تاریخِ تحریکِ آزادیِ ہند

مصنف
ڈاکٹر تاراچند

مترجم
قاضی محمد عدیل عباسی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل
حکومت ہند

ویسٹ بلاک۔I، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی۔110066

Tareekh Tehreek-e-Azad-i-Hind

By : Dr. Tara Chand

سنہ اشاعت:

پہلا اڈیشن : 1980

دوسرا اڈیشن : 1998 تعداد 1100

قیمت: -/103

سلسلۂ مطبوعات: 807

ناشر : ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔I، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066

طابع : ایس۔ نارائن اینڈ سنز، نئی دہلی

تاریخِ تحریکِ آزادیِ ہند

جلد سوم

تارا چند

مترجم

عدیل عباسی

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

وزارتِ ترقیِ انسانی وسائل، حکومتِ ہند

ویسٹ بلاک۔1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066

پیش لفظ

"ابتدا میں لفظ تھا۔ اور لفظ ہی خدا ہے"

پہلے جمادات تھے۔ ان میں نمو پیدا ہوئی تو نباتات آئے۔ نباتات میں جبلت پیدا ہوئی تو حیوانات پیدا ہوئے۔ ان میں شعور پیدا ہوا تو بنی نوع انسان کا وجود ہوا۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے کہ کائنات میں جو سب سے اچھا ہے اس سے انسان کی تخلیق ہوئی۔

انسان اور حیوان میں صرف نطق اور شعور کا فرق ہے۔ یہ شعور ایک جگہ پر ٹھہر نہیں سکتا۔ اگر ٹھہر جائے تو پھر ذہنی ترقی، روحانی ترقی اور انسان کی ترقی رک جائے۔ تحریر کی ایجاد سے پہلے انسان کو ہر بات یاد رکھنا پڑتی تھی، علم سینہ بہ سینہ اگلی نسلوں کو پہنچتا تھا، بہت سا حصہ ضائع ہو جاتا تھا۔ تحریر سے لفظ اور علم کی عمر میں اضافہ ہوا۔ زیادہ لوگ اس میں شریک ہوئے اور انھوں نے نہ صرف علم حاصل کیا بلکہ اس کے ذخیرے میں اضافہ بھی کیا۔

لفظ حقیقت اور صداقت کے اظہار کے لیے تھا، اس لیے مقدس تھا۔ لکھے ہوئے لفظ کی، اور اس کی وجہ سے قلم اور کاغذ کی تقدیس ہوئی۔ بولا ہوا لفظ، آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ ہوا تو علم و دانش کے خزانے محفوظ ہو گئے۔ جو کچھ نہ لکھا جا سکا، وہ بالآخر ضائع ہو گیا۔

پہلے کتابیں ہاتھ سے نقل کی جاتی تھیں اور علم سے صرف کچھ لوگوں کے ذہن ہی سیراب ہوتے تھے۔ علم حاصل کرنے کے لیے دور دور کا سفر کرنا پڑتا تھا، جہاں کتب خانے ہوں اور ان کا درس دینے والے عالم ہوں۔ چھاپہ خانے کی ایجاد کے بعد علم کے پھیلاؤ میں وسعت آئی کیونکہ وہ کتابیں جو نادر تھیں اور وہ کتابیں جو مفید تھیں آسانی سے فراہم ہوئیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اچھی کتابیں، کم سے کم قیمت پر مہیا کرنا ہے تاکہ اردو کا دائرہ نہ صرف وسیع ہو بلکہ سارے ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور پڑھی جانے والی اس زبان کی ضرورتیں پوری کی جائیں اور نصابی اور غیر نصابی کتابیں آسانی سے مناسب قیمت پر سب تک پہنچیں۔ زبان صرف ادب نہیں، سماجی اور طبعی علوم کی کتابوں کی اہمیت ادبی کتابوں سے کم نہیں، کیونکہ ادب زندگی کا آئینہ ہے، زندگی سماج سے جڑی ہوئی ہے اور سماجی ارتقاء اور ذہن انسانی کی نشو و نما طبعی، انسانی علوم اور ٹکنالوجی کے بغیر ممکن نہیں۔

اب تک بیورو نے اور اب تشکیل کے بعد قومی اردو کونسل نے مختلف علوم اور فنون کی کتابیں شائع کی ہیں اور ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ یہ کتاب اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ امید ہے یہ اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔ میں ماہرین سے یہ گذارش بھی کروں گا کہ اگر کوئی بات ان کو نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ اگلے ایڈیشن میں نظر ثانی کے وقت خامی دور کر دی جائے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ

ڈائرکٹر

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند، نئی دہلی

فہرست

تاریخ تحریک آزادی کی پہلی دو جلدیں نیشنلزم اور آزادی کے تخیل کے نمودار ہونے کی بنیاد سے تعلق رکھتی تھیں۔ ہندوستان کی نمایاں جغرافیائی وحدت نے ان تمام لوگوں کے ایک قوم ہونے کے احساس کو ترقی دینے کی ضروری بنیاد کو فراہم کیا جو ملک کے جغرافیائی حدود کے اندر بسے ہوئے تھے۔ اگرچہ ان میں بہت سے مذہبوں کے ماننے والے تھے۔ کلچر بھی ایک دوسرے سے مختلف تھا لیکن ان میں یکسانیت کے پہلو بھی اتنے نمایاں تھے کہ بابر کو بھی آخر تسلیم کرنا پڑا تھا کہ یہاں کے بسنے والوں کے طرز زندگی میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔

تیسری جلد میں جس زمانہ کا حال بیان ہوا اس میں ایک ہونے کے اس احساس نے ترقی کرکے یہ سیاسی بیداری پیدا کی کہ ہر ایک کی قسمت دوسرے سے وابستہ ہے۔ اس نمو پر برطانوی حکمراں مضطرب ہو گئے ان کی شہنشاہیت کے متعلق ان کے مفاد کا تقاضہ تھا کہ وہ ہندوستان کی قومیت کے مطالبے کو رد کر دیں۔ جب تک کہ شہنشاہیت کا حیلہ قایم رہا اور جب تک کہ دوسری جنگ عظیم کے نتیجہ کے طور پر یورپ کی ماتحت ریاستیں ان سے الگ نہیں ہو گئیں اور جب تک کہ یورپین قوموں کے باہمی مقابلے کی جگہ دو بڑی طاقتوں حکومت متحدہ امریکہ اور حکومت متحد سوویت روس نے نہیں لے لی برطانیہ کے صف اوّل کے مدبرین اس بات سے انکار ہی کرتے رہے کہ جو ممالک ان کے جوے کے نیچے ہیں ان میں خود ارادیت پیدا ہونے کا بھی امکان ہے۔

ہندستان کے بسنے والوں اور دوسرے لوگوں میں یکسانیت اور اختلاف کا

مسئلہ اٹھارہویں صدی کے آخری حصہ میں اس وقت پیدا ہوا جب انگریزوں نے بنگال کو فتح کر لیا تھا اور ایسا نظامِ حکومت نافذ کیا تھا جس نے سفید فام حکمرانوں اور ان کے کالے رنگ کی رعایا میں فرق کیا تھا۔ حکمرانوں نے اعلیٰ اقتدار لے لیا تمام اونچی جگہوں سے یک قلم الگ کر دی گئی۔

مفتوحین اپنی حیثیت کی کمتری پر غمناک تھے اور اس بات کی تدبیر سوچنے لگے کہ کس طرح فاتحین سے برابری کا درجہ حاصل کر سکیں مفتوحین میں دو نقطہ نظر کے لوگ ابھرے ایک اس بات کا مبلغ تھا کہ بیرونی حکمرانوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے تشدد کا استعمال کیا جائے ان میں بہت سے گروپ تھے رجماعتیں تھیں یعنی حامی احیاء مذہب۔ انقلابی اور تخویف پسند وغیرہ تھے۔ دوسرا نقطہ فکر رکھنے والے پرامن شورش پر عقیدہ رکھتے تھے تاکہ مخالفت کو منظم کر کے حکومت پر سیاسی دباؤ ڈالیں۔

یہ دونوں گروپ پہلی جنگ عظیم کے خاتمے اور گاندھی جی کی عدم تشدد پر مبنی تحریک ترک موالات چلانے کے قبل تک سیاسی اسٹیج پر قابض رہے۔ اس تحریک نے شدت اختیار کی اور اس کو بے نظیر ہر دلعزیزی حاصل ہوئی اور عوام کی مرضی کو اثر انداز بنانے کے لیے یہ ایک طاقت ور حربہ بن گئی۔ انگریزوں کو اس بات کا یقین تھا کہ دوسری جنگ عظیم میں جو نقصانات ان کو اٹھانے پڑے ہیں ان کی بنا پر وہ اب اس قابل نہیں رہ گئے ہیں کہ اپنی ملوکیت ان رعایا پر زبردستی عائد رکھ سکیں جو اس پر راضی نہیں تھے۔

اس تیسری جلد میں نیشنلسٹ خیالات کے نشوونما پانے اور خود ارادیت کے تقاضے کے نمودار ہونے کا حال بیان کیا گیا ہے۔ ان خیالات کی نشر و اشاعت، فلسفوں کی نئی شرح اور ہندو اور مسلمان دونوں مذاہب کی جدید تشکیل کے ذریعہ کی گئی ہے۔ شارحین کا منشا آزادی کا جذبہ ابھارنا تھا لیکن اپیل قدیم مقدس کتابوں کی تعلیمات کے ذریعہ کی گئی۔

اگرچہ ہندو اور مسلمان دونوں کے شرح و تاویل کرنے والوں کا مقصد ایک تھا لیکن وہ ایسی زبان لکھتے تھے جو ایک طبقہ کے لیے تو ایسی تھی جس سے وہ مانوس تھے مگر دوسرے طبقہ کے لیے ناقابلِ فہم تھی۔ سمجھنے کی یہ کمی حکمرانوں کے لیے سودمند تھی اور انھوں نے اپنا پورا اثر اختلاف کی خلیج کو وسیع تر کرنے پر صرف کیا۔ عنان طاقت

ان کے ہاتھ میں تھی اور ان کو اپنی ملکیت کے ضائع ہونے کا خطرہ بھی لاحق تھا اس لیے وہ اس پر یقین کرنا نفرت انگیز سمجھتے تھے کہ ہندوستانیوں میں اس حد تک ضروری وحدت اور قوت ہے کہ وہ ایک متحدہ اور اچھے نظم و نسق کے ہندوستان کو برقرار رکھ سکتے ہیں۔

تیسری جلد کے لکھنے میں مجھے اپنے ریسرچ افسران خاص کر ڈاکٹر آر۔ کے۔ پرمو (Dr.R.K. PARMU) اور ڈاکٹر وی۔جی۔ ڈگی (Dr.V.G. DIGHE) سے بہت مدد ملی مسودہ کو شری بی۔آر۔ اجمانی (B.R. AJMANI) نے ٹائپ کیا نیشنل آرکائیوز آف انڈیا نے آرکائیو کے وسائل کو آزادی سے میرے سپرد کر دیا جس کے لیے میں شکر گذار ہوں۔

15 اگست 1972 — تاراچند

پہلا باب

انگلستان کی سلطنت اور ملوکیت میں گرہن

۱۔ تمہید

بیسویں صدی کے آغاز میں ہندوستان کی جانب سے ذمہ دار حکومت کا مطالبہ زور پکڑ گیا تھا مگر اسے حکومت برطانیہ کی تینوں سیاسی جماعتوں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ پھر بھی بہر حال تاریخ کا دھارا رکا نہیں رہ سکتا تھا کیونکہ برطانیہ اور ہندوستان کے تصادم کے اندر کشیدگی اور تقابل کے بیج موجود تھے۔ ایک جانب انکار پر ضد سخت ہوتی گئی تو دوسری جانب بھی انحراف نے تصادم کی شکل پیدا کی جو وقت کے ساتھ ترقی کرتا گیا۔

ہندوستان کا حال یہ تھا کہ اس میں سوسائٹی کے مختلف طبقات میں موثر تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ ملک میں بسنے والوں کے مختلف گروہوں میں دولتمند مالکان زمین اور راجگان کا گروہ اب بھی حکومت کا وفادار تھا۔ لیکن تجارت پیشہ ور جماعتیں اور پڑھے لکھے لوگ یہ محسوس کر رہے تھے کہ ان کی آنکھوں سے پردے اٹھ گئے ہیں اور وہ غیر مطمئن تھے۔ اس لئے تبدیلی لانے کی اپنی جدوجہد کا رخ قدرتاً وہ جامد، افسردہ اور غیر مطمئن عوام کی جانب موڑ رہے تھے جسے آئینی جدوجہد کا نام دیا گیا تھا۔ اس کے بیکار ہونے کو بااثر لیڈران میں سے کچھ لوگوں نے سمجھ لیا تھا اور جس طرح اس صدی کا وقت گزرتا گیا ان کی تعداد اور ان کے اثر میں اضافہ ہوتا گیا اور ان کی منظم کارروائیوں نے شدت، جوش اور جارحیت اختیار کر لی۔

دوسری طرف بے مثال اقتصادی مرفہ الحالی اور بین الاقوامی سیاست میں بلا اختلاف فوقیت جو برطانیہ نے حاصل کی تھی وہ جیسے جیسے دوسری قومیں صنعت، دولت اور قوت میں ترقی کرنے لگیں

ویسے ویسے بتدریج گھٹنے لگی تا آنکہ برطانیہ پیچھے رہ گیا۔ ایسی قوموں کے ابھر آنے سے جو زیادہ انسانیت نواز تھیں اور جن کے پاس وسائل بھی زیادہ تھے۔ انھوں نے نہ صرف یہ کہ برطانیہ کی انرجی کو آخری حد تک مقابلہ میں لگانے پر کھینچ لیا بلکہ طاقتور رقیبوں کی دنیا میں اسے اپنی امپائر (مملکت) کو سنبھالنا ایک انتہائی پرخطر معاملہ بن گیا۔ ایسی ملوکیت پسندی جس میں اجارہ داری کا رجحان تھا اس نے قدرتاً حسد پیدا کیا اور اس کی وجہ سے اس طاقت پر جو آدمیوں کی تعداد سے پیدا ہوتی ہے اور اقتصادیات دونوں پر زبردست دباؤ پڑا۔ عالم پر برتری کی عدم موجودگی میں ملوکیت ایک مشتبہ جائداد ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز ہی میں برطانیہ کی وفاقی قیادت باقی نہیں رہ گئی تھی لیکن خسروان کا انداز برطانیہ نے رفتہ رفتہ ہی کیا۔

اس طرح آزادی کی جدوجہد دو پارٹیوں کے درمیان ایک مسلسل تنازعہ بنی ہوئی تھی۔ ایک وہ تھی جس کا پیمانہ صبر روز بروز لبریز ہوتا جارہا تھا اور ایک طے شدہ منزل کی جانب اس کا عزم برابر ترقی کر رہا تھا۔ اور دوسرے کا حال یہ تھا کہ اس کا عقیدہ ملوکیت کے مشن پر روز بروز کمزور ہوتا جارہا تھا۔ لیکن دنیا میں جو واقعات رونما ہورہے تھے ان کے دباؤ سے ہی وہ اپنی پوزیشن سے بے دلی کے ساتھ دست بردار ہوتا تھا۔

برطانیہ کو دنیا میں جو پوزیشن حاصل تھی اس سے محرومی کے اسباب وہ نہیں تھے جو ماضی میں دوسری شہنشاہیتوں کے زوال کا باعث ہوئے تھے۔ مثلاً ایران میں یونانی نسل کی شاخ اکیمینین (ACHAEMENIAN) یا یونان میں ایتھنین قوم ATHENIAN کے یا مقدونیوں کے اٹلی میں رومن کے یا اسلام کی خلافت کے یا مقدس رومن امپائر کے ازمنۂ وسطیٰ میں بظاہر قوم کے لوگوں میں ہمت ہمت و عزم کا فقدان نہیں ہوا تھا۔ نہ تو حب الوطنی کے جذبہ کے جوش میں کمی آئی تھی اور نہ قوم کی رگوں میں خون کی گردش بند ہوئی تھی۔ اسی طرح سماج کے نظم میں طبقات کے درمیان کسی قسم کا تشدد آمیز تصادم بھی رونما ہوا تھا۔ اور نہ سماج کے نظم کے درہم برہم ہونے کا کوئی نشان تھا۔ ذہن کی توانائی، علمی اور تکنیکی ایجادات کا ذوق اور حالات سے مصالحت کرنے یا ہم بازی کی صلاحیت بھی بدستور تھی۔ ایسی حالت میں برطانیہ کے زوال کے دو اسباب کہے جا سکتے ہیں۔ اندرونی طور پر برطانیہ کی آبادی اور قدرتی وسائل کی کمی اور بیرون ملک میں اس سے ایسے مقابلہ کرنے والوں کا نمودار ہونا جن کی آبادی کہیں زیادہ تھی اور جن کے قدرتی وسائل بھی زیادہ تھے اور ان دونوں کو انھوں نے بیسویں صدی میں تیز رفتار سے اپنوں نے استعمال کیا۔ ان ناموافق حالات پر قابو پانا ناممکن تھا اور انھوں نے برطانیہ کو مجبور کر دیا کہ وہ نیچے گر کر اقوام عالم میں دوسرے

درجہ کی صف میں آجاتے ۔

لیکن یہ تبدیلی اچانک نہیں آئی بلکہ اس کا سلسلہ کئی دہ سالہ زمانوں پر پھیلا ہوا ہے ۔ اگرچہ تبدیلی کی اہمیت کا اندازہ رفتہ ہی رفتہ ہوا ۔ لیکن جس طرح دہ سالہ دور ایک دوسرے کے بعد ختم ہوتے رہے ۔ وہ اس بات کی شہادت فراہم کرتے رہے کہ دنیا میں برطانیہ کی پوزیشن رو بہ زوال ہے ۔ اور جو دھاگے ملکیت کے اجزاء کو ایک میں باندھے ہوئے تھے وہ ٹوٹتے جا رہے ہیں ۔

2 شہنشاہیت بیسویں صدی کے آغاز پر

پچھلی صدی کے آخری سالوں میں برطانوی شہنشاہیت، طاقت اور وقار کے عروج پر تھی ۔ دنیا میں تیرہ ملین مربع میل رقبہ پر اس کا قبضہ تھا اور ۳۶۶ ملین انسانوں پر حکومت کرتی تھی ۔ جن میں 300 ملین ہندوستان کے باشندے تھے ۔ برطانیہ کا جھنڈا اس کے ان مملوکہ ممالک پر لہرا رہا تھا ۔ جو تمام بر اعظم میں بکھرے ہوئے تھے ۔ تمام ملوکیت پسند ممالک فرانس، جرمنی، روس، بلجیم ہالینڈ، پرتگال، وہ امریکہ سب پر کیا بلحاظ رقبہ مملوکہ اور کیا بلحاظ تعداد آبادی رعایا برطانیہ کو فوقیت حاصل تھی ۔

اس کی طاقت کی مخصوص بنیادیں دو تھیں ۔ بحریہ کی طاقت اور اس کی مالیات ۔ برطانوی بحریہ سمندر پر چلنے والی طاقتوں میں سب سے زیادہ طاقتور تھی ۔ برطانیہ کی خیالی مجسم صورت در حقیقت موجوں پر حکمراں تھی ۔ صدی کے آخر میں لارڈ سپنسر نے بحریہ کی از سر نو تعمیر کی اور اس کو اور زیادہ بھاری جنگی جہاز دیئے ۔ اور اسی قسم کے نئے تباہ کن جہازات فراہم کئے جن میں ترقی یافتہ اور زیادہ دور تک مار نے والی اور زیادہ قطر کے نال کی توپیں اور دوسرے اسلحے تھے ۔

فشر نے اس سلسلہ کی تکمیل اس طرح کی کہ بحریہ کے کمان کو از سر نو منظم کیا ۔ نئے بھاری اور طاقتور جنگی جہاز بنائے ۔ جن میں بھاری بھاری توپیں ، گشتی جہازات اور دور مار آبدوز کشتیوں کا بہ طور امدادی سامان اضافہ کیا اس طرح ایک زبردست جنگی جہازوں کا بیڑا تیار ہوا جو دور دراز تک پھیلی ہوئی برطانوی مملکت کی پاسبانی بھی کرتا تھا اور رقیبوں کی دست برد سے اسے محفوظ بھی رکھتا تھا ۔

مالیات میں برطانیہ کی عظمت ناقابل بحث تھی ۔ گزشتہ دس سالوں میں اس کی دولت میں تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا ۔ اگرچہ اضافہ کی شرح اتنی اونچی نہ تھی جتنی کہ اس سے پہلے کے

دس سالوں میں رہی تھی۔ قوم کی آمدنی بڑھ رہی تھی اور اشیاء کی قیمتوں کی شرح سے زیادہ مزدوروں کی اجرت بڑھ رہی تھی مزدوروں کی اجرت کو جو 1886ء میں تھی اس سے 1900ء میں 77% کا اضافہ ہوگیا تھا۔
برطانیہ اب بھی دنیا کا ورکشاپ (کارخانہ) تھا۔ اگرچہ اس کے حریف اپنے کو قانون حاصل بحری درآمد و برآمد کی دیواروں سے محفوظ کرکے تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے۔ اور برطانیہ کی قیادت سے مقابلہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو مصنوعات عرصے سے برطانیہ میں تیار ہونے کی وجہ سے روایتی شکل اختیار کر چکے تھے۔ ان کو دھکا لگا لیکن مشینری اور جہازات کی تیاری کے بڑھ جانے اور لوہا فولاد اور کوئلہ کی پیداوار سے اس کی تلافی ہوگئی۔

اس کے تجارتی جہازات اب بھی تجارتی مال دنیا میں سب سے زیادہ دے جاتے تھے
مملکت متحدہ برطانیہ کی بیرونی تجارت کے مال جو برطانوی بندرگاہوں میں آتے یا وہاں سے باہر جاتے تھے ان کا 70% سے زائد برطانیہ کے جہازات کے ذریعہ آتا جاتا تھا۔ دنیا کے اسٹیمروں کے ذریعہ مال کی جو مقدار آتی جاتی تھی اس کا $\frac{5}{8}$ برطانیہ مہیا کرتا تھا۔ سمندر پر سے جانے والے تجارتی مال کے نصف سے زائد کے لئے برطانیہ کے جہازات استعمال ہوتے تھے۔ اور دنیا کے نئے درآمد و برآمد کے مال کا 60% اس کے بندرگاہوں سے اتارا لادا جاتا تھا۔ بیرونی تجارت 1899ء سے ایک موج کی چوٹی تک بڑھ رہی تھی۔ درآمد اور برآمد دونوں میں توسیع ہو رہی تھی۔

مالیات میں لندن دنیا کا مرکز تھا۔ 1900ء میں برطانوی راس المال خواہ وطن میں یا بیرون ملک برابر ترقی کر رہا تھا۔ 1900ء میں کل راس المال کی میزان 336226.3 ملین تھی جو گزشتہ تمام سالوں سے زیادہ تھی۔ یہ اصل قومی آمدنی کی 13.5 فی صدی تھی۔ یہ بات غور و فکر کے لئے دلچسپ ہے کہ جنگ عظیم سے ایک سال قبل۔ 1913ء میں یہ 372.2 ملین کی حد تک اور کل آمدنی کے 5.3% فیصدی تک پہونچ گئی تھی۔ اقتصادی ترقیات میں ان سالوں کے اندر ایک اور رجحان نظر آتا ہے:

گھریلو اقتصادیات میں راس المال گھٹا اور بیرونی ملکوں میں بڑھا 1900ء سے 1913ء کے درمیان گھریلو راس المال 188.6 ملین سے 167.9 ملین تک یا قومی پیداوار کے 10.4 سے [illegible] فی صدی تک ہے۔

لیکن بیرونی راس المال 37.9 ملین سے بڑھ کر 204.3 یا کل آمدنی کا 2.1 سے گزر کر 6.4 فیصدی ہوگیا۔

1- Ashworth. W, Economic History of England 1870-1939, P.139

- I. صاف ظاہر ہے کہ برطانوی سرمایہ اس کو زیادہ منافع بخش سمجھتا تھا کہ بیرون ملک کی ترقیات کے لئے سرمایہ فراہم کرے۔ بجائے اس کے کہ گھریلو صنعت کو ترقی دینے کے لئے وطن کے اندر بیٹھا رہے۔

ان تمام سرمایوں کے لگانے سے عظیم فوائد حاصل ہوئے۔ جمع شدہ سرمایہ کو بیرونی ممالک میں لگانے اور خاص کر ایشیا، افریقہ اور جنوبی امریکہ کے پچھڑے ہوئے ممالک میں صرف کرنے سے زیادہ سے زیادہ منافع کے مواقع تھے۔ اسٹریچی نے بتلایا ہے کہ "بیسویں صدی کے پہلے دس سالوں میں معیار زندگی ترقی نہ کرسکا۔ مجموعی طور پر اقتصادیات اور اسی کے ساتھ کل قومی پیداوار مستقل طور پر ترقی کررہی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ سال بہ سال بچت کی مقدار بڑھتی جارہی تھی۔ یہ تمام بچت سوائے بیرونی ملک میں لگانے کے اور کہاں لگائی جاسکتی تھی جو منافع بخش ہوتی ۔" 2/

بیرون ملک میں اثاثہ لگانے سے وسیع تر قسم کی اشیاء کی تیاری کی رغبت میں ترقی ہوئی اس نے برطانیہ کو اس قابل کیا کہ جن اشیاء کی برطانیہ کو ضرورت ہو اس کا مال سستے داموں کی شرح پر درآمد کرسکے اور نئے بازاروں کو تیز لگا۔ ایش ورتھ ASHWORTH کہتا ہے کہ "اس تبدیلی سے نسبتاً کا جلا اور واقعتہً بھی زیادہ تر حصہ وہ تھا جو تقسیم اشیاء، مالیات اور دوسری ملازمتوں میں برطانیہ کی اقتصادی سرگرمیوں میں تھا۔ خصوصاً اقتصادی ملازمتوں کے نمونے نے ایک مختلف اقسام کی دنیا میں پھیلی ہوئی اور زرخیز تجارتی نظام کو فروغ دیا جس پر برطانیہ کی مادی زندگی کا انحصار اب ہو گیا تھا اور اسی نے برطانیہ کو دنیا میں مرکزی پوزیشن اور بالا تر طاقت اور اثر کا مالک بنا دیا ۔" 3

سرمایہ کو باہر لگانے کے ساتھ تیار شدہ اشیاء کی برآمد بھی بڑھی۔ 1900 میں اس کی مقدار کی قیمت 280 ملین پاؤنڈ تھی اور 1910 میں 400 ملین پاؤنڈ ہوگئی۔ یہ اضافہ زیادہ تر

---

2 - Strachey: J. The end of Empire . P.116.

3 - Ashworth, W. op cit P.254.

لوہا، فولاد، مشینری اور جہازرانی کی تعمیرات ہوا۔

لیکن صرف بیرونی تجارت ہی پر اثر نہیں پڑا بلکہ ہر قسم کی تجارت کو ترقی ہوئی۔ 1901ء میں اس کی مقدار کی قیمت 870.5 ملین تھی اور 1913ء میں یہ 1155.7 ملین ہوگئی 1901ء کی سٹرلنگ کے حساب سے)۔ اس کے علاوہ ملک کے واقعی سرمایہ میں بھی اضافہ بقدر 50 فیصدی 1895ء اور 1914ء کے درمیان ہوا۔

جو تصویر خوشحالی کی پیش کی گئی ہے اس کے ساتھ دوسرا رخ بھی دکھلانا ضروری ہے۔ جنگ سے پہلے قیمتیں چڑھ رہی تھیں۔ تھوک چیزوں کے دام کا انڈکس جو 1901ء میں 72 تھا۔ (1871ء - 100 کے ساتھ) آگے بڑھ کر 1913ء میں 85 ہوگیا لیکن مزدوروں کی اجرتیں جہاں تھیں وہیں رہیں۔ اس کا انڈکس 1901-5ء (100 - 1885ء) کے لئے) 133 تھا اور 1913ء میں 134 ہوگیا۔ بے روزگاری بڑھ گئی تھی۔ 1891ء لغایت 1901ء میں بے روزگاری 5.2 فیصدی تھی لیکن 1901ء لغایتہ 1910ء میں 6 فی صد ہوگئی۔

اس طرح ظاہر ہے کہ انیسویں صدی کے اختتام پر برطانیہ مرفہ الحالی اور طاقت کے بام عروج پر تھا۔ اس کی آبادی بڑھ رہی تھی اس کا معیار زندگی اور دولت سے حاصل شدہ عیش و آرام ترقی پر تھے۔ اس کی بیرونی تجارت پھیل رہی تھی۔ اس کی صنعت کامیابی کے ساتھ دنیا کے بدلے ہوئے حالات سے موافقت کر رہی تھی۔ اس کی قومی آمدنی اور بچت روز افزوں اوپر جارہی تھی اور دنیا کی قوموں کے لئے یہ مہاجن اور بینک کی طرح سرمایہ فراہم کرنے والی بن گئی تھی۔

برطانیہ پہلی جنگ عظیم کے موقع پر

لیکن افق پر تہدید آمیز بادلوں نے جمع ہونا شروع کر دیا تھا اور اس کے شاندار منظر پر جسے انگلستان کہتے ہیں اپنا سیاہ سایہ ڈال رہے تھے۔ برطانیہ کے رقیب تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے۔ بیسویں صدی کے پہلے دس سالوں میں برطانیہ کی آبادی 41.9 سے بڑھ کر 45.3 ملین ہوگئی تھی یعنی 8 فیصدی کا اضافہ ہوا تھا۔ لیکن جرمنی کی آبادی 56.3 ملین سے ترقی کر کے 64.9 ملین پر پہونچی یعنی 15% فیصدی کا اضافہ ہوا۔ اور ممالک متحدہ امریکہ کی آبادی 75.9 ملین سے بڑھ کر 91.7 ملین ہوگئی یعنی 21 فیصدی بڑھی۔

بیس سال یعنی 1893ء لغایتہ 1913ء درمیان جنگ عظیم سے قبل آبادی، کوئلہ

بھٹی سے نکل کر بنے ہوئے لوہے، کچے فولاد کی پیداوار اور بنی ہوئی تجارتی اشیاء کے برآمد میں جرمنی اور امریکہ نے جو ترقی کی تھی وہ برطانیہ کے مقابلے کہیں زیادہ تھی۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل جدول سے ظاہر ہوگا۔

اضافہ فیصد

	انگلستان	جرمنی	امریکہ
1۔ آبادی	20	32	46
2۔ کوئلہ کی پیداوار	75	159	210
3۔ بھٹی سے نکال جما ہوا لوہا	50	287	337
4۔ کچا فولاد	136	522	715
5۔ بنی ہوئی تجارتی اشیاء کی برآمد	121	239	563

فی کس واقعی آمدنی جو انیسویں صدی کے آخری حصہ میں اونچی شرح سے بڑھ رہی تھی۔ مختلف اعداد وشمار کے لحاظ سے 7 اور 25 فیصدی کے درمیان 1905ء سے 1914ء کے دس سالوں کے درمیان بہت کم ہو گئی تھی۔ کیونکہ اس کے پہلے دس سال کے مقابلہ میں اس کے اندر صرف 7 فیصد کا اضافہ ہوا۔ قومی آمدنی میں اضافہ کی رفتار کی سستی اس سے ظاہر تھی کہ مزدوروں کی آمدنی جہاں تھی وہیں رہ گئی تھی۔ اگرچہ قوم کی بنائی ہوئی چیزوں کی مقدار ترقی کر رہی تھی۔ جس سے سالانہ بچت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اور اس اضافہ شدہ رقم کو بیرون ملک میں لگا کر کثیر منافع کمایا جا رہا تھا اور اس نے توسیع مملکت اور اندرونی ملوکیت پسندانہ رقابت کی بھٹی کی آگ کو بھڑکا دیا تھا۔

برطانیہ کا سرمایہ بیرون ملک لے جانے اور بیرون ملک میں لگا کر کثیر منافع کمانے کی پالیسی برطانیہ کے محنت کش مزدوروں کے عام معیار حیات پر کوئی اثر ڈالنے میں ناکامیاب رہی۔ در حقیقت جو طبقے سرمایہ لگا رہے تھے یعنی تجار۔ وہ منافع کی زیادہ مقدار خود ہضم

لوہا، فولاد، مشینری اور جہازرانی کی تعمیر سے ہوا۔

لیکن صرف بیرونی تجارت ہی پر اثر نہیں پڑا بلکہ ہر قسم کی تجارت کو ترقی ہوئی۔ 1901ء میں اس کی مقدار کی قیمت 870.5 ملین تھی اور 1913ء میں یہ 1155.7 ملین ہوگئی 1901 کی شرح کے حساب سے) اس کے علاوہ ملک کے واقعی سرمایہ میں بھی اضافہ بقدر 50 فیصدی 1895ء اور 1914ء کے درمیان ہوا۔

جو تصویر خوشحالی کی پیش کی گئی ہے اس کے ساتھ دوسرا رخ بھی دکھلانا ضروری ہے۔ جنگ سے پہلے قیمتیں چڑھ رہی تھیں۔ تھوک چیزوں کے دام کا انڈکس جو 1901ء میں 72 تھا۔ (100 - 1871ء کے ساتھ) آگے بڑھ کر 1913ء میں 85 ہوگیا لیکن مزدوروں کی اجرتیں جہاں تھیں وہیں رہیں۔ اس کا انڈکس 1915ء (100 - 1885) کے لئے 133 تھا اور 1913ء میں 134 ہوگیا۔ بے روزگاری بڑھ گئی تھی۔ 1891ء لی نیا 1901ء میں بے روزگاری 2.5 فیصدی تھی لیکن 1901ء لغاتیہ 1910ء میں 6 فی صد ہوگئی۔

اس طرح ظاہر ہے کہ انیسویں صدی کے اختتام پر برطانیہ مرفہ الحالی اور طاقت کے بام عروج پر تھا۔ اس کی آبادی بڑھ رہی تھی اس کا معیار زندگی اور دولت سے حاصل شدہ عیش و آرام ترقی پر تھے۔ اس کی بیرونی تجارت پھیل رہی تھی۔ اس کی صنعت کامیابی کے ساتھ دنیا کے بدلے ہوئے حالات سے موافقت کر رہی تھی۔ اس کی قومی آمدنی اور بچت روز افزوں ادپر جارہی تھی اور دنیا کی قوموں کے لئے یہ مہاجن اور بنیک کی طرح سرمایہ فراہم کرنے والی بن گئی تھی۔

برطانیہ پہلی جنگ عظیم کے موقع پر

لیکن افق پر تہدید آمیز بادلوں نے جمع ہونا شروع کر دیا تھا اور اس کے شاندار منظر پہ جسے انگلستان کہتے ہیں اپنا سیاہ سایہ ڈال رہے تھے۔ برطانیہ کے رقیب تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے۔ بیسویں صدی کے پہلے دس سالوں میں برطانیہ کی آبادی 41.9 سے بڑھ کر 45.3 ملین ہوگئی تھی یعنی 8 فیصدی کا اضافہ ہوا تھا۔ لیکن جرمنی کی آبادی 56.3 ملین سے ترقی کر کے 64.9 ملین پر پہونچی یعنی 15% فیصدی کا اضافہ ہوا۔ اور ممالک متحدہ امریکہ کی آبادی 75.9 ملین سے بڑھ کر 91.7 ملین ہوگئی یعنی 21 فیصدی بڑھی۔

بیس سال یعنی 1893ء لغایتہ 1913ء درمیان جنگ عظیم سے قبل آبادی، کوئلہ

بھٹی سے نکل کر بنے ہوئے لوہے، پکے فولاد کی پیداوار اور بنی ہوئی تجارتی اشیاء کے برآمد میں جرمنی اور امریکہ نے جو ترقی کی تھی وہ برطانیہ کے مقابلے کہیں زیادہ تھی۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل جدول سے ظاہر ہوگا۔

اضافہ فیصد

	انگلستان	جرمنی	امریکہ
1 - آبادی	20	32	46
2 - کوئلہ کی پیداوار	75	159	210
3 - بھٹی سے نکالا ہوا لوہا	50	287	337
4 - کچا فولاد	136	522	715
5 - بنی ہوئی تجارتی اشیاء کی برآمد	121	239	563

فی کس واقعی آمدنی جو انیسویں صدی کے آخری حصہ میں اونچی شرح سے بڑھ رہی تھی۔ مختلف اعداد و شمار کے لحاظ سے 7 اور 25 فیصدی کے درمیان 1905ء سے 1914ء کے دس سالوں کے درمیان بہت کم ہوگئی تھی۔ کیونکہ اس کے پہلے دس سال کے مقابلہ میں اس کے اندر صرف 7 فیصد کا اضافہ ہوا۔ قومی آمدنی میں اضافہ کی رفتار کی سستی اس سے ظاہر تھی کہ مزدوروں کی آمدنی جہاں تھی وہیں رہ گئی تھی۔ اگرچہ قوم کی بنائی ہوئی چیزوں کی مقدار ترقی کر رہی تھی۔ جس سے سالانہ بچت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اور اس اضافہ شدہ رقم کو بیرون ملک میں لگا کر کثیر منافع کمایا جا رہا تھا اور اس نے توسیع مملکت اور اندرونی ملوکیت پسندانہ رقابت کی بھٹی کی آگ کو بھڑکا دیا تھا۔

برطانیہ کا سرمایہ بیرون ملک لے جانے اور بیرون ملک میں لگا کر کثیر منافع کمانے کی پالیسی برطانیہ کے محنت کش مزدوروں کے عام معیار حیات پر کوئی اثر ڈالنے میں ناکامیاب رہی۔ درحقیقت جو طبقے سرمایہ کار رہے تھے یعنی تجار۔ وہ منافع کی زیادہ مقدار خود ہضم

کرجاتے تھے۔ اور روز بروز دولتمند سے دولتمند تر ہوتے جارہے تھے۔ اور محنت کش مزدوروں کی اجرت بیسویں صدی کے پہلے دس سالوں میں جوں کی توں رہ گئی۔ جنگ عظیم کے قبل کے سالوں میں اگر سرمایہ لگانے والوں کے مفاد نے ملوکیت کے زیادہ زوروں کے ساتھ ابھرنے کے لئے سامان فراہم کیا تو اسی کے نسبتاً مزدوروں کی غریبی نے محنت کش طبقہ کی تحریک اور سوسلسٹ پارٹی کی نمود میں جان ڈال دی۔

چارلس بوتھ Charles Booth اور سیبوہم رونٹری Seebohm Rowntree کے سروے نے یہ نمایاں کیا کہ خاندانوں کی ایک کثیر تعداد ناکافی آمدنی پر گزر کر رہی ہے اور ان کا طرز رہائش حقیر اور گھناونا ہے۔ ان کی تحقیق کے مطابق لندن کی ۳۰ فیصدی سے زائد اور یارک کی تقریباً 28 فیصدی آبادی عسرت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔

سوسائٹی کے اونچے اور نیچے طبقوں پر اقتصادی اثرات کا جو رخ تھا اسے مزدال Mansdal نے انجیل کے الفاظ میں جامع لیکن مختصر طور پر بیان کر دیا ہے۔

"کیونکہ جس کے پاس ہے اس کو دیا جائے گا۔ حتیٰ کہ اس کے پاس کثرت سے ہوگا اور جس کے پاس نہیں ہے اس سے بھی لے لیا جائے گا۔ جو اس کے پاس ہے" 5/

بیرون ملک کے مقابلے کرنے والوں کی تہدید اور محنت کش مزدوروں میں بے چینی سے برطانیہ کے سرمایہ دار گھبرا گئے اور حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے تدابیر نکالنے کے لئے سنجیدگی سے غور کرنے لگے۔ جن خاص صنعتوں پر کڑی ضرب پڑ رہی تھی وہ فولاد، دھات اور لنکاشائر کے بنے ہوئے سوتی کپڑے تھے۔ یہ برمنگھم Birmingham کے جوزف چیمبرلین Joseph Chamberlain جن کا خاص تعلق مڈلینڈ Midland اور لنکاشائر Lanca shire کی صنعتوں سے تھا انہوں نے اس تحریک کی باگ سنبھالی۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ برطانیہ کے حریفوں کا مقابلہ کیا جائے اور محنت کش مزدوروں کی حالت سدھاری جائے چونکہ امریکہ برطانیہ کی صنعتوں کو تحفظ کی پالیسی نے مدد دی تھی۔ وہ اس نتیجہ پر پہونچے کہ برطانیہ کی آزاد تجارت کی پالیسی کو ختم کر کے اس کی جگہ تحفظ کی پالیسی اختیار کی جائے اور حکومت برطانیہ کو اس غرض کے لئے

4- Ibid, P.P. 240 and 243.

5- Cited in Strachey. J. op-Cit P. 115.

استعمال کیا جائے کہ برطانیہ کے مال کو ترجیح دینے کی پالیسی قائم کرکے برطانیہ میں تیار شدہ اشیاء کے لئے بازاروں میں وسعت دی جائے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ہوا کہ محنت کش مزدوروں کی حالت سدھارنے کے لئے بھی تدابیر اختیار کی جائیں۔

اس طرح جنگ عظیم کے آغاز کے وقت برطانیہ کے اندر کی اقتصادی حالت تضاد کا شکار تھی۔ اقوام عالم میں ملک کی خوشحالی قابل رشک تھی اور بین الاقوامی معاملات میں برطانیہ عظیم طاقت اور اعزاز کا استعمال اور اظہار کرتا تھا۔ دوسری طرف جبکہ برطانیہ کی اقتصادی حالت سست ہو رہی تھی۔ اس کے حریفوں کی اقتصادی حالت روز افزوں ترقی پر تھی اور برطانیہ کو نہ صرف پچھاڑنے بلکہ اس سے آگے نکل جانے کی کوشش میں تھی۔ وطن کے اندر سماجی اور سیاسی اختلافات کی خلیج وسیع تر ہو رہی تھی۔ جس کا اثر سرمایہ دار، مزدور اور حکومت اور حزب مخالف کے تعلقات پر پڑ رہا تھا۔ ایسے مسائل جیسے کہ عورتوں کی حق رائے دہندگی آئرلینڈ کو ہوم رول عطا کرنا، محنت کش مزدوروں کی اجرت اور اسی طرح کی دوسری باتوں نے عالمگیر بے چینی اور پر تشدد مڈبھیڑ پیدا کر رکھی تھی۔

حکومت برطانیہ کی بیسویں صدی کے آغاز میں جس سماجی حالت کا سامنا تھا وہ اتنے کافی سنگین تھے کہ جن سے پریشانی پیدا ہو سکتی تھی۔ عوام حکمراں طبقہ کی عظیم سہل انکاری، بے جا خود اعتمادی اور آمرانہ غرور کے خلاف رد عمل ظاہر کر رہے تھے۔ جو چیز کہ ان سالوں کو ذہنی بناتی ہے وہ "قبل جنگ کی ابلتی ہوئی بے چینی اور کشمکش ہے۔ اس کی عظیم شدت اور اس کے اضطراب کی فراوانی" جو ایک انقلاب کا پیش خیمہ تھی اور جو بعد کے دس سالوں میں پختہ ہوا۔

ملوکیت کا اخبار جدید

اس اضطرابی کیفیت میں برطانیہ پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ محنت کش مزدوروں کی دردناک حالت میں تخفیف کے لئے حکمرانوں کے ضمیر کو بیدار کیا جائے اور برطانیہ کے باشندوں کو لیکتوں ریز خانہ جنگی سے بچایا جائے۔ جس کا واحد طریقہ یہ تھا کہ نئی زمینیں حاصل کی جائیں جہاں فاضل آبادی بسائی جا سکے۔ اور فیکٹریوں میں اور کارخانوں میں جو اشیاء تیار ہوتی ہیں ان کے لئے نئے بازار بنائے جائیں ۔ جیسا کہ ۔

سسل روڈس (Cecil Rohdes) نے کہا ہے "جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ شہنشاہیت میں روٹی اور کفن کا سوال ہے، اگر تم خانہ جنگی سے بچنا چاہتے ہو تو شہنشاہیت پسند بن جاؤ۔ 6

شہنشاہیت کی توسیع اور سماجی فلاح، یہ تھے دو جڑواں مقاصد جو بہت سے برطانوی مدبرین اور صنعت کے قائدین کے دماغوں پر چھاگئے۔ صنعتی استحکامات کی توسیع کے مطالبات کو تاکہ ان سے صارفین، عوام کی روز افزوں ضروریات کو پورا کیا جاسکے۔ یہ لوگ فوراً منظور کر لیتے تھے۔ حتیٰ کہ اندرون ملک سرمایہ لگانے کو بھی دستیاد جوش سے قبول کر لیتے تھے۔ اگرچہ اس میں ان کو کچھ قربانی بھی اس مقصد کی دینی پڑتی تھی کہ سرمایہ کو باہر لگایا جاسکے۔ جس سے نہ صرف یہ کہ زیادہ منافع ملتا تھا بلکہ اس سے مملکت میں توسیع بھی ہوتی تھی۔ پسماندہ قوموں کی لوٹ کھسوٹ کے مواقع بھی حاصل ہوتے تھے۔ اور دوسری قوموں کے ساتھ مقابلہ اور رقابت کے مراحل میں تیزی آتی تھی۔

لیکن اگرچہ محنت کش طبقوں کو راضی کرنے کی ضرورت تسلیم کر لی گئی تھی۔ جیسے کہ جوزف چیمبرلین نے خیال ظاہر کیا تھا کہ جمہوریت کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ ملوکیت پرستی اور سماجی اصلاح۔ لیکن پھر بھی اس سلسلے میں جو عمل کیا گیا وہ ان طبقوں کی توقعات سے بہت پیچھے تھا۔ یہ صحیح ہے کہ ان لوگوں کی حالت جیسا کہ قیاس کیا جاتا تھا بدتر نہیں ہوئی لیکن پھر بھی ان کی حالت میں جو بہتری ہوئی وہ اطمینان بخش نہیں تھی۔ کیونکہ جس طرح دولت مند بہت زیادہ خوشحال ہوتے چلے جارہے تھے اس کی نسبت سے ان کی حالت قطعی نمایاں نہ تھی۔

جوزف چیمبرلین اور مصلحین کے مصلحین جن کے دماغوں پر بسمارک نے جرمنی میں حکومتی سطح پر سوشلزم کا جو تجربہ کیا تھا اس کا اثر تھا۔ انھوں نے ملوکیت پرستی کے جذبہ کو اندرون ملک ملوکیت پرستی کے اثرات کو بیرون ملک میں فروغ دینے کی تدبیر سوچی تھی کہ تجارتی تحفظات کی پالیسی۔ اختیار کرکے پیداوار کی رفتار تیز کر دیں اور بیرون ملک کی مملکتوں میں یہ جذبہ پیدا کریں کہ ملوکیت کی اشیاء کو دوسری اشیاء پر ترجیح دی جائے اور قوم کے اندر ملوکیت کی شان و شوکت کو دکھا کر ان میں یہ جذبہ پیدا کیا

---

6 - Lenin K. Imperialism, The Highest Stage of Capital-ism, (New York) 1939.

جائے کہ وہ اس پر فخر محسوس کریں اور اس طرح حب الوطنی کے جذبات پیدا ہوں۔ لیکن یہ ضروری تھا کہ آزاد تجارت پر عقیدہ رکھنے والے تاجروں نے محفوظ تجارت کے جو نقصانات بتلائے تھے ان میں سے کچھ پر محنت کش طبقہ کی رضامندی حاصل کی جاتے۔ مثلاً یہ کہ اس سے یہ نقصان ہے کہ قومی دولت میں اضافہ کا وعدہ کرنے، زیادہ اجرت دینے اور سماجی فلاح و بہبود کے طریقہ ہائے کار مثلاً بوڑھوں کو پیش نظر رکھنے سے غذائی ضروریات کی چیزوں کی قیمتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔

چیمبرلین کے خیالات کی وسیع پیمانہ پر نشر و اشاعت ہوئی۔ حتیٰ کہ لبرل جماعت بھی بیسویں صدی کی پہلی چوتھائی تک ملوکیت پسند اور غیر ملوکیت پسند دو طبقوں میں بٹی ہوئی تھی۔ اول الذکر کی قیادت رو زبری گرے ہالڈین اور اسکوئتھ کر رہے تھے۔ اور موخرالذکر کے قائدین ولیم ہارکورٹ کیمبل بیز مین اور لائڈ جارج تھے۔ چرچل جو ایک قدامت پسند باپ کا بیٹا تھا اس نے چیمبرلین کی شہنشاہیت پسندانہ پالیسی کی مخالفت کی اور لبرل پارٹی میں شریک ہوکر وہ گرے کے ساتھ بورڈ آف ٹریڈ کا پریسیڈنٹ ہوگیا۔ گرے کے پاس وزارت خارجہ کا قلمدان تھا۔ ایک نے سماجی اصلاحات کا وعدہ اور دوسرے نے آلات حرب کے اضافہ کا وعدہ کیا۔

سیاسی جماعتیں اور ملوکیت پرستی (IMPERIALISM)

چیمبرلین کے حالات اور ان کے پروگرام کا برطانوی سیاست پر غلبہ تھا۔ لیکن مختلف جماعتوں کا اس کے متعلق مختلف ردعمل تھا۔ تینوں پارٹیوں میں ملوکیت پرستی کے مبلغین موجود تھے۔ کچھ نرم اور کچھ گرم۔ کچھ چیمبرلین کے پروگرام کے داخلی پہلو پر زور دیتے تھے اور کچھ اس کی خارجہ حکمت عملی کے پہلو پر۔ لیکن سب مل کر دونوں میں اشتراک پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اگرچہ اشتراک کے حصول کے مقدار مختلف تھی۔ اسی کے ساتھ کابڈنسٹ Cobdenism کا مخالف ملوکیت گروہ بالکل ختم نہیں ہوا تھا اور آزاد تجارت جنگ عظیم کے ختم ہونے کے قبل کلی طور پر بند نہیں ہوئی تھی۔

قدامت پسند جو ڈزرائیلی Disraeli روایات کے وارث تھے۔ وہ سب سے زیادہ ملوکیت پرستی کے علمبردار تھے۔ انھوں نے 1900 کا الیکشن جسے کاکی Khakhi الکشن کا نام دیا تھا جیت لیا تھا۔ چیمبرلین جو ایک زمانے میں انتہا پسند تھا اب بدل کر منافع بخش سوداگری یعنی اب بنیادی کے احیاء جدید کا حامی ہوگیا تھا۔ یعنی قوم کی طاقت شہنشاہیت اور بین الاقوامی امور سماجی صلاح و فلاح اور اقتصادی ترقیات میں ظاہر ہو 1903 ء میں اس نے محاصل کی اصلاح

برطانوی ملوکیت کے مال کو دوسری اسی قسم کی اشیاء پر خریدار کو ترجیح دینے کی ترغیب اور سوشل
ریفارم کی پالیسی پر عمل درآمد کا آغاز کیا۔ اس ریفارم کا مقصد یہ تھا کہ صنعتی آبادی کے عوام کو مناسب
اجرت پر مسلسل کام ملتا رہے۔ اور یہ وہ ریفارم بھی تھا جس کے ذریعہ محنت کش طبقہ سوشلزم
سے ہٹ کر شہنشاہیت کی وکالت میں لگ جائے اسی سال Tariff Reform League (
(ٹیکس اصلاح محاصل درآمد و برآمد) کی بنیاد پڑی۔ جس نے پارلیمنٹ کے بہت سے قدامت پسند
ممبروں کو اپنی جانب کھینچ لیا اگرچہ کچھ تذبذب میں رہے اور کچھ آزاد تجارت کی پالیسی سے چپٹے رہے۔
لیکن پارٹی کی ملوکیت پرستانہ اور خارجہ پالیسی پر سب متفق تھے۔ اگرچہ پرانے قدامت پرستوں
مثلاً Salisbury (سالس بری) اور Hicks Beach کا نقطۂ نظر نسبتاً جدید قدامت
پرستوں مثلاً کرزن (Curzon) لیٹل ٹن (LYTTELTON) آرتھر بالفور Brodrick Arthur Balfour
اور ویڈہم سے (Wyndham) مختلف تھا۔ شہنشاہیت کے سب سے زیادہ پرجوش اور مجنونانہ
حد تک علمبرداروں میں جن کے عقائد سیاستدانوں کو اپنی جانب راغب کرتے تھے Milner تھا جو
جنوبی افریقہ کی نو آبادی کا حکومت برطانیہ کی جانب سے گورنر تھا۔ نوجوانی میں ایک لبرل کی حیثیت سے
اس نے لبرل خیال کے نوجوانوں کو اپنے لئے ہمدردانہ طور پر اثر پذیر پایا اور ایک ملوکیت پرست کی
حیثیت سے اس نے مملکت برطانیہ کے جشن کا ایک اعلیٰ تخیل پیش کر کے قدامت پرستوں
کی پیش رو جماعت "ٹوری" کے جوانوں میں جوش و جذبہ بھر دیا۔ اس کے ملوکیت پسندانہ پیغام کی
عمرانیت سائنس، جغرافیہ اور تاریخ کے ماہرین اور شعراء نے خوب نشر و اشاعت کی۔ یہ سب
لوگ ملوکیت برطانیہ کے متعلق یہ خیال رکھتے تھے کہ "دنیا کا سب سے بڑا کاروباری نظام" ہے
جس کو اگر مناسب اور فنکارانہ مہارت سے ترقی دیا جائے تو وہ برطانیہ کی اقتصادیات کو بہت
زیادہ فروغ دے سکتا ہے۔ ان کا یقین تھا کہ جتنی نسلوں نے کبھی بھی اس دنیا میں حکمرانی کی
ہے ان سب میں اہل برطانیہ عظیم ترین ہیں۔ اپنی کمزوریوں اور اپنی خوبیوں دونوں کی بنا پر یہ مقدر رہ
چکا ہے کہ تمام دنیا کی آبادی پر ہم پھیل کر چھا جائیں۔" 7
لیبر (مزدور) جو سوشلسٹوں، آزاد لیبر پارٹی اور ٹریڈ یونین والوں کا مجموعہ تھی۔

7- The Cambridge History of the British Empire Vol III, P.247.
(Quotation from Joseph Chamberlain's Speeches).

——— مختلف خیالات کے عناصر سے مرکب تھی، کچھ تو ملوکیت پسندی کے مخالف تھے۔ مختصر انگلستان کے علمبردار جو اس پر مصر تھے کہ برطانیہ کی ملوکیت کو ختم کرکے نوآبادیوں کو اندرونی آزادی دے دی جائے۔ ایک دوسرا طبقہ مثلاً لبرل کا ایسا تھا جو سلطنت (امپائر) کو ایک ٹرسٹ (امانت) تصور کرتے ہیں جو تاریخ نے ان لوگوں کے سپرد کیا تھا کیونکہ اس کے اجزاء جن سے سلطنت بنی تھی اس قابل نہیں تھے کہ وہ امن وامان کے حالات اور انسانی ترقی کو صرف اپنی کوششوں سے قائم رکھ سکیں۔ ایک تیسرا طبقہ تھا جو سلطنت کے وجود کو اس لئے قائم رکھنا چاہتا تھا کہ محنت کش طبقے کے معیار زندگی کو برقرار رکھنے کا یہ ایک آلہ تھی۔

1906ء تک لیبر پارٹی کا پارلیمنٹ پر کچھ بھی اثر نہ تھا۔ لیکن اس سال کے انتخابات میں ان کی تعداد 20 ہوگئی اور ریمزے میکڈانلڈ 1910ء میں چیرمین منتخب ہوا۔ لڑائی کے زمانے میں لیبر کی اہمیت کو تسلیم شدہ ظاہر کرنے کے لئے ہنڈرسن نے کابینہ کے ایک ممبر کی حیثیت سے کام کیا۔ 17-1915ء لیکن جب تک لڑائی ہوتی رہی اس تمام زمانے میں لیبر پارٹی کے ممبران پارلیمنٹ لبرل پارٹی کے کم وبیش محکوم ہی رہے۔

جہاں تک ہندوستان کا سوال تھا پارٹی کے کل ممبران ایک رائے پر متفق نہ تھے۔ اگرچہ سوشلسٹ پارٹی کے ممبران کی اکثریت شہنشاہیت اور فوجی نظام کی مخالف تھی۔ اور بین الاقوامیت اور آزادانہ تجارت کی حامی تھی لیکن کافی تعداد میں ایسے سوشلسٹ لیڈر اور انشاء پرداز تھے جو نیشنلزم اور امپیریلزم کے عقائد کے حامی تھے۔ ان میں فیبین سوسائٹی (اشتراکیین انگلستان کی انجمن) کے چند ممبران نمایاں طور پر ممتاز تھے۔ وہ وطن کے داخلی معاملات کا حل تو سوشلسٹ طرز سے کرنے پر زور دیتے تھے۔ یعنی صنعتوں کا قومیانہ، قومی دولت کا تقسیم کرنا وغیرہ وغیرہ۔ لیکن جہاں تک خارجہ پالیسی کا تعلق ہے ان کا موقف وہی تھا جو روزبری (ROSEBURY) نقطۂ خیال کے مرید لبرل شہنشاہیت پسندوں کا تھا۔

اس سوسائٹی کے شہنشاہیت پسند گروہ کے ممتاز لیڈران سڈنی SIDNEY اور بیٹرس وب Beatrice Webb، برنرڈ شاہ (BERNARD SHAW) اور ویلس Wells تھے۔ فیبین سوسائٹی کے ممبران کا خیال تھا کہ پسماندہ اور نااہل عوام کو یہ اجازت نہ ملنی چاہیے کہ وہ تہذیب کی ترقی میں رکاوٹ ڈال سکیں۔ ان کی تمنا یہ تھی کہ مملکت برطانیہ "ایک مضبوط اور خود شناس طاقت" بن کر ابھرے۔ جس کا پالن ایسا ہو کہ وہ وسائل سے مستعدی کے ساتھ نفع اٹھائے۔ اور یہ طاقت

اس لئے مستقل طور پر متحد رہے تاکہ " نہ صرف دولت مشترکہ برطانیہ دبرٹش کامن دیلیتھ) کے عام مفاد میں بلکہ تمام مہذب سوسائٹی کے مفاد میں برطانوی اجتماعی اصول کے معیار کو قائم رکھنے کے لئے اہم تھے" وہ اقوام مفتوحہ کے لوگوں کو حق دینے پر سخت مضطرب تھے۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ایسا کرنے سے ترقی کے راستے میں رکاوٹ پیدا ہو سکتی ہے۔ ملوکیت کی اکائی جتنی بڑی ہوگی اتنی ہی زیادہ اس کی بہتر کارکردگی ہوگی ۔/8

دلسن بوریے سک بارے میں ہالے رہنر ہمارا نے لکھا ہے" وہ لوگ جو شہنشاہیت کے بارے میں مکمل اعتقاد رکھتے تھے اور جو ایک متوسط درجہ کے اجتماعی نظام کے اندر اس پر نگاہ رکھتے تھے کہ ایک ایسی حکومت قائم ہو جو قومی بھی ہو اور افواج کی بالا دستی پر بھی قائم ہو۔ ان لوگوں نے لبرل اصولوں اور آزاد تجارت کے لئے نفرت کے سوا اور کچھ بھی محسوس نہیں کیا۔ ہو برنرڈ شا نے کلیفورڈ رن ہال میں تقریر کرتے ہوئے اس کی رائے میں چھوٹی چھوٹی دنیا میں Anachronistic) ہیں اور ایک بڑی طاقت کے لئے لازم ہے کہ شعوری یا لاشعوری طور پر تہذیب کے مجموعی مفاد میں ان پر حکومت کرے ۔/9 اس پر شاہ مخالفین ملوکیت سے پارٹی کے اندر رائے شماری اور انتظامیہ میں الکشن دونوں محاذوں پر نبرد آزما ہوا اور عظیم اکثریت سے کامیابی حاصل کی۔ اس نے ایک حہ پمفلٹ لکھا۔ جس کا اصول تھا فیبین سوسائٹی کے اصول اور سلطنت" یہ پمفلٹ فیبین (اشتراکی) پارٹی کے خیالات کا مستند ترجمان بن گیا ۔ ے برائر (Mc Briar) کی رائے میں "جو خیالات فیبین سوسائٹی کے اصول اور سلطنت نامی پمفلٹ میں ظاہر کئے گئے ہیں وہ فیبین صاحبان کو شہنشاہیت پسندوں کی صف میں شمار کئے جانے کے قابل قرار دیتے ہیں نہ کہ اس کی مخالفت میں . . .

یہ بالکل ظاہر ہے کہ فیبین اس کو قطعی جائز سمجھتے تھے کہ ایک برتر تہذیب والا ملک ایک پسماندہ ملک پر قبضہ کرے" 11 فیبین سمجھتے تھے کہ ہندوستان پارلیمانی اداروں

---

8 - Cambridge History of British Empire Vol III, P. 349.

9 - Halevy E. A History of British People. Vol III, P. 366.

10 - Mc Briar. B.M. Fabian Socialism and English Politics 1884 - 1948, P. 124. 11 - Ibid, P. 126

کو سنبھالنے کی اہلیت نہیں رکھتا ہے۔ لیکن اس کے موید تھے کہ ہندوستانیوں کو تعلیم کی سہولتیں دی جائیں۔ رفتہ رفتہ منزل بہ منزل سول ملازمتوں کو ہندوستانی بنا دیا جائے۔ قانون ساز کونسلیں جن کے اختیارات محدود ہوں، ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہے اور گاؤں کی پنچایتوں میں خود مختار حکومتوں کا جو پیدائشی عنصر شامل ہے اسے ترقی دی جائے۔/12

ولس (WELLS) نے بھی لبرل پارٹی کے موضوعہ "اہلیت" کو تسلیم کر لیا وہ گورنمنٹ میں دورنگی کا موید تھا۔ ایک ایسی آواز تھی کہ جس میں جوزف چیمبرلین اور ان کی حمایت کے لوگ بھی شریک ہوگئے۔ اس طرح شہنشاہیت پسند وں لبرل گرے (GREY) اور ہالڈین (HALDANE-) اور قدامت پسند لیڈر آرتھر بالفور کی جانب سے ایک نئی پارٹی 1902ء میں عالم وجود میں آئی جس کا نام Coefficients (دعلم جبر) رکھا گیا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ ایسے لائق لوگوں کے ایک گروہ کو یکجا کیا جائے جن کے عقائد یکساں اور مقاصد مشترک ہوں تاکہ امپریل ملوکیت پسندی پالیسی کی تمام تفصیلات کو مکمل کیا جائے۔

لیو پالڈ امیری LEOPHALDAMERY (LEOPHALDAMERY) جو بعد کو وزیر ہند ہوا (45-1940) اسی گروہ کا ایک فرد تھا۔ اس گروہ کا دوسرا شخص تھیوڈر و مارلین Theodoremaurison تھا جس نے محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج علی گڑھ کے پرنسپل کی حیثیت سے ہندوستان کی سیاست میں اہم کردار ادا کیا۔ دوسرے ممتاز ممبران میکنڈر (MACKINDER) ماہر علم جغرافیہ۔ ہیونس (HEWNES) لندن اسکول آف اکنامکس (مدرسہ اقتصادیات لندن) کے ڈائریکٹر برٹرانڈ رسل فلسفی تھے۔

سوشلسٹ پارٹی والے جو شہنشاہیت پسندانہ خیالات رکھتے تھے مثلاً RAMSAY MACDANALD (ریمزے میکڈانلڈ) اور بارنس (BARNES) یہ لوگ مخالفین ملوکیت پسندی کے خلاف تھے۔ (H.G. WELLS) (ایچ جی ولس) نے اپنا رخ سماجی اصلاحات کی جانب موڑا اور اہلیت کے فلسفہ کا علم بلند کیا۔ اپنی کتابوں۔ aZinn
Anticipations (1901) Mankind in the Making (1903) میں انھوں نے سوسائٹی (جماعت) اور افراد کے مسائل پر بحث کی تاکہ بظاہر ہو کہ کس طرح ایک معیاری شہری عالم وجود میں لایا جاسکتا ہے۔

---

12 - Ibid . P. 129.

لبرل اور قدامت پسند

1906ء میں لبرل برسر اقتدار آئے اور جبکہ لڑائی شروع ہوئی تو یہ لوگ گورنمنٹ کی حکومت کے افضل ترحصہ دار تھے۔ امپریلیزم کے مقاصد کے بارے میں پارٹی میں اختلاف آراء تھا۔ بزرگ رہبران جو کیمبل Campbell، بینرمن Bannerman، ہرکورٹ Harcourt اور مارلے Morley، پر مشتمل تھا۔ کابڈن Cobden کے اصول کا پابند تھا یعنی آزاد تجارت۔ بین الاقوامی اتحاد، امن و امان، تخفیف اسلحہ وغیرہ) لیکن بعد کی نسل والے کم عمر لوگ جن کے دماغوں میں جرمن فلسفی ہیگل کا علم کلام سرایت کر گیا تھا یعنی جو مغرب اور مشرق کے ان موافق و مخالف مقالات سے جن کی یونان اور برطانوی فلسفی Bosanquet نے اشاعت و تبلیغ کی تھی، سے متاثر تھے۔ وہ روزبری کے لبرل امپریلیزم، لبرل جماعت کے اصول کی شہنشاہیت کے پیرو تھے۔ ان میں ممتاز گرے Gray، اسکویتھ (Asquith) اور ہالڈین Haldane تھے۔

یہ لوگ قدامت پسندوں کے اصول سلطنت کے مخالف تھے کیونکہ یہ لوگ آزاد تجارت پر عقیدہ رکھتے تھے اور محفوظ تجارت کو رد کرتے تھے۔ روزبری شہنشاہیت کے تخیلات کی تبلیغ کی یہ بنا قرار دیتے تھے کہ "شہنشاہیت اپنے مزدوروں اور محنت کش طبقے کے تمام حلقوں کو ایسے تحفظات کے مواقع فراہم کرتا تھا جو دنیا کا دوسرا ملک پیش نہیں کر سکتا تھا" لبرل صاحبان کے نزدیک شہنشاہانہ نظام سماجی فلاح کے لئے ایک ایسا حربہ تھا جس کے بغیر چارہ ہی نہیں تھا۔ اس لئے ایک ایسا مرحلہ تھا جس کے لئے جینا اور جس کے لئے مرنا قابل قدر ہے۔ لیکن وہ تسلیم کرتے تھے کہ "سمندر پار برطانیہ کا جو رویہ اپنی ذمہ داریوں کے بارے میں ہے وہ طاقت کا مظاہرہ نہیں بلکہ ایک امانت کا نظم و نسق ہے" [13]

ان مقاصد کے حصول کے لئے شرط اول یہ تھی کہ ایک شاہانہ نسل کی پرداخت کی جائے یعنی ایسی نسل جو مضبوط، محنتی، اور شیر دل" ہو اور اس کے لئے صحت تعلیم اور اعلیٰ معیار زندگی کے لئے سماجی اصلاحات لانے کی ضرورت تھی۔ اور صرف ایک لائق حکومت کے ذریعہ سلطنت کے وسائل کو ترقی دی جا سکتی تھی۔ اور انہیں برطانیہ کے عوام کے استعمال۔

13- Philips. H. The Liberal outlook, p. 187.

میں لایا جا سکتا تھا۔

چنانچہ قابلیت کا عقیدہ لبرل جماعت کے لئے ایسا الفاظ بن گیا جس سے اس کا نصب العین ظاہر ہوتا تھا اور روزبری کے پریمئر شپ کے زمانے میں "لبرل لیگ" اس غرض سے قائم کی گئی کہ ہر محکمہ میں قومی معیار کی اہلیت کو فروغ دے۔ یہ خیال پسند کیا گیا اور قدامت پرست اور سوشلسٹ دونوں نے اسے قبول کر لیا۔

لڑائی کے زمانے میں صدی کے پہلے دس سال کے اندر اونچی چوٹی تک پہونچنے کے بعد سلطنت کے تخیل میں اعتدال آ گیا تھا۔

بہر حال سلطنت دو حصوں میں منقسم ہو گئی۔ سفید سلطنت اور غیر سفید سلطنت۔ سفید سلطنت میں یورپین نسل کے اولاد اور اعزہ بستے تھے۔ یہ ایک آزاد سلطنت تھی۔ جس کا دعویٰ تھا کہ ان کی حکومت اسقف اعظم کی حکومت کے مساوی ہے۔ برطانیہ نے ان کی وفاداری اس انعام سے قائم رکھنی چاہی کہ ان کو یہ حق دیا ہے کہ ان مملکتوں میں درآمد و برآمد کے مال کا ٹیکس نسبتاً کم ہوگا اور وفاقی طرز کی حکومت میں ان کا درجہ مساویانہ ہوگا۔ لیکن مملکتیں ان ترقیات کے نیچے دب نہیں گئیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ ان کو اپنی قومی صنعتوں کی حفاظت کا حق مرکزی سلطنت کے خلاف بھی فروغ دینے کا حق ملے۔ وفاقی طرز کی حکومت کا اصول ان کو پسند نہیں آیا۔ سفید مملکتوں کے بارے میں تینوں برطانوی پارٹیوں میں کوئی انتہا پسندانہ اختلاف نہ تھا۔

VIII قدامت پرست پارٹی اور ہندوستان

غیر سفید مملکت میں حالات مختلف تھے۔ غیر سفید باشندے جن میں باشندگان ہندوستان بھی شامل تھے۔ ان کی تقریباً 90 فیصدی آبادی کمتر نسل کی اور قانون سے بے تعلق تھی یہی وہ لوگ تھے جن کو مخصوص قوم، یعنی انگریزوں کے مفاد کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ کرزن جو سلطنت برطانیہ کے افسران اعلیٰ میں بڑا شہنشاہیت پسند اور قدامت پرست پارٹی کا ترجمان تھا اس نے یہ اعلان کیا کہ:-

"یہ انگلستان کے لئے خوب ہندوستان کے لئے خوب تر اور تہذیب کی عام ترقی اور فروغ کے لئے خوب ترین ہوگا۔ اگر شروع ہی سے یہ سمجھ لیا جائے ..... ہمارا قطعی طور پر ذرا بھی ارادہ نہیں ہے کہ ہم اپنے ہندوستان پر کے مقبوضات کو کبھی بھی ترک

کردیں اور یہ انتہائی غیر اغلب ہے کہ اس طرح کا کوئی ارادہ ہماری آئندہ نسلوں میں سے کوئی کرے ،

ہندوستان سے واپس بلائے جانے کے بعد ان کے اعزاز میں LONDON (انجمن سیاحین لندن) SOCIETY OF PILGRIMS نے انہیں ایک عشائیہ ۱۵ اپریل ۱۹۰۶ء کو دیا وہاں LORD GEORGE HAMILTAN (لارڈ جارج ہملٹن) کی صدارت میں لارڈ کرزن نے ایک تقریر فرمائی - لارڈ جارج ہملٹن کے جام صحت کی تجویز کا جواب دیتے ہوئے ہندوستان کے سابق وائسرائے نے کہا وہ لوگ (یعنی ہندوستانی) نہ ایک قوم ہیں نہ ان کی ایک زبان ہے نہ ایک نسل ہے نہ ایک مذہب - یہ لوگ ایک براعظم ہیں ایک قلمرو بلکہ ایک الگ تھلک دنیا ہیں - 14/

آگے چل کر انہوں نے کہا ، ہم نے ہندوستان میں جو تجربہ کیا ہے وہ خواہ کچھ بھی ہو لیکن اس کے بدلے میں دنیا جو کچھ بھی پیش کرے اس سے دست بردار نہیں ہو سکتے اور بہرحال ہمارا ہاتھ دنیا کی نبض پر رہا ہے - انسان کو جو بڑے بڑے کام تفویض کیے جا سکتے ہیں - اس میں ہم نے اپنا ایک کردار ادا کیا ہے - خواہ وہ کتنا ہی معمولی ہو - 15

لارڈ ملنر کے اعزاز میں دیے ہوئے ایک عشائیہ کے بعد کے ایک اور موقع پر کرزن نے اعلان کیا جس سفر کو ہمارے پیش روؤں نے شروع کیا تھا ہمیں اسے جاری رکھنا ہے - ہم کو نظم و نسق کے سامنے جوابدہ ہونا ہے - اور یہ ایک شہنشاہیت کا نظم و نسق ہے جو زمانہ کے مد و جزر کے ساتھ زمانہ سابق سے مابعد تک کے لئے ہے - 16/

کرزن نے اسی بات کو دہرایا جو جوزف چیمبرلین نے بارہ سال پہلے کہا تھا - اپنے عظیم ماتحت مملکت ہندوستان پر ہماری جو گرفت ہے ہم اسے کبھی ڈھیلی نہیں کریں گے ، یہ ماتحت مملکت ہمارے تمام گاہکوں میں سب سے بڑی اور سب سے زیادہ قیمتی ہے - 17/

لبرل پارٹی جس سے ہمارے ملک ہندوستان کے کچھ لیڈران مثل گوکھلے بڑی

14:- Curzon :- Lt Marquis, The Subjects of the Day P 37

15:- Ibid P. 39

16:- Ibid P. 5

17:- Chamberlain J, Speech on June 22, 1894, Vide Dobb M Studies in the development of Capitalism P311 note 2

بڑی امیدیں رکھتے تھے۔ وہ امانت کے اصول کا یا حلت لئے ہوئے تھی۔ برطانوی حکمران نہ صرف امن و امان کے پاسبان تھے بلکہ وہ جاہل اور پسماندہ عوام کی بہبود کی حفاظت کے لئے مامور من اللہ تھے۔

1906 میں جان مارلے وہ انتہا پسند مفکر جیسے لبرل پارٹی اپنی آرا کے اظہار کے لئے نہایت موزوں ترجمان تصور کرتی تھی اور جسے ہندوستان کے تعلیم یافتہ لوگ اپنا علاخیال کرتے تھے وہ وزیر ہند مقرر ہوے۔ امیدیں بہت بلند ہوگئیں۔ ہندوستان کے مفاد کے لئے اس سے زیادہ موافق بات کیا ہو سکتی ہے کہ وہ شخص حکومت کا سربراہ ہو جس نے انقلاب فرانس کے رہنماؤں کی زندگی ہمدردانہ انداز میں لکھی۔ گلیڈسٹون جیسے آزاد خیال مدبر اور مخالف ملوکیت مفکرین جیسے برک اور کابڈن کے سوانح حیات بطرز دوستانہ تحریر کی۔ جو آئرلینڈ کو ہوم رول دیے جانے کا موید اور جنوبی افریقہ میں بوئروں کے خلاف جنگ کرنے کا مخالف تھا۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود مارلے نے ہدایت خود امانت کے اصول کا حامی تھا۔ اس نے لارڈ منٹو سے کہا کہ انگریزی سیاسی اداروں کو ہندوستان میں رواج دینے کے رواج کے بارے میں میں مشکوک ہوں ۔/18

1909ء میں دارالامراء میں تقریر کرتے ہوے انہوں نے پرزور انداز میں کہا کہ ریفارم ایکٹ کا منشا صرف اس قدر ہے کہ جو لوگ ہندوستان میں نوآبادیاتی قسم یا جس طرز کی جس سلف گورنمنٹ یا خود اختیاری کی امید رکھتے ہیں ان کو بتلا دیا جائے کہ وہ اس خواب کا دیکھنا ترک کر دیں اور برطانوی نظام میں تعاون کے حق پر قانع ہو جائیں ۔/19

1912ء میں لبرل ریاستی وزیر کریو د CREWE (نے دارالامرا کو یقین دلایا کہ کرزن اور لینڈس ڈاون کے یہ خطرات کہ ہندوستان میں وفاقی طرز کا ہوم رول رائج ہونے والا ہے۔ قطعی بے بنیاد ہیں کیونکہ حکومت کا کوئی ایسا ارادہ نہیں ہے /20

لیکن بہرحال جب 1914ء میں عالمی جنگ شروع ہوئی تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کے بارے میں از سر نو غور و فکر ہونے لگی۔ 1915ء میں لبرل وزیر اعظم اسکوتھ اور نائب وزیر را برٹس نے تسلیم کیا ،، اب آئندہ ہندوستان کے مسئلہ پر مختلف

18:- Morley's Recollections vol II P172
19:- H.L. Debates, 5th series Vol II Cols 118-119
20:- Ibid, Cols 243-44

نقطۂ نگاہ سے سوچا جائے گا۔" 21/

ایڈون مانٹیگو مقیم اسکوئیتھ نوجوان اپنے لیڈر سے غیر مطمئن ہو گیا اور لائڈ جارج کے گروہ میں شریک ہو گیا۔ 12 جولائی کو اس نے اس جنگی کارروائی کی رپورٹ پر حکومت ہند نے مقدونیہ میں کی تھی ایک جلی کٹی تنقید کی۔ لیکن اسی کے ساتھ انھوں نے یہ بھی واضح کر دیا کہ ان کی قطعی رائے ہے کہ ہندوستان کو ہوم رول دینا ناممکن ہے۔ انھوں نے لکھا کہ قبل اس کے کہ وہ منزل آئے بہت سے سال بلکہ بہت سی نسلیں ختم ہو جائیں گی اور ہندوستان کے مختلف حصوں کو مختلف رفتار سے چلانا ہو گا" 22/

اس اصول کو لبرل پارٹی کے وزیر اعظم لائڈ جارج اور ان کی کابینہ کے قدامت پرست ساتھی وزیروں نے بالاتفاق تسلیم کر لیا۔ آسٹن چیمبرلین نے اسے برکتیں دیں۔ بھلا کوئی برطانوی پارٹی ایسے معصوم کاروبار کی کیسے مخالفت کرتی جسے کہ "جہاں ہیں گورنمنٹ کے کام کی۔ یا ہندوستان میں برطانوی حکومت کے "آخری خاتمہ" کی جس منزل تک پہونچنے کے لئے بہت سی نسلوں کا وقت لگنے والا تھا۔"

پھر بھی کرزن جس نے کابینہ کے ایک ممبر کی حیثیت سے تو اتفاق کیا تھا لیکن پھر بھی مذبذب تھے۔ انھوں نے مانٹیگو سے پوچھا "یہ کیوں ضروری ہے کہ ایسے معاملے میں انتہائی تیز رفتاری سے قدم اٹھایا جائے جو انقلاب لانے والا ہے۔ اور وہ انقلاب کتنا عظیم ہو گا۔ اس کا اندازہ اس ملک کے ہزار آدمیوں میں سے ایک کو بھی نہیں ہے اور جو رفتہ رفتہ رفتار کے مزید تیز ہوتے ہوتے زینہ بہ زینہ سلطنت برطانیہ کی آخر کار تباہی کا موجب ہو گا" 23/

لیکن بہر حال چند ممبران دارالامرا مخالفت کے باوجود یہ سمجھتے تھے۔ "گزشتہ بیس سال کے اندر دنیا نے حرکت ہی نہیں کی ہے۔ اور گورنمنٹ آف انڈیا ایک ایسی چیز ہے جسے بلا کسی تبدیلی یا ترمیم کے لوگ ہمیشہ تک برداشت کرتے رہیں گے۔ کرزن نے اپنے آپ کو اس پر راضی کر کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1919 کو منظور کرا کے قانون کی کتاب میں

---

21 - M.C Debates, 5th Series Vol. 68, Col 1357.

22 - Waley. S. D. Edwin montegue, P. 131.

23 - Ibid 171, Quotes Curzon's letters to Montegue july 23, 1918

داخل کر دیا۔

لیکن مانٹیگو کی کوششیں بیکار ثابت ہوئیں۔ جو آئینی تبدیلی لائی گئی تھی ان کے اثرات ان جابرانہ حکمت عملیوں سے جن سے رولٹ ایکٹ عالم وجود میں آیا۔ اور ان خوفناک چیرہ دستیوں سے جو آخر کار 13 اپریل 1919 کو امرتسر کے قتل عام پر منتج ہوئیں کالعدم ہو گئے۔ گورنمنٹ نے جن ظالمانہ کارروائیوں کو جاری کیا۔ اور جس طرح باشندگان ملک پر ذلتوں کا انبار لگایا۔ ان کا قدرتی نتیجہ یہ ہونا ہی تھا کہ غصے کے جذبات پیدا ہوں۔ مسلمان خصوصیت سے اس بات پر برافروختہ تھے کہ ترکی کی مملکت کو پارہ پارہ کر دیا گیا تھا۔ اور خلیفہ کی مقدس عربی ریاستوں کو ان کے عیسائی فاتحین میں بانٹ دینے کی دھمکی دی جا رہی تھی۔ ان حالات میں حکومت اور عوام کے درمیان تعاون کی امید قطعی فضول تھی۔

لبرلوں نے ہندوستان کے مسئلہ کا جو حل تلاش کیا تھا اس کا ناکام ہونا پہلے ہی سے واضح تھا۔ نیشنلسٹ طبقہ نے اس کو ناقابل اطمینان قرار دے کر رد کر دیا تھا اور ماڈرنیوں نے کوئی خاص جوش ظاہر نہیں کیا۔ ہندوستان کے لیڈران کے مطالبات اور برطانیہ حکومت کی جانب سے ان پر ردعمل میں جو خلیج حائل تھی اس کے تنگ ہونے کے کچھ امکانات نظر نہیں آتے تھے۔ ٹیلر نے دستوری حقوق کی رفتار کی کم مائیگی کا ان الفاظ میں تذکرہ کیا ہے "صوبوں کے لئے جدید آئین مرتب کئے گئے۔ بس ان کے نام خوبصورت تھے۔ الکشن تو بہت سے ہوئے لیکن سیاسی طاقت بالکل منتقل نہیں ہوئی یعنی ایک بھوکے انسان کے سامنے صرف پرسکون زندگی کی تصویریں پیش کی گئیں۔" 24/

جنگ کے نتائج

لڑائی 11 نومبر 1918 کو اس وقت ختم ہوئی جب عارضی صلح نامہ پر دستخط ہو گئے۔ طویل باہمی گفتگو جاری رہی اور ورسیلز (Versailles) کے مقام پر جو صلح نامہ مرتب کیا گیا اس نے شکست خوردہ ممالک پر ایسے قوانین بنائے جن سے تصادم میں اضافہ، مفاد کے ٹکراؤ اور سیاسی انقلاب کے ایک نئے دور کا آغاز کیا۔

اگرچہ برطانیہ کی مالیات ہل گئی تھی مگر ابھی ٹکڑے ٹکڑے نہیں ہوئی

24- Taylor, A.J.P. Oxford British History 1914-45, P. 152.

تھی۔ جنگ سے برطانیہ نکلا تو زخمی ضرور تھا لیکن اس کی شباہت اپنے اتحادیوں یعنی فرانس اور روس اور اپنے حریف دشمن جرمنی اور اٹلی سے بہتر تھی۔

لیکن بہرحال یہ وہ زمانہ تھا جب وطن کے اندر مواقع کھو دیئے گئے تھے۔ اور وطن کے باہر دھکے لگ رہے تھے۔ طبقاتی تصادم ترقی پر تھے۔ بے روزگاری بڑھ رہی تھی۔ اور اعتماد گھٹ رہا تھا۔ اور لوگ جس دھوکے میں مبتلا تھے اس کا پردہ چاک ہونے میں زیادتی ہو رہی تھی یعنی "دو مصیبت کے زمانوں کے درمیان یہ ایک سانس لینے کے وقفہ کا زمانہ تھا۔"

جنگ نے برطانیہ کی اقتصادیات پر دو طرح سے اثر ڈالا۔ اول تو ان کے صنعتی کارخانے جو جنگ کی اغراض کے لئے استعمال ہو رہے تھے ان کو پھر امن کے اغراض کی جانب منتقل کرنا تھا۔ اسی کے ساتھ ان کی اشیاء کی تیاری بالخصوص دو طبقوں یعنی کپڑے اور کوئلہ میں سنگین حد تک گھٹ گئی تھی۔ اور اس طرح جو نقصان ہوا تھا اس کی تلافی کرنی تھی۔ اس حد تک جدید صنعتوں مثل الیکٹرسٹی کے سامان، ہوائی جہاز، خودکار مشینوں اور کیمیائی سامانوں نے پورا کر دیا۔ خوراک کی اشیاء اور کچے مال کی قیمتیں بہت زیادہ گر گئیں اور اس کی نسبت سے مشینوں کے تیار شدہ مال کی قیمت نہیں گھٹی ان دو باتوں نے بھی صنعت اور محنت کش طبقہ کو فائدہ پہونچایا۔ اس لئے جو نقصان جہازرانی اور قومی سرمایہ میں ہوا وہ جلد ہی پورا ہو گیا۔

دوسرے جنگ نے دنیا کی اقتصادیات کو بالکل پارہ پارہ کر دیا۔ بین الاقوامی اقتصادی نظام مفلوج ہو گیا تھا اور غیر ملکی تجارت کا شیرازہ درہم برہم تھا۔ برطانیہ کی قومی بچت اور بین الاقوامی فاضل مقدار کم ہو گئی تھی۔ برطانیہ جس کی مالیات کا انحصار بیرون ملک کی تجارت پر تھا وہ بیرون ملک کی بہت سی بازاریں کھو چکا تھا۔ کچھ ممالک جہاں یہ تجارت کیا کرتے تھے جھگڑے میں گرفتار تھے۔ کچھ نے اپنی خود صنعتیں قائم کر لی تھیں اور برطانیہ سے مال منگانا کم کر دیا تھا۔ ان سب باتوں کے علاوہ نئی اور آزاد ریاستیں [illegible] میں آ گئی تھیں۔ جو برطانیہ کی تجارت کی ترقی میں حائل تھیں۔ ممالک متحدہ امریکہ اور جاپان [illegible] کی بدترین بربادیوں سے بچ گئے تھے۔ وہ مواقع سے فائدہ اٹھا کر صنعتوں کی رقابت کے میدان میں اتر آئے تھے اور طاقتور [illegible] بن گئے تھے۔

اس طرح 1918 میں برطانوی درآمد جس میں دوبارہ بھی مال بھیجا شامل [illegible] 1913 سے 63% فیصد کم ہو گیا تھا اور درآمد 27% فیصد کم ہوا تھا۔ اس کے برخلاف ممالک متحدہ امریکہ کی بیرونی تجارت 20% فیصدی اور جاپان کی 75% فیصدی اسی زمانے

میں بڑھ گئی تھی۔

جس طرح زمانہ گزرتا گیا یہ حالات اور ترقی کرتے گئے۔ دنیا کی برآمدات کے میدان میں برطانیہ کا حصہ 1913 کے تیرہ سے گھٹ کر 1929 میں صرف بارہ فیصدی رہ گیا۔ برطانیہ نے 1913 میں اپنی تیار شدہ اشیاء کا 30% ، 1913 میں بیرونی تجارت پر منتقل کیا۔ اور 1929 میں صرف 27% فیصدی۔ ان سالوں میں برطانیہ کے کل تیار شدہ مال کی قیمت 16% فیصدی کم ہو گئی۔

بیرونی تجارت پر برا عظم کے ممالک میں [illegible] ترقی کر جانے کا بھی اثر پڑا تاوان جنگ اور بیرونی ممالک کو قرضہ جات کی ادائیگی اور وصولی کے مسائل نے مخالف اثر ڈالے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ برطانیہ کی بیرون ملک تجارت پر زوال آ گیا۔ صرف کوئلہ کی برآمد جو 1926 میں 82 ملین ٹن تھی وہ گھٹ کر 1930 میں 70 ملین ٹن رہ گئی۔ اور کپڑے کی برآمد 105 ملین سے 86 ملین ہو گئی۔

سرمایہ کا بیرون ملک لگانا بھی کم نفع بخش ہو چکا تھا۔ قلیل المدت مالیات کا روزگار رو بہ زوال ہو گیا اور قلیل المدت قرضے تیزی کے ساتھ گر گئے۔

1913	£ 177	MILLION
1930	£ 120	"

پیداوار کی کمی کا روزگار پر برا اثر پڑا۔ لڑائی کے پہلے بے روزگاری 6% فیصدی تھی لیکن 1921 میں یہ بڑھ کر 16.2 فیصدی ہو گئی۔ اور 1922 سے 1929 تک اوسطاً 12% فیصدی یا یہ کہ قریب دس لاکھ آدمی بے روزگار ہو گئے۔ جہاز رانی، انشورنس اور سرمائے کی ملازمتوں میں برطانیہ دنیا پر چھایا ہوا تھا۔ اور یہی پوزیشن برابر قائم تھی لیکن لڑائی ختم ہوتے ہوتے یہ حالت بدل رہی تھی۔

برطانیہ کی اہمیت دنیا کے سب سے بڑے مہاجن ملک ہونے اور اہم پیداوار کے لئے تمام دنیا کی سب سے بڑا اور کھلا ہوا آزاد تجارت کا بازار ہونے اور دنیا کے اقتصادی نظام کا مرکز ہونے کے بارے میں گھٹ گئی۔ اپنی پیداوار کو وسعت اور اپنی صنعتوں کو فروغ دے کر اب ممالک متحدہ امریکہ نے خاص مہاجن ملک کی حیثیت برطانیہ کی جگہ حاصل کر لی تھی۔

اس طرح صنعت کی نمو میں گراوٹ، دنیا کی تجارت میں جو حصہ تھا اس

میں کمی، درآمد میں ترقی اور بیرونِ ملک میں سرمایہ لگانے سے جو آمدنی ہوتی تھی اس میں کمی اور برطانیہ کی تابع مملکتوں اور نوآبادیوں میں صنعتوں کے نمو اور ان کی ترقی نے برطانیہ کی اقتصادی طاقت کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ جس علاج کو اس کے مداوا کے لئے استعمال کیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ برطانیہ پھر سونے کے سکے کی جانب پلٹ آیا۔ لیکن اس کے نتائج بالکلیہ نفع بخش ثابت نہیں ہوئے۔

قومی آمدنی کے گھٹ جانے اور بے روزگاری کے ترقی کر جانے اور گھن گرج اور سرد بازاری کا ایک دوسرے کے بعد پیہم نمودار ہونے کے تکلیف دہ ظہور نے نہایت اہم سماجی اور سیاسی نتائج پیدا کئے۔ جنگ کے جن مقاصد کا اعلان کیا گیا تھا ان میں ایک یہ بھی تھا کہ جمہوریت کو فروغ دیا جائے لڑائی کے ختم ہوتے ہی باشندگان برطانیہ حکومت کے نظم و نسق میں اپنے حصہ اور جن تکلیفات سے وہ دوچار ہوتے تھے ان کے معاوضہ کا مطالبہ کرنے لگے۔ لڑائی ختم ہونے کے بعد پولیس اور فوج کو ان اسٹرائیکوں پر قابو پانے میں تنگ ہونا پڑا۔ جو ایک وبا کی طرح محنت کش طبقہ کوئلہ کی کان کے مزدوروں، ریلوے ملازمین، جہاز بنانے والے صنعت کاروں وغیرہ میں پھیل گئی تھی۔

ٹریڈ یونینیں اپنے کو اس نو منظم کر رہی تھیں کہ اگر ضرورت ہو تو اپنے مطالبات کو منوانے کے لئے سیاسی اقدامات کئے جائیں۔ 1914 اور 1920 کے درمیان ان کے ممبروں کی تعداد دونی ہوگئی۔ انقلابی خیالات کسی حد تک روس میں بالشویک انقلاب کے زیر اثر پھیل گئے۔ 1926 میں جو عام اسٹرائیک ہوئی اس کی وجہ مزدوروں کے درمیان بے چینی تھی۔ دوسری جانب مالکان نے بھی مزدوروں کی بغاوت کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنے آپ کو منظم کرنا شروع کیا۔

انگریزوں کی قوم جو لڑائی سے پہلے دو حصوں، شہری اور دیہاتی میں بٹی ہوئی تھی وہ اب زیادہ متحد ہو رہی تھی لیکن اونچے اور نیچے کا فرق اب بھی خاصا نمایاں تھا۔ حکمراں طبقہ یعنی وہ لوگ جو پبلک اسکولوں اور آکسفورڈ اور کیمبرج کی قدیم یونیورسٹیوں میں تعلیم پاتے تھے اب بھی بڑا سیاسی اثر رکھتے ہیں۔ ایک نیا فلسفہ جو صنعت اور تجارت کو اساس قرار دیتا تھا وہ پرانی امارت پسندی کی جگہ لے رہا تھا۔

متوسط طبقہ تعداد اور طاقت دونوں میں بزمانہ جنگ ترقی کر گیا تھا اور سول ملازمین نظم و نسق میں زیادہ تر اختیارات جانے لگے تھے۔

دوسری جانب محنت کش طبقہ ایک نئی تبدیل شدہ حالت سے دوچار تھا۔

اقتصادی نامساوات میں کمی آگئی تھی۔ اجرتیں بڑھ گئی تھیں اور کام کے اوقات کے گھنٹے کم ہو گئے تھے۔
تعلیم اور زیادہ وسیع پیمانہ پر ہو رہی تھی اور عام آدمی کی قیمت خواہ محاذ جنگ پر بحیثیت سپاہی یا دفاع کی
ناگزیر صنعتوں میں بحیثیت مزدور زیادہ وزنی ہو گئی تھی اس کے برخلاف صنعتی نظام نئے مراحل کو حل
کرنے کے لئے قابل نہیں رہا تھا اور بے روزگاری بڑھ رہی تھی۔ محنت کش طبقہ اپنے طبقہ کے مفاد کے
لئے بیدار ہو رہا تھا۔ ٹریڈ یونین کے خیالات ترقی کر رہے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ اسی قسم کی سوسائٹیاں
جیسے کہ آزاد لیبر پارٹی ـــــ (Independent Labour Party)، فیبین سوسائٹی
(Fabian Society) اور کمیونسٹ پارٹی مزدور تحریک کو سوشلسٹ رنگ دے رہے تھے۔

ایک سماجی نظریہ تھا کہ ووٹ دہندگی کی تحریک شروع ہوئی جس کا مطالبہ یہ تھا کہ
عورتوں کو بھی مردوں کے مساوی ووٹ دینے کا حق دیا جائے۔

قومی سیاست میں بھی سماجی اضطراب اپنے کو ظاہر کر رہا تھا۔ لڑائی سے قبل جن دو
پارٹیوں قدامت پرست اور لبرل نے بساط سیاست پر قبضہ کر رکھا تھا۔ اس کا دور اب ختم ہو رہا تھا۔
ایک تیسری جماعت منظر عام پر آگئی تھی جو طبقوں کے اساس، اقتصادی مفادات، فکری نظریات کے
علاوہ حکومت کے فرائض اور حدود کے بارے میں بھی ان دونوں سے مختلف تھی۔ اس نے اندرون
ملک اور بیرون ملک کی پالیسیوں کو ایک نئے سانچے میں ڈھالنے کا عزم کیا۔ قانون بابت عوام 1918
(Representation of People Act 1918) نے ووٹروں کی تعداد میں بہت اضافہ کر دیا تھا کیونکہ
21 سال سے اوپر کے مردوں اور 30 سال کے اوپر کی عورتوں کو رائے دہندگی کا حق دے دیا گیا تھا۔
لیبر پارٹی نے یہ طے کیا کہ اپنی ووٹ دینے کی کل طاقت کو مجتمع کر کے سیاست میں ایک آزاد روش
پر عمل پیرا ہو۔ جو عام الکشن جنگ کے بعد ہوئے۔ ان سے پارٹیوں کی عددی طاقتوں میں عجیب تبدیلیاں
نظر آتی ہیں۔ یکے بعد دیگرے جلد جلد 6 سال 1918، 1922، 1923، 1924 کے اندر چار الکشن
ہوئے۔ اگرچہ قدامت پرست بالا رہے لیکن لیبر پارٹی کی کامیابی اتنی وسیع تھی کہ جنوری 1924 میں
ریمزے میکڈانلڈ کی قیادت اور لبرل پارٹی کی مدد سے سب سے بڑی پارٹی بن کر نکلی۔

اس نے گویا لبرل پارٹی کو گرہن لگ جانے کا باتنگ اعلان کیا اور لبرل پارٹی
اس کے بعد تیزی سے زوال کی طرف چلی گئی۔

اکتوبر 1924ء کے الکشن میں قدامت پرست پارٹی پھر عظیم اکثریت کے ساتھ واپس ہوئی۔ اسٹینلے بالڈون غیر معروف وزیر اعظم آئندہ دس سال کے لئے انگلستان کا صدر الصدور قرار پایا۔ یہ زمانہ برطانیہ کی اندرونی وطنی پالیسیوں کے لئے بالکل ساکت زمانہ ہے بیرونی دنیا میں انجمن بین الاقوامی کا وقار تیزی کے ساتھ نیچے گر رہا تھا۔ ایک دو کوششیں بیدلی کے ساتھ مختلف طاقتوں میں میل ملاپ پیدا کرنے کی کی گئیں۔ مثلاً 1926ء کا لوکارنو پیکٹ (معاہدہ) یا 1928ء کا کلاگ برائنڈ پیکٹ جن میں جنگ کو قومی پالیسی کے طور پر استعمال کرنے کی مذمت کی گئی تھی۔ مگر ان دو معاہدوں میں سے کوئی بھی جرمنی کو اس سے باز نہ رکھ سکا کہ وہ ورسیلز Versailles کے صلح نامہ کو توڑنے کی کوشش کے لئے کارروائی کرے۔ نہ جاپان کو منچوریا میں جارحیت سے روک سکا اور نہ اٹلی کو حبشہ پر حملے سے باز رکھ سکا۔

بین الاقوامی میدان میں حالات برطانیہ کے قطعی موافق نہ تھے۔ جس کی خوشحالی ہی نہیں اس کی قوت لایموت کا انحصار ایک بڑی حد تک بیرونی تجارت پر تھا۔ جنگ نے یورپ کا پہیہ الٹ دیا تھا۔ فرانس نے عظیم ترین قربانیاں دی تھیں اور جرمن حملہ کا سب سے بڑا نشانہ بنا تھا۔ اس کی بحالی کی رفتار سست تھی۔ جرمنی شکست کی مار پر مار اور فدیہ کے مطالبات کے نیچے تڑپ رہا تھا۔ اسٹریا کی قدیم مملکت پارہ پارہ ہو گئی تھی۔ نئی نئی خود مختار سلطنتیں نقشہ پر اپنا وجود دکھا رہی تھیں اور رسل و رسائل اور تجارت میں پیچیدگیاں پیدا کر رہی تھیں۔ پولینڈ، زیکوسلوکیا، یگوسلودیہ عظیم تر رومانیہ، یہ تھیں جدید سلطنتیں۔ آسٹریا اور ہنگری ایک دوسرے سے الگ کر دیئے گئے تھے۔ اور دونوں کے رقبے بھی کم کر دیئے گئے تھے۔ دولت عثمانیہ یورپ کے بہت سے مقبوضات سے محروم کر دیا گیا تھا۔ اور اس سے اس کے عرب صوبے چھین لئے گئے تھے۔ بالٹک کی سرزمین روس سے آزاد ہو چکی تھی۔ اور جرمنی نے فرانس سے السیس اور لارین کے صوبے لے کر اپنی مملکت میں شامل کر لئے تھے۔ روس تعمیر نو کی زد میں تھا اور اٹلی کی ANLARKIE اقتصادیات کا تجربہ کر رہا تھا۔

برطانیہ کی پوزیشن جو دنیا کی طاقتوں کے پاس تھی۔ وہ واشنگٹن کے معاہدہ 23 - 1921ء کے دفعات میں محبوس تھی۔ اس میں برطانیہ کے بڑے جنگی جہازات کی تعداد امریکہ کے برابر رکھی گئی تھی۔ اور اس طرح یہ سمندر پر برطانیہ کی برتری کے خاتمہ کا اعلان تھا۔

جنگ کی ایک تعمیری پیداوار یعنی انجمن بین الاقوام جس نے بڑی امیدوں
کے ساتھ جنم لیا تھا عملاً ایک ایسے بچے کی طرح تھی جو مردہ پیدا ہوا ہو۔ ممالک متحدہ امریکہ جو اس کا
خاص موید تھا۔ اس نے اس میں شرکت ہی سے انکار کر دیا اور معاہدہ پر دستخط سے بھی انکار کر دیا
اور بقیہ دوسرے ممبران عالمی امن اور رفاہ عام کو فروغ دینے کے بجائے انجمن کو اپنے قومی
مفادات کی ترقی کے لئے استعمال کرنے میں دلچسپی لے رہے تھے۔ مملکت برطانیہ جنگ کے
بعد ایک الجھی ہوئی شکل میں ابھری۔ اس کی کل نوآبادیات برطانوی اقتصادیات کی امدادی فوج کے
طور پر کام کرنے سے انکار کر چکی تھیں۔ جنگ کے اختتام کے بعد ان سبھوں نے انجمن بین الاقوام
کی ممبری کا مطالبہ کر کے گویا انھوں نے اپنی خودمختاری کا اظہار کیا تھا۔ 1921 کے امپریل کانفرنس
میں نوآبادیات کے وزرائے اعظم نے اپنی اپنی پارلیمنٹ کی آزاد خودمختاریت پر مہر ثبت کی۔ پانچ سال
کے بعد 1926 میں نوآبادیات کی تعریف اس طور پر کی گئی۔

"زیر سایہ مملکت برطانیہ آزاد قومیں جو ایک دوسرے کی اپنی اندرونی یا بیرونی
معاملات میں کسی طرح سے بھی تابع اگرچہ تاج برطانیہ کی وفاداری کے دھاگے میں ایک دوسرے سے
مشترکہ طور پر بندھی ہوئی ہیں اور آزادی کے ساتھ برٹش کامن ویلتھ آف نیشنس کے ممبران کی حیثیت
سے ایک دوسرے کی رفیق ہیں۔"

1920-21 کے معاہدہ کے مطابق نوآبادیات آزاد ہو گئیں اور مساویانہ حقوق
کے ساتھ کامن ویلتھ (دولت مشترکہ برطانیہ) کی ممبر ہو گئیں۔ اس سے برطانیہ کی قانون ساز جماعت
اور انتظامی محکمہ کا نوآبادیات پر جو اقتدار تھا وہ کل ختم ہو گیا۔ اس حیثیت پر ویسٹ منسٹر کے قانون
1931 Statute of Westminster نے مہر توثیق ثبت کر دی۔

دوسری جانب مملکت برطانیہ ایک خوفناک جدوجہد سے جو اگرچہ عدم تشدد
پر مبنی تھی دوچار تھی۔ یہ عدم تشدد کی جنگ حق خود ارادیت کے مطالبہ کے لئے جاری کی گئی تھی۔
عالمگیر جنگ اور ہندوستان کے اندر جو طوفان برپا تھا انھوں نے برطانیہ
کو مانٹیگو وزیر ہند کے ذریعہ ہندوستان کے لئے ایک جدید پالیسی کے اعلان پر
مجبور کر دیا تھا۔ جس کا اعلان دارالعوام میں 20 اگست 1917 کو ہوا۔ گورنمنٹ آف انڈیا 1919 نے اس
اعلان کو قانونی شکل دے دی۔

برطانیہ کے اندر بیسویں صدی میں اس طرح متضاد رجحانات تھے۔

کچھ تو یہ ظاہر کرتے تھے کہ طاقت کا زوال ہو رہا ہے اور عالمی امور میں برطانیہ کو پسپائی کا سامنا ہے۔ اگرچہ زوال کی طرف جھکاؤ کے کوئی نمایاں نشانات نہیں تھے لیکن تعجب ہے کہ برطانیہ کے مصنفین کے دل و دماغ کو ایک سانحہ کی آمد کا اور معاشرہ کے درہم برہم ہو جانے کا خوف طاری تھا، تقریباً ہر مصنف زمانہ کا مرثیہ گو تھا اور جہاں تک ہو سکتا تھا وہ اس کی مذمت کرتا تھا" 25/ کچھ تو دائیں بازو کے سرے تک پہونچ گئے اور مذہب کی روایات یا سماجی ردعمل میں پناہ تلاش کرنے لگے۔ دوسرے کچھ لوگ بائیں بازو کی جانب جھک گئے۔ خود غرض، خود ستا یا مزاجی تی ایلیٹ T.S. ELIOT، اسی زمانہ میں مورخ تھا اس کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ " جہاں مردہ انسانوں نے اپنی ہڈیاں کھودیں۔" 26/

بالڈون کا دور (1924 - 1926)

1929 میں انگلستان ایک الکشن سے دوچار ہوا۔ جس میں اصل سوال بیروزگاری کا تھا۔ الکشن کا نتیجہ یہ ہوا کہ لیبر پارٹی کی تعداد سب سے زیادہ تھی۔ یعنی 290 بمقابلہ قدامت پرست۔ جن کی تعداد 260 اور لبرل کی 60 تھی۔ لیبر (مزدور) پارٹی نے حکومت کی ذمہ داری سنبھال لی۔ لیکن حکومت کو چلانے کے لئے ان کو لبرل پارٹی کے ووٹوں پر بھروسہ کرنا تھا۔

لیکن بہرحال قبل اس کے کہ مزدور گورنمنٹ کسی عرصہ تک برسر اقتدار رہے 1929 کے ہولناک اقتصادی اضمحلال نے اس کا احاطہ کر دیا۔ اس کا طوفانی مرکز نیویارک تھا۔ جہاں اسٹاک (خام اشیاء) اور تیار شدہ اشیاء کی قیمتیں تباہ کن حد تک گر گئیں۔ یہ خوفناک تیزی کے ساتھ متحرک ہوئی اور زیادہ تر حلقوں میں محاصرہ کر کے کل عالم پر چھا گئی۔ برطانیہ میں قیمتیں گر گئیں، کاروبار مندا پڑ گیا اور بے روزگاری نے لرزہ خیز شکل اختیار کر لی۔ حتیٰ کہ 1930 میں دو ملین مارک سے بھی زیادہ بڑھ کر خزانہ پر ناقابل برداشت بار ڈال دیا۔ اسٹرلنگ کا عالم یہ تھا کہ وہ موت کے قریب نظر آتا تھا۔ ان حالات میں میکڈانلڈ نے مزدور

25- Ibid, P. 179.

26- Cited in David Thompson, England in the Twentieth Century, Pelican History of England, page 89.

حکومت کو توڑ دیا اور قدامت پرست پارٹی زیر قیادت بالڈون اور لبرل پارٹی کے ایک جزو زیر قیادت ہربرٹ سیموئیل ایک ملی جلی گورنمنٹ بنائی۔ اس کے بعد جو عام الکشن ہوا اس نے قدامت پرست پارٹی کو زبردست اکثریت دی۔ لیکن نیشنل گورنمنٹ اگست 1931ء سے جون 1935ء تک بر سرکار رہی جس کے وزیر اعظم میکڈانلڈ تھے۔ جنوری 1935ء سے مئی 1937ء تک بالڈون وزیر اعظم رہے اس کے بعد آغاز جنگ تک نیول چیمبرلین وزیر اعظم تھے۔

1929-31ء میں جو اضمحلال مالیات میں پیدا ہوا تھا اس نے برطانیہ کی صورت حال پر بہت خراب اثر ڈالا۔ اس نے خرابیوں پر قابو پانے کی ملک کی طاقت پر اثر ڈالا کیونکہ 1930ء کے ادھر ادھر کاروبار کے پھیلاؤ اور کام کے مندا ہونے میں جو تیزی سے رد و بدل ہوئے ان میں ایک دوسرے سے نمایاں فرق ظاہر ہوا۔ اور یہ فرق ہر دوسرے سال پہلے سال سے زائد تھا۔ اشیاء کی تیاری کی مقدار گھٹ گئی۔ تیار شدہ چیزوں میں ایک سب سے زیادہ سودمند کپڑا تھا۔ لیکن اس کی مقدار 1935ء میں 1924ء کے ایک تہائی سے بھی کم رہ گئی تھی۔ جو اشیاء اندرون ملک باہر بھیجنے کے لئے تیار کی جاتی تھیں ان کی برآمد کی مجموعی مقدار 90٪ فیصدی سے گھٹ کر 60٪ فیصدی رہ گئی۔ ہندوستان میں ان کا بازار زوال پذیر تھا۔ اسی طرح کوئلہ پر بھی اثر پڑا 1924ء میں 61 ملین ٹن کوئلہ باہر بھیجا گیا تھا لیکن 1938ء میں صرف 35.9 ملین بھیجا جا سکا۔ جو مزدور کاروبار میں لگائے جاتے تھے ان کی تعداد اور جو اشیاء تیار کی جاتی تھیں ان کی مقدار دونوں زوال پذیر تھے 1929ء میں 35.7 فیصد مزدور اشیاء کی تیاری پر لگائے گئے لیکن 1938ء میں صرف 34.6 فیصد لگائے جا سکے۔ پھر بھی چونکہ نئی نئی صنعتیں لگائی گئیں اور ان میں توسیع بھی کی گئی۔ اس لئے مجموعی طور پر حالات نے نازک شکل اختیار نہیں کی۔ برطانیہ کا جو سرمایہ بیرون ملک میں لگایا گیا وہ 1927ء میں 4,290 £ ملین تھا جس سے 299 £ ملین کی آمدنی ہوئی۔ وہ 1938ء میں گھٹ کر 3.[illegible] ملین 185 £ ملین سالانہ رہ گیا۔

لیکن اقتصادیات کی زبوں حالی کا بدترین پہلو برآمد میں کمی تھی۔ 1927ء میں وہ 1913ء کے اوسط مالیت کے زیر نظر اس کے 84٪ فیصد رہ گیا تھا 1936-1938ء میں وہ 67٪ فیصدی تک آ گیا۔ قدرتی بات یہ ہے کہ دنیا کی مجموعی دولت میں برطانیہ کا جو پہلے 11.10 فیصد تھا وہ 1937ء میں گھٹ کر 9.87٪ فیصد رہ گیا۔

ایشورتھ ASHWARTH کے الفاظ میں 190[illegible] سے لگ بھگ اگرچہ

بہت سی نئی قابل قبول اشیاء تیار ہونی شروع ہوئی تھیں۔ لیکن ان کی ایک بڑی مقدار استنے فاصلے پر نہیں لے جائی جاتی تھیں جہاں تک ان کو لے جانا چاہیئے تھا۔ یا جہاں تک کہ مقابلہ کرنے والے رقیب ممالک لے جاتے تھے۔" 27/

1930ء کے لگ بھگ کے دور نے ایک ایسا بوجوڑ الااور ایسا شگاف پیدا کیا جس کو کوئی سوسائٹی عافیت قائم کرتے ہوئے غیر معینہ مدت تک برداشت نہیں کر سکتی تھی۔" 28/

برطانیہ بہت سے تفکرات میں مبتلا تھا۔ جن میں ایک تو یہ تھا کہ اسے دنیا کے اندر اپنا راستہ بنانے کی صلاحیت قائم رکھنا تھا۔ دوسرا یہ کہ بے روزگاروں کی تعداد میں 1921ء سے 1939ء تک قریب 14.4 فیصد اضافہ ہو گیا تھا اور دوسری جنگ عظیم کے درمیان اندرونی اقتصادی پریشانیوں کا دباؤ اور بھی زیادہ بڑھ گیا۔ سرمایہ دار طبقہ یعنی وہ لوگ جو لگان سود اور منافع سے بہرہ اندوز ہوتے تھے۔ وہ ہندوستان کے موسم گرما کا لطف اڑاتے تھے۔ لیکن سرمایہ دارانہ انفرادیت کو قائم رکھنے کی طاقت گھٹ گئی تھی۔ کیونکہ حکومت بار بار اور ایک سے زیادہ دوسری تیز خوراک اپنی مداخلت کا پیش کرتی رہتی تھی۔ امیر اور غریب کے درمیان سماجی تصادم اور زیادہ مستحکم ہو گیا۔

اندر اندر جو دباؤ ترقی کر رہے تھے وہ بہت جلد بین الاقوامی فضا کے اندر ہونے والے واقعات سے بہت بڑھ گئے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد جس طرح معاملات طے کئے گئے تھے اور مفتوحہ ممالک کو جو شرائط دیئے گئے تھے وہ انتہائی سخت تھے۔ پرانی آسٹریا اور ہنگری اور دولت عثمانیہ دونوں پرزے پرزے کر دیئے گئے تھے۔ جرمنی نے اپنے ملک کے باہر اپنی نوآبادیات کھو دیئے تھے اور یورپ میں بھی کچھ وسیع قطعات سے محروم کر دیا گیا تھا اور اسی طرح اٹلی پر بھی اثر پڑا تھا۔

اٹلی نے اس کا جواب یہ دیا کہ 1922ء میں اس تسلطائی پارٹی کی حکومت تسلیم کر لیا جس کی قیادت کی باگ مسولینی کے ہاتھ میں تھی۔ مسولینی نے پارٹی کی ڈکٹیٹر شپ قائم کی۔

---

27 - Ashworth . op-cit , P. 335.

28 - Ibid, P. 431.

اور یورپ کے اندر اور افریقہ کی نوآبادیات پر غیر معقول حقوق کے مطالبات اس معنی میں پیش کئے کہ جہاں جہاں اطالوی زبان بولی جاتی ہے وہ سب ملک اٹلی کے ہیں۔ 1939ء میں اٹلی نے انجمن بین الاقوام کی مخالفت کر کے حبشہ پر حملہ کر دیا اور عملاً انجمن بین الاقوام پر جاپان والا حملہ کیا۔ اٹلی کی فتح یورپ کی محافظت کے تار و پود کے بکھر جانے کی تنبیہ تھی۔ چرچل نے کہا "ہم لوگ ایک عظیم تباہی سے متصادم ہوتے ہیں" قبل اس کے کہ حبشہ پر اٹلی حملہ کرے جاپان نے قانون اپنے ہاتھ میں لے کر 1933ء میں منچوریا کو اپنے ممالک محروسہ میں شامل کر لیا تھا۔ جاپان کو روکنے میں انجمن بین الاقوام کی ناکامی نے حبشہ پر حملہ کرنے کے لئے اٹلی کی ہمت افزائی کی۔

اس سے بھی زیادہ سنگین خطرہ امن کو اس وقت پیدا ہوا جب ہٹلر 1933ء میں برسر اقتدار آیا۔ اس کا منصوبہ یہ تھا کہ ورسیلز معاہدے کی دھجیاں اڑا دے۔ یورپ میں جرمنی کی بالا تر اقتدار کی حالت کو پھر نمایاں کرے۔ کھوئی ہوئی نوآبادیات کو حاصل کرے۔ اور تمام جرمنوں میں ایک حکومت کے اندر متحد کرے۔ اس کا تصور مملکت کے بارے میں نسل اور تشدد پر منحصر تھا۔

اس کا کیریر ایک طوفان کے مثل تھا۔ چانسلر کا عہدہ سنبھالے اس کو ابھی مشکل سے تین سال ہوتے تھے کہ اس نے دریائے رائن کے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ گویا اس نے اس طرح ورسیلز کے غیر منصفانہ صلح نامہ کے پرزے اڑا دیئے۔ جب اٹلی نے حبشہ پر قبضہ کر لیا تب ہٹلر نے اس سے ایک معاہدہ کر لیا۔ اور کچھ ہی دنوں کے بعد جاپان سے بھی ایسا معاہدہ کر لیا۔ اس طرح تین طاقتوں کا ایک محور قائم ہوگیا۔ اس کے بعد اس نے آسٹریا کی جانب کوچ کیا۔ ملک کے اندر گھس گیا اور دنیا پر قبضہ کر لیا۔ (مارچ 1938ء) چھ ماہ بعد زیکوسلوکیہ کے اعضاء کاٹ ڈالے گئے اور Sunder Land (سنڈر لینڈ) جرمنی کی مملکت میں شامل کر لیا گیا۔

برطانیہ کے تدبر کی خامی اور ہندوستان کا مسئلہ

جاپان کی چین پر اٹلی کی حبشہ پر اور جرمنی کی اپنے ہمسایوں پر جارحیت بلا شبہ جنگ عظیم کا پیش خیمہ تھی۔ برطانیہ کی ان سب اور دوسری اس قسم کی متشددانہ واقعات مثلاً اسپین کے اندر خانہ جنگی [illegible] یہ تھا کہ خواہ کچھ بھی قیمت دینی پڑے امن قائم رکھا جائے اور

ڈکٹیٹروں کے سامنے یعنی حملے کی دھمکیوں کے بالمقابل سپردگی کا رویہ اختیار کیا جائے۔

نیول چیمبرلین نے آسٹریا کی اپیل کو جو اس نے اپنی حفاظت کے لئے کیا تھا۔ نامنظور کر دیا اور زیکوسلویا کو بچانا ناممکن قرار دیا۔ اس طرح چیمبرلین نے برطانیہ کے اقتدار کے بحال رکھنے کی خواہش کے زوال کو بحال کر دیا۔ کل قوم اس زمانے میں مجموعی طور پر اس فکر میں مبتلا تھی کہ کس طرح جنگ سے بچایا جائے۔ مزید اسلحہ سازی کی مخالفت کی جائے اور اس طرح کی تجاویز منظور کی جائیں۔ مثلاً یہ ایوان (آکسفورڈ یونیورسٹی سوسائٹی) کبھی بھی شاہ اور ملک کے لئے۔ جنگ نہیں کریگا" بلکہ اگر جنگ کریگا تو کسی سنگین اور باضابطہ جانچے ہوئے اصول کے لئے کریگا جس کی غایت یہ ہوگی کہ مضبوط اقدامات سے قانون شکن لوگوں کو اکھاڑ کر امن قائم کیا جائے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ کامل عدم اعتماد اور تذبذب جو میکڈانلڈ اور بالڈون کی حکومتوں کے زیر انتظام جاری رہا وہ اس افتاد کا عکس تھا جو برطانیہ کو اس زمانے میں پریشان کئے ہوئے تھے۔

سلطنت کے امور میں بھی اسی طرح مضبوط فیصلے اور مضبوط عمل کا فقدان نمایاں ہے۔ 1931ء میں ویسٹ منسٹر کے قانون نے نوآبادیات کی تسلیم شدہ اندرونی خودمختاری پر مہر تصدیق ثبت کر دی تھی۔ محض جذباتی تسکین کے لئے تاج برطانیہ کو برٹش کامن ویلتھ آف نیشنز کے ممبران کی باہمی ارتباط کا نشان قرار دیا گیا تھا۔ اس فارمولا میں ایک حد تک بات چھپی ہوئی تھی کہ اب برطانوی پارلیمنٹ کو نوآبادیات کے لئے قانون سازی کا حق حاصل نہیں رہ گیا ہے۔

آئرلینڈ میں ڈی ویلرا De Valera نے یہ دیکھ کر کہ برطانیہ کی پالیسی میں تبدیلی آگئی ہے برطانیہ سے اپنا تعلق منقطع کر لیا۔ تاآنکہ 1937ء میں آئرلینڈ مکمل ری پبلک بن گیا۔ یعنی ایک اقتدار اعلیٰ کے ساتھ خودمختار جمہوری حکومت جس کا تعلق کامن ویلتھ سے صرف خارجہ معاملات تک باقی رہ گیا تھا۔ آئرلینڈ نے اپنے اقتدار اعلیٰ ہونے کا حق اس طرح استعمال کیا کہ دوسری جنگ عظیم میں غیر جانبدار رہا۔

چونکہ ملنر کے خواب ایک فضول خام خیالی ثابت ہو چکے تھے اور جوزف چیمبرلین کی تمام کارروائیاں سفید فام مملکت کے فروغ کی بے کار اور تھی از دانشمندی ثابت

ہو چکی تھیں اور وفاق کی اسکیم ناقابل قبول ہو چکی تھیں۔ کوئی کوشش مملکت برطانیہ کے مناسب تعمیر نو کی نہیں کی گئی۔ تدبر کے اس دیوانہ پن کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر نوآبادی نے اپنے مسائل خود طے کرنے شروع کر دیئے۔ نہ صرف اندرونی معاملات میں بلکہ باہر کی دوسری قوموں کے ساتھ تعلقات کے معاملات میں بھی۔

کامن ویلتھ کی شکل میں مملکت برطانیہ کے مسائل اب بھی تجربہ کی حد میں ہیں۔ جس کی کامیابی کے امکانات زیادہ روشن نظر نہیں آتے۔

جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے مسٹر مانٹیگو کے اگست 1917 کے اعلان۔ کے بعد پلوں کے نیچے بہت زیادہ پانی بہہ چکا تھا۔ اعلان بذات خود نہایت مبہم تھا۔ یعنی جہاں تک ہندوستان کی آخری منزل کی جانب بڑھنے کا سوال تھا "ہندوستان میں ذمہ دار حکومت کی جانب ترقی پسندانہ اقدام تاکہ وہ مملکت برطانیہ کا ایک اٹوٹ حصہ بن سکے"۔

سب سے بدتر بات یہ تھی کہ اس ترقی پسندانہ اقدام کی رفتار اس کی نوعیت اور وقت کا فیصلہ حکومت برطانیہ اور حکومت ہند کے ہاتھوں میں تھا۔

1919ء سے 1929ء تک اس پر کچھ توجہ نہیں کی گئی کہ ہندوستان میں دوسرا قدم کیا اٹھایا جائے۔ اگرچہ گاندھی جی کی قیادت میں سخت قسم کی اتھل پتھل ان سالوں میں پیش آئی۔

بیسویں صدی کے آغاز سے جو حالات پیدا ہو گئے تھے ان کا برطانیہ کے پاس کوئی حل نہ تھا۔ ایچ۔ ایس۔ ولس (H.S. WILLS) کے الفاظ میں برطانوی راج "اس آدمی کی مثل تھا جو ایک سیڑھی سے ہاتھی کی سونڈ پر آگرا تھا اور یہ نہیں جانتا تھا کہ اب کیا کرے اور کیسے نیچے اترے۔ 29/

اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا کہ "اگر ایسے باعمل اور ذہین افراد کی ایک کثیر تعداد مملکت کے اندر غیر مطمئن اور بیگانہ ہو گئی تو مملکت کو پارہ پارہ ہونے سے کون سی چیز اسے بچا سکے گی۔"

واقعہ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے جیسا کہ تیج بہادر سپرو نے 17 نومبر 1930

29- Wells H.G. The New Machiavelli cited in Thornton. A.P. The Imperial Idia and its enemies P.223.

پہلی گول میز کانفرنس میں بیان کیا تھا "تم اپنا اقتدار اعلیٰ (سیاسی اقتدار اعلیٰ) ۲۵۰ ملین باشندوں پر جو تمہاری سیاسی طاقت سے چھ ہزار میل کی دوری پر بسے ہوئے ہیں نافذ کرنا چاہتے ہو۔ میں ضرور کہوں گا کہ پارلیمنٹ کے ایک عام ممبر کے پاس ہندوستان کے دماغ اور جذبات کو سمجھنے کے لیے نہ تو کافی وقت ہے نہ کافی اہلیت ہی ہے اور نہ کافی پیش بینی ہے۔ اور اگر مسٹر وج ووڈ بن Wedgewood Benn مجھے معاف کریں تو میں کہوں گا کہ وزیر ہند خواہ وہ کیسی ہی حیثیت رکھتا ہو ان ہی ۱۵۰۰ افراد میں ایک فرد ہے۔ اس لئے قدرتاً اسے ان مشوروں پر بھروسہ کرنا ہی پڑتا ہے جو انڈیا آفس دیتا ہے ۔ آخر کار نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پارلیمنٹ کے اقتدار اعلیٰ تک تو بات جاتی نہیں۔ صرف انگلستان کے نصف درجن اور ہندوستان کے نصف درجن آدمیوں میں یہ اقتدار اعلیٰ محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔ 30/

سپرو نے جو وائسرائے کے ایگزیکٹو کے ممبر رہ چکے تھے جو کچھ کہا وہ گورنمنٹ آف انڈیا کی کارروائیوں کے اندرونی معاملات کی براہ راست جانکاری پر مبنی تھا۔ بہر حال اس ملک برطانیہ کے لوگوں میں ایک گہری اور ہمہ گیر دلچسپی کے متعلق لارڈ پیل (Lord Peel) کے احتجاج کے باوجود ہندوستان برطانیہ کی پبلک کی نظر توجہ کی وسعت کے باہر ہی رہا۔

جہاں تک کہ تین برطانوی سیاسی پارٹیوں کا سوال تھا ان کی سالانہ کانفرنسوں کی روئیداد کے مطالعہ سے یہ ظاہر نہیں ہوتا ہے کہ ان میں سے کسی نے ہندوستان کے مسائل میں کسی مسلسل اور سنجیدہ دلچسپی کا اظہار کیا ہو۔ پارلیمنٹ میں جو بحثیں ہوئیں وہ سب بے ترتیب تھیں۔ انھوں نے شاذ و نادر ہی کسی دلچسپی کو ابھارا یا ممبران کی توجہ کو کھینچا ہو۔ جب کبھی ہندوستان کے مسائل آتے تھے تو ماہرین ماہرین سے مباحثہ کرتے تھے اور ممبران کی اکثریت کھانا کھانے چلی جاتی تھی۔ 31/

عام پبلک میں ایک چھوٹا سا طبقہ تھا جس کا مفاد ہندوستان سے وابستہ تھا۔

30- Sapru T.B. Second Plenary meeting November 17 1930. Round Table Conference. P 24.

31- Thompson A.P. op.cit. P. 91.

اور اس لئے وہ ہندوستان کے معاملات میں دلچسپی لیتے تھے۔ ان میں ریٹائرڈ اینگلو انڈین برطانیہ کے وہ خاندان جن کے افراد سول اور ملٹری کے محکموں میں ملازمت کے متلاشی تھے۔ مشنری جو غیر مہذب کافروں کو مشرف بہ دین مسیحیت کرنے کے لئے بے چین تھے۔ اور وہ تجار جو درآمد و برآمد سے تعلق رکھتے تھے۔ اور جنہوں نے اپنا سرمایہ لگا رکھا تھا۔

جہاں تک کہ ہندوستان کے دفتری محکمہ کا تعلق ہے۔ یہ اس بات کو سینہ سے لگائے ہوئے تھے کہ کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہونی چاہئے۔ مانٹیگو نے جس کا رابطہ برابر ان لوگوں سے رہتا تھا۔ ان کے متعلق اپنی رائے حسب ذیل الفاظ میں بیان کی ہے۔

"اس بات پر آنکھ بند کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ جو ہندوستان کے برسر اقتدار ہیں یعنی ملازمین۔ وہ اس کے قطعی مخالف ہیں کہ اس بات کی کوئی کوشش کی جائے کہ وہ اس ہندوستان کو جس پر وہ حکمرانی کر رہے ہیں بدل کر اسے ایک زندہ ہندوستان بنا دیا جائے۔" 32/

ٹامسن نے سرکاری ملازمین کے حلقہ میں جو فرق آگیا تھا اس پر توجہ مبذول کی۔ وہ لکھتا ہے "ملازمتوں میں جو لوگ ہندوستان سے ہمدردی رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ان کی صف میں اب ان لوگوں کی تعداد کتنی کم ہو گئی ہے جو باشندگان ہند کے بارے میں قریبی تعلقات کی بنا پر وہ صحیح معلومات رکھتے ہیں یا ہندوستان کی چیزوں کو اس طرح جانتے ہیں جس طرح اس سے قبل اس صف کے بہت سے لوگ رکھتے اور جانتے تھے۔" 33/

لازمی طور پر گورنمنٹ آف انڈیا کے لئے پالیسی وضع کرنے کی ذمہ داری وزیر ہند پر عائد ہوتی تھی جس کی مدت ملازمت کبھی زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ کیونکہ اس کا انحصار اس پارٹی کی قسمت پر تھا جو پارلیمنٹ میں برسر اقتدار ہوتی تھی۔ علاوہ ازیں وزیر ہند کی ہندوستان کے بارے میں معلومات زیادہ گہری اور براہ راست شاذونادر ہی ہوتی تھی۔ برڈگان (BRAGAN) کے الفاظ میں مملکت کی پالیسی وہ صرف وہ پالیسی ہے جو مشنریوں، تاجروں، افسران اور سپاہیوں کے پاس کوٹ چھانٹ کر صلح مصالحت سے طے پاتی ہے۔ یا یوں کہئے کہ ان کے درمیان صلح سے۔

32- Wabby S.D. op-cit. P. 319-

33- Thompson, Edward Tagor, Life and Works. P.73.

طے ہوتی ہے۔ جو روح کی نجات سے لے کر روپیہ کمانے تک کے ہوتے ہیں "۔ 34/

ڈیوک آف آرگل (ARGYLL) جو چھ سال تک وزیر ہند رہا تھا اس نے کہا ہے کہ "ہندوستان کے اندر مملکت برطانیہ کو بڑے جوشیلے غرور اور رشک وحسد کی نگاہ سے لوگ دیکھتے تھے۔ یہ ایسے جذبات تھے جن میں اس ملک کے ساتھ اچھائی کرنے کے جذبہ کا کوئی شائبہ نہ تھا۔" 35/

پہلی جنگ عظیم کے بعد ہندوستان کا منظر مشتعل اور طوفانی تھا۔ مانٹیگو چیمسفورڈ ایکٹ 1919 ہندوستان کے لیڈروں کے لئے اطمینان بخش نہ تھا اور جبر کی جو پالیسی چلائی گئی تھی اس نے غصہ بے اطمینانی اور بغاوت کے جذبہ کو جنم دیا تھا۔ 1924ء میں مزدور حکومت جو برسر اقتدار آئی اس کا اضطراب صرف اس جانب تھا کہ وہ اپنے کو دوسروں سے زیادہ حکومت کا اہل ثابت کرے نہ کہ ہندوستان کے غصہ کو فرو کر کے مصالحت کرے۔

ریمزے میکڈانلڈ نے سوراجیہ پارٹی کو ایک پیغام بھیجا۔ جس میں یہ اطلاع دی کہ "وہ ہرگز تشدد کی دھمکیوں یا ان پالیسیوں سے جو گورنمنٹ کو مفلوج کر دینے کے لئے عمل میں لائی جائے، مرعوب نہیں ہوگا۔ 36/ ان کے وزیر ہند آلیور نے بعد کو یہ اعتراف کیا کہ "میں اس نتیجہ پر پہونچا کہ ہندوستان کا مسئلہ سردست لاینحل ہے"۔ 37/

اخبار نیو لیڈر (NEW-LEADER) نے یہ تبصرہ کیا "ہندوستان کو راضی کرنے میں جیسا کہ مزدور پارٹی کو کرنا چاہیئے تھا ہماری ناکامی کا آخری نتیجہ یہ تھا کہ ہم کو بھی جبر و استبداد کی وہی پالیسی اختیار کرنی پڑے گی جو قدامت پرستوں نے کی تھی"۔ 38/

لیکن بہت جلد یہ محسوس کیا گیا کہ 1919 کا ریفارم ناکام ہو چکا ہے۔

34- Brogan Dn. The English People. P. 155.

35- Duke of Argyle, The Eastern question 1879 (Hutchins on. P. 45)

36- Lyman, R.W. The first Labour Government, P. 216.

37- Olivier, M. Sidney olivier. P. 157.

38- The New Leader. October 31, 1924. PP 2 and 3.

بالڈون کی وزارت عظمیٰ کے زمانے کا وزیر ہند برکن ہیڈ (BIRKEN HEAD) ایک انتہا پسند ٹوری (قدامت پسند) تھا۔ اس کا اعتقاد یہ تھا کہ برطانیہ کے لئے یہ مقدر ہو چکا ہے کہ وہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جائے تاکہ پوری عالم انسانیت لیڈر بن سکے۔ وہ کہتا تھا کہ یہ تقدیر لازمی ہے۔ خواہ ہم اسے ایسا سمجھیں کہ ایک اعلیٰ قدرت نے وقت کے چکر پر اس کو بن دیا ہے یا یوں سمجھیں کہ ہمارے عظیم ماضی کا ایک عکس ہے جو ایک نئے جنم پانے والے عظیم تر مستقبل کی نشان دہی کرتا ہے " 39/

ہندوستان کے حالات میں ابتری کے پیش نظر اس نے نومبر 1927 میں پارلیمنٹ کے اندر سات انگریزوں کے ایک کمیشن کی تقرری کی تجویز اس غرض سے پیش کی کہ یہ کمیشن ہندوستان کے اصل مسائل کا جائزہ لے۔ تاکہ پارلیمنٹ کو مشورہ دیا جا سکے کہ ہندوستان کے دستور میں کن تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔

کمیشن کے جو اغراض و مقاصد مقرر کئے گئے تھے ان سے پتہ چلتا ہے کہ حکومت برطانیہ کا دماغ بھی کس طرح انتشار کا شکار ہے۔ قبل اس کے کہ کمیشن اپنا کام ختم کرے دو اہم ترمیمیں کی گئیں۔

(1) ہندوستانی ریاستوں اور برٹش انڈیا کے تعلقات (2) رپورٹ پر غور کرنے کا طور طریق۔

ابھی رپورٹ پیش بھی نہ ہو سکی تھی کہ ہندوستان کے حالات سے مجبور ہو کر لارڈ ارون نے 31 اکتوبر 1929ء کو ایک بیان جاری کیا۔ جس میں یہ اعلان کیا کہ ہندوستان کے سیاسی جذبات کا مقصد زیر سایہ برطانیہ آزاد حکومت کا حصول ہے اور یہ کہ سائمن کمیشن کی رپورٹ پیش ہونے اور شائع ہونے کے بعد ایک گول میز کانفرنس منعقد ہوگی تاکہ ہندوستان کی رائے عامہ کو مکمل آزادی کے ساتھ ظاہر ہونے کا موقع دیا جا سکے۔

وائسرائے کے اس اعلان سے پارلیمنٹ میں شور و غوغا مچ گیا۔ 5 نومبر 1929ء کو جو مباحثہ دارالامراء میں ہوا اس میں تین سابق وزیر ہند ایک سابق وائسرائے ایک سابق گورنر اور گورنمنٹ کے ممبران نے حصہ لیا۔ دو سوالات زیر بحث آئے۔ زیر سایہ برطانیہ آزاد مملکت ـــ (DOMINION STATES) کے مقصد کا اعلان کہاں تک مناسب تھا اور دوسرے

---

39 - Havighurst R.E., Twentieth Century Britain P. 203.

گول میز کانفرنس طلب کرنے کی غرض و غایت۔

کل تینوں پارٹی جنہوں نے بحث میں حصہ لیا اس طرح زوردار الفاظ میں گویا بالحلف بیان دیا کہ ڈومینن اسٹیٹس (زیر سایہ برطانیہ آزاد مملکت) ڈومینن اسٹیٹس نہیں ہے ڈومینن اسٹیٹس کے الفاظ مبہم ہیں۔ لارڈ پیل نے اس فقرہ کے استعمال کو اس لئے مذموم قرار دیا کہ "اس فقرے کے کوئی معین معنی نہیں ہیں اور اس کا مطلب سال بہ سال بدلتا رہا ہے" اور اس وجہ سے بھی کہ ڈومینن اسٹیٹس کے فقرہ کے استعمال سے آخری مرحلہ جہاں ہم کو پہونچنا ہے اور سردست موجودہ صورت جس پر عمل درآمد کرنا ہے دونوں میں انتشار اور تذبذب پیدا کرتا ہے۔ لارڈ ریڈنگ کا کہنا یہ تھا کہ اس فقرہ کے استعمال نے ہندوستان میں ایسی تصویر کی نقاب کشائی کر دی ہے جس کا حاصل ہونا کم از کم ایک زمانہ دراز تک ناممکن ہے اور رکاوٹیں باقی ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ اس اعلان سے قبل تھیں۔ برکینڈ جو خود بھی کمیشن کی تقرری کا بحیثیت وزیر ذمہ دار تھا اس نے بھی اروِن اعلان پر صاف لفظوں میں اظہار ناپسندیدگی کیا۔ اس نے کہا کہ کوئی شخص بھی جو صحیح الدماغ ہو یا کم از کم صحیح الدماغ ہونے کا دعویدار ہو وہ اس تاریخ اور وقت کا تصور نہیں کر سکتا جب ہندوستان کو ایک آزاد مملکت زیر سایہ برطانیہ کی حیثیت حاصل ہوگی۔ اس ایوان میں وہ کون انسان ہے جو یہ کہہ سکتا ہے کہ کتنی پشتوں کے گزرنے کے بعد ہندوستان اس قابل ہوگا کہ وہ بری و بحری افواج اور سول ملازمتوں پر اپنا اقتدار قائم کر سکے اور ایک ایسا گورنر جنرل مقرر کر سکے جو حکومت کے سامنے ذمہ دار ہو نہ کہ اس ملک کے کسی اقتدار کے سامنے" [40]

لارڈ پارمور نے سرزور حکومت کی طرف سے یہ صاف کر دیا کہ ڈومینن اسٹیٹس موجودہ حالت میں بطور عملی سیاست کے قابل قبول تصور نہیں کی جاتی ہے بلکہ یہ صرف ایک خوش آئند خواب ہے۔ جسے کبھی مستقبل بعید میں حاصل کرنے کے لئے دل لگائے رکھنا چاہئے۔ اس کا اعلان اس لئے کر دیا گیا تھا کیونکہ اسی طرح کے اور معصوم اعلانات اس سے قبل بھی کئے گئے تھے اور اس سے گورنمنٹ کی پرانی پالیسی میں کسی قسم کی ترمیم

---

40 - Birkenhead, Speech in House of Lords, November 5, 1929.
H.L. Debates 5th Series Vol 75. Cols 404-5.

نہیں متصور ہے۔

شرائط جنہوں نے اس پر پابندیاں عائد کی تھیں حسب ذیل تھے۔

۱۔ ذمہ دار حکومت ایک منزل ہے جس کی جانب قدم مسلسل درجہ بدرجہ بڑھانا پڑیگا۔

۲۔ ہر آگے کے قدم کے وقت اور اس کے طریقہ کا فیصلہ برطانوی حکومت اور حکومت ہند کے ہاتھ میں ہوگا۔

۳۔ آگے کی رفتار اس پر منحصر ہوگی کہ ہندوستان امتحان میں پاس ہو۔ وہ امتحان یہ ہوگا کہ وہ حکومت سے تعاون اور ذمہ داری کے جذبہ کا مظاہرہ کرے۔

ہندوستان کے اندر لارڈ ارون نے قانون ساز (لیجسلیٹو) اسمبلی کے ایک جلسہ میں جو ۲۵؍ جنوری ۱۹۳۰ کو ہوا تھا یہ بات صاف کر دی کہ کسی مقصد یا منزل کا اعلان لازمی طور پر اس مقصد کے حصول یعنی فوری معاملہ سے قطعی مختلف ہے۔

ان باتوں نے ڈومینین اسٹیٹس کے قیام کو روز قیامت تک کے لئے ملتوی کر دیا۔ لارڈ پاس فیلڈ (PASS FIELD) نے معزز لارڈ صاحبان کو ایوان امرا میں یقین دلایا کہ ہز مجسٹی کی حکومت ان شرائط میں جو ۱۹۱۹ کے ایکٹ میں درج کی گئی ہیں کسی ترمیم کی کوشش نہیں کریگی۔ اس یقین دہانی سے ایوان امرا کو مطمئن کر دیا۔ لارڈ کریو (CREWE) نے اپنے اطمینان کا ان الفاظ میں اعلان کیا "ایسا نظر آتا ہے کہ مباحثہ کا جو خلاصہ برآمد ہوا وہ یہ ہے کہ یہ منزل (ڈومینین اسٹیٹس) وہ نہیں ہے جس کے قائم کرنے کے ہم کسی معاہدہ کی بنا پر پابند ہوں۔ بلکہ اس کا انحصار چند شرائط پر ہے اور اس پر عمل درآمد ان شرائط کی تکمیل پر منحصر ہے۔

لارڈ ریڈنگ جنھوں نے تجویز کو تحریک کیا تھا پورے طور پر مطمئن تھے اور اپنے کو حق بجانب تصور کرتے تھے کہ انھوں نے گورنمنٹ سے ایک واضح اور غیر مبہم جواب حاصل کر لیا ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اگر ڈومینین اسٹیٹس ایسا ہی مبہم فقرہ ہے تو ایسے مواقع پر اس کا اظہار و اعلان اس طرح کیوں کیا گیا تھا۔ حکومت کے متکلم کا جواب یہ تھا کہ چونکہ سائمن کمیشن رپورٹ پر غور کرنے کی کارروائی میں ترمیم کر دی گئی ہے اور حکومت [illegible] نے تسلیم کر لیا ہے کہ کل آئینی مسائل ایک گول میز کانفرنس میں زیر بحث لائے جائیں۔ قبل اس کے کہ ان کو پارلیمنٹ کے جوائنٹ کمیٹی کے سپرد کیا جائے۔ ان وجوہ کی بنا پر یہ ضروری تھا کہ باشندگان

ہند کے شبہات کو دور کرنے کے لئے یہ اعلان کر دیا جائے۔
لیکن لارڈ برکن ہیڈ Lord Birken Head نے اس سلسلہ میں انکشاف کر دیا۔ انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ یہ اعلان اس وجہ سے کیا گیا تھا کہ گورنمنٹ کو اکھاڑ پھینکے جانے کا ایک سنگین خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ . . . . (اور) یہ سوچا گیا کہ ایک ایسا اعلان جو اپنی وسعت کے لحاظ سے فریب دینے والا ہو اور جس کی غرض یہ تھی کہ وہ لوگوں کو فریب دے اور حقیقتاً عمل میں آ کر وہ فریب دینے والا ثابت بھی ہوا۔ یہ سوچا گیا کہ ایک اس طرح کا اعلان اس خطرہ کو دور کر دیگا جو قانون اور امن کو لاحق ہو گیا تھا" /41

اس کے بعد جو مباحثہ جو دار العوام میں سات نومبر 1929ء کو ہوا اس میں تمام پارٹیوں کی رایوں کا خلاصہ یہ تھا کہ اروِن نے جو اعلان کیا ہے اس نے اس پالیسی میں کوئی ترمیم نہیں کی ہے جس کو ماشگو نے 1917ء میں اعلان کیا تھا۔ بالڈون نے اپنی تقریر میں ہندوستان ایک ایسی خود مختار حکومت کے وجود کو جو دوسری ڈومینین کی حیثیت کے برابر ہو۔ ایک ایسا خواب بتلایا جس کی غالباً طویل نسلوں کے بعد تعبیر کی جا سکے" /42 لائڈ جارج نے اس مباحثہ میں حصہ لیتے ہوئے کہا کہ ہندوستان کا ذکر ایک متحدہ مملکت کی حیثیت سے کرتا اور اس معنی میں کہ وہاں کے کل باشندے ایک قوم ہیں۔ کل مسائل کے بنیادی واقعات سے ناعلمی کا اظہار ہے" /43 اور وج ووڈبن Wedgwood Benn (وزیر ہند) ڈومینین سٹیٹس کا اس حیثیت سے پہلو بچا گئے کہ آیا وہ فوری منتہمہ ہے یا نہیں اور اس سے بھی پہلو بچا گئے کہ آیا مستقبل بعید میں بھی اس کے حصول کا کوئی مقصد ہے ت اس خیال پر آمد یہ بات ثبت کر دی کہ اروِن کے اعلان نے سوائے اس کے اور کچھ نہیں کیا تھا کہ ماشگو کے اعلان اور 1919ء کے ایکٹ کے مبادیات کا اعادہ کر دیا تھا۔ اس طرح ڈومینین سٹیٹس کا کفن

---

41 - Ibid.

42 - Stanley Baldwin - Speech in the House of Commons on Nov. 7. 1929. H.C. October Vol 231. Cols 1303-13

43 - Lloyd George - Speech in the House of Commons on Nov. 7. 1929. Ibid, C.C. 1315.

"انگلش چینل" کی اتھاہ گہرائیوں میں دفن کر دیا گیا۔

سائمن کمیشن جس نے لارڈ اروِن کی حمایت نہیں کی تھی اپنی رپورٹ گورنمنٹ کو پیش کر دی اور جو جدید طریقہ کار طے ہوا تھا اس کے مطابق راؤنڈ ٹیبل کانفرنس نومبر 1930 میں طلب کر لی گئی۔ ذمہ دار خود مختار نوآبادیوں کے طرز کی حکومت تو نامنظور ہو چکی تھی اب کچھ باقی تھا تو صرف یہ کہ ہندوستان کو برطانیہ کی ماتحت داری پر اس وقت تک کے لئے راضی کیا جا سکے جب تک کہ برطانیہ اپنی رضا و رغبت سے اس حالت پر نظر ثانی کرنے کے لئے تیار نہ ہو۔ کانگریس نے ایسے واضح الفاظ میں جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش کا امکان نہ تھا یہ اعلان کر دیا تھا کہ وہ ڈومینین اسٹیٹس سے کم کسی اسکیم کو قبول نہ کرے گی۔

کانگریس کے مطالبہ کو گورنمنٹ نے رد کر دیا تھا اور اگر باشندگان ہند بھی اسے رد کر دیں تو حکومت کے ہاتھ بہت حد تک مضبوط ہو جائیں گے۔ اگر کانگریس کے مندوبین قانون ساز جماعتوں کی تشکیل اور حیثیت کے بارے میں اختلاف کریں یا اس بات پر متفق نہ ہو سکیں کہ مختلف اقلیتی جماعتوں کی تعداد کیا ہو گی یا یہ کہ وہ کس طرح منتخب ہوں گے۔ یا مرکزی حکومت کی تاسیس کے اصولوں پر اختلاف ہو جائے تو ڈومینین اسٹیٹس کا خیال مردود ہو جائے گا۔

یہ کوئی مشکل کام نہ تھا کہ اقلیتوں کے نمائندوں کی تعداد میں اضافہ کر دیا جائے۔ یا ایسے لوگوں کو نامزد کر دیا جائے جو صرف اپنے تنگ نظرانہ مفاد سے تعلق رکھتے ہوں۔ ہر ملک میں اور خاص کر ایسے ملک میں جو عرصہ سے کسی دوسرے کی غلامی میں رہا ہو۔ مذبذبین کی ایک کثیر تعداد ہوتی ہے جو اپنے ابناء ملک کی اہلیت یا حب الوطنی میں کوئی عقیدہ نہیں رکھتے اور جو دیانتداری کے ساتھ یہ یقین رکھتے ہیں کہ تبدیلی خطرناک ہو گی۔

جو نمائندے گول میز کانفرنس کے لئے منعقد کئے گئے تھے وہ ایک غیر منظم بھیڑ کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان میں کچھ تو در حقیقت معتدل (ماڈریٹ) پارٹی کے قابل عزت لیڈران تھے جن کی حقیقی حب الوطنی دماغی رفعت، سیاسی تجربات اور پبلک خدمات مسلم تھے۔ اور جن کی ہندوستان کے ہر طبقہ کے دل میں عزت تھی۔ ان میں تیج بہادر سپرو اور شری نواس شاستری تھے۔ یہ دونوں مسلم لیگ کے جری اور با اثر لیڈر مسٹر محمد علی جناح کے ساتھ مل کر مضبوطی کے ساتھ بلا کسی ہچکچاہٹ کے اس مطالبہ کے

لئے کھڑے ہوئے کہ ہندوستان میں وفاقی قسم کی ڈومینین اسٹیٹس قائم کی جائے لیکن بہت سے ایسے تھے جن کو قومی لیڈر بننے کا کوئی حق حاصل نہ تھا۔ یہ لوگ تنگ نظرانہ گروہ بندیوں کے اصول سے وابستہ تھے۔ انھوں نے ملک کے وسیع تر مفادات کی خدمت میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا جو ۱۹۱۹ سے ۱۹۲۹ تک ہندوستان کے ایک گوشے سے دوسرے گوشہ تک پھیلی ہوئی ہے۔

کانگریس جس نے اس تحریک ترک موالات کو شروع کیا اور اس کی رہنمائی کی تھی۔ اس نے کروڑوں باشندگان ہند کو اپنے جھنڈے کے نیچے جمع کر لیا تھا اور جس نے حکمرانوں کے ابدی سکون اور اطمینان کو ہلا دیا تھا۔ اسے ابتدائی اجلاس میں نمائندگی ہی نہیں دی گئی تھی۔

اس پارٹی کی عدم موجودگی جو تمام دوسری جماعتوں سے زیادہ "قومیت کے مقاصد کے جذبے کو ابھارنے تیز کرنے اور ترقی دینے کی ذمہ دار تھی اور جس کے لئے عام طور پر ایسے معاملہ میں جو وقت لگتا ہے اس کی طناب کھینچ دیتا ہے" [44] ایسا ہی تھا جیسے ہیلمٹ کا ڈرامہ بلا پرنس آف ڈنمارک کے کھیلا جائے۔

لیکن بہرحال کانفرنس کا یہ نشانہ تو تھا ہی نہیں کہ قومیت کے مقاصد کی تکمیل ہو۔ برطانوی مندوبین کے ذہنوں کے سامنے تو صرف "اقلیتوں اور اکثریتوں" شہر اور کھیت جوتنے والوں کے مردوں اور عورتوں، زمینداروں اور کاشتکاروں، مضبوط اور کمزوروں، ذات اور عقائد ان سب کے جائز مطالبات جن سے سیاسی جماعت مرکب ہوتی ہے" [45] تھے۔ قومیت کا ذکر تو محض خالی خولی تفریحی بحث کی چیز تھی۔ اصل چیز ان تمام مباحث میں جو ایک طرف برطانیہ کے سیاسی لیڈران اور دوسری جانب میز کے اردگرد بیٹھے ہندوستان کے مختلف الخیال نمائندوں میں گفتگو کے درمیان مابہ البحث آئی۔ وہ فرقہ وارانہ جماعتوں اور سماجی علیحدگی پسندی کے جذبات تھے۔

---

44. H.M. King Emperor's Opening Speech Nov. 13, 1930.
The Indian Annual Register 1930, Vol II. P. 387.
45. Ibid.

اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ کانفرنس کی کارروائی ہندوستان کے باج گذار راجاؤں جن کی تعداد قریب چھ سو کے تھی۔ ہندوستان کی اقلیتوں جن کی تعداد ہی غیر معین تھی۔ برطانوی فوج اور انگریز ملازمین سرکار۔ ان سب کے حقوق و مراعات کے تعین اور ضمانت کے پیچیدہ معموں کے حل کی کوشش تک محدود ہو کر رہ گئی۔

برطانوی جماعت ہندوستان کے بارے میں تعجب خیز حد تک صدیوں تک یکساں اور غیر مبدل رہے ہیں۔ ان لوگوں کے نزدیک ہندوستان محض اپنے طور پر ایک ملک تھا۔ درحقیقت یہ مختلف نسلوں، مختلف مذاہب، مختلف زبانوں، مختلف مفادات کے متصادم تخیلات کا ایک مجموعہ تھا۔ اور سب سے زیادہ یہ ہے کہ "دو مذہب گروہوں ہندو اور مسلمان۔ اور چھوٹی چھوٹی قومیتوں کے مجموعے کے اضافہ کے ساتھ ایک باہمی متصادم ملک تھا۔ /46"

کلائیو کے زمانے سے کبھی بھی برطانوی دماغ متحرک نہیں ہوا۔ اگرچہ ان کو حکومت کرتے دو سو سال گزر چکے تھے اور دنیا جس میں ہندوستان بھی شامل تھا، ساکت نہیں رہا تھا۔

برطانوی حکمراں جماعت نے یہ خیال مستقل عقیدہ کے طور پر قائم کر لیا کہ ہندوستان کی زندگی کی اساس کسی مشترک قومی جذبہ پر نہیں ہے بلکہ ایک دوسرے سے اختلاف رکھنے والے خیالات پر ہے۔ وزیر اعظم ریمزے میکڈانلڈ جنھوں نے کانفرنس کی صدارت کی۔ وہ تو بہت پہلے ۱۹۱۰ء میں اس نتیجہ پر پہونچ چکے تھے کہ "ایک متحدہ ہندوستان جس میں ایک قومی یکجہتی کا احساس ہو اور جن کے اغراض و مقاصد مشترک و متحد ہوں۔ ایک ایسا خواب ہے جو تمام فضول خوابوں میں سب سے زیادہ فضول ہے" /47

برکن ہیڈ جنھوں نے وزیر ہند کی حیثیت سے سائمن کمیشن مقرر کیا تھا ان کا یہ خیال تھا کہ ہندوستان صدیوں تک ڈومینین اسٹیٹس کے اخراجات کو

46- Marquis of Dufferin speech delivered in St. Andrews Dinner in Calcutta, Nov 30, 1858.

47- Mac Donald. J. Ramsay, The Awakening of India, Page 69

برداشت کرنے کے قابل نہ ہوسکے گا۔ ان کے الفاظ یہ تھے "مستقبل کے کسی لمحہ کا بھی خیال میرے دماغ میں نہیں آتا ہے جب ہم یا تو خود بخود یا ہندوستان کے حق میں اپنی اس امانت سے دست بردار ہوسکیں" 48/ یہ الفاظ ان الفاظ کی صدائے بازگشت تھے جو ایک دوسرے وزیر ہند جان مارلے نے پندرہ سال قبل کہے تھے۔

یورپ کے لوگوں کا ہندوستان کے تعلیم یافتہ لوگوں کے بارے میں جو سوراجیہ کے تخیل میں مست تھے۔ یہ خیال تھا "بابو شیطان مجسم ہے اس کا دماغ بہت تیز ہے لیکن ضمیر ندارد ہے۔ وہ گناہ کے مثل عیار ہے اور اس کے ہاتھ میں ہمارے جیسے سادہ مزاج (وزیر میکڈانلڈ) اہل مغرب مٹی کی طرح کمہار کی ہتھیلی کے نیچے ہیں" اس کے علاوہ وہ کمینہ مزاج بزدل ہے جو زندگی کے گوشوں میں چھپ چھپ کر فساد کھڑا کرتا ہے کیونکہ اسے یہی پسند ہے" 49/

درحقیقت ہندوستان کے تعلیم یافتہ متوسط طبقہ کے بارے میں انگریزوں کا عام خیال نفرت اور خوف پر مبنی تھا۔ چرچل نے گاندھی کے بارے میں ریمارک دیا تھا یعنی برہنہ فقیر جس کی یہ گستاخانہ ہمت تھی کہ عظیم الشان سلطنت برطانیہ کے نائبین سے برابری کے درجہ پر بات کرے" مندرجہ بالا نفرت اور خوف کے دوہرے جذبات کی بڑی صفائی سے تائید کرتا ہے۔ اقوام برطانیہ کو ایک نشریہ کے اندر جو 10 نومبر 1935 کو جاری کیا گیا تھا۔ انھوں نے جبکہ وہ حزب مخالف کی صف میں تھے ان چند انگریزوں کی کوششوں کی مذمت کرتے ہوئے کہا کہ:۔

"میرے وہ دوست جن کو میں مخاطب کر رہا ہوں (اور گزشتہ چار سال سے میں آپ حضرات سے برابر کاسٹ (نشریہ) پر ہندوستان کے بارے میں گفتگو کر رہا ہوں) ان سے میری گزارش ہے کہ مجھے یہ کہنے دیجئے کہ ہندوستان کا برطانیہ کے محنت کش طبقہ سے گہرا تعلق ہے۔ کیوں؟ اسے ان لوگوں نے جو لنکاشائر Lanca Shire.

48- Lord Birkenhead - Speech in the House of Lords July 7, 1925
H.L. Debates Vol 61, 5th Series Col 1031.

49- Mac Donald, R. op.cit. P. 70.

سے سوت سے کاموں میں لگے ہوئے ہیں۔ خوب اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔ ایک لاکھ کے قریب لوگوں کے ہاتھوں میں توکشکول گدائی آہی چکا ہے۔ اور اگر ہندوستان کے ہوم رول نے ہمارے ساتھ وہی برتاؤ کیا جو آئرلینڈ کے ہوم رول نے کیا ہے تو ان کی تعداد دو لاکھ ہو جائیگی یعنی یہ ہوگا کہ اس ملک کے تقریباً بیس لاکھ روٹی کمانے والے ایسے ہوں گے جو سڑک پر گھوم رہے ہوں گے اور مزدور زرمبادلہ کے دفتر کے سامنے کیو لگا کر کھڑے ہوں گے ہمارے اس ملک میں ۶۷ ملین ایسے لوگوں کی آبادی ہے جو تمام یورپین ممالک کے باشندوں سے زیادہ بہتر معیار زندگی رکھتے ہیں۔ ان میں سے ایک تہائی کو معیار زندگی گھٹانا ہوگا یا بہت پست کر دینا ہوگا یعنی اس صورت میں کہ ہم ایک عظیم سلطنت باقی نہ رہیں جس کے تمام دنیا سے روابط ہیں اور تمام دنیا میں پھیلی ہوئی تجارت ہے اس انگلستان کو جیک کے زیادہ تر باشندوں کا بھی حشر ہوگا۔ اور تب یہ لوگ ہم سے کہتے ہیں کہ گورنمنٹ برطانیہ اور ہندوستان کے تعلقات کا انحصار محنت کش طبقہ یا عام ووٹر پر منحصر نہیں کیا جا سکتا۔ یہ لوگ کہتے ہیں نہیں نہیں ہرگز نہیں۔ یہ تمام بڑے بڑے معاملات تو ان طرحدار چھیلا لوگوں کے طے کرنے کا ہے جو ایک دوسرے کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہیں اور ویلسٹ منسٹر اور ہوائٹ ہال میں بیٹھ کر سیاسی سازشیں کرتے ہیں۔ محنت کش طبقہ کی اس معاملہ میں ہمت افزائی نہ کرنی چاہئے کہ وہ ہندوستان کے معاملہ میں دلچسپی لیں۔ ان کو اپنے کام سے کام رکھنا چاہئے۔ ہندوستان کو ان سے کوئی واسطہ نہیں یہ تو ان کی روزانہ کی روٹی کا معاملہ ہے اور بس۔

مزدور جماعت میں جو لوگ اثر رکھتے تھے۔ ان کی رائے بھی فی الجملہ یہی تھی۔ اگرچہ مزدور جماعت کی پارلیمانی پارٹی ۱۹۳۰ میں سائمن کمیشن کے بارے میں اپنی مایوسی کی تجویز ضبط تحریر میں لائی تھی اور کل حالات پر اپنی بے چینی کا اظہار کیا تھا اور اگرچہ ۱۹۳۷ میں انڈپینڈنٹ لیبر پارٹی ر.ر.ر سوشلسٹ لیگ اور کمیونسٹ پارٹی نے ایک مشترکہ منشور جاری کیا تھا جس میں اس بات پر زور دیا تھا کہ ہندوستان میں جو ملوکیت پرستی قائم ہے اس کے خلاف جدوجہد کی جائے اور اگرچہ ۱۹۴۱ میں عوام کے ایک کنونشن جو زیر قیادت ڈی این پریٹ PRITT ہوا تھا اور جس کی تائید چند ٹریڈ یونین والوں نے بھی کی تھی جو بہر حال اپنی جماعت میں زیادہ ممتاز حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ ایک ۸ پوائنٹ پروگرام طے ہوا تھا جس میں ہندوستان کی قومی آزادی بھی شامل ہے۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود جب ۱۹۴۲ میں پارٹی نے

"عہد قدیم اور جدید معاشرہ۔ The Old World and the New Society" کے عنوان سے رپورٹ شائع کی۔ جس میں جنگ اور امن کے تعمیر جدید کے مسائل پر بحث کی گئی تو اس رپورٹ میں ہندوستان کے بارے میں مبہم رویہ اختیار کیا گیا ہے

گول میز کانفرنس کا اجلاس 12 نومبر 1930ء کو شروع ہوا۔ پہلے اجلاس میں ایک مخصوص کامیابی حاصل ہوئی جس پر بہتوں کو تعجب اور چند کو رنج ہوا۔ تیج بہادر سپرو نے جو تجویز کیا کہ ہندوستان کا دستور وفاقی ہو جس میں ہندوستان کے برطانوی صوبے اور دیسی ریاستیں شامل ہوں۔ راجگان کے نمائندوں نے اس کا خیر مقدم کیا۔ اور دوسرے ہندوستانی مندوبین نے اس کی تائید کی۔ حب الوطنی اور صحت شعور نے ایک مرتبہ فتح حاصل کر لی اور ایک متحدہ ہندوستان طے ہو گیا۔ جس نے مذبذبین کی پیشین گوئیوں اور شکوک وشبہات کو غلط کر دیا۔

بدقسمتی سے وفاقی حکومت کے اجزاء کی تشکیل اور حیثیت کا طوفان سے مقابلہ ہوا۔ کانفرنس کے دوسرے جلسہ میں کانگریس نے یہ غلطی کی کہ نہایت گاندھی کو تنہا بھیج دیا۔ قدامت پرستوں کے بھڑکانے سے اقلیتوں نے اپنے مطالبات پر ذرا بھی جھکنے سے انکار کر دیا اور اس مسئلہ پر کوئی صلح نہ ہو سکی۔ قومی تحریکات کے لیڈران کا خوف بدقسمتی سے صحیح ثابت ہوا۔ یہ ایک انتہائی ذلت خیز اور مایوس کن نتیجہ تھا۔ لیکن بالکلیہ تعجب میں ڈالنے والا بھی نہ تھا۔ برطانیہ کے رویہ نے اقلیتوں کی ضد کی ہمت افزائی کی۔ اور یہ امید ہی کب کی جا سکتی تھی۔ کہ بیرونی حکمران باہمی سمجھوتے کو فروغ دینے کی کوشش کریں گے جیسے کہ بروگان Barogaan نے کہا ہے کہ "ایک بیرونی حکومت خواہ انسانوں کی ہو یا فرشتوں کی، وہ اس نہج کا اتحاد پیدا کرنے والی نہیں ہو سکتی۔ اس کا وجود ہی اس کے فروغ کے لئے رکاوٹ ہے۔ اگر اس میں کوئی خوبی ہے تو وہی خوبی ایک اچھی حکومت کے ساتھ قومی آزادی کی شمولیت کو جو موجودہ قومی حکومت کے اصول کی اساس ہے برداشت نہیں کر سکتی اور اس کے خلاف ہی عمل کرتی ہے"[5]

اقلیتوں کے نمائندے تنگ نظرانہ مفادات اور محدود زاویہ نگاہ کے حامل تھے۔ یہ جاننے کے بعد کہ حکمراں جماعت ان کی ہمدرد ہے وہ اپنے مطالبات میں کسی قسم کی کمی کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کرتے تھے لیکن (LASKI) جو لاڈز سینٹ ———

---

[5] Brogan D.W. op-cit, P 191.

Lord Sankey کا پرائیویٹ سکریٹری تھا۔ اس کی یہ رائے تھی کہ سیموئل ہور Samuel Hoare اور مسلم لیگ گول میز کانفرنس کی ناکامی کے ذمہ دار تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ برطانیہ کی کوئی پارٹی ہندوستان کو سلف گورنمنٹ دینے کی تائید میں نہ تھی۔ حتیٰ کہ اٹیلی ATTLEE بھی جو مزدور پارلیمانی پارٹی کی قیادت کرتا تھا اور جس نے جوائنٹ سلکٹ کمیٹی کی رپورٹ کے خلاف ایک متبادل مسودہ تیار کیا تھا۔ ہندوستان کو ایک امانت تصور کرنے کے خیال سے دست بردار ہونے کے لئے آمادہ نہ تھا۔ پارٹی کی زیادہ دلچسپی مزدوروں کی نمائندگی اور بالغوں کے حق ووٹ میں تھی نہ کہ طاقت کے انتقال میں۔ 51/

جیسا کہ پہلے ہی سے دیکھا جا سکتا تھا۔ نمائندگان آپس میں متفق نہ ہو سکے اس لئے باگ ڈور ہاتھ میں برطانیہ کے آگئی۔ برطانیہ کے حل و عقد نہ تو اس کا تعین کر سکے اور نہ اس رفتار کو طے کر سکے۔ جب اور جس سے مانٹیگو کے اعلان اور پارلیمنٹ کے وعدوں کے مطابق ہندوستان کو ریفارم دیا جا سکے۔

گول میز کانفرنس نے حکمرانوں کے موقف کو کھول دیا تھا۔ منہ بھرائی کا مقصد حاصل ہو گیا تھا اور اس کا اختتام ہو گیا۔ اس لئے گھڑی کا پنڈولم دوسری جانب گھوم گیا۔ گاندھی جی کو جیل میں بند کر دیا گیا۔ اور جبروتشدد پوری قوت سے جاری ہوا۔ 1935 کا گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پاس ہو کر آئین بن گیا۔ ہندوستان کی آواز جب زندہ ہو چکی تھی۔ اس نے اسے بلا کسی رسم و رواج کے فوراً مسترد کر دیا۔ ٹیلر Taylor نے اس ایکٹ کا مفہوم حسب ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے۔

"صوبوں میں ایک ذمہ دار حکومت یا اس کے قریب قریب ہونی تھی۔ جہاں کانگریس کے لوگ سیاست کا کھیل بلا کوئی نقصان پہونچائے کھیل سکتے تھے اور جہاں جداگانہ نئی بات کی بدولت ایک پیچیدہ قسم کی شعبدہ بازی ممکن تھی۔ اور مرکزی طاقت برطانوی وائسرائے کے اقتدار اعلیٰ کے ماتحت قطعی محفوظ تھی۔ برطانوی حکمرانوں کا کہنا تھا کہ وہ اقلیتوں کے لئے اور خاص کر مسلم اقلیت کے لئے فکر مند ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ راج سے چپکے ہوئے تھے اور اس

51- Annual Reports of the Labour Party, 1936, P. 86

نا ممکن دن تک پیچھے رہنا چاہتے تھے جب کہ فرقہ وارانہ رقابت کا خاتمہ ہو جاتے "52

XI دوسری جنگ عظیم اور آخری منزل

وقع الوقتی کے اصلاحات کی پالیسی خواہ وہ کتنی ہی بدمزہ رہی ہو جس کے ساتھ تدارکی قواعد وضوابط کا جبر وتشدد شامل تھا اس نے گورنمنٹ کو ایک سطحی اور عارضی سکون قائم کرنے میں کامیاب کر دیا۔ لیکن ہندوستان کے اس غیر متحرک سکوت نے برطانیہ کو مطمئن نہیں کیا۔ افق پر نئے اور زیادہ مہیب خطرات نے زور دار طریقہ پر نمایاں ہونا شروع کر دیا تھا۔ ہٹلر [illegible] جرمن افواج کو بہ مقاصد صفوں میں مجتمع کر رہا تھا۔ تاکہ برطانیہ کو سمندروں اور دور دور تک پھیلے ہوئے نوآبادیات میں چیلنج کرے۔ ہٹلر نے اٹلی کے مسولینی میں اپنی ہی طرح کے جذبات دیکھے اور ایک مفید حلیف پایا۔ شعلہ ریز بلند مقصد جس کی غرض وغایت یہ تھی کہ قدیم رومن شان وشوکت کو از سر نو زندہ کرے یہ اتحاد برطانیہ کے لئے کوئی فال نیک نہ تھا۔

دنیا میں جو افسردگی پھیلی ہوئی تھی اس سے برطانیہ آہستہ آہستہ روبصحت ہو رہا تھا۔ اس عہد میں بالڈون نیشنل گورنمنٹ کے ذہن ومزاج کا صدر الصدور تھا۔ وہ اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ سوتے ہوئے کتے کو پڑا رہنے دو۔ لوگوں کا موڈ صلح جویانہ تھا۔ مزدور جماعت زیر قیادت جارج لینس بری (George Lansbury) از سر نو اسلحہ بندی کی مخالف تھی۔ بالڈون نے دل میں اتر جانے والی صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا "ایک امن پسند جمہوریہ کو اسلحہ سازی کی ضرورت کے لئے قائل کرنا ناممکن ہے۔"

لیکن آنے والی مصیبت کے سیاہ سایوں نے بین الاقوامی منظر کو تاریک بنانا شروع کر دیا تھا۔ جاپان، اٹلی اور جرمنی نے جارحانہ مہم بازیاں شروع کر دی تھیں اور چونکہ انجمن بین الاقوام کو ممبران کا تعاون حاصل نہیں ہو رہا تھا۔ وہ ایک مجبور تماشائی بنی ہوئی تھی۔ درحقیقت یہ تیزی کے ساتھ بیچارگی سے اتر کر ناپید ہونے کی حیثیت تک آ رہی تھی۔

ان نئے مقابلوں نے میدان میں آکر امن پسندانہ صنعتی ترقی پر اثر انداز ہونا شروع کر دیا۔ نیول چیمبرلین کا سفر جو برچٹ گیڈن (Berchtesgaden) اور

52. Taylor A.J.P. op cit. p. 356.

گاڈس برگ (GODES-BERG) اور میونخ کے ملاقاتوں کا تمام دہ جنگ کے خونخوار دیوتا کو جو بے گناہوں کے خون کا طالب تھا۔ راضی کرنے میں کچھ بھی سودمند نہ تھا۔ بلکہ غالباً اس نے اس کے خون کی پیاس کو اور بڑھادیا۔ اس نازک صورت حال نے برطانیہ کو اب جدید اسلحہ بندی کے لئے بیدار کیا۔ ہوائی جہازوں کی تعمیر کی تعداد بڑھانے اور فوج میں اضافہ کے لئے فوری اقدامات کئے گئے۔ ٹینکوں اور توپوں کی تیاری زیادہ تیزی سے کی جانے لگی۔ ہوائی حملوں کے خلاف حفاظتی اقدامات کئے گئے اور بڑے شہروں کو خالی کرانے کی اسکیمیں تیار کی گئیں۔ افسوس "ہمارے زمانے کا امن" ایک سال بھی قائم نہ رہ سکا۔ ورسیلز کے معاہدہ کے شرائط کے خلاف جو شکایات تھیں ان کو دور کرنے انجمن بین الاقوام کے ضوابط قائم کرنے اور اسلحہ سازی کو روکنے میں ناکام رہنے۔ ہٹلر کے اس عزم نے کہ پہلی جنگ عظیم کی شرم کو دھو دیا جاتے۔ اور یورپین اقوام کے اس خوف نے کہ جرمنی پھر ابھر آئیگا اور کمیونسٹ آگے بڑھیں گے۔ ان کے علاوہ نو آبادیات کی رقابتوں اور شہنشاہانہ حوصلوں۔ ان سب نے مل کر آخری مرحلہ مذمت تک پہونچا دیا۔ یعنی ت د کے۔ جدھر ملک حرکت کر رہا تھا۔

3 ستمبر 1939 کو برطانیہ نے اعلان جنگ کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چھ سال کی طویل مدت تک تباہی و بربادی کا دور رہا اور عظیم ترین قربانیاں دینی پڑیں۔ تقریباً 3,03,000 واقعتی فوجی 60,000 سول نظام کے لوگ اور ایک لاکھ سے زیادہ آدمی جو شہنشاہیت کے گوشوں سے آتے تھے قتل ہوتے جتنا ان بحری جہازات کا تھا ان کا نصف سمندر کی تہ کے سپرد ہوگیا اور تاجرانہ کام پر مامور بحریہ کے قریب تیس ہزار ممبران نے اپنی جان سے ہاتھ دھویا۔ قومی دولت کا ایک چہارم حصہ دھنواں بن کر اڑ گیا۔ 13 ملین مکانات میں سے 4 ملین سے زیادہ کو نقصان پہونچا اور پانچ لاکھ مسمار ہو گئے 51,500 ملین پونڈ کے قریب مالیت کے صنعتی استحکامات برباد ہو گئے۔ 53/

انسانی اور مادی وسائل کو انتہا درجہ تک استعمال کرنے کی جہد کی گئی

---

53. Thomson David, England in the Twentieth Century (1965) P. 201

13 DPD/71-7.

1939ء میں کل فوجیوں کی تعداد جو میدان جنگ میں سرگرم عمل تھی چار لاکھ ترسٹھ ہزار تھی 1940ء میں یہ تعداد بڑھ کر 5,098,000 ہوگئی۔ فوج کے اخراجات 113.1 ملین 1929-30ء میں تھی وہ بڑھ کر 1939-40ء میں 626.4 ملین اور 1944-45ء میں 5,115 ملین ہو گئے۔ 1939ء سے 1945ء تک لڑائی کا کل خرچہ 34,433 ملین تھا۔ عوام پر جو ٹیکس لگایا گیا وہ اتنا زیادہ تھا کہ اس کی کوئی مثال ماضی میں نہیں ملتی۔ جن لوگوں کی آمدنی 250 پونڈ سالانہ تھی ان پر ٹیکس لگا دیا گیا اور 1,000 پونڈ کی سالانہ آمدنی کے بعد جتنی آمدنی بڑھتی جاتی تھی اتنا ہی ٹیکس درجہ بدرجہ بڑھتا جاتا تھا۔ ایک خاندان جس کی آمدنی ایک ہزار پونڈ سالانہ تھی اس کو اپنی آمدنی کا چالیس فیصدی ٹیکس میں دے دینا ہوتا تھا۔ حالانکہ لڑائی سے قبل صرف 10 فیصدی دینا پڑتا تھا۔ مجموعی طور پر قبل جنگ سے مقابلہ کرنے پر ٹیکس 50 سے 100 فیصدی تک بڑھا دیا گیا تھا۔ سب سے زیادہ آمدنی والوں پر ٹیکس اور سپر ٹیکس ملا کر آمدنی کا 97.5% فیصدی ٹیکس لگا دیا گیا تھا۔

بین الاقوامی اہم تجارتوں پر مہیب اثر پڑا جبکہ درآمد جو 1935ء میں 7.55 ملین تھی بڑھ کر 1940ء میں 1,152 ملین اور 1945ء میں 1,104 ملین ہوگئی۔ برآمد 481 ملین سے گھٹ کر 1940ء میں [illegible] ملین اور 1945ء میں [illegible] ملین رہ گئی۔ لڑائی نے صنعت کو بھی اتھل پتھل کر دیا تھا۔ باہر سے جو بظاہر نظر سے دور آمدنی ہوتی تھی اس سے 1939ء میں درآمد کا 37% فیصدی ڈھک لیا تھا۔ لیکن 1945ء آتے آتے یہ آمدنی بالکل غائب ہوگئی تھی۔ اور برطانیہ 750 ملین تک کا مقروض ہو چکا تھا۔ اور استحکامات کی بربادی نے الیکٹریسٹی اور کیمیاوی اشیاء کی پیداوار اور لوہا اور فولاد کی صنعتوں پر بھر پور ضرب لگائی تھی اور ریلوے اور مکانات کو پھر سے تعمیر کرنے کے مسائل کھڑے تھے۔ سوتی کپڑے اور کوئلہ کی صنعتیں سنگین زوال کا شکار تھیں۔

برطانیہ کے سرمایہ کی قیمت بہت زیادہ گھٹ گئی تھی۔ حتی کہ بیرونی سرمایہ تو صرف ایک تہائی رہ گیا تھا۔ برطانیہ کا قومی قرضہ 7000 ملین سے اچھل کر 23,000 ملین تک پہونچ گیا تھا۔ ادائیگی کا توازن بگڑ گیا تھا۔ اور پاونڈ اور اسٹرلنگ کا وزن بڑی مشکل سے قائم رکھا جا رہا تھا۔

اس تاریک تصویر میں صرف ایک روشنی روزگار کی تھی۔ مدافعتی افواج اور صنعتوں میں بے محابا اضافہ نے سب کو روزگار دے دیا تھا۔ ہفتہ وار آمدنی میں اضافہ نے [illegible] چیزوں کی خریداری پر قابو پانے کا سامان مہیا کر کے معیار زندگی کو بلند کر دیا تھا۔

ٹیکس لگانے کی جو یہ پالیسی اختیار کی گئی تھی کہ جس کے پاس جتنا زیادہ ہے اس پر اتنا ہی زیادہ ٹیکس لگایا جاتے جس سے زیادہ آمدنی والوں کو زیادہ ایثار کرنا پڑتا تھا۔ یہ سب باتیں سماجی برابری کو ابھار رہی تھیں۔

برطانیہ کی مالیت کے دوران جنگ اور بعد جنگ کے دو پہلو ہیں ایک تو یہ کہ اقتصادی امور میں حکومت کا عمل دخل بہت بڑھ گیا تھا۔ آزاد تجارت کا دور کب کا ختم ہو چکا تھا۔ جنگ کی صنعت مطلقاً حکومت کے عنان اقتدار میں تھی۔ پیداوار صرف تجارت، بینک اور سکے کے معاملات سے متعلق ضوابط مرتب کرنے کے مطالبات میں بڑی سختی برتی جانے لگی بعض صنعتوں رسل و رسائل اور دوسرے بہات کو قومیانے کے مطالبات کے لئے پرزور حرکت کی ضرورت تھی۔ مزدوروں، محنت کش طبقوں اور سوسائٹی کے بارے میں جو نقطہ نظر تھا اس میں تبدیلی آئی۔

ماہرین اقتصادیات کے الفاظ میں "مزدوری مالیات میں حصہ اسدی کا اصول موضوعہ ہونے کے بجائے عام فیاضانہ قسم کی ادائیگی کا ایک جزء مقصود ہونے لگی۔" /۵۴

برطانیہ ایک منظم اور شوسلشٹ سماج کی شکل اختیار کرنے کی جانب متحرک تھا۔ اس کا مکمل ثبوت ۱۹۴۵ء کے الکشن نے فراہم کر دیا۔ کیونکہ باوجود اس کے چرچل کو برطانیہ کی تاریخ میں سب سے مہلک و خطرناک جنگ کو فتح سے ہمکنار کرنے کی حیثیت سے عظیم ہردلعزیزی اور وقار حاصل تھا۔ ملک نے چرچل کی پارٹی کو نامنظور کر دیا اور مزدور جماعت کو تخت حکومت پر اس طرح واپس لایا کہ پارلیمنٹ میں اس کے 393 ممبران اور قدامت پرستوں کے صرف 213 ممبران منتخب ہوئے۔ چرچل نے وزارت عظمیٰ کے عہدہ سے استعفیٰ دے دیا اور اٹیلی نے وزارت عظمیٰ کی عنان اپنے ہاتھ میں لی۔

دوسرے سیاسی اور اقتصادی امور میں امریکہ پر برطانیہ کا انحصار ترقی کر گیا۔ یہ صحیح ہے کہ برطانیہ پر ذاتی طور سے بڑا دباؤ ڈالا تھا لیکن عوام کا رویہ مستقبل کے لئے امید افزا تھا ۱۹۱۸ء کے خلاف جب وہ ماضی کو حاصل کرنے کی سوچتے تھے۔ اب وہ

54- Harighwen. A.P. op. cit. P. 384.

مستقبل کی امید اور اعتماد کے ساتھ نظر دوڑا رہے تھے۔ خوفناک لڑائی کے صحت مندانہ قائمہ نے زندگی کی تمناؤں میں ازسرنو جان پھونک دی تھی۔ لیکن پھر بھی برطانیہ کے لئے بلا امریکی امداد کے مالی دشواریوں پر قابو پانا ممکن نہیں تھا۔ چرچل نے افسردہ صورت حال کو تسلیم کرتے ہوئے صدر جولائی 1945 کو ٹرومین (TRUMAN) سے کہا" ہم کو مدد طلب کرنی پڑیگی تاکہ ہم پھر سے اپنا کاروبار جاری کر سکیں اور جب تک کہ ہم اپنے پہیوں کو حرکت نہ دے سکیں۔ ہم دنیا کے امن و امان کے لئے قطعی سود مند نہ ہوں گے" 55/ ——— دوران جنگ میں برطانیہ نے امریکہ سے کثیر سامان لیا تھا۔ جن میں سے زیادہ تر ادھار یہ معاہدہ کی شکل میں لئے گئے تھے۔

اب ایک معاہدہ نامہ مرتب ہوا جس کی رو سے برطانیہ نے امریکہ سے جو کچھ دوران جنگ میں لیا تھا، وہ سب معاف کر دیا گیا۔ 5,21,000 ملین پونڈ سے گھٹا کر صرف 650 ملین پونڈ کر دیا گیا۔ ایک دوسرے معاہدہ کے ذریعہ برطانیہ کی تباہ حال اقتصادیات کو ازسرنو بحال کرنے کے لئے امریکہ نے برطانیہ کو 53.750 ملین پونڈ دو فیصدی کی کم شرح سود پر قرض دیا۔ جس کی ادائیگی کے لئے پچاس سال کی مدت طے ہوئی۔ اس کے ساتھ یہ شرط بھی تھی کہ ملوکیت پرستانہ ترجیحات جس قدر جلد ممکن ہو ختم کر دیئے جائیں گے لیکن جس قدر زمانہ ترقی کرتا گیا امداد کی ضرورت بھی بڑھتی رہی۔

لڑائی کے بعد انگلستان کی حالت وطن کے اندر نازک تھی۔ سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ اشیاء کی تیاری اور پیداوار میں بہت کمی آگئی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ انگلستان میں اس کے استعمال اور بیرون ملک کی تجارت پر سنگین اثرات پڑے تھے۔ کس طرح لڑائی کے ماقبل کی حالت کو واپس لایا جائے اور پھر اس پر اضافہ کیا جائے۔ یہ تنہا ملک کے بس کی بات نہ تھی۔ اور یہ بات صرف امریکہ کی بھاری امداد ہی سے ہو سکتی تھی، جیسا کہ کہا گیا۔

کل صنعت کو براستہ جنگ سے نئی صورت برائے صلح میں تبدیل کرنا

---

55 – C[...]chil, Sir W. The Second World War, Vol VI, Triumph of Tragedy. Page 547.

تھا۔ جنگ سے مکانات، فیکٹریوں، بجلی، کیمیکل، لوہے اور فولاد کے انتصابات کو جو نقصان۔
پہونچا تھا ان سب کو مرمت کرنا تھا۔ مزدور کا ملنا محال تھا۔ اس لئے فوج سے لوگوں کو نکال کر ان
کاموں پر لگایا گیا اور جو کارخانے جنگ کے سامان بناتے تھے ان میں کام کرنے والے پیشوں
کی صنعت کا کام جاری کیا گیا۔

اگرچہ صنعتی میدانوں میں حکومت کی مداخلت جاری کی گئی اور مزدور۔
حکومت نے نہایت دلیرانہ کوششیں بھی کیں۔ لیکن ان سب کے باوجود منصوبہ حاصل نہ ہو سکا
کچھ اشیاء جو تیار کی گئیں اور جو استعمال میں آئیں ان میں بیرونی تجارت اور بیرونی قرضے کے معاملہ
میں بھی اقتصادیات نے محض معمولی فوائد حاصل کئے لیکن 1947ء کے آخر میں 1938ء کے مقابلہ میں
برآمد کا توازن دس یا پندرہ فیصدی زائد تھا اور جو چھ فیصدی اضافہ برطانیہ کے معیار زندگی کو قائم
رکھنے کے لئے اعلان کیا گیا تھا اس سے بہت کم تھا۔ 56/

1947 میں جو اقتصادیات کا سروے کیا گیا اور جس کو سرمایہ کی جنگ کا
عنوان دیا گیا تھا۔ اس نے ایک پریشان کن حالات کا مظاہرہ کیا۔ اس نے "قومی مصیبت" کی
پیشین گوئی کی۔ گورنمنٹ نے اس کے خلاف ایک دوہرا پلان جاری کیا۔ یعنی ایک تو اخراجات میں
کمی کرنے کا پلان۔ اور دوسرے اشاعت کا پروگرام۔ اخراجات کی کمی کے پلان میں زراعت اور
صنعت کی پیداوار کا اضافہ کچے مال اور لیبر پر کنٹرول بھی شامل تھے۔ معاہدوں کے احکام
کے متعلق کنٹرول کے ماتحت کام کرنے والے صرف تبادلے سے حاصل کئے جاسکتے تھے۔
فوج کی تعداد میں کمی کر دی گئی۔

ان تمام تدابیر کا ضروری نتیجہ یہ تھا کہ چرچل کے قسم کے فوجی مہمات کا خیال
رکھنے والوں کے خلاف فوجی معرکوں کا خاتمہ ہوگیا۔ ملوکیت پرستانہ حوصلے اور ملوکیت پرستی کی احیائے
جدید کے خیالات بصد افسوس سر جھکا کر چل بسے۔

اس زمانہ میں جبکہ برطانیہ اپنے وطن کے اندر عظیم دشواریوں کو حل
کرنے کے لئے سرتوڑ کوشش کر رہا تھا اور اقتصادی اور معاشرتی شکستہ اجسام کو از
سر نو تعمیر کر رہا تھا۔ اس کو بیرون ملک ایک نہایت تکلیف دہ حالات سے دوچار ہونا پڑا۔

---

56. Hazighosh. A. E. op. cit. P. 383.

سوویت روس سے نکلے ہوئے سوسلشٹ خیالات کے دباؤ اور روس کی بحری مالی امداد اور تجارتی سہولتیں جو متحدہ حکومت روس فراہم کر رہی تھی سے ایک ویلفیئر حکومت کا خیال ابھر رہا تھا۔ اس کے علاوہ دنیا میں اپنی حیثیت کھو دینے اور دنیا پر اپنا اثر زائل ہو جانے کی وجہ سے برطانیہ کو سنگین معاملات کا سامنا تھا اور یہ باتیں برطانوی مفاد کو بیرون ملک سخت نقصان پہنچا رہے تھے۔

" برطانیہ کی بحری طاقت جس کی برتری مسلم تھی اسے جنگ نے عظیم دھکا پہونچایا تھا۔ اور اسی طرح حکومت برطانیہ کے ناقابل تسخیر طاقت کو بھی مجروح کیا تھا۔ جرمنی اور جاپان نے ملوکیت برطانیہ کی حیثیت کو گرادیا تھا۔ حتیٰ کہ نوآبادیات بھی اب یہ محسوس کرنے لگیں تھیں کہ برطانیہ ان کی حفاظت نہیں کرسکتا۔ سفید فام ممبران سلطنت اب سرکاری جلسوں میں مساویانہ برتاؤ کرنے لگے تھے جس کا ثبوت یہ ہے کہ برٹش کامن ویلتھ British Common Wealth ، کا نام اب کامن ویلتھ Common Wealth ہوگیا۔

اس کا مظاہرہ جنگ میں بھی تھا۔ کیونکہ جنگ میں شریک ہونے کے لئے ہر ایک انفرادی طور پر طے کرتا تھا۔ برطانوی حکومت کے پانچ ممبران میں سے آئرلینڈ نے شرکت سے انکار کر دیا اور غیر جانبدار ہوگیا۔ حتیٰ کہ اس نے اپنے مدبرانہ نمائندگی کو بھی برلن میں قائم رکھا۔ جنوبی افریقہ کے پارلیمنٹ نے ضرور شرکت کی۔ تجویز پاس کی لیکن بہت حقیر اکثریت سے۔

دوران جنگ کے کل زمانے میں نوآبادیات کو پوری طرح باخبر رکھا گیا۔ اور ان سے مشورہ بھی کیا گیا۔ جنوبی افریقہ کے جن اسمٹس - Smuts - جنگی کابینہ کے ممبر بنائے گئے۔ وزیر اعظم میں برابری درجہ پر ملتا تھا۔ نوآبادیات اپنی فوج کے استعمال پر پورا کنٹرول رکھتے تھے۔ جنگ کے بعد آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ نے ممالک متحدہ امریکہ سے ایک مدافعتی معاہدہ کیا۔ جس سے برطانیہ کو الگ رکھا گیا۔ اب نوآبادیات نے برطانیہ کے برابر مکمل حاکمانہ اختیارات حاصل کرلئے تھے۔ مملکت برطانیہ ایک ڈھیلے ڈھالے گروپ سے بنی ہوئی ادارہ بن گئی تھی۔ جس کا نام کامن ویلتھ تھا۔ وطن کے اندر یا کامن ویلتھ کے ممبران کے باہمی تعلقات یا خارجہ معاملات میں مشکل سے کوئی چیز کامن (مشترک) تھی۔ در اصل یہ ایک سوشل کلب کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ جہاں پر وزیر اعظم یا ان کے

نمائندے وقتاً فوقتاً خوشامد کا کردار ادا کرنے کے لئے۔ جمع ہوتے تھے جو کبھی کبھی تلخ لہجوں میں بھی تبدیل ہو جاتا تھا۔

لیکن برطانیہ کی کمزوری نمایاں طور پر خارجہ امور میں ظاہر ہوتی تھی۔ دوران جنگ میں برطانیہ کے اثر کا زوال پذیر ہونا ظاہر ہو رہا تھا۔ روزولٹ (ROOSEWELT) نے مقاصد جنگ سے کے معاملہ میں اتحادیوں کا رویہ جرمنی اور اٹلی سے کے معاملہ میں کیا ہو رد کر دیا تھا اور فرانس، اٹلی، مشرقی یورپ، پولینڈ، آسٹریلیا پر سے حملے کا جو فوجی نقشہ چرچل سے نے تجویز کیا تھا اس کی بھی تحقیر کی گئی۔

جنگ سے کے بعد امریکہ نے برطانیہ کو اپنی اقتصادیات از سر نو بحال کرنے کے لئے بیش بہا امداد دی لیکن اپنے حفاظتی ٹیکسوں کو جو باہر سے آنے والے مال پر لگائے جاتے تھے چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ اس نے برطانیہ کو مجبور کر دیا کہ برطانوی مال کو جو مسابقت حاصل تھی اسے رد کر دے۔

دوسرے بڑے اتحادی یعنی روس کے ساتھ انگلستان کی جو پالیسی تھی اس سے وہ پریشانی میں مبتلا ہوا۔ برطانیہ نے پیچھے کھسک کر دوم درجہ کی طاقت اختیار کر لی تھی۔ ولیو صنعت فوجی طاقتیں جو صنعتی اسلحوں سے آراستہ تھیں اور جلد ترقی کرکے ایٹمی ہتھیاروں پر قابض ہونے والی تھیں وہ برطانیہ کو پیچھے چھوڑ کر بہت آگے نکل گئیں۔ اس لئے اب برطانیہ ایک زبردست کشمکش میں مبتلا تھا۔ روس تو ابھرتا رقیب تھا۔ جس کے مفاد ایشیا اور یورپ میں براہ راست برطانیہ کے مفاد سے متصادم تھے۔ اس کی عظیم الشان فوجی طاقت تھکے ہوئے یورپ کے لئے ایک خطرہ تھی۔ کمیونسٹوں کے انقلابی افکار جن کی پشت پر گورنمنٹ اور پارٹی تھی۔ وہ ان لوگوں کے لئے ایک عظیم تشویش کا باعث تھی۔ جو سرمایہ دارانہ نظام کی حامی تھی۔

یونان، یوگوسلاویہ اور پولینڈ کے معاملات میں چرچل کا رویہ کھلم کھلا مخالف کمیونسٹ تھا وہ کوشش کر رہا تھا کہ امریکہ کو اس پر راضی کرے کہ وہ یورپ کی طرف تیزی سے چل کر فرانس سے جرمنی میں داخل ہو اور اٹلی کی طرف وینیسیا سے آسٹریلیا میں داخل ہو تاکہ مشرقی یورپ کے ممالک روس کے قبضہ میں جانے سے بچ جائیں۔ لڑائی کے ختم ہونے کے بعد بھی جو حالات تھے ان سے چرچل بہت پریشان تھا۔ اس نے ایڈن

کو بو سین فرانسسکو (San Francisco) کانفرنس میں جو اس غرض سے طلب کی گئی تھی کہ مستقبل میں ایک متحدہ دنیا کا پلان تیار کرے شرکت کر رہا تھا۔ لکھا اور اس کو جرمنی اور مشرقی یورپین ممالک کے روس کے قبضہ کر لینے کے بارے میں خبردار کیا۔ اس کے الفاظ یہ تھے "اس مصیبت عظمیٰ سے ہمیں کوئی چیز نہیں بچا سکتی۔ سوائے اس کے کہ ہم ایک میٹنگ جلد از جلد کریں اور اس میں اپنی تہی دامنی کا اظہار کریں۔" 57/

1945 میں جو کانفرنس پوسٹ ڈیم (Post Dam) کے مقام پر ہوئی اس میں چرچل اور برطانیہ کے نمائندے بیون (Bevin) معاہدہ امن کے بارے میں روس سے بہت دل شکستہ اور ناامید ہوتے۔ بیون کو تو یہاں تک شبہ تھا کہ "روس سیدھے چلا آنا چاہتا ہے۔ اور کیا میں یہ کہوں کہ وہ برطانوی کامن ویلتھ کے گلے پر پہونچ جانا چاہتا ہے" 58/

لڑائی کے بعد چرچل نے روس کے خلاف ایک جہاد شروع کیا۔ اس نے یورپ کے اتحاد کا نعرہ بلند کیا۔ اور شمالی اٹلانٹک معاہدے کے نظام کی بنیاد رکھی۔ وہ اس غرض سے امریکہ گیا تاکہ سوویت روس کے خلاف پروپگنڈے کی جنگ شروع کرے۔ پانچ مارچ 1946 کو اس نے فلٹن نیشوری (Fulton Missouri) کے مقام پر وہ بدنام زمانہ تقریر کی جس میں اس نے گھن گرج کے ساتھ سخت ملامت کیا۔

کوئی نہیں جانتا تھا کہ سوویت روس اور اس کا بین الاقوامی ادارہ مستقبل قریب میں کیا کرنا چاہتا ہے یا ان کے وسیع دائرہ میں پھیلے ہوتے اور نئے اقتصادی نظام کے رجحانات کے حدود کیا ہیں۔ بالٹک (Baltic) میں اسٹیٹن (Stettin) سے ایڈریاٹک (Adriatic) میں ٹرسٹی (Trieste) تک ایک فولادی پردہ پورے براعظم تک چھایا ہوا ہے۔ . . . میں یقین تو نہیں کرتا کہ سوویت روس جنگ چاہتا ہے۔ وہ لوگ جو چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ جنگ کے نتائج کا پھل ان کو ملے اور غیر معین حد تک وہ اپنی طاقت اور اپنے اصول پھیلا سکیں۔"

---

57. Churchil Sir, W. op.cit. P. 439

58. Hunghurst, op.cit. Page 357.

اس سے مشتعل ہوکر اسٹالن نے روس کے اخبار پراودا میں 13 مارچ کو حسب ذیل جواب دیا۔ "ہر لحاظ سے یہ ظاہر ہے کہ چرچل جنگجو لوگوں کی صف میں کھڑے ہیں میں نہیں جانتا کہ آیا مسٹر چرچل اور ان کے دوست اس میں کامیاب ہوں گے کہ نہیں کہ مشرقی یورپ کے خلاف ایک نئی فوجی مہم کا آغاز کریں۔ اگر وہ اس میں کامیاب ہو گئے جو بہت زیادہ ممکن نظر آتا ہے تو نہایت اطمینان کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کو اس طرح شکست ہوگی جس طرح 26 سال پہلے ہوئی تھی۔"

یہاں سے انگلستان اور روس کے تعاون کا دور ختم ہوگیا اور سرد جنگ کا دروازہ کھل گیا۔ اس کا لازمی نتیجہ برطانیہ کے لئے یہ سبق تھا کہ اپنی گرتی ہوئی حالت اور انتہائی کمزور وسائل کی موجودگی میں وہ اس قابل نہیں ہے کہ ہندوستان میں اپنی پوزیشن حاصل کر سکے۔

یہ ظاہر ہے کہ برطانیہ سوویت یونین پر کوئی بھروسہ نہیں کرتا تھا اسی قسم کی دوستی یا اتحاد کا خیال نہیں کیا جاسکتا تھا۔ لیکن ان حالات میں قطعی لازمی تھا کہ دنیا میں طاقتوں کا توازن قائم رکھنے کے لئے اور برطانیہ کی محافظت کی ضمانت حاصل کرنے کے لئے متحدہ جمہوریتہ امریکہ پر بھروسہ کیا جاتے۔ اس طرح برطانیہ مجبور ہوگیا کہ وہ آئندہ بین الاقوامی معاملات میں امریکہ کے دم چھلے کا کام دے۔

ایک معزز برطانوی اخبار نے تلخی کے ساتھ ریمارک کیا "جہاں ہم امریکہ سے اتفاق کرتے ہیں وہاں ہم بیکار پاتے جاتے ہیں اور جہاں ہم امریکہ سے اختلاف کرتے ہیں وہاں ہم مجبور ٹھہرتے ہیں" 59/

ان حالات کے ابھرنے اور دنیا کی اس صورت میں ایک تہی دست برطانیہ کے لئے ملوکیت پرستی ناممکن تھی۔ صنعت تجارت مالیات میں قیادت کے فقدان نے دنیا کی سیاست میں برطانیہ کی برتری کی بنیاد ہلا دی تھی۔ اجارہ داری اور بنیا پن کی بنیادوں پر بنی ہوئی ملوکیت پرستی کی راہ میں امریکہ کی اقتصادی برتری اور روس کی سیاسی رقابت عظیم رکاوٹیں تھیں۔

59- The New Statesman, Friday, June 23. 1947.

ہندوستان کا حال بالکل مختلف تھا۔ ہندوستان اس تمام دوران میں۔
احتجاج اور ایجی ٹیشنوں سے بھرا ہوا تھا اور آخر 1942 میں وہ بغاوت کا علم لے کر کھڑا ہو گیا 1939
میں اعلان جنگ کے بعد ہی ہندوستان نے یہ احتجاج کیا تھا کہ اس کو بلا اس کی مرضی حاصل
کئے جنگ میں گھسیٹ لیا گیا۔ اور صوبائی حکومتوں نے استعفے دے دیئے۔ جیسا کہ نہرو
نے کہا تھا "ہندوستان نے ایک تباہی کے قریب پہونچی ہوئی ملوکیت پرستی کو بچانے
سے انکار کر دیا"

برطانیہ پریشان ہو گیا اور ہندوستان کی حمایت حاصل کرنے کے
لئے کوشش شروع کر دی۔ گورنمنٹ نے سر اسٹافورڈ کرپس (Sir Stafford Cripps)
کو جو بائیں بازو کے سوسلشٹ اور نہرو کے دوست تھے ہندوستان بھیجا تاکہ وہ کانگریس
کے لیڈران سے مل کر انھیں اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ ہماری مخالفت کرنا
ترک کر دیں۔

لیکن لڑائی کی اس نازک حالت میں برطانیہ کی حکومت کو ملوکیت پرستانہ
اقتصادی اتحاد اور دفاع میں ہندوستان کے حالات سے زیادہ دلچسپی تھی۔ وزیر اعظم
چرچل نے اعلان کیا کہ "میں شہنشاہ معظم کا فرسٹ منسٹر اس لئے نہیں بنایا گیا کہ مملکت برطانیہ
کے اختتام کے جلسہ کی صدارت کروں"

مزدور پارٹی نے جنگ اور امن کی از سر نو تعمیر پر ایک عارضی رپورٹ
شائع کی تھی اس کا عنوان تھا "پرانی لڑائی اور نئی سوسائٹی" اس رپورٹ پر 1942 کی لندن
کانفرنس نے مہر تصدیق ثبت کر دی۔ جی ڈی ایچ کول کہتا ہے:۔

ہندوستان کے بارے میں بھی رپورٹ بالکل مبہم تھی۔ اس میں
سلف گورنمنٹ کا کسی مکمل شکل میں نظریہ ادھورا پیش کیا گیا تھا اور ہندوستان کے مختلف
پارٹیوں کے اتحاد کا انتظار کرنا ہوگا۔

اگرچہ یہ بات بھی کہی گئی تھی کہ "برطانیہ حکومت کا بھی
فرض ہے کہ وہ ہر ممکن ذریعہ اس باہمی اتحاد کے لئے اختیار کریں"

ہندوستان کے مکمل آزادی کے مطالبہ یا دوسرے ممالک
کی مکمل آزادی کے بارے میں جو مملکت برطانیہ میں تھے کوئی تائیدی

عبارت نہ تھی "/60

اس طرح کی راستے کے پس منظر میں کرپس کی اس پیش کش کے لئے کہ جنگ کے بعد ہندوستان کو سلف گورنمنٹ دے دی جائے گی ۔ لازم تھا کہ مشتبہ نظروں سے دیکھا جاتے ۔ قدرتی طور پر نتیجہ یہ ہوا کہ 1942 میں "انگریز و بھارت چھوڑ دو" کی مہم شروع ہوئی ۔ لیکن لڑائی کے انجام نے یہ صاف ظاہر کر دیا تھا کہ ملوکیت پرستی کے افکار اب فرسودہ ہو چکے تھے ۔ برطانیہ کو آخرکار یہ محسوس کرنا پڑا کہ ہندوستان پر سیاسی اقتدار قائم رکھنا نہ تو ممکن ہے اور نہ نفع بخش ۔

جنگ نے برطانیہ کی طاقت میں مردوں اور دولت دونوں میں سنگین شگاف کر دیا تھا ۔ اور اس لئے طاقت کے زور پر مملکت کو قائم رکھنا ممکن نہ تھا ۔ چونکہ اقتصادی اور فوجی طاقت پر زبردست پرزے ہو چکی تھی اور مزدور اور سرمایہ وطن کے اندر فوراً ضروری طور پر درکار تھے تاکہ جنگ کی تباہ کاریوں کو مٹایا جا سکے اور صنعت کی از سرِ نو تعمیر کی جا سکے ۔ اس لئے چرچل کے اس مشورہ کو قبول کرنا خاص کر جب کہ اس کا قریب ترا اتحادی ممالک متحدہ امریکہ صاف صاف غیر ہمدردانہ رویہ رکھتا تھا اور اس کا ایک عظیم رقیب ممالک متحدہ سوویت روس رکاوٹیں ڈال سکتا تھا ۔ لازمی طور پر بڑے اخراجات کا حامل ہی نہیں ہوتا ۔ بلکہ یہ خود کشی کی مہم ہوتی ۔

مملکت برطانیہ نے ہندوستان کو اپنے قبضہ میں سمندر پر اقتدار رکھنے کی وجہ سے کامیابی حاصل کی تھی لیکن جنگ نے برطانیہ کی بحری طاقت کی برتری کو پاش پاش کر دیا تھا ۔ اور اب ممالک متحدہ امریکہ کی بحری طاقت سمندروں کی موجوں پر حکمرانی کر رہی تھی اور اس لئے برطانیہ کی ملوکیت کا ستون ٹوٹ گیا ۔

یہ بھی ظاہر تھا کہ برطانیہ کے مفادات کو قائم رکھنے کے لئے اور ان کی حفاظت کے لئے خواہ مالیات میں ہوں یا سرمایہ لگانے میں یا تجارت میں اب یہ کسی طرح قرینِ مصلحت نہ تھا اور نہ ضروری تھا کہ سیاسی اقتدار کو قائم رکھا جائے ۔ ایک آزاد ہندوستان اچانک اپنے اقتصادی تعلقات کو جو عرصہ دراز سے قائم تھے ۔ ختم نہیں کر سکتا

---

60 - Cole. G.D.H. A History of the Labour Party from 1914. P. 418.

تھا۔ ان کے انداز مداخلت جن کا اثر تجارت یا صنعت پر تھا۔ لازمی طور پر مخالفانہ ردعمل ہندوستان پر ڈالتا تھا۔ برطانیہ کی تجارت اور مالیات کے لئے ہندوستان کا اپنا قومی مفاد بذات خود ایک ضمانت تھا۔

اسی قسم کے خیالات ان تمام ممالک میں جو بیرونی طاقت کے ماتحت تھے۔ قومی اور جمہوری طاقتوں سے ابھرے۔ اور غالباً یہ بھی ممکن ہے کہ برطانیہ کے اقتدار اعلیٰ نے جو سنجیدہ وعدے کئے تھے ان کا خیال کرنے سے برطانیہ کے حکام بالادست نے مزدور گورنمنٹ کو جن کا سربراہ اٹیلی تھا مجبور کیا کہ وہ اس حالت کا مقابلہ کریں جو ناگزیر تھی۔ اٹیلی نے ایک کابینہ مشن کو ہندوستان بھیجنے کا فیصلہ کیا تاکہ وہ ان طریقوں اور ذرائع کو تیار کریں جس سے طاقت منتقل کی جاسکے اور ایک نئے وائسرائے لارڈ ماونٹ بیٹن (Lord Mountbatten) 1947 میں مقرر کئے گئے۔ تاکہ قلیل سے قلیل وقت میں اس پالیسی کو عمل میں لا سکیں۔ وائسرائے نے دو تاریخ تقدیر فیصلے کئے "آزادی فوراً دے دی جاتے۔ ملک کا بٹوارہ کر دیا جائے اور دو آزاد حکومتیں عالم وجود میں لائی جائیں۔ تاکہ اقلیت کا مطالبہ پورا ہو۔ انڈین نیشنل کانگریس اور مسلم لیگ کے لیڈران نے اس سے اتفاق کیا۔

پارلیمنٹ نے سرعت کے ساتھ ہندوستان کی آزادی کا قانون پاس کر دیا اور 15 اگست 1947 کی آدھی رات کے وقت یہ قانون عمل میں آگیا۔ برطانیہ نے ہندوستان کے تحتی بر اعظم پر سے اپنا اقتدار اٹھالیا اور دو خود مختار حکومتیں ہندوستان اور پاکستان عالم وجود میں لائی گئیں۔

ایک طویل اور تکلیف دہ تصادم جو ہندوستان اور برطانیہ کے درمیان جاری تھا آخر کار ختم ہوگیا۔ برطانیہ نے امن و امان کے ساتھ آزادی کے مطالبہ کے سامنے سر جھکا دیا۔ لیکن ہندوستان کی سوسائٹی کے کردار کے بارے میں جو نظریہ قائم کیا تھا اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ ملک کا بٹوارہ اسی نظریہ کو ثابت کرنے کے لئے کیا گیا۔ لیکن ثبوت تو یہاں کے باشندوں کے خون اور آنسوؤں میں لکھی ہوئی تھی۔ [illegible] آدمی قتل ہوئے۔ ایک کروڑ [illegible] لاکھ خاندان ویران ہوئے۔ ایک لاکھ نوجوان لڑکیوں کا دونوں جانب سے اغوا ہوا جو یا تو زبردستی مذہب تبدیل کرنے پر مجبور کی گئیں یا نیلام کے تختہ پر فروخت کر دی گئیں۔ ہندوستان نے آزادی حاصل کرلی اور اس کی قیمت ادا کی۔

۱۹۰۰ سے لیکر ۱۹۴۷ تک برطانیہ کا سفر نشیب و فراز سے بھرا ہوا تھا۔ پہلی عالمی جنگ سے کے قبل کے سالوں میں برطانیہ کی مملکت اپنے آخری عروج پر تھی۔ اس کے بعد زوال شروع ہوا۔ کچھ دنوں بعد کچھ کچھ آثار محسوس ہونے لگے لیکن ۱۹۲۹ کے عظیم سرد بازاری کے بعد وہ نمایاں ہو گئے۔ ۱۹۴۰ کے بیچ میں کچھ افاقہ ہوا لیکن بہرحال یہ زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکا اور دوسری جنگ کے سیلاب کی موجوں میں ڈوب گیا۔ اگرچہ ملوکیت پرستانہ شان و شوکت کا سورج غروب ہو گیا تھا لیکن انگلستان کی قومی عزت محفوظ رہ گئی تھی۔

دوسرا باب

اقتصادی جمود: زراعت

اقتصادی تعزیرات کے نتائج

اقتصادی امور کا معاشرتی سیاسی تبدیلیوں کے آلہ کار ہونے کی اہمیت پر زور دینا قطعی ضروری نہیں ہے۔ گذشتہ جلد میں یہ بات دکھلائی گئی ہے کہ کس طرح برطانوی حکومت کی زرعی پالیسی نے گاؤں کی معیشت کو بالکل نئے سانچے میں ڈھال دیا اور کس طرح رسل و رسائل کے جدید ذرائع نے ملک کی اندرونی اور بیرونی تجارت پر اثر ڈالا اور پھر آزاد تجارت کی پالیسی اور پبلک معیشت کے بارے میں جو طریقے اختیار کئے گئے ان سب نے صنعت کی ترقی میں روکاوٹ ڈالی دوسری جانب ان ترقیات کا ایک مفید انجام یہ ہوا کہ علاقے آپس میں ایک دوسرے کی امداد پر بھروسہ کرنے لگے اور اقتصادی ہم آہنگی کی نشو نما ہوئی۔ اقتصادی تبدیلیوں کے ساتھ سیاسی آزادی کے تخیلات میں انقلاب نے اس امر کی جانب رہنمائی کی کہ ہندوستان کے تمام برطانوی صوبے ایک دوسرے سے یکساں قانونی، عدالتی اور انتظامی نظام کی رسی میں بندھ گئے۔ جدید سیاسی اور اقتصادی قوتوں نے ایک متوسط طبقہ کے ارتقا میں بھرپور امداد کی۔ اور سیاسی یکجہتی کو فروغ دیا۔ متوسط طبقہ کا یہ تیار کردہ ہندوستان اور حکمران جماعت کے مفادات کے تصادم سے آگاہ تھا۔ اور اسکولوں اور کالجوں میں جدید تعلیم حاصل کر چکا تھا اور اقوام مغرب کے ماڈرن طریقوں اور ان کے اعمال سے بخوبی واقف تھا۔ اس لئے ان سب وجوہ کی بنا پر اس کے ذہنی جھکاؤ کا فیصلہ کن شدید ردعمل سے ہوا جو بیرونی حکمرانوں کے خلاف اس کے دل میں پیدا ہوا تھا۔

بیسویں صدی کے آغاز سے ہی تبدیلی کی رفتار تیز تر ہو گئی ــــــ اس تبدیلی کے دو متضاد سیاسی

پہلو تھے۔ قومی یکجہتی کی جانب رجحان زیادہ مضبوط ہوگیا اور اسی کے ساتھ ساتھ اقلیتی جذبات کا احساس ترقی کر گیا۔ اس لئے معاشرتی زندگی میں پرانے رسوم اور عقائد کی گرفت دماغوں پر کمزور ہو گئی اور یہ بات خاص طور پر شہروں میں زیادہ نمایاں ہوئی۔ اور عرصہ دراز سے روایتی طور پر جو علیحدگی پسندی اور نابرابری چلی آرہی تھی اس میں ملائمت آئی لیکن ایک رومانی حب الوطنی جس میں ماضی کی شان وشوکت کا احساس اور اس کے احیاء جدید کی تمنا تھی۔ اس نے جنم لیکر علیحدگی پسند فرقہ وارانہ جذبات اور مذہب کے ساتھ وفاداری کو فروغ دیا۔

عقائد مذہبی میں نیشنل رنگ ورخ کو ابھار ضرور گیا لیکن اسی کے ساتھ اس کا انجام یہ بھی ہوا کہ غیر قومی رجحانات کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ آگے بڑھنے کا تخیل یعنی تومیاتی ترقیات اور اخلاقی اوصاف کا حصول جو موجودہ حالت سے مطابقت رکھتا تھا پھیلا۔ لیکن اس کے ساتھ اخلاق کی اصلاح کی بنیاد یہ قرار دی گئی کہ ماضی کی شان وشوکت پر فخر وغرور کیا جائے ۔۔۔ ماضی پر یہ فخر وناز موجودہ ذلت خیز حالات پر پردہ ڈالنے کے لئے ایجاد ہوا تھا۔ اور اسی لئے نہایت جوش وخروش سے اس کا پروپیگنڈہ ہوتا تھا۔

اقتصادیات کے میدان میں دو قسمیں جو انیسویں صدی میں نمودار ہوئی تھیں ان کا اور بھی فروغ بڑھا۔ "ایک نوآبادی کی حیثیت سے ہندوستان کا جو تعلق برطانیہ سے تھا اور جس نے ہندستان کو برطانیہ کی سیاسی اور اقتصادی مفادات کا پابند بنا رکھا تھا اس نے ایک طرف کچھ اقتصادی ترقیات کی نشوونما کی اور دوسری جانب دوسرے امور میں رکاوٹ بھی ڈالی۔" I

غریبوں کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ اور غریب اور زیادہ غریب ہو گئے اور دولتمند اور زیادہ دولتمند ہو گئے اور ان کی تعداد بھی بڑھ گئی۔ دولت پیدا کرنے کے جو دو خاص ذرائع تھے یعنی زراعت اور صنعت ان میں سے مقدم الذکر زیادہ تر جمود کا شکار رہا۔ اور موخر الذکر دہ آہستہ آہستہ درد وکرب کے ساتھ تھپیڑیں برداشت کرتا ہوا آگے کو کھسک رہا تھا۔ ہندستان کی مالیات دو حصوں میں بٹ گئی دیہی اور شہری۔ مقدم الذکر تو وہی قدیم فرسودہ از منہ وسطیٰ کی یادگار رہ گئی۔ البتہ یہ ضرور تھا کہ اس پر رسل ورسائل اور بازار

I. - Lamb, Helen, "State and Economic Development in India" in Kuznets, S, Moore, W.F. and Spengler. J.J. (eds) Economic Growth: Brazil, India, Japan. 465.

کے جو جدید حالات پیدا ہو گئے تھے ان کا کچھ اثر پڑا۔ موخرالذکر ماڈرن ہو گیا لیکن اس کی جدیدیت فیکٹری کے ابتدائی نظام کی سطح پر تھی۔

سیاسی اور اقتصادی قوتوں کے اثرات کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک متوسط طبقہ نے جنم لیا یعنی ملک التجار تاجر، مالکان بنک، مہاجن، مالکان آراضی، لگان وصول کرنے والے ٹھیکیدار، پیشہ ور آدمی وغیرہ وجود میں آئے۔ اور ان لوگوں کی تعداد اور دولت میں روزافزوں اضافہ ہوتا رہا۔

"اقتصادیات کی مختلف النوع ترقی اور جدیدیت کے غیر مساویانہ پھیلاؤ نے ہندستان کے اندر سماجی ارتقاء پر اثر ڈالا اور قومی یکجہتی کی رفتار کو تیز کیا۔ چھوٹے چھوٹے سماجی اداروں کا ترقی کر کے ایک بڑے متحد نظام میں ضم ہو جانے کا انحصار زیادہ تر اقتصادی ترقیات پر ہوتا ہے اس کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ ابتدائے ازمنہ وسطیٰ میں یورپ کے ممالک میں جو نظام نسل کی بنیاد پر قائم ہوتے تھے۔ وہ بعد کے اسی ازمنہ وسطیٰ میں علاقائی گروہوں میں تبدیلی ہو گئے اور پھر ان علاقائی گروہوں نے ترقی کر کے اٹھارہویں اور اس کی بعد کی صدیوں میں قومی کردار اختیار کر لیا ایک فرد اپنا واسطہ دوسرے افراد سے پہلے چھوٹے چھوٹے گروہوں میں کرتا ہے اور بعد کو جب اس کے مفادات متنوع ہوتے جاتے ہیں تو وہ اور بڑے گروہوں میں اپنے آپ کو شامل کرتا جاتا ہے۔ یہ طریقہ ہندوستان میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ برطانیہ کے زمانہ کے پہلے زراعت کے طریقے پرانے اور فرسودہ تھے۔ بالکل ابتدائی طور کی تکنیک جاری تھی۔ اسباب لانے لیجانے کے طور طریقے بہت سست تھے اس لئے پیداوار کا زیادہ تر انحصار فطرت کی بخشش پر تھا۔ صنعت کے طریقے گھریلو تھے۔ اور اسی طرح کے دوسرے امور نے ایسے حالات پیدا کئے جس سے زندگی میں جمود آ گیا اور صرف علیحدگی پسندانہ خود کفیل اقتصادیات رہ گئے۔ ذات، جتھا، قبیلہ اور گاؤں اس زمانہ کی اقتصادیات میں ہی سماجی نظام کے ادارے تھے۔

برطانوی حکومت نے یہ کیا کہ ان حالات میں سے کچھ بدل دیا لیکن وہ زراعت کے طریقوں کو ماڈرن بنانے اور صنعت کے جدید طریقوں کو رائج کرنے میں ناکامیاب رہا۔ جو سماجی گروہوں کو قومی یکجہتی کے دھاگے میں پرونے اور ٹھوس نیشنلزم پیدا کرنے کے لئے ضروری ہیں۔ غیر متوازن اقتصادی تبدیلیاں ایک بے ڈھنگا سماجی نشوونما وجود میں لائیں جس کا ایک رخ دوسرے سے بڑھا ہوا تھا۔ کچھ رکاوٹ ڈالنے والے رسم و رواج اور ادارے باقی رہے مثلاً ذات پات اور فرقہ واریت کا پھولا ہوا تھا۔ قومیت کی نشوونما میں خرابی رونما ہوئی۔ عوام الناس غریب اور افلاس کے کیچڑ میں لتھڑے ہوئے

روایات کے پابند رہے صنعت اور تجارت میں جو ترقیاں ہوئیں انھوں نے ان کی بے روزگاری میں کوئی کمی نہیں کی اور نہ ان کی معیار زندگی پر کوئی اثر ڈالا۔ اور نہ ہندستان کو ایک صنعتی ملک میں تبدیلی کرنے کی سست رفتار میں اتنا جوش پیدا کیا کہ رسم و رواج کی زنجیروں کو توڑ ڈالتا۔

اس لئے انیسویں صدی میں جو تحریک جاری ہوئی وہ صرف تعلیم یافتہ لوگوں کی تحریک تھی جو بہرحال عوام الناس کی زبردست مصیبت وان کی بے چینی سے بے تو بی واقف تھی لیکن یہ لوگ برطانوی قوت وقت کی چمک دمک اور ترقی اور برطانیہ کے جمہوری اور آزادانہ طور وطرز کے اس درجہ مداح تھے کہ اسی مدح وثنا کی وجہ سے انھوں نے سوائے اس کے کہ عرضیاں دیں اور اپیل کریں اور کسی طریقے کار پر غور کرنے ہی سے احتراز کیا اور اسے ممنوع قرار دیا لیکن بیسویں صدی میں یہ تحریک ترقی کرکے عوامی بغاوت کی شکل اختیار کر گئی۔ اور جیسا کہ لینن نے کہا ”اصل سیاست وہاں شروع ہوتی ہے جہاں عوام ہوتے ہیں۔ میا ای۔ رُیچ کار کے الفاظ میں ”تاریخ میں عدد کی اہمیت ہے“ مورخ کا یہ فرض ہے کہ وہ اس بات کی شرح کرے کہ وہ عظیم الشان اصل تخیل جو حصول آزادی کے لئے بنیادی ضرورت کی حیثیت رکھتا تھا کس طرح ہندستان کے اندر وجود میں آیا۔

ایک منظم سیاسی تحریک 1885ء میں شروع ہو چکی تھی لیکن ایک نسل گذر جانے کے بعد ہی کانگریس اپنا پہلا اجلاس کر سکی۔ اس کے سالانہ اجلاسوں میں جو ہمیشہ دسمبر کے تیسرے ہفتہ میں ہوتے تھے۔ عوام کی سیاسی اور اقتصادی شکایات اور تکالیف کی جانب صرف گورمنٹ کی توجہ دلاتا رہا اور فصیح وبلیغ الفاظ میں ان کو بیان کرتا رہا اور ان کو دور کرنے کے لئے عرضداشتیں پیش کرتا رہا اگرچہ کچھ گورنر جنرلوں نے اس کی کاروائیوں میں معمولی دلچسپی بھی لی اور ان کاروائیوں کو تغیرات زمانہ کا نشان بھی سمجھا اور یہ بھی سمجھا کہ رائے عامہ بیدار ہو رہی ہے اور اس لئے کچھ توجہ کے قابل ہیں۔ لیکن عام طور پر حکمراں طبقہ کو یہ یقین نہیں تھا کہ ہندوستان نے واقعی طور پر قومی یکجہتی کی جانب اس صدی میں کچھ آگے قدم بڑھایا ہے اور شخصی جابرانہ حکومت کے سوا کسی اور قسم کی حکومت کا مستحق ہے ان کی رائے کا انحصار اس امر پر تھا کہ عوام الناس کی کثیر تعداد جو ابھی تک غیر سیاسی تھی کیونکہ یہ لوگ اگرچہ انتہائی افلاس میں مبتلا تھے۔ اور بڑی مصیبت کی زندگی گذار رہے تھے اور اپنی قسمت کو کوستے رہتے تھے۔ لیکن وہ ایسی عظیم جہالت میں مبتلا تھے اور اپنے مصائب سے اتنے بدحواس تھے کہ وہ اپنی پریشانیوں کی گہرائیوں کا اندازہ نہ کر پاتے تھے پھر ان کے دفعیہ کی تدابیر سوچنے کا کیا سوال تھا۔

برطانیہ کے لوگ اسی لئے یہ خیال رکھتے تھے کہ ایسے جامد عوام سے خوفزدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اگرچہ جو طوفان آنے والا تھا اس کی پیشنگوئی کے خیالات سرسری طور پر دلوں میں پیدا ہوئے تھے اور اس کی بھی کمی نہ تھی کہ وہ سوچتے تھے کہ یہ طوفان آگے چل کر طاقتور بنے گا۔

کسانوں میں عام بے چینی اور 1875ء میں دکن کے بلوے نے اس کی نشاندہی کی سخت قسم کا قحط اور اس میں کثیر اتلاف جان۔ جو انیسویں صدی کے دوسرے نصف عہد میں پیش آیا۔ وہ اقتصادی تباہ حالی کے ثبوت تھے۔ "بھوک اور عریانی اور تنگی کے نام پر ظلم بوجھ بنے ہوئے تھے" اور یہ دیہی علاقوں میں اور شہر کے تنگ و تاریک کوٹھریوں میں بسنے والے کروڑوں انسانوں کے دلوں کو متحرک کر رہے تھے۔ اور جیسے جیسے اس صدی کے دن آگے بڑھتے گئے عوام الناس کی حرکت اور سائنس کی تیز رفتار کے سائے ملوکیت پرستی کے فیصلوں کی راہ میں نظر آنے لگے۔

وہ کشمکش، ہنگامہ، ظلم آرائیاں، اور اتھل پتھل جو بیسویں صدی میں نمایاں ہوئی ان کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس پر نگاہ دوڑائی جائے کہ اقتصادیات میں ایک ایسی تبدیلی آرہی تھی۔ جس کے نتیجہ میں دیہات کے بسنے والے کروڑوں انسان جن مصائب کی تہہ میں ڈوبے ہوئے تھے ان کی مصیبت میں اور بے شمار کم حیثیت فن کار اور مزدور جو شہروں میں بسے تھے اور تقریباً جانور کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان کی تکالیف میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ اور اس کے بالمقابل نسبتاً وہ لوگ خوش حال طبقہ جو تجارت، کاروبار، صنعت اور دوسرے پیشوں میں لگا ہوا تھا نشوونما پا رہا تھا۔ ان دونوں طبقوں کے کام کی حالت، ان کی ضروریات، ان کی تکالیف، ان کی سعی پیہم اور ان کے مقاصد جن کے سبب وہ تحریک آزادی میں تعاون کرتے تھے ان سب کو خاطر میں لایا جائے تو ہندستان کے سیاست کی کنجی ملے گی۔ اس لئے تحریک آزادی کے اسباب اور اس کی ترقی کو جاننے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ان دونوں طبقوں کے اقتصادی ترقی کے ذرائع اور جو اقتصادی تغیر بیسویں صدی میں پیش آیا ان سب پر غور و فکر کرنا ضروری ہے۔

II اقتصادی ترقی کی نوعیت

بیسویں صدی میں جو اقتصادی ترقی ہوئی وہ درحقیقت اسی کا سلسلہ تھا جو انیسویں صدی میں شروع ہوئی تھی لیکن جدید صدی نے نئی ایسی طاقتوں کے عمل دخل کو دکھایا جو دنیا پر اثر انداز

مجھے ادرجن کا ردعمل برطانیہ اور ہندستان دونوں پر ہوا۔

ہندستان کی اقتصادیات اب دنیا کی لہروں سے کوئی جداگانہ حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ اور چونکہ یہ برطانیہ کی اقتصادیات کے نیچے کے نیچے تھی اس لئے اس کا دباؤ براہ راست محسوس کرتی تھی۔ کشمکش لڑائیاں، اتھل پتھل اور دنیا میں سائنس اور تکنیک کی ترقیات نے ہندوستان کی پیداوار کے حالات پر اثر ڈالا اور جو بچا مال تھا وہ سب بک گیا۔

حکومت برطانیہ نے جو پالیسیاں اختیار کیں اور برطانوی اقتصادیات کی ہنگامی ضروریات زیادہ تر ہندستان میں تحریک کا رخ موڑتی رہیں لیکن باوجود اس کے کہ ہندستان کی سیاست برطانیہ کے پنجے میں تھی اور باوجود اس کے کہ اس کی نوعیت نوآبادی کی تھی۔ ہندستان کی اقتصادیات نے سخت اور مسلسل جدوجہد اپنی انفرادیت کو نمایاں کرنے کے لئے کی۔ اور جیسے جیسے کہ صدی آگے قدم بڑھاتی گئی۔ عمل اور حرکت کی آزادی حاصل کرتی گئی۔

بیسویں صدی میں ہندستان کی اقتصادی تاریخ پر مختلف پہلوؤں سے غور کیا جا سکتا ہے اس کا ایک دور عام طور پر بیسویں صدی کے پہلے دو دس سالوں پر مشتمل ہے۔ یعنی لڑائی کے پہلے برطانیہ اور اس کے چار رقیبوں کے درمیان جو اقتصادی ترقی کے میدان میں صف آرائی ہوئی اور جس کا انجام پہلی عالمگیر جنگ پر ہوا۔ یہ دور سودیشی کے فروغ اور بائیکاٹ کا دور ہے اور برطانیہ اور ہندوستان کے درمیان تصادم کی پہلی منزل ہے۔

دوسرا دور معاہدہ درسلیز اور دنیا کے اندر کساد بازاری کی وسعت سے شروع ہوتا ہے۔ اس دور میں برطانیہ کی تمام تر توجہ اس جانب مبذول رہی کہ لڑائی سے جو عظیم تباہ کاریاں ہوئی تھیں ان کو دور کرے اور اپنی مالی صحت کو از سر نو واپس لائے اور اس کی روایاتی صنعتیں جو زوال پذیر ہو گئی تھیں۔ مثلاً کوئلہ، بنے ہوئے کپڑے، لوہا، فولاد ان کی جگہ پر نئی صنعتیں تعمیر کرے اس لئے اگرچہ اپنی مرضی کے خلاف اسے ایسا کرنا پڑا لیکن مجبوراً اسے اپنا پنجہ ہندستان کی اقتصادیات پر زور ڈھیلا کرنا پڑا یعنی مالی اور بنک، مال کی تیاری میں ہندوستانی طرز کھیتی اور دوکان کی تجارت میں خود اختیاری دینی پڑی۔

تیسرے دور میں جس کا اختتام دوسری عالمگیر جنگ کے اعلان پر ہوا۔ برطانوی اقتصادیات کو شروع کے چند سالوں میں سخت کساد بازاری کا شکار ہونا پڑا لیکن اس کے بعد ہی اس نے اپنی حالت بحال کرنا شروع کر دی۔ برطانوی حکومت جس کے سربراہ قدامت پرست

تھے وہ اس قومی ایمرجنسی کے خلاف جو آگئی تھی سخت جنگ کر رہے تھے اور اس کے لئے انھوں نے ان
اشیاء پر جو باہر سے آتی تھیں محصول لگا دیا تھا۔ یہ قانون بنایا تھا کہ انگلستان میں جو سامان بنتا ہے
حکومت کے تمام اجزاء اس کی خریداری کو اولیت دیں۔ مالیات میں ریفارم لائے اوٹاوا (Ottawa)
کانفرنس ہوئی۔ سونے کے سکے سے گریز ہوا سکے کی قیمت گھٹائی گئی۔ بے روزگاری کو ایک حد تک
کم کیا گیا۔ مکانات بنائے گئے اور نئی نئی صنعتیں عالم وجود میں لائی گئیں۔ مثلاً جہاز رانی، جہازوں
کی تیاری، خودرفتار گاڑیوں، ہوائی جہازوں، الکٹری سٹی کے سامانوں، کیمیاوی اشیاء کے
کارخانے بنائے گئے۔ اور زراعت کی ترقی کے لئے گورنمنٹ سے مالی امداد دی گئی۔

جس قدر برطانیہ میں اقتصادی ترقی ہوئی اسی قدر ہندوستان میں اقتصادی بدحالی آئی
ہندوستان کی مالیت کو روپیہ کے زرمبادلہ کم کرکے اور اسی طرح کے دیگر قوانین سے قربان
کر دیا گیا حتے کہ روزمرہ کی غذائی اجناس کے لئے بھی ہندوستان بیرون ملک کا محتاج ہو گیا
اور تاریخ اول میں بار سونا باہر بھیجا گیا۔ کاشت کار پر سخت ضرب لگی، بے روزگاری بڑھی اور عام
بیزاری اس قدر بڑھی کہ وہ آخرکار "تحریک ستیہ گرہ" میں کھل کر سامنے آئی۔ اور بعد کو اس کا نتیجہ
سول نافرمانی ہوا۔

آخری دور لڑائی کے گھن گرج کا دور ہے۔ اس کا نشیب و فراز، اضطراب، ناکامیاں اور
کامیابی اس دوران میں اقتصادیات کو مکمل جنگ کے پہیے میں باندھ دیا گیا۔ اور یہاں تک کہ
مخالفین کے مقابلے اور حرب و ضرب کے مقابلے کا سوال تھا۔ برطانیہ کامیاب نکلا لیکن اقتصادیات
جس پر شہنشاہانہ طاقت کا انحصار تھا۔ تہ و بالا ہو گئی۔ ہندوستان میں ماڈرن قسم کی اقتصادیات
کو قائم کرنے میں برطانیہ نے نہ تو روشن دماغی کا ثبوت دیا نہ وسعت قلب کا۔ بیچارہ ہندوستان کے ساتھ
وہی برتاؤ کرتا رہا۔ جو ایک نوآبادی کے ساتھ کیا جاتا ہے یعنی اس کا زیادہ سے زیادہ درجہ یہ ہے
کہ وہ فوج کا سامان مہیا کرنے کا ایک عارضی اور مختصر اڈہ ہے۔ اس ذلت آمیز حالات کے خلاف
ہندوستانیوں نے بغاوت کرنے کا فیصلہ کیا۔

اقتصادیات کے جو تین بڑے دھارے ہیں یعنی زراعت، صنعت اور تجارت۔ ان میں
زراعت کو ہندوستان میں سب سے بڑی اہمیت حاصل ہے کیونکہ ہندوستان کی کثیر آبادی کے
آذوقہ کا انحصار زراعت پر ہے۔ اور مردوں اور عورتوں کی ایک کثیر تعداد کھیتیوں میں بطور
مزدور کام کرتی ہے۔ جس قدر زمانہ ترقی کرتا گیا اسی قدر زراعت کا تمام دیگر فنون پر غلبہ بھی

ترقی کرتا گیا۔ اور روز بروز اقتصادیات کا لوگوں میں علم و احساس، اقتصادی بدحالی اور افلاس کو ترقی دیتا گیا۔

بیسویں صدی کے پہلے دس سالوں میں زراعت کے حلقہ میں روز افزوں جمود اور گراوٹ نظر آئی لیکن صنعتی ترقی کی راہ کچھ مختلف تھی۔ گاؤں کی غیر منظم صنعتیں شروع میں نظر انداز کئے جانے اور زوال پذیر ہونے کے بعد اب مستحکم ہو گئی تھیں۔ جب کہ شہروں کی صنعتیں اور جن کی جڑیں مضبوط ہو گئی تھیں، منظم صنعتیں مثلاً کپڑا، بننے کی صنعت باوجود یہ کہ گورنمنٹ نے جو پالیسیاں اختیار کر رکھی تھیں انھوں نے ایسے حالات پیدا کر دیئے تھے جو سخت ہمت شکن تھے، لیکن ان کے باوجود یہ صنعتیں پہلے تو اپنا قدم جمائے رہیں اور بعد کے سالوں میں خوشحال ہو گئیں یعنی جس طرح حالات سازگار ہوتے گئے۔ سن سے پارچہ بافی کی صنعت اور کارخانہ کاشت کی صنعتیں ترقی کرتی رہیں۔ کوئلے کی کانوں کی صنعت کچھ نشیب و فراز سے گذرنے کے بعد آخر کار کافی مقدار میں کوئلہ فراہم کرنے لگیں۔ بھاری سامانوں اور درمیانی درجوں کی پیداوار کی صنعت مثلاً لوہا اور فولاد، کیمیاوی چیزیں، مشینری، انجینئرنگ وغیرہ دیر میں شروع ہوئیں اور بڑی آہستہ رفتار سے آگے بڑھ رہی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ برطانوی حکومت کے اختتام کے وقت صنعتی ترقی اس درجہ تک نہیں پہونچی تھی کہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر برگ و بار لاتی ــــ تجارت کے حلقہ میں البتہ ترقی حیرت انگیز تھی۔ اور اندرونی اور بیرونی دونوں تجارتیں بڑی تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہی تھیں۔ بدقسمتی سے بیرونی تجارت کی جو نوعیت تھی اور جو اس کا رخ تھا اس کی وجہ سے وہ فائدہ نہیں دلا سکی جس کی اس سے توقع تھی۔ تجارت کا پھیلاؤ صنعتی ترقی سے ہم آہنگ نہ تھا اور نہ تو اس سے اس قسم کی ترقی کی رغبت ہی پیدا ہوئی۔

III آبادی

تاریخ اقتصادیات پر غور کرنے کے لئے ہم کو اس بات پر نظر کرنے کی ضرورت ہے کہ آبادی کے چارٹ کا رخ کدھر ہے کیوں کہ آبادی کی ترقی کا مسئلہ نہ صرف پیداوار کے معاملے میں اور دولت کی تقسیم کے معاملے میں قابل توجہ ہوتا ہے بلکہ مختلف پیشوں میں تنوع کے ساتھ کام کرنے والے آدمیوں کی تعداد سماجی حالات پر بہت روشنی ڈالتا ہے۔

۱۸۶۱ء اور ۱۹۵۱ء کے درمیان کا زمانہ تین حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے پہلی دو دہائی اور

دوسری دو دہائی اور تیسری دہائی ۱۹۴۱ء سے ۱۹۵۱ء تک ۔ ۱۹۰۱ء سے ۱۹۲۱ء تک آبادی میں اضافہ دھیرے دھیرے اور غیر منظم طور پر ہو رہا تھا لیکن ۱۹۲۱ء سے ۱۹۴۱ء تک ۱۹۴۱ء سے ۱۹۵۱ء تک یہ اضافہ تیزی کے ساتھ اور مسلسل ہوتا رہا۔ پہلے دس سالوں میں آبادی کے اضافہ کی رفتار کے سست ہونے کی وجہ اس کے پہلے کے سالوں کے قحط اور ۱۹۱۸ء کے انفلوئنزا کی وبا تھی پہلے دس سالوں میں اضافہ (۱۹۰۱ لغایتہ ۱۹۱۱) 6.2 فیصد تھا لیکن دوسرے دس سالوں میں (۱۹۱۱ لغایتہ ۱۹۲۱) اضافہ 9.7 فیصدی ہو گیا/2

ان کے بعد کے زمانوں میں فیصدی اضافہ دس سالوں کے اندر 10.6 ، 15.0 اور 16.1 ہوا۔ صرف انڈیا یونین کی آبادی ۱۹۰۱ء سے ۱۹۵۱ء تک 235.5 ملین سے بڑھ کر 356.9 ملین ہو گئی/3

اضافہ آبادی کی زیادہ تر وجہ اموات کی کمی تھی۔ جب کہ بچوں کی پیدائش کی رفتار تقریباً وہی رہی۔ چوں کہ قحط میں سہولت دینے کے جو انتظامات ہوئے وہ پہلے سے بہتر تھے اور حفظان صحت کی خدمات میں ترقی ہوئی۔ نئی دواؤں کے استعمال میں اضافہ ہوا جیسا کہ مفاد انسانی کے نقطہ نظر سے ہونا چاہئے تھا۔ اس لئے موتوں کی تعداد میں کمی ہو گئی اور اس کا افسوسناک ردعمل عام اقتصادیات پر ہوا۔ آبادی میں اضافہ بلا اسی مقدار میں زراعت اور صنعت کی پیداوار میں اضافہ کے عامۃ الناس کے معیاری زندگی کو پست کر دیتا ہے کیونکہ زمین پر دباؤ بڑھ جاتا ہے اور شہری حلقوں میں بے روزگاری ترقی کر جاتی ہے۔ شرح پیداوار کا بہت اونچا اور حیات کی مدت کی امید کا بہت نیچا ہونا یہ بھی اثر ڈالتا ہے۔ کہ ان مزدوروں کی تعداد فیصد کم ہو جاتی ہے جو کسی پیشے کے کرنے کی مہارت رکھتے ہیں۔ کام کرنے والے آدمیوں کی تعداد گھٹ گئی۔ اور ان کی کمائی سے کھانے والوں کی تعداد بڑھ گئی۔ برطانوی حکومت کے آخری پچاس سالوں میں کام کرنے والوں کی تعداد جن میں ۱۵ سال سے ۶۰ سال تک کے لوگ شامل تھے کل آبادی کی

2- Sinha J. S. "Demographic" in Economic History of India 1857-1956 edited by V.B. Singh, PP. 104-06.

3. Ibid

صرف نصف تھی/4

آبادی کا وہ حصہ جس کی روزی کا انحصار زراعت پر تھا ان کی تعداد فیصد بڑھتی گئی ایک سو سال کے اندر یعنی انیسویں صدی کے وسط سے بیسویں صدی کے وسط تک اضافہ بچاس سے اکہتر ہوگیا/5 جو لوگ کہ زراعت کے کام میں لگے ہوئے تھے ان کی تعداد میں 62.4 فیصد جو 1901ء میں تھا وہ 1961ء میں 69.6 ہوگیا۔ اسی کے ساتھ مزدوروں کا گروہ جو زراعتی پیشے کے علاوہ دوسرے کاموں میں لگا ہوا تھا اس کی تعداد 34.9 ملین سے گھٹ کر 37.4 ملین رہ گئی یا 37.6 فیصد سے 30.4 کل مزدوروں کی تعداد تھی/6۔ یہ ایک واضح ثبوت اس بات کا ہے کہ اس پوری مدت میں آبادی کے رزق کا ذریعہ صرف کھیتی تھی۔ دنیا کے دوسرے ملکوں میں جب آبادی بڑھتی ہے تو اسی کے ساتھ صنعتوں اور دوسرے پیشوں میں روزگار حاصل کرنے کے مواقع بھی بڑھتے ہیں لیکن ہندستان میں بالکل اس کے برعکس رجحان تھا۔

ان حالات کی ذمہ داری بالعقطع برطانوی حکومت پر تھی۔ یہ برطانیہ کی پالیسی ہی کا نتیجہ تھا کہ چھوٹی چھوٹی گھریلو اور دیہات کی صنعتیں برباد ہوگئیں۔ جن سے مجبور ہو کر پیشہ ور مزدور کھیت پر کام کرنے چلا گیا۔ زرعی پیداوار کی قیمتوں میں جو اضافہ ہوا اور جو 1861ء میں شروع ہوا تھا اس نے اس رجحان کو ترقی دی۔ اس نے کاریگروں کو مجبور کیا کہ وہ کم منافع والے کاروبار کو چھوڑ کر کھیتی کے کام کی جانب رخ کریں۔ صنعتی کارخانوں میں کام کرنے والوں کی تعداد 5.5 فیصد سے جو 1911ء میں تھی 1961ء میں صرف 2.4 فیصد رہ گئی۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ زمین پر دباؤ برابر بڑھتا جا رہا تھا۔

---

4 - Coale, A.J. and Hoover, E.M. The Population Growth and Economic Development in Low Income Countries

5 - Ibid.

6 - Bhatia, B.M. Agriculture and Cooperation, 1857-1956", in Singh V.B. (ed) op-cit, P. 113, table 7.

IV کھیتی کی پیداوار

زمین پر دباؤ کوئی مصیبت نہ لاتا۔ بشرطیکہ جس رفتار سے آبادی بڑھ رہی تھی اسی رفتار سے رقبہ زیر کاشت اور پیداوار میں اضافہ ہوتا جاتا۔ بدقسمتی سے ایسا نہیں ہوا اگرچہ کاشت کا رقبہ 221 ملین ایکڑ سے جو 1900-5 میں تھا 250 ملین 1940-45ء میں بڑھکر غذائی پیداوار والے کھیتیوں کا ہوگیا۔ اور غیر غذائی پیداوار والے کھیتوں کا رقبہ اسی مدت میں 53 ملین سے بڑھکر 72 ملین ہوگیا/7 ـــ لیکن آبادی میں اضافہ اس سے زیادہ تیزی کے ساتھ ہوا۔ اور ایک فرد کا حصہ جو 1901ء میں 1.03 تھا وہ 1951ء میں گھٹ کر صرف 0.8 فیصد رہ گیا۔ اسی کے ساتھ غذائی پیداوار کی قیمت گھٹ کر 26 سے 122 (1900-5 بالمقابلہ 1940-50) رہ گئی لیکن غیر غذائی پیداوار میں معمولی سا اضافہ ہوا یعنی اسی زمانہ میں 38 سے الخ/8

تجارتی اغراض کی اشیاء کی پیداوار ہندستان کی اقتصادیات میں ایک چونکا دینے والا واقعہ ہے کیونکہ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہندستان جو آج تک اس میں پھنسا تھا کہ گاؤں والے اپنی ضرورت کی چیز بنا لیتے تھے۔ نہ باہر سے کچھ منگاتے تھے۔ اور نہ باہر کچھ فروخت کرتے تھے۔ اب اس پالیسی سے انحراف ہوا اس ترقیاتی منصوبے کی جانب کئی معاملات نے رہنمائی کی۔

(1) رسل و رسائل کے ذرائع میں وسعت (2) سن اور روئی جیسے کچے مال کی مانگ تاکہ وطن کے اندر اور اس کے باہر کی صنعتوں کو سامان فراہم کیا جاسکے۔ جہاز رانی پر ٹیکس کی سہولتوں نے باہر مال بھیجنے پر اکسایا اور اندرون ملک سے بندرگاہ تک سامان لے جانے کے لئے ریلوے نے جو سستی

---

7 - Singh, V. B. Op-cit, P. 115, table 115A. Dr. B. M. Bhatia gives the following figures.

1901 — 1902	رقبہ غذائی پیداوار کی کاشت کا	187.63 Million ایکڑ
1901 — 1902	" " " "	33 Million ایکڑ
1939 — 1940	" " " "	197.45 Million ایکڑ
1939 — 1940	رقبہ غیر غذائی پیداوار کی کاشت کا	42.12 Million ایکڑ

8 - Ibid, P. 116.

شرح قائم کی اس نے زبردست رغبت پیدا کی کہ تجارتی اشیاء کی پیداوار کے رقبہ میں اضافہ کیا جائے۔ اس دوران میں غذائی اور تجارتی اشیاء کی پیداوار کے چارٹ سے نتائج خود بہ خود برآمد ہوں گے۔/ 9

۱	۲	۳	۴
کل غذائی پیداوار کا اندازہ ملین (ٹن)	رقبہ تجارت پیداوار کے لئے زیر کاشت	رقبہ غذائی پیداوار کے لئے زیر کاشت	
73.9	100	100	1893ء سے 1896ء کا اوسط
74.0	126	99	1906ء سے 1916ء تک کا اوسط
60.6	171	94	1926ء سے 1936ء تک کا اوسط
60.3	185	93	1930ء سے 1946ء تک کا اوسط

اس درمیان میں آبادی کے اضافے کا تناسب 100، 107، 120، 134 ہے۔ اس طرح ظاہر ہے کہ جب 1901ء سے 1941ء تک شرح آبادی میں اضافہ 34 فیصد ہوا تو ان پانچ دہائیوں (دس سالوں) میں پیداوار میں اضافہ (غذائی اور غیر غذائی) صرف 2 فیصد ہوا/10

دوسرا واقعہ جس نے ہندستان کے زرعی نظام پر اثر ڈالا وہ دیہات کی اقتصادیات میں روپیہ کے استعمال میں مسلسل اضافہ تھا۔ لگان اور مال گذاری میں نقد روپیہ لیا جاتا تھا۔ اور اسی طرح ضرورت مند کاشتکاروں اور قرضہ دینے والے مہاجنوں کے درمیان لین دین نقدی تھا۔ اسی طرح سڑکوں کے تعمیر ہونے اور مال کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کے ذرائع کی سہولت نے مزید نقدی کاروبار کو فروغ دیا۔

اس رجحان نے غذائی پیداوار پر اثر ڈالا کیوں کہ اب پیداوار صرف اپنے وطن والوں کے کھانے تک محدود رکھنے کا واحد مقصد کاشتکار کا نہ تھا۔ لیکن پیداوار میں تنوع، اس رقبہ میں اضافہ

9- Thorner, Dr., Long Term Trends in out put in India in Kuznets, Moore and Spengler, op-cit, PP. 121-22

13 DPD/71-4.

جن کی پیداوار بازار میں بکے عام جنتا کی بڑی تعداد کے لئے ذرا بھی نفع بخش نہ تھا۔

ادھر برطانیہ کے اشیاء تیار کرنے والوں نے ہندستان سے کچا مال مانگنا شروع کیا کہ نے مندرجہ بالا رجحان کو اور ترقی دے دی نتیجہ یہ ہوا کہ روئی، اوکھ، سن اور تلہن کی کاشت پر کاشتکار کی توجہ زیادہ مبذول ہوئی۔ انجام کار غذائی پیدوار کی کاشت گھٹ گئی۔

1936ء سے 1946ء کے دس سالوں میں غیر غذائی پیداوار کا تناسب غذائی پیداوار کے مقابلے میں 22% سے بڑھکر 44% ہوگیا/11 اس طرح اگرچہ مجموعی طور پر پیداوار دوگنی ہوگئی لیکن غیر غذائی پیداوار کل کا صرف 18% فیصدی رہا۔ مختصر یہ کہ جب یہ صحیح ہے کہ تجارتی کاروبار نے ترقی کی۔ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ترقی محدود تھی اور اس کی نوعیت اور اس کا رخ برطانیہ کی (ہی) اقتضا ضروریات طے کرتی تھی۔

بلین (Blyn) کے قول کے مطابق تمام قسم کی پیداوار کا چارٹ جو 1893ء سے 1896ء اور 1936 سے 1946 تک ہیں یہ ظاہر کرتا ہے کہ مجموعی طور پر کل پیداوار میں 0.2% فیصدی کی کمی ہوئی۔ لیکن غذائی پیداوار میں 2.3% فیصدی کی کمی ہوئی/12 انہوں نے جو حساب لگایا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ 1901ء اور 1902ء کے درمیان اور 1946-47ء کے درمیان مجموعی پیداوار 48081,000 ٹن سے گھٹ کر 47,247,000 ٹن رہ گئی/13

V زراعت اور رقبہ جات کی تقسیم

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس قدر غذا کی ضرورت بڑھتی جاتی تھی۔ اسی قدر زراعت کی لیاقت اسے بخوبی پورا کرنے کی کم ہو جاتی ہے تھی۔ وہ اعداد و شمار جن سے ظاہر ہوگا کہ فی کس کتنا رقبہ کھیت کا پڑتا تھا۔ اسے ثابت کردے گا۔ ہولڈرنس (Holderness) نے ظاہر کیا ہے کہ 1911 میں زرعی آبادی کے خاندان کے ہر فرد کے لئے 2.25 ایکڑ رقبہ پڑتا تھا جس سے

---

10 - Ibid, P.122.

11 - Singh, V.B. op.cit., P.127.

12 - Blyn, G. Agricultural Trends in India (1966) P.29, Table I.2.

13 - Ibid, P.354.

اس کو ان لوگوں کا بھی پیٹ بھرنا ہوتا تھا جو کھیتی نہیں کرتے تھے اور باہر بھیجنے کے لئے بھی غلہ دینا پڑتا تھا۔ انجام کار کاشتکار کے ہر فرد پر 2/3 ایکڑ سے زیادہ رقبہ نہیں آتا تھا۔ /14/

ہیرولڈ مین (Harold Mann) نے حساب لگایا ہے کہ پونہ کے ضلع میں 81٪ فیصد کھاتے دس ایکڑ سے کم اور 60٪ فیصدی کھاتے پانچ ایکڑ سے کم تھے 1921ء کی مردم شماری کی رپورٹ میں ہے کہ بنگال، صوبہ متوسط اور بمبئی کے علاوہ ہر کاشتکار کا زیر کاشت رقبہ پانچ ایکڑ سے کم تھا۔ اتر پردیش تو سب سے نچلی تہہ میں تھا کیوں کہ یہاں تو صرف 2.5 ایکڑ ہر فرد پر آتا تھا۔ زراعتی کمیشن (Agricultural Commission) 1926-28ء نے اس امر سے اتفاق کیا ہے کہ پنجاب میں 55٪ فیصدی کاشتکاروں کے پاس خاندان کے ہر فرد پر پانچ ایکڑ سے کم رقبہ تھا۔ فلاؤڈ کمیشن (Flood Commission) کے مطابق بنگال میں 57.7 فیصدی کاشت کے کھاتے فی کس تین ایکڑ سے کم تھے 75٪ فیصدی پانچ ایکڑ سے کم۔ کول (Coale) اور ہوور (Hoover) نے 1951ء میں یہ بتلایا ہے کہ اوسطاً 1.2 ایکڑ فی کس رقبہ زیر کاشت تھا۔

ڈیوس (Davis) کے قول کے مطابق جو رقبہ زمینداری اور رغبت داری نظم میں 1890ء میں فی کس زیر کاشت تھا وہ 1940ء میں بالترتیب 2.4 سے 1.9 ایکڑ اور 2.4 سے 1.8 ایکڑ گھٹ کر رہ گیا۔ /15/ 1951ء میں جب پہلا پانچ سالہ پلان بننے کو ہوا تو اس وقت جو تحقیقات کی گئی اس سے پتہ چلا کہ پانچ ایکڑ سے کم کے کھاتوں کا حسب ذیل حال تھا۔ /16/

یوپی	81.2 فیصد یا کل رقبہ کا 38.8 فیصد	
بمبئی	52.3 فیصد یا کل رقبہ کا 14.0 فیصد	
مدھیہ پردیش	51.5 فیصد یا کل رقبہ کا 10.8 فیصد	
اڑیسہ	74.2 فیصد یا کل رقبہ کا 30.1 فیصد	

14- Holderness, T.W. Peoples & Problems of India (1911) P. 139.

15- Davis, K. Population of India and Pakistan. P. 208, Figure 46

16- Wadia, P.R. and Marchant, K.T. Our Economic Problem P. 253. foot note

بہار	83.3 فیصد یا کل رقبہ کا فیصد
آسام	66.1 فیصد یا کل رقبہ کا 36.0 فیصد
میسور	66.2 فیصد یا کل رقبہ کا 25.3 فیصد
ٹراونکور کوچین	94.1 فیصد یا کل رقبہ کا 44 فیصد
ہماچل پردیش	95.0 فیصد یا کل رقبہ کا 21 فیصد
پیپسو	45.4 فیصد یا کل رقبہ کا 8.2 فیصد

1936ء سے 1950ء تک غلہ بوئے جانے والے کھیتوں کا رقبہ 10٪ فیصدی بڑھ گیا لیکن پیداوار صرف 6.3 فیصد بڑھی/17 اور جب کہ آبادی 15٪ فیصد بڑھ گئی۔

VI زرعی قرضے اور کھاتوں کے رقبہ جات کا گھٹ جانا

گاؤں کے رہنے والے لوگوں کی تکلیف و مصیبت کا رشتہ قرضے کے بوجھ کے دباؤ کے بڑھ جانے سے بھی متعلق تھا اور اس سے بھی متعلق تھا کہ کاشتکاران اور گاؤں کے کاریگروں کا جو غریب طبقہ تھا اس میں اضافہ ہوگیا ان دو وجوہ سے محروم بین مزدوروں یا ادنیٰ ترین مفلس مزدوروں کا وجود ملک میں ہوا۔

جہاں تک کاشتکار پر قرضے کا سوال ہے ویرا اینسٹے (Vera Anstey) تسلیم کرتی ہے کہ "مسلسل قرضہ کا اضافہ برطانوی حکومت کا ایک منحوس نتیجہ ہے"/18۔ لیکن وہ اس بات سے انکار کرتی ہے کہ غریبی کے بڑھ جانے سے قرضوں میں اضافہ ہوا۔ بلکہ اس کے بالکل برخلاف وہ یہ سمجھا دیتی ہے۔ کہ قرضے کی وجہ یہ ہوسکتی ہے۔ کہ لوگوں کی خوش حالی میں اضافہ، امن وامان میں ترقی کی وجہ سے ہوا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زمین کی قیمت بڑھ گئی۔

جب کہ صحیح ہے کہ زمین کی قیمت کا بڑھ جانا کاشتکار کے اوپر قرضے کی زیادتی کا ایک اہم سبب تھا۔ لیکن یہ کہنا غلط ہے کہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کی خوش حالی میں اضافہ ہوگیا تھا۔ اور مرکزی بنکنگ کمیٹی (Central Banking Committee) نے جو رپورٹ 1931ء میں

17- Kuznets, Moore and Spengler, op. cit. P. 281.

18- Anstey, Vera, The Economic Development of India P. 187.

دی ہے اس میں یہ تحریر کیا ہے کہ۔

"مقروض ہونے کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آخر کار زمین بک کر کاشتکار کے قبضہ سے مہاجن کے پاس چلی جاتی ہے اور اسی سے بعوم ہین مفلس مزدوروں کے طبقے کا وجود عمل میں آتا ہے جس کی مالی حالت پہلے سے بہت زیادہ کمزور ہو جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کھیتی پوری مہارت سے نہیں کی جا سکتی کیونکہ مہاجن لوگ ایسی شرح پر زمین شکمی پر دیدیتے ہیں جس سے اس کو بہت کم ملتا ہے اس لئے اس کو کوئی رغبت عمدہ فصل تیار کرنے کی نہیں ہوتی"۔ 19/

کاشتکار کے اوپر قرضے کی زیادتی کے علاوہ اور بھی امور ایسے تھے جو اس کی مفلسی میں برابر اضافہ کر رہے تھے۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کھاتوں کے ٹکڑے ہو رہے تھے جس سے کھاتے اتنے چھوٹے ہو جاتے تھے جس کی کاشت میں لاگت سے کم پیداوار ہوتی تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ کھاد پر پیسہ نہ خرچ کرنے کی وجہ سے اور فصل کو نہ بدلنے کے سبب زمین زرخیز نہیں رہ گئی تھی۔

ان حالات کا نتیجہ یہ تھا کہ کاشتکار آہستہ آہستہ دیوالیہ پن کی سرحد پر پہنچ گیا تھا۔ وہ مجبور ہو گیا تھا کہ وہ اپنی کل زمین بیچ دے اور بعوم ہین مزدوروں کی فوج میں بھرتی ہو جائے اس کے نتیجہ میں پیداوار پر اثر پڑا۔ اور کاشتکار کے راشن کا جو کوٹا زیادہ فاقہ کی سطح کا تھا کاشتکار کے مقروض ہونے کی وجہ سے دیہات کی آبادی کی ایک بڑی تعداد فاقہ کشی کی نوبت تک پہونچ گئی جس کو کوئی موقع متبادل روزگار کا میسر نہ تھا۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ہوا کہ زمیں داروں اور مہاجنوں کے پاس زمین کی مقدار بڑھتی گئی جن میں سے بہت سے لوگوں کو کھیتی کرنے میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔

چھوٹے زمینداران اور کاشتکاران کا مہاجنوں کے قرضہ پر روز افزوں انحصار کرنے کا نتیجہ ان کی تباہی اور بربادی ہوا۔ مرکزی بنک اور تحقیقاتی کمیٹی (The Central Bank-ing Enquiry Committee) 1931ء میں یہ بیان ہے "اس امر پر اتفاق آرا ہے کہ گذشتہ صدی کے اندر قرضے کی مقدار روز بڑھتی رہی ہے"۔/ 2

19- Report of the Central Banking Enquiry Committee (1931) P. 59.

ڈارلنگ (Darling) کی تحقیقات کے مطابق پنجاب کے زمینداران میں سے صرف 17 فیصدی قرضے کی وبا سے بچے ہوئے تھے اور اوسط قرضہ 463 روپیہ سے کم نہ تھا یعنی مالگذاری کا بارہ گنا / 12 !

قانون انتقال اراضی (Land Alienation Act) کے پاس ہونے کے بعد بھی کاشتکاروں کو قرضہ دینے والے مہاجن پنجاب کے دیہی علاقوں میں طاقت پکڑ رہے تھے جیسا کہ پنجاب انتظام مالگذاری رپورٹ Punjab Land Revenue Administration Report) جو 1936-37 میں شائع ہوئی اس سے ظاہر ہو گا کہ پنجاب کے کھیتوں پر قرضہ 90 کروڑ سے جو 1921 میں تھا 1929 میں 135 کروڑ ہو گیا ۔ جو بدحالی 1929 میں تمام دنیا کے اندر پھیلی ہوئی تھی اس کے اثر سے قرضہ دو نا ہو گیا ۔

ہندوستان کے دیہی علاقے کے قرضہ کا 1911ء میں 3000 ملین سے بڑھ کر 1938ء میں 18000 ملین / 22 ہو جانا اس بات کا ثبوت ہے کہ ہندوستان کے گاؤں کی مالی حالت بدتر ہو گئی تھی اور ان کے اندر خوش حالی نہیں آئی تھی ۔ کاشتکاروں نے مجبور ہو کر اپنی زمینوں کو چھوڑ دیا ۔ اور غلہ کی پیداوار گر گئی ۔

زرعی زمینوں کا انتقال

اوپر جو اعداد و شمار قرضہ کی زیادتی کے متعلق دیئے گئے ہیں وہ پورے طور پر ظاہر کرتے ہیں کہ کھیتی کرنے والے پر بوجھ برابر بڑھ رہا تھا ۔ قرضے کے دباؤ کے نیچے کھیتی کرنے والے اس بات پر مجبور ہوئے کہ اپنی زمین رہن رکھیں اور آخر کار اپنے چھوٹے چھوٹے قطعات اراضی کو بیچ ڈالیں مورخین کا اس پر اتفاق ہے کہ زمین کا بیعنامہ اور خریداری جو برطانوی راج کے پہلے بہت کم یاب تھی ۔ برطانوی راج کے اندر عام ہو گئی لیکن بہر حال تمام ہندوستان کے اعداد و شمار کا حاصل کرنا مشکل ہے ۔ ڈارلنگ (Darling) کی تحقیقات کے مطابق رہن نامے سکھ حکومت کے اندر کامیاب تھے ۔ لیکن 1878 تک کل صوبے کا 7 فیصدی رہن ہو چکا تھا ۔ اس کے بعد کے

30 سالوں میں مہاجنوں کی تعداد میں بہت اضافہ ہوگیا۔ اور وہ بہت خوشحال بھی ہونے لگے حتیٰ کہ ان کی تعداد جو 1868ء میں 53263 تھی وہ بڑھکر 1911ء میں 99,391 ہوگئی۔ 1930ء میں ڈارلنگ (Darling) نے حسب ذیل نتیجہ اخذ کیا۔ "اس بات کا خطرہ ہے کہ انتقال اراضی ایکٹ کے باوجود کسان کی تباہ حالی ایک وسیع پیمانے پر پھر سے شروع ہو۔ ابھی سے ایسے امکانات کی نشان دہی شروع ہوگئی ہے کہ مغربی پنجاب میں بڑے بڑے زمیندار ان اس ایکٹ سے فائدہ اٹھاکر کاشتکاروں کو محروم کرکے اپنی اراضیات کے رقبوں میں اضافہ کر رہے ہیں/23

06-1905ء سے 36-1932ء تک تیس سالہ رکارڈ کے مطابق رہن شدہ زمین کا رقبہ اوسط 18,810 ایکڑ سے بڑھکر 327,835 ایکڑ ہوگیا/24 ـــ بمبئی کی مالگذاری رپورٹ کے مطابق 27-1926ء سے 37-1936ء تک دس سال کے اندر پانچ ملین ایکڑ زمین یا کل اراضی زیر کاشت کا ½20 فیصدی کاشت کاران کے قبضہ سے نکل کر مہاجنوں کے پاس پہنچ گیا۔ اور واقعی کھیتی کرنے والے کاشتکاروں کی تعداد قریب ½9 فیصدی گھٹ گئی/25۔ Wadia (واڈیہ) اور Merchant (مرچنٹ) کا اندازہ یہ ہے کہ پنجاب میں 06-1905ء انتقال اراضی کا رقبہ 40 ہزار تھا وہ 39-1938ء میں 115,000 ہوگیا/26 ـــ اسی صوبے کے اندر رہن بالقبضہ کی زمین جو 23-1922ء میں کل رقبہ زیر کاشت کی ½10 فیصد تھی ۔ 37-1936ء میں بڑھکر ½13 فیصدی ہوگئی/27

یو۔ پی میں وہ کل رقبہ جس سے کاشتکار بے دخل ہوا حسب ذیل چارٹ سے ظاہر ہوگا۔/28

27-1926ء سے 1928ء تک (دو سال)   347,421 ایکڑ

24- Patel. S. op-cit, P.57.

25- Ibid, P.59.

26- Wadia and Merchant op-cit, P.365.

27- Ibid.

28- Ibid, P.366.

1929-30ء سے 1932-33 تک (تین سال) 789,810 ایکڑ
1933-34 سے 1936-37 تک (تین سال) 911,655 ایکڑ
1937-38 سے 1938-39 تک (ایک سال) 210,624 ایکڑ

زراعت اور غذائی پیداوار

غذائی پیداوار کی سالانہ مجموعی مقدار 1897—1906 کے دس سالوں سے 1937—1946 کے دس سالوں میں 166 پونڈ فی کس کی کمی کا اندازہ ہے یعنی 500 پونڈ سے گھٹ کر 392 پونڈ رہ گئی۔[29] گیہوں جو ہندستان کی خاص پیداوار ہے اس کی مقدار 707 پونڈ فی ایکڑ جو 1918-1922 میں تھی 1947-48ء میں 599 پونڈ رہ گئی۔[30] دھان کی اوسط پیداوار فی ایکڑ جو پہلی جنگ عظیم کے دوران 962 پونڈ تھی وہ دوسری جنگ عظیم کے شروع کے وقت صرف 728 پونڈ رہ گئی۔[31] غذائی فصلوں کی پیداوار کی کمی کے بالمقابل تجارتی فصلوں کی مقدار پیداوار بڑھ گئی۔ اگرچہ تجارتی فصلوں کی پیداوار بڑھ گئی لیکن ان کا رقبہ زیر کاشت کم تھا۔ اس لئے اوسط سالانہ پیداوار تمام فصلوں کی 1893-94 سے 1945-46 میں 100 بڑھکر 110 ہوگئی۔[32]

اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ ہندستان کی آبادی میں اس دوران (1901—1941) مجموعی طور پر 39 فیصدی کا اضافہ ہوا۔ یہ ظاہر ہے کہ زرعی پیداوار آبادی کے اضافے سے بہت پیچھے تھی۔ یہ بحث کی جاتی ہے کہ پیداوار میں کمی لازمی طور پر پیداوار سے متمتع ہونے والوں کی محرومی پر منتج نہیں ہوتی ہے کیونکہ پیداوار میں جو کمی ہوتی ہے وہ قومی آمدنی میں جو زیادتی ہوتی ہے

29- Kuznets Moore and Spengler. op-cit. P. 123.
30- Singh. V.B. op-cit. P. 143.
31- Burns. W. Technological possibilities of Agricultural Development in India. 1944. P. 55. (Dutt R. Palme India to day. P. 181.
32- Blyn. G. op-cit P. 29.

اس کی درآمد سے پوری ہو جاتی ہے۔ بدقسمتی سے یہ معاملہ بہت بحث طلب ہے کہ آیا اس دوران میں قومی آمدنی ضروری حد تک بڑھی بھی یا نہیں۔

ہندوستان کی زراعت کا ایک بدنصیب پہلو یہ بھی رہا ہے کہ کھیتیوں کی پیداوار بہت کم رہی ہے۔ 1900 سے 1947 کے درمیان جبکہ مجموعی رقبہ زیر کاشت 20% فیصدی بڑھ گیا مجموعی زرعی پیداوار صرف 14% فیصدی بڑھی۔ اس طرح پیداوار میں 7% فیصدی کی کمی ہوئی[33] یہ سوچا ؤ دیا گیا ہے کہ پیداوار میں کمی کا سبب کسی حد تک یہ تھا۔ کہ زمین کی زرخیزیت کم ہوگئی تھی لیکن زراعت پر جو رائل کمیشن (1928) بٹھایا گیا تھا اس نے اس کی تردید کی ہے اور زیادہ قریبی زمانہ کی شہادت وہ اعداد و شمار ہیں جو پلاننگ کمیشن نے 1953ء میں تیار کئے ہیں۔ اور وہ ظاہر کرتے ہیں کہ 39-1936 اور 49-1948 میں جو اوسط پیداوار دھان کی ہوئی وہ فی ایکڑ 809 سے 698 پونڈ تک کم تھی اور جہاں تک گیہوں کی پیداوار کا تعلق ہے وہ 623 سے 568 پونڈ تک کم ہوئی۔ 34/. یہ اعداد و شمار ممکن ہے کہ مکمل طور پر قابل اعتماد نہ ہوں لیکن یہ کمی کے رخ کو ظاہر کرتے ہیں۔ اگر دوسرے ملک کی پیداوار سے مقابلہ کیا جائے تو ہندستان کی پیداوار ان سے کم نکلے گی۔

زرعی زوال اور غلہ کی درآمد برآمد

غذائی فصلوں کی پیداوار کی کمی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان جو اب تک کثیر مقدار میں غلہ باہر بھیجتا تھا۔ اپنے کھانے کے لئے باہر سے غلہ منگانے کے سہارے پر مجبور ہوگیا۔ 16-1915ء سے 20-1919 کے پانچ سالوں کے اندر جو غلہ باہر سے منگایا گیا اس سے اس غلہ کی مقدار جو باہر بھیجا گیا 4,00,000 ٹن زیادہ تھی 36-1935 سے 40-1939 کے درمیان کل غلہ جو باہر سے منگایا گیا۔ 1.38 ملین زیادہ تھا۔ لڑائی کے سالوں میں بالخصوص 1942 میں برما کے نکل جانے کے بعد درآمد میں کمی ہوئی۔ لیکن 47-1946 میں ان کی مقدار پھر بڑھ گئی اور بڑھ کر 2.58 ملین ٹن

33- Singh. V. B. op-cit. P. 116

34- Wadia and Merchant, op-cit, P. 207.

ہوگئی۔/35

غذا، مشروبات اور تمباکو کی برآمد پہلی جنگ عظیم میں 32٪ فیصدی تھی وہ 1940-41 میں گھٹ کر 22٪ فیصدی ہوگئی۔ اور کچے مال کی برآمد 47 میں 3٪ ہوگئی۔/36

1920-21 سے 1944-45 تک 24٪ فیصدی سے گھٹ کر 20.9٪ فیصدی اور 50.2٪ فیصدی سے گھٹ کر 45.5٪ فیصدی رہ گئی۔/37 Vera Anstey (ویرا اینسٹے) کے قول کے مطابق گیہوں کی برآمد میں تبدیلی عالمگیر جنگ اور 1933-34 میں 14٪ فیصدی اور دو فیصدی کی کمی ہوئی اور اسی طرح چاول میں کل پیداوار کی 9٪ فیصدی سے 6٪ فیصدی تک ہوئی۔/38

لڑائی سے پہلے (1909-14) گیہوں کی اوسط برآمد 3,88,000 ٹن تھی لیکن گھٹ کر 1932-33 میں 2000 ٹن رہ گئی۔/39 اس کے بعد ہندوستان کا یہ حال ہوگیا کہ وہ گیہوں باہر سے منگانے لگا اور 1931 میں گورنمنٹ کو درآمد پر 40٪ فیصدی کسٹم ڈیوٹی لگانا پڑا تاکہ ہندوستان کے مفادات کا تحفظ آسٹریلیا کے مقابلہ میں ہو سکے۔

گیہوں کی برآمد میں کمی کے کئی اسباب تھے۔ ایک سبب تو یہ تھا۔ غذائی پیداوار کے لئے جو رقبہ کاشت کیا جاتا تھا اس کی مقدار گھٹ گئی تھی۔ دوسرے فی فصل کی پیداوار جو 1897-1907 کے دس سالوں میں 800 تھی لیکن 1936-1946 کے دس سالوں میں اس سے گھٹ کر 5.7-6 رہ گئی۔/40 اور ایک وجہ یہ بھی تھی کہ آبادی کے بڑھ جانے سے غذائی پیداوار کا خرچ بھی بڑھ گیا تھا اگرچہ زمین زیر کاشت کا زیادہ حصہ غذائی پیداوار کے لئے استعمال ہوتا تھا یعنی تقریباً کل کا 9/15 اتنا کہ ہی پیدا کرنے میں لگا تھا۔ لیکن ہندوستان کا دوسرے ملکوں سے غلہ درآمد کرنے کا انحصار بڑھتا ہی گیا لیکن یہ

35- Singh, V.B. op. cit. PP. 134-35.

36- Davis, K. op. cit. P. 213.

37- Singh, V.B. op. cit. PP 457 and 465

38- Ansley V. op. cit. P. 340.

39- Gadgil, D.R. The Industrial Evolution of India in Recent times. (1942 ed) P. 200, Not 2.

40- Kuznets, Moore and Spengler op. cit. P 277

یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ اپنے ملک میں غلہ کی پیداوار کی جو کمی ہوئی تھی وہ باہر کے ملکوں سے غلہ درآمد کرکے پوری کرلی گئی۔ (بلائن) نے حسب ذیل اعداد و شمار میں کل کیفیت کو آئینہ کر دیا ہے۔ ۱۶/

سال	غذائی اجناس کی پیداوار (ہزاروں کے ٹن میں)	مکمل تجارتی مقدار (ہزاروں کے ٹن میں)	باقیماندہ جو غذا کے لئے میسر تھا
1901 - 1902	48,081	176	47,903
1946 - 1947	47,297	890	48,187

اسی طرح اگرچہ آبادی میں اضافہ ہوگیا لیکن جو اجناس بطور غذا میسر تھیں وہ تقریباً وہی رہیں

معیار زندگی میں زوال

فی کس رقبہ کاشت میں کمی اور پیداوار گھٹ جانے سے معیار زندگی پر اثر پڑا۔ طبی معیار کے مطابق ایک شخص کو تندرست حالت میں رہنے کے لئے 2400 سے لیکر 3,090 حرارے کی ضرورت ہے (Megaw) میگو نے 1933 میں یہ رپورٹ کی ہے کہ ہندستان کے صرف 39% فیصدی آدمیوں کو مناسب غذا ملتی ہے۔ 41% فیصدی کو ضرورت سے کم غذائیت ملتی ہے اور 20% فیصدی بد ترین حالت میں رہتے ہیں۔ 42/ AYKROYD ایکرائڈ نے دس سال کے بعد یہ کہا کہ ایک تہائی آبادی کو ضرورت سے کم غذائیت ملتی ہے۔ زراعت پر رائل کمیشن کی رپورٹ (1924-28ء) اور لیبر (مزدور) پر رائل کمیشن کی رپورٹ 1929 بھی اسی جانب اشارے کرتی ہیں۔

وہ چارٹ جس میں جیل کے قیدیوں اور قحط زدہ لوگوں کو راشن دیا جاتا ہے ان کی مقدار کا

41- Blyn. G. op. cit Appendix table 5C. P.334.
42- Dutt. R. Palme, India Today. PP. 36-53.

—— بمبئی کے بعض مزدور طبقہ کے راشن سے مقابلہ کیا گیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بمبئی کے مزدور کو تو خاندان کے بجٹ میں 1.29 پونڈ فی کس راشن ملتا ہے لیکن قید بامشقت قیدیوں کو 1.5 پونڈ دیا جاتا ہے۔ قحط کا جو قانون مرتب ہوا۔ اس نے اسی کو کافی سمجھا کہ ایک شخص جو قحط میں کھدائی کا کام کرتے ہیں اتنا ہی راشن دیا جائے جو بمبئی کے مزدور کے حصہ میں آتا ہے یعنی 1.29 پونڈ فی کس بمبئی کے مزدور اور جیل کے قیدی کے راشن میں جو اختلاف ہے وہ ایسا نہیں ہے کہ نظر انداز کر دیا جائے لیکن بمبئی شہر کے مزدور کی حالت دیہات کے مزدور سے بہتر ہے۔ موخر الذکر کے کھانے کے اجناس کے کوٹے کو ضرور اس کی صحت اور طاقت کو قائم رکھنے کے لئے ناکافی تصور کرنا پڑے گا حقیقت یہ ہے کہ اس کی حالت نہایت ابتر تھی۔

خوراک میں کمی بیماریاں اور شرح اموات کی زیادتی یہ سب ایک دوسرے سے ملی جلی چیزیں ہیں ان کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مزدور خوش اسلوبی سے کام نہیں کر سکتا۔ اس کی طاقت گھٹ جاتی ہے اور اس میں سستی آ جاتی ہے۔ برطانوی حکومت پر یہ افسوس ناک نتیجہ تھا کہ اپنی سلطنت کو مستحکم کرنے کے ڈیڑھ سو سال کے بعد بھی ہندستان کی ایک تہائی آبادی مستقل بھوک میں مبتلا رہی۔

VII زرعی طبقہ

دیہی علاقوں کی مالی تباہ کاری گاؤں کے سماجی نظام اور ملک کی عام اقتصادی حالت کے لئے بڑے دور رس نتائج رکھتی ہے۔ ان پر دو عنوانات کے تحت غور کیا جا سکتا ہے۔ (1) مفلس کاشت کاروں کی تعداد میں اضافہ اور (2) لگان وصول کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ۔

ہندستان کی زراعت سے متعلق آبادی تین طبقوں میں منقسم کی جا سکتی ہے۔ (1) وہ زمینداران جو کاشت نہیں کرتے تھے۔ (2) کھیتی کرنے والے خواہ وہ مالک اراضی ہوں یا کاشتکار اور (3) زرعی مزدور۔ جہاں تک پہلے طبقہ کا تعلق ہے یعنی وہ زمینداران جو کھیتی نہیں کرتے تھے اور صرف کاشتکاروں سے لگان وصول کرتے تھے۔ شہادتیں بتلاتی ہیں کہ ان کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی تھی اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ کاشتکاروں پر قرضہ بڑھتا جا رہا تھا جس کی ... اور بیع کے ذریعہ کھیت قرضہ دینے والے مہاجنوں اور خوش حال زمینداروں کے قبضہ میں چلے جا رہے تھے۔ دوسرا ثبوت یہ ہے کہ کھیتی کے مزدوروں میں اس وجہ سے اضافہ ہو رہا تھا کہ کاشتکار اپنی زمین سے محروم کیا جا رہا تھا۔ مردم شماری کی جو رپورٹ ان سالوں کی ہے وہ

پیشوں کی تقسیم کے عنوان کے اندر بحث کرتے ہوئے اس کا کافی ثبوت فراہم کرتی ہے ۔

بھوم ہین مزدور کا عالم وجود میں آنا

کاشت کار کی پیٹھ پر تین بوجھ لدے ہوئے تھے (۱) مالگذاری اور ٹیکس کی ادائیگی گورنمنٹ کو (۲) لگان زمیندار کو زمیندارانہ نظام کے علاقوں میں اور مالکان آراضی کو رعیت واری نظام کے علاقوں میں (3) قرضوں کے سود کی ادائیگی ۔ یہ تینوں بوجھ اس کی کمر توڑ رہے تھے ۔ اس کا نتیجہ ہوا کہ چھوٹے زمینداران ایسے کاشتکار بن کر رہ گئے جن کو زمیندار اپنی مرضی سے جب چاہے بے دخل کر سکتا تھا اور کاشتکاران بھوم ہین مزدور ہو گئے ۔

اس تاریخ کی گذشتہ جلدوں میں یہ دکھلایا گیا ہے کہ انیسویں صدی کے وسط تک بھوم ہین مزدوروں کی تعداد ناقابل لحاظ تھی ۔ لیکن 72-1871 سے قبل کچھ ایسے اعداد و شمار نہیں ملتے ہیں جن سے پتہ چلے کہ زراعت کرنے والوں کی کل تعداد کیا تھی 1872ء سے 1931ء تک ہر دس سال کے بعد مردم شماری کا جو ریکارڈ ملتا ہے وہ اس وجہ سے ابہام اور پراگندگی خیال پیدا کرتا ہے کہ ایک مردم شماری سے دوسری مردم شماری تک پیشہ وروں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا اصول بدلتا رہتا ہے اور 1931ء کے بعد پیشوں کی بنیاد پر آبادی کی تقسیم کرنے کا ریکارڈ ہی ختم کر دیا گیا ۔

لیکن پھر بھی ماہرین اقتصادیات نے مختلف مردم شماری کے اعداد و شمار سے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی ہے کہ زرعی مزدوروں کی نسبت کل کھیتی کا کاروبار کرنے والوں کے مقابلے میں کیا تھی ۔ ان حسابات نے یہ ظاہر کیا ہے کہ انیسویں صدی کے تین دس سالوں میں زرعی مزدوروں کی تعداد قلیل تھی 1891ء میں ان کی نسبت بہ مقابلہ کل کھیتی کا کام کرنے والوں کے صرف 13% فیصدی تھی ۔ اس کے بعد زبردست قحط نے ملک کو تہہ و بالا کر دیا اور اس کا انجام یہ ہوا کہ دیہی مزدوروں کی تعداد گھٹنے کے بجائے وسیع تر ہوتی نظر آتی ہے ۔ خاص کر ان علاقوں میں جہاں آبادی زیادہ گنجان تھی ۔ 43 کی مردم شماری نے اس حساب کو صحیح ثابت کر دیا کیوں کہ ان کی تعداد 25% فیصدی ہو گئی ۔ جیسے جیسے حالات سدھرتے گئے اور قحط کے اثرات کم ہوئے تعداد کم ہو گئی

43- Report of the Indian Famine Commission (1898) P. 363.

اور 1911ء میں وہ بڑھ کر 22 فیصدی رہ گئی۔ لیکن اس کے بعد پھر تعداد فیصد بڑھنے لگی 1921ء میں 26.2 اور 1931ء میں 38.7 فیصد ہوگئی۔ مردم شماری کے کمشنر نے اپنا یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ۔ "خواہ کچھ بھی ہو فیصد حساب جو بدلا ہے وہ بہت قابل لحاظ ہے۔ خواہ ہم کم سے کم کو قبول کریں اور اس کا 1911ء سے مقابلہ کریں"/44 زرعی مزدوروں کی تعداد میں فیصد اضافہ اس خیال کی تردید کرتا ہے کہ آبادی میں اضافہ (جو 1891ء سے 1931ء کے درمیان واقعی عظیم تھا) وہ اس بات کا ذمہ دار تھا کہ مفلس کاشتکاران وجود میں آئے اور کمی پیداوار اور قحط بھی اس کے ذمہ دار نہ تھے۔

مزدور طبقہ کی تعداد بہ مقابلہ کل کھیتی کرنے والوں کے فیصد سب سے زیادہ دکن، صوبہ متوسط، مدراس اور بمبئی پریسیڈنسی میں تھی۔ ان کے بعد مشرقی علاقوں کا نمبر آتا ہے یعنی بہار اور اڑیسہ، بنگال اور آسام۔ مغربی علاقوں پر سب سے کم اثر پڑا تھا۔ بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جہاں جہاں رعیت واری نظام نافذ تھا یا مستقل بندوبست کا نظام تھا وہاں سب سے زیادہ یہ پریشانی آئی تھی لیکن جہاں جہاں زمینداری نظام چل رہا تھا اور جہاں بندوبست ایک مقررہ مدت پر ہوا کرتے تھے اور زمین پر مشترکہ قبضہ تھا۔ جیسے کہ اتر پردیش میں۔ وہاں دیہی آبادی مفلس کاشت کاری کی وبا سے زیادہ تر محفوظ تھی۔

ہندستان کی کل آبادی میں سے 1951ء میں ستر فیصدی یعنی 249.1 ملین کاشتکار تھے اور بحوم ہین مزدوروں کی تعداد مسلسل بڑھ رہی تھی ان کی تعداد 1882ء میں 7.5 ملین اور 1921ء میں 21.5 ملین تھی 1931ء میں 33 ملین اور 1951ء میں 44.8 ملین یا کل آبادی کا 20.7 فیصد تھے (پاکستان کو منہا کرکے)/45

مندرجہ ذیل چارٹ سے بحوم ہین مزدوروں کی تعداد میں روز افزوں مسلسل اضافہ کا پتہ چلے گا۔ چارٹ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں :۔

44- Census of India (1931) Vol I, Part I, PP. 288-89.

45- Wadia and Merchant, op. cit, P. 544.

	1921	1931
	(ہزاروں کے شمار سے)	
بھومہین	2,845	3,257
کاشت کرنے والے	71,096	61,180
زرعی مزدور	28,879	31,480
دیگر	5,196	6,536

1921-31 کے دس سالوں کے اندر زرعی مزدوروں کی تعداد عام مزدوروں کی تعداد کے بالمقابل ایک ہزار میں 1921 کے تناسب سے بڑھکر 497 ہوگئی / 46

نیشنل سیمپل سروے (آٹھواں راؤنڈ)

ظاہر کرتا ہے کہ بیسویں صدی کے اوسط میں کھیتی کرنے والوں اور زرعی مزدوروں میں جو نسبت تھی اس میں نمایاں طور پر فرق ہوگیا تھا۔ دیہی خاندانوں کے 22٪ فیصدی بھومہین تھے ۔53٪ فیصدی کے پاس فی کس پانچ ایکڑ سے کم زمین تھی یعنی کل رقبہ زیر کاشت کا دس فی صدی ایسا تھا جبکہ 24٪ فیصدی کے پاس 5 ایکڑ سے 50 ایکڑ تک زمین تھی یعنی ایسے لوگوں کی تعداد کل رقبہ کی 68٪ فیصدی پر قابض تھی۔ صرف ایک فیصدی کے پاس 50 ایکڑ سے زیادہ زمین تھی یعنی کل رقبہ کا 16.0٪ ایسا تھا۔ دوسرے الفاظ میں کل کاشتکاران کے 34٪ فیصدی کے پاس ایک ایکڑ سے کم زمین تھی 64٪ فیصدی کے پاس ایک ایکڑ سے 5 ایکڑ تک زمین تھی اور صرف ایک فیصدی کے پاس 50 ایکڑ سے زائد زمین تھی / 47

مزدوروں کے روزگار کی کیفیت

جن شرائط پر مزدوروں سے کام کیا جاتا ہے ان کا حال یہ تھا کہ زیادہ تر تو عارضی طور پر رکھے

46 - Ibid. P. 364.

47 - Ibid. PP 367-68.

جاتے تھے۔ ان کے علاوہ صرف ایک مختصر تعداد ایسے مزدوروں کی تھی جنہیں وابستہ مزدور کہا جا سکتا تھا۔ یعنی وہ مزدور جن کو بڑے زمیندار کسی طرح مستقل طور پر رکھتے تھے۔ جو مزدور غیر مستقل تھے ان کا حال یہ تھا کہ وہ 189 دن تو کھیتوں پر کام کرتے تھے اور 29 دن کھیتی کے علاوہ دیگر جگہوں پر مزدوری کرتے تھے۔ یعنی سال کے 365 دنوں میں وہ صرف 218 دن کام کرتے تھے۔ جس کا مطلب ہوا کہ مزدور کو ایک سال کے اندر صرف سات مہینے کام ملتا تھا۔ البتہ دو مہینے اور متفرق کام ملتا رہتا تھا۔ دوسرا طبقہ مزدوروں کا تمام سال کام پر لگا رہتا تھا لیکن اس کی تعداد بہت قلیل تھی

کھیتی کرنے والے کاشتکاران رفتہ رفتہ نیچے اترتے اترتے کاشتکار برضامندی زمیندار کی حد کو پہنچ پاتے تھے۔ اور یہ سلسلہ برابر جاری تھا۔ اور روز افزوں ترقی کر رہا تھا 1882ء میں مفلس زرعی کاشتکاروں کی تعداد 7.5 ملین تھی لیکن 1921ء میں یہ تعداد 21.5 ملین ہو گئی۔ اور صرف انڈیا یونین کے علاقہ میں 1931ء میں 33 ملین ہوتے ہوتے 1961ء میں یہ تعداد 48.4 ملین ہو گئی۔ رادھا کمد مکرجی (Radha Kamal Mukerjee) نے جو نوٹ سیلاب (Flood) کمیشن کو دیا تھا اس میں لکھا تھا کہ "بنگال کی 31 فیصدی آبادی اپنی روزی نہیں کماتی ہے اور ان کو بے روزگار قرار دینا چاہیے"[48]۔

مزدوروں کا طبقہ

بدقسمتی سے ان مزدوروں میں بھی افلاس کے درجے تھے۔ اور ان کی مزدوری کے طریقے بھی مختلف تھے۔ وہ لوگ جو سب سے نچلی تہہ میں تھے ان کی حالت غلاموں یا پابند قیود مزدوروں سے کسی طرح بہتر نہ تھی۔ وہ ایک مالک کے ساتھ بندھے ہوئے تھے۔ اور اسے چھوڑ کر دوسرے مالک کے پاس نہیں جا سکتے تھے۔ وہ اور ان کے خاندان کے لوگ مجبور تھے کہ اپنی مرضی کو دخل نہ دیں اور جو بھی کام ان کے سپرد کیا جائے اس کو کریں۔ یہ لوگ ان بدقسمت لوگوں میں سے تھے جو کسی مصیبت کے وقت اپنی آزادی کو اپنے مہاجنوں کے ہاتھ رہن رکھنے پر مجبور ہو گئے تھے ان کے بعد ان مزدوروں کا نمبر آتا ہے۔ جو کہا ہے لگا ہے کام پر لگائے جاتے تھے۔ اور ان کو آپ پارٹ ٹائم مزدور کہہ سکتے ہیں۔ جن کی مجبوری یہ تھی کہ سال کے تین مہینے وہ بے کار رہتے

48۔ Ibid, P. 364.

تھے۔ مالکان سے وابستہ یا پورے وقت کام کرنے والے مزدوروں کا ایک علیحدہ طبقہ تھا۔ ان کے پاس اپنی کوئی زمین نہ تھی اور وہ زمینداران یا مالکان آراضی کے کھیتوں پر بطور مددگار کام کرتے تھے اور ان کو وہ شرائط جبراً منظور کرنی پڑتی تھیں جو مالکان آراضی طے کرتے تھے یہ وہ لوگ تھے جن کے پاس کچھ معمولی سی بونے کی قسم کی زمین بھی ہوتی تھی۔ جو ان کو رزق دینے کے لئے ناکافی تھی اور اس لئے وہ مزدوری کرنے کے لئے مجبور ہوتے تھے تاکہ اپنی آمدنی میں بقدر ضرورت اضافہ کر سکیں ان میں کاشتکاران برضامندی زمینداران، اور وہ کاشتکاران شامل تھے جو بٹائی پر کاشت کرتے تھے۔

ایس پٹیل (Patel S.) کے حساب کے مطابق ہندستان کے زرعی کارکنان کی تعداد جن کی تعداد [illegible] ملین تھی۔ حسب ذیل خانوں میں منقسم کی جا سکتے ہیں۔

لگان وصول کرنے والے	3.6 فیصد
کاشتکاران جن کے پاس 5 ایکڑ سے زیادہ زمین تھی	25.3 فیصد
نہایت قلیل زمین والے مزدور	33.3 فیصد
بجوم ہین زرعی مزدوران	37.8 فیصد

بہت قلیل زمین والے مزدوروں کی تعداد (24.3) کاشت کار برضامندی زمیندار اور بٹائی کاشت کاران کی تھی۔ اور بجوم ہین مزدوروں میں سے بڑا طبقہ وہ تھا جس کو بقدر ضرورت کام نہیں ملتا تھا۔ یعنی کل مزدوروں کی تعداد کا (35 فیصدی)/49

یہ امر دلچسپ ہے کہ ان لوگوں کی مجموعی تعداد جو زراعت یا چراگاہ کا پیشہ اختیار کئے ہوئے تھے وہ 1911ء سے 1933 کے درمیان تو بڑھ کر 106.8 ملین سے 109.7 ہو گئی لیکن ان لوگوں کی تعداد تو پورے وقت کی مزدوری کا روزگار کرتے تھے گھٹ گئی اور جو 1911ء میں 105.3 ملین تھی مگر 1933 میں 102.5 ملین ہو گئی اور پارٹ ٹائم یا امدادی طور پر کام کرنے والے مزدوروں کی تعداد اسی دوران 476,000 سے بڑھ کر 4,276,000 ہو گئی/50

49 - Patel, S. op cit pp. 148-49.

50 Ghate. B.G. Studies in India Economics. No I. Changes in the occupational distribution of the population (1940). P. 21.

زرعی مزدوروں کی اجرتیں

عام طور پر زرعی مزدوروں کی اجرتیں اگر نقد روپیہ کے حساب سے لگائی جائیں تو روز
بروز اس دوران میں بدتر ہوتی جا رہی تھیں۔ زرعی مزدور تحقیقاتی کمیٹی (1952) (Agricultural Labour Enquiry Committee) جس نے مختلف ریاستوں میں مزدوروں
کی اجرتوں کی تحقیقات کی اس نتیجہ پر پہنچی کہ اشیاء کی قیمتوں میں جو اضافہ ہوا ہے اس کے پیچھے
اجرتیں بھی کم ہوتی گئی ہیں لیکن جہاں کم نہیں ہوئی ہیں وہاں اجرتوں کی نسبت سے اشیاء
کی قیمتیں زیادہ بڑھی ہیں "/51

1946ء کے گورنمنٹ پبلیکیشن کے مطابق جو سماجی اور اقتصادی رجحانات اندرون
ہندستان کے بارے میں درمیان جنگ کے متعلق ہے۔ کلکتہ میں اس سال ماہوار اجرت کا
حساب لگانے پر پتہ چلتا ہے کہ 1921ء اور 1939ء کے درمیان اجرتیں گھٹی ہیں۔ اس کے بعد
بڑھی ہیں۔ اوران کا آخری عروج 1944 میں ہوا ہے۔ انڈکس سے پتہ چلتا ہے کہ 1921ء میں 179
سے گھٹ کر 1939 میں 108۔ ہو گیا اور پھر 1944 میں 298 ہو گیا۔

آسام کے چائے کے باغوں کے مزدوروں کی اجرتیں 18 سال کے درمیان (1921-1939)
80 کے قریب گھومتی رہیں اور اس کے 98 کے عدد تک 1942 میں پہنچ گئیں جو 1929ء
سے دو پوائنٹ نیچے ہے۔ جھریا کے کوئلے کے کانوں میں مزدوری کا انڈکس برابر کمی کی جانب شمار
کرتا ہے 1926ء میں 100 تو 1942 میں 73 ہے۔ مدراس (MCA) میں 1926 کے 100 سے
بڑھ کر 1929 میں 121 ہو گیا اور پھر 1938 میں گھٹ کر 96 رہ گیا اور پھر بڑھ کر 1942 میں
117 ہو گیا۔

بعض اشیاء جو بطور خوراک استعمال ہوتی تھیں وہ ظاہر کرتی ہیں کہ مزدوروں کی مالی حالت
اچھی نہیں تھی اور ان کے معیار زندگی میں کوئی ترقی نہیں ہوئی تھی مثلاً 1920-21 میں فی کس 12.64
گز کپڑا صرف ہوا اور 1944-45 میں 11-19 گز۔ مٹی کے تیل کا استعمال 69 گیلن (1923-29)
سے گھٹ کر 23 گیلن (1943-44) رہ گیا۔ شکر کا استعمال بدستور سابق رہا یعنی 4.6 پونڈ

51- Wadia and Merchant. op-cit. P. 372.

1920-21ء سے 1923-24ء میں اور 4.7 پونڈ 1944-45ء میں۔ صرف چائے کے استعمال میں اضافہ ہوا 1920-21ء کے 14 پونڈ سے بڑھکر 1941-42ء میں 24 پونڈ ہو گیا۔/52

زراعت کرنے والوں کی تکالیف

کاشتکاران کی استمراری دقتیں روز افزوں ترقی پر تھیں ان کے اسباب یہ تھے (1) اقتصادی بد حالی جس نے پوری دنیا کو 1929ء میں اپنی گرفت میں لے لیا تھا (2) 1921ء کے بعد آبادی میں تیزی کے ساتھ اضافہ اور (3) پیداوار میں مسلسل کمی 1928-29ء میں زرعی فصلوں کی پیداوار کی قیمت کا اندازہ 10,3400 ملین روپیہ کا ہے 1933-34ء میں یہ گھٹ کر 4,730 ملین رہ گیا یعنی آدھے سے زیادہ گھٹ گیا۔ بدقسمتی سے روپیہ کی قیمت جس طرح سے گھٹی اسی نسبت سے لگان اور مالگذاری کے مطالبات نہیں گھٹے پنجاب کے چند اضلاع کو بطور استثنا شمار کیا جا سکتا ہے۔

1928-29ء میں مالگذاری 321 ملین روپیہ تھی اور 1933-34ء میں 300 ملین۔

زراعت میں کمائی میں کمی ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ کاشتکار کی طاقت خریداری کم ہو گئی ان کی بچت ختم ہو گئی۔ ان کی اراضی کا رقبہ گھٹ گیا۔ زبردستی مالگذاری وصول کرنے کے واقعات میں اضافہ ہوا قرضوں میں زیادتی ہوئی اور سونا باہر نکل جانے لگا 1931ء سے 1939 کے درمیان جس مقدار میں سونا باہر بھیجا گیا وہ ہندستان کی تاریخ میں ایک غیر معمولی واقعہ ہے کیونکہ اس کے ماقبل کل زمانوں میں برآمد کے بجائے ہندستان سونا درآمد کرتا تھا۔ قیمتی دھاتوں کا دراصل ہندستان ایک ذخیرہ تھا لڑائی کے قبل کے آٹھ سالوں میں تقریباً 39 کروڑ کا سونا ملک سے نکل کر باہر چلا گیا۔ جہاں تک زرعی پیداوار کا سوال تھا یہ قطعی طور پر ثابت ہے کہ کپاس، السی کے میدانوں میں کافی کمی آئی۔ البتہ گیہوں، گنجی اور ادکھ کی پیداوار میں کچھ زیادتی ہوئی/53

52- Subramaniam, S and Homfray, P.W.R. Recent Social and Economic Trends in India (Office of the Economic Adviser, Government of India 1946) P. 78

53- Ibid, Plates 5 and 6

دوسری سختیاں

گورنمنٹ اور زمینداران نے کاشتکار کی پیٹھ پر جو بوجھ لادے تھے ان کا ذکر نہایت تکلیف دہ ہے کیونکہ ایک تو اس پر مہاجنوں کے قرضہ کے سود کی ادائیگی کا بوجھ لدا ہی تھا۔ اور اس کے علاوہ گورنمنٹ اور زمیندارانہ نظام کے حلقہ میں لگان وصول کرنے والے زمینداران دو سخت گیر مالکوں کے مطالبات بھی پورے کرنے ہوتے تھے۔ مرکزی بینک تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ میں اقلیتی نوٹ میں یہ ظاہر کیا گیا ہے۔ کہ جو مالگذاری گورنمنٹ وصول کرتی تھی اس کی مقدار 350 ملین روپیہ تھی۔ قرضہ جات کا سود تقریباً 1000 ملین روپیہ تھا۔ اور علاوہ مالگذاری کے جو لگان وصول ہوتا تھا وہ 525 ملین روپیہ ہوتا تھا۔ جہاں تک لگان کا تعلق ہے رپورٹ یہ ظاہر کرتی ہے کہ جہاں جہاں بچ لئے ہوتے تھے وہاں وہاں کاشتکار پر بوجھ اس سے زیادہ ہوتا تھا۔ جو 1:1.5 کی نسبت سے ظاہر کیا گیا ہے۔ جہاں تک سود کا سوال ہے رپورٹ نے 12½ فیصدی کے حساب سے اسے شمار کیا گیا ہے۔ یہ کم ظاہر کیا گیا ہے۔ کیونکہ رواج یہ تھا کہ کاشتکار کو ایک روپیہ پر ایک آنہ سود دینا پڑتا تھا۔ جو 75 فیصدی ہوگا۔ نمک پر جو ٹیکس تھا اس کو بھی حساب میں لگانے کے بعد ان پر کل بوجھ 2000 ملین روپیہ یا ہر کاشتکار پر فرداً فرداً 20 روپیہ ہوگا کمیٹی کی اکثریت کی رپورٹ نے کاشتکار کی اوسط آمدنی 42 روپیہ سالانہ شمار کی ہے۔ /54

کاشتکار کی آمدنی کے تفصیلی معاملہ کے لئے مواد موجود نہیں ہے۔ سبرامینین (Subramanian) نے جو مطالعہ کے نتائج پیش کئے ہیں وہ صرف ایک نمونہ ہے۔ انھوں نے مدراس ضلع ترچناپلی کا مفصل مطالعہ کیا اور 1926 میں اسے شائع کر دیا ان کے مطالعہ کے مطابق اس گاؤں کا ہر کاشتکار سال میں صرف 38.00 روپیہ کی آمدنی حاصل کرتا تھا۔ گورنمنٹ کو جو ٹیکس دینے ہوتے تھے۔ ان کو اور زمیندار کے مطالبات اور مہاجن کے قرضہ کے سود ان سب کو گھٹا کر اس کے پاس 13.00 روپیہ سے بھی کم بچتا تھا اور اسی میں اس کو پورے سال گذر کرنا ہوتا تھا۔ بینک انکوائری کمیٹی کی رپورٹ کے بعد قرضہ جات بڑھے ہیں اور اس لئے حالات اور بدتر ہوئے ہیں۔

54- Dutt, R.P. op.cit. PP 210-11.

لگان اور مالگذاری کے مطالبات 02-1901 سے 24-1923 کے درمیان اضافہ ہوگیا تھا۔ جیسا کہ رادھا کومد مکرجی (Radha Kumud Mukerjee) رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے۔/55

بمبئی اور ممالک متحدہ کے بارے میں اندازہ ہے کہ اضافہ حد سے زیادہ تیزی کے ساتھ ہوا تھا۔/56 بنگال میں مجموعی مالگذاری جو 58-1957 میں 3.3 ملین پاؤنڈ اسٹرلنگ تھی وہ 37-1936 میں 23 ملین پاؤنڈ ہوگئی۔ یوپی میں لگان کا بوجھ جو 2.24 کروڑ روپیہ 96-1893 کے اندر تھا، وہ بڑھکر 45-1944 میں 17.63 پاؤنڈ ہوگیا۔ ستیہ گرہ کے بعد بردولی کے بارے میں گورنمنٹ نے تحقیقات کی اس سے پتہ چلا کہ "جو لگان مقرر کیا گیا ہے وہ حد سے زیادہ ہے"/57

یہ بحث کی جاتی ہے کہ لگان میں جس قدر بھی اضافہ ہوا اس کی نسبت سے کہیں زیادہ 30-1929 کے درمیان قیمتوں میں اضافہ ہوا۔ جو کاشتکار کے فائدے کی بات تھی۔ لیکن یہ بحث غیر متعلق ہے کیونکہ چھوٹے کاشتکار کے پاس بہت ہی کم غلہ بچتا تھا۔ جسے بیچ کر وہ قیمتوں کے اضافہ سے نفع حاصل کر سکے مکرجی (Mukerjee) 1901 سے 1931 کے درمیان مالگذاری کے اضافہ کو قیمتوں کے اضافہ سے مقابلہ کرکے یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ "جب کہ زرعی آمدنی اس دوران میں فی کس 30٪، 60٪ اور 23٪ فیصدی بڑھی۔ مدراس، صوبہ متحدہ اور بمبئی میں مالگذاری بالترتیب 57٪، 22.6٪ اور 15.5٪ فیصد بڑھی اس طرح مالگذاری کا بڑھنا اور اسی کے ساتھ اس کا غلہ سے نقدی میں تبدیل کرنا اور اس نقدی کی وصولی عین غلہ کے دلنے کے وقت کرنا ان سب نے غیر نفع بخش کھاتوں پر جن کی اکثریت ان صوبوں میں ہے۔ بہت ہی ناموافق اثر ڈالا"/58

55- Mukerjee, R.K. Land Problems of India, P.P. 209-10

56- Ibid, P. 206.

57- Wadia and Merchant, op-cit. P.P. 343-44.

58- Mukerjee, R.K. op-cit, P.P. 345-46.

VIII زرعی جمود کے اسباب

گورنمنٹ کا نظریہ

بیسویں صدی کے آخری نصف میں قومی زندگی کا المناک نظارہ یہ تھا کہ ہندستان کی اقتصادی تحریک نے جو بڑے بڑے علاقوں میں جاری ہوئی کسانوں کی بڑی سے بڑی تعداد کی روزی کی حالت کو بہت ہی زوال پذیر کر دیا۔ برطانوی حکمراں جو ان مصیبت خیز حالات سے بلاشبہ باخبر تھے انھوں نے کچھ اقدام اس لیے کئے کہ کاشتکار کی نہایت سخت تکالیف میں کچھ کمی ہو جائے لیکن بدقسمتی سے بیماری کی جڑیں بہت گہری تھیں۔ اور کل تحتی براعظم کو اپنے لپیٹ میں لئے ہوئے تھی اور اسی کے ساتھ اس کے کروڑوں انسانوں کی آبادیوں کو بھی اگرچہ گورنمنٹ کو حالات کی انتہائی ابتری کی وسعتوں کا اندازہ تھا۔

رویہ یہ تھا کہ یا تو ان تمام واقعات سے انکار کیا جاتا تھا جو ہندستان کی شکایات کی بنیاد تھے یا یہ کہا جاتا تھا کہ ان واقعات سے جو نتائج برآمد کئے گئے ہیں وہ نکلتے ہی نہیں ہیں اگرچہ ایک زرعی ملک ہونے کی وجہ سے اس کی پسماندگی تسلیم کی جاتی تھی لیکن اس پسماندگی کی ذمہ داری خود ہندستان کے سر تھوپی جاتی تھی۔ یہ بھی بطور بحث کہا جاتا تھا کہ دیسی حکومتوں کے مقابلہ میں برطانوی حکومت کے زمانہ میں حالات بہتر ہیں۔ اور حکومت برطانیہ کی کشش سے تکلیفوں کو کم کرنے اور زراعت کو ترقی دینے کے لئے جو کاروائیاں کی گئیں تھیں ان کو شمار کر کے ثابت کیا جاتا تھا۔

آر سی دت کے میمورنڈم کے جواب میں جس میں اس بات کی تردید کی گئی تھی۔ کہ زرعی طبقہ کی ابتر حالت کی حکومت ذمہ دار نہیں ہے۔ لارڈ کرزن نے 1902 میں ایک ریزولیوشن کا اعلان کیا۔59 ریزولیوشن میں کہا گیا تھا کہ "محاصل کا ضرورت سے زیادہ اضافہ ہندستان کی عام یا وسیع پیمانہ پر پھیلی ہوئی غربت اور قرضہ کا ذمہ دار نہیں ہے۔" ...... موجودہ نظام ملک کے موجودہ حالات

---

59. Government of India Resolution No I. 50-2, January 16, 1902

کے پیش نظر نہایت مناسب بھی ہے۔ اور اس کی آئندہ ترقی کے مطابق بھی ہے ۔"

حامیان حکومت برطانوی مصنفین کی رائیں

لندن یونیورسٹی کے اقتصادیات کے پروفیسر ال۔ سی۔ اے نولس (L.C.A Knowles) نے برطانوی ملوکیت پرستی کو حق بجانب قرار دیتے ہوئے ہندستان کی پسماندگی کا الزام یہاں کی جغرافیائی کیفیت، آب وہوا، مانسون، آبادی کی زیادتی، مذہب، ذات، رسم و رواج، مشترکہ خاندان، عورتوں کی خلوت گزینی، مادی ترقیات کی خواہش کے فقدان اور کاہلی پر رکھا ہے۔ اس نے برطانوی حکمراں کی اس بات پر بڑی مدح وثنا کی ہے کہ وہ ایک متفرق سوسائٹی کی از سر نو تعمیر کر رہے تھے۔ اور معیار زندگی کو بلند کر رہے تھے۔ اس نے آخر کار یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ہندستان ایک عظیم مثال اس بات کی پیش کرتا ہے۔ کہ کس طرح ایک گورنمنٹ ایک ملک کے اقتصادی معیار کو بلند کرنے کا کامیاب عمل کر سکتی ہے۔/60 اس نے ان حالات میں ہندستانیوں کے نامعقول رویہ کا مذاق اڑایا ہے۔ "صرف ہندستان کے لوگ ہر طرح کی چیز چاہتے ہیں۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ ذات پات کو بھی رکھیں۔ خاندان کے اسی نظام کو بھی رکھیں۔ زمین کو ٹکڑوں میں نہ ہونے دیں بھی نہ بچاویں۔ مزدور وقفہ دار نہ رہیں اور گورنمنٹ سے یہ امید کریں کہ وہ ایک جادو کی لکڑی گھماکر خوشحالی لے آوے" /61

ویرا اینسٹے (Vera Anstey) جو متذکرہ بالا کی شاگرد لندن اسکول آف اکنامکس اینڈ پولیٹیکل سائنس میں تھی۔ پانچ سال کے بعد (1929) میں لکھتے ہوئے اس نظریہ کو پیش کرتی ہے کہ اصلاحات اور ہم آہنگی سماجی دائرے کی چیزیں ہیں نہ کہ اقتصادی دائرے کی اور ایک ایسے میدان عمل کے دائرے سے اس کا تعلق ہے جس سے رائے عامہ کی خواہش سے بھی اور اپنی سوچی سمجھی پالیسی کے ماتحت بھی گورنمنت بالکل الگ تھلگ ہے۔/62

پرسیوال گریفتھ (Percival Griffiths) نے یہ حال ظاہر کیا ہے کہ "حالیہ زمانوں میں

---

60 - Knowles L.C.A The Economic Development of the British Over-seas Empire (1924) P.274

61 - Ibid P 435.

62 - Anstey, Vera The Economic Development of India (third Edition) 1936, Reprinted in 1946, P.474.

قیمتوں کے اضافہ نے کاشتکار کی پوزیشن اس درجہ مضبوط کر دی ہے کہ اس بات کو بھول جانا آسان ہے کہ برطانوی حکومت کے دور سے قبل اس کی حالت کتنی مصیبت کی حالت تھی۔"/63 ان کی رائے میں لگان اور مالگذاری میں جو اضافہ ہوا ہے۔ وہ شاذ و نادر ہی جلد ہو پر قیمتوں کے اضافہ کے مقابل آتا ہے "/64

دوسری رائیں

ہندو اور مسلم دونوں کے نظام میں۔ سماجی نظام، مذہبی عقائد، اعمال اور نظریات میں کیا کیا یکساں ہیں ان کے بارے میں صرف کنگسلے ڈیوس (Kingsley Davis) کی کتاب اکنامکس گروتھ (Economic Growth) میں جو بحث کی گئی ہے اس کا حوالہ کافی ہوگا۔ برازیل، ہندستان، جاپان اور ہندستان اور پاکستان کی آبادیوں پر بحث کرتے ہوئے زراعت کو ماڈرن نہ بننے کے وجوہ کا تجزیہ حسب ذیل الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

"باوجود اس کے کہ برطانیہ حکمرانوں نے زراعت سے اپنی بڑی دلچسپی کا اظہار کیا لیکن انھوں نے پیداوار کے بڑھانے کے وسائل پر زور نہیں دیا۔ انھوں نے صرف قانونی حقوق کھاتوں ٹیکس لگانے کے اصول، رسل و رسائل ابتدائی کارروائیوں اور زرعی رقبہ آبپاشی کی سہولتیں دے کر بڑھانے پر ہی تمام تر توجہ مبذول کی۔ اگرچہ مجموعی طور پر زراعت کو ترقی دینے کے لئے یہ ذرائع بڑے قیمتی تھے لیکن یہ سب کاشتکار کو اس سے آگے نہ لے جا سکے کہ وہ بیل گاڑی کی رفتار کے منصوبہ سے آگے جا سکے۔ اس کے برخلاف برطانوی حکمرانوں نے زرعی رقبہ کو بڑھایا اور اس طرح اس آبادی میں اضافہ کیا جو بلا سرمایہ لگائے زرعی کاموں میں چھوٹے چھوٹے کھاتوں کی پرانی طرز کی کاشتکاری کرنے میں لگے ہوئے تھے"/65

ویرا انیسٹے (Vera Anstey) کا فیصلہ یہ ہے کہ "کل زرعی نظام کو جس میں خاندان کا نظام اور قانونی حقوق شامل ہیں یکقلم منسوخ کر دو لیکن یہ بادی النظر میں اس وقت تک قطعی ناقابل عمل نظر آتے ہے۔ جب تک کہ مکمل ذمہ دار خود مختار حکومت قائم نہ ہو۔

63- Griffith, Sir, P. British Impact on India, P. 389.

64- Ibid.

65- Davis, K- in Kuznets, Moor and Spengler, op-cit, P. 293

جائے ۔[66] شاہانہ طرز کی حکومت کے حامیوں نے جو اعتراض پیش کیا تھا یعنی یہ کہ زراعت میں
جمود اور چھوٹے کاشتکاروں اور بالعموم ہی مزدوروں کی ابتر حالت کی ذمہ داری مذہب اور
سماجی رسم و رواج پر ہے ۔ وہ انتہائی مبالغہ آمیز تھا۔ ایک بات تو ظاہر ہے کہ سماج کے
اندر جمود کی کیفیت اور لوگوں کے خیالات میں فرسودگی کی پختگی ہزاروں سال کے اقتصادی
جمود اور پیداوار کے تکنیک کے یکساں رہنے کا نتیجہ تھی ۔ چونکہ تبدیلی کے لئے کسی قسم کا جذبہ موجود
نہ تھا اس لئے اس کا نتیجہ یہی ہوتا ہی تھا کہ اس کے جواب کے طور پر جمود عالم وجود میں آئے
انسان کی فطرت جو اور جگہ ہے اس سے ہندوستان کی انسانی فطرت مختلف کیسے ہو سکتی تھی
صرف تاریخی اور سیاسی حالات ہی ایسے ہیں جو ان قانوں کو تیار کرتے ہیں جس میں سوسائٹی
کی قد و قامت اور اس کا عمل دخل موثر کر بنایا جاتا ہے ۔

اس کے علاوہ ہندوستانی سوسائٹی کی قوت برداشت کے بارے میں سخت غلط فہمی رہی ہے
کہ ایک بڑی فیصد کاشتکاران کی آبادی زراعت کے پیشہ کو روایتی طور پر کرتی رہتی تھی لیکن ہمیشہ
ایک اچھی تعداد ایسی بھی رہی ہے جس نے اصولی روایتی ضوابط سے علیحدگی اختیار کر رکھی ہے اگرچہ
مذہب نے بعض لوگوں کو دنیا سے کنارہ کشی اور خواہشات پر قابو رکھنے اور لذات دنیوی سے
مستفیض نہ ہونے پر اکسایا لیکن اس نے تاجروں اور اشیاء کی پیداوار کرنے والوں کو دولت
حاصل کرنے کے ذرائع کو استعمال کرنے سے روکا نہیں تھا ۔ درحقیقت ہندو مذہب تو
اس امر پر اصرار کرتا تھا کہ لوگ اپنے آبائی روایتی پیشوں پر مضبوطی سے جمے رہیں ۔ مادی ترقی کے راستہ
میں رکاوٹ یہ تھی کہ ترقی کرنے کے مواقع میسر نہ تھے یہ نہ تھی کہ لوگوں میں ترقی کی خواہش ہی نہ
تھی ۔

اگر ان مقاصد کا جائزہ لیا جائے جن کے لئے قرضوں میں اضافہ ہو رہا تھا تو معلوم ہوگا
کہ وہ نہ تو یہ تھے کہ کسانوں کو مقدمہ بازی کا شوق تھا اور نہ یہ تھا کہ سماجی اور مذہبی رسم و رواج
میں وہ افراط سے فضول خرچی کی حد تک روپیہ خرچ کرتے تھے زیادہ تر قرضے پرانے قرضوں
کو چکانے ، مالگذاری یا لگان ادا کرنے اور کھانے کے لئے غلہ خریدنے کے لئے لیے جاتے تھے

66- Anstey. V. op. cit. P. 101.

13 DPD / 71-5.

آئی ۔ایل ۔او (O.L.I) رپورٹ کے مطابق جو ایشیاء کے ممالک میں سماجی پالیسی کی اقتصادی پسماندگی بردی گئی ہے "ہماری دیہی قرضے زیادہ تر کھانے کے لئے غلہ خریدنے کی وجہ سے جمع ہوتے گئے ہیں "67/

تھارنر (Thorner) کے الفاظ میں زرعی ترقی میں خاص روکاوٹ یہ تھی کہ :۔

"تقریباً 1¼ صدی تک یعنی 1820 سے 1947 حصول آزادی تک ہندستان نے خود اپنی اقتصادی پالیسی تعمیر نہیں کی بلکہ اس کی تقدیر کا خاکہ برطانوی حکمراں نے تیار کیا "69/ جہاں تک زراعت کا تعلق ہے انھوں نے یہ فیصلہ دیا کہ "بیسویں صدی میں بلکہ انیسویں صدی کے آخری چوتھائی سے ہی فیصلہ کن بات یہ رہی ہے کہ زیادہ تر کاشت کرنیوالوں کے پاس سرمایہ کی کمی تھی "69/

ڈیوس (Davis) نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ 1920 کے بعد آبادی میں تیزی سے اضافہ پسماندگی کا ذمہ دار تھا جس سے زرعی جمود کا افسوسناک وجود عمل میں آیا اس کا نظریہ یہ ہے کہ 1920 کے قبل بھی سماج کے اس طبقہ کی آبادی ضرورت سے زیادہ گنجان تھی ۔لیکن 1921 اور 1951 کے درمیان آبادی کا 44% فیصدی بڑھ جانا ایسا اضافہ تھا جس نے عام کاشتکار کی اوسط آمدنی پر اثر ڈالا۔

یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ "اگرچہ یہ بالکل صحیح ہے کہ ہندستان سیاسی طور پر برطانیہ کے ایک غلام کی حیثیت رکھتا تھا۔ اور اس کی اقتصادیات برطانیہ کے آسمان میں ایک سیارے کی طرح تھی یہ وہ یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ ہندستان پر برطانوی حکومت کے اقتدار کا انجام یہ تھا کہ بہت سے معاملات میں توازن پیدا ہوگیا یعنی " بہ نسبت کاریگری کا کام کرنے والوں کے زراعت کا کام کرنے والوں کی تعداد بڑھ گئی ۔اور حفظان صحت پر زیادہ سے زیادہ رفاہ عام کے کاموں پر زور دیا گیا" اس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ "بے روزگاری اور کم زوری پر روزگار زمین پر لوگوں کی نمایاں بھیڑ اور بہ نسبت آبادی کے پیداوار کے آلات کی عام

67- Wadia and Merchant, op. cit., PP 284-86

68- Thorner D. in Kuznets more and Spengler op. cit. P. 103.

69- Ibid. P.P 123-24.

کمی کیوں تھی یہ/ 70

IX زرعی ترقی کیلئے جو کاروائیاں کی گئیں انکی ناکامی

زرعی حلقہ کی حالت بد سے تر ہوتے دیکھ کر گورنمنٹ نے رفاہ عام کے کام شروع کئے لیکن بد قسمتی سے وہ ناکامی ثابت ہوئے اور بیماری کی جڑوں کو کھو نہ سکے۔
انھیں کاروائیوں میں وہ کاروائیاں بھی تھیں جن سے گورنمنٹ نے اس بات کی کوشش کی کہ کرنوڑنے والا لگان نہ لگایا جا سکے۔ 1859 میں بنگال ٹیننسی ایکٹ (Bengal Tenancy Act) — اس سے پہلے ہی اس کوشش کے لئے پاس ہو چکا تھا کہ کاشتکار کو اس کی زمین سے بے دخل نہ کیا جا سکے اس میں 1885 میں ترمیم کی گئی اور اس کے بعد 1907 کا بنگال ایکٹ پاس کیا گیا۔ پہلے دو قوانین کے ذریعہ رعیت کو دخیل کاری حقوق اس حالت میں دیئے گئے جبکہ وہ بارہ برس تک اپنی زمین پر مسلسل قابض رہا ہو۔ اسی طرح کے قوانین صوبہ ممالک متحدہ صوبہ متوسط، مدراس اور مالابار میں جہاں زمینداری نظام تھا پاس کئے گئے۔
اسی طرح انتقال زمین کی برائیوں کے خلاف جو قرضہ لینے کی وجہ سے ہوتے تھے۔ 1900 — 1901 اور 1903 میں اودھ، پنجاب اور بندیل کھنڈ میں قوانین نافذ کئے گئے
دوسرا طریقہ دیہات کے لوگوں کو مدد دینے کا یہ تھا کہ قرضہ لینے کے لیے کوآپریٹیو سوسائٹیز کو وجود میں لایا گیا۔ جن کا مقصد یہ تھا کہ مہاجنوں کو نکال باہر کیا جائے اور کھیتی کی ترقی کے لئے سرمایہ ان سوسائٹیوں سے حاصل ہو سکے۔ پہلا ایکٹ ایسی سوسائٹیوں کے قائم کرنے کا 1904 میں پاس کیا گیا۔
صوبوں میں زراعت کے محکمے قائم کئے گئے اور اسی طرح مرکز میں بھی ایک زراعت کا محکمہ قائم ہوا۔ زراعت کی تعلیم کے لئے کالج اور تحقیقاتی ادارے قائم ہوئے۔ یہ سب قدم صحیح منزل کی طرف اٹھائے گئے تھے 1904 میں پوسا میں امپیریل انسٹیٹیوٹ آف ایگریکلچر Imperial Institute of Agriculture (یعنی زراعت کا مرکزی ادارہ) قائم کیا گیا۔
1916 میں صوبے کے زراعتی محکموں کو مضبوط کیا گیا اور زراعت کے لئے مختلف مقامات پر

---

70 - Davis. K. in Kuznets. Moore and Spengler, op-cit. PP 278-79.

اسٹیشن بنائے گئے اور اسی طرح ماڈل (نمونہ) کے زرعی فارم بھی قائم کئے گئے۔

قرضوں میں سہولت دینے کے لئے پہلے یہ کوشش کی گئی کہ مہاجن اپنے طور پر کمی کریں۔ اور جب اس میں ناکامی ہوئی تو جبراً کمی کی گئی۔ 1920ء سے 1946ء تک قرضوں کے بوجھ کو کم کرنے کے لیے صوبوں میں متعدد قوانین پاس کئے گئے۔ بدقسمتی سے زرعی کمیٹی کا فیصلہ یہ تھا کہ "نہایت اطمینان سے کہہ سکتے ہیں کہ جو بھی قوانین مہاجنوں کی کارروائیوں کو کم کرنے کے لئے بنائے گئے سب ناکامیاب ہوئے" بلکہ "ان کے بجائے قرضے کی سپلائی کی مقدار میں کمی کا نتیجہ شاید یہ ہوا کہ کھیتی کا معیار گھٹ گیا۔"/71

کچھ کوشش اس بات کی بھی کی گئی کہ ترقی یافتہ بیج پیداوار بڑھانے کے لئے دیا جائے بہتر اوزار اور ہل وغیرہ بھی دیئے جائیں۔ ایک ایسے ملک میں جہاں آبپاشی کا انحصار مانسون پر ہے جس کی حرکتیں غیر یقینی ہوتی ہیں۔ مصنوعی ذرائع آبپاشی ضروری ہیں۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے گورنمنٹ نے سینچائی کے کام شروع کئے۔ پرانی نہروں کی مرمت کی گئی۔ اور پنجاب، صوبہ متحدہ، سندھ اور راجستھان، دکن اور مدراس وغیرہ میں جدید نہریں تعمیر کی گئیں۔

بدقسمتی سے یہ کل کارروائیاں ضرورت سے کم ثابت ہوئیں۔ قرضہ نے اپنی گرفت ڈھیلی نہیں کی درحقیقت ہوا یہ کہ قرضوں کے بارے میں جو قوانین بنے۔ انھوں نے پرائیوٹ مہاجنوں کے اعتماد کو ہلا دیا جو کل قرضہ جات کا جو کاشتکار لیتا تھا اس کا 92% فیصدی دیتے تھے۔/72 جہاں تک کہ کوآپریٹیو (امداد باہمی) تحریک کا معاملہ ہے تو 1948-50ء میں جب اس کا جائزہ لیا گیا تو یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ "ہندوستان کے کاشتکار کو کوآپریٹیو کے ذریعہ نئی زندگی عطا کرنے کا خیال تکمیل پذیر نہ ہو سکا۔"/73 بہرحال کوآپریٹیو سوسائٹیوں نے کسان کی کل قرضہ کی ضروریات کے صرف 3% فیصدی کو پورا کیا۔/74 ان ترقیات نے

71- Wadia and Merchant. op-cit, P. 283.

72- Ibid. P. 292.

73- Ibid, P. 303.

74- The Rural Survey Committee Report (1954).

زراعت کی صرف سطح کو چھوا۔ اور زراعت وہی ازمنہ وسطیٰ کی فرسودہ زراعت رہ گئی۔ آبپاشی کے ذرائع جو تعمیر کئے گئے انھوں نے صرف سطحی اثرات ڈالے کیونکہ 1929ء میں کل رقبہ زیر کاشت کے صرف 12¼ فیصدی کو نہروں کے پانی سے فائدہ ملا۔/75 1947ء میں یہ بڑھ کر صرف 23½ فیصدی ہوا۔

یہ اضافہ بھی محض دھوکا تھا کیونکہ آرازی زیر کاشت فی کس کے رقبہ کی اوسط جو 1891ء میں 16½ فیصدی اور 1921ء میں 18½ فیصدی تھی وہ 1951ء میں گھٹ کر صرف 1/4 فیصدی رہ گئی۔/76

مجموعی طور پر بیسویں صدی میں دیہات کے مزدوروں کے بڑے حصہ کی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی۔ اپنے ابناء وطن کی کثیر تعداد کی حقارت آمیز حالت اور پریشان حال مصیبت زدگی کو دیکھ کر تعلیم یافتہ طبقہ میں غصہ کی آگ بھڑک اٹھی اور بے اطمینانی اور برطانیہ کی مخالفت کے جذبات کی آگ میں ایندھن کا کام دیا۔

گاڈگل (GODGIL) کہتا ہے کہ اس امر پر بحث کرنا صحیح معلوم ہوتا ہے کہ کاشت کرنے والوں کی زبردست اکثریت کی مالی حالت خاص کر جو لوگ کپاس کی کاشت کے خطے سے باہر تھے۔ یہ مقابلہ ماقبل جنگ کے دوران جنگ میں بدتر ہو گئی اور 1918 اور 1921ء میں چونکہ بارش کی کمی ہوئی اور انفلوانزا کی وبا بھی پھیل گئی اس سے حالات اور بھی زیادہ خراب ہو گئے 23-1921 سے کاشتکار آہستہ آہستہ اپنی حالت سدھار رہا تھا۔ لیکن حالیہ سخت سرد بازاری نے اس کو انتہائی تنگ حالت میں پہنچا دیا ہے اس نے زراعت کو مجموعی طور پر غیر نفع بخش بنا دیا ہے۔ اور کاشتکار پر نقدی ذمہ داریوں کے بوجھ کو بڑھا کر اس نے کاشتکاروں کی اکثریت کے حقہ کو بیکس اور لاچار بنا دیا ہے دیا ہے۔/77

75- Anstey V. op.cit. P.163. Wadia and Merchant op.cit. P.213.

76- Wadia and Merchant, op. cit. P. 704.

77- Gadgil D.R. The Industrial Evolution of India. (II edition 1942, Reprinted 1950) PP. 189-99.

زرعی متوسط طبقہ کا وجود میں آنا

زرعی پالیسیوں کی ناکامیوں کے تذکرے کے بعد ضرورت ہے کہ تصویر کے دوسرے رخ پر نظر ڈالی جائے۔ اس لئے کہ باوجود اس کے کہ برطانوی حکومت نے بہت سی برائیوں کو جنم دیا۔ اس کا اثر ایک اور مختلف طریقے سے بھی ہوا۔ قیاس غالب ہے کہ انگریزوں کا منشا تو ایسا ہرگز نہ تھا لیکن یہ آزادی کی تحریک کی نشو و نما کے لئے قیمتی ثابت ہوئے۔ جبکہ ہندوستان کی اکثریت افلاس کے دلدل میں دھنسی ہوئی تھی ایک ایسا چھوٹا سا گروہ ابھر رہا تھا جو زراعت کے پیشہ کو اپنانے پر اپنی روزی کا انحصار کرنا چاہتا تھا۔ اور برطانوی نظم و نسق نے جو حالات قائم کر دیئے تھے ان سے فائدہ اٹھا کر وہ اپنی مالی حالت درست کرنے پر تلا ہوا تھا۔ اور اسی نے اس متوسط طبقہ کو جنم دیا جس نے تحریک آزادی کی دوڑ دھوپ کی رہنمائی کی۔

تھارنر (Thorner) کہتا ہے کہ "برطانوی حکومت کے اثرات کا نچوڑ یہ تھا کہ ہندوستان کی زراعت کے لباس کو مکمل طور پر بدل دیا لیکن پیداوار کی بنیادی کارروائیوں کو اسی طرح بلا کوئی اثر ڈالے چھوڑ دیا اور اس طرح تکنیک کی سطح بھی وہی رہ گئی۔ اس لئے زراعت پیشہ لوگوں کے اونچے طبقہ نے اس سے خوب فائدہ اٹھایا۔ جبکہ اپنے ہاتھ سے کاشت کرنے والوں کی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی۔ جو سرمایہ زراعت کی ترقی کے لئے ضروری تھا اسے ٹیڑھا میڑھا کر دیا اور اوسط پیداوار کی سطح جامد ہو کر رہ گئی۔[78]

زراعت پیشہ لوگوں میں تین طبقے تھے۔ زمینداری خطہ میں بڑی بڑی زمینوں والے رعیت واری خطہ میں بڑے بڑے کاشتکار، قرضہ دینے والے مہاجن۔ جو مالک آراضیات بھی تھے اور تاجر بھی۔ اور وہ تاجر جو نقدی دینے والی فصلوں کی تجارت کرتے تھے۔ جن کی پیداوار ان تعلقوں میں جہاں وہ فصلیں بوئی جاتی تھیں۔ برابر بڑھ رہی تھی۔ اور ان کے رقبہ میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔

پہلے طبقہ میں وہ زمیندار اور کاشتکار ان تھے۔ جو غلہ کا دام بڑھ جانے کا نفع

---

78. Thorner, op. cit., p. 127.

انحصار ہے تھے۔ خاص کر وہ لوگ جو ایسی فصلیں پیدا کرتے تھے جو بازار میں بکتی ہیں مثلاً روئی سن، تمباکو، اوکھ، چائے، قہوہ، گنجی، السی تیسی وغیرہ" جبکہ غذائی پیداوار فراہم کرنے والی فصلوں کا رقبہ گھٹ گیا تھا۔ غیر غذائی فصلوں کا رقبہ بڑھ گیا تھا۔ 1913-14ء کو بنیادی سال مان کر اضافہ کا جو چارٹ بنا ہے۔ اس سے معلوم ہوگا کہ عام طور پر 1940-4ء میں غذائی فصل کا رقبہ 91ء اور سن اور کپاس کا 83ء تھا۔ /79

مدراس اور بنگال کے اعداد و شمار سے ان خود کام نہ کرنے والے زمینداران اور کاشتکاران کے رقبہ زیر کاشت میں اضافہ کا ایک خیال قائم کیا جا سکتا ہے 1901ء سے 1934ء کے درمیان مدراس میں زمینداران کا طبقہ 34% فی ہزار ہو گیا تھا جبکہ اس کے پہلے صرف 19% فیصد تھا۔ اور کاشتکاران کی تعداد جو 1931ء میں ایک فی ہزار تھی وہ 16% فی ہزار ہو گئی بنگال میں 1911ء اور 1931ء کے درمیان لگان وصول کرنے والے اور خود کاشت نہ کرنے والے زمینداران کی تعداد 62% فیصدی بڑھ گئی۔ /80

دیہی بینک تحقیقاتی کمیٹی 1930ء (The Rural Banking Enquiry Committee 1930) نے یہ نوٹ کیا ہے کہ مجموعی زرعی آمدنی کا ایک خاصہ بڑا حصہ ایک چھوٹے سے اقلیتی گروہ کے ہاتھ میں چلا گیا ہے۔ (جو کاشتکاران کی کل تعداد کا صرف 20 فیصد ہے۔) اور قرضوں میں جو کمی کی گئی اس کا فائدہ زیادہ تر اسی طبقے نے اٹھایا ہے۔ /81

یعنی زمانہ جنگ میں قرضے کے بوجھ کو گھٹانے کا اثر بڑے اور متوسط طبقہ کے زمینداران پر پڑا جن کو اس سے بھی نفع ہوا کہ زرعی اشیاء کی قیمتیں برابر بڑھتی رہیں۔

لگان وصول کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ زمیندار اور کاشتکار کے درمیان بچولیوں کی تعداد بڑھ گئی۔ آر۔ کے مکرجی (R.K. Mukerjee) کے قول کے مطابق مالکان زمین کے پورے حلقہ میں زیادہ سے زیادہ 17 بچولئے تھے۔ سائمن کمیشن نے ان کی تعداد 50 بتلائی ہے۔ /82

---

79. Wadia and Merchant, op-cit, 178.

80. Ibid, PP. 363-64.

81. Ibid, P. 281.

82. Simon Commission Report, Vol. I, P. 340

بنگال میں شکمی کاشتکاران کی فہرست میں پٹنی دار۔ در پٹنی دار سے پٹنی دار وغیرہ اور زمیندار والی
میں تعلقداران، اوسط تعلقداران، حولداران، نیم حولداران وغیرہ شامل تھے۔ جو کچھ بنگال
کے بارے میں صحیح تھا وہ دوسرے زمیندارانہ نظام کے علقوں کے لئے بھی صحیح تھا۔
رعیت داری نظام کے علقوں میں بھی رعیت لوگ اپنی زمین کو اصل کاشت کرنے والے
کو شکمی بر دے کر اور لگان وصول کر کے زمیندار بنتے جا رہے تھے۔

ان مالکان آراضی کی تعداد جو بذات خود کاشت نہیں کرتے تھے۔ اور ان لوگوں
کی جو وہاں نہیں رہتے تھے۔ اور مہاجنوں اور روپیہ لگانے والوں کی تعداد برابر بڑھ
رہی تھی۔ یہ رجحان کہ زمین کم اور کم سے کم لوگوں کے ہاتھ میں رہے۔ بڑھتا ہی گیا۔ وہی
بینک تحقیقات کمیٹی نے یہ اندازہ کیا ہے کہ کل رقبہ زیر کاشت کے 67.7٪ فیصدی سے کم
زمین 20٪ فیصدی کاشتکاران کے قبضہ میں ریاست بمبئی میں 47.7٪ فیصدی سے کم
پنجاب میں اور 35.1٪ فیصدی سے کم اتر پردیش میں تھی۔ 83/ بنگال میں جو لگان وصول
ہوتا تھا وہ 1793ء میں 20 لاکھ تھا لیکن 1940ء میں بڑھ کر 832 لاکھ ہو گیا۔ جس سے
اس بات کو ملا کر کہ شکمی کاشتکاران سے کس قدر نفع حاصل کیا جاتا تھا یہ ثابت ہوتا ہے
کہ مالکان آراضی کی تعداد میں کس کثرت سے اضافہ ہو گیا تھا۔ /84

اتر پردیش میں بچولیوں (زمینداران) کے منافع میں 70٪ فیصدی کا اضافہ بھی
اسی نتیجہ کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ لگان وصول کرنے والوں کی تعداد بھی اور مدراس میں
1951ء میں 30٪ فیصدی تھی اور پنجاب میں چھ ملین سے بڑھ کر جو 1947ء میں تھی 15
ملین ہو گئی تھی۔ اتر پردیش میں 1891ء اور 1821ء کے درمیان 64٪ فیصدی بڑھ گئی اور
اسی 30 سال میں صوبہ متوسط میں 50٪ فیصدی بڑھ گئی جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ مالکان
آراضی کے 24٪ فیصدی کے ہاتھ میں 63٪ فیصدی زمین مرکوز تھی اور 16٪ فیصدی ایک
فیصدی کے ہاتھ میں تھی۔

زرعی متوسط طبقہ میں خوشحال زمینداران اور خوشحال کاشتکاران کے طبقوں کے

83- India and Merchant, op-cit, P. 365.

84- Ibid, P. 343

علاوہ دو اور طبقوں کی نشو و نما ہوئی وہ قرض دینے والے مہاجن اور تجار تھے۔ اعداد و شمار نہ ہونے کی وجہ سے ان کی صحیح تعداد کا اندازہ لگانا دشوار ہے لیکن دیہی قرضہ جات میں زیادتی بازار میں بکنے والی غذائی اشیاء کے دام میں اضافہ، کچے مال کی برآمد اور مقامی طور پر تیار ہونے والی اشیاء کا بدل باہر سے آتی ہوئی فیکٹری کی تیار کردہ اشیاء بالخصوص کپڑوں سے ہو جانے کے باعث تجارت میں پھیلاؤ یقینی ثبوت اس بات کے تھے۔ کہ قرضہ دینے والے مہاجنوں اور تاجروں کی تعداد میں جو گاؤں کے کاروبار میں حصہ لے رہے تھے۔ اضافہ ہوا تھا۔

یہ ایک روایت بن گئی ہے۔ کہ کل الزام مہاجن پر رکھا جاتا ہے۔ جو قرضہ دیتے تھے اور کاشتکاروں کی مصیبت اور پریشانیوں کا اسی کو اصل سرچشمہ قرار دیا جاتا ہے۔ یہ ضرور صحیح ہے۔ کہ اس نے کاشتکاروں کی بے بسی کا ناجائز فائدہ اٹھایا لیکن وہ ان حالات میں پیدا کرنے کا ذمہ دار نہیں تھا جن سے مجبور ہو کر کاشتکار اپنی اراضیات کو بیچ یا منتقل کرتا تھا۔ اور اسے حد سے زیادہ سود ادا کرتا تھا جو اس کو اور اس کے ورثاء کو ہمیشہ کے لئے ایک نہ ٹوٹنے والے جال میں پھنسا دیتا تھا۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ کاشتکار کی لازمی ضرورت یہ ہے کہ اسے قرضہ مل سکے۔ یہ اس لئے ضروری ہے تاکہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو پوری کرنے میں سہولت پا سکے۔ اور اس سے زیادہ اس لئے ضروری تھا کہ وہ اپنے کھیتی کے کاروبار کو ترقی دے سکے۔ جو قرضے وہ لیتا تھا وہ ہو سکتا ہے ان اغراض کے لئے ہوں جن سے پیداوار ہوتی ہے یا ان اغراض کے لئے ہو جن کا پیداوار سے کوئی تعلق نہیں ہے جب قرضہ پیداوار کی غرض کے لئے لیا جاتا ہے تو وہ بوجھ نہیں ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ہندوستان میں زیادہ تر قرضے ان اغراض کے لئے لئے گئے جن کا پیداوار سے کوئی تعلق نہ تھا اور اس لئے وہ سخت ثابت ہوا۔

بہر حال مہاجنوں نے ایک لازمی ضرورت کو پورا کیا۔ اور حالات ایسے تھے کہ ان کی عدم موجودگی کے باعث کاشتکار انہی پر بھروسہ کرنے پر زیادہ تر مجبور ہو گیا۔ ان حالات کی ذمہ داری بڑی حد تک گورنمنٹ کی اس پالیسی پر بھی ہے جو اس نے مالگذاری کے بارے میں اختیار کر رکھی تھی۔ ایک ناکافی کوآپریٹیو قرضہ دینے والی سوسائٹی اس قابل نہ تھی کہ کسی معقول حد تک ان حالات میں سہولت پیدا کر سکتی۔

مہاجنوں کے طبقہ کی نشوونما کی ایک طویل تاریخ ہے۔ جو اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب سے ایسٹ انڈیا کمپنی نے بنگال میں آرضیات کاشت کے انتظام میں تجربات شروع کئے جس طرح ہندوستان کے مختلف حصے برطانوی سامراج میں ضم ہوتے گئے۔ مہاجنوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ اور گاؤں کی قدیم اقتصادیات کا نظام پارہ پارہ ہوگیا۔ انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں برطانوی افسران کو یہ احساس ہونے لگا کہ کسان پر قرضہ کا بوجھ روز بروز بڑھ رہا ہے۔ جس کا انجام یہ ہے کہ ان کی آراضیات منتقل ہو رہی ہیں۔ لیکن جو بھی اقدامات اس نشوونما کو روکنے آرضیات کے انتقال میں روکاوٹ ڈالنے اور قرضہ جات کے بوجھ کو کم کرنے کے لئے گئے گئے وہ بیکار ثابت ہوئے۔

چنانچہ سخت مذموم مہاجن پھلتا پھولتا رہا اور اس کی تعداد میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ اور آخر نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے جو مقاصد ہندوستان کی اقتصادی ترقی کے تھے وہ حکمرانوں کی ان پالیسیوں سے برباد ہو گئے جنھوں نے برطانوی سرمایہ داروں کے مفاد کو ترقی دینے کے لئے ان پر ہندوستان کے مفاد کو قربانی کی بھینٹ چڑھا دیا۔

1951 میں ریزرو بینک آف انڈیا نے جو لینڈ سروے کمیٹی 1951 میں مقرر کی تھی اس کی رپورٹ کے مطابق کاشتکاروں کے قرضہ کی ضروریات 39% فیصدی پرائیوٹ ذرائع سے پوری ہوتی تھیں۔ اور بقیہ صرف تین فیصدی گورنمنٹ تین فیصدی کوآپریٹیو سوسائٹیاں اور ایک فیصدی تاجرانہ بینک پوری کرتے تھے۔ [85]

اگر اس بات پر کہ دیہی قرضہ جو بیسویں صدی کے شروع میں 300 کروڑ تھا اور صرف 30 سال میں بڑھ کر 1200 کروڑ ہوگیا اور آزادی کے وقت تک 1800 کروڑ ہوگیا قرضہ دینے والوں کی تعداد کے ساتھ غور کیا جائے تو یہ ناقابل تردید ثبوت فراہم کرے گا کہ قرضہ دینے والے مہاجنوں کی تعداد میں وسعت پیدا ہوگئی تھی۔ جو اعداد و شمار دکن تحقیقاتی کمیٹی نے 1889ء میں قحط کمیشن نے 1901 میں سنٹرل بینک تحقیقاتی کمیٹی نے 31-1930 میں اور بہت سی تحقیقاتی کمیٹیوں اور افراد مثلاً فریڈرک نکولسن ایڈورڈ ڈینیک لاگمن، ڈارلنگ، آر مکرجی، پی. جی تھامسن وغیرہ نے اکٹھا کئے ہیں وہ دیہی قرضوں

85- Sing. V. B. op. cit. P. 149.

اور مہاجنوں کی تعداد کے بڑھنے پر مہر تصدیق ثبت کرتے ہیں۔

بازار میں بکنے والی اشیاء کی روز افزوں پیداوار نے زراعت کو تجارتی شکل دیدی تھی اور اس نے مہاجنوں کو بڑا موقع فراہم کیا تھا کہ وہ قرض کے اگلنے، غلہ کے نکالنے کی کل کاروائیوں کے کرنے اور بازار میں لے جا کر بیچنے میں ہر موقع پر اپنا سرمایہ لگائیں چھوٹے چھوٹے مہاجن بڑے بڑے سرمایہ داروں سے پیشگی رقم پاتے تھے۔ اور ان بڑے سرمایہ داروں کو برطانیہ کے بینک اور برآمد درآمد کی فرمیں سرمایہ فراہم کرتی تھیں ان کے مواقع سال بسال ترقی پر تھے یہ بات اس سے ثابت ہوتی ہے کہ غذائی پیداوار کا انڈکس یہ ظاہر کرتا ہے۔۔۔ کہ 1893-94ء میں تو وہ 100 تھا لیکن دس سال کے اندر یعنی 1935-36 سے 1945ء تک گھٹ کر 93 رہ گیا لیکن نقدی پیداوار انہی سالوں میں 100 سے بڑھ کر 185 ہو گئی/86 ان واقعات سے شمال میں مارواڑیوں گجراتیوں اور سندھیوں کے پرانے تجارتی طبقے نے اور مدراس کے "چیٹیوں" نے خاص طور پر نفع حاصل کیا۔

سیمور کے (Seymour Keay) ایم پی نے جو اعداد و شمار جمع کئے تھے ان کی بنیاد پر ڈگبی (Digby) نے یہ پتا لگایا ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز میں دس ہزار کی تعداد میں بڑے بڑے مالکان اراضی تھے۔ جن میں راجگان اور زمینداران بھی تھے۔ اور جن کی آمدنی ہر ایک کی 5,000 پونڈ سالانہ تھی۔ 7,500 بینک چلانے والے تجار اور پیشہ ور لوگ تھے۔ جن میں ہر ایک کی کمائی 1000 پونڈ سالانہ تھی اور 7500 تاجر دوکاندار وغیرہ تھے۔ جن میں سے ہر ایک 100 پونڈ سالانہ کماتا تھا۔ اس طرح یہ سب مل کر (8,35,000) یعنی قومی آمدنی کا نصف تصرف کر لیتے تھے۔ اور 200 ملین آبادی کے لئے بقیہ نصف آپس میں تقسیم کرنے کے لئے چھوڑ دیتے تھے/87 ۔ صدی کے دوسرے نصف میں زراعت کی کچے مال کی پیداوار کے اضافہ کے باعث ان کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ بیسویں صدی کے پچاس سالوں کے اندر غیر غذائی پیداوار غذائی پیداوار کی نسبت سے دوگنی ہو گئی تھی۔/88 مقدم الذکر میں واقعی اضافہ 85٪ فیصدی کا ہوا تھا۔ اس کا قدرتی نتیجہ

---

86 - Digby, W. Prosperous British India (1901) PP. 615-16.

87 - Blyn, G. op. cit. P. 29.

88 - Singh, V.B. op. cit. P. 126.

یہ ہوا کہ اندرون ملک اور بیرون ملک کی تجارت میں اضافہ ہوا۔ اندرون ملک میں سڑکوں اور ریلوے کی تعمیر سے رسل و رسائل میں جو ترقی ہوئی اور بیرون ملک سامان لیجانے کے لئے بھاپ سے چلنے والے جہازوں کی نشوونما سے جو سہولتیں حاصل ہوگئیں اس نے زراعت کو تاجرانہ رنگ دینے اور مال کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے میں قوت محرکہ فراہم کی ۔ دو لڑائیوں کی وجہ سے تجارت میں جو زیروبم پیدا ہوا اور 1929ء میں جو پسماندگی آئی اس نے تجارت کی مقدار اور قیمت کے بلالحاظ تاجروں کو اپنی مالی حالت کو ترقی دینے میں روز افزوں واقعے فراہم کئے ۔

کچے مال اور غذائی اشیاء کی تجارت کا ایک نہایت درجہ قابل لحاظ پہلو یہ تھا کہ ہندستانی تجار صرف ایجنٹ کا کام کرتے تھے یعنی یہ لوگ یورپین فرموں کو مال سپلائی بھی کرتے تھے اور تقسیم بھی کرتے تھے ۔ اور یورپین فرم تھوک کے طور پر مال پر پورا تصرف رکھتے تھے۔ اور بڑا نفع انھیں کو ملتا تھا۔ فرق ان تاجروں میں صرف اتنا تھا کہ کلکتہ کی تجارت کا انتظام زیادہ تر برطانوی قوم کے ہاتھ میں تھا جب کہ بمبئی میں وہاں کے ہندستانی یعنی گجراتی اور پارسی بھی ایک بڑا حصہ رکھتے تھے ۔

کپاس اور افیون کا بیچنا اور انھیں بیرون ملک کے بازاروں میں بھیجنا اور سوت کی تجارت ان سب نے ہندستان کے تاجروں کے دماغ میں اول اول سوت کی اور بعدازاں کپڑے تیار کرنے کی فیکٹریاں بھی اور اس کے قریب کے کپاس پیدا کرنے والے علاقوں میں بنانے پر اکسایا ۔

گجرات کے مہاجنوں تاجروں اور صنعت کرنے والوں کے علاوہ مارواڑیوں نے بھی تجارت میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ ان کو صرف قرض دینے میں دلچسپی تھی ۔ اور پیشوا حکومت کے زوال کے بعد وہ ایک بڑی روز افزوں ترقی کرنے والی تعداد میں دکن اور مغربی ہندستان میں نمودار ہوئے ۔ مغربی ہندستان میں جتنے قرضے ادا کئے گئے ان میں ان کا بڑا حصہ تھا۔ گجراتی اور مارواڑی دونوں رفتہ رفتہ تمام ہندستان میں پھیل گئے وہ دیہات سے لیکر اور راج تک قرضہ بھی دیتے رہے ۔ اور تجارت بھی کرتے تھے ۔ یہ دونوں ان کے عمل میں شامل تھے مارواڑی جن کا اصلی وطن راجپوتانہ تھا۔ وہ مہاراشٹر، صوبہ متوسط، صوبہ متحدہ، بنگال، آندھرا پردیش اور دوسرے اہم مرکزوں میں قرض دینے اور تجارت کرنے میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے

ان کا اصل کاروبار چھوٹی چھوٹی صنعتوں کے لئے سرمایہ فراہم کرنا اور ان کے لئے بازار مہیا کرنا اور زرعی پیداوار مثل کپاس کی تیاری کی کاروائیوں میں مدد دینے تک محدود تھا۔

بنگال میں ایجنٹوں، گماشتوں اور چھوٹے چھوٹے سرکاری ملازمین کے ذریعہ ایک متوسط طبقہ کی نشوونما اور اس متوسط طبقہ کے ذریعہ ایک ہی مالکان آراضی کے طبقہ کا وجود میں آنا جس نے مختلف طبقات کے لگان وصول کرنے والوں کی ایک بے شمار تعداد کو جنم دیا۔ اس سے پہلے بحث میں آ چکا ہے۔ بیسویں صدی میں تجارت کو فروغ ہوا۔ بنگال کے مالکان اراضی اور ان کے علاقوں کے تجار اور کاروباری لوگوں نے جو دوسرے صوبوں کے رہنے والے تھے مثلاً مارواڑی ان سب نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے اس مہم میں شرکت کی اور ان کو بیرون ملک کی فرموں سے سخت مقابلہ کرنا پڑا۔ ان کو یہ پتہ چلا کہ صنعت سے زیادہ زمین میں منافع ہے اس لئے ان لوگوں نے سن، تیار شدہ کپڑوں یا بونے والی صنعتوں مثلاً چائے یا تیل وغیرہ میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔

نتیجہ یہ ہے کہ اگرچہ زرعی متوسط طبقہ کی صحیح تعداد کا اندازہ کرنا مشکل ہے لیکن پھر بھی جو نامکمل اور پورے طور پر قابل اعتبار نہ ہونے والا مواد موجود ہے اور جو اعداد و شمار اوپر دیئے گئے ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس طبقہ کی تعداد دولت اور اثر میں بیسویں صدی کے اندر بہت زیادہ ترقی کر گیا۔

تیسرا باب

اقتصادی جمود، صنعت اور تجارت

اقتصادیات کی دوسری نوع یعنی صنعت کی ترقی کے ساتھ بھی ویسا مختلف برتاؤ رہا جو زراعت کے ساتھ رکھا گیا۔ یہ فرق نمایاں نظر آتا ہے جب صنعت کی دو شاخوں غیر منظم اور منظم دونوں کا تجربہ کیا جائے۔ جبکہ اور شہروں اور قصبوں کی غیر منظم گھریلو صنعت بیسویں صدی میں زوال پذیر تھی اور منتشر ہو رہی تھی۔ منظم صنعتیں سست رفتار بھی تھیں اور غیر مساویانہ رفتار سے چل رہی تھیں۔ حلقوں میں کچھ ترقی ضرور ہو رہی تھی۔ لیکن مجموعی طور پر یہ ترقی ناہموار تھی اور صنعت ایک جامع نظام کی حیثیت سے عملاً بڑھ نہیں رہی تھی کچھ صنعتیں جن کا انحصار ابتدائی زرعی پیداواروں پر تھا انیسویں صدی کے آخر میں قائم ہوئیں۔ لیکن لوہا فولاد اور کوئلہ پیچھے رہ گئے تھے اور نتیجہ یہ ہوا کہ صنعتی انقلاب کی ایک ضروری شرط ہندوستان میں روک دی گئی تھی۔

غیر منظم صنعت

ہندوستان کی پرانی کاریگری اور دستکاری کی صنعتیں یا تو قصبوں میں تھیں یا گاؤں میں شہر طلب میں دستکاری زیادہ تر امرا اور روٴسا کی ضروریات کو پوری کرنے کا کام کرتی تھی اور یہ لوگ بیرونی ممالک کو بھیجی جانے والی بہت سی اشیاء بھی تیار کرتے تھے لیکن اس طبقہ کو عظیم رکاوٹ کا سامنا کرنا پڑا اور کچھ صنعتوں نے تو دم توڑ دیا۔

صدی کے اختتام کے وقت نئی طاقتیں آگے آکر صف آرا ہوئیں ہندوستان کی سیاسی تحریک مضبوط ہو گئی۔ اور سودیشی کی تحریک کیوجہ سے گاؤں کی صنعت کو ایک جدید حمایت حاصل

ہوئی انیسویں صدی کے آخری سالوں صنعتی ترقی کے مطالبہ پر برطانیہ کا مزاج آگ کی طرح گرم ہو رہا تھا اور کرزن کے خطیبانہ مضامین جو طنز کی بارش کرتے رہتے تھے اور گورنمنٹ کے انتظام کی خیر ہر دل عزیز تدبیر خاص کر بنگال کی تقسیم بے اطمینانی کی آگ کو بھڑکاتی رہتی تھیں۔ یہ روز بروز صاف طور پر ظاہر ہوتا جا رہا تھا کہ انگریسیوں کا یہ مفروضہ کہ گورنمنٹ معقول بات کو ماننے کے لئے تیار ہے اور شکایات کے دفعیہ کے لئے آئینی طریقے کافی ہیں۔ اس پر نظر ثانی کرنی چاہئے اور اپنے مطالبات بر روز دینے کیلئے نئے ذرائع کی ضرورت ہے۔ اس موقع پر بیرون ملک کی بعض مثالوں نے اپنی جانب متوجہ کیا۔ آئرلینڈ کے محبان وطن نے راستہ دکھلا دیا تھا۔ 1870 کے قریب ان لوگوں نے بائیکاٹ کا ہتھیار زمینداروں کے خلاف استعمال کیا تھا اور بہت جلد یہ سیاسی جنگ کا ایک طاقتور آلہ بن گیا۔ 1902 اس گریفتھ (GRIFFITH) نے آئرش لیگ کی بنیاد ڈالی اور ایک پالیسی اختیار کیا جس کا نام سن فین رکھا (یعنی ہم لوگ) جو آئرلینڈ کے ہوم رول کا نعرہ جنگ بن گیا۔

ہندستان میں سودیشی (یعنی اس کے کہ جو اپنے ملک کا تیار کردہ ہو) اور بائیکاٹ کے حربے بطور جواب استعمال کئے گئے۔ بہت جلد وہ قومی خودداری اور خود اعتمادی کے نشان بن گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بنگال میں ہینڈ ہوم صنعت کا پھر ابھرا ہوا اور وہاں سے ہندستان کے مختلف حصوں میں پھیل گئی 1919 سے گاندھی جی نے چرخہ اور کھدر پر جو حد سے زیادہ زور دیا تو اس کا انجام یہ ہوا کہ دیہات کی صنعت کو از سر نو زندہ کر بڑا سامان مہیا ہوا۔

اس طرح سوت کی صنعت کا کاروبار 07-1906 سے آگے تیزی سے بڑھتا ہی رہا آر۔ کے کری کا کہنا ہے کہ یہ تی زندگی ان مقامات پر زیادہ نمایاں ہوئی جہاں کپڑا تیار کیا جاتا تھا 1905-1906 میں تو 1032 ملین گز تھا لیکن 39-1938 اس 17,032 ملین گز ہو گیا جب سے کاتنے والوں کی کل ہند انجمن All India Spinners Association عالم وجود میں آئی اس صنعت کی ترقی کی رفتار حسب ذیل تھی۔[1]

25-1924 میں کھدر 9.5 لاکھ کا تیار کیا گیا

31-1930 " " 72 " " "

---

[1] Wadia and Merchant, op-cit, P. 606.

1935 - میں کھدر 32 لاکھ کا تیار کیا گیا
1941 - 42 " " 1.2 کروڑ " " "
1944 - 45 " " 1.34 " " " "

یہ اندازہ کیا گیا کہ کل جتنا کپڑا ہندستان میں استعمال ہوتا ہے اس کا ایک تہائی حصہ ہینڈ لوم سے تیار کیا جاتا ہے۔ یہ بات کہ گاؤں کی کپڑا بنانے کی صنعت فیکٹری کے تیار شدہ مال کے مقابلہ سب بالکل تہ و بالا نہیں ہو گئی خاص وجوہ کی بنا پر ہے۔ ان میں قابل ذکر حسب ذیل باتیں ہیں (1) گاؤں میں جن چیزوں کی ضرورت ہے ان کی نوعیت اور (2) خریداران کی مالی اہلیت۔

لیکن پھر بھی اس صنعت کو کئی طرح کی منزلوں سے گذرنا پڑا۔ یہ کوئی مبالغہ نہ ہوگا اگر یہ نتیجہ نکالا جائے کہ اگر چہ اس صنعت نے اپنا سب سے بڑا حصہ ان سوتی کپڑوں کے بنانے پر صرف کیا۔ لیکن سودیشی تحریک کے اکسانے سے جو 1906 میں شروع ہوئی تھی اور گاندھی جی کی حمایت اور قدر سے گورنمنٹ کی امداد ان سب کے باوجود جولاہوں کی حالت میں کوئی نمایاں حد تک بہتری نہیں آئی۔

دنکٹارمن (Venkataraman) نے ہینڈ لوم صنعت کے بارے جو نتائج نکالے ہیں وہ حسب ذیل ہیں (1) گذشتہ صدی میں جولاہوں کی حالت بدترین تھی اور خاص کر اس زمانہ میں جب ہندستان میں آزاد تجارت کو رواج دیا گیا اور (2) کوئی چیز ایسی نہیں ملتی ہے۔ جو یہ ظاہر کرے کہ گذشتہ ساٹھ سالوں میں ان کی حالت کچھ بھی بہتر ہوئی ہے۔[2]

اس طرح باوجود اس کے کہ 1904 کے بعد اس کو ابھارا گیا۔ پھر بھی دیہات کی صنعت مجموعی طور پر ترقی نہ کر سکی اور پوری انیسویں صدی میں نیچے اترنے کی رفتار پر یہ قائم رہی اور اگر چہ ان صنعتوں میں سے بعض مستحکم ہو گئیں مثلاً سوت کا کپڑا تیار

2- Venkataraman, K.S. The Handloom Industry in South India (1935). P. 190.

کرنے کا کام۔ لوہاری کا کام بڑھئی کا کام۔ لیکن دیہات کی صنعت کے ٹکڑوں میں ٹوٹ جانے سے دستکاری اور کاریگر پر برا اثر پڑا گیڈگل (Gadgil) کہتا ہے

دیہات کی صنعت ایسی صنعت تھی جو برابر زوال سے دوچار تھی۔ ایک کثیر تعداد جو ان صنعتوں سے باہر پھینک دی گئی اس نے دوسرے معمولی درجے کے مزدوری کے کام شروع کر دیئے صرف چند خوش قسمت ایسے تھے جو شہروں کی صنعت میں جگہ پا سکے۔ کچھ لوگوں نے زراعت کا پیشہ اختیار کر لیا اور جو لوگ باقی رہ گئے۔ یعنی وہ لوگ جو اب تک اپنے آبائی پیشہ سے چپکے ہوئے تھے وہ بس وہیں رہ گئے جہاں پہلے تھے یعنی ایک بھوک کا مارا طبقہ جو موسم کے ردوبدل سے بدرجہ اتم متاثر ہوا کرتا تھا۔

برطانیہ کی ڈیڑھ سو سال کی حکومت کے باوجود غالباً اسی کی وجہ سے ہندستان کا دیہات یعنی اس کی تقریباً۔ 80 فیصدی آبادی ایک جامد زندگی کو گھسیٹ رہی تھی جس میں بہتری کی کوئی امید نہ تھی۔ یہ مذموم چکر کہ ایک طرف تو آبادی بڑھ رہی تھی اور دوسری جانب اقتصادی حالت کھسکنے والی تھی ملک کو ایک خطرناک نزاکت کی گود میں دھکیل کرلے جا رہا تھا۔

II منظم صنعت

جہاں تک منظم صنعت کا تعلق ہے حالت غیر معمولی تھی۔ صنعت کے دو شعبے تھے کاشت اور فیکٹریاں۔ پہلے میں مخصوص صنعتیں یہ تھیں۔ تیل، قہوہ، اور ربڑ۔ دوسرے میں سوتی کپڑوں کی تیاری، کوئلہ کی کانیں یا انجینیری، لوہا، فولاد اور کیمیاوی اشیاء۔

III متمتع کے مال کی صنعت

ان صنعتوں کا غیر معمولی پہلو یہ تھا کہ جن کا تعلق پہلی قسم سے تھا وہ زیادہ تر یوروپینوں کی ملکیت میں تھے اور یوروپین لوگوں کے ہاتھ میں ان کا انتظام بھی تھا۔ اور دوسری قسم، کی صنعتوں کا سوائے سوتی کپڑا تیار کرنے کی صنعت کے یہ حال تھا کہ ان کا کل سرمایہ یوروپین لوگوں کا تھا اور وہی ان کا انتظام بھی کرتے تھے۔ بلکہ سوتی کپڑوں کی صنعت کے لئے بھی یوروپین منیجر اور ماہرین فن ملازم رکھے جاتے تھے۔ ان صنعتوں کا نظام جوائنٹ اسٹاک کمپنیز (JOINT STOCK COMPONIES) کے مثل تھا اور ان کا کاروبار اس

طرح ہوتا تھا کہ کارخانے قائم کئے جاتے تھے اور ان کے منیجران کے ذریعہ انتظام کیا جاتا تھا یہ منیجران زیادہ تر یورپین ہوتے تھے۔ 32-1931 میں وہ کمپنیاں جو ہندستان کے باہر مملکت برطانیہ عظمیٰ میں رجسٹرڈ کی گئیں ان کی تعداد 911 تھی اور ان کا خاص سرمایہ 756 ملین تھا جو کمپنیاں ہندستان میں رجسٹرڈ کی گئیں ان کی تعداد 7198 تھی اور ان کا سرمایہ 286 کروڑ روپیہ یا تقریباً 214 ملین پونڈ تھا (ایک پونڈ تیرہ روپیہ 5 آنہ سہ پائی کے برابر تھا)

اس طرح جو لوگ ان صنعتوں سے منتفع ہوتے تھے وہ خاص طور پر یورپین تھا اسلئے منافع کا بہت سا حصہ جو ہندستان میں حاصل کیا جاتا تھا ہندستان کے باہر چلا جاتا تھا۔ اس لئے تجارتی مرکزوں اور انتظام کے اڈوں کے تجربات ملک کے اندر نہیں رہتے تھے تاکہ اس زمین کے بچوں کو فائدہ پہونچے اور نہ ان سے وہ راستہ بن سکتا تھا جس پر چل کر ان صنعتوں پر قبضہ حاصل کیا جا سکے۔ گورنمنٹ ان بیرون ملک کمپنیوں کو لطف وعنایات سے نوازا کرتی تھی۔ اس سے فیکٹری کے مرکزوں کے قائم کرنے والوں کی ہمت افزائی ہوتی تھی اور قائم کرنے والوں کو مزدور مل جاتے تھے جن کے ساتھ نہایت انسانیت سوز برتاؤ کیا جاتا تھا دوسری جانب گورنمنٹ کا رویہ ان فیکٹریوں کے ساتھ جو سوتی کپڑے تیار کرتی تھیں اور جن کے مالک ہندستانی تھے اور برطانوی کارخانہ داروں کا رقیبانہ مقابلہ کرتے تھے 1923 تک غیر دوستانہ تھا۔ انیسویں صدی میں آزاد مغربی قومیں اپنی حکومتوں کی عملی امداد سے نہایت تیزی کے ساتھ صنعتی ملک بن رہی تھیں اور برطانیہ کے صنعتی انقلاب کے نقش قدم پر چل رہی تھیں۔ ممالک متحدہ امریکہ اور سوئٹزرلینڈ پہلے راہ دکھلانے والے تھے۔ ممالک متحدہ امریکہ آزادی کے فوراً بعد اپنے وطن کی صنعت کو فروغ دینے کے لیے باہر سے آنے والے مال پر اپنے مال کے تحفظ کے لیے بھری ٹیکس لگا دیا اور ایک صدی سے کم عرصہ میں امریکہ کی صنعت نے دوڑ کر برطانیہ کی صنعت کو پکڑ لیا۔ اور پھر اس سے آگے نکل گئی۔ بہت سے یورپ کے ممالک نے اسکی تقلید کی۔ بلجیم، فرانس، جرمنی، آسٹریا، روس، اور سویڈن۔ ان تمام ممالک میں ملک کو صنعتی بنانے کے لیے یا تو تحفظ کی پالیسی اختیار کی گئی یا امداد دی گئی حتیٰ کہ 1860 میں وہ نہ صرف برطانیہ کے مقابلے کو برداشت کر سکتے تھے بلکہ زیادہ سے زیادہ برطانیہ سے مال منگانے سے آزاد ہوتے گئے۔ براعظم کے ممالک میں جرمنی بہت تیزی سے آگے نکل گیا اور قبل اس کے کہ صدی ختم ہو برطانیہ کے نظام فرماں روائی کو مقابلے کے لیے للکارا۔

کچھ دوسرے ممالک یورپ۔ اٹلی، نیدرلینڈ، ڈنمارک اور یونان اس دوڑ میں شریک ہو گئے اور کناڈا اور جاپان کے بالکل قریب پیچھے 1960 کے بعد چلے۔ یہ بڑی تعریف کی بات ہے کہ معدنیات کے وسائل کے نہ ہونے کے باوجود ہالینڈ ڈنمارک اور سوئزرلینڈ نے ترقی یافتہ صنعتی اقتصادیات کو تعمیر کر لیا۔

بیسویں صدی کے نصف کے زمانہ کے صنعتی ترقیات کا ایک عام جائزہ لینے سے ہندوستان کی پسماندگی صاف نظر آتی ہے۔ اس کی اقتصادیات بے حرکت تھیں اور اس کے سماجی مسائل روز بروز زیادہ پیچیدہ ہوتے جاتے رہے تھے۔ سوتی کپڑوں کی تیاری کی صنعت اور دوسری ان صنعتوں کا بھی لحاظ کرتے ہوئے جو مال کے استعمال کرنے والوں کے لیے قائم کی گئیں اور یہ بھی تسلیم کرتے ہوئے کہ لوہے اور فولاد کی صنعتیں قائم کی گئیں پھر بھی یہ واقعہ اپنی جگہ پر جاری رہتا ہے کہ ملک کو صنعتی بنانے کی کارروائی مایوسی کی حد تک سست تھی اور اس لیے عام باشندوں کے ہولناک مصائب کا کوئی علاج نہیں ہوا۔

صدی کے خاتمہ کے وقت تک ہندوستان ایک بالکل زراعتی ملک تھا اور جو بھی صنعتی ترقی ہوتی تھی وہ برطانوی تھی۔ نہ کہ ہندوستانی۔ یہ ایک عجیب منظر تھا۔ برطانیہ کا سرمایہ برطانیہ مہم بازی اس کی انتظامی اور فنی استادانہ مہارت ہندوستان کے مزدوروں کو اور ہندوستان کا کچا مال استعمال کر کے بڑے سے بڑا منافع کماتے تھے اور اس کو ہندوستان سے برطانیہ منتقل کر دیا جاتا تھا ہندوستان کے مزدور اپنے برطانوی مالکان کی دولت اور ان کی طاقت میں اضافہ کرنے کے لیے غلامانہ خدمات انجام دیتے تھے اور اس کے معاوضہ میں ایک نہایت حقیر رقم مزدوری کے طور پر پاتے تھے اور نہایت ذلیل زندگی گذارتے تھے۔ چائے کی کاشت کے لیے بوچانن (Buchanan) کی شہادت سخت ملامت انگیز ہے۔[4]

ان فیکٹریوں اور کانوں میں مزدور انسانیت سوز حالات میں رہتے تھے بلا لحاظ اس کے کہ ان کے مالکان ہندوستانی ہیں یا انگریز۔ بمبئی فیکٹری لیبر کمیشن نے ہو رپورٹ روئی دھننے کی مشین اور اسکو دبانے کے کارخانے کے بارے میں دی اگر زن نے کو کر کی

---

4. Buchanan, D.H. The Development of Capital Enterprises in India. P.52.

کانوں کے کاروبار کی جو جانچ کی، عورتوں اور بچوں کی بھرتی کے بارے میں جو اطلاعات ایکٹس اور پارلیمنٹ کے کاغذات یہ سب اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ صنعتوں میں مزدوروں کے ساتھ کیسا مذموم سلوک کیا جا رہا تھا۔ سوت کے کارخانوں میں دھننے کی مشینوں کے کام پوں یا دبانے کے چودہ سے پندرہ گھنٹے اور بعض اوقات اٹھارہ گھنٹے یومیہ کام لیا جاتا تھا۔ ان لوگوں کی مزدوری چار بجے صبح سے دس بجے رات تک کام کرتے تھے 3 یا 4 یومیہ تھی۔5/ ایک فیکٹری کے منیجر نے کمیشن کے سامنے بیان دیا۔ روکھے پھیکے چہرے کے کے ساتھ کہا کہ جو لوگ ان حد سے زیادہ گھنٹوں تک کام کرتے تھے اکثر مر جاتے تھے۔6/

برطانوی حکومت کے آخری نصف صدی میں جہاں تک کہ مزدوروں کے معاملات کا سوال ہے۔ حالات ضرور بدل گئے تھے لیکن ملک کے صنعتی بننے کی رفتار بدستور غیر اطمینان بخش تھی۔ منظم صنعت کی دو قسموں میں تقسیم ہونے والوں کے لئے سامان تیار کرتی تھیں ان کو اولیت حاصل تھی اس کا ظہور ایک ایسے ملک میں جس کی اقتصادیات حد سے زیادہ زراعت پر مبنی تھی ترقی کی ایک منزل تھی۔ اس صنعت کی خاص شاخیں غذا، مشروبات، پارچہ بافی، سوت ریشم اور سن، چمڑے کے سامان، لکڑی کے سامان اور کوئلہ کی کان کنی تھیں۔ ہندوستان میں اس صنعت کی نشو ونما کی وجہ دستکاری کا زوال تھا۔ جو اس وجہ پیش آیا کہ سستے قسم کے کپڑے بیرون ملک سے آئے جس کی تحریک اس سے ہوئی تھی کہ مملکت متحدہ انگلستان نے سرمایہ لگایا اور ہندوستان کے تجار طبقہ کے ہاتھ میں دولت جمع ہو گئی۔ جو زیادہ تر بمبئی پریسیڈنسی کے رہنے والے تھے اور یہ دولت افیون اور روئی کی چین سے تجارت اور بیرون ملک بھیجنے کے لیے سامان فراہم کرنے اور برطانیہ سے جو مال اندرون ملک آتا تھا اس کو بیچنے سے کمائی گئی تھی۔ دو واقعات جنہوں نے نشو ونما میں سہولتیں پیدا کیں وہ کچے مال کی دستیابی اور ملک کے باہر بازاروں کا وجود تھیں۔

کارخانہ کاشت کی صنعت کے کسب سے پہلے وہ تھے۔ جو تیل، چائے، قہوہ اور کچھ دیر ربڑ کی کاشت سے تعلق رکھتے تھے۔ 1850 اور 1900 صنعت بر بنائے کاشت میں نیل

5۔ Ibid, P. 304.

6۔ Ibid, P. 305.

کے علاوہ ترقی بہت تیز تھی۔ بیسویں صدی کے آغاز کے وقت 5,25,000 ایکڑ چائے کی کاشت
اور 1,00,000 ایکڑ قہوہ کی کاشت تھی۔ لیکن قہوہ کی کاشت تیزی کے ساتھ گھٹ رہا تھی۔
اور اس کی کاشت کا رقبہ شروع میں جو زیر کاشت تھا اس کا صرف ایک تہائی رہ گیا تھا۔
50 - 1949 تک چائے کا زیر کاشت رقبہ بڑھ کر 8,00,000 اور اس کی کل آمدنی
600 ملین پاؤنڈ ہو گئی تھی اور اسی طرح قہوہ کا رقبہ اسی زمانہ میں 2,20,000 ایکڑ اور آمدنی
50 ملین پونڈ تھی۔ ہندستان نے فیکٹریوں میں 12,000 ٹن ربڑ تیار کیا۔
کارخانہ کاشت کی صنعت خوش نصیب تھی اس کا کل انتظام برطانوی لوگوں کی ملکیت
اور اقتدار کے اندر تھا اور اس لیے اس کو گورنمنٹ کی سرپرستی حاصل تھی۔

IV وسیع پیمانہ کی صنعت

فیکٹری کی صنعتیں بہرحال اتنی خوش قسمت نہ تھیں کہ ان میں بھی حکمراں کے سے
اسی کے برابر لطف و کرم دینے کی کوشش ہوتی۔ لیکن جہاں تک ان کا تعلق ہے کچھ دوسرے
ایسے موافق حالات تھے جنہوں نے حکومت کے نظرانداز کرنے اور ان کی ہمت توڑنے کا جو
طریقہ اختیار کیا تھا ان کی تلافی کر دی گورنمنٹ نے ان کی ترقی کی رفتار کو سست کر دیا اور ایسی
صنعتوں کے ارتقا میں رکاوٹ پڑی جو بڑے بڑے سرمایوں سے مال تیار کرتی ہیں۔

V پارچہ بافی۔ سوتی

سوتی ملوں کی صنعت کے کارخانے زیادہ تر مغربی ہندستان میں اور خاص کر بمبئی میں
اکٹھا ہو گئے تھے۔ ایسے واقعات پہلے سے موجود تھے جو ان کی ترقی میں معاون ہوئے۔ کچا مال
آسانی سے مل سکتا تھا کیونکہ ریسیڈنسی، گجرات، کچھ، برار اور صوبہ متوسط میں جو سب بمبئی اور
احمدآباد سے جہاں ملوں کا مرکز تھا قریب واقع ہیں۔ روئی کی کاشت کثرت سے ہوتی تھی مزدور
کی بھی فراوانی تھی کیونکہ گاؤں میں ایسے کاشتکار بہت تھے جو بے روزگار تھے۔
بمبئی کے تجار۔ پارسی، بھاٹیا اور بوہرہ بیرونی تجارت سے جو ہر سال بڑھتی جاتی تھی
بہت دولت مند ہو گئے تھے۔ بنگال اور دوسرے شمالی ہند کے مقابلہ کے برخلاف جہاں
جہاں ریعیت واری طرز مالگزاری قائم تھا وہاں دولت زمین پر سرمایہ لگانا کسی طرح جاذب نہ تھا۔

تھا۔ نے جو سرمایہ جمع کیا تھا اسے پارچہ بافی کی صنعت پر لگا سکے کافی میلان اسی وجہ سے تھا۔ سوت کی ملوں کے لیے بازار کثرت سے تھے۔ چین والے ہندوستانی سوت اور کپڑوں کے خاص خریدار تھے مثلاً 05-1904 اور 09-1908 کے درمیان 248 ملین پونڈ کا سوت باہر بھیجا گیا۔ جس میں سے 220.7 ملین پونڈ کے چین نے لیے 7/۔ دوسرے دسویں سال سے جاپان کے مقابلہ میں آجانے اور چین میں سوت کی صنعت کی نشو و نما نے بتدریج اس بازار میں تنزل پیدا کر دیا۔ لیکن بہرحال اس کی تلافی اندرون ملک میں سوت اور کپڑے دونوں کے بازاروں کے ترقی کر جانے سے ہو گئی۔

ان موافق حالات کے خلاف اس صنعت کو لنکاشائر کی سوت کی فیکٹریوں کے مالکان کی مخالفت کا صدی کے پہلے تین دس سالوں میں مقابلہ کرنا پڑا جس نے گورنمنٹ کو اس بات پر مجبور کر دیا کہ اس نے اس پنپتی ہوئی ہندوستانی صنعت کو 1923 تک کوئی تحفظ نہیں دیا۔

جو کچھ ہو پھر بھی پارچہ بافی کی صنعت 1900 سے لیکر 1950 کے درمیان کافی ترقی کر گئی پہلی سوت تیار کرنے والی مل 1854 میں شروع ہوئی اور کپڑا بننے والی مل 1860 میں قائم ہوئی۔ 62-1861 میں سوت کی گرم بازاری نے سوت کی صنعت کو اور تقویت پہونچائی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تاجروں میں ایک صنعتی سرمایہ دار طبقہ عالم وجود میں آگیا۔ 1905 تک بمبئی میں 69 سوت کی ملیں تھیں جن میں 2,24,000 تکلیاں تھیں، اور 1911 میں 87 ملیں تھیں جن میں 28,90,000 تکلیاں تھیں۔ 1941 میں 65 ملیں تھیں جن میں 27,80,000 تکلیاں تھیں۔ ملوں کی تعداد بمبئی پریسیڈنسی میں 1911 میں 182 سے 1941 میں 202 ہو گئی 8/۔ اور کل ہندوستان میں (بیرون بمبئی) 1911 میں 261 سے 1941 میں 380 ہو گئی۔ 01-1900 میں ہندوستان نے 353 ملین پونڈ سوت اور 422 ملین گز کپڑا تیار کیا۔ 1947 میں سوت کی تیاری کی تعداد بڑھ کر 1,330 ملین پونڈ

7- Sanyal. V.B. 96-Cent. P. 240

8- Ibid, PP. 224-25.

اور کپڑا 3770 ملین گز تیار ہو گیا۔ /9

سوت کی صنعت زیادہ سے زیادہ تر ایک ہندوستانی صنعت تھی لیکن پھر بھی بہت سے یورپین منیجری کے لیے اور فنی مہارت کے کاموں کے لیے ملازم رکھے جاتے تھے اگرچہ بعد کو ان کی جگہوں پر ہندوستانی آ گئے۔ 1948 میں باہر کا جو سرمایہ اس میں لگا وہ کل کا صرف 2% فیصدی تھا۔ /10

ایک دلچسپ واقعہ سوت صنعت میں پیش آیا کہ جو لوگ شروع میں اس کے بانی مبانی اور مالک تھے۔ یعنی پارسی، بھاٹیا، بوہرہ اور یورپین ان سب کو ٹھا کسان کی جگہ مارواڑیوں اور گجراتیوں نے بمبئی اور احمد آباد اور ہندوستان کے دوسرے مقامات کی ملوں میں لے لیا اور اس طرح ملوں کی ملکیت چند انتظامی گماشتوں managing Agents کے ہاتھ میں چلی گئی۔

سوت کی تجارت ان فیکٹریوں کی صنعتوں میں جن کا نظم و نسق ہندوستانیوں کے ہاتھ میں تھا اور جو پرائیوٹ ہم بازی سے وجود میں آئی تھیں سب سے بڑی صنعت تھی۔ یعنی جہاں تک کہ سرمایہ لگانے تیار شدہ مال کی مقدار کا اور جو مزدور کام پر لگے ہوئے ان کی تعداد کا سوال تھا۔

1889 کے بعد ترقی برابر مسلسل ہوتی رہی اگرچہ انیسویں صدی کے آخر میں سخت قسم کے قحط پڑے اور گلٹی والا طاعون بھی آیا جو 1896 میں بہت شدت سے پھیل گیا۔ یہ امریکہ کی سٹہ بازی اور بعد کو قیمت کے اضافہ کو (1902) اور ہندوستانی سوت کے لیے چین کے بازار کی علی محرومی کو بھی جھیل گئی۔ باوجود اور دیگر مخالف حالات اور صنعت کی انتشار بازی اور کساد بازاری جو مابعد جنگ نمودار ہوئیں اور باوجود اس کے کہ ہیڈ لوم کی صنعت مقابلہ باہر کے تیار کیے مال سے تھا ملوں کے تیار شدہ مال کی مقدار بڑھتی ہی گئی۔ نصف صدی میں صنعت کے اندر نشیب فراز آئے لیکن مجموعی طور پر یہ پھیلتی ہی گئی۔ اس کی ترقی کا باہر سے ملک کے اندر آنے والے مال پر نمایاں اثر ہوا۔ 01 - 1900 میں ہندوستان نے۔

9- Ibid, P. 247.

10- Ibid, P. 243, Note Quote. Malhotra Brothers; Bharat yearbook 1951 (DELHI, 1952) P. 284.

48-1947 میں 1875 ملین گز کپڑا باہر سے درآمد کیا تھا اور سب سے اونچی چوٹی پہنچی جب 2400 ملین کا مال درآمد ہوا لیکن '48-1947 میں گھٹ کر صرف 26 ملین رہ گیا۔/11،

سن (JAUTE)

دوسری بڑی پارچہ باقی کی صنعت سن (Jute) کی تھی جو تقریباً کل کی کل یورپینوں کے ہاتھ میں تھی۔ چنانچہ ان کی نشو و نما کے لیے حالات اور بھی زیادہ موافق تھے۔ کچا مال وافر تھا اور مزدور کثرت سے ملتے تھے سن سے تیار شدہ اشیاء کی مانگ دنیا میں تیزی سے بڑھ رہی تھی اور برطانیہ کے سرمایہ دار بلا جھجک سرمایہ مہیا کر رہے تھے۔ گورنمنٹ پر اس کاروبار کی وجہ سے مسرت چھائی ہوئی تھی اس صنعت کا اہم مرکز بنگال تھا۔

شکر

اس صنعت کی دوسری صنعتیں جو غذا یا شروبات کے طور پر استعمال ہوتی تھیں یا چمڑے یا لکڑی سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان میں ایک صنعت ایسی تھی جس پر خاص توجہ کرنے کی ضرورت ہے بقیہ تو معمولی اہمیت رکھتی تھیں۔ صدی کے اختتام کے قریب شکر کی صنعت کا حال خراب تھا۔ چقندر یا اسی قسم کے پودوں سے تیار کی جانے والی شکر کی صنعت کی ترقی ماریشس سے آنے والی سستی چینی اور امریکہ کی قانونی تحفظ کی شکر ان سب نے مل کر قیمت گرانے پر مجبور کیا۔ اور اس کی وجہ سے ہندوستان مجبور ہو گیا کہ اپنے اوکھ کا رقبہ کم کرے۔ موجودہ صدی کے شروع ہندوستان میں شکر کی صنعت زوال پذیر تھی اور باہر سے درآمد تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ 18 - 1914 کی لڑائی نے اوکھ کی پیداوار کی تحریک پیدا کی اور اس کی فصل کے رقبہ میں اضافہ ہوا۔ 32 - 1931 میں عارضی طور پر صناع کمی کو محفوظ رکھنے کے لیے بیرونی مال پر عارضی طور پر ٹیکس لگایا گیا اور دوسرے سال (1932) صنعت شکر کا حفاظتی ایکٹ (Sugar Industry Protection Act)

11- Singh, V.B. op-cit. PP. 238 and 247.

پاس لیا گیا جو ٹیکس تحفظ کے لیے لگایا گیا اس نے ضروری محرکات فراہم کر دیئے اور یہ صنعت اور تیزی کے ساتھ ترقی کرنے لگی۔ /12

کوئلہ

معدنیات کی صنعتوں میں لوہے نے بہت ترقی کی کیونکہ ریلوے اور فیکٹریوں کی روز افزوں ضروریات کو یہ پورا کرتی تھی اور زراعت کے نشیب و فراز کا اس پر کوئی اثر نہ تھا ــ صدی کے پہلے دس سالوں میں کوئلہ کی مجموعی پیداوار میں اضافہ ہوا۔ لڑائی اس کی پیداوار میں محرک ثابت ہوئی لیکن اس کے بعد ایک طویل زمانہ جمود کا آتا ہے جو جاکر 1936 میں ختم ہوا جب مانگ بڑھی۔ 45-1939 کی لڑائی نے مزید محرکات پیدا کئے پیداوار بڑھ گئی اور برآمد میں ترقی ہوئی۔

اصل سرمایہ کی صنعت

گو کہ یہ ملک ان صنعتوں کے معاملے میں آگے بڑھا ہوا استعمال ہونے والی اشیاء کے بارے میں تھیں اور ترقی خاص کر 1914 کے بعد ہوئی لیکن دوسری منزل کی ترقی کے لیے جن محرکات کی ضرورت تھی بدقسمتی سے وہ عالم وجود میں نہیں آئے کسی ملک کے صنعتی انقلاب کے لیے لوہا۔ فولاد، مشینری انجینرنگ اور معدنیات کی صنعتیں کلیدی حیثیت رکھتی ہیں۔ 1925 میں جو اشیاء استعمال میں آتی تھیں ان کی نسبت ہندوستان میں مجموعی پیداوار اور اصل سرمایہ کی صنعت کی پیداوار کے مقابلہ میں 4.2 تھی جبکہ اسی زمانہ میں جاپان کے اندر 2.4 اور برطانیہ کی نوآبادیات کے اندر کناڈا میں 1.07 جنوبی افریقہ میں 1.08 آسٹریلیا 1.07 اور نیوزی لینڈ میں 3.04 تھی /13۔ رانا ڈے نے جو بڑی امیدیں بنائی تھیں وہ مبالغہ آمیز ثابت ہوئیں۔ انہوں نے 1898 میں لکھا تھا "میں نے آپ کے سامنے وہ سب باتیں پیش کر دی ہیں جن سے بظاہر ایسا

---

12 - Jather, G.B. and S.G. Indian Economics, Vol I (9th Edition 1949) PP. 142-48.

13 - Hoffmann, W.G. The Growth of Industrial Economics, Appendix, Table 2.

معلوم ہوتا ہے کہ اس امید کے لیے یہ مناسب وجوہ ہیں جو میں نے قائم کی ہیں کہ ہندوستان اب ایسی راہ پر اچھی طرح لگ گیا ہے کہ اگر اسی جوش سے اس کی کارروائیوں کو آگے بڑھایا جاتا رہا جس جوش سے اس کے سرمایہ داروں نے اب تک کام کیا ہے تو ہندوستان اپنی صنعتی تجارت کے حاصل کرنے میں ناکام نہیں رہ سکتا،،/14

رانا ڈے نے جو ابتدا قائم کی تھی وہ کامیاب کیوں نہ ہوئی وہ بات سمجھ میں آسکتی ہے اگر اس زمانہ میں ان صنعتوں کی نشو ونما کی تشریح کردی جائے۔

لوہا اور فولاد

لوہے اور فولاد کی صنعت ذرا دیر میں شروع ہوئی اگرچہ بنگال آئرن کمپنی (لوہا کمپنی بنگال) 1889 میں عالم وجود میں آچکی تھی لیکن 07-1906 میں وہ صرف 40,000 مستطیل ٹکڑے بھٹی سے سالانہ تیار کررہی تھی جبکہ ہندوستان امریکہ سے 80,000 ٹن لوہا اور فولاد درآمد کررہا تھا۔ /15 اس دوران میں جے۔ این ٹاٹا جنہوں نے سوت کے کپڑے تیار کرنے میں بڑی دولت کمائی تھی ۔ لوہے کی صنعت میں دلچسپی لینے لگا۔ انہوں نے یہ پلان بنایا کہ صوبہ متوسط میں واقع وروار کے مقام پر ایک صفار خانہ تعمیر کرے۔ لیکن وہ گورنمنٹ کی منظوری حاصل کرنے میں ناکامیاب رہا۔ اس نے 1907 میں اس اسکیم کو جارج، ہمیلٹن۔ (اس وقت کے وزیر ہند) کی ہمت افزائی سے متاثر ہوکر پھر سے زندہ کرنے ارادہ کیا۔ 1911 میں فیکٹری نے کام شروع کیا اور بھٹی سے لوہے کے مستطیل ٹکڑے یعنی سلاخیں نکالنا شروع کیا۔ دو سال کے بعد ڈھلے ہوئے لوہے کے ڈلے نکلنا شروع ہوئے جنگ کے اثرات سے فیکٹری کو وسعت حاصل ہوئی اور 22-1921 میں اس کی پیداوار 2,70,000 سلاخوں اور 1,32,000 فولاد تک پہونچ گئی۔ /16 لیکن لڑائی ختم ہوتے پر قیمتیں گر گئیں۔

14- Ranade, M.G. Essays on Indian Economics, P. 118.

15- Jather, and Beri, op-cit, Vol II, P. 36.

16- Gadgil, D.R. op-cit, P. 252.

ٹیرف بورڈ (Tariff Board) (انجن محاصل درآمد و برآمد بحریہ) جو ابھی حال میں قائم ہوئی تھی اس نے تحقیقات کی اور گورنمنٹ امداد کی سفارش کی 1934، 1937 اور 1939 میں اسٹیل پروڈکشن ایکٹ (Steel Protection Act) (تحفظاتی ایکٹ) نے امتیازی تحفظات کے قوانین بنائے جن کے اثر سے 1939 میں پیداوار 8,00,000 ٹن ہو گئی۔

لوہے اور فولاد کی صنعت جو بنیادی حیثیت رکھتی ہے کی ترقی کی رفتار برابر بڑھتی ہی رہی لیکن یہ ملک کی ضروریات کے لئے کافی نہیں تھی جیسا کہ درآمد کی مقدار سے ظاہر ہوتا ہے

1914 - 18	اوسط فی سال	4,22,000	ٹن
دوران جنگ	سالانہ	6,61,000	ٹن
1929 - 30	سالانہ	9,68,000	ٹن

معدنیات

وسیع پیمانہ پر معدنیات کی صنعتوں کا حال بھی کچھ بہتر نہ تھا اگرچہ باوجود اس کے کہ جہاں تک کچے مال اور بازاروں کا تعلق ہے۔ حالات موافق تھے اور باوجود اس کے کہ ملک میں امکانی قوت بہت زیادہ تھی پھر بھی ترقی رک رک جاتی تھی۔

صنعتوں کی جانچ۔ منظم اور غیر منظم۔ دونوں کی ملوکیت پرستانہ حکومت کے گندے پہلوؤں کی مضرتوں کو نمایاں کرتی ہے۔ دستکاری کی تباہی جس کے لئے برطانوی حکومت کے قبل ہندوستان نے فنی مہارت اور ہنرمندی کے لئے شہرت حاصل کی تھی گھریلو صنعتوں کا زوال جس نے بڑھی ہوئی آبادی کا ناقابل برداشت بوجھ زراعت پر ڈال دیا تھا۔ جو کاریگر اپنے کام سے محروم کر دیئے گئے تھے اور جو منظم صنعتوں میں کھپائے نہ جا سکے تھے۔ کیونکہ اس کی رفتار رنج دہ حد تک سست تھی۔ ان بے روزگاروں کی تعداد میں اضافہ۔ آبادی میں تیزی سے جس کے لیے زیادہ مقدار میں غذا کپڑا اور مکان کی ضرورت تھی۔ کام کرنے کے مواقع کی وسعت لیکن پھر بھی جوابًا کام نہ ملنے کی مایوسیاں۔ آبادیوں کا زیادہ سے زیادہ تعداد میں برابر دیہات میں بسنے پر مجبور ہونا۔ یہ تھے آبادی پالیسیوں کے نمایاں نتائج جن پر ہندوستان کے حکمراں عمل پیرا تھے۔ اس حکمرانی کے خاتمہ نے ناقابل حل مسائل کا ایک انبار مہیا کر دیا تھا جن سے نپٹنا آزاد ہندوستان کی

تقدیر ہے۔

V صنعتیت

بیسویں صدی کے نصف میں ہندستان کی صنعت کی ترقی کا ایک عام جائزہ بڑے دلچسپ نتائج ظاہر کرتا ہے جن کا اس زمانہ کے سماجی اور سیاسی تحریکات پر اثر پڑا۔
بیسویں صدی کے پچاس سال کے اندر صنعت میں بڑے پیمانہ پر ترقی ہوئی۔ اگرچہ اتنی نہیں ہوئی جو ملک کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے ہم پلہ ہوتی ہے۔ اور اگر اس پر غور کیا جائے کہ دیہاتوں میں جس طرح بے روزگاری بڑھنے سے کام کے کتنے مزید دروازوں کے کھلنے کی ضرورت تھی تو یہ معلوم ہوگا کہ ترقی خطرناک حد تک سست تھی۔ دیہاتوں میں جو بے روزگاری پھیلی ہوئی تھی گورنمنٹ اس کی جانب سے لاپرواہ تھی اور اپنے ملوکیت پسندانہ مفاد کے لیے ہندوستان کی صنعتی ضرورتوں کو یا تو نظر انداز کر رہی تھی یا ان کا لف تھی۔ جب اس کو اپنا رویہ بدلنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ تو اس کا رد عمل یا تو سست رفتار یا ناکافی ہوتا تھا۔
لیکن ان سب باتوں کے باوجود ہندستان کی اقتصادیات کا بے حس و حرکت رہنا ناممکن تھا۔ جو نئی قوتیں ابھریں انہوں نے ہندوستان کی زراعت پر اثر ڈالا اور خود کفالت سے تجارت کی جانب قدم بڑھانے کی تحریک پیدا ہوئی۔ غیر غذائی پیداوار کی نسبت غذائی پیداوار کے مقابلہ 94-1893 میں 105/ تھی لیکن 46-1945 میں 102/ ہو گئی مثال کے طور پر روئی کی کاشت میں اضافہ ہو جانے سے روئی اوٹنے او گیہوں پیسنے کی مشین اور بعد ازاں باریک آٹے کی ملیں قائم ہوئیں۔
بیرونی سرمایہ۔ اور خاص کر برطانیہ کا جو مختلف صنعتوں میں لگا ہوا تھا اس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا ہی تھا کہ ہندوستان کے لوگوں میں ہمسری کی ریس کی خواہش کا جوش پیدا ہو رفتہ رفتہ ریلوے روڈ اور رسل و رسائل کی تبدریج توسیع نے وسطی زمانہ کے ہندوستان کے الگ تھلگ رہنے کے طریقہ کو توڑ دیا اور اندرون ملک میں ایک بڑا بازار پیدا کر دیا ان اسباب نے ہندوستان کو دھکیل کر دنیا کے بازار میں بھی پہونچا دیا اور بیرون ملک کی تجارت میں بھی ترقی ہوئی۔

بیرونی سرمایہ

اوپر بیان کیا گیا ہے کہ جسے ہندوستان کی صنعت کا نام دیا جاتا ہے وہ دراصل برطانوی صنعت تھی جو ہندوستان میں ہندوستان کے کچے مال کو لگا کر اور ہندوستان کے مزدوروں کو استعمال کر کے اپنا کام کرتی تھی اور جس کا منافع ہندوستان سے زیادہ برطانیہ کا تھا وجہ یہ تھی کہ سرمایہ جو لگایا گیا تھا وہ برطانوی تھا اور کارکردگی اور فنی مہارت بصیغہ صنعت بھی سب کی سب غالب اندازمیں برطانوی تھے۔

مشترکہ سرمایہ کی کمپنیوں (جوائنٹ اسٹاک کمپنیوں) میں جو ہندوستان میں رجسٹرڈ کی گئی تھیں ان میں جو اصل سرمایہ لگا تھا ان کا تجزیہ ظاہر کرے گا کہ[17]

(ملین روپوں میں)

اصل سرمایہ	کمپنیوں کی تعداد	سال
760	2,681	1913-14
2,230	4,781	1921-22
2,650	6,606	1929-30
2,905	22,114	1938-39
4717	21,853	1946-47

ان کا مقابلہ اگر ان کمپنیوں کی تعداد سے کیا جائے جو ہندوستان کے باہر رجسٹرڈ کی گئیں اور یہ دیکھا جائے کہ ان میں اصل سرمایہ کتنا لگا تھا تو تعداد اور سرمایہ حسب ذیل ہوگا[18]

17- Singh. V.B. op-cit. P. 223, Note.

18- Ibid. Note on previous Page.

ملین روپیوں میں

سال	کمپنیوں کی تعداد	اصل سرمایہ
1929-30	841	10,710
1938-39	870	11,401
1946-47	834	10,860

اس برطانوی حکومت کے آخری دور میں بھی ہندستان کی اقتصادیات کے امداد باہمی کے شعبہ میں برطانیہ کو ہندوستانیوں کے مقابلہ میں دوگنے خطرے کا سامنا تھا۔ یہ طے شدہ ہے کہ اس کے دو اسباب تھے۔ اول یہ کہ ہندوستانی سرمایہ لگانے میں ہچکچاتے تھے اور دوسرے صنعتی انقلابات میں بیرونی سرمایہ کا ابتدائی دور میں لگایا جانا ہمیشہ غیر معمولی طور پر زیادہ ہوتا رہا ہے۔ جہاں تک کہ اول کا سوال ہے اسی کتاب کے دوسرے ابواب میں اس پر بحث کی جائے گی۔ اور جہاں تک دوسرے کا سوال ہے۔ یہ صحیح ہے کہ صنعتی نشوونما شروع کی منزلوں میں بیرونی سرمایہ سے ہی ممکن ہوتی ہے۔ لیکن جیسے جیسے اپنے ملک کی صنعت ترقی کرتی جاتی ہے ویسے ویسے دیسی سرمایہ بیرونی سرمایہ کی جگہ لیتا جاتا ہے۔ مگر ہندستان کے معاملہ میں یہ بات پیش نہیں آئی۔

دوسری وجہ جس سے ہندوستان میں بیرونی سرمایہ غالب رہا۔ یہ ہے کہ بیرون ملک کا سرمایہ بعض میلانات کی ہمت افزائی کا کام کرتا رہتا تھا سرمایہ کا بہت سا حصہ اشیاء کی پیداوار سن کی فیکٹریوں، کوئلہ کی کانوں اور ریلوے میں لگایا گیا تھا یعنی ایسی صنعتوں میں جو کچے مال پیدا کرتی ہیں اور رسل و رسائل پر جو تجارت پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ یعنی ہندوستان سے کچے مال کی درآمد و برآمد اور برطانیہ میں تیار کیے ہوئے مال کو ہندستان میں مختلف مقامات پر پھیلاتا۔ لیکن خواہ محرکات پیدا کرنے کا سوال ہو یا ممنوعات کا دونوں صورتوں میں فائدہ برطانوی اقتصادیات کو پہونچتا تھا۔

صنعتوں کے انتظامات

صنعتوں پر برطانیہ کا مضبوط پنجہ اور بھی زیادہ طاقتور انتظامی ایجنسی (Managing Agency)

کے قیام سے ہوگیا۔ جوایک ایسے قسم کا ادارہ تھا جو صرف ہندستان تک محدود تھا۔ لیکن بد قسمتی سے برطانیہ کے کاروباری لوگوں کا مقصد جو وقت کے ساتھ اور ترقی کرتا چلا گیا تھا غالباً ،، صرف یہ تھا کہ منافع بخش روزگار کریں نہ یہ کہ مجموعی طور پر ملک کی ترقی کی رفتار کو تیز کریں۔ [19]

منتخب صنعتی کارخانوں کے انتظامات کا مرکزیت کی جانب میلان حسب ذیل اعداد و شمار سے ثابت ہوگا۔ سات برطانوی مینجنگ ایجنٹ 1911 میں 102۔ 1931 میں 133۔ 1951 میں 163 کارخانوں پر حاکمانہ اقتدار رکھتے تھے [20]

اشوک مہتا کے قول کے مطابق ، ہماری اقتصادیات کے نمایاں پہلو ، جیسا کہ وہ نشوونما پاتے رہے ہیں ، یہ تھے کہ صنعتیں صرف چند آدمیوں کے ہاتھوں میں مرکوز ہوکر رہ گئی تھیں۔ انتظامی ایجنٹوں کا ایک گروہ پانچ سو صنعتی کارخانوں کو کنٹرول کرتا تھا جن کا سرمایہ تقریباً 150 کروڑ تھا اور صنعتی کاروبار کے تمام شعبوں سے وہ تعلق رکھتے تھے " [21] ۔ کنٹرول کی مرکزیت کی اہمیت میں اس سے اور بھی اضافہ ہوجاتا تھا۔ کہ پورے ڈائریکٹر ان کی بھی تعیناتیاں ہوگئیں ، تھی تاکہ بہت سے ٹرسٹ مشترک ڈائریکٹروں کی نگرانی میں ایک دوسرے سے بندھ جائیں محض چند افراد کی ایک چھوٹی سی تعداد ۔ جن میں یورپین بھی تھے اور ہندوستانی بھی بینکوں کمپنیوں اور سرمایوں کے ٹرسٹ پر کنٹرول رکھتے تھے۔

یہ طریقہ عمل حکومت برطانیہ کے دور کے آخر تک قائم رہا البتہ یہ ہوا کہ انگریزوں کی جگہ تدریج ہندوستانیوں نے سنبھالے لی۔ پارسی ، گجراتی ، مارواڑی وغیرہ۔

صنعتی نشوونما

بیسویں صدی کے پہلے پانچ (دہائیوں) (دس سالوں) کے عہد میں ملک کو صنعتی بنانے میں ، کس حد تک آگے بڑھنے کی کارروائی ہوئی اس کا پتہ اس تعداد سے چل سکتا ہے جو صنعت میں کام پانے

---

19 - Malenbaum, W. Prospects for Indian Development, P. 155 ; Note

20 - Wadia and Merchant, op-cit. P. 642.

21 - Mehta Asoka, Who Owns India, PP 2-24.
(Jha, S.C., Studies in the Development of Capitalism in India: PP.158)

والوں کی تھی۔ واڈیا (WADIA) اور مرچینٹ (MERCHENT) نے دکھلایا ہے کہ مزدور جو صنعتوں میں کام کرتے تھے ان تعداد کل آبادی کے مقابلہ میں نسبتاً بتدریج گھٹتی ہی گئی۔ 22/

	1911	1921	1931	1941
تعداد آبادی (ملین میں)	315	319	353	389
کام کرنے والے مزدور (ملین میں)	149	146	154	170
تعداد ان لوگوں کی جو صنعتوں میں کام کرتے تھے (ملین میں)	17.5	15.7	15.3	16.3
صنعتوں میں کام کرنے والوں کی فیصد نسبت کل آبادی میں کام کرنیوالوں کے مقابلہ میں	11.0	11.0	10.0	9.6
صنعتوں میں کام کرنے والوں کی فیصد نسبت کل آبادی کے مقابلہ میں۔	5.5	4.9	4.3	4.2

ہے۔ این سنہا نے اس امر کی نشاندہی کی ہے کہ 1901 سے 1951 کے درمیان جبکہ زراعت میں کام کرنے والوں کی تعداد کل آبادی کے 37.4 فیصدی سے بڑھ کر تو 69.0 فی صد ہو گئی تھی وہ لوگ جو زراعت کے باہر کام کرتے تھے ان کی تعداد 37.6% فیصدے گھٹ کر 31.0% فیصد رہ گئی تھی۔ 23/

شہریت

دوسری دلیل صنعتیت کی سست رفتاری کی شہریت کا نشو و نما ہے اعداد و شمار ظاہر کرتے ہیں کہ 1901 سے لیکر 1941 کے چالیس سالوں میں شہر کی آبادی میں صرف 9.9% فیصدی کا اضافہ ہوا۔

---

22 - Wadia & Merchant, op-cit. P. 146.

23 - Singh. V.B. op-cit. P. 113.

حالانکہ ملک کی کل آبادی میں 28% کا اضافہ ہوا 24/ یعنی تین فیصدی سے بھی کم۔
حالانکہ کل آبادی مجموعی طور پر 294.3 ملین سے بڑھ کر 389 ملین ہو گئی تھی۔ یعنی اس
زمانہ میں 32% فیصدی کا اضافہ ہوا تھا جس شرح سے ہندوستان کی شہری آبادی میں
اضافہ ہوا ہے اس کا مقابلہ ممالک متحدہ امریکہ سے کرتے ہوئے ڈیوس (DAVIS) نے یہ
نتیجہ نکالا ہے کہ۔

"اعداد و شمار کے موازنہ کا سرسری جائزہ بھی یہ ظاہر کرتا ہے کہ ہندوستان دوسرے
ملکوں کے مقابلہ میں جو حال میں صنعتی بنے ہیں اور جن کی سطح وہی تھی جو ہندوستان کی تھی۔
شہریت کے معاملہ میں اپنی سطح سے بہت سست رفتاری سے آگے بڑھ رہا ہے۔ 25/
اگر صرف مقابلہ کی غرض سے ایک لاکھ کے اوپر کی آبادی والوں پر نگاہ ڈالی جائے
تو معلوم ہوگا کہ 1951 میں شہروں کے گنجان ہونے کی حد کو ہندوستان وہاں پہونچا،
جہاں امریکہ 1955 ہی میں پہونچ چکا تھا یعنی 6.8% فیصد۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان
میں شہرت امریکہ کے مقابلہ 1891 - 1951 کے درمیان برابر پیچھے ہی جاتی رہی۔
1891 میں ہندوستان 55 سال پیچھے تھا۔ 1931 میں 90 سال اور 1951 میں
سو سال۔ 26/

اس مقابلہ میں جس کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے ڈیوس (DAVIS) صنعتیت میں ہندوستان
کو دنیا کے ملکوں میں باونویں نمبر پر رکھتا ہے اور کہتا کہ 57 ملک زراعتی صنعت میں اس
سے آگے ہیں 51 شہریت میں 92 خواندگی میں اور 57 فی کس آمدنی میں۔

ہندوستان دیگر ممالک کے مقابلہ میں

ہندوستان اور دوسرے صنعتی ملکوں کی ترقی کا دوسرا موازنہ ہاف مین HAFF MONN

24- Anstey. V. op-cit. P. 515.

25- Kaznet Moore and Spengler op-cit, P. 272

26- Ibid. P. 271.

نے فراہم کیا ہے۔ 27/ اس نے شمار کیا ہے کہ 1770 سے تمام دنیا میں صنعتی کی چار ارتقائی منزلیں رہی ہیں۔ پہلی منزل 1770 سے 1820 تک۔ دوسری 1821 سے 1860 تک۔ تیسری 1981ء سے 1890 اور چوتھی 1891 سے شروع ہوتی ہے اور آج تک چلی جارہی ہے۔ وہ برطانیہ، امریکہ اور سوئزرلینڈ کو پہلے عہد میں رکھتا ہے۔ جب ان ملکوں میں صنعتی انقلاب شروع ہوا دوسرے عہد میں متعدد یورپین ممالک اپنے اندر صنعتی انقلاب لائے جیسے بلجیم، فرانس، جرمنی، آسٹریا، روس اور سوئیڈن۔ تیسرے عہد میں یورپ کے ملکوں میں ہالینڈ، ڈنمارک اور یونان، شمالی امریکہ میں کناڈا اور ایشیا میں جاپان انقلابی دور میں داخل ہوئے۔ محض یورپین ممالک جیسے ہنگری۔ اور افریقہ کے ملک مثل جنوبی افریقہ اور جنوبی وسطی امریکن ممالک مثل برازیل، میکسیکو، چائل اور ارجنٹائنا، بحرالکاہل کے ممالک مثل آسٹریلیا، اور نیوزی لینڈ اور ایشیا کے ممالک جیسے ہندوستان اور چین آخری عہد کے شمار میں آتے ہیں۔

صنعتی ارتقا جو ان چاروں عہدوں میں ان ممالک کے اندر ہوا اس کی نوعیت یہ تھی کہ (1) ان صنعتوں کا غلبہ رہا جو استعمال کے لئے اشیاء تیار کرتی تھیں (2) لائق استعمال اشیاء اور ان اشیاء، کا توازن جو اصل سرمایہ لگا کر تیار ہوتی ہیں اور (3) اس جانب میلان کہ اصل سرمایہ سے تیار کی جانے والی اشیاء کی صنعت بہ نسبت اس صنعت کے جو استعمال کے لئے اشیاء تیار کرتی تھیں، زیادہ تیزی کے ساتھ پھیلنے لگی۔

راسٹو (ROSTOW) نے ترقی کے تقریباً یہی منازل بیان کئے ہیں /28 ان ہی کے سانچے کے مطابق جن ملکوں نے صنعت کی دوڑ میں حصہ لیا ان میں ہندوستان چوتھے عہد میں شمار کیا گیا ہے۔ لیکن پھر بھی بہت سے وہ ممالک جنہوں نے اپنے ملکوں میں صنعتیں اسی عہد میں شروع کی تھی جس میں ہندوستان نے شروع کی تھی وہ پہلے عہد سے نکل کر اس دوسرے عہد میں پہونچ گئے جو 1950 میں ختم ہوتا تھا۔ صرف ہندوستان، چین اور میکسیکو پہلی ہی منزل میں رہ گئے۔ آسٹریلیا اور جنوبی افریقہ تو واقعۃً تیسری منزل میں کود کر نکل گئے۔ ہندوستان میں جو بھی ترقی ہوئی ہو۔ جو نسبت استعمال ہونے والی اشیاء کی پیداوار کی راس المال سے

---

27. Hoffmann, W.C. op. cit Chapter III, The Historical Phases of Early Industrialization. PP. 42-66.

28. Rostow W.W. The Stages of Economic Growth Chapter 2.

پیدا کردہ اشیا سے تھی اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ۔ 1891ء میں صنعتی ترقی کا یہ عالم تھا کہ استعمال والی اشیا اور راس المال سے تیار شدہ اشیا کے پیدا وار کی نسبت 54.0 اور 6.2 فیصد تھی 1947-48 تک یہ نسبت بدل کر 57.4 اور 16.0 ہو گئی ۔ جبکہ مجموعی تعداد تمام لوگوں کی جو صنعت میں کام کرتے تھے 100 کے برابر تھی ۔ بڑے پیمانہ پر مال تیار کرنے والی صنعتوں کی مجموعی پیداوار 1925ء میں 43.6 تو ان صنعتوں کی تھی جو استعمال کے لئے مال تیار کرتی ہیں اور راس المال صنعتوں کی 11.6 یعنی مقدم الذکر کی پیداوار ۔ موخرالذکر کی 4.2 گنا تھی /29 نیشنل انکم کمیکس کی پہلی رپورٹ (1951ء) کے مطابق چھوٹی اور بڑی ۔ صنعتوں کی پیداوار کے حصہ کی نسبت 51٪ فیصد تھی یعنی تقریباً 50 ملین روپیہ کی پیداوار تو چھوٹی صنعتوں کے بارے میں بتلائی جاتی تھی (جو زیادہ تر گھریلو تھیں) جبکہ بڑی صنعتوں، کے لئے صرف 11 ملین روپیہ بتلا گیا ہے (یعنی فیکٹریاں، ریلوے کاشت وغیرہ ۔ /30

ترقی کی رفتار میں سستی کے اسباب

مورخین اقتصادیات نے ہندوستان کی صنعتی پسماندگی اور سست ہی نہیں بلکہ بالکل بیکار تحریک جو صنعتیت کے لئے چلائی گئی ان سب کے اسباب دریافت کرنے کی کوشش کی ہے ۔

قدرتی وسائل

یہ تو بالکل ظاہر ہے کہ ہندوستان میں قدرتی وسائل کی کمی نہیں تھی اور ان کا پتہ لگانا بھی مشکل نہ تھا بشرطیکہ ایسا کرنے کی خواہش ہوتی ۔ بنیادی سامان کوئلہ، لوہا دوسرے معدنیات کی کمی تو تھی ہی نہیں ۔ پانی کی میکانکی طاقت پیدا کرنے کی قوت زیادہ تھی ۔

---

29 - Hoffmann, W.G. op-cit, P.68.

30 - Thorner, D Long-term trends in output in India in Kuznets Moore and Spengler. op-cit. P ...

ماہر فن مزدور

جولاہوں کے فن اور لوہے کے سامان تیار کرنے میں زمانہ ماضی کے اندر ہندوستان کے ماہر فن مزدوروں نے عالمی شہرت حاصل کی تھی۔ لیکن روایتی ہنرمندیوں کو زوال پذیر ہو جانے دیا گیا۔ اور کاریگروں کو فیکٹریوں کی صنعتوں میں استعمال نہیں کیا گیا۔ نئی تعلیم کے احاطہ سے یہ بات باہر رہتی تھی اور نہ عارضی مشق Apprenticeship ہی کے دائرے سے یہ بات باہر رہتی کہ جتنے آدمیوں کی ضرورت ہوتی ان کو ٹرین کر دیا جاتا۔ لیکن فنی تعلیم کو قطعی، نظرانداز کیا گیا۔

سرمایہ

جہاں تک کہ صنعت کے لئے سرمایہ کا سوال تھا اس کے بارے میں کچھ لوگوں نے یہ رائے قائم کی ہے کہ ہندوستان کے دولت مند لوگوں کا ذہن منافع کمانے کی جانب نامکمل میلان رکھتا تھا۔ یا یوں کہا جائے کہ تجارت میں مہم بازانہ ہمت خطرات مول لینے کی نہیں تھی۔ اور بہرحال بڑی بڑی صنعتوں میں لگانے کے لیے سرمایہ موجود نہیں تھا۔

دیسی سرمایہ کے مالکان کی ہچکچاہٹ

جہاں تک سرمایہ کے دستیاب ہونے کا سوال ہے یہ ظاہر ہے کہ اس کے دو ذرائع تھے ایک دیسی اور دوسرے بدیسی۔ جہاں تک دیسی سرمایہ کا سوال ہے۔ سرمایہ لگانے والوں میں زیادہ سے زیادہ رقم مہاجنوں اور زمینداروں کی تھی۔ یہ روپیہ زمین، تجارت اور بینک کے نظام سے جو منافع ہوتا تھا اس کا بچا ہوا حصہ تھا لیکن جو بھی رقم بچ جاتی تھی اسے زیادہ تر زمینداری کی جائداد گاؤں میں اور جائداد غیر منقولہ شہروں میں خریدنے۔ قیمتی معدنی اشیاء اور زیورات کی ذخیرہ اندوزی پر جو ایک نہایت محفوظ سرمایہ لگانے کا طریقہ تھا۔ خاص کر اس، حالت میں جب ناموافق صورت نمودار ہو اور قرض دینے کی کارروائیوں میں جس سے بہت زیادہ سود ملتا تھا۔ یعنی 16% فیصدی سے 30% فیصدی تک بلکہ اس سے بھی زیادہ ان سب پر صرف ہوتا تھا۔

یہ سرمایہ صنعتوں میں لگائے گئے سرمایوں کے خطرات اور بے یقینیوں سے جو گورنمنٹ کی پالیسیوں سے پیدا ہوتے سے محفوظ رہتے تھے۔ لیکن بہرحال جب انیسویں صدی کے وسط میں وسیع پیمانہ پر نئی صنعتیں قائم ہونی شروع ہوئیں تو ان سب کا سرمایہ ہندوستان کے ہمت وروں ان کے خاندان والوں اور زرتوں نے فراہم کیا تھا۔ یہ سرمایہ تجارت سے حاصل کیا گیا تھا۔ بیرون ملک اور دیسی۔ اور ان تاجروں نے حاصل کیا تھا۔ جو ایسے طبقوں سے تعلق رکھتے تھے جن کا دیہی آبائی پیشہ روایتی انداز میں چلا آرہا تھا۔ ان کے بارے میں ڈی آر گیڈ گل لکھتا ہے کہ۔

۔تجارت کرنے والی اور مالیت سے تعلق رکھنے والی ذاتوں کے پاس وسائل بھی تھے اور اس فن تجارت سے ان کو اتنی واقفیت بھی تھی کہ جدید کاروبار نے جو میدان کھولا تھا اس میں وہ کودنے کی ہمت کریں۔ ان ذاتوں کی ایک مختصر تعداد نے اس لئے خاص طور پر ان لوگوں کو سپلائی کیا جو میدان پر قابض تھے اور اب تک سپلائی کر رہے ہیں اور صرف ان لوگوں کو نہیں جو تجارت اور مالیت کا کاروبار کرتے تھے بلکہ ان کو بھی جو ماڈرن مال تیار کرنے والی فیکٹریوں کی صنعت میں خطرات مول لینے کی ہمت کرنے کا کام کرتے تھے۔ /31

ان طبقوں میں سب سے زیادہ ممتاز تو پارسی تھے اور ان کے بعد گجراتی اور مابعد مارواڑی جو مرہ بھی اسی طبقہ سے تعلق رکھتے تھے ان کو جو کامیابیاں ہوئیں ان سے متاثر ہو کر راجاؤں دولتمند پیشہ وروں اور زمیندار تک نے صنعتوں کی ترقی میں حصہ لینا شروع کیا۔

جنوبی ہند میں چٹی (Chettiar) جو قرض پر روپیہ دینے والا ایک مہاجن فرقہ ہے اور نائیڈو (Naidus) جو سوت کی تجارت کرتے تھے اور کاروبار چلانے میں مصروف رہتے تھے پارچہ بافی کی صنعت میں داخل ہوئے۔ بنگال کے اندر شروع زمانہ میں زمینداروں نے کاشت اور کوئلہ کی کانوں کی صنعتوں میں حصہ لینے کی کوشش کی لیکن ان کے بہت سے افراد اور گروہ برطانیہ تاجروں سے تعلق رکھتے تھے اور بہت سے حالات میں وہ انہی کی رضا درغبت پر انحصار کرتے تھے۔

سرمایہ کا دوسرا طریقہ ماڈرن بینک تھا لیکن اس پر عرصہ دراز تک بیرون ہند لوگوں کا تسلط

31- Gadgil . D. R. op.cit

رہا۔ اس میدان کے ہراول دستے کلکتہ اور بمبئی کے ایجنسی کے ادارے تھے لیکن ان کو بینک سے زیادہ تجارت سے دلچسپی تھی۔ پریسیڈنسی کے بنکوں کو برطانوی سرمایہ داروں نے گورنمنٹ کی حمایت اور زیر سرپرستی قائم کیا۔ ہندوستان کے مشترکہ سرمایہ کے بینک انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں قائم کیے گئے۔ لیکن ان کی تعداد کم اور ان کی رفتار ترقی سست تھی ان کا کاروبار کم مدتی قرضے دینے تک محدود تھا۔ جو مستقل یا اتنا سرمایہ مہیا نہیں کر سکتا تھا جس سے صنعت کا کاروبار چلایا جا سکے اس طرح 1900 سے قبل بینک کا کاروبار کم بیش جمود کی کیفیت میں تھا۔

علاوہ دیسی سرمایہ کے تمام ممالک جو صنعتی بننے کے مراحل سے گذرتے ہیں شروع زمانہ میں باہر کے سرمایہ پر انحصار کرتے ہیں۔ بات مین "کہتا ہے کہ" ترقی یافتہ بیرونی ممالک نے عام طور پر ایک زرعی ملک جو جدید صنعتی اقتصادیات کے میدان میں قدم رکھتا ہے، سرمایہ فنی علوم، اور سب سے زیادہ مشینری سے ان کی امداد کی ہے۔ یہ بات کناڈا، جنوبی امریکہ کی عوامی حکومتوں، ہندوستان اور کسی حد تک یورپین ممالک میں بھی پیش آئی ہیں /32 ہندوستان میں کم سے کم دو ایجنسیاں تھیں جو سرمایہ فراہم کر سکتی تھیں۔ تبادلہ والے بینک اور وہ بیرونی سرمایہ دار جو ہندوستان میں صنعتیں قائم کرنے اور ان کا کاروبار ایجنسیوں کے ذریعہ کرنے میں دلچسپی رکھتے تھے۔

تبادلہ والے بینک بہر حال بیرونی تجارت سے تعلق رکھتے تھے اور صنعتی مالیات سے ان کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ان کا کاروبار صرف باہم دگر تبادلے۔ سونے چاندی کی سلاخوں کو متحرک کرنے اور مقامی محصول اور ادائیگی کے درمیان کی ضروریات کے لیے قرضہ دینے تک محدود تھا۔

مینیجنگ ایجنسیاں انیسویں صدی میں بنیں۔ ایجنٹ ایک فرد بھی تھا، فرم بھی اور کمپنی بھی۔ جس کا کام یہ تھا کہ وہ نئے کارخانوں کو کھولے اور جوائنٹ اسٹاک کمپنیوں (مشترک سرمایہ کی کمپنیوں) کو ترقی دے ایجنٹ صاحبان یا تو خود اپنا سرمایہ لگاتے یا ضامن دار بن کر سرمایہ اکٹھا کرتے تھے۔ وہ کاروبار کے منیجر بھی ہوتے تھے اور کچا مال اور ذخیرہ اور مشینری کی سپلائی بھی کرتے تھے۔ پیداوار کو بازار میں بیچنے کا کام وغیرہ بھی ان کے سپرد تھا۔ مینیجنگ ایجنسی کا کام برطانیہ

---

32. Hoffmann, W. G. op. cit. P. 29

کی کمپنیوں نے شروع کیا تھا جس کا ہیڈ کوارٹر لندن میں رکھا تھا۔ اس کے بعد جو کمپنیاں کہ ہندوستان میں قائم تھیں وہ بھی اس میں شریک ہو گئیں۔ انیسویں صدی میں یورپ کے لوگوں کا اس نظام پر پورا غلبہ تھا۔ جو مستقل اور روزمرہ کے خرچ کے لیے سرمایہ درکار تھا۔ ان کمپنیوں میں سے بیرون ملک کے لیے کشش پیدا ہوئی۔ لیکن ان کی کوشش زیادہ تر ایسی صنعتوں تک محدود رہی جیسے کہ سن، کوئلہ، چائے اور قہوہ۔ یہ اس کی بھی ذمہ دار تھیں کہ کاروبار میں اجماع اور مرکزیت کے میلانات پیدا ہوں۔ یہ لوگ جو ذرائع اپنے منافع کو بڑھانے کے لیے استعمال کرتے تھے وہ ہمیشہ کھلے خزانے نہیں ہوتے تھے۔ لیکن اگرچہ وہ منافع بخش کاروبار قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے لیکن صنعتیت کو آگے بڑھانے میں مجموعی طور پر آلہ کار نہ بن سکے۔

مختصر یہ کہ اگر سرمایہ کی کمی تھی یا وہاں صنعتوں کے فروغ میں لگا ہوا تھا جو شاہانہ عادات کے لیے کارآمد تھے تو ہندوستان کو قصوروار نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ان میں خطرات مول لینے والے ہمت ور تاجروں کی کمی تھی۔ اور نہ تو یہی الزام لگایا جا سکتا ہے کہ جس قدر سرمایہ لگانے کی ضرورت تھی وہ موجود نہیں تھا۔ بلکہ قصور برطانیہ کی مبنی بر سیاست اقتصادی نظام کا تھا۔ میلن بام (Malenbaum) کے الفاظ میں "نوآبادیاتی نظام مغلوب ملکوں میں آگے بڑھنے کی تحریکات کا معاون نہیں ہوتا"۔ 33/

VI بیسویں صدی کے واقعات کی رفتار

بیسویں صدی کے آغاز سے نئی قوتیں دنیا اور ہندوستان میں عمل پیرا ہونے لگیں برطانیہ نے جو اقتصادی نظام بہ اختیار حکمرانی بنا لیا تھا۔ لوگ اس کے مقابلہ میں اتر آئے تھے اس کے بعد دو عالمگیر جنگوں اور دوران جنگ کی پست حالی نے برطانیہ کی اقتصادیات اور اس کے شاہانہ اعزاز کے دعووں پر ضرب لگائی۔ ہندوستان میں سودیشی کی تحریک نے اقتصادیات کے لیے قوت تو فراہم کی اور خود اعتمادی کو بیدار کیا۔ برطانیہ جن مصیبتوں میں مبتلا ہوا اور جس طرح اس کی ترقی رکی۔ ان سے ہندوستان کو موقع ملا۔ اور ہندوستان کی اقتصادیات کو فائدہ پہونچا جو عالمگیر سرد بازاری 1929 سے شروع ہوئی اور ابتدائی ضروریات کی پیداوار

---

33. Malenbaum, W op-cit. P. 162.

کی قیمتوں میں بہت زیادہ اتار چڑھاؤ آگیا اور جس سے کاشت کاروں پر ہولناک مصیبت نازل ہوئی ان سب نے مل کر سرمایہ داروں اور صنعت کے مالکوں کے منافع کو غیر معمولی طور پر بڑھاوا دیا گورنمنٹ کی پالیسی میں بھی تبدیلی آئی اور آزاد تجارت کو بھی روکنا پڑا اور تحفظات کی کاروائیوں پر عمل پیرا ہونا پڑا ۔ برطانیہ کا جو تسلط ہندوستان کی اقتصادیات پر چلا آرہا تھا پیچھے ہٹنے لگا۔ ہندوستان کا متوسط طبقہ ۔ برطانوی متوسط طبقہ کے تجارتی دولت کے میدان میں داخل ہونے لگا روزمرہ کے استعمال کے اشیاء کی صنعت تیزی کے ساتھ نشو ونما پانے لگی۔ اونچے طبقہ کی سرمایہ دارانہ مہم بازی اور صنعتوں میں تنوع عالم وجود میں آئے ۔ ٹاٹا، برلا ، ڈالمیا اور پرشوتم داس ٹھاکر داس کی طرح کے لوگ انڈریو یولس (Andrew Yules) برڈس (Brids) مارٹن برنس (Martin Burnes) آکٹیوین اسٹیلس (Octavian Steel) جیلنڈرر (Gillander) اور آربتھ ناٹ (Arbuthnots) شاو ولیس (Shaw Wellaces) اور ان قسم کے لوگوں سے شانہ ملاکر چل رہے تھے

ہندوستان کے سرمایہ کا نمونہ

ہندوستان کا سرمایہ صنعت میں لگنے لگا ہے۔ این ٹاٹا نے مقامی طور پر اتنا سرمایہ اکٹھا کرلیا کہ 1912 میں جمشید پور میں لوہے اور فولاد کا کارخانہ قائم کیا۔ تین ہفتہ کے اندر 16,30,000 پونڈ جمع کیا جس کا ایک ایک بیشتر راجہ یعنی گوالیار سے کے ہندستانیوں نے دیا۔ کام چلانے کے لیے جس سرمایہ کی ضرورت تھی وہ کل 000 ,000 ,4 پونڈ ہندستانی مہاراجہ سندھیا نے دیا-34

جوائنٹ اسٹاک بینکوں (مشترکہ سرمایہ کے بینک) کی ترقی کا اندازہ ان کی تعداد میں اور ان کے دفتروں کے مختلف مقامات پر قائم ہو جانے سے اور جو روپیہ ان میں جمع کیا گیا ان کی زیادتی سے ہوگا۔ 1916 اور 1936 کے درمیان ان کی شاخوں کی مجموعی تعداد پہلے سے چوگنی ہو گئی اور 1937 اور 1945 کے درمیان پھر اس کی دو نی ہوگئی۔ تمام بینکوں میں جو رقومات جمع ہوئیں وہ 1900 میں 34/ کروڑ سے بڑھکر،

---

34 - Wacha, D.E. The Life & Work of J.N. Tata, P. 202. (Jha S.C.) op-cit. P 176

1947 میں 1118 کروڑ ہو گئیں۔

1912 اور 1948 کے درمیان عام کاروبار میں ملک کے اندر ہندوستان کا حصہ بڑھا اور برطانیہ کا گھٹا۔ صرف بمبئی مل برطانیہ کو وہ سرمایہ جو ادا کیا گیا اور جو اصل سرمایہ لگا ہوا تھا وہ 30.8 اور 4300 سے گھٹ کر 809 اور 36 رہ گیا جبکہ علاوہ ہندوستان کا سرمایہ جو بطور تجزیہ لگایا گیا تھا اس اداشدہ سرمایہ 69.2 سے اور اس کا راس المال سرمایہ تو 57.7 فی صدی بڑھ کر 91.1 اور 96.4 بالترتیب ہو گیا۔[35]

"آج اس بات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جو کل ماڈرن کاروبار ہندوستان میں ہے اس کے 95 فیصدی پر ہندوستانی مفاد کا تسلط ہے۔"[36]

صنعتی انجماد کے متعلق بعض مغرب کے لوگوں کی رائیوں پر بحث

چند مغربی مصنفین نے مذہب، سماجی نظام۔ یعنی فرقہ اور ذات کی بنیاد پر گروہ بندی اور مشترکہ خاندان کو صنعتیت کی رفتاری اور اقتصادیات کے عام انجماد کے لیے مورد الزام ٹھہرایا ہے۔ ویری اینسٹے (Vera Anstey) نے اس خیال کی تردید کی تھی کہ تیز رفتار سے ترقی "سماج کے نظام کی بنیادوں کو از سرِ نو ترتیب دیئے بغیر، ممکن ہی نہیں ہے۔ جو سماجی رکاوٹیں ہیں ان میں وہ ان کو شمار کرتی ہے (1) آبادی کے بڑھنے میں رکاوٹ ڈالنے کا فقدان (2) اقتصادی نقطہ نظر کی عدم موجودگی (3) کامل طور پر پیداوار پر توجہ کرنے، مزدوروں کو متحرک بنانے اور ان میں کام کرنے کی اہلیت پیدا کرنے اور اقتصادی امور اور اشیاء کی خریداری پر روپیہ خرچ کرنے میں مذہب اور ذاتیں رکاوٹ ڈالتی ہیں۔

ان کے مطابق مذہبی میلان جو ہندوستان کے اندر زندگی کے ہر شعبہ میں سرایت کیے ہوئے ہے وہ مالیات کی جانب رجوع ہونے کے جذبہ کو بالکل کاٹ دیتا ہے اور مادی اور سماجی ترقی کا سخت دشمن ہے وہ اپنی رائے ظاہر کرتی ہے کہ "ہندوازم اور محمڈن ازم دونوں نے زمانہ ماضی میں اقتصادی ترقی کو سختی سے محدود کر دیا تھا۔

35- Mukerjee, W. op. cit., P. 155.

36- Ibid., P. 156.

اور آمدنی کی ترقی کی طاقتوں کو بنیادی طور پر متاثر کرتے ہیں۔ 37/ مزید لکھتی ہے کہ مخالفت جو سماج میں نظام طبقات کو رائج کرتی ہے وہ مادی ترقی کے پیر میں نہ ہٹنے کے قابل زنجیر بنی رہی ہے۔ اور یہی اس کی ذمہ داری ہے کہ ہندوستان ان فنی مہارت سے لائی ہوئی تبدیلیوں کو جو مغرب میں رائج ہوئیں اختیار نہ کرسکا۔ اور پیداوار کے طریقوں کو جدید طرز کا نہ بنا سکا۔ یا نئے طریقوں کا تجزیہ نہ کرسکا۔ اور مختلف ذاتوں کے آدمیوں کو امداد باہمی میں رکاوٹ ڈالنے سے منع نہ کرسکا۔ اور جس سرمایہ کا لگانا ضروری ہے اس میں اسراف بیجا کو نہ روک سکا۔ مذہب غذا کی سپلائی کے ذرائع کو حرام قرار دیتا ہے اور ان جانوروں اور عذاب جان ابوہ کو مارنے سے روکتا ہے جو بے حساب نقصان پہونچاتے ہیں۔ مذہبی مراسم اور ان کے مروجہ ضابطے سے اسراف وجود میں آتا ہے۔

مشترکہ خاندان کا نظام انفرادی حوصلوں کے آزتجسّس کے کناروں کو کند کردیتا ہے اور محنت کرنے کے جوش کو کمزور کرتا ہے۔ یہ قدامت پرستی کی طاقتوں کو فروغ دیتا ہے اور آدمی کو اس قابل نہیں رکھتا ہے کہ خود اپنے منصوبہ کو عمل کا جامہ پہنانے کے لیے پیش قدمی کرنے اور سماجی اور اقتصادی تبدیلیوں میں رکاوٹ ڈالتا ہے۔

المختصر یہ مراسم اور ادارے آبادی کو حد سے زیادہ بڑھانے، مفلسی لانے، اقتصادی مہم بازیاں روکنے اور دماغی اور جسمانی ترقیات کا ایک حقیر معیار قائم کرنے کا رجحان پیدا کرتے ہیں۔ 38/

مغربی آرا کی تردید

جب سے برطانیہ کا راج قائم ہوا نیم پچانیاں یورپ کے ان سرکاری اور غیر سرکاری لوگوں کا، تجارتی وغیرہ رہی ہیں۔ جو زبردستی کھوج کھوج کر اس راج کے قیام کو مبنی برحق و انصاف ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ چند سخت درست لکھنے والے طنز نگاروں کے بیانات اور خاص کر عیسائی مشنریوں کے۔ تاریخ کی جلدوں میں درج کیے جاچکے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مقاصد دو تھے اول یہ کہ اپنی رعایا کے دلوں میں احساس کمتری کو بڑھائیں اور ان میں یہ خیال پیدا کریں کہ وہ سلف گورنمنٹ

37- Anstey. V. op. cit. P. 47.
38- Ibid. P. 59.

کے لیے بالکل نااہل ہیں۔ اور دوسری بات یہ تھی کہ ان کو اپنے ضمیر کی ملامت کی آواز کو دبانے کی اور ملوکیت پرستانہ منافع خوری کی منافقت پر نقاب ڈالنے کی ضرورت تھی یہی وہ کوششیں تھیں جن سے برطانیہ کو "(Perfide Albion) زیب دہندہ لباس تقوی ملبوس کا لقب دیا گیا۔ دوسرے لوگوں اور قوموں نے بھی برطانیہ سے بدتر برتاؤ کیے ہیں لیکن وہ برطانیہ کی طرح اپنے افعال کو جو ان کی منافع خوری تک محدود تھا حسن سیرت کا ایک نمونہ ثابت کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہوئے"۔ 39

یہ رائے کہ ہندو مذہب دنیا کو چند روزہ خیال کرتا ہے اور خواہشات سے دست کش ہونے اور لذات دنیوی کے ترک کا حکم دیتا ہے اور اپنے تمام پیروں پر رہبانیت کو لازم قرار دیتا ہے۔ مبالغہ آمیز ہے۔ یہ بات ہندو مذہب اور ہندو سماج جیسا کہ وہ کتابوں میں درج ہے اور جیسا کہ وہ عمل کے اندر ہے دونوں کے بارے میں غلط فہمی پر مبنی ہے۔

جہاں تک کہ ہندوؤں کی مذہبی کتابوں کا تعلق ہے ان میں صاف یہ قرار دیا گیا ہے کہ تین اونچے طبقوں کی زندگی کو چار حصوں میں منقسم ہونا چاہئے۔ پہلا زمانہ تعلیم، تربیت اور کار آموزی کا ہے دوسرا گھریلو فرائض اور اپنے ذات کے پیشہ کے ذریعہ روزی کمانے کا۔ تیسرا گوشہ نشینی گیان دھیان اور روحانی ریاضتوں کا۔ اور چوتھا ذاتی مفاد سے بالکل الگ تھلگ ہو جانے اور سماج کے فلاح کا کام کرنے کا۔

عمل میں تو کم ہی لوگ اس طریقہ زندگی پر کاربند ہوتے تھے لیکن ذات کے نظام کے جو قواعد مرتب ہوئے تھے ان کی رو سے ہندو سوسائٹی کو چند گروہوں میں بانٹ دیا گیا تھا۔ اور ہر ایک کے ذمہ اس کا آبائی پیشہ تھا اور ہر ایک کے اقتصادی فرائض کا عمل بتلایا گیا تھا۔ فن، کاریگری، تجارت یا پیشہ۔ اس لیے یہ قرار دینا کہ ذات دنیوی مال کے حصول کی کارروائیوں کو روکتا تھا سچائی کا مذاق اڑاتا ہے۔ اس کے برخلاف منافع بخش روزگاروں کو اختیار کرنا ضروری قرار دیتا تھا بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ہر ہندو کا یہ فرض قرار دیا گیا تھا کہ وہ اپنے ذات کے عائد کردہ کاموں کو انجام دے۔

کوئی چیز ان روزگار کرنے والوں کو جو بنک کا کاروبار کرتے تھے اس بات سے نہیں روکتی تھی کہ وہ دولت جمع کریں اور تجارتی مہم بازیوں کو وسیع پیمانہ پر منظم کریں۔ تاریخ بے شمار شہادتیں اس بات

39- Nehru, Jawaharlal, An Autobiography (New Edition, Reprinted 1953) P. 376.

کی مہیا کرتی ہے کہ کروڑہی ہیمتوں نے جنگ کے لیے رقوم دیں۔ اور ایسی بنڈیاں جاری کیں جو ہندوستان کے ہر حصہ میں جائز مانی گئیں۔ علاوہ ازیں یہ بھی اچھی طرح معلوم ہے کہ ذات کے قواعد و ضوابط جو پیشہ سے متعلق تھے انھیں عمل میں کثیر تعداد میں نظر انداز کیا گیا اور اس کے لیے سماج نے کسی ناپسندیدگی کا اظہار نہیں کیا۔ مثال کے طور پر برہمنوں کو لیجئے جن کی تعداد کل ہندو آبادی کی ۶٪ یا ۷٪ فیصد تھی منو کے قانون کے مطابق ان کی ذات کا پیشہ تعلیم دینا، پڑھنا اور پروہت کا مذہبی کام کرنا تھا۔ مشکل سے ۱۳٪ فیصدی ایسے تھے جو ان پیشوں میں لگے ہوئے تھے۔ برہمن لوگ ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوجوں میں کثرت سے سپاہی کی حیثیت سے بھرتی تھے اور کاشت کاری کا پیشہ کرنے کے علاوہ باورچی، بہیرا، وغیرہ بھی۔ یہی بات دوسری ذاتوں کے بارے میں بھی صحیح ہے۔ 1931 کی مردم شماری کے اعداد کے مطابق صرف ۴۵٪ فیصدی آبائی پیشہ کر رہے تھے ڈیوس (Davis) کے قول کے مطابق ہندوؤں میں صرف تین طبقے ہیں جن میں سے آدھے سے زیادہ اپنا آبائی پیشہ کرتے ہیں۔ یعنی وہ لوگ جو زراعت میں ہیں ۹۱٪ فیصدی۔ تجارت اور صنعت میں ۵۲٪ سے ۷۵٪ فیصدی تک۔

اس جانب بھی مضبوطی سے اشارہ کیا جا سکتا ہے کہ عیسائی مذہب جیسا کہ عیسیٰ مسیح نے تعلیم دی تھی اور جس کی ایسی ہی شرح رومن کیتھالک اہل کلیسا نے رومن سلطنت کے شاندار عروج کے زمانہ میں کی تھی وہ بھی مغرب کی عیسائی قوموں کو اس سے نہ روک سکی کہ انھوں نے مذہب مسیحیت کے ترک دنیا، انکساری، فقر و فاقہ اور سود اور عیش طلبی اور دولت جمع کرنے اور دنیوی فوائد اور طاقت کے حصول کے لیے کام کرنے کو گناہ قرار دینے کے احکام کی خلاف ورزی نہ کی ہو۔

جہاں تک سماجی برائیوں کا سوال ہے۔ کچھ اونچی ذاتوں میں پائی جاتی تھیں جیسے کہ عقد بیوگاں کی ممانعت اور نوزائیدہ بچوں کا قتل۔ لیکن بڑے توہمات زیادہ تر نیچے طبقوں میں رائج تھے۔ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ ۱857ء کی بغاوت کے بعد گورنمنٹ اس درجہ خوف زدہ ہو گئی تھی کہ وہ ان کو دور کرنے کی جانب قدم اٹھانا تو درکنار۔ شائستگی کا یہ تقاضا سمجھتی تھی کہ ان سے کوئی تعرض نہ کریں۔ اور اس کے لیے مذہب کے معاملات میں غیر جانبداری کے اصول کے پیچھے پناہ لیتی تھی۔ اور اس طرح جو مراسم کہ مذموم یا لغو تھے ان کے قائم رکھنے میں معاون ہوتی تھی۔ ایسی قوم کی حکومت جو سماجی فلاح کے راستے کی رکاوٹوں کو دور کرنے سے انکار کرے اپنی رعایا کی اقتصادی ترقی میں جو امور مانع ہیں ان کو دور نہ کرے۔ وہ گو بالاعلان یہ مشتہر کرتی ہے کہ وہ ایک بیرونی حکومت ہے اور اس کا تعلق عوام کے جسم سے ایک علیحدہ عضو کا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ گورنمنٹ کا رویہ اس سے متاثر تھا۔

کہ ایسے حلیف تلاش کرے جو اس اقتدار کے نیچے کو اور زیادہ مضبوط کریں اور اس لیے قدرتاً وہ حد سے زیادہ قدامت پسند اور رجعت پسند لوگوں سے ہمدردی رکھتی تھی اس لیے یہ ان لوگوں کو اپنی قدامت پرستانہ غیر جانبداری کی پالیسی سے ان کو خوش کرنے کا منصوبہ بناتی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ اقتصادی جمود کے ذمہ دار اصل مجرموں کو بچانے کے لیے سماجی برائیوں کو قربانی کے بکرے کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ آخر 1947ء کے بعد کیا ہوا۔ ہندوازم اور اسلام اس ملک سے غائب نہیں ہوئے اور نہ تو اپنا کردار ہی بدلا اور دہی فرقہ وارانہ اور ذات پات کی علیحدگی پسندی ہی ختم ہوئی۔ اور نہ تو مشترکہ خاندان کی خامیوں میں کوئی انتہا پسندانہ ترمیم ہوئی ہے۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود سماجی اور اقتصادی نظام میں قوت عمل رکھنے کے میلانات پیدا ہو رہے ہیں اس سے کافی ثبوت اس بات کا ملتا ہے کہ جو اوپر دلیل دی گئی ہے وہ لایعنی ہے۔ الگزنڈر گرشنکرن (Alexander Gerschenkron) اپنا یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ تجارتی مرکز قائم کرنے والوں کے خلاف سماجی رویہ صنعتیت کی رفتار پر اثر انداز نہیں ہوتا ہے جب تک وہ حکومت کے رابطہ عامہ کی شکل میں ڈھال نہ لیں 40۔ میل باوم (Malenbaum) جنہوں نے اپنی کتاب میں سماجی اور ثقافتی امور اور صنعت کے باہمی تعلقات پر بحث کی ہے وہ یہ رائے ظاہر کرتے ہیں کہ۔

زیادہ اہم بات قابل ذکر یہ ہے کہ نسبتاً ایک قلیل عرصہ میں باوجود ان ثقافتی اور مذہبی معاملات کے اور باوجود ہندوستان کے طبقات نظام میں کاروبار اور تجارتی گروہ کی پست حیثیت کے جو ہندوستانی سوسائٹی کی ساخت میں اور روایتی طور پر چلی آ رہی ہے ایسے افراد اور گروہ ابھرے ہیں جو ماڈرن اقتصادی مہم بازیوں میں ہم آہنگ ہیں 41۔

دوسرے مصنفین پر بحث

کنگس لے ڈیوس (Kingsley Davis) نے اس مجرم کی تلاش میں جس نے ہندوستان کی اقتصادیات کو پست کر دیا آبادی کے اضافہ کو سب سے زبردست عنصر قرار دیا ہے اور دوم درجہ پر جزوی طور پر ایک فرسودہ سماجی نظام کو اہم بتلایا ہے۔

40- Gerschenkron, A Social attitudes Entrepreneurship and, Economic Development Quo in Bhatt. V.V. Aspects of Economic Change and policy in India, 1860-1960 P. 36

41- Malenbaum. W op. cit. P. 156

۱۹۵۲ء تک اول تو کوئی حقیقت ہی نہیں رکھتا تھا پھر بھی صنعتیت کے جو مواقع انیسویں صدی میں بکثرت ظہور پذیر ہوئے ان سے فائدہ نہیں اٹھایا گیا۔ یہ دلیل کہ آبادی میں اضافہ صنعتیت کی رفتار اور طور میں ضروری رکاوٹ ڈالتا ہے۔ قابل یقین نہیں معلوم ہوتا۔ کوئی بھی اضافہ جو آبادی میں ہوتا ہے اس سے فوراً کام کرنے والوں کی تعداد کی قوت میں اضافہ ہوتا ہے اور چیزوں کی مانگ بھی بڑھ جاتی ہے۔ ان دونوں کو مل کر موافق حالات کی موجودگی میں پیداوار کے بڑھانے کے میلان کو ترقی دینا چاہیئے۔ اگرچہ مخالف حالات میں جبکہ آبادی کے اضافہ کی شرح اقتصادی ترقی کی شرح سے زیادہ ہوتی ہے تو یہ زیادتی بے روزگاری کو بڑھا دے گی اور آبادی کا اضافہ قومی پیداوار میں افراد کے حصہ کو کم کر دے گا۔ اس لیے ہندوستان کی سست رفتار اور کمزور صنعتیت کی وجہ صرف آبادی کے اضافہ کو قرار نہیں دیا جاسکتا۔ بلکہ وجہ یہ ہے کہ انسانوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ کی جو طاقت پیدا ہوئی اس کا صحیح استعمال نہیں کیا جاسکا۔ ڈیوس یہ تسلیم کرتا ہے کہ آبادی کے اضافہ اور صنعتیت میں معیاری تطبیق پیدا کرنا امکانات سے ہے۔ /42

دوسرا معاملہ اپنی قدامت پرستانہ مشابہت کے باوجود کوئی ضروری روکاوٹ نہ تھا ڈیوس تسلیم کرتا ہے کہ ہندوازم غیر معمولی طور پر جدید خیالات اور تبدیلیوں کے اظہار کے لیے عیسائیت اور اسلام سے زیادہ موزوں ہے اور چونکہ اس سے عمل میں یکسانیت رائے سے پیدا ہوتی ہے نہ کہ جبر سے اس لیے اس سے اعمال کے اندر اختلافات کی گنجائش ہے۔ جہاں تک کہ مذہبی عقائد کا تعلق ہے اور اعمال کو اس سے زیادہ نہیں ڈھالنا جیسا کہ مثلاً کیتھالک مذہب فرانس میں کرتا ہے عقائد کا نظام اب اقتصادی ترقی میں بہت کم اہمیت کا حامل ہے بلکہ بالکل اہمیت نہیں رکھتا ہے" /43 اس کے علاوہ ہندو مذہب میں متضاد دھارے بہتے ہیں۔ کچھ تو ترک دنیا کا نقطۂ نظر بگاڑنے کی تعلیم جانوروں کے مارنے کو حرام سمجھتے اور ذات اور مشترکہ خاندان کو پسند کرتے ہیں جو جدیدیت میں روکاوٹ ڈال سکتے ہیں لیکن دوسرے اور امور میں جو جدیدیت کو فروغ دیتے ہیں۔ قدیم مذاہب میں ہندو مذہب غیر معمولی طور پر لوچ دار ہے۔ اس کے خیالات کسی خاص دائرے کے اندر محدود نہیں ہیں۔ اس کی مختلف شکلیں ہیں۔ یہ رنگارنگ ہے اور نئے افکار کے ساتھ رواداری کر سکتا ہے۔ اس کی کوئی مرکزی کمیٹی نہیں ہے اور نہ اس کے مذہبی پیشواؤں کا طبقہ بہت اونچے درجہ پر منظم "بین الاقوامی تنظیم نہیں ہے"

---

42. Davis, K. in Kuznets, Moore, and Spengler, op. cit. P. 284.
43. Ibid, P. 300

اور جہاں اس کا وطن ہے اس کے باشندوں میں 85٪ ہندو ہیں۔ لیکن اسے اپنے آپ کو ایک سیکولر حکومت اعلان کرنے میں کسی قسم کی پریشانی نہیں ہوئی۔ 44/۔

انجماد کے وجوہ کے بارے میں ہندوستان کے خیالات

ان لوگوں کے خیالات کا تجزیہ کرنے کے بعد جو اقتصادی انجماد کے غلط وجوہ بیان کرتے ہیں اب یہ ضروری ہے کہ صحیح وجہ کی نشاندہی کی جائے۔ یہ مشکل نہیں ہے۔ جب سے دلدا بھائی نوروجی نے (Poverty and un British Rule) "مفلسی اور مخالف برطانیہ حکومت" اور آرسی دت نے دو جلدیں (Economic History of India under British Raj) یعنی برطانوی حکومت میں ہندوستان کی تاریخ اقتصادیات اور رانا ڈے نے (Economic Essay) "انشاء اقتصادیات" لکھے ہیں۔ ہم نے انیسویں صدی کے صرف تین ممتاز تصنیفات سے متعلق اظہار آرا کا تذکرہ کیا ہے۔ سب نے ہندوستان کی پسماندگی کی ذمہ داری اصولی طور پر برطانیہ گورنمنٹ کے کندھوں پر رکھی ہے۔

اسی موضوع پر جن لوگوں نے بیسویں صدی میں قلم اٹھایا ہے انہوں نے بھی انہی لوگوں کے نظریات کی تائید کی ہے۔ سر ابراہیم رحمت اللہ جو 1922 کی مالی (Fiscal) کمیٹی کے چیرمین تھے اور ان کے چار ساتھیوں نے اپنے اقلیتی نوٹ میں نہایت صفائی سے اپنی رائے ظاہر کی ہے۔

ہم یقین کرتے ہیں کہ ہندوستان کی صنعتی پسماندگی کسی طرح بھی باشندگان ہند کی جبلی کمزوریوں کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ وجہ یہ ہے کہ ایک زبردستی عائد کی ہوئی بحری درآمد و برآمد کی پالیسی کے محکمہ سے ہندوستان کی فطری صنعتی ذہانت کا مسلسل گلا گھونٹ کی کارروائی کر کے مصنوعی طور پر اس کو پیدا کیا گیا ہے۔" 45/

گیڈگل جو ایک محتاط اور چوکس ماہر اقتصادیات ہے کہتا ہے کہ "حکومت کی اقتصادی پالیسی اپنی ابتدائی حالات کی بنا پر زیادہ تر منفی رہی ہے"۔ 46/۔ سر ایم۔ وسواسوریا (Visvesvaraa) جو ہندوستان کی صنعتیت کے میدان کا ایک ممتاز اولین رہنما تھا اس نے 1942 میں یہ خیال ظاہر کیا ہے۔

44 - Ibid, PP. 304-05.

45. The Fiscal Commission Report P. 48, cited in Wadia and Merchant, op-cit, P. 598.

46- Gadgil, D.R. op.cit P XV.

گورنمنٹ کے پاس نہ کوئی پالیسی ہے نہ کوئی پلان ہے اور نہ اس کے پاس کوئی مجوزہ تحلیل اس بات کا ہے کہ وہ کیا کر رہے ہیں اور ایسے معاملہ میں جو ہماری آبادی کے 40,00,00,000 آبادی کی قوت خریداری سے تعلق رکھتا ہے وہ کیا کرنا چاہتے ہیں"۔ /47

امریکہ کے لوگوں میں ڈی۔ ایچ۔ بوچانن (D.H. Buchanan) نے اس کے اسباب پر بحث کی ہے کہ کیوں 1934 کے قریب تک ہندوستان کی صنعتیت کی رفتار ایسی حقیقت تھی کہ اس کی آبادی کی صرف دو فیصدی فیکٹری کی صنعت سے مستفیض ہوتی تھی۔ /48

گورنمنٹ کے بعض مغربی نکتہ چیں

یورپین مصنفین میں مارکس کا مکتبۂ خیال ملوکیت کے کلیتہً خلاف ہے اور مارکسی مصنفین نے واقعات کے انبار لگا کر اور اعداد و شمار پیش کر کے یہ ثابت کیا کہ کس طرح برطانیہ کی ملوکیت پرستی نے ہندوستان کی لوآبادیاتی اقتصادیات تک گرا دیا تھا اور وسیع پیمانہ کی صنعت کی نشوونما میں رکاوٹ ڈالی۔ آر پالمے دت اور جے۔ اسٹریچی (R. Palme Dutt and J. Strachey) مثال کے طور پر پیش کیے جاسکتے ہیں۔

وہ جن نتائج پر پہونچے ہیں ان کی تائید میں غیر مارکسی انگریز اور امریکن مصنفین نے ہندوستان کی اقتصادی تاریخ پر جو کچھ لکھا ہے اسے بھی پیش کیا ہے ولیم ڈگبی (William Digby) نے اپنی کتاب (Prosperous British India 1901) خوشحال برٹش انڈیا 1901 میں برطانیہ کی حکومت پر ہندوستان کی بڑھتی ہوئی مفلسی کے ذمہ دار ہونے کی فرد جرم لگائی ہے۔ سر گلفورڈ مالسورتھ (Sir Guilford Molesworth) جو ایک انگریز انجنیر تھے اور جنہوں نے ہندوستان میں ریلوے کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا تھا انہوں نے لندن کے جلسہ میں 1909 کہا تھا۔

"وہ یعنی (انگلستان) اس کے (یعنی ہندوستان) وسائل کو مسلسل کھینچتا رہا اور اس کو انگریزوں اور باہر کے ملکوں کے بنائے سامانوں کے سیلاب میں غرقاب کر دیا۔ اور بجائے اس کے کہ اس کی صنعتوں کو پالے پوسے ان میں ہر طرح کی رکاوٹ پیدا کی۔ ہندوستان میں صنعتیں اس وقت تک

---

47. Visvesvaraya, Sir. M. December 1942. quoted by Wadia and Merchant, op. cit. P. 6.

48. Wadia and Merchant, op. cit. P. 433.

قائم نہیں ہوسکتی ہیں جب تک کہ ان کو نہ صرف بیرونی ملکوں کے مقابلہ میں بلکہ ہمارے مقابلہ میں بھی تحفظ نہ دیا جائے ۔/49

ویرا اینسٹے (Very Anstey) نے صنعتوں کی سست رفتاری پر بحث کرتے ہوئے تسلیم کیا ہے کہ "تیسری بنیادی مشکل ہندوستان کی صنعتکی ترقی کا یہ ہے حاکم اور محکوم میں باہمی تعاون نہیں ہے" آگے چل کر وہ فرماتی ہیں کہ ملک کی اقتصادی زندگی میں گورنمنٹ نے جو حصہ لیا ہے وہ ضرور ہندوستان میں دوسرے ملکوں سے زیادہ ہوگا۔ ہندوستان کے اکثر انتہائی ضروری اقتصادی مسائل کی بنیادی وجہ یہ تعلق (یعنی ہندوستان اور انگلستان کے مابین) ہے اور اس لیے گورنمنٹ کو چاہیے کہ اس کے حل تلاش کرنے کی کم سے کم جزوی ذمہ داری قبول کرے ۔/50

گریفتھ (Griffith) جو برطانوی راج کے ایک اور صفائی پیش کرنے والے نے تسلیم کیا ہے کہ "یہ بھی اس طرح غلط ہوگا کہ حکومت پر برطانیہ کو یہ نیکنامی دی جائے کہ جو کچھ ترقی ہوئی ہے اسکو اس نے بالارادہ بلاان کیا ہے یا کسی بڑی حد تک اسکو ابھارا ہے ۔/51 - وہ کسی قدر ہچکچاہٹ سے یہ تسلیم کرتا ہے کہ" معتدل تحفظ کی جو پالیسی آئی ہے وہ درحقیقت اس سے پہلے آسکتی تھی جب وہ آئی ۔/52

امریکہ کے لوگوں میں ڈی ایچ بوچانن (D.H. Buchanan) نے صنعت کی خفیف ترقی کے اسباب پر بحث کی ہے کہ 1934ء کے قریب اس کی آبادی کے صرف دو فیصدی فیکٹری کی صنعت سے مستفیض ہوئے تھے لیکن اپنے کو" جانبدار ذہنیت" کا ثابت کرنے کے لیے اس نے زیادہ تر اس پر قناعت کی کہ برطانیہ کے نقطہ نظر کو بھی لکھ دیا اور اس پر ہندوستان کے معترضین کے بیانات بھی درج کر دیئے ۔

اسکے برخلاف حال کے بعض امریکن مصنفین نے اس طرح کی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی ہے کنگس لے ڈیوس (Kingsley Davis) کی رائے کا اوپر حوالہ دیا جا چکا ہے ان کے کچھ اور اقوال کو بطور

---

49. Buchanan . D.H. op-cit P. 468 . quotes from the journal of the society of Arts. Vol L. P. 353.

50. Anstey V. op-cit . P 477

51. Griffith . P op-cit . P. 476

52. Ibid . P. 468

ثبوت پیش کیا جاسکتا ہے ۔ وہ فرماتے ہیں کہ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کی اقتصادی پالیسی کو مسلسل دیہی بنائے رکھنا اس سماجی پالیسی سے پورے طور پر مطابقت رکھتا تھا جو اس اصول پر مبنی تھی کہ ہندوستان کے اداروں میں جہاں تک ممکن ہو کم سے کم تبدیلی کی جائے۔ ہم کو اب یہ بات سمجھ میں آرہی ہے کہ کیوں ایک ایسے ملک کی متابعت میں جس نے کہ صنعتی انقلاب کو آگے بڑھایا دو سو سال رہنے کے بعد بھی ہندوستان میں ایک ایسی پست اور کمزور تبدیلی پیدا ہوئی کہ جس سے نہ صرف یہ کہ صنعتیت مکمل نہیں ہوئی بلکہ بے شمار رکاوٹیں (جن کا منبع دیسی سماجی ساخت کو قرار نہیں دیا جاسکتا) اس کی راہ میں بکثرت جمع ہوگئیں "/53

ڈینیل تھارنر (Danial Thorner) نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ "ہندستانی محاصل کے طویل المیعاد ہونے کا رجحان یہ ظاہر کرتا ہے کہ 1970 سے 1940 تک کے سالوں میں ہندوستان کی فی کس آمدنی میں واقعی تبدیلی خفیف حدوں تک محدود رہی ہے اگرچہ مجموعی غیرزرعی کاروبار گذشتہ ساٹھ سال کے اندر برابر بتدریج بڑھتا رہا تھا لیکن اس کا بالکل صحیح طور پر شمار کرنا ٹھیک ٹھیک اعداد و شمار کی عدم موجودگی میں آسان نہیں ہے وہ یہ رائے ظاہر کرتا ہے کہ کچھ لوگوں کی رائے ہے کہ بیسویں صدی میں فی کس آمدنی بڑھ گئی ہے۔ دوسرے لوگ یہ کہتے ہیں کہ نہیں بڑھتی رہی ہے۔ ایک تیسرا منطقی امکان یہ بھی ہے کہ فی کس آمدنی گھٹتی رہی ہے۔ جب تک ہندوستان کی اقتصادیات اور اس کے ارتقا کا علم زیادہ ٹھوس بنیادوں پر قائم نہ کیا جائے اس تیسرے امکان کو مسترد کردینا قبل از وقت ہوگا "۔/54

اسی جلد میں ہیلن بی لیمب (Helen. B. Lamb) "ہندوستان میں حکومت اور اقتصادی ترقی" کے موضوع پر لکھتا ہے کہ "جبکہ ہندوستان کی گورنمنٹ نے رسل و رسائل و ذرائع باربرداری میں انقلاب لانے کیلیے متحرک اور موثر ذرائع اختیار کیے لیکن ماڈرن صنعت کی نشوونما میں ایک مجہول رویہ اختیار کیا" آگے چل کر وہ کہتی ہے کہ "ہندوستان کے حکام ہندوستان کے صنعتی قوم بن جانے کے امکان کو بد اعتقادی کی نگاہ سے دیکھتے تھے"۔ اس کے علاوہ "یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ مختلف اقسام کے بے شمار اداروں کا پلان بلا سوچے سمجھے اور بلا یہ غور کیے کہ ہندوستان کے کس جگہ کے لیے

53- Davis. K. in Kuznets Moore and Spengler, op-cit. P. 293.

54- Thorner D. in Kuznets Moore and Spengler, op-cit. P. 128.

کن خاص چیزوں کے اقتصادی نشوونما کی ضرورت سے قائم کر دیئے جانے تھے۔ اسی کی وجہ سے ہندوستان کی اقتصادیات کے مطالعہ کرتے وقت دماغ پر یہ اثر پڑتا ہے کہ کل اور جزو کے درمیان عضوی تعلق کے تنظیم کی خامی ہے۔ ہندوستان میں بہت سے برطانوی اداروں کا اوپری ڈھانچہ تو ضرور تھا لیکن اندرونی حصہ ندارد۔ صرف سایہ لیکن ٹھوس حقیقت غائب اور آخری حوالہ یہ ہے۔ "برطانوی صنعت برطانوی راج کے آخر تک اس بات پر برابر امکانی زور دے رہی تھی کہ ہندوستان کی صنعتی ترقی کو روکے تاکہ برطانوی مہم باز تاجروں کے لیے بازار قائم کرے"55/

ولفرڈ میلن بام (Wilfred Malenbaum) نے ہندوستان میں صنعتی ترقی کی سست رفتاری کے وجوہ بیان کیے ہیں کہ "یہ جزواً تو انتظام اور کنٹرول کے مسائل اور مالیات میں مضمر ہیں اور زیادہ تر ان کی اصل جڑ یہ ہے کہ ہندوستان ایک اہم صنعتی اور تجارتی ملک کی نوآبادی ہے"56/

رائیں تنہا نہیں ہیں۔ ان کی تائید ان کامل الفن ماہرین اقتصادیات نے کی ہے جنہوں نے صنعتی ترقی کے میدان میں گورنمنٹ کی کارکردگی کا جائزہ لیا ہے مثلاً ڈبلو ڈبلو راسٹو (W.W. Rostow) گورنمنٹ کے اعمال کو حسب ذیل الفاظ میں ظاہر کرتا ہے۔ "گورنمنٹ میں یہ اہلیت ہونی چاہئے کہ وہ قوم کو منظم کرے تاکہ متحدہ تاجرانہ بازار میں نشوونما پائیں یہ ایک ایسا ٹیکس لگائیں اور مالیات کا ایسا انتظام قائم کریں جو وسائل کو جدید استعمال میں لائیں اور اگر ضروری ہو تو پرانے ٹیکس وصول کرنے والوں کو ہٹا دیا جائے۔ اور قومی پالیسی کے پورے پیکر کے ذریعہ۔ جبری درآمد و برآمد ٹیکسوں سے تعلیم اور صحت عامہ تک۔ صنعت اور سماج کو جدید بنانے کی راہ دکھائے جس کا وہ ایک جزو ہے"57/

پروفیسر آرتھر لیوس اسٹینے جونس (Arthur Jeunne) مینچسٹر یونیورسٹی کا پروفیسر اقتصادیات کہتا ہے کہ۔

اقتصادی نشوونما پر گورنمنٹ ایک نمایاں اثر رکھتی ہے اگر وہ صحیح قدم اٹھائے تو نشوونما کو فروغ ہوتا ہے۔ اور اگر وہ بہت کم کرے یا غلط راستہ اختیار کرے یا حد سے زیادہ کرے

---

55 - Lamb, H.B. "The State and Economic Development in India" in Ibid, PP. 486 and 494.

56 - Malenbaum, W. op.cit. P. 55.

57 - Rostow W.W. op.cit. P. 30.

تو نشو و نما رک جاتی ہے ....

حکومت برطانیہ اقتصادی میدان میں جس جگہ ناکامیاب ہوئی وہ جگہ آزاد تجارت کے اجراء کی تھی زراعت میں کاشت کاروں کو نئے طریقے نہیں سکھائے گئے۔ اور نہ ان کو جدید قسم کے بیج یا کھاد کے سامان فراہم کیے گئے۔ اور صنعت میں بڑے پیمانے پر جدید اشیاء کی تیاری کی پرداخت نہیں کی گئی۔ اور ان کی نشو و نما میں جو تکالیف اٹھانی پڑتی ہیں اسے اٹھایا۔ اس نے کل محاصل کی پیداوار کی ترقی کی رفتار سست رہی اور جس شرح سے آبادی بڑھ رہی تھی اس سے زیادہ تر رفتاری تو کبھی نہیں رہی۔ تمام جدید شہنشاہیوں نے آزاد تجارت کی پالیسی اختیار نہیں کی ہے" 58/

کالن کلارک (Colin Clark) کہتا ہے کہ "تحفظ ایسے ملک کے لیے مناسب ہے جس کی ایک کثیر تعداد منافع دینے کے قابل زراعت میں مشغول ہے اور جہاں مزدوروں کی کثرت مقابلہ کی مہم بازاروں میں عام طور پر اس وقت تک نہ ہوگی۔ جب تک کہ ایسے وسیع پیمانہ پر اشیاء تیار کرنے والے صنعتی نظام پہلے مصنوعی طور پر اس پیمانے کے بنا نہ لیے جائیں۔ جہاں ان کی روزافزوں آمدنی اتنی کافی ہو کہ وہ دوسرے ملکوں کی صنعتوں کا مقابلہ کر سکیں " 59/

VII انجماد کی اصل وجہ آزاد اتحاد

گورنمنٹ ان پالیسیوں میں جن کی وجہ سے ہندوستان کی ... صنعتیت میں رکاوٹ پڑی۔ سب سے اول ممالک متحدہ برطانیہ کی سیاسی اور اقتصادی پالیسی تجارت اور صنعت میں عدم مداخلت آزاد تجارت کی ہے۔ ان کا عہد اس وقت انیسویں صدی کے وسط کے قریب سے شروع ہوا۔ جس زمانہ تک انگلستان نے اپنی تحفظ کی پالیسی سے ایک عظیم بحری درآمد برآمد ٹیکس کی صنعت تعمیر کر لی تھی۔ باوجود اس کے دو ناموافق حالات اس میں مانع تھے (1) نہ انگلستان کے اپنے پاس کوئی خام مال نہ تھا۔ اور (2) یہ کہ جو پیداوار ہوتی تھی اسے دور دراز ملکوں میں پہنچانا ہوتا تھا جس پر کثیر بار برداری خرچ لگتا تھا۔ یہ پالیسی ہندوستان کی گھریلو صنعت کو اس طرح برباد کر کے اب اس کی تلافی نا ممکن تھی کامیاب ہوئی۔

58- Davis W. Arthur. The Theory of Economic Growth PP. 408 & 413.

59- Clark, Colin. The Conditions of Economic Progress P. X.

آزاد تجارت کی پالیسی ہندوستان پر زبردستی تھوپی گئی۔ بعض مصنفین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ کارروائی کسی خود غرضی کی نیت سے نہیں کی گئی تھی بلکہ وجہ یہ تھی کہ برطانیہ کے ارباب نظم ونسق ایمانداری کے ساتھ یہ یقین رکھتے تھے کہ یہ انسانیت کی عالمگیر فلاح کے لیے بہتر ہے۔ لیکن یہ امر مشتبہ ہے آیا اس قسم کی دلیل تجزیے کو برداشت کر سکے گی۔ کیونکہ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ تجارت اور تجارت میں حکومت کی عدم مداخلت جنگی نعرے تھے جو انگلستان کے نئے مہم باز خطرات مول لینے والے تاجروں نے اس وجہ سے لگائے تھے تاکہ مزدوری کو کم کرنے کے لیے بلا کوئی ٹیکس ادا کیے غلہ درآمد کیا جا سکے اور نہ زراعت پیشہ گروہ سے مزدور مل سکیں جن کی تعداد گھٹ رہی تھی۔

نہ تو یہی صحیح ہے کہ وہ دو فلسفی جن کی رائیں انیسویں صدی کی آخری چوتھائی تک بہت زیادہ رائج تھیں وہ کلیتہ عدم مداخلت کے حامی تھے۔ جرمی بینتھم (Jeremy Betham) انفرادیت کے اصول کا پیش کرنے والا مانا جاتا ہے۔ اپنی ابتدائی زندگی میں وہ غالباً آدم اسمتھ کے اس خیال کا پیرو تھا کہ افراد اپنے غادی کی کارروائیوں میں مشغولیت رکھتے ہوئے فطرتاً اپنے مفاد کے لیے دوسروں سے مل جاتے ہیں لیکن بعد کو اس نے یہ بحث کیا کہ افراد کے مفاد کا کامل طاقت رکھنے والے ضمان قانون کو خوش آیند تخمینہ کی بنیاد پر مصنوعی طور پر اشتراک پیدا کرنا چاہئے۔ بینتھم اس امر کا مبلغ ہو گیا کہ حکومت کو انسانیت کی فرحت کے لیے قانون بنانا چاہئے اور اس نے قواعد وضوابط اصول اجتماعیت کے مرتب کیے۔

ان کے شاگرد جان اسٹورٹ مل جس نے آزاد تجارت کے اصول کی وکالت کی۔ اور اس بات کا دعویٰ کیا کہ یہ فلسفہ بینتھم کا نچوڑ ہے۔ بعد کو مداخلت کے فلسفہ کا حامی ہو گیا۔ اپنی خود نوشت سوانح عمری میں وہ ایک آزاد خیال (لبرل) سوشلسٹ کی صورت میں نظر آتا ہے۔ لیکن اپنی کتاب "سیاسی اقتصادیات کے اصول" (Principal of Political Economy) میں اس نے دولت کی تقسیم کے اصول کے معاملہ میں حکومت کی مداخلت کی رعایت کی ہے۔ اپنی کتاب (Liberty) میں اس نے جمہوریت سے خوف اور سماج کے مظالم کا رد ظاہر کیا ہے۔ اور سماجی زندگی کے احوال سے افراد میں جو آزادی پیدا ہوتی ہے اس کے حدود مقرر کرنے کے لیے خیال کی توثیق کی ہے۔ جہاں تک تحفظ کا سوال ہے اس نے بچہ صنعتوں کے تحفظ کا اصول وضع کیا ہے۔

انیسویں صدی کے پورے دوران میں انگلستان کی گورنمنٹ۔ خواہ وہ قدامت پرست ہو یا لبرل مسلسل اس بنیادی پالیسی پر کارفرما رہی جس کا نام تجارت میں عدم مداخلت کا نام دیا گیا ہے لیکن باوجود اس کے برابر اقتصادی آزادی میں دخل اندازی کرتی رہی مثلاً فیکٹری کے ایکٹ۔ پورلا ایکٹ

(Act Law Poor) وہ ایکٹ جس میں صنعتی تنازعات کے لیے پنچایت کے ضوابط تھے۔
وہ قوانین جن میں مالکان کی ذمہ داریوں کی تفصیل دی گئی تھی، کم سے کم اجرت مقرر کرنے کے قوانین اور
ٹریڈ یونینوں کو تسلیم کرنے کے قواعد اس طرح کے قوانین برابر وضع ہوتے رہے۔ صنعتوں کے بارے میں مختلف
قسم کے ایسے ریگولیشن تھے جن میں جوائنٹ اسٹاک کمپنیوں پر پابندیاں عائد کی گئی تھیں اور ان کے
علاوہ ایسے ریگولیشن بھی تھے جن کا کلیسا کے حقوق اور ان کی مملوکہ جائدادوں پر اثر پڑتا تھا۔ ان سب
پابندیوں کو دیکھ کر ڈبلیو میک بائن ([illegible]) یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ "تجارت میں عدم مداخلت کا فلسفہ
ایک غیر آزمودہ خواب وخیال کی دنیا ہے /60

انیسویں صدی میں تجارت میں عدم مداخلت (آزاد تجارت) سے کثیر منافع حاصل ہوئے انگلستان
مغربی ممالک میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ صنعتی ملک ہوگیا۔ اور دنیا کی مالیات کا مرکز بھی بن گیا لیکن
جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے کہ مرکزی حکومت اور مقامی حکام کی مداخلت ابتدائی دنوں میں بھی کافی تھی اور
جیسے جیسے کہ صدی بڑھتی گئی یہ حقیقی بنتی گئی۔ جیسا کہ جی۔ ایم ینگ (G.M. Young) نے
ظاہر کیا ہے کہ "آزاد تجارت کا عہد درحقیقت بہت مختصر رہا افراد پر حکومت کا دباؤ 1830 میں تو
مشکل سے محسوس ہوتا تھا لیکن 1870 تک وہ کافی محسوس ہونے لگا" /61

صدی کے اختتام کے قریب ریفارم ایکٹ کے پاس ہونے اور غیر معاشی کارروائیوں کی نشوونما کے اثر
سے جیسے کہ بحری اور لشکری استحکامات اور تعلیم۔ رائے عامہ روزافزوں دباؤ ڈال کر مطالبہ کرنے لگی
کہ گورنمنٹ ان لوگوں کی معاشی حالت سدھارنے کے لیے جن کے پاس اپنے تحفظ کے وسائل
نہیں تھے۔ عمل پیرا ہو۔ علاوہ ازیں انیسویں صدی کے اختتام کے قریب برطانیہ کی برتری کا مقابلہ کر
نے کیلیے ممالک متحدہ امریکا اور جرمنی میں اقتصادی ترقیات ابھر رہی تھیں۔ 1870 کے اوائل میں
نئی بازاروں کے حاصل کرنے اور بیرونی حکومتوں کی تاجرانہ پالیسیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے گورنمنٹ کی

---

60 - The Discussion is based on J.B. Brebner's article on "Laissez faire and State Intervention in Nineteenth Century Britain" The Journal of Economic History. Supplement VIII, 1948.

61 - Young. G.M. Last Essays quoted in Ashworth, William. An Economic History of England, 1870-1931. P. 217 [illegible]

امداد کا مطالبہ ہونے لگا۔ ان سب کا انجام محاصل درآمد و برآمد کے اصلاح کی تحریک کا آغاز ہوا جس کے قائد بیسویں صدی کے آغاز میں جوزف چیمبرلین تھے۔

18-1914ء کی جنگ نے اس تحریک کو تیز کر دیا 1915ء میں میکنا (Mekenna) نے نئے درآمد کے ٹیکس عاید کیے۔ قدامت پرست پارٹی اس سے پہلے ہی اقتصادی تحفظ کے لیے درآمد و برآمد کے ٹیکس کے سلسلہ میں ایک اصول تسلیم کر چکی تھی۔ اور یہ بھی طے کر چکی تھی کہ سامراج کے احوال کے ساتھ ترجیحی سلوک کیا جائے۔ 1919ء میں سامراجی ترجیح کو میکنا کے ٹیکس سے منسلک کر دیا گیا۔ 1921 میں "قانون تحفظ صنعت" (Safegua ding of In dustrial Act) پاس کیا گیا۔ تجارت میں حکومت کی عدم مداخلت اور آزاد تجارت کی پالیسی نے اب دم توڑ دیا اور 1935ء تک اسکو دفن کر دیا گیا اور اب اس کے از سر نو جی اٹھنے کی کوئی امید باقی نہیں رہی۔

تاریخ کی روشنی میں اس بات کا تسلیم کرنا ممکن نہیں ہے کہ انگریز لوگ تجارت میں عدم مداخلت (Laissez faire) کو اخلاقی حیثیت سے واجب سمجھتے تھے جس کے عالم گیر احاطہ سے ذرا بھی باہر جنبش کرنا نہ تو ممکن ہے اور نہ مناسب۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہندوستان تک میں بھی اس حکمت عملی سے کچھ نہ کچھ تجاوز کیا گیا جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے۔ ریلوے کمپنیوں کے منافع کی گارنٹی دی گئی۔ کاشت کی کمپنیوں کو مختلف اقسام کی امداد اور حقوق دیئے گئے۔ جو پرائیویٹ برطانوی بینکوں کے دفتر ہندوستان میں قائم تھے انکو گورنمنٹ کی سرپرستی حاصل تھی لیکن یہ سب وہ کاروبار تھے جن کو حکمراں طبقہ کے اہل وطن چلا رہے تھے تجارت میں حکومت کی عدم مداخلت کو صرف ان صنعتوں سے خارج کیا گیا جن کو یا تو ہندستانیوں نے قائم کیا یا انکی شروعات کی تھی یعنی وہ صنعتیں جن کو ہندوستان کے مفاد کے لیے ترقی دینا چاہئے تھا۔ اور غالباً اس وجہ سے بھی کہ برطانیہ کے تجارت کی حالت بھی بہتر ہو۔ راسٹو (Rostow) نے بتلایا ہے کہ پائدار اقتصادی ترقی کے لیے پیشگی شرط سیاسی ہے۔ 62۔ مالن ہام کے قول کے مطابق "انتظامیہ کی پوری شکل ایسی ہونی چاہئے جس سے مستقبل کے بہتر زمانہ ہونے کے بارے میں پورا اطمینان ہو۔ 63۔ لیکن گورنمنٹ آف انڈیا کا رویہ اس کے بالکل خلاف تھا اور پورے ہندوستان کے منظر پر مایوسی اور قنوطیت کا ایک ایسا موٹا پردہ پڑا ہوا تھا جو کفن کے اوپر ڈالا جاتا ہے۔

62. Rostow W. W. op. cit.

63. Malenbaum W. op. cit. P. 151

ہیلن لیمب (Helen Lamb) کا فیصلہ یہ ہے کہ "اس طرح وہ قدیم مقصد کہ ہندوستان کو ایسا بنا
یا جائے کہ کچی غذا اور کچا مال کے بدلے میں وہ برطانیہ کے اندر تیار شدہ مال کا ایک بازار بن جائے۔ بار برداری
رسل و رسائل اور آبپاشی کی ترقی، اور صنعتی نشو و نما میں سرکاری عدم مداخلت کا نام دے ایک مجہول پالیسی
اپنانے سے اور ان سب کے مجموعی اثر سے حاصل ہو گیا۔ اس طرح یہ ممکن ہو سکا کہ مرکنٹائل ازم (بیناپن)
کی قدیم منزل کو کسی طرح کی شرائط عائد کیے بغیر حاصل کیا جا سکا۔" /64

تجارت میں سرکاری مداخلت کی پالیسی ترک کر دی گئی

پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ کے بعد گورنمنٹ نے حالات سے مجبور ہو کر ایک معمولی قسم کی اقتصادی خود
مختاری عطا کی۔ 1921 میں فسکل آٹانامی کنونشن (معاشی خود مختار کنونشن) نے بحری درآمد و برآمد۔
ٹیکس کو طے کرنے کا حق وزیر ہند سے لے کر گورنمنٹ آف انڈیا کو دیدیا اور ایک مالی (Commission)
کمیشن کا تقرر عمل میں آیا جس کے مشورہ پر بعض موجود صنعتوں کو ٹیرف بورڈز (Tariff Board)
(محصول نامہ درآمد و برآمد کی جماعت) کی سفارش پر امتیازی تحفظ دیا گیا۔ لیکن جو موجودہ اقتصادی پالیسی
مرتب کی گئی وہ بہت مختصر تھی اور بہت دیر میں آئی /65

ہندوستان کساد بازاری کے اس بھنور میں پھنس گیا جو عالم گیر تھا جس سے وہ 37-1936
سے قبل اپنے آپ نکال نہ سکا۔ 1935 کے آئین کے مطابق صنعت کے قلمدان کا صوبوں کے وزرا
کے ہاتھ میں آنے کا کوئی نفع نہیں ہوا جس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ہندستان کی وزارتیں اتنے دنوں
تک رہ ہی نہیں گئیں کہ اسکیم بنانے کے علاوہ کوئی کام ہی کر سکتیں۔ لیکن دوسری خاص وجہ یہ تھی کہ
صوبوں کو کافی وسائل حاصل دیئے گئے تھے جن میں وسعت ممکن ہی نہ تھی۔ ان سب کے ماسوا واقعہ
اصل میں یہ تھا کہ تنظیم کے محدود دائرے کے اندر ایک دوسرے سے ملی جلی سالم پلاننگ جو ترقی کے
لیے اس قدر ضروری ہے قطعی ناممکن تھی۔ جیسا کہ 1934 میں بوچانن (Buchanan) نے اظہار خیال
کیا ہے "صنعتوں کی ہمت افزائی کے لیے گورنمنٹ کی ایک دور رس ٹھوس پالیسی کی ضرورت ہوتی
تھی جو نہ صرف کچے مال اور پیداوار کے طریقوں سے تعلق رکھے ___________

64- Lamb, H.B. in Kuznets Moore and Spengler, op. cit. p. 484

65- Ibid, p. 478.

بلکہ کھلے بازاروں سے بھی/66 دوسری جنگ عظیم نے وزارتوں کی زندگیاں ختم کردیں اور زمانہ جنگ میں اگرچہ چند صنعتوں کو آگے بڑھانے کی کوشش کی گئی اور خاص کر ان کو جو مسلح فوجوں کی ضروریات کے سامان تیار کرتی تھیں لیکن پلان کے مطابق ایسی اسکیم تیار نہیں کی گئی جو مکمل صنعتیت کو فروغ دیتی۔

گورنمنٹ کی دیگر پالیسیاں جو صنعتی پسماندگی کی ذمہ دار تھیں

(ا) ذخیروں کی خریداری

علاوہ اس کے کہ تجارت کی عدم مداخلت پالیسی قریب اسّی سال تک یعنی بیسویں صدی کی پہلی چوتھائی تک اپنے غلبہ کا اثر جماتی رہی۔ دوسری انتظامی پالیسیاں بھی تھیں۔ جنہوں نے ترقی میں یا رکاوٹ ڈالی یا اسے یک قلم روک دیا۔ ان میں ایک پالیسی یہ تھی کہ گورنمنٹ اپنی ضروریات کے لیے ذخیرے خریدلیتی تھی گورنمنٹ کی خریداری تو اس غرض سے ہونی چاہیے کہ ملک کی صنعت کی ہمت افزائی کی جائے۔ جیسا کہ جاپان میں ... بدقسمتی سے برطانوی حکومت اول عالمگیر جنگ کے آغاز کے وقت تک فوج، سول ورکس، تار، ٹیلیفون اور ریلوے کی ضروریات کی چیزیں انگلستان سے ہرسال خریدتی رہی۔ لڑائی نے گورنمنٹ کو مجبور کیا کہ ہندوستان کے اندر سامان حرب وضرب تیار کرے۔ اور اس کے لیے ہندوستان کے مال پر بھروسہ کیا۔ انڈسٹریل کمیشن رپورٹ 1918ء نے ذخیروں کا ایک محکمہ قائم کرنے کی تجویز ہندوستان میں خریداری کرنے کی ضرورت کے تحت پیش کی۔ اس محکمہ نے اپنا کام انچ کیپ (Inch cape) کمیٹی رپورٹ کے زیرسایہ ملازمتوں کی تخفیف سے شروع کیا۔ کلہاڑی تو اس نے سلامت رہنے دی لیکن لنگڑا لنگڑا کے صرف تھوڑی دور چلی۔ سات سالوں کے اندر یعنی 29-1928ء تا 36-1935ء اس نے ان کل اشیاء کی جو یا تو ہندوستان میں کل تیار ہوئی تھیں یا جزو تیار ہوئی تھیں ان کی خریداری 15.6 کروڑ کی کی /67 حالانکہ اسی زمانہ میں گورنمنٹ نے انگلستان سے 40 کروڑ کا مال درآمد کیا۔ /68 36-1935ء سے اور زیادہ فیاضانہ پالیسی اختیار کی گئی۔ ریلوے کے ذخیرے کے سامان پل وغیرہ بنانے کے لیے فہرست کے اندر آئے۔ اور انگلستان سے خریداریوں کی مقدار گھٹی۔ گورنمنٹ نے اپنے فرائض کا نہایت تنگ نظرانہ

66- Buchanan, D.H. op. cit. P. 464

67- Banerji. P.N. Indian Economics (1951) P. 524

68 Statistical Abstracts, 1938-39. P. 744.

رویہ اختیار کیا اور ہندوستان کے کاروبار کو تنہا چھوڑ دیا۔ حالاں کہ اپنے اور رفاہ عامہ کے آخری درجہ کے فائدے کے لیے بہت کچھ کر سکتی تھی"۔ 69/

(ii) صنعتی مالیات

بینک کے بارے میں جو پالیسی اختیار کی گئی وہ بھی صنعتی ترقی کے حق میں نہ تھی۔ جرمنی اور جاپان جیسے ملکوں میں کارپوریشنوں نے صنعت کی نشوونما کی ہے لیکن ہندوستان میں ایسا نہیں ہوا۔ جو بینک پریسیڈنسیوں میں قائم ہوئے۔ وہ یورپین حضرات کے سرمایے سے قائم کیے گئے جس میں گورنمنٹ نے بھی امداد کی۔ گورنمنٹ کے کاروبار پر اجارہ داری ان کے ہاتھ میں تھی۔ 1868ء کے ریگولیشن نے ان کو خارجی زر مبادلہ میں حصہ لینے سے ممنوع قرار دیا تھا۔ اور مہینہ سے زائد میعاد کا وہ قرض بھی نہیں دے سکتے تھے اور نہ بلا غیر منقولہ جائداد کی ضمانت کے قرض دے سکتے تھے ۔اس طرح وہ صنعتی مہم بازیوں کی کوئی امداد نہیں کر سکتے تھے۔
ہندوستان میں تبادلہ کے بینک بیرونی ملک بینکوں کی شاخ تھے اور ان کو صرف بیرون ملک کی تجارت سے لگاؤ تھا۔ ہندوستان کے اندر کی صنعت سے قطعاً کوئی دلچسپی نہ تھی۔
1900ء تک تو کوئی دیسی بینک تھے ہی نہیں اور اس کی زندگی غیر مسلسل اور توازن سے محروم اور بوقلمونی رہی ہے 17-1913ء 36 - 1922ء کے نازک زمانوں میں اور اس کے بعد بھی بہت سے چھوٹے چھوٹے بینک ٹوٹ گئے۔ بہرحال غرض یہ ہے کہ ہندوستان کے جوائنٹ اسٹاک جیکوں کا کام تو بس اتنا تھا کہ پونجی جمع کرنے کی کشش پیدا ہو۔ تجارت کو سرمایہ دیا جائے۔ قابل اعتماد ضمانت لیکر قلیل المدت قرضے دیئے جائیں۔ یہ تبادلہ کی بلوں کی اصل قیمت سے کم ادا کرتے یا نظر انداز کردیتے تھے اور اندرون ملک سے بندرگاہ تک مال لے جانے یا وہاں سے مال لانے کیلیے بحری بیمہ کرتے تھے ان کاموں میں سے کوئی کام بھی صنعت کی توسیع سے تعلق نہیں رکھتا تھا۔ اس طرح صنعت اس سرمایہ سے محروم رہ گئی جو بینکوں میں جمع تھا۔

(iii) سکہ

ہندوستانی صنعت کی ایک اور شکایت ہندوستانی سکے کے انتظام کے بارے میں تھی۔ انیسویں

69- Buchanan, D.H. op. cit. P.473.

صدی کے آخری چوتھائی میں ہندوستان کا سکہ جو چاندی پر انحصار رکھتا تھا دہ مشکل میں اس لیے مبتلا ہو گیا کہ چاندی کا دام مسلسل گھٹتا رہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قیمتیں بڑھنے لگیں۔ گورنمنٹ آف انڈیا نے یہ دیکھ کر کہ چاندی کے روپیہ کے زر مبادلہ کی رقم سونے میں تبدیل کرنے میں چاندی کا بڑا نقصان ہوتا ہے۔ وزیر ہند سے درخواست کی کہ اس معاملہ پر غور کرنے کیلئے ایک کمیٹی کا تقرر کیا جائے۔

چنانچہ 1893ء ہرشل ( ) کمیٹی کا تقرر عمل میں آیا اس کی سفارشات کے مطابق سونے اور چاندی کے سکے آزادی کے ساتھ ڈھالنے والے ٹکسال بند کر دیئے گیے اور صرف گورنمنٹ کو یہ اختیار دے دیا گیا کہ وہ چاندی کے سکے تیار کرے ٹکسالوں کا بند کر دینا ایک پہلا قدم اس منزل کی جانب جانے کا تھا۔ کہ سونا ہی معیار قائم کیا جائے اور سونے ہی کا سکہ چلے اس عبوری قدم نے طبقہ تجار کو مطمئن نہیں کیا۔ اور اس لیے 1898 میں ایک دوسری کمیٹی ایچ آر فاولر ( ) کی صدارت میں مقرر کی گئی تاکہ وہ اس امر کا مشورہ دے کہ وہ کیا طریقہ ہے جس سے مملکت برطانیہ اور ہندوستان کے مابین ایک پائدار تبادلہ کا قاعدہ مرتب ہو جائے۔

اس کی رپورٹ کی بنیاد پر ایک ساورن (طلائی پاونڈ) اور آدھا ساورن (نصف طلائی پاونڈ) پندرہ روپیہ فی پونڈ کے حساب سے جائز سکہ قرار دیا گیا اور چاندی کے روپیہ کو جائز سکہ ہونے پر کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی۔ سکہ کے میدان کی سختی نے گورنمنٹ کو اس امر پر مجبور کیا کہ اس نے چاندی کے ٹکسال وسیع پیمانہ پر قائم کیے۔

1900 میں ایک گولڈ اسٹینڈرڈ ریزرو (ایک معیاری طلائی ریزرو) روپیہ کے سکے کے منافع سے قائم کیا گیا۔ جس کی جزئی غرض یہ تھی کہ نظام زر مبادلہ میں افراط زر پیدا نہ ہو۔ اور جزاً ان اخراجات کو پورا کرنے کے لیے جو وزیر ہند نے کیے تھے اور وطن کے مطالبات کو پورا کرنے کے لیے اور جزاً اس لیے کہ چاندی کے سکہ ڈھالنے کے لیے لندن میں چاندی خریدنے کے لیے سرمایہ اکٹھا کیا جائے۔ تبادلہ کا نرخ ایک شلنگ 4 پنس فی روپیہ مقرر کیا گیا۔ برطانیہ اور انگلستان کی حکومتیں زر مبادلہ کی خرید و فروخت اسی سرکاری نرخ سے کرتی تھیں۔ انگلستان میں وزیر ہند کونسل بل جاری کرتا تھا اور گورنمنٹ آف انڈیا ریزرو کونسل بل جاری کرتی تھی۔ اس طریقہ عمل سے روپیہ کی قیمت تبادلہ میں مستقل رہی اور اسطرح گورنمنٹ اور برطانوی مفادات کی حفاظت ہوتی رہی۔

1913 میں چیمبرلین کمیشن نے طلائی سکے کا جو معیار قائم کیا گیا تھا اس پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ لیکن ہوا یہ کہ قبل اس کے کہ کمیشن کی متعدد سفارشات پر عمل درآمد ہوسکے لڑائی شروع ہو گئی۔ اور اسکے نے

ہندوستان کے سکے اور تبادلے کی پوزیشن کو درہم برہم کردیا چاندی کی قیمت میں بہت اتار چڑھاؤ ہوگیا اور جو 27 پنس فی اونس سے جو 1915ء میں تھا 89 پنس فی اونس ہوگیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ 12 فروری 1920ء کو روپیہ کی قیمت دو شلنگ دس پنس ہوگئی۔ لیکن پھر بہت جلد الٹا دھارا بہنے لگا اور چاندی گھٹنے لگی حتیٰ کہ 1923ء میں یہ ایک شلنگ $3\frac{1}{8}$ پنس ہوگئی۔

افراط زر کے زور پکڑنے پر (Babington Smith) کمیٹی مقرر کی گئی جس نے روپیہ کی قیمت 2 شلنگ مقرر کردی اس سے سٹے بازی شروع ہوئی اور گولڈ اسٹینڈرڈ ریزرو (سونے کے سکے کا جو معیار تھا اس کا ذخیرہ) تقریباً ختم ہوگیا۔ اس احمقانہ قمار بازی میں ہندوستان کو 38 کروڑ کا نقصان برداشت کرنا پڑا۔

اس خرابی نے گورنمنٹ کو 1925ء میں ایک رائل کمیشن ہلٹن ینگ (Hilton Young) کی صدارت میں بنایا۔ کمیشن کے گولڈ اکسچینج اسٹینڈرڈ (طلائی معیاد تبادلہ) میں بہت سے نقائص پائے انھوں نے یہ سفارش کی کہ طلائی معیاد کو قطعی ختم کردیا جائے اور سکے اور تبادلے پر کنٹرول کرنے کے لیے ایک سنٹرل بینک قائم کیا جائے اور سونے چاندی کی اینٹوں کا انتظام مرتب ہو۔ لیکن ایک سفارش جو بہت متنازعہ فیہ مسئلہ بن گئی تھی وہ یہ تھی کہ روپیہ کی قیمت ایک شلنگ ۶ پنس قرار دی جائے۔

سر پرشوتم داس ٹھاکر داس جو کمیشن کے ایک ممبر تھے انھوں نے اپنے اختلافی نوٹ میں اس امر کی جانب توجہ دلائی کہ جو شرح تبادلہ چاندی کی مقرر کی گئی ہے۔ وہ ہندوستان کی اقتصادیات پر بھاری بوجھ ثابت ہوگی۔ کیونکہ اس سے ہندوستان سے جو مال ہو باہر جاتا ہے اس کی قیمت کو یہ ۱۲ ½ فیصدی بڑھا دے گی۔ یہ درآمد کی ہمت افزائی کرے گی۔ اور برآمد میں رکاوٹ کا باعث ہوگی۔ اور تجارت کے ترازو کے پڑلے کو ہندوستان کے خلاف جھکا دے گی ان دلائل کو ہندوستان کے لوگوں نے بڑے جوش وخروش سے بیان کیا۔ جو گورنمنٹ پر اعتراض کرتے رہتے تھے اور اسکو انھوں نے ایک سیاسی مسئلہ قرار دیدیا۔ جو کساد بازاری 1929ء میں پیدا ہوئی اس نے حالت کو اور ابتر کردیا۔ اور انیسویں سال میں جو مالی تباہی آئی اس کا ذمہ دار زیادہ تر اسی شرح کو قرار دیا گیا۔ جس کی وجہ سے بہت بڑی مقدار میں ہندوستان سے سونا باہر نکل گیا۔ 1939ء سے جنوری 1960ء تک 350 کروڑ سے زیادہ کا سونا باہر گیا۔ بدقسمتی سے کئی نسلوں سے جو رقم بچا کر رکھی گئی تھی۔ جو باہر نکل گئی تھی وہ تکلیف دے کر جمع کیا ہوا سونا تھا جو غریب کسانوں کی جیبوں سے زبردستی نکالا گیا تھا اور اس طرح اپنی بچت

سے محروم ہونا پڑا تھا اس کے سونے کی فروخت کی وجہ قیمتوں کی مصیبت خیز کمی تھی جو 1929ء سے شروع ہوئی (اور تقریب ۶۰ فیصدی دام گھٹ گئے) اور اس لیے اس کو اتنا روپیہ بچتا ہی نہ تھا کہ زمیندار، مہاجن اور گورنمنٹ کے مطالبات پورا کر سکے۔ اس لیے چھوٹے چھوٹے سونے کے زیورات جو خراب وقتوں میں کام آنے کے لیے رکھے ہوئے تھے۔ ان سے انھیں اپنے کو محروم کرنا پڑا تاکہ آمدنی کی کمیوں کو پورا کیا جا سکے۔

(۱۷) ریلوے

ریلوے صنعتوں کی ترقی میں ایک اہم مددگار کی حیثیت رکھتی ہیں علاوہ اس کے کہ وہ دوسرے اہم کام انجام دیتی ہیں اور بالواسطہ بھی فوائد پہونچاتی ہیں۔ دوسرے ملکوں میں ریلوے کی پالیسی اسی نہج پر تیار کی جاتی ہے کہ اس سے صنعت کی ترقی میں مدد ملے جیسے کہ جرمنی یا جاپان میں ہوا ریلوے کے نظام کا یہ پہلو ایسا تسلیم شدہ ہے کہ اس پر زور دینے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ 1953ء جیسے ماضی بعید میں جب ہندوستان نے ریلوے لائنوں کو بچھانا شروع کیا مارکس نے تسلیم کیا تھا کہ "یہ طریقہ عمل ماڈرن صنعت کا پیش رو ہے۔"/70

لیکن ہندوستان کے حکمرانوں کو ہندوستان کی صنعت کی ترقی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور انھوں نے بالکل مختلف اغراض کے تحت اپنی پالیسی مرتب کی۔ ہارڈنگ نے 1848ء میں ریلوے کی ترقی کی تائید اس غرض سے کی کہ فوجوں کو کسی مرکز پر جمع کرنے اور فوجوں کے لیے سامان رسد وغیرہ پہنچانے میں سہولت ہو، بغاوت کو روکا جا سکے، جنگ کو پوری طاقت سے جاری رکھا جا سکے اور مملکت برطانیہ کی حفاظت ہو سکے۔ لیکن ڈلہوزی نے ریلوے کی اہمیت پر اس نے زور دیا تاکہ برطانیہ کے اندر مال بنانے والوں کی تیار شدہ اشیا کے لیے بازار مہیا ہو سکے اور ہندوستان کے کچے مال کی برآمد میں آسانیاں پیدا ہوں۔

علاوہ ان باتوں کے ریلوے کی تعمیر نے برطانیہ کے بحت کے سرمایہ کو ایک منافع بخش کام میں لگانے کے مواقع فراہم کیے کیونکہ پرائیویٹ کمپنیاں جن کے سپرد ریلوے کی تعمیر کا کام کیا گیا تھا ان کو گورنمنٹ نے راس المال سرمایہ پر پانچ فیصدی سود کی گارنٹی دی تھی۔

انیسویں صدی میں ریلوے ملکیت کے بارے میں پالیسیاں بدلتی رہیں۔ لیکن صدی کے آخر میں ریلوے کی توسیع میں جوش پیدا ہو گیا کیونکہ ریلوے 2,47,752 میل سے جو 1900ء میں تھی پھیل کر 1914ء میں 34,656 میل ہو گئی تھی۔

---

70 - Marx, K. Articles on India. PP. 70-71

لیکن پہلی جنگ عظیم نے ایک دباؤ دینے والا اثر پیدا کیا۔ اور 21-1920ء میں ایک کمیٹی نے جس کے چیرمین ایشس ورتھ (Ackworth) تھے ریلوے کے انتظام کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں جانچ کی۔ اس کمیٹی کی خاص سفارشات یہ تھیں۔ (1) پرائیویٹ کمپنیوں کی ملکیت اور ان کے انتظام کو ختم کر کے ریلوے کو قومیالیا جائے (2) ریلوے بورڈ اور اس کے اختیارات میں توسیع کی جائے (3) عام پبلک مالیات سے ریلوے مالیات کو الگ کر دیا جائے۔

ان سفارشات پر گورنمنٹ کے عمل درآمد کا نتیجہ خوش حالی بھی ہوا اور ریلوے لائن وسیع ہو کر 42,000 میل تک پہونچ گئی۔ لیکن دنیا میں جو کساد بازاری پیدا ہوئی تھی اس کا اس پر بھی کئی سالوں تک اثر رہا۔ 1936ء میں وج وڈ Wedge Wood کمیٹی مقرر کی گئی تاکہ ریلوے کے روز مرہ کے کام کاج میں ترقی دی جائے اور اس کو ایک ٹھوس اور منافع بخش بنیاد پر قائم کیا جائے۔

جہاں تک کہ معاشی پہلو کا سوال ہے ترقی بہت جلد ہوئی اور دوسری جنگ عظیم تک جاری رہی لیکن اسٹاک جمع کرنے کے مسئلہ پر توجہ نہیں دی گئی۔

یہ پہلے ہی بتلایا جا چکا ہے کہ ریلوے کے نظام کا قیام برطانیہ کے مفاد کے مقصد سے عالم وجود میں لایا گیا تھا۔ ریلوے کی شرح آمدنی اس طرح مقرر کی گئی اس سے برطانیہ فائدہ اٹھا سکے۔ شروع کے زمانوں میں برطانوی کمپنیوں کا اصل مقصد منافع کمانا تھا۔ اس لیے چابکدستی سے شرحیں اس حساب سے رکھی گئی تھیں۔ کہ برطانیہ کے اندر تیار شدہ مال کی درآمد اور ہندوستان سے کچے مال کی برآمد دونوں میں بطانیہ نفع میں رہے۔ لیکن جہاں تک ہندوستان کے مفاد کا سوال تھا ان سے امتیاز برتا گیا۔ اور کچے مال کو جہاں سے اس کو سپلائی کے لیے لے جاتا تھا تیار کرنے کی جگہ تک لیجانے اور اسی طرح اس کے برعکس پر حد سے زیادہ چارج کیا جاتا تھا اور عذر یہ کیا جاتا تھا کہ تھوڑی دور مال لے جانے کے مقابلہ میں کہیں زیادہ خرچ پڑتا ہے۔ ان ہی اغراض کے راستہ کے سوک ٹوک دیلاک سسٹم کا طریقہ بھی بتایا گیا تھا۔ بندرگاہوں کو خصوصی مراعات دی جاتی تھیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ وہی بندرگاہ کل صنعتوں کا مرکز بن جاتا تھا۔ اور بندرگاہ کے باہر کا داخلی علاقہ نظر انداز ہو جاتا تھا اور وہاں صنعتوں کی ترقی میں دو کاوٹ پڑتی تھی۔

اگرچہ ریلوے کے نظام کا خاص مقصد تو ترک کر دیا گیا لیکن بعض ضمنی باتیں وجود میں آئیں جو بڑی اہمیت کی حامل تھیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ملک کی سالمیت میں ترقی ہوئی۔ بہت سے علاقے جو رسل و رسائل کے فقدان کے باعث ایک دوسرے سے قطعی بیگانہ تھے اب آپس میں مل گئے اور ایک ملک اور ایک قوم ہونے کا تخیل مضبوط ہوا۔ ریلوے کے سفر نے مختلف صوبوں کے آدمیوں کو ایک دوسرے سے ملنے

کے مواقع فراہم کیے اور اس بات کے بھی موقع فراہم کیے کہ ایک دوسرے پر اثر ڈال سکیں اس طرح اختلافات کے مٹنے اور آپس میں مل کر ایک ہو جانے کا سامان اکٹھا ہوا۔ سواری کی تیز رفتاری نے سماج میں بھی تیز رفتاری پیدا کی۔ جس نے قومی یک جہتی کے جذبہ کو فروغ دینے میں بڑی مدد کی۔

ریلوے نے پیداوار میں اضافہ کرنے کے جذبہ کو بھی ابھارا انہوں نے زراعت کو تجارتی بنانے میں مدد کی اور داخلی اور تجارت کو ترقی دی۔

(۷) پبلک مالیات

چونکہ پبلک مالیات کی نوعیت گورنمنٹ کی پالیسیوں انتظامی، سماجی اور اقتصادی کا ایک بڑی حد تک پتہ دیتی ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ گورنمنٹ آف انڈیا کے بجٹ پر اس غرض سے نگاہ ڈالی جائے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ صنعت کے بارے میں گورنمنٹ روپے پر وہ کیا روشنی ڈالتا ہے۔ بیسویں صدی کے پہلے بیس سالوں کا بجٹ اس معاملہ میں کچھ بھی کارآمد نہیں ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اس زمانہ میں گورنمنٹ کی پالیسی تجارت میں عدم مداخلت کی تھی۔ اور سوائے اس کے کہ اس پر کوئی بالواسطہ اثر پڑ جائے صنعت پر براہ راست اس کی کوئی توجہ ہی نہ تھی۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد حکمرانوں کے دماغ میں جہاں تک صنعت کے تحفظات کی توسیع کا سوال ہے ایک تبدیلی واقع ہوئی۔ لیکن زمانہ جنگ کے بجٹ 1920 - 21 سے 39-1938 کا مطالعہ کرنے سے حیرتناک حد تک اس معاملہ میں یکسانیت نظر آتی ہے۔ کہ کوئی قابل لحاظ رقم کی مد صنعت کی مدد کے لیے نہیں ہے۔ گورنمنٹ آف انڈیا اور صوبہ کی حکومتوں کے سالانہ محاصل اور اخراجات قریب قریب معمولی سی کچھ کمی بیشی سے 121.5 کروڑ تھے۔ صرف گورنمنٹ آف انڈیا کے محاصل 215.2 کروڑ اور اس کے اخراجات 142.8 کروڑ 22 - 1921 میں تھے جبکہ 39 - 1938 میں محاصل 121.07 اور اخراجات 211.07 کروڑ تھے۔ لیکن مرکزی حکومت اور صوبائی حکومتوں کو ملا کر صنعت پر صرف پچاس لاکھ سالانہ اوسطاً ان بیسویں سالوں میں 1935 کے آئین کے نفاذ سے قبل خرچ کے لیے رکھا جاتا تھا۔

مرکزی اور صوبائی دونوں کے خرچ کے لیے خاص مدات یہ تھے (۱) قرضہ جات کا سرکاری محکمہ (2) دفاع کا سرکاری محکمہ اور (3) سول انتظامات (ملکی نظم و نسق) 22-1921 میں 54.81 کروڑ کے خرچ میں سے تینوں پر ملا کر خرچ 130.06 کروڑ تھا یا تقریباً 80% فیصدی

39-1938 میں مرکزی حکومت کا کل خرچ بلا محاصل میں سے 121 کروڑ تھا جس میں سے قرضہ جات کے سرکاری ٹکڑ پر 14 دفاع کے محکمہ پر 52 کروڑ اور ملکی نظم ونسق پر 17 کروڑ یعنی مجموعی طور سے ان تینوں پر 83 کروڑ یا تقریباً 70% فیصدی تھا۔ جہاں تک قوم کی تعمیر کے کاموں کا سوال ہے تقریباً 24 لاکھ تعلیم پر 22 لاکھ طبی سہولتوں پر اور 14 لاکھ سے کچھ کم صحت عامہ پر یعنی کل کو ملا کر 60 لاکھ سے بھی کم 71 ۔ علاوہ ازیں چونکہ یہ تمام محکمے صوبائی فہرست میں تھے ان کے اخراجات کا اصل بوجھ صوبائی حکومتوں پر پڑتا تھا۔ 1935 کے ایکٹ کے مطابق صنعتوں کو صوبوں کے زیر انتظام منتقل کر دیا گیا۔ 40ء 1939 میں ان پر مجموعی خرچ قریب ایک کروڑ تھا۔

ان واقعات سے ظاہر ہے کہ اپنی حکومت کے آخری وقت تک برطانوی حکومت نے کوئی لائق ذکر کوشش ہندوستان کی صنعت کو ترقی دینے کے لیے نہیں کی۔ جبکہ گورنمنٹ آف انڈیا کا وزیر مالیات برابر شکایت کرتا رہتا تھا کہ محاصل بے لچک نہیں ہیں۔ اور برابر بجٹ میں خرچ کی آمدنی سے زیادتی کی شکایت بجٹ کے اوقات میں کیا کرتے تھے۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ پبلک مالیات کے دو ضروری اجزاء ہیں۔ (1) وہ کون سے طریقہ ہیں جن کو اختیار کر کے ملک کی دولت میں اضافہ کیا جا سکتا ہے تاکہ گورنمنٹ کے محاصل میں اضافہ ہو اور (2) کس طرح ان اخراجات میں جو نفع بخش نہیں ہیں کمی کی جائے۔ جبکہ یہی اخراجات ہندوستان کی معاشیات پر ایک بھاری بوجھ بنے ہوئے تھے۔ ہندوستان کے لیڈران جو ہندوستان کی صنعت کی ترقی کی ضرورت پر زور دیا کرتے تھے اور تنقید کیا کرتے تھے کہ فوج، ملکی نظم ونسق اور قرضہ جات کی مدات پر بہت زیادہ خرچ ہو رہا ہے ان کے تنقیدوں پر کان دھرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ اس طرح ایک مذموم چکر قائم ہو گیا۔ زراعت اور صنعت کی ترقی کے لیے کوئی رقم بچتی ہی نہ تھی اور بلا زراعت اور صنعت کی ترقی کے قومی دولت میں اضافہ ہو نہیں سکتا تھا اور اس لیے صنعتی نشوونما کے لیے کوئی سرمایہ تھا ہی نہیں۔

اقتصادی ترقی کے لیے گورنمنٹ نے جو تنگ نظرانہ پالیسیاں اختیار کر رکھی تھیں ان کے بارے میں ویرا اینسٹے (Vera Anstey) اپنی رائے ان الفاظ میں ظاہر کرتی ہے۔

"جہاں تک زراعت کا تعلق ہے (جس کے لیے گورنمنٹ نے دیگر اقتصادی مدات سے کہیں زیادہ کیا ہے) ان پر جو اخراجات گورنمنٹ نے فی کس بافی ایکڑ کیا ہے وہ دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں بہت کم

---

71 - The Statistical Abstracts 1938-39. PP. 302-306, and 308.

کم ہے جیسا کہ ذیل نقشہ میں دکھلایا گیا ہے۔

گورنمنٹ کا خرچ زراعت پر

	فی 1000 کی آبادی پر	مزروعہ آراضی کے 1000 ایکڑ پر
جرمنی	روپیہ	روپیہ
ممالک متحدہ امریکہ (1900)	945	705
ممالک متحدہ انگلستان (1919-1920)	1,020	210
پنجاب (1921)	960	1,380
(1921-22)	74	56

صنعت پر تو اس سے بھی کم خرچ ہوا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ گر زراعت، صنعت، صحت عامہ اور تعلیم پر زیادہ خرچ کیا جائے ان کے بارے میں اچھے اصول بنائے جائیں اور ان کا نظم و نسق عمدہ ہو تو وہ آخر جا کر مالی حیثیت سے زیادہ تعداد میں پیداوار بڑھانے کا بھی باعث ہوگا۔/72

VIII تجارت

بین الاقوامی تجارت قومی معیشت میں نہایت اہم حصہ ہے۔ بیرون ملک سے تجارت ایک ملک کی معیشت میں ایک نہایت اہم کام انجام دیتی ہے کیونکہ تجارت کے دو رخ ہوتے ہیں۔ داخلی اور خارجی۔ اندرونی معیشت اور پیداوار کی ترقی اس کی برآمد کی نوعیت اور اس کے فریق کار کو طے کر سکتی ہے یا بیرونی ملکوں کی مانگیں اندرونی معیشت کی ترقی کو طے کر سکتی ہیں۔ پہلی صورت ان ملکوں پر لاگو ہوتی ہے جن کو آزادی حاصل ہے اور اس لیے اپنے معاملات [illegible] نے کے خود ہی مختار ہیں۔ دوسری صورت ان ملکوں سے تعلق رکھتی ہے جن پر بیرونی لوگوں کا تسلط ہے اور جن کی اقتصادیات غالب طاقت کی ماتحت ہیں۔

ہندوستان دوسرے زمرے میں آتا تھا۔ ہندوستان کی بیرونی ملک کی تجارت اس کی زرعی معیشت پر زیادہ سے زیادہ منحصر تھی۔ اس کا خاص کام یہ تھا۔ ابتدائی ضرورت کی چیزیں یا کچا مال تیار

72 - Anstey, V op. cit. P. 461.

کرے۔ اس کی اس حیثیت میں بہت سے ممالک شریک تھے۔ بعض تو گرم ممالک تھے مثلاً ایشیا افریقہ اور لیٹن امریکہ۔ دوسرے یا تو یورپین ممالک تھے یا ان کی نوآبادیاں تھیں جو زیادہ تر منطقہ حارہ سے باہر واقع تھیں۔ ان میں سے زیادہ تر میں برطانیہ خاص برتاؤ کا فائدہ یا لوگوٹہ کے ذریعہ یا بحری ٹیکس کے ترجیحی اصولوں یا زیادہ مفید سیاسی اقرار ناموں سے اٹھاتا تھا۔

دوسرے زمرے کے ممالک کی خاص نوعیت یہ تھی کہ ان کا میعار زندگی بہت پست تھا وہ جو چیزیں برآمد کے لیے پیدا کرتے تھے وہ بیرون ملک کے کنٹرول میں ایسا کرتے تھے اور ان کے برآمد کی قیمت آبادی کے فی کس کے حساب سے نسبتہً قلیل تھی۔ وہ ممالک جو پہلے زمرے میں تھے وہ کم و بیش سیاسی اور اقتصادی حیثیت سے خود مختار تھے اور ان کا معیار زندگی بہت بلند اور ان کی برآمد سے آمدنی فی کس بہت زیادہ تھی۔ پہلے زمرے کے ملکوں کی بیرونی تجارت کو دوسری صف کے ملکوں سے کم خطرات کا سامنا تھا۔

ہندوستان جو دوسرے زمرے میں آتا تھا اس کی پوزیشن جہاں تک کہ برآمد کے فی کس قیمت کا سوال ہے سب سے کم تھی۔ کیونکہ اس زمرے میں قیمت 207 پرانے سونے کے ڈالر سے جو فرانسیسی غربی افریقہ میں تھی 64 ملایا میں ہو کر آپس میں بہت مختلف تھی دوسرے زمرے میں۔ یہ اختلاف ایسا تھا کہ یونان میں 76 ڈالر تو نیوزی لینڈ میں 98۔

ہندوستان کو یہ ناقابل رشک امتیاز حاصل تھا کہ اس کی فی کس قیمت 102 ڈالر تھی۔ یہ اعداد و شمار 1937ء کے ہیں۔ دونوں زمروں میں جو اختلاف ہے وہ ظاہر کرتا ہے کہ دوسرے زمرے کی قومی آمدنی فی کس زیادہ تھی۔ ہندوستان کے برآمد کی کم قیمت ہونے کی حالت یہ پتہ دیتی ہے کہ ہندوستان مال تیار کرنے والے ملکوں میں بہت پسماندہ تھا۔

اگرچہ ہندوستان جو مال ہندوستان کے باہر برآمد کرتا تھا ان کی فہرست کافی لمبی تھی لیکن وہ مال اس طرح کے تھے کہ جن کی قیمتوں میں بہت زیادہ اور جلد جلد کمی بیشی ہوتی رہتی تھی جس نے بیرون ملک کی تجارت کی ساخت کو قطعی غیر مستقل بنا دیا تھا۔

ہندوستان کی صنعت اور زراعت کی پسماندگی اور ان کے انجماد کی جزاً وجہ اس کی بیرونی تجارت کے اثرات تھے جو ملک کی پیداوار کی ہیئت ترکیبی کی شکل تیار کرتے تھے۔

بیرونی تجارت

1869ء میں نہر سوئز کے کھل جانے سے ہندوستان کی بیرونی تجارت میں غیر معمولی توسیع

ہوئی۔ 69-1868 میں یہ قریب 90 ملین پونڈ (یعنی 90 کروڑ روپیہ۔ ایک پونڈ۔ دس روپیہ) تھی لیکن 14-1913 بڑھ کر 200 ملین پونڈ (300 کروڑ روپیہ۔ ایک پونڈ۔ پندرہ روپیہ) ہوگئی 1929 کی عظیم کساد بازاری سے قبل یہ تعداد 400 ملین پونڈ (604 کروڑ روپیہ۔ ایک پونڈ۔ پندرہ روپیہ) تھی مندا بن نے تجارت پر خراب اثر ڈالا اور اسے گھٹا کر 200 ملین (321 کروڑ روپیہ۔ ایک پونڈ پندرہ روپیہ) کر دیا لیکن 47-1946 پورے طور پر معاملہ سدھر گیا تھا اور تجارت سو ملین پونڈ ہوگئی (608 کروڑ روپیہ۔ ایک پونڈ پندرہ روپیہ۔

تجارت کی قابل لحاظ حیثیتیں حسب ذیل تھیں۔

(1) برطانیہ سے جو مال ہندوستان میں درآمد ہوتا تھا وہ اس سے زیادہ تھا جو مال ہندوستان برطانیہ کو برآمد کرتا تھا۔

(2) بیرونی تجارت میں ایک سے زیادہ کے ساتھ کاروبار کے نظام کی نشوونما جس نے ہندستان کو اس لائق بنا دیا کہ برطانیہ سے درآمد کے اخراجات کی زیادتی کو برطانیہ کے علاوہ دوسرے ممالک کے برآمد کی آمدنی سے پورا کرے اول جنگ عظیم کے بعد یہ نظام درہم برہم ہوگیا جس کے بہت سے وجوہ تھے اور اس کی جگہ رفتہ رفتہ دو طرفہ نظام نے لے لی۔

(3) برآمد کی بچت کا مسلسل ریکارڈ جیسے تجارت کو موافق توازن کہا جا سکتا ہے اس نے ملک کے سرمایہ کو یک طرفہ منتقل کرنے کا طریقہ اس پہ تھوپ دیا۔

1870 سے 1939 تک (سوائے دو سالوں 21-1920 اور 22-1921 کے) برابر درآمد و برآمد سے مسلسل فاضل رہنا غیر معمولی ہے عام تبادلہ کے حالات میں درآمد و برآمد توازن چند سالوں کے اندر برابر ہونا چاہئے لیکن ہندوستان میں برابری کا توازن کبھی قائم ہی نہیں ہوا۔

ایک ملک سے دوسرے ملک کو اس کا سرمایہ یک طرفہ منتقل ہونا حسب ذیل وجوہ سے ہوتے ہیں۔

(1) ایک سیاسی خراج کی ادائیگی۔

(2) ان قرضہ جات کی مکمل ادائیگی جو جنگی قرضے ہوتے ہیں یا ان سرمایوں کی ادائیگی جو ترقیات کے لئے قرض لیے گئے ہوں۔

(3) گورنمنٹ بیرونی مالی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لیے مثلاً قرضہ جات ایقیمی،

ریلوے کی ضمانتوں وغیرہ کی ادائیگی ۔

(4) بڑے بڑے سامانوں کی درآمد کے اقوام کی ادائیگی جیسے کہ مشینری اور اور آئندہ کی ضرورت کے لیے ذخیرہ جمع کرنا ۔

اس طرح کے انتقالات تجارت کے شرائط کو اس ملک کے خلاف کر دیتے ہیں جو انتقال کرتا ہے اور اسکو اس بات پر مجبور کر دیتے ہیں کہ درآمد کی مقدار میں اور زیادہ اضافہ کرے ۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ "ہندوستان کی بیرونی ملک سے تجارت کی نشوونمانے کاشتکاروں پر ایک غیر متوازن بوجھ لا دیا۔ اور ان کو مجبور کر دیا کہ وہ فصلوں سے" جن سے آمدنی نہیں ہوتی تھی" جیسے کہ کپاس ۔ اس کا نامطلق واقعی شرائط پر تبادلہ کریں 73

اقتصادی آزادی کی نمو کے نقطہ نظر سے دو میلانات بہت قابل توجہ ہیں ۔ ان اشیاء میں جو تجارت کی بنیاد تھے اہم تبدیلی کی گئی ۔ 39-1938 اور 46-1945 کے درمیان درآمد و برآمد میں جو تبدیلی ہوئی وہ ذیل میں دکھلائی جارہی ہے /74

درآمد	1938-39	1945-46
غذا	15.7	9.3
کچا مال	21.7	48.5
تیار شدہ مال	60.8	40-6
برآمد		
غذا	34	22.5
کچا مال	45	26.5
تیار شدہ مال	29.7	46.0

ان اعداد و شمار سے یہ ثابت ہے کہ ملک کے تیار شدہ مال کی مقدار بڑھ رہی تھی لیکن ان سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ برطانوی حکومت کے آخری ایام تک بھی صنعتی برآمد پچاس فیصدی کے نشانہ تک نہیں پہنچی تھی /75

73 - Gangali : B. N. Reconstruction of India foreign Trade Chapter I.

74 - Jathar and Beri, op-cit, P. 174.

75 - Banerji, P. N. op-cit, P. 575.

تجارت کی راہیں

دوسرا میلان یہ تھا کہ تجارت کی راہ برابر بدلتی رہتی تھی۔ پہلی جنگ عظیم سے قبل ممالک متحدہ برطانیہ ہندوستان کو 63% فیصدی مال درآمد کراتا تھا اور بطور برآمد 25% فیصدی مال لیتا تھا۔ 40-1939ء میں ہندوستان میں برطانیہ سے درآمد کی مقدار گھٹ کر 25.2 فیصدی ہوگئی۔ لیکن ہندوستان سے برطانیہ کو برآمد کی مقدار بڑھ کر 35% فیصد ہوگئی۔ 46-1945ء میں اور بھی کمی عمل میں آئی۔ برطانیہ سے ہندوستان کو درآمد تو وہی 25% فیصدی رہی لیکن برطانیہ کو جو مال ہندوستان نے بھیجا وہ گھٹ کر 28% فیصدی رہ گیا۔ جن اشیاء کی درآمد میں کمی ہوئی وہ زیادہ تر روئی، سوتی کپڑے، لوہا اور فولاد کی مشینری، دھاتی مال اور کاغذ تھے۔ جہاں تک برآمد کا تعلق ہے چار، سن کے تیار شدہ مال، چمڑا، ادھوڑی کھال اور سروں میں اضافہ ہوا جبکہ غذائی اشیاء کی مقدار بہت گھٹ گئی۔ ہندوستان کی معیشت کا جو انحصار کلی برطانیہ پر تھا اس میں کمی نظر آ رہی تھی۔ دوسرے ممالک جیسے کہ جاپان اور ممالک متحدہ امریکہ برطانیہ سے کامیاب مقابلہ کر رہے تھے۔ اور اس اجارہ داری کی جڑوں کو ہلا رہے تھے۔ جبکہ ممالک متحدہ برطانیہ کی بیرونی ملک تجارت جو ہندوستان سے متعلق تھی مجموعی طور پر 40% فیصدی سے 30.8% فیصدی تک 39-1937ء میں تھی۔ جاپان کی اوسط 5.5% سے بڑھ کر 8.8% فیصدی اور ممالک متحدہ امریکہ کی 5.2% سے 11% فیصدی ہوگئی 76%۔ 46-1945ء میں ممالک متحدہ امریکہ کی پوزیشن ممالک متحدہ برطانیہ سے اس لحاظ سے قدرے بہتر تھی کہ کل کا 28% فیصد درآمد اور 20% فیصد برآمد تھی۔77

تجارت اور وطنی اخراجات کا توازن

اس تاریخ کی دوسری جلد میں یہ دکھلایا جا چکا ہے کہ عرصہ دراز تک برآمد کا درآمد سے زیادہ ہونا ہندوستان کی خارجہ تجارت کا ایک اہم کاشف تھا۔ خصوصیت کے ساتھ یہ حال اس تجارت

---

76 - Jathar, and Beri, op. cit. P.178.

77 - Ibid, P. 184.

کا تھا جو ہندوستان اور مملکت برطانیہ کے مابین تھی۔ اس میں دو قسم کی فہرستیں شامل تھیں۔ ایک فہرست تو وطنی اخراجات کی تھی، ذخیرے، قرضوں کی ادائیگی سالانہ رقوم کی ادائیگی پنیشن اور وہ اخراجات گورنمنٹ انڈیا آفس پر کرتی تھی۔ یہ سب تو خاص مدات پہلی فہرست کے تھے۔ دوسری فہرست میں ایسے مدات شامل تھے جو دکھلائی نہیں دے سکتے تھے۔ بنکوں انشورنش اور جہاز کے کمپنیوں کی ملازمتیں بیرون ملک میں مہم بازی کے منافع جیسے کہ کاشت سن سے سامان کی تیاری پرائیویٹ طور پر معانیاں وغیرہ۔

ان برآمد کے بعض مدات ان ادائیگیوں سے تعلق رکھتے تھے جو اس مال پر کیے گئے تھے جو ہندوستان کو ملے۔ اور دوسرے وہ سامان برآمد تھے جو غیر ضروری تھے۔ اور جن سے ہندوستان کو اس کے مساوی معاوضہ اہم یا غیر اہم نہیں ملتا تھا۔ 1913-14ء سے 1933-34ء تک کے وطن کے املاک واجب الوصول کی کل میزان ذیل کے نقشہ سے معلوم ہوگی۔ 78/

پونڈ	2,03,11,673	1913-14
پونڈ	2,36,29,495	1918-19
پونڈ	3,18,88,776	1924-25
پونڈ	3,15,58,715	1928-29
پونڈ	3,15,58,715	1929-30
پونڈ	2,88,62,177	1933-34

ان اعداد میں ذخیروں پر گورنمنٹ کے قرضہ جات کے ادا کرنے پر ریلوے اور آبپاشی کے کاموں پر جو ادائیگیاں ہوئیں وہ سب شامل ہیں۔ اور ملکی نظم و نسق اور فوج کی ملازمتوں پر جو خرچ ہوا اور فوج کے متعلق اخراجات جو بار شاہت کی جنگوں کے سلسلہ میں ہوئے وہ بھی شامل ہیں۔

ان کے علاوہ برآمد کی بحث میں جو چیزیں شامل تھیں وہ یہ تھیں (1) اس بیرونی سرمایے پر سود اور منافع جو ہندوستان میں گورنمنٹ کی مداخلت کے بغیر لگا ہوا تھا (2) بیرون ملک کے مالکان بینک، جہاز اور بیمہ کمپنیوں وغیرہ نے جو خدمات انجام دی تھیں ان کا معاوضہ مگر ان خدمات کا کوئی۔

---

78. Jather, G. B and Beri S. G. Indian Economics (8th Edi-tion) Vol II, P. 197.

ریکارڈ نہ تھا۔ ممالک متحدہ برطانیہ سے ہندستان کے درآمد و برآمد کا فرق بتدریج گھٹتا گیا جیسا کہ حسب ذیل اعداد سے معلوم ہوگا /79

1913-14	59 کروڑ
1929-30	36 کروڑ
1932-33	11 کروڑ
1933-34	کچھ نہیں
1936-37	16 کروڑ
1937-38	12 کروڑ

صرف تجارتی اشیاء میں ہندوستان کی کل تجارت میں ممالک متحدہ برطانیہ کا حصہ ذیل میں دیا ہوا ہے /80

	درآمد	برآمد	میزان
(۱) قبل جنگ اوسط (1909 ـ 14)	62.8	25.1	40.0
(2) زمانہ جنگ کا اوسط 1914-15 سے 1918-19 تک	56.5	31.2	41.2
(3) زمانہ جنگ کے بعد اوسط 1919-20 سے 1923-24	57.6	27.7	39.5
(4) 1938-39	30.5	34.3	32.5
(5) 1939-40	25.2	35.1	30.8

زمانہ جنگ کے حالات نرالے تھے اور ان پر استدلال نہیں کرنا چاہیئے۔

یہ ظاہر ہے کہ برطانیہ نے ہندوستان سے بیرونی ملک کی تجارت میں جو اجارہ داری تقریباً قائم کر لی تھی اور خاص کر درآمد میں جو بعد کے سالوں میں حاصل کی گئی اور پھر جب جاپان، ممالک متحدہ، امریکہ اور جرمنی نے تجارت کے اندر زبردستی مداخلت کی اور ایک کثرت تعداد کے اندر معاہدوں کا نظام بنایا اور اس طرح ہندوستان کو نیچے گرا کر مجبور کر دیا کہ وہ ممالک متحدہ برطانیہ پر اپنا نفع ا کرے۔
برآمد کی مسلسل بحث جو غیر ضروری اشیاء کے ایک بڑے حصہ کے برآمد پر مشتمل تھی اس نے

79- Ganguli, B.N. op-cit, P.
80- Jathar and Beri op-cit, P. 183.

ہندوستان کی معاشی ترقی کے لئے اس حد تک سرمایہ کی فراہمی کو کم کر دیا اور ممالک متحدہ برطانیہ کی معیشت کو فائدہ پہنچایا۔

یہ صحیح ہے کہ برآمد کی ترقی سے مجموعی طور پر زراعت میں بڑے پیمانہ پر سوداگری کی نشوونما ہوئی کاشت کی صنعتیں ابھریں۔ مثلاً چائے، قہوہ اور سن۔ اور معدنیات کی پیداوار میں اضافہ ہوا لیکن ان تمام مہم بازیوں سے جو منافع ہوتا تھا اس کا بہت بڑا حصہ برطانیہ ہڑپ کر لیتا تھا۔ اور بھاری صنعتوں کی ترقی میں یہ رکاوٹ کا باعث تھا۔

صرف اس وقت جبکہ بحری ٹیکس کی پالیسی بدلی اور صنعت کو امتیازی تحفظ دیا گیا تب ہی جا کر سوت اور سن کے علاوہ پارچہ بافی، لوہے اور فولاد کی معدنیات سیمنٹ اور شکر کی صنعتوں نے ترقی کرنی شروع کی۔ اور تجارت کے توازن کے مذموم اثرات کی قدرے تلافی ہوئی۔

اندرونی تجارت

اگرچہ ہندوستان کی بیرونی تجارت اہم ہے۔ اس کی اندرونی تجارت مقدار اور قیمت دونوں لحاظ سے اس سے زیادہ ہے۔ اقتصادی تحقیقاتی کمیٹی (Economic Inquiry Committee) کی رپورٹ کے مطابق[81] اگر ہندوستان کی زرعی پیداوار کو زیر نظر لایا جائے تو حساب کتاب ظاہر کرے گا کہ ہر ایک ایکڑ زمین کے بدلے جس میں ان اشیاء خوردونوش یا تلہن یا پٹسن وغیرہ کی کاشت بیرونی تجارت کے لیے کی جاتی ہے۔ گیارہ ایکڑ کی کاشت عام استعمال کی پیداوار کی ہوتی ہے۔ زرعی پیداوار کے علاوہ غیر زرعی پیداوار بھی ہیں۔ مثلاً معدنیات اور صنعتی کارخانوں کی تیار شدہ اشیاء جو تجارت کو بہت بڑھا دیتی ہیں۔

بدقسمتی سے تجارت کے اعداد و شمار اطمینان بخش حالت میں بالکل نہیں ہیں۔ 1923ء تک ملک کی خاص پیداوار کی اشیاء کے درآمد و برآمد کو گورنمنٹ نے ایک مکتوب "ہندوستان کی اندرونی تجارت (بندرگاہ ریل و دریا) (Indian Trade, Rail & River Borne)" میں شائع کیا جاتا تھا۔ لیکن اس میں اس تجارت کا کوئی ذکر نہیں ہے جو سڑکوں کے ذریعہ کی جاتی تھیں۔ اس کی اشاعت 1923ء بند ہو گئی۔ اور اس کے بعد 1933ء سے ایک نیا سلسلہ شروع کیا۔ "ہندوستان کی اندرونی

81- Economic Inquiry Committee Report, P.13.

تجارت (بذریعہ ریل ودریا) کے متعلق حسابات "Account Relating to the Inland
Trade by Rail & River borne) ہے۔ جو اعداد وشمار اس میں دیئے گئے ہیں وہ اشیاء کی مقدار اور اشیاء کی
قسم ظاہر کرتے ہیں لیکن قیمتیں درج نہیں ہیں ایسے نامکمل اعداد وشمار پر کسی نتیجہ کی بنیاد رکھنا مشکل ہے
لیکن اندرونی تجارت 1937 لغایتہ 1940ء کی مقدار کے متعلق جو اعداد دیئے گئے ہیں ان سے معلوم
ہوتا ہے کہ بعض اہم اشیاء میں بہت زیادہ اضافہ ہوا ہے جو ریلوے گورنمنٹ کے انتظام میں تھی۔
اس کی مجموعی آمدنی کا جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ 29-1928ء اور 44-1943ء میں آمدنی۔
1961 کروڑ سے بڑھ کر 49۔185 کروڑ ہوگئی /82

اندرونی تجارت کی بیرونی تجارت سے کیا نسبت تھی اس کا طے کرنا مشکل ہے۔ ایک اندازہ۔
2.5 کا ہے /83 بہر حال جو بھی مقدار ہوگی زیادہ ہی ہوگی۔ 29-1928ء میں بیرونی تجارت کا اندازہ
600 کروڑ کا ہے اگر یہ اندازہ کچھ بھی حقیقت کے قریب ہے تو اندرونی تجارت 1500 کروڑ سے کم نہ ہو
گی۔ اس لیے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ باربرداری کے ذرائع اور رسل ورسائل کی ترقی اور ریلوں کے
پھیلاؤ اور سڑکوں کی میلوں کے اضافہ نے مال کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کو بہت زیادہ
متحرک کر دیا۔

صنعتیت اور سماجی تبدیلی

صنعتی ترقی نے کس طرح ہندوستان کے سماجی نظام پر اثر ڈالا؟ اس کے دو قابل لحاظ نتائج
ہوئے ایک تو یہ تھا کہ اس نے صنعتی مزدوروں کے ایک طبقہ کو جنم دیا۔ اس بات کے شروع میں
یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ انیسویں صدی میں ہندوستان کے اندر صنعتی مزدوروں کی حالت اس سے بہتر نہ
تھی جو انگلستان کے صنعتی مزدوروں کی صنعتی انقلاب سے قبل تھی۔ زیادہ گھنٹوں تک کام حقیر
اجرت غیر صحت مند اور پرہجوم مکانات کی رہائش اور عورتوں اور بچوں کو انسانیت کو غلامی
میں رکھنا۔

ہندوستان میں صنعتی مزدوری کا کام کرنے کیلئے کثرت سے ہجوم ہیں۔ مزدور تھے جو مزدور کہ۔

82- Jathar and Beri op. cit, Vol. II, P. 198.
83- Ibid, P. 199

فیکٹریوں معدنیات اور کوئلہ کی کانوں میں کام کرتے تھے ان کی ایک تعداد پہلے اپنے تعلقات گاؤں سے قائم رکھے ہوئے تھی اس کے بعد ایک واقعی صنعتی مزدوروں کا طبقہ ابھرا جو شہروں میں اور کوئلہ کے علاقوں کے قریب بس گیا۔

فیکٹریوں میں جو مزدور کام پر لگے تھے ان کی تعداد جو 1902ء میں 5,42,000 تھی اس سے بڑھ کر 1947ء میں 22,75,000 ہو گئی یعنی تقریباً چار گنا۔ لیکن تمام صنعتیں نظر میں رکھنے پر پتہ چلتا ہے کہ صنعتوں میں جو مزدور کام کرتے تھے ان کی جو نسبت کل کام کرنے والوں سے یا کل آبادی سے تھی وہ گھٹ گئی تھی۔

صنعتی مزدوروں کی تعداد نسبتاً کم تھی جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ زرعی آبادی کے فاضل کام کرنے والوں کو صنعت ایک متبادل ہمیشہ مہیا نہیں کرتی تھی۔ 1921ء اور 1945ء کے درمیان کا نرخ کا انڈکس ظاہر کرتا ہے کہ تھوک دام چڑھ گئے۔ 179ء (کلکتہ) اور 198ء (بمبئی) سے 289ء (کلکتہ) اور 219 (بمبئی 1942ء)۔ لیکن روزانہ کی مزدوری کا 1926ء تا 1942ء تک کا انڈکس یہ بتلاتا ہے کہ جھریا کے کوئلے کی کان میں 100ء سے گھٹ کر 72 اور ممالک متوسط میں مینگنیز کی کانوں میں 86 ہو گئی۔84/ 1900-1938ء کے درمیان ہندوستان کے اندر کل ہند انڈکس نیچے دیا جاتا ہے جس سے مصارف زندگی اور روپیہ کی کمائی اور واقعی کمائی کا پتہ چلے گا۔85/

سال	مصارف زندگی	روپیہ کی کمائی	واقعی کمائی
1900	100	100	100
1900-1909	97	107	111
1910-1919	143	135	98
1920-1929	207	211	103
1930-1938	147	184	129

84- Subramaniam and Homfrey op-cit. PP. 76-77.

85- Wadia and Merchant. op-cit. P. 495.

اگرچہ ان اعداد و شمار کو بالکل قابلِ اعتماد نہیں مانا جاسکتا۔ اس لیے ان کی بنیاد پر جو نتائج نکالے جائیں وہ وہ یقینی نہیں ہوسکتے پھر بھی وہ ظاہر کرنے میں مفید ہیں کہ رجحان کیا تھا۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ نقدی مزدوری بڑھنے کی جانب مائل تھی اور واقعی اجرت کا اگر مصارف زندگی سے مقابلہ کیا جائے تو وہ گھٹنے کی طرف جارہی تھی۔ اس قسم کے حالات کے اثرات مصارف زندگی۔ مثلاً قوت بخش غذا، صحت، رہائش، مکان، مزدوری کے شرائط۔ پر کیا ہوں گے ان کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا کھانے پینے کے ناکافی ہونے کا عظیم اثر پیداوار پر پڑتا ہے ضرورت سے کم خوراک ضرورت سے کم کپڑا۔ خراب رہائش گاہ کے ساتھ ہندوستانی آبادی کا ایک کثیر حصہ ایک سست اور فرسودہ زندگی گذارتا ہے۔ نسلاً بعد نسلٍ جسمانی طاقت گھٹتی جاتی ہے اور جیسے جیسے جسمانی طاقت گھٹتی ہے ان کی اخلاقی قوت بھی روز بروز کمزور ہوتی جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مزدور کی کام کرنے کی اہلیت جس پر پیداوار کا انحصار ہے بتدریج تیزی کے ساتھ گھٹنے کی جانب مائل رہتی ہے" / 86

قومی آمدنی

اقتصادیات کے تین عناصر یعنی زراعت، صنعت اور تجارت کی ترقیات کا جائزہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ برطانوی حکومت میں مختلف اطراف میں ارتقا ہوا یعنی اونچے طبقہ کے لوگ ترقی کر گیے اور عوام الناس کے حالات پست ہوتے گیے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ قومی دولت اور دونوں طبقوں میں اس کی تقسیم سے جو برطانیہ کی حکومت کے دو سو سال کے اندر ہوئی۔ مندرجہ بالا بات کو ثابت کیا جاسکے کیونکہ اگر کسی قدر صحت کے ساتھ یہ کیا جاسکے تو اس حکومت کے کیا معاشی نتائج ہوئے ان کا مظاہرہ اس سے بہتر طریق پر نہیں ہوسکتا۔

بد قسمتی سے علم تحقیق کے اصول سے دولت اور آمدنی کے حساب میں بالکل صحیح اعداد حاصل کرنا حساب کرنے والے کی گرفت میں نہیں آتا ہے پہلے سو سالوں میں (1857 - 1957) اعداد و شمار کا اس درجہ فقدان ہے کہ صرف قیاس آرائی ممکن ہے۔ انیسویں صدی کے دوسرے نصف حصہ میں واقعات کی معلومات میں کچھ ترقی ہوئی ہے۔ لیکن پھر بھی یہ اس درجہ کافی نہیں ہے کہ اس سے قابل اعتماد نتائج نکالے جاسکیں۔ البتہ اس زمانہ میں قومی آمدنی کے چند اندازے موجود ہیں مثلاً دادابھائی

---

86 - Banerji. P.N. op-cit. P. 209.

نیر دجی کا اندازہ 78-1876/ کا ولیم ڈگبی کا 1882 اور 1899/ کا اور ایف جے ایٹکنسن ۔۔۔
(F. J. Atkinson) 1875/ اور 1895/ کا۔ یہ اندازے ناقص تھے ۔ بیسویں صدی میں حالت بہتر ہوئی ۔ اعداد و شمار زیادہ بھی ملتے ہیں اور قابل اعتماد بھی ۔

لیکن اس زمانہ کے اعداد و شمار بھی اتنے زیادہ نہیں ہیں جتنے کی ضرورت ہے کیونکہ ان میں خلا اور غیر یقینیت ہے اور اس لیے ان میں بھی قیاس ہی کی گنجائش ہے ۔

اعداد و شمار کے علاوہ فنی اصطلاحات نتائج اخذ کرنے کے قواعد اور ان کو مرتب کرنے کے ضابطے مختلف ہیں ۔ کیونکہ قومی دولت اور بچت کا حساب لگانے کے مختلف نقطہ نظر ہیں کچھ لوگ تو معاشیات کے مختلف معاملات کے راس المال سرمایہ پر اپنے اندازے کا انحصار کرتے ہیں اور کچھ دوسرے لوگ اس کو بہتر سمجھتے ہیں کہ قومی مصارف پر نتائج کو مبنی کیا جائے اور کچھ ایسے بھی ہیں جو آمدنی پر حساب لگاتے ہیں جو حصہ داروں سے تعلق رکھتی ہے ۔ علاوہ ازیں دو یا دو سے زائد طریقوں کا امتزاج بھی ملتا ہے ۔

نتیجہ یہ ہے کہ نہ صرف مختلف ماہرین اقتصادیات کے اندازے ایک ہی سال کے بارے میں مختلف ہوتے ہیں بلکہ جب وہ کئی سالوں کا حساب لگاتے ہیں تو ان کے طریقوں میں بھی فرق ہوتا ہے اس لیے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ایسے ترقی یافتہ ممالک جیسے کہ ممالک متحدہ برطانیہ ہے وہاں بھی یہ اختلاف اعداد و شمار کے معاملہ میں مختلف ہوتے ہیں مثلاً برطانیہ 1814/ کے بارے میں تین اندازے حسب ذیل ہیں ۔

سر ال۔ جی چوزامنی	Sir L. G. Chiozzamoney	16,000 پونڈ
مسٹر کریے مانڈ	Mr. Edgar Crammond	16,400 پونڈ
سر جوسیا اسٹامپ	Sir Josiah Stamp	16,300 پونڈ

مسٹر مکرجی 87/ نے تقریباً چالیس اندازوں کی فہرست تیار کی ہے لیکن کوئی دو بھی یکساں نہیں ہیں ۔ ان میں سے پہلی لارڈ کرزن کی بجٹ کی تقریر میں شامل ہے اور پورے ہندستان کے متعلق ہے ۔ دوسرے حسابات ہندوستانی اور انگریز مصنفین کے 1901 لغایت 50-1949/

87- Mukherji. M. A preliminary Study of the Growth of National Income in India 1857-1957. in Asian Studies in Income and wealth (1965) PP. 82-83.

کی بابت ہیں اور اس سے بالکل مختلف کہانی بیان کرتے ہیں اور ایک دوسرے سے مختلف ہیں مثلاً 1911 کے لیے تین اندازوں میں 989 کروڑ روپیہ تو ایف اے ہارن (F.A. Horn) کا ہے اور 1920 کروڑ جی ایف شراس (Shirras G.F.) کا اور 1935 کروڑ (12 - 1911 کے لیے) بالکرشن کا۔ ان میں جانچ کرنے والوں کے نزدیک فی کس آمدنی سالانہ 178 روپیہ 339 روپیہ اور 81 روپیہ ہے (49-1948 کے نرخ ناموں کے مطابق) سر بی این سرما (Sir. B.N. Sharma) نے 1911 کے لیے 86 روپیہ کا ذکر، 1921 میں کونسل آف اسٹیٹ کے اندر کیا ہے۔

49-1948 کے لیے دو اندازے ہیں یعنی ایک تو گورنمنٹ آف انڈیا کے محکمہ کامرس (تجارت) کی طرف سے اور دوسری قومی آمدنی کمیٹی (National Income Committee) کی آخری رپورٹ جو گورنمنٹ آف انڈیا نے 1949 میں مقرر کی تھی۔ وہ انڈیا یونین کے مطابق ہیں یعنی برما اور پاکستان کے ماسوا ہندوستان۔ قومی آمدنی کے اعداد 7059 کروڑ روپیہ اور 8,650 روپیہ ہیں اور انفرادی آمدنی کے اعداد 297 روپیہ اور 247 روپیہ ہیں۔

بعید اوقات کی آمدنی کا اندازہ کرنے میں ایک سخت مشکل اس واقعہ سے پڑتی ہے کہ مسٹر مکرجی نے جو فہرست تیار کی وہ کنایہ والے اندازے ہیں یعنی ان کا تعلق ایک سال سے ہے اور چونکہ مختلف حساب کرنے والوں کے حساب کرنے کے طریقوں میں اختلاف کی وجہ سے وہ کئی سالوں کی آمدنیوں کو ملانے سے جو کمی پیدا ہوتی ہے اسے دور کرکے چارٹ تیار نہیں ہو سکتا۔

ان مشکلات کی وجہ سے اس کا بالیقین بیان کرنا ممکن نہیں ہے کہ قومی آمدنی کس رخ پر چل رہی تھی۔ چند مصنفین نے جو سال بہ سال کے اندازے لگائے ہیں وہ ذیل کی فہرست میں درج ہیں۔ اور وہ اس کی مثال پیش کرینگے۔ 88/

سال	پٹیل	نرورا	کے مکرجی
1905-6 — 1915-16	100	100	100

88- Mukherji, K. A Note on the Long Term Growth of National Income in India 1900-01 to 1952-53, See Vol II vide Bhatt V.V. Aspects of Economic Change and Policy in India 1800-1960 (1963)

سال	پٹیل	اودرا	کے کرجی
1916-17 — 1925-26	1,03.9	125	110
1926-27 — 1935-36	98.3	132	112
1936-37 — 1945-46	91.1	138	112

جبکہ اوروا اور آئنگر 38% فیصدی کا اضافہ تقریباً اتنے ہی سالوں میں بتاتے ہیں کرجی اس سے کم کی ترقی سست رفتاری کے ساتھ بتلاتے ہیں اور پٹیل کے قول کے مطابق آمدنی 06-1905 — 46-1945 کے اندر گرتی جارہی تھی۔

کے کرجی نے جو نتائج برآمد کیے ہیں ان کو بھٹ (Bhatt) نے قابل اعتراض قرار دیا ہے۔ بھٹ کی دلیل یہ ہے کہ کرجی نے پیشوں، خانگی ملازمتوں، مکانات کی جائداد دوسری قسم کی تجارتوں اور چھوٹی چھوٹی کمائی کی کوششوں کی آمدنیوں کی نشوونما کا اندازہ زیادہ کیا ہے اور اگر وہ اصلیت سے زائد اندازہ جو انھوں نے کیا ہے۔ اسے تسلیم کرلیا جائے تو فی کس آمدنی کی شرح کی ترقی اس سے بہت کم ہوجائے گی 89/

ایک نتیجہ جو بالکل بدیہی ہے وہ یہ ہے کہ اگر 49-1948 کے نرخ کو معیار قرار دے دیا جائے اور کرزن کے زمانہ (1901) نیشنل انکم کمیٹی کی پہلی رپورٹ 51-1950 کے لیے یکساں مانی جائے تو یہ پتہ چلے گا کہ فی کس آمدنی میں اگرچہ 89 (بالکرشن 12-1911) اور 339 (جی۔ ایف شراس 1911) کے درمیان بہت اختلاف ہے لیکن یہ تو طے ہی ہوجائیگا کہ بہت کم تھی۔ یہ ثابت کرنا مشکل نہیں ہے کہ بالکرشن اور شراس نے جو اعداد و شمار پیش کیے ہیں وہ مبالغہ آمیز ہیں۔

اگر ان اندازوں سے قطع نظر بھی کرلیا جائے تب بھی میلانات کے بارے میں شکوک رفع نہ ہوں گے۔ کالن کلارک (Colin Clark) جیسے عظیم ماہر اقتصادیات فی کس واقعی سالانہ آمدنی پر 40-1939 کے نرخ کے لحاظ سے نظر ڈالتے ہوئے اس نتیجہ پر پہونچا ہے کہ 40-1939 اور 48-1947 کے درمیان تقریباً مسلسل یہ آمدنی گرتی رہی ہے 40-1939 میں یہ آمدنی 200 OU تھی اور 48-1947 میں 185 OU/ 90

89- Bhatt: V.V. op. cit, S. P. 2.

90- Clark, Colin, The Condition of Economic progress (1960) P. 203, C. Calculation based on the Computations of eastern economist and R.C. Desai; -I.U. Stand for the international Unit O.U. for Orient Unit.

کلارک کل حالات کا اختصار یوں بیان کرتا ہے۔

"یہ معلوم ہوتا ہے کہ انیسویں صدی کی ایک بہت بڑی بستی نے ابھر کر واقعی آمدنی فی کس 1831 تک تیزی سے بڑھی۔ لیکن اس کے بعد اس سطح کو قائم رکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکی ہے"/91

اس کا نقشہ 4/4 (XIV) ظاہر کرتا ہے کہ 32-1931 اور 40-1939 میں وہ 218 او۔یو (O.U) سے گھٹ کر 200 او۔یو (O.U) رہ گیا تھا۔ لیکن اس کے قبل کے سالوں یعنی 1868 تا 39-1931 میں فی کس آمدنی 103 سے بڑھ کر 218 ہو گئی تھی (دیکھئے نقشہ V/4)

انیسویں صدی میں کمی کی وجہ یہ ہے کہ اٹھارہویں صدی کی ابتدا سے انیسویں صدی کے وسط تک ہندوستان ایک حد درجہ خیز جنگ، اخراج اور خون خرابہ کے دور سے گذرا اور اقتصادی پیداوار میں عظیم کمی آئی۔/92

پچھلی صدیوں کے بارے میں وہ دریافت کرتا ہے کہ "کیا انیسویں صدی کے لیے یہ بہت گری ہوئی کہی جا سکتی ہے جبکہ پہلے سے یہی حال رہا ہے" اور جواب دیتا ہے کہ "بہت کافی زیادہ رہی ہے اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔"/93

او۔یو کے پیمانہ پر سلطنت مغلیہ کے زمانہ کی اوسط ماہانہ آمدنی اور حکومت برطانیہ کے زمانہ کی مندرجہ ذیل نقشہ سے ظاہر ہوگی/94

	اکبر	جہانگیر	1895	1953
غیر ہنر مند کھیتی کا مزدور	67	87	24	48
چپکیدار۔ شہر کا مزدور	101	131	32	55
بڑھئی	203	262	57	82
ماہر اونچے کاریگر۔	236	284	78	97
سب سے اونچا محلوں کا اسٹاف		400		

91- See Clark, op-cit Chapter II. Ibid, PP. 204-05.

92- Ibid, P. 206.

93- Ibid, P. 205-6.

94- Ibid, P. 207.

آر۔ سی ڈیسائی کے حساب کے مطابق صارفین کا فی کس خرچ 39 - 838ء کے نرخ اشیاء سے لگانے پر معلوم ہوگا کہ نرخ 3.6 روپیہ کم ہوگیا یعنی 49.5 سے گھٹ کر 46.3 1931-32 اور 1940-41ء کے مابین آگیا۔/95 جو نتائج انہوں نے اخذ کیے وہ یہ تھے (1) یہ اغلب ہے کہ فی کس آمدنی بڑھ نہیں رہی تھی۔ (2) "سب سے زیادہ سنگین بات تو یہ تھی کہ غذا کا صرف گھٹ رہا تھا اور اور یہ صورت حال اس سے بھی بدتر تھی جس کا تصور مالتھوس (Malthus) نے پیش کیا ہے"/96

یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ ہندوستان کی فی کس آمدنی کی بابت جو نتیجہ اخذ کیا گیا ہے اس کا مقابلہ ٹیکس کے قابل مجموعی آمدنی کی فی کس رقم سے اسے ایک نشاندھی کرنے والا عدد سمجھ کر کیا جائے۔ زمانہ کے حالات، نرخ اور ٹیکسوں کی حد بندیوں کی کمی بیشی وغیرہ کو ترتیب دینے کے بعد بیسٹ کرتا ہے کہ "ہر ٹیکس دہندہ کی مجموعی آمدنی 1886-90ء اور 1938-41ء کے مابین کی اس سے زیادہ 1886 - 90ء اور 43-1938ء میں تقریباً 65 فیصدی کم ہوگئی"/97 وہ اس نتیجہ پر پہونچے گا کہ "یہ بالکل ممکن ہے ہر ٹیکس دہندہ کی مجموعی آمدنی میں کمی اس وجہ سے ہوئی ہو کہ ہر شخص کی آمدنی میں کمی ہوگئی تھی"/98

موجودہ غرض کے لیے بہر حال اسے مان لینا چاہئے کہ بٹیل اور بھٹ جس نتیجہ پر پہونچے وہ غلط ہے اور آخری اندازہ جو مکرجی نے دیا ہے وہ شاید صحیح ہونے کے زیادہ قریب ہے اور یہ کہ نو سال کے پرائے طرف فی کس آمدنی 99ء سے بڑھ کر 255 (مطابق نرخ 1947-49ء) 1896-1904ء اور 1948-49ء کی طویل مدت میں ہوگئی۔ لیکن یہ بات تو مکرجی بھی تسلیم کرتے ہیں کہ بیسویں صدی کی پہلی چوتھائی پر فی کس آمدنی بڑھ گئی تھی اور اس کے بعد دوسری جنگ عظیم تک وہ ٹھہری رہی اور اس کے بعد گر گئی۔ ان کے الفاظ یہ ہیں "مجموعی طور پر ہم کو نصف صدی تک تو معمولی سی زیادتی نظر آتی ہے لیکن اس کے بعد نشو و نما بھر انجماد اور پھر معمولی سی گراوٹ دکھلائی دیتی۔"

95- Desai, R.C. Standard of Living in India and Pakistan (1953) P. 284

96- Ibid. P. 285-6.

97- Bhatt. K.V., op-cit. P. 260 and Table 3 (PP. 21-22).

98- Ibid. P. 27.

ہے۔/99

اگر آمدنی میں زیادتی کے بارے میں مکرجی کے نتائج تسلیم بھی کر لیے جائیں تب بھی برطانوی راج میں ہندوستان کی حالت کتنی دردناک تھی۔ اس کا اندازہ اسی زمانہ کے دوسرے ملکوں سے مقابلہ کرنے سے ہوگا۔ کالن کلارک (Colin Clark) کا نقشہ 19 (XIX)/100 ظاہر کرتا ہے کہ ہندوستان کی واقعی آمدنی فی کس سالانہ او۔یو (I.U.) کے پیمانہ سے 1950 میں 100 اور 150 او۔یو (I.U.) کے درمیان تھی۔ دوسرے ملکوں کے اعداد کے جو حساب لیے گئے ہیں حسب ذیل ہیں۔

افریقہ کے تمام ملکوں کا حساب لگانے کے بعد سات ایسے ہیں جن کی آمدنی فی کس او۔یو (I.U.) 150 سے کم ہے۔ دو 100 اور 150 کے بیچ میں ہیں اور آٹھ 200 کے اوپر ہیں یعنی شمالی وسطی اور جنوبی امریکہ میں صرف ہیتی (Haiti) ایسا ہے جس کی آمدنی 200 او۔یو (I.U.) سے کم ہے۔ یورپ میں کوئی ملک ایسا نہیں ہے۔ صرف ایک اوشیانا یعنی برٹش اوشیانا اور نیو ہیبرائیڈیز (New Hebrides)۔ ایشیا میں چار ممالک کی فی کس آمدنی 150 کی سطح سے کم ہے چار ملک تو 150 سے 200 کی صف میں ہیں اور دس 200 او۔یو (I.U.) کی حد کے اوپر ہیں۔ اس طرح ساٹھ ممالک جن کی فہرست تیار کی گئی ہے میں سے صرف چودہ ایسے ہیں جن کی آمدنی ہندوستان سے کم ہے۔ سات تو اسی صف میں ہیں اور بقیہ 39 ہندوستان سے اوپر۔

اس سے بھی زیادہ وضاحت نقشہ 7 (VII) سے ہوتی ہے جس میں دنیا کی اصلی آمدنی تجارتی مال تیار کرنے کی حد سے ملین آئی۔یو (I.U.) میں دکھائی گئی ہے۔

1905 سے 1948 تک ہندوستان کی پیداوار 293 سے بڑھ کر 876 ہو گئی یعنی 300% فیصدی بڑھی۔ جاپان کی 1905 سے ابتدا جنگ عظیم دوم تک 393 سے بڑھ کر 2,835 یعنی 826% فیصدی بڑھ گئی۔ آسٹریلیا کی 1905 سے 1948 کے درمیان 150 سے 1,020 یعنی 680 فیصدی بڑھ گئی اور کناڈا کی 1905 سے 1948 تک 947 سے بڑھ کر 2794 یعنی 562 فیصدی ہو گئی۔

مجموعی آمدنی اور فی کس آمدنی سے زیادہ اہم اقتصادیات کے مختلف شعبوں میں دولت کی

99- Mukherjee. M. in Asian Studies in Income and Wealth (1965) P. 101.

100- Clark, Colin. op. cit. Table XXI to face P. 257.

تقسیم کیا ہے۔ یعنی زراعت، صنعت، تجارت اور ملازمتوں میں۔ بدقسمتی سے اس کا جائزہ قومی دولت کے اندازے کے جائزے سے بھی مشکل ہے لیکن پھر بھی یہ ظاہر ہے کہ اس معاملہ پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے تاکہ تحریک آزادی کو خاص انداز میں سمجھا جاسکے۔

انڈیا یونین یعنی باستثنا پاکستان کی آبادی 1901ء سے 1941ء تک 235.5 ملین سے بڑھ کر 316.3 ملین ہو گئی۔ مزدوروں کی تعداد اسی زمانہ میں 117.2 ملین سے بڑھ کر 128.4 ملین ہو گئی۔ وہ زراعت اور غیر زراعت حلقوں میں حسب ذیل نسبت سے تھے۔

1901	37.6	42.4
1941	69.6	30.4

زرعی مزدوروں کی واقعی تعداد 73.1 ملین سے بڑھ کر 89.4 ملین ہو گئی لیکن غیر زرعی مزدوروں کی تعداد 43.5 سے گھٹ کر 37.7 ملین ہو گئی۔ زرعی مزدور کے ماحصل کی قیمت فی مزدور 105 سے گھٹ کر 103 اور فی کس مجموعی آمدنی 20 سے 15 ہو گئی۔ اگر یہ اعداد و شمار صحیح ہیں تو ان سے صاف ظاہر ہے کہ اقتصادیات کے خاص شعبہ یعنی زراعت میں بلاشبہ تنزل کی جانب قدم اٹھ رہا تھا/101/۔ اس نتیجہ کی حقیقت کو ظاہر کرنے کیلئے تائیدی شہادت پر غور کیا جاسکتا ہے۔

شعبۂ زراعت

اس عہد میں انسان اور زمین کے موازنہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فی کس رقبہ گھٹا۔ 1890ء اور 1940ء کے درمیان جبکہ ہندوستان (بشمول پاکستان) کی آبادی 285.3 ملین 1901ء سے بڑھ کر 379 ملین 1941ء ہو گئی یعنی تقریباً 36% کا اضافہ ہوا۔ مجموعی مزروعہ رقبہ 201.2 ملین ایکڑ سے بڑھ کر 206.6 ملین ایکڑ 37-1936ء تا 46-1945ء یعنی بمشکل 2.5 فیصدی سے بھی کم بڑھا۔/102/

101- The Figures are taken from the article of Sinha. J.N. "Demographic trends" in Singh. V.B. op-cit and Davis. Kingsley. op-cit.

102- Blyn. G. op-cit. P. 129.

فصلوں کی پیداوار (غذائی) کا انڈکس ظاہر کرتا ہے کہ 1983-84 سے 1395-96 تک 100 سے گھٹ کر 1906-7 لغایت 1915-16 میں 99 اور 1936-37 لغایت 1945-46 میں 93 ہو گیا۔ 103 تاجرانہ اغراض کی پیداوار اسی زمانہ میں 100 سے بڑھ کر 122 ہو گئی اور پھر 185 تک گئی اور مجموعی پیداوار 100 سے 104 ہوئی اور پھر 110 تک گئی۔ اس طرح فصلوں کی پیداوار مجموعی طور پر دس فیصدی بڑھی بہ مقابلہ اضافہ آبادی کے 37 فیصدی بڑھی۔ اور غذائی پیداوار بہت پیچھے رہ گئی درحقیقت غذائی پیداوار کے ماحاصل میں فی کس 29% فیصدی کمی۔ 1911 سے 1941 تک ہوئی یعنی 0.4 فیصدی فی سال 104 لیکن غیر زرعی پیداوار مجموعی طور پر بڑھی جس نے کسی حد تک غذائی پیداوار کی کمی کی تلافی کر دی۔ اس طرح برٹش انڈیا میں 1911-47 کے وقفہ میں فی کس تمام فصلوں کی پیداوار کی مجموعی آمدنی میں 0.72 فیصدی کی کمی ہوئی ہے 105

جب مجموعی آمدنی کے اعداد و شمار پر غور کیا جائے اور اس کے ساتھ اس پر بھی غور کیا جائے کہ زرعی طبقہ میں مزدوروں کی تعداد میں کتنا اضافہ ہوا اور کس مقدار میں غلہ کی پیداوار ہوئی تب جا کر اس کا صحیح پتہ چلے گا کہ اس آبادی کی کیا حالت تھی جو زراعت کے پیشہ میں لگی ہوئی تھی۔

ہندوستان کے (باستثناء پاکستان) کام کرنے والوں کی تعداد 1901 اور 1941 کے اندر 117.2 ملین سے بڑھ کر 122.4 ملین ہو گئی۔ یعنی 5.2 ملین یا 4.4% کا اضافہ ہوا۔ اور جو لوگ کھیتوں میں کام کرتے تھے ان کی تعداد 73.3 ملین سے بڑھ کر 84.9 ملین ہو گئی یعنی 11.6 ملین یا تقریباً 16% فیصدی (جو کہ) کھیت کے اندر کام کرنے والے مزدوروں کی نسبت کل مزدوروں کے مقابلہ میں 49.4 سے 69.6 تک تھی یعنی قریب 11% فیصدی اور مزروعہ رقبہ 174 ملین سے بڑھ کر 201 ملین ہو گیا یعنی 1901-02 سے 1941-42 کے درمیان 16% فیصدی کا اضافہ ہوا۔ 106

یہ رقبہ غذائی اور غیر غذائی کی پیداوار میں بٹا ہوا تھا 1901-02 میں 146 ملین ایکڑ زمین غذائی

---

103. Ibid. P. 29.

104. Ibid. P. 102

105. Ibid

106. Ibid. PP. 316-17 (Appendix 4C) and PP. 349-350.

پیداوار کے لیے 28 ملین غیر غذائی پیداوار کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ 42-1941 میں رقبہ بڑھ کر 162 ملین غذائی پیداوار اور 38.6 ملین غیر غذائی پیداوار کے لیے ہو گیا۔

اس طرح اگرچہ مزروعہ رقبہ میں گیارہ فیصدی کا اضافہ ہوا اور جو کچھ پیدا ہوتا تھا اس کی قیمت کی 6,1391 ملین سے بڑھ کر 7317 ملین روپیہ ہو گئی یعنی بارہ فیصدی کا اضافہ ہوا لیکن دوسری جانب غیر غذائی پیداوار کا رقبہ ٪36.7 فیصدی سے بھی زائد بڑھ گیا اور کل پیداوار کی قیمت 2,184 ملین سے بڑھ کر 3,411 ملین روپیہ ہو گئی یعنی ٪56 فیصدی اضافہ ہوا۔

اگرچہ تمام فصلوں کے لیے استعمال ہونے والی زمینوں کا رقبہ 174 ملین ایکڑ سے بڑھ کر 201 ملین ہو گیا۔ یعنی ٪16 فیصدی کا اضافہ ہوا لیکن کل پیداوار کی قیمت 8383 ملین روپیے بڑھ کر صرف 10,279 ملین ہوئی یعنی صرف 12.4 فیصدی کا اضافہ ہوا۔ 107

غذائی پیداوار اور کل پیداوار کو ملا کر جو بھی پیدا ہوتا تھا وہ آبادی کے اضافے سے مناسبت نہیں رکھتا تھا۔ خواہ اس لحاظ سے اس پر غور کیا جائے کہ کل مزدوروں کی تعداد کیا تھی یا یہ دیکھا جائے کہ زرعی مزدور کتنے تھے یا یہ دیکھا جائے کہ ان کی تعداد کیا تھی جو کھیتوں میں کام کرتے تھے اور نسبتاً وہ بہت زیادہ تھے۔ تمام فصلوں کی پیداوار قیمت میں آبادی کے ہر کس کی ٪15 فیصدی تھے اور غذا کے اعتبار سے ٪85 فیصدی گھٹی۔ 108

یہ اعداد و شمار اس نتیجہ پر مہر تصدیق ثبت کرتے ہیں جو ہندوستان کے باشندوں کی اکثریت کی معیشت کے بارے میں کیا گیا ہے۔ یعنی یہ کہ جن کی روزی کا دار و مدار زراعت پر تھا ان کی حالت بیسویں صدی کے آخری نصف حصہ میں روز بروز ابتر ہوتی جارہی تھی یا کم سے کم ترقی نہیں کر رہی تھی۔

غیر زرعی شعبہ

دوسری جانب غیر زرعی شعبہ کی جو تصویر سامنے آتی ہے وہ اتنی مایوس کن نہیں ہے حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ صدی کی پہلی چوتھائی میں صنعت کی ترقی کی رفتار کم ہوئی تھی لیکن دوسری چوتھائی میں

107- Ibid.

108- Singh. V.B. op-cit. p. 116

یہ کچھ تیزی سے چلی۔ یہ ماننے کے بعد کہ قومی سرمایہ میں زرعی شعبہ جو حصہ ادا کرتا تھا وہ ایک ہی جگہ جما ہوا تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے تھا کہ کم ہوتا جا رہا تھا لیکن پھر بھی مجموعی سرمایہ بڑھا تھا خواہ کسی قدر آہستہ آہستہ رہا ہو اس لازمی نتیجہ پر پہنچنا ہوگا کہ یہ جو اضافہ ہوا وہ غیر زرعی شعبہ کی آمدنی سے ہوا۔ خاص کر صنعت، تجارت اور نقل و حمل کے بہتر انتظام سے۔ ڈیوس کہتا ہے کہ "یہ معلوم ہوتا ہے کہ کل مجموعی آمدنی میں اضافہ غالباً کسی حد تک صنعتیت کی ترقی، تجارت کی نشو و نما اور تقسیم کے بہتر طریقوں سے ہوا ہے۔/109"

بہت سی علامتیں ایسی ہیں جن سے اس نتیجہ کی توثیق ہوتی ہے۔ اول تو شہریت کی ترقی بذات خود اس بات کا ثبوت ہے۔ صنعت میں ترقی ہوئی۔ ہندوستان کے شہروں کی آبادی 1901 میں 10.1 فیصد کا تھی لیکن 1911 میں یہ گر کر 9.4 ہو گئی تھی۔ لیکن 1941 تک 5000 سے زیادہ آبادی کے شہروں میں آبادی بڑھ 12.8 فیصدی ہو گئی تھی۔ یہ زیادتی تمام قسم کے شہروں میں ہوئی تھی جن کی آبادی 5000 سے زائد یعنی 5000، 10,000، 25,000 یا 100,000 یا اس سے بھی زیادہ بسنے والوں کی ہو۔ یہ جو شہروں کی آبادی میں اضافہ ہوا وہ اتنا قدرتی وجود سے نہ تھا۔ جتنا کہ گاؤں سے ترک وطن کر کے شہروں میں جا کر آباد ہونے کی وجہ سے تھا۔ کیونکہ یہ کشش تھی کہ گاؤں سے بہتر اجرت شہروں میں ملے گی جیسا کہ حسب ذیل نقشہ سے ظاہر ہوگا۔/110

صنعتیت کی ترقی کا ثبوت، کچے مال اور تیار شدہ مال کے درآمد و برآمد سے فراہم ہوتا ہے جس کا نقشہ ذیل میں دیا جاتا ہے۔/111

1914 سے پہلے		1960 - 61	
درآمد	برآمد	درآمد	برآمد

109- Davis, K. op. cit. P. 212.

110 - Ibid. Chapter 15.

111- Ibid. P. 213.

کی تعداد میں کمی کر دی اور جب ٹیکس سے مستثنیٰ ہونے والوں کی حد گھٹا کر ۴۷-۱۹۴۶ء میں 3,000 کی آمدنی تک کے لوگ ٹیکس سے بری کر دیئے گئے تو ٹیکس دہندگان کی تعداد گھٹ کر 12,98,000 رہ گئی۔ بہر حال مجموعی سالانہ آمدنی جو ٹیکس کے قابل تھی وہ 1902-1896ء میں تو 3.3 کروڑ تھی لیکن ۴۷-۱۹۴۶ء میں بڑھ کر 72.6 کروڑ ہو گئی۔[113]

دولت پیدا کرنے والے شعبوں میں آمدنی کی تقسیم کے طریقہ کار میں امتیازی سلوک برتنے کا ایک اور ثبوت ہے۔ جو اس حساب نشاندہی کرتا ہے کہ اگر ہر سال کی آمدنی کی مقدار اور اس سال اس قدر مجموعی آمدنی ہوئی تو تعداد آمدنی اور میزان کل دونوں سے ثابت ہوگا کہ اوپر کے درجوں میں اضافہ زیادہ ہوا ہے بہ نسبت نیچے کے درجوں کے جیسا کہ حسب ذیل نقشہ سے ظاہر ہوگا۔

ہر سال کی آمدنی کی سطح	تعداد ذریعہ آمدنی (1938)	تعداد رقوم (1948)	میزان کل (1938)	میزان اکل (1948)
			روپیہ ملین کے حساب سے	
1 تک 4,999	182,234	2616,182	805	118
2، 5,000 سے 9999 تک	55,038	112,763	222	798
3 10,000 سے 14999 تک	16,913	38,692	151	471
4 15,000 سے 24999 تک	10,691	25,902	141	495
5 25,000 سے 49999 تک	5,622	15,2261	115	607
6 50,000 سے 99999 تک	1,091	4,922	10	376
7 100,000 سے اوپر تک	436	2452	91	594

یہ کوئی بعید از قیاس نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ مختلف سطحوں میں جو اضافہ ہوا ہے وہ زراعت میں ترقی کے باعث نہیں ہوا ہے بلکہ صنعت اور تجارت کی آمدنیوں سے ہوا ہے۔[114]

113. Batt. V.V. op-cit. PP. 21-22.
114- Wadia and Merchant, op-cit. P 752.

مال تیار کرنے والے ذرائع کی پیداوار میں جو اضافہ ہوا ہے وہ بطور ثبوت زیادہ مدد دیتا ہے۔
کالن کلارک نے ایک نقشہ دنیا کی خالص آمدنی کا (186 اور 1953 یامیں) تیار کیا ہے جو مال
تیار کرنے والے ذرائع سے ہوئی وہ ہندوستان کے لیے اعداد ملین آئی۔یو (I.U.) میں دیتا ہے
اس نے جو پانچ سال کی اوسط نکالی ہے اس میں دکھلایا ہے کہ 1815 سے 1900 تک 186
ملین آئی۔یو (I.U.) 1948 میں 836 آئی۔یو (I.U.) آمدنی تھی اور 1925 لغایتہ 1929 کو بنیاد
قرار دے کر 509 ملین آئی۔یو (I.U.) اوسط سالانہ خالص آمدنی ظاہر کی ہے۔

یہ تمام اعداد و شمار اس نتیجہ کی تائید کرتے ہیں جو اوپر ذکر کیا گیا ہے یعنی یہ کہ (۱) زراعت کی پیداوار
کی قیمت کے حساب سے فی کس آمدنی گھٹ رہی تھی۔ اس کے نتائج یہ تھے کہ ہندوستان کی آبادی
کی کثیر تعداد انیسویں صدی کے پہلے نصف میں بتدریج مفلس ہوتی جا رہی تھی اور ایک قلیل تعداد
جس کی روزی کا انحصار صنعت، تجارت یا ملازمت پر تھا وہ آمدنی کی زیادتی سے لطف اندوز ہو رہے
تھے۔ صرف ان کی فی کس آمدنی ہی نہیں بڑھ رہی تھی۔ ان کی تعداد میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔

یہ صورت حال سیاسی جدوجہد کے لیے بڑی اہمیت رکھتی تھی۔ انیسویں صدی کے آخر تک عوام
الناس ظاہری اکثریت اور مفلس۔ اور تخلیقی اقلیت دونوں دو الگ دنیا میں بسے تھے۔ لیکن صدی
کے اختتام کے قریب دونوں ایک دوسرے کے قریب آنے لگے تھے۔ عوام الناس اپنے مصائب
کے بوجھ کے نیچے کراہتے ہوئے بھوک خوف اور غلامی سے پناہ کی راہ ڈھونڈھ رہے تھے اور
طبقات کو عوام الناس کی حمایت کی ضرورت تھی تاکہ شکایتوں۔ یعنی وہ پالیسیاں جو صنعت
کی ترقی میں حائل تھیں ہندوستانیوں کو اونچی ملازمتیں حاصل کرنے میں مانع تھیں اور سلف
گورنمنٹ کی جانب قدم اٹھانے میں ذرا بھی دلچسپی ظاہر نہیں کرتی تھیں۔ ان کو دور کرنے کے
لیے تھی۔ متوسط طبقہ نے اپنی تعداد اور تموّل میں اضافہ کے باعث اپنا اثر اپنے ابنائے ملک میں وسیع
ترکیا۔ شہروں میں بھی اور دیہاتوں میں بھی۔ قومی یک جہتی کو مضبوط بنانے کی طرف قدم بڑھایا۔
اور رائے عامہ کی طاقت کی تعمیر کرنے اور اسکو مستعد جاری رکھنے کے لیے ایک آلہ کے طور پر

115-Clark Colin, op-cit Table VII facing P.335. I.U. is defined as the quantity of goods exchangeable in USA for 1 Dollar average of the decade 1925-34 (P.18).

منظم کرنے میں لگ گئے۔

انڈکس اے (A) ملحقہ الف

خاص اشیاء کی درآمد کی مقدار

درآمد	1913 -14	1918 -19	1928 -29	1934 -35	1945 -46
روئی					
کچی روئی (1,000 ٹن)	12	2	36	61	861
سوت اور بٹا ہوا (ملین پونڈ)	41	34	50	34	123
پارچے (ملین گز)	2616	1810	1752	943	3
لوہے اور فولاد سے تیار شدہ سامان (1,000 ٹن)	908	423	992	370	48
شکر (1,000 ٹن)	634	472	798	223	35
معدنیات کے تیل (ملین گیلن)	90	82	209	201	1131

(1) Anstey Vera: The Economic Development of India P.534. and Statistical Abstract for the year 1949, PP. 1658-53.

انڈکس بی (B) ملحقہ ب

خاص اشیاء جو درآمد ہوئیں ان کی قیمت

درآمد	1913 -14	1918 -19	1928 -29	1934 -35	1945 -46
روئی	5470	5,283	7,299	2,704	2,303

لوہا اور فولاد	1,248	1,011	1,907	6.58	162
				اس میں معدنیات بھی شامل ہے	
شکر	1217	1,476	1,637	211	.038
معدنیات کا تیل	3.94	4.83	1,014	6.16	7.85

(1) Anstey Vera. op-cit. p. 534. and Statistical Abstract for the year 1949. PP. 1658-59.

اینڈکس سی (C) ملحقہ سی

خاص اشیاء کی برآمد (1)

اشیاء	1913-14	1918-19	1928-29	1934-35	1945-46
روئی کچی (1,000 ٹن)	430	391	610	615	136
سوت اور بٹا ہوا	192	129	31	12	15
کپڑے ایک لاکھ گز	90	156	71	57	457
سن	764	464	768	752	338
غلہ، دال اور آٹا	4,411	3,141	2,967	1765	55
تلہن (ایک ہزار ٹن)	1,453	708	1,191	875	394
چا (ٹن 1,000,000)	266	322	347	324	356
کچا چمڑا، کھال اور پکا چمڑا (ٹن 1,000)	50	57	56	40	33
دھات اور اسکی بنی ہوئی چیزیں (ٹن 1,000)	52	72	593	631	30
کچی دھات (ٹن 1,000)	619	485	679	515	462

(1) Ansky, Vera, op. cit. P 536 and Statistical Abstract for the year 1949. PP. 167-73

اینڈکس ڈی (۵) (ملحقہ د)

خاص اشیاء برآمد کی قیمت

(۱) (لاکھ روپیوں میں)

اشیاء	1913-14	1918-19	1928-29	1934-35	1945-46
روئی	4,468	4,525	81,16	3,764	4,532
سن	4,245	5,299	8,622	3,234	1,534
غلہ، دال اور آٹا	4,581	3,741	4,179	1,184	2,048
تمباکو	2,436	1,217	2,763	1,954	1,235
چائے	1,306	1,754	2,972	2,013	3,482
کچا اور پکا ہوا چمڑا	1,460	1,707	1,602	861	835
لاکھ	220	257	711	330	421
دھات اور دھات کی بنی ہوئی چیزیں	54	82	637	319	14
اون اور اونی چیزیں	294	410	534	219	519
کچا مال	114	189	253	272	312
افیون	936	216	181	7	2
تیل (معدنیات اور ترکاریوں کا)	91	187	155	55	17

(1) Ansky Vera, Op. cit, P. 536 and Statistical Abstract for the year 1949, PP. 167-73.

چوتھا باب

فلسفیانہ پس منظر

تمہید دو جماعتوں کے درمیان جن میں ایک حاکم اور دوسری محکوم اور تابع ہو مخالفت کا ہونا قطعی فطری اور ناگزیر ہے۔ خصوصاً جب کہ حاکم جماعت غیر ملکی ہو۔ حاکموں کی پالیسی اور طرزِ عمل سے مخالفت میں کمی بیشی تو ممکن ہے لیکن مکمل طور پر یہ شے ختم نہیں ہو سکتی ہے۔ افراد یا جماعت کا طرزِ عمل بھی اس فطری اور لاینفک تعلق پر خواہ وہ کتنی ہی کم یا زیادہ مدت سے چلا آ رہا ہو بہت زیادہ اثر انداز نہیں ہوتا۔ یہ مخالفت تو دونوں جماعتوں کے یا تو باہم مل کر ایک ہو جانے یا کسی ایک کے خاتمہ پر ہی ختم ہوتی ہے۔ ہندوستان اور انگلینڈ کے معاملہ میں پہلی بات تو قطعی ناممکن تھی اور برطانوی حکومت کی برطرفی کے علاوہ کوئی چارہ کار ہی نہیں تھا۔

بیسویں صدی کی آمد پر یہ عداوت کچھ کم ہو گئی تھی لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا یہ مخالفت آشکارا، گہری اور شدید ہوتی گئی۔ برطانوی حکومت پر ہندوستان کا دباؤ اور بھی شدید اور جارحانہ ہو گیا اور دوسری طرف برطانوی حکومت کی قوتِ مدافعت کم سے کم ہوتی گئی علاوہ ازیں عالمی حالات بھی اس سلسلہ میں ہندوستان کے معاون ثابت ہوئے۔

جیسا کہ پچھلے باب میں بتایا جا چکا ہے کہ ان پچاس برسوں میں مملکت برطانیہ روز مرہ تنزل کی طرف مائل تھی حتی کہ عالمی حکومت کے نقطۂ عروج سے گر کر مختصر سے انگلینڈ تک محدود ہو گئی تھی اور انھیں دنوں برطانوی حکومت کے مختلف حصے مثلاً نو آبادیات اور دیگر مقبوضات برتر و اعلیٰ ہمسری اور بے قابو آزادی کی طرف بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ ہندوستان جو انگریزی عملداری کا سب سے بڑا، سب سے زیادہ آباد اور سب سے قیمتی حصہ تھا اپنی آزادی کے لئے بے تاب و بے قرار ہو رہا تھا

ہندوستان میں انیسویں صدی میں ہونے والے سماجی، معاشی، سیاسی اور تصوراتی انقلابات کے چند نتائج بہت حیرت انگیز تھے۔ سماجی اختلافات اگرچہ کم ہو گئے تھے لیکن فرقہ وارانہ تعلقات اور بھی بدتر ہو چکے تھے۔ مختلف طبقوں کا ڈھانچہ جو مختلف طبقات میں مختلف تھا اگر گہری نظر سے نہ دیکھا جائے تو یکسانیت کی طرف مائل نظر آتا ہے۔ امرا کا پرانا حکمراں طبقہ فنا ہو گیا تھا یا بالکل ناکارہ کر دیا گیا تھا۔ یہ شاہی طبقہ کچھ بڑی ریاستوں مثلاً حیدرآباد اور کشمیر اور چند چھوٹی چھوٹی ریاستوں مثل کاٹھیاواڑ میں بہت خستہ حالت میں باقی رہ گیا تھا اور قطعی طور پر فرماں روا حکومت کے تابع تھا۔

لاکھوں گاؤں میں رہنے والے لاکھوں افراد نہ صرف یہ کہ سیاسی بے حسی کا شکار تھے بلکہ ذہنی طور پر مکمل مفلوج ہو کر رہ گئے تھے۔ افلاس اور بیماری کے شکنجے میں جکڑے ہوئے تھے اور سرکاری افسروں، زمینداروں اور مہاجنوں کے مظالم کے بری طرح شکار تھے۔

متوسط طبقہ جو برطانوی حکومت کا پروردہ تھا زیادہ تر تین طبقوں میں منقسم تھا۔ زرعی، صنعتی اور پیشہ ور طبقہ۔ ان تین طبقوں میں بھی بہت سے درجات تھے لیکن یہی متوسط طبقہ ہندوستانی سماج کا متحرک تھا۔ تھا ان تینوں درجات کے افراد کے کچھ ذاتی مفادات تھے اور ان کی نفسیاتی اور مادّی ضرورتوں کے سبب ان میں قومی بیداری اور حب الوطنی کا جذبہ بھی پیدا ہو گیا تھا۔ یہ درمیانی طبقہ نہ تو کوئی نسلی فرقہ یا جماعت تھا اور نہ ہی کسی قسم کے رسمی قوانین کا پابند تھا لیکن اس طبقے کے لوگ ذات، برادری کے قوانین کا پاس و لحاظ کرتے تھے اور یہی لحاظ ان کی وطن سے وفاداری میں مزاحم ہو جاتا تھا۔

قرونِ وسطیٰ کی ذمہ داری نئے متوسط طبقے کے کندھوں پر پڑی تھی اور قدرتاً اسی طبقے نے آزادی کی مہم کی قیادت بھی کی۔ اس تمام بحث سے یہ بتانا مقصود ہے کہ انیسویں صدی میں خصوصاً صدی کے آخری نصف میں برطانیہ بے پناہ مضبوط شہنشاہیت کی حامی قوت بن گیا تھا جس کی اصل بنیاد اس کا صنعتی نظام تھا۔ اور اس کی اقتصادی پالیسیاں برطانیہ کی ملوکیت پسندانہ ضرورتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے بنائی جاتی تھیں۔ اگرچہ ہندوستان جیسے علاقوں پر ان پالیسیوں کو لاد کر برطانوی حکومت کو زیادہ کامیابی نہیں ملی۔ لیکن ان پالیسیوں سے بڑی بے غیرتی کے ساتھ نوآبادیاتی اور ہندوستان کو لوٹا کھسوٹا گیا۔ ہندوستان میں نوآبادی کو مدنظر رکھ کر معاشی تنظیم بنائی گئی جس کا انجام کار ایک بے توازن، متنازعہ، تجارتی پالیسی کا ارتقا ہوا۔

ان سب کا انجام یہ ہوا کہ زرعی پیشے سے متعلق عوام میں افلاس بڑھنے لگا۔ جس سے زمینداروں میں اکثریت ہندوؤں کی تھی اور ان کے کاشتکار زیادہ تر مسلمان تھے وہاں پر جھگڑے فرقہ وارانہ فساد کی شکل اختیار کر گئے زمینداروں اور مسلمانوں کے تناسب کی بنیاد پر کم و بیش ہر جگہ ان جھگڑوں کا نتیجہ فرقہ وارانہ فسادات کی صورت میں ظاہر ہوا۔

سرکاری پالیسیوں کے ساتھ ساتھ کچھ دیگر اسباب مثلاً ملازمتوں کے لئے مسابقت معاشی اور تعلیمی ناہمواری، تہذیبی اور مذہبی اختلافات، الغو اور مہمل خوف و دہشت، حسد، تشویش اور رہنماؤں کی کوتاہ فہمی، تکبر اور بےجا بدظنی یا حسن ظن نے فرقہ وارانہ فسادات اور جھگڑوں کو اور بھی ہوا دی۔

اگرچہ یہ اختلافات خلاف معمول نہیں تھے کیوں کہ دوسرے ممالک میں بھی اس طرح کے اختلافات کا وجود تھا لیکن ہندوستان میں ایک تیسری اور بیرونی پارٹی کے وجود نے جو کہ بے پناہ طاقت و ہتھیاروں سے لیس تھی ان اختلافات کو بڑھانے میں جلتی پر تیل کا کام کیا اور مختلف فرقوں کی ملی یکجہتی کے درمیان ہمیشہ دیوار بنی رہی۔

سیاسی طور پر ایک بنیادی تغیر پیدا ہو گیا۔ قرون وسطی کا سیاسی نظام اور نظریات جن پر وہ قائم تھا کلی طور پر مفقود ہو گئے۔ محدود حکومتوں کے رسوم جو کہ آبائی فرمانرواؤں نے پالی تھیں مکمل طور پر بھلادی گئیں قبیلے گروہ اور خاندان جو سیاسی اعتبار سے نہایت اہم تھے اور جنہوں نے بیرونی حملوں اور فتوحات کے دوران اور اندرونی جھگڑوں اور فسادات کے تباہ کن و مخدوش حالات میں ملک کی یکجہتی اور طاقت کی برقراری میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ وہ اپنا وجود اور قوت عمل کھو چکے تھے۔

جیسے جیسے سیاست کے عرض و طول میں وسعت آئی اس کے ساتھ ساتھ قدیم سماجی اور مذہبی اختلافات نے بھی سیاسیات کے میدان پر حملہ کر دیا۔ ملوکیت پرستانہ منصوبوں نے ان اختلافات کو اور بھی بڑھایا۔

فکر اور تہذیب کی دنیا میں مغربی تمدن بہت زیادہ گھر کرنے لگا اور اس کے نتائج مختلف حلقوں میں مختلف ہوئے۔ بہت باتعلیم سے مزین افراد سائنسی اور تنقیدی نظریہ کے حامی ہو گئے لیکن انہوں نے ان خیالات کو مختلف مقاصد کے حصول میں استعمال کیا۔ زیادہ تر ہندوستانی فلسفیوں نے تو ہندوستان کے بنیادی اصولوں جو روحانیت اور مشاہدۂ ذات پر مبنی تھے۔ اور مغربی مادی نظریات کے درمیان تعلق کرانے کی کوشش کی۔ ان کی اس کوشش کو سراہا گیا کیوں کہ مغربی طریقہ کار کے سبب سائنس صنعت و حرفت دولت اور طاقت میں جو ترقی ہوئی ہے وہ ناقابل فراموش حقیقت ہے۔

اس میدان میں بھی یکساں تبدیلی نہیں تھی۔ تعلیم یافتہ افراد میں بھی تدریس کے مختلف درجات تھے۔ کچھ ہندوستانی فلسفی، سائنس داں اور ادیب تو مغربی نمائندوں کے حامی تھے لیکن زیادہ تر تعلیم یافتہ افراد جن میں یونیورسٹی ٹرینڈ افراد بھی شامل تھے بس سطحی طور پر ہی مغربی تہذیب کی حمایت کرتے تھے جو دوہرا پارٹ ادا کر رہے تھے۔ یعنی گھروں میں تو اپنی روایات کے پابند رہتے تھے۔ اور مجلس عام میں مغربی تہذیب کے علم بردار بن جاتے تھے۔

بدقسمتی یہ تھی کہ ہندوستان کا بڑا طبقہ غیر تعلیم یافتہ تھا اور وہ مشکل سے ہی اپنے روایتی ماحول سے باہر نکل پاتا تھا اور ان لوگوں کا کردار پرانی رسومات، اوہام پرستی اور خوش اعتقادی کے زیر اثر رہتا تھا۔ اس لئے انھیں بڑی آسانی سے جذبات کے دھارے میں بہا کر کچھ بھی کام نکالا جاسکتا تھا

حکام کے دماغوں میں بھی غلط تصورات کا عمل دخل تھا برطانوی یا انگریزی الاصل اپنے آپ کو سفید باشندوں کا عطر اور بنی نوع انسان میں سب سے زیادہ خصوصیت کا حامل خیال کرتے تھے۔ یہ لوگ ہندستان کے کالے آدمیوں کو اپنے سے کمتر نسل کا ' کمتر عقل و دانش کا، کمتر عملی لیاقت کا اور حکومت خود اختیاری کے فن میں بہت کمتر خیال کرتے تھے۔

ان کا یہ خیال تھا کہ ہندستان میں اس قدر فرقے، مذاہب، زبانیں اور تہذیبیں پائی جاتی ہیں کہ یہاں پر کسی متحدہ قومیت NATION کا قیام ناممکن ہے اور اسی اختلاف کی بنیاد پر انھوں نے یہ نتیجہ اخذ کرلیا تھا کہ ہندستانی عوام کے لئے خود اختیاری حکومت کا تصور بھی ناممکن ہے اور یہ ضروری ہے کہ انگریز ہندستان پر حکمراں رہیں۔ وہ یہ سوچتے تھے کہ تعلیم یافتہ ہندستانی ایک حقیر جانور کے مانند ہیں۔ وہ ہندو جو سیاسی ذہن رکھتے تھے وہ انگریزوں کے لئے وبال جان اور باغی تھے خواہ کھلے ہوئے ہوں یا چھپے ہوئے۔

مسلمان اگرچہ انگریزوں سے کمتر سمجھے جاتے تھے لیکن ہندوؤں کے مقابلہ میں انھیں برتری حاصل تھی۔ اور چونکہ مسلمان ہندوؤں کی اکثریت سے خائف رہتے تھے اس لئے حاکموں سے وفاداری میں انھوں نے اپنا تحفظ تلاش کرلیا تھا اور اسی وجہ سے وہ مراعاتی رویہ کے لائق سمجھے جاتے تھے۔

فرقہ وارانہ رجحان کے مخالف ہندو رہنما نامذہبی قومیت پروری پر اعتماد رکھتے تھے ایک متحدہ ہندستان اور ایک ہندستانی قومیت میں ان کا یقین تھا۔ انھیں یقین تھا کہ زبان مذہب اور رسم و رواج کا اختلاف سیاسی معاملات میں بے معنی ہے اور ان کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ کوئی

وجہ نہیں جو اقلیتیں اپنے عقائد، اپنی تہذیب اور اپنے طریق عبادت کے معاملات میں اکثریت سے کسی قسم کا خوف کھائیں۔ دونوں کے مفادات یکساں ہیں۔ سیاسی و اقتصادی۔ ان کا یہ خیال تھا کہ خصوصی حقوق، تناسب سے زیادہ حق نمائندگی اور جداگانہ رائے دہندگی کا قوم کی بنیادی سالمیت کو منتشر کرنے اور قوم کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی جانب قدرتی رجحان ہے انھوں نے مسلمانوں کی جائز پریشانی کو جو انھیں اپنے مستقبل کے بارے میں تھی مناسب اندازہ نہیں کیا تھا۔ کیوں کہ انہوں نے بیرونی ممالک کی اقلیتوں کے مسائل کا مطالعہ نہیں کیا تھا۔ اور نہ ہی انجمن بین الاقوام کے مقرر کردہ اقلیتی کمیشن کی رپورٹ پر ہی کوئی توجہ دی تھی اس لئے انہوں نے اقلیتوں کے مسائل کو کبھی کبھی وہ اہمیت نہیں دی جس کے وہ مستحق تھے۔

فرقہ پرست ذہنیت کے حامی اور تنگ نظر ہندو رہنماؤں کا نظریہ قطعی بے کار ثابت ہو چکا تھا وہ بغیر کسی وجہ کے مسلمانوں سے اتنے ہی خائف تھے جتنے خود مسلمان ہندوؤں سے تھے۔ ماضی کے عکس تھے جو محض ان کے تصور کی پیداوار تھا اور جس کا واسطہ حقیقت سے برائے نام ہی تھا۔ انھیں اس قدر خوف زدہ کر دیا تھا کہ دونوں کے درمیان عمل اور ردِ عمل نے برائیوں کا ایک نہ ختم ہونے والا مذموم سلسلہ بنا دیا تھا۔

مسلمانوں کا ذہن بھی عجیب ہیجانی کیفیت میں مبتلا تھا ایک مدت تک سرکار کے غیر مناسب رویہ اور مخالفت کے سبب ان کے ذہنوں میں مظلومیت کے احساس سما گئے تھے۔ وہ خود کو سب سے الگ تھلگ اور کم قیمت سمجھنے لگے تھے لیکن اس کے باوجود بھی ماضی کے دورِ خلافت کی شان و شوکت، اسلامی حکومت کی وسعت، آرٹ، سائنس اور ادبی محاذ پر حیرت ناک ترقی کے خواب رکھتے تھے تھے۔ وہ ایک مرتبہ ہندستان کے بڑے حصہ پر حکمراں رہ چکے تھے۔ اس لئے فطری طور پر اس کے مشتاق تھے کہ انھیں ابھرتے ہوئے ہندستان میں ایک اہم پارٹ ادا کرنے کا موقعہ ملے۔ وہ قدرتی طور پر کسی بڑی قوت کے سہارے کے متلاشی تھے تاکہ ترقی اور طاقت کی طرف بڑھنے کے لئے راہیں درخشاں ہو جائیں۔ ہندوؤں نے تعلیم، ملازمتوں اور دیگر پیشوں میں جو ترقی کی تھی اس سے حسد ان کے دلوں میں سما گیا تھا اور اسی خوف و حسد کے زیر اثر وہ ہر وقت خوف زدہ رہتے تھے کہ ہندو اکثریت انھیں کسی موقعہ پر کچل کر نہ رکھ دے۔ جب بدظنی اور جوش و ہیجان ذہن پر سکہ جما لیتے ہیں تو عقل و دلائل کی ایک نہیں چلتی پھر بھی سیاست کے قدم احساسات و جذبات سے قطعی نہیں ڈگمگاتے۔ جذبات اور حالات

کے طوفان کا مقابلہ کرنا اور ان پر فتح پانا ہی سیاست دانی ہے۔

تیسری پارٹی نے ان اوہام اور خوف زدگیوں کو اور زیادہ بڑھایا۔ انھوں نے مسلمانوں کی تاریخی اہمیت اور مختلف مفادات کو تسلیم کرکے ان کے اختلافی میلان اور رجحان کو ہوا دی اور دوسری طرف ہندستانیوں کے فرقہ وارانہ اور تمدنی جھگڑوں کا ذمہ دار خود ہندستانیوں کو ٹھہراتے ہوئے ہندستانیوں کے اس دعوی کی نفی کی کہ وہ ایک قوم ہے۔ مارلے MORLEY کو یہ مناسب نہیں معلوم ہوا کہ انگریزی سیاسی اداروں کو ہندستان میں بسنے والی اقوام کے مزاجوں کے مطابق بنا دیا جائے۔ قوم پروری کے منافی اصولوں پر جداگانہ انتخابات کی پالیسی اس وقت بھی تبدیل نہیں کی گئی جب ۱۹۱۹ اور ۱۹۳۵ میں برطانوی طرز کی نمائندہ حکومت کو عطا کیا گیا تھا سابق بدگمانیوں اور مختلف اوہام کے سبب حالات اس قدر پیچیدہ ہوگئے کہ کوئی معجزہ ہی ان کو سلجھا سکتا تھا۔ پھر بھی تمام پس و پیش کے درمیان ایک بات ایسی تھی جس پر تقریباً تمام جماعتیں متفقہ طور پر راضی تھیں اور وہ بات تھی مکمل آزادی کا مطالبہ۔

آزادی کی جدوجہد صرف سیاسی طوق غلامی سے رہائی کی کوئی معمولی تحریک نہیں تھی بلکہ عام طور پر یہ کوشش تھی کہ قدیم جامد اور بے جوڑ سماج کی جگہ ایک متحرک نظام۔ آزادی، انصاف، انفرادیت انسانیت اور سیکولرازم کی نشو و نما کے لئے قائم کیا جائے۔ مقصد یہ کہ سماج جن بندھنوں میں بندھا تھا ان کو توڑ کر نئے بندھنوں میں ان کو بدل دیا جائے یعنی قبائلی تنظیم کے نظریہ کو نظام ملکی میں علاقائی کو سیکولرزم میں اور فرقہ پرستی کو قوم پروری میں۔ یہ کام بڑا مشکل تھا خصوصاً ان رکاوٹوں کو مدنظر رکھتے ہوئے جو اس وقت ترقی کی راہ میں حائل تھیں۔

اس لئے آزادی کی تحریک کی تاریخ محض ان حادثات کی کہانی نہیں ہے جو سیاست کے اسٹیج پر ظہور پذیر ہوئے بلکہ ایک مستقل مضمون ہے جس میں سماجی ارتقا کے تمام رواج سلسلہ وار موجود ہیں۔ مثلاً نئے نظریات کے آغاز اور ان کی افزائش کے ساتھ ساتھ مختلف مقابل جماعتوں کے مفادات اور طاقتوں کے ٹکراؤ کی مسلسل روداد ہے۔

تاریخ کا مطالعہ عالمی ترقی اور ہندستان اور انگلینڈ میں ہونے والی تبدیلیوں کو مدنظر رکھ کر کرنا پڑے گا۔ تحریک میں رونما ہونے والے تغیرات دراصل ان تینوں یعنی ہندستان، انگلینڈ اور عالم کی باہمی اثر اندازی کا نتیجہ ہے۔ ریاست برطانیہ اور ہندوستانی تحریک کا معاشی پس منظر الگ الگ ابواب میں مذکور ہے۔ اس باب میں ان خیالات کے ارتقا کی جھلک دکھانا مقصود ہے

جنھوں نے تحریک آزادی کے نظریات کی بنیاد رکھی اور آزادی کے جانبازوں میں جوش پیدا کیا رہنمایان ہند اگرچہ ہندوستانی سیاست میں انقلاب کی اہمیت اور ضرورت سے پوری طرح آشنا تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ کچھ بنیادی مسائل جیسے اپنے مستقبل کے آزاد سماج اور نئی تہذیب کی ہیئت اور کردار کے تعین میں بھی الجھے ہوئے تھے، سماجی تعمیر نو کا سوال اسی باعث بہت گہرائی کے ساتھ زیر بحث رہا اور نئی تہذیب کے مسئلہ کو نئے رسم و رواج پر مغربی اثرات کے تصادم سے پیدا شدہ نتائج کو مدنظر رکھ کر کیا گیا۔
ہندستان کی آزادی محض دال روٹی کے حصول کا معاملہ نہیں تھا بلکہ اس سے کہیں زیادہ اس کا تعلق زندگی کے نئے معیاری اصولوں اور نئے انداز فکر کی جستجو سے تھا۔ مختصراً ہندوستان کی آزادی کا سوال درحقیقت اس مقصد کا حصول تھا جس کے لئے ہندستانیوں کو جینا اور مرنا تھا۔
بیرونی غلبہ کے خلاف اس جنگ آزادی کے دو پہلو تھے۔ ایک پہلو قوت سے متعلق تھا اور دوسرا انداز فکر کی جستجو سے۔ جنگ آزادی اخلاقی اور مادی دونوں اعتبار سے لڑی جارہی تھی، یہ جنگ ایک بیرونی دشمن سے کہیں زیادہ اندرونی طور پر ذہنوں میں جاری تھی۔
اس لئے تحریک آزادی کی تاریخ میں سیاسی جدوجہد کے حقائق کے ساتھ تحریک کے رہنماؤں کے نظریات، خیالات اور طرز فکر کا اظہار بھی موجود ہے۔
ان رہنماؤں نے جو نظریات قایم کئے تھے ان میں یکسانیت بھی ملتی ہے اور اختلاف بھی کیونکہ وہ گہرے غور و فکر اور وسیع دماغوں کے مسائل کو حل کرنے کے منتظر تھے جن کا ان کے ملک کو سامنا تھا اس لئے ایک طرف تو انھوں نے تحریک آزادی کی مہم کے لئے طریقہ کار کا تعین کیا اور دوسری طرف مقاصد اور ذرائع کے قومی اور اخلاقی بنیادوں کے مناسب اور جائز ہونے پر زور دیا۔
یہ آزادی کی دورخی جستجو کوئی خلاف معمول بات ہرگز نہیں تھی۔ بنی نوع انسان کی تمام عظیم شورشیں یا بغاوتیں دورخی وضع وقطع کی حامل رہی ہیں 1889 کے انقلاب فرانس کی قیادت والٹیر voltair روسو Rausseau ڈیڈیرٹ Diderot اور ارباب ان سائیکلوپیڈیا Encyclopaedists کے نظریات نے کی تھی۔ روس کا بالشویک انقلاب 1917 مارکس MARX اینجلس Engels اور لینن Lenin کے نظریات کا نتیجہ تھا۔ مزید یہ کہ جرمن اور اٹلی کی تحریک بھی جرمنی ادیبوں گوئٹے goethe اور ہیگل Hegel وغیرہ اور اٹلی کے میزنی MAZZINI تحریروں کا ردعمل تھا۔ ان کی تحریروں نے رہنماؤں کے لئے میدان عمل تیار کیا تھا۔ حالیہ دور میں ترکی اور عرب ممالک کو بھی اپنی آزادی اور تعمیر نو کے لئے ان کے ادیبوں کی تحریروں اور فلسفیوں

کے نظریات نے حوصلہ بخشا۔

جس طرح یورپ اور ایشیا کے قومی استحکام کے معنی اور اس کی عملی کارروائیوں کو بغیر وہاں کے بنیادی نظریات کو جانے ہوئے سمجھنا ناممکن ہے ٹھیک اسی طرح ہندستانی تحریک آزادی کی اہمیت اور کردار کی جانچ کے لئے یہاں کے فلسفیانہ نظریات کا تجزیہ نہایت ضروری ہے۔

بیسویں صدی کی تحریک میں حصہ لینے والے تمام قابل ذکر رہنماؤں میں سے یہاں صرف انھیں کا ذکر کیا جاتا ہے جن کے خیالات اور نظریات عوام کی کارکردگی پر زیادہ حد تک اثر انداز ہوئے ان میں بال گنگا دھر تلک (پیدائش 1856) رابندر ناتھ ٹیگور (پیدائش 1861) ایم۔ کے گاندھی پیدائش 1869) اور اربندو گھوش (پیدائش 1872 کے نام خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ انھوں نے آزادی کی مہم میں نمایاں پارٹ انجام دیا۔ مسلم رہنماؤں میں محمود الحسن (پیدائش 1851) اور دیوبند سے متعلق ان کے کچھ ساتھیوں کے ساتھ ساتھ ابو الکلام آزاد (پیدائش 1888) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ محمد اقبال (پیدائش 1873) نے مسلم ذہنوں کو اس قدر متاثر کیا کہ مسلمانوں کی بڑی تعداد نے ایم۔ اے جناح (پیدائش 1876) کی قیادت میں ہندستان ہی کو خیرباد کہہ دیا۔

یہ افراد محض سیاسی رہنما نہیں تھے۔ بلکہ نئے نظریات کی بنیاد اور قیام کا سہرا بھی انھیں کے سر ہے اور ان لوگوں کی اہمیت کا اندازہ ان کے اخلاقی، سماجی، اور سیاسی نظریات اور سرگرمیوں سے لگایا جاسکتا ہے اگرچہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے خیالات میں حیرت انگیز یکسانیت تھی پھر سرکاری معاملات اور طریقۂ کار سے متعلق کچھ بنیادی اختلافات تھے لیکن دونوں اپنے اپنے نظریات کی روشنی میں الگ الگ راستوں سے ایک ہی منزل کے لئے کوشاں تھے اور وہ منزل تھی ہندستان کی آزادی۔

بال گنگا دھر تلک

بال گنگا دھر تلک ۲۳ جولائی 1856ء کو مہاراشٹر کے ایک ساحلی قصبہ رتن گری میں چتپاون (CHITPAVAN) برہمن خاندان میں پیدا ہوئے تھے ان کے والد ایک اسکول میں ماسٹر تھے لیکن ان کے اجداد مرہٹہ کے پیشواؤں کے یہاں انتظامیہ امور سے متعلق اونچے عہدوں پر فائز تھے۔ وہ اپنے بچپن ہی سے مرہٹہ سرداروں اور 1857 کی انقلابی تحریک کے رہنماؤں کے عظیم کارناموں کا ذکر سنتے آئے تھے اور ان کارناموں نے ان کے ذہن پر گہرا اثر ڈالا تھا۔

تلک بہت ہی جوشیلا اور ضدی لڑکا تھا جو عام ضابطوں کی آسانی سے پابندی کرنے والا یا معمولات

پر عمل کرنے والا نہ تھا۔ لیکن اس کا دماغ غیر معمولی صلاحیتوں کا حامل تھا۔ وہ سب سے بڑا تحقیق پسند اور تجزیہ کرنے والی بے پناہ تیز، حساس، زیرک اور فیصلہ کن عقل و فراست کا مالک تھا۔ اس کا تحمل اور بڑکپن فطرت بھی قابل ذکر خصوصیات تھیں۔ وہ نہ تو پریشانیوں سے ہراساں ہوتے تھے اور نہ کامیابیوں پر مگن ان کا جسم ضرور تکلیفوں کا احساس کرتا تھا لیکن ان کی روح ذرا بھی مصائب سے تنگ یا پریشان نہیں ہوئی تھی۔ وہ حقیقت پسند اور عملی ذہنیت رکھنے کے ساتھ ساتھ ہمیشہ سمجھوتہ کرنے کے خواہش مند رہتے تھے انھوں نے تحریک آزادی کو چلانے کے لئے ایک صاف اور موثر طریقۂ جنگ اختیار کیا تھا جو ان کی وفات کے بعد گاندھی جی کی قیادت میں کانگریس پارٹی نے اپنالیا۔

تلک نے اپنی نوعمری میں ہی اپنی زندگی کو ہندستان کی آزادی پر قربان کرنے کا تہیہ کر لیا تھا 1876 میں انھوں نے علم الحساب میں بی۔ اے (B.A.) کی ڈگری حاصل کی اور پھر قانون کا مطالعہ شروع کیا۔ لیکن ان میں ہندستانی افراد کے مسائل گھر کر گئے تھے۔ اس لئے آخرکار انھوں نے یہی نتیجہ نکالا کہ مسائل واحد علاج ہے آزادی یعنی سوراجیہ۔

اس راہ میں دو بڑی دشواریاں تھیں۔ ایک انگریزی حکومت کی دنیا کی سب سے بڑی مسلح طاقت، اور دوسری تعلیم یافتہ طبقے کا احساس کمتری، خود اعتمادی کی کمی اور لوگوں میں برطانوی حکومت کی برتری اور بے پناہ قوت کا احساس۔

یہ دشواریاں لوگوں کی خودداری، ان کے حوصلے اور احساس فخر کو ابھار کر اور افراد کی عظیم قوت کو جگا کر دور کی جا سکتی تھیں اور ساتھ ہی بڑی تعداد میں بے خوف لوگوں کی ایک فوج بنا کر جاں نثار، خود اعتماد اور مضبوط رہنماؤں کی قیادت کے ذریعہ ناممکن کو ممکن بنایا جا سکتا تھا۔

مسئلے کے حل کے لئے دو چیزیں لازمی تھیں۔ (۱) تعلیم یافتہ افراد کی ذہنیت کو بدل کر ان میں خودداری کو جگانا، ان کی انا کو ابھارنا اور ان کے ذہنوں میں ملک کی موجودہ لیاقت میں یقین اور مستقبل کے مقصد کے حصول کا جذبہ پیدا کرنا (۲) عوام کو سیاست کے میدان میں گرمی کے ساتھ حصہ لینے کے لئے اکسانا۔ پہلی بات اخلاقی تغیر پر منحصر تھی۔ انگریزی حکومت کے ... ہی ہندستان کے لوگ اس مسئلہ کا سامنا کر رہے تھے۔ پرانے رسم و رواج نئے سماج ... بیکار اور ناکارہ لگنے لگے تھے۔ اور بدلتے ہوئے حالات کے مطابق نئے نظریۂ حیات کی تلاش ... جان توڑ کر کوششیں کی جا رہی تھیں۔ رام موہن رائے، دیانند، کیشب چندر سین، رام کرشن پرمہنس، وویکانند، بنکم چندر چٹرجی وغیرہ نے ایک ایسا حل تلاش کر لیا تھا جس سے مغرب کی للکار کا سامنا

کیاجا سکے۔

ان افراد کی قیادت اور رہنمائی میں بال گنگادھر تلک نے اس تلاش میں حصہ لیا۔ وہ سماج میں رہنے والے ان افراد سے جو بیرونی غلامی کے جوئے کو اپنے کندھوں سے اتار پھینکنے میں جان کی بازی لگائے ہوئے تھے اور بھی شدت سے منسلک ہو گئے۔ انھوں نے یہ محسوس کیا کہ مسئلہ کے حل کے لئے اس سے زیادہ فلسفیانہ غور و فکر کی ضرورت ہے جتنا اب تک کیا گیا تھا انھوں نے تمام مسائل کی تحقیق اور استفسار طالب علمی کے دور میں ہی شروع کر دیا تھا انھوں نے اپنی ذاتی ترقی سے قطع نظر اپنے ملکی عوام کی بھلائی اور بہبودی کی خاطر اپنی زندگی وقف کردینے کا جو تہیہ کیا تھا۔ اس کی درستگی کے لئے انھیں جواز کی تلاش تھی کہ وہ ایسا کرنے میں کہاں تک حق بہ جانب ہیں۔ ان کی جستجو انسان کے ذہنی اطمینان کے لئے نہیں تھی بلکہ ان کی عملی جدوجہد کی رہنمائی میں یہ تلاش نہایت اہم کردار ادا کر رہی تھی۔ بے پناہ عاقل اور بے حد سنجیدہ و متین شخص ہونے کے ناطے انھوں نے انسانی اطوار کے بنیادی اصولوں کو سلجھانے کی سعی کی اور اس سے کچھ نتائج بھی اخذ کئے۔

وہ اس کے قائل تھے کہ بھگوت گیتا میں مذکور اخلاقیات کی تعلیم ہندستانیوں کے لئے لازمی چیز تھی۔ اس سے اخلاقی عمل کے لئے ایک ایسا جامع لائحہ عمل مل گیا جو نئے دور کی ضرورتوں کو پورا کرتا تھا۔ لیکن تلک کی زندگی انتہائی مصروف اور پریشانیوں اور ہنگاموں سے بھری تھی جب انہیں منڈالے (Mandalay) کی جیل میں قید کر دیا گیا تھا۔ صرف اس وقت انہیں اپنے خیالات کو قلم بند کرنے کا موقعہ مل سکا تھا۔ انھوں نے مراٹھی زبان میں گیتا کی تفسیر لکھی جس کا نام گیتا رہسیہ (رموز گیتا) رکھا۔

ان سے پہلے بہت سے لوگوں (فلسفیوں) نے گیتا کی تعلیمات کو سمجھانے کے لئے اپنے ذاتی نظریات کی بنیاد پر رسالے لکھے ان میں شنکرا (Shankaa) اور رامانج (Ramanuja) کی تشریحات زیادہ مقبول تھیں۔ شنکر کا یقین مثالی اصولوں پر تھا جنہیں جنانا مارگ (شاہراہ علم یا علم باطنی) کہا گیا ہے۔ اس کے مطابق زندگی کا نصب العین یہ ہے کہ آتما یعنی فرد یا الوہیت یعنی ذات مطلق و لا محدود میں جذب ہو کر اپنی حقیقت کو پا جائے۔ اس راہ کے راہ گیر کو غیر حقیقی اور بے کار دنیا سے دست بردار ہونا چاہیئے اور غور و فکر اور مراقبوں کے ذریعہ اس علم کو حاصل کرنا چاہیئے جو آزادی عطا کرتا ہے۔

رامانج نے بھگتی (عبادت) کے راستہ کو بہتر سمجھا۔ بھگتی کے ذریعہ سے اپنی ذات کو خدا ئے واحد کے حوالے کر کے جگت (عابد) اپنی خودی کو اعلیٰ خودی (ذات بالا) میں ضم کر دیتا ہے اس انضمام کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ خدا بندے کی روح میں بس جاتا ہے اور روح خدا کے پر مسرت نظارے سے محظوظ ہوتی رہتی ہے یہ زندگی سب سے برتر مقصد ہے جو نظام اخلاق میں اخلاقی عمل کی غایت ہے یعنی خیر اعلیٰ ہے۔

اور بھی شارحین مثلاً وسطی زمانہ میں مادھو، ولبھ اور سنمبر اکا وغیرہ اور حالیہ دور میں مغربی ممالک کے بھی اور ہندوستان کے بھی دیگر لوگ گذرے ہیں لیکن تلک ان شرحوں سے مطمئن نہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ گیتا کی تعلیمات کے حقیقی مفہوم کے سمجھنے میں یہ لوگ ناکام رہے ہیں۔ انھوں نے اپنے مطالعہ سے کچھ دوسرے ہی معنی اخذ کئے تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ۔

"گیتا کے شارحین میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جس نے اپنے ذاتی نظریے کی تائید نہ کی ہو اور اپنے نظریات کو گیتا کی تعلیمات سے ثابت کرنے کی کوشش نہ کی ہو۔ میں نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے اس کے مطابق گیتا ہر شخص کو اور اس شخص کو بھی جس نے علم یا بھگتی کے ذریعہ ذات مطلق میں سکر بے پناہ بلند مرتبہ حاصل کر لیا ہو۔ ہر لمحہ عمل پیرا رہنے کی تاکید کرتی ہے اس عمل کا مداد ایسا ہونا چاہیے کہ دنیا ہمیشہ درست کی بنائی ہوئی ترقی کی ارتقائی راہوں پر گامزن رہے جس کے لئے اسے ودیعت کیا گیا ہے:[1]

گیتا رہسیہ (Gita Rahasya) میں شنکر اور رامانج کے نظریات کو تنقیدی نقطہ نگاہ سے پرکھنے کے بعد ناقص قرار دیا گیا ہے گیتا رہسیہ کے ذریعہ تلک نے یہ بتایا ہے کہ انسان کی جد و جہد کا مقصد نہ تو صرف علم ہے اور نہ محض بھگتی۔ علم سے خدا کے وجود اور اس کی ربوبیت کا علم ہوتا ہے لیکن اس علم کے حصول کے بعد دوسرا قدم کیا ہو؟۔ اس کا پتہ نہیں چلتا۔ یہی سوال بھگتی کو مقصد سمجھنے کے سلسلے میں بھی ہوتا ہے۔ تلک کے خیال میں گیتا اس کے آگے کی نشاندہی کرتی ہے بے غرض عمل جسے نشکام کرم (Nishkam-Karma) کہا گیا ہے اس کی طرف اشارہ کرتی ہے ایسا انسان کا طرز عمل جسے کرم یوگ کہا گیا ہے۔ مقصد انسان کی تکمیل ہے۔ وہ مکمل صداقت (جنانا) اور مکمل عقیدت (بھگتی) کے اصول کی سعی کے پیش نظر رہتا ہے یا ساتھ لگا رہتا ہے۔ اس طرح جنانا اور بھگتی کرم عمل کی بنیادیں ہیں: جنا بھگتی سمنو یا کرم یوگا (Jana, Bhagti, Samanvita, Karmayoga) اس کے معنی ہیں کہ جب کبھی کوئی ارادہ کرتا ہے پہلے اسے یہ احساس ہونا چاہیے کہ اس کی خودی، آفاقی خودی یعنی ذات مطلق

1. Tilak, Bal Gangadhar, His writings and Speeches (Ganesh & Co.) Madras 1922-61

سے عالمت بھی رکھتی ہے یا نہیں۔ اور یہ عالمت عملی محبت میں آشکارا ہوتی ہیں۔

گیتا یہ تعلیم بھی دیتی ہے کہ کرم (عمل و حرکت) زندگی کے لئے ضروری اور ناگزیر حقیقت ہے۔ ہر انسان خواہ وہ جاہل ہو یا عاقل ہر وقت عمل پیرا رہنے کے لئے قانونِ فطرت کے تحت مجبور ہے۔ اس لئے عمل چھوڑنے کے بعد کسی بھی طرح انسان کی تکمیل ممکن نہیں۔ اور اتنا ہی نہیں بلکہ اس پر عمل کر کے ہی کوئی شخص زندگی کے عظیم مقصد کو نہیں پا سکتا۔

حقیقی مسرت صحیح طرزِ عمل پر مبنی ہے اس کا حصول مستقل مزاجی اور غیر یکسی قوت ارادی کے ذریعہ ممکن ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ انسان اپنے نفس پر قابو رکھے اپنی خواہشات اور فطری ضروریات کو پورا کرے کسی لالچ میں نہ پڑے دل و دماغ کو دنیوی رغبت و نفرت سے آزاد رکھے اور سکھ دکھ میں، فائدے و نقصان کی حالت میں اور فتح و شکست پر بھی مزاجی کیفیت کو معتدل رکھے۔

انسان کا مقصدِ حیات ایسا ہونا چاہئے کہ اس کا ہر عمل لوگوں کی بھلائی اور معاشرے کی فلاح کے لئے ہو اس کی تمام تر توجہ ذات سماوی کے لئے وقف کر دے اور اس کے احکام اور عائد کردہ فرائض کی پابندی اور انجام دہی میں مصروف ہو۔

انھیں اصولوں کی بنیاد پر کرشن نے ارجن سے کہا تھا کہ کورؤں سے اپنی حکومت یا برتری کے لئے نہیں بلکہ انصاف پسندانہ اصولوں کے قیام کی خاطر جنگ کرو۔ اس طرح ارجن نے اپنی خودی کو خدا کے آگے جھکا کر اس شرط کو پورا کیا اور زندگی کا بلند و عظیم مقصد حاصل کر کے لوگوں کے لئے مثال قائم کی۔

تلک کی نظر میں گیتا میں دراصل اخلاقیات کی وہ پاکیزہ نقاشی ہے جو لوگوں کو بہت عظیم اخلاقی اصولوں پر گامزن ہونے کی دعوت دیتی ہے۔ گیتا کوئی فرقہ وارانہ کتاب نہیں ہے کیونکہ اس کے عظیم خطبات تمام انسانیت کے لئے ہیں۔ اس کی بنیادی تعلیمات اسلامی، عیسائیت اور دیگر مذہبی تعلیمات کے عین مطابق ہیں۔ کوئی بھی فرقہ یا جماعت گیتا میں فلسفۂ حیات کا اعلیٰ نمونہ دیکھ سکتی ہیں۔ اس کے معقول غیر متحملانہ توہم پرستی کے عناصر سے بری، اور وحدت پرستانہ عقائد موجودہ قدریں مثلاً آزادی، مساوات اور انسانی بھائی چارگی کی تائید کرتے ہیں۔ کانٹس کیٹگوریکل امپریٹیو Kant's Categorical imperative، اور گرین کا کنسپشن آف کانشنس پرنسپل Conception of Self Conscious Principle جو کہ نفسوں پر قابو، خواہشات اور ضروریات کی معقولیت اور علم کے حصول کے لئے بنیاد بنانے پر زور دینے والے اصول مغربی انداز فکر کی ایسی مثالیں ہیں جو گیتا کی تعلیمات کے عین مطابق ہیں گیتا کے فلسفیانہ نظریات تمام ہندستانیوں کے لئے یکساں طور پر آفاقی دعوت عام دیتا ہے تلک نے شنکر اور راماننج جیسی کی تشریحات وحدانیت اور گیتا کے بارے میں انفرادیت پسندانہ تعبیر تسلیم نہیں کیا اس کے برخلاف تلک نے گیتا کے اندر اس عقیدے کو پایا کہ انسان کا ہر عمل نہایت معقول، بے غرض، آفاقی

حیثیت کا حامل اور معاشرے کی فلاح کے لئے ہونا چاہیئے۔ ان کا کہنا ہے، روحانیت اور پرستش یا بھگتی سے خلوص کرم یوگ Karmayoga ہی گیتا کا اصل مقصد ہے۔ 2/ کرم یوگ کا مطلب ہے۔ اعمال صالح، اس کے مطابق انسان کے ظاہری رویہ کی اخلاقی بلندی کی جانچ کے لئے اس رویہ کے اسباب یا محرکات ہی معیار کا کام دیتے ہیں اور وجہ صاف اور عیاں ہے تو عمل درست ہے ورنہ غلط ہے۔

عمل کے اسی فلسفہ کی روشنی میں انھوں نے ہندوستان کے مسئلہ کو بھی دیکھا۔ ہندوستان کے لوگ پریشانیوں میں گھرے ہوئے تھے اس کے لئے ان کے واسطے ان ناسازگار حالات کے اسباب معلوم کرنا اور دنیا کی بھلائی کے لئے کام کرکے اپنی پریشانیوں کو کم کرنے کی سعی کرنا لازمی امر تھا۔

سماج کا بھلا کرتے ہوئے اپنی پریشانیوں کو دور کرنا مذہبی فرائض اور ہدایات یعنی دھرم کے مطابق تھا کسی سماج کی سیاسی حیثیت اس سماج کے قیام اور اس کے مفادات کے تحفظ میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے وہ معاشرہ جو کسی بیرونی مملکت کا محکوم ہو اپنی ترقی کی اہم ضرورت سے محروم رہ جاتا ہے وہ وہ اپنا بھلا سوچنے کی ذمہ داری تک سے محروم رہتا ہے اور بھلائی کی کوشش بھی نہیں کر پاتا۔ ہندوستان کے معاملے میں اس کے حاکموں نے ہندوستانی عوام کے وجود کو ہی تسلیم نہیں کیا تھا۔

انگریزوں نے اس بات کو بھی نظر انداز کر دیا کہ پچھلی کئی حکومتوں کی عمل داری میں ہندوستان میں سیاسی اتحاد پیدا ہو چکا تھا اور یہ کہ ہندوستان کی آبادی اور اس کے رقبہ کی وسعت کے اعتبار سے یہاں مذہبی اور زبان سے متعلق اختلافات نسبتاً دنیا کے دیگر ممالک سے زیادہ نہیں تھے یورپ کے نسلی نظریات نے اس حقیقت کو بھی تسلیم نہیں کیا کہ ہندوستانی عوام بنیادی طور پر وحشی اور غیر مہذب تھے بلکہ بے پناہ اعلیٰ تہذیب کے علمبردار تھے جنھوں نے مذہب، فلسفہ، آرٹ، ادب، اور سائنس میں انتہائی شاندار نظام ترتیب دیے تھے۔ ان کی انجینیرنگ کتائی، اور بنائی اور دیگر شاندار دستکاری میں کمال اور کارہائے نمایاں نے دنیا کی تمام مہذب اقوام سے اپنے طرز فکر اور عقل و فراست کا لوہا منوایا تھا۔

اگرچہ ہندوستان کی تاریخ عظیم سیاستدانوں، بہترین ناظموں، بہادر سپاہیوں، عظیم پیغمبروں شاعروں زندگی کے ہر شعبہ میں عقل و فراست کے ماہرین کے قابل فخر کارناموں سے مزین تھی۔ پھر بھی انگریزوں نے ہندوستان کو ایسے طفل مکتب کی طرح سمجھا۔ جسے آہستہ آہستہ شکل سے بتدریج ترقی کرنا ہے۔

---

2. Tilak, B.G. Gita Rahasya, Translated by B.S. Sukthankar 2nd Edition P.669

اور نہ ہی نہیں بلکہ انھیں اس میں بھی شک تھا کہ ہندستانی عوام کبھی کسی بلند مرتبہ کو حاصل کر سکیں گے۔

اگرچہ انگریزوں کے پاس لامحدود قوت تھی لیکن یہ ایک امر مسلمہ ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی ذمہ داریوں کا سامنا کرنے سے کتراتے رہے حالاں کہ وہ ہمیشہ اس بات کا دعویٰ اور تشہیر کرتے رہے کہ وہ ہندستان کو خود اختیاری حکومت کے قابل بنانے کے لئے کوشاں ہیں لیکن ان کا طرز عمل اور طریقہ کار بالکل اس کے برعکس تھا یہ بھی سچ ہے کہ ہندستان کے حالات یورپ کے دوسرے ممالک سے مختلف نہیں تھے۔ قرون وسطیٰ کے سماج کا موجودہ سماج میں ارتقا ایک عالمی صورت تھی۔ یہ پہلے مغربی یورپ میں شروع ہوا اور پھر دنیا کے دیگر ممالک میں پھیل گیا۔ خوش قسمتی سے جو ممالک یورپ کی غلامی سے بچ گئے تھے۔ انھوں نے بذات خود اپنے آپ تبدیل کر لیا تھا۔ ان ممالک میں ترکی، ایران، جاپان اور چین قابل ذکر ہیں اور جو ممالک بدقسمتی سے یورپ کی غلامی کا شکار ہو گئے۔ انھوں نے اپنی حکومتوں میں ایک مزاحم عنصر کو موجود پایا۔ ان ممالک انڈونیشیا (Indonesia) انڈوچین (Indochina) ملایا (Malaya) برما Burma مغربی ایشیا کے عرب ممالک، شمالی افریقہ اور ہندستان آتے ہیں۔

انگریزوں نے سیاسی اتحاد کو فولاد کی مانند مضبوط بنا دیا۔ نظم و نسق اور امن قائم کیا اور جدید دور کے تمام آلہ جات، تعلیم، ادویات اور آمد و رفت کے ذرائع یکساں طور پر نہ سہی لیکن پھر بھی تمام ملک میں پھیلا دیے۔ لیکن انھوں نے جدید صنعتی اور خود اختیاری سماج کے ارتقا میں مزاحمت پیدا کی دوسری طرف ہندستان کی کمزوری کو اس کے فرقوں کے درمیان خلیج بڑھانے اور صنعتی ترقی کو روکنے میں استعمال کیا۔ 3/

تلک ان سیکھے ہوئے رہنماؤں میں تھے جو شہنشاہیت پسند حکومت کی فطرت کے بارے میں کسی شک و شبہ میں مبتلا نہیں ہوتے۔ انھوں نے ملک کو حکومت سے چھٹکارا دلانے کے لئے ایک جنگی طریقہ ایجاد کیا وہ جانتے

---

3. Some British and American writers have questioned the correctness of this judgment among them are many British officials like Cherry Strachy, Curzon and non-officials like Thread-ore Marison Findlay Shiras Knowles Vera Anstey and Griffi-the, Among their American supporters is Morris D. Morris. But against them is a vast host of anti imperialist writers and what is more over whelming factual evidence.

استعمال نہیں کیا گیا مثلاً تو غریب، کمزور اور نچلے طبقے کے لوگوں پر ان کے ذریعہ سے شوق ستم کی گئی اور نہ اونچی ذات والوں کی اجارہ داریوں کے متکبرانہ دعووں کی وکالت کی گئی۔ یہ اخبارات انگریز حکومت کے نسلی برتری کے دعووں اور ہندستان کو ایک برطانوی نو آبادی میں تحلیل کرنے کی کوششوں کی ملامت کرنے اور رد Condom کرنے میں بھی قطعی بھی نہیں ہچکچائے اور جب انھوں نے ہندستان کے تہذیبی پہلوؤں پر زور دیا تب بھی وہ مغربی تہذیب کے اندھے مداح اور مقلد نہیں تھے۔ ان دونوں ہی اخباروں نے عوام کی بے چارگی اور پریشانی کے اسباب پیش کئے۔

تیسرے یہ کہ تلک گیتا کے مذہبی اور اخلاقی نظریات سے بہت زیادہ متاثر تھے اور اپنی تقریروں اور اخباری مضامین کے ذریعہ انھوں نے ان نظریات کو عوام میں پھیلا دیا اور گیتا کے بتلائے ہوئے کرم یوگ پر عمل کی دعوت دی چونکہ دیانت یہ تھی کہ تلک نے ری اور رن The orion اور ویدوں کا قطبین وطن (The Arctic Home in the Vedas) اور گیتا رہس Gita Rahasya جیسی کتابیں لکھ کر ہندستان کے تعلیم یافتہ طبقے کی انا کو ابھارنے کی کوشش کی۔

آخر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ تلک نے اپنے مصمم حوصلے ہندستان کی آزادی کی راہ میں حب وطن بلا جبر پر ایک شکتی لائے اور اپنی بے غرض عقیدت اور جاں نثاری اور ثبات قدم خدمات سے ایک کرم یوگی (Karma yogi) کی مثال پیش کی۔ گاندھی کے الفاظ میں جدید ہندستان کے معمار کی حیثیت سے ان کی یاد آنے والی نسلوں تک باقی رہے گی۔ 5/

دوسرا ستون جس پر انگریزی حکومت قائم تھی اس کی مسلح افواج کی قوت تھی حکومت کے پاس بہت بڑی تربیت یافتہ اور جدید ہتھیاروں سے لیس ایسی فوج تھی جسے مملکت برطانیہ کی بحری اور بری افواج کی پشت پناہی حاصل تھی۔ دوسری جانب ہندستانی مکمل نہتے تھے 1857ء کی انقلابی تحریک میں انھیں بڑی شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ انگریزوں کو اپنی برتری کا شدید احساس تھا اور وہ وقتاً فوقتاً ہندستانیوں کو یہ احساس دلاتے رہتے تھے کہ یہ ملک بزور شمشیر فتح حاصل کی گئی ہے اور ان کا ملک تلوار ہی کے ذریعہ تابعداری پر آمادہ کیا گیا ہے۔

ان کے حالات کے پیش نظر ہندستانی رہبروں نے سوچا کہ مسلح قوت کا قیام اور ترقی قطعی ناممکن ہے اسی خیال کے پیش نظر فوجی طاقت ابھارنے کی نہ تو کوئی کوشش خود ہی کی اور نہ انگلینڈ کے کسی دشمن ملک سے ہی مدد لی اور نہ باہر سے ہتھیار منگائے۔ البتہ کچھ مستثنیات ضرور ہیں۔ مثلاً (1) دیوبند کے محمود الحسن کی ترکی اور افغانستان سے مدد کی کوشش (2) کابل میں قایم کی گئی عارضی حکومت کے لئے ہردیال اور مہندر پرتاپ وغیرہ کی افغانستان سے مدد مانگنے کی تجویز۔ (3) جرمنی کی مدد سے بغاوت برپا کرنے کی جین سنگھ جی اور زرسندر ریبتا جاریہ کی کوشش۔ اس کے علاوہ ایک چوتھی اور غیر معمولی مثال جاپانی افواج کی مدد سے جس نے برما پر قبضہ کرکے ہندوستان پر حملہ کر دیا تھا سبھاش چندر بوس کی قیادت میں ہندوستان کو آزاد کرانے کے لیے نیشنل آرمی National Army کی تنظیم

5. Tendulkar, D.G. Mahatma. Vol I, Page 371.

ان تمام کوششوں کی ناکامیوں نے یہ ظاہر کر دیا کہ تحریک آزادی کی کامیابی کے لئے پر امن طریقے پر عدم تشدد اختیار کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ لیکن اس کی کامیابی کے لئے بھی ہندستانی رہنماؤں کے سامنے پہلی اور اہم شرط یہ تھی کہ وہ ہندستان کی بے پناہ آبادی میں جو کہ تحریک کا آغاز کرنے کے لئے واحد اثاثہ تھی حرکت عمل اور اتحاد پیدا کیا جائے۔ اگر وہ یک جا ہو جاتے تو برطانوی مسلح قوت کا مقابلہ کر کے ہندستانی عوام کے اتحاد کا مظاہرہ کیا جا سکتا تھا ان کی مقاومت مجہول بھی سرکار کو مفلوج کر سکتی تھی۔ اس لئے تلک نے ایک ایسی تحریک چلانے کا ارادہ کیا جس میں عوام شامل ہوں لیکن ان کا عقیدہ تھا کہ عوام کی توجہ کو وہی اسباب اپنی طرف منعطف کرا سکتے ہیں جو عوام کو بھلے معلوم ہوں مثلاً مہاراشٹر کے مواضعات میں رہنے والے سادہ لوح لوگوں کی توجہ گنپتی (Ganpati) دیوتا کے اعزاز میں کوئی تیوہار منا کر یا شیواجی (Shivaji) کے کارناموں کی خوبصورت جھلکیاں دکھا کر ہی اپنی طرف کی جا سکتی ہے

ان کا عقیدہ تھا کہ سیاستدانوں کو عوام کے فرسودہ رسم ورواج پر تنقید کر کے ان کے جذبات کو ٹھیس نہیں پہونچانی چاہیئے۔ فوری ضرورت قانون وضع کرنے کے لئے طاقت کا حصول تھا نہ کہ سماج کی اصلاح جس کے چکر میں پڑ کر آزادی کا حصول اور بھی دیر طلب بن جاتا۔ تلک کا خیال تھا کہ "اگر زیادہ تعداد میں عوام کو کانگرس میں شامل کر لیا جائے تو یہ ممکن ہے کہ وہ بالواسطہ یا براہ راست اپنی امداد سوشل کانفرنس (Social Conference) کے حق میں نہ دیں"[6] اس لئے تلک نے کانگرس پر زور دیا کہ ایسے پروگرام بنائے جائیں جن سے عوام کی حمایت حاصل ہو سکے۔ اس پروگرام کی وضع قطع، خود اعتمادی اور جذبہ ایثار پر مبنی تھی لوگ ایک بڑے پیمانے پر انگریزوں کی مزاحمت پر آمادہ ہو سکیں۔ اس کے لئے ان چار پہلوؤں قومی تعلیم، سودیشی، بائیکاٹ پر مشتمل پروگرام تجویز کیا گیا۔ دراصل اس پروگرام کا مقصد، تہذیبی، اقتصادی، عدلی اور انتظامی امور میں حکومت برطانیہ کی حمایت سے بتدریج دست برداری تھا۔ ان دائروں میں سے جس سے بھی حکومت کو خارج کر دیا جاتا ان کا مکمل نظام قومی منتظم اس وقت تک کے لئے اپنے ہاتھ میں لے لیتے جب تک کہ مکمل نظام حکومت ہندستانیوں کے ہاتھ میں نہ آ جائے۔

یہ ایک بہادرانہ منصوبہ تھا لیکن تلک سمجھتے تھے کہ ملک کو بتدریج ہی اس کے لئے تیار کرنا پڑے گا اس لئے تدریجی ترقی کے حامی تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کا یہ خیال نہیں تھا کہ انگریزوں سے فوراً اور مکمل تخلیہ کرایا جائے گا۔ بلکہ وہ سیاسی طاقت تبدریج حاصل کرنے کے حامی تھے انھوں نے اس پر ضرور زور دیا کہ طاقت کی یہ

6- The Maharatta, November 3, 1895.

منتقلی حقیقی ہو اور ۱۹۰۹ اور ۱۹۱۹ کے ایکٹ (Act) کی طرح خیالی اور رسمی نہ ہو۔ اس منتقلی کے دوران انھوں نے جوابی تعاون کی وکالت کی۔ اور انھوں نے حکومت برطانیہ کے زیر سایہ نوآبادیات کے طرز کی حکومت کے آگے نگاہ نہیں دوڑائی اور وہ شہنشاہ انگلستان کو محض برائے نام سربراہ مانتے تھے جن کا اقتدار متحدہ مملکت اور نوآبادیات پر یکساں تھا۔

نیونس کے مطابق (Nevinson) انھوں نے سیاسی تحریک کے لئے فوری اصولوں کا دھندلا سا خاکہ ان الفاظ میں پیش کیا "بے شک یہ ایک مختصر سی جماعت ہے جو برطانوی حکومت کو مکمل طور پر اور یکدم نکال دینے کا ارادہ رکھتی ہے اس کا تعلق ہم سے نہیں ہے۔ شاید یہ بہت دور مستقبل سے متعلق ہے۔ غیر منظم، غیر مسلح متحد ہوتے ہوئے ہم کو حکومت برطانیہ کو ہلادینے کی توقع نہیں رکھنی چاہیے .... ہمارا مقصد بالآخر اپنے ملک پر زیادہ سے زیادہ اختیار حاصل کرنا ہے۔ تمام شہنشاہیت سے متعلق سوالات کو مرکزی حکومت انگلینڈ کے لئے چھوڑتے ہوئے ہمارا خیال مستقبل بعید میں اپنے ملک کی منفرد اور خود مختار سیاسی کے ایک وفاق قایم کرنے کا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہمارا ہوم رول (Home Rule) شروع میں نامزد یا بالواسطہ پر چنے ہوئے ممبران اور تعلیم عام ہوجانے کے بعد عام انتخابات کے ذریعہ منتخب شدہ ممبران پر مشتمل صوبائی کونسلوں (Provincial Councils) کی شکل اختیار کرلے"[7]

اعتدال پسندوں Moderates اور اپنی جماعت کے اختلافات کے متعلق انھوں نے کہا " وہ یعنی اعتدال پسند وفد بھیج بھیج کر اب بھی رائے عامہ کو ہموار کرنے کی توقع رکھتے ہیں ....اور ہمارے معاملات کے حق میں منصفانہ دلائل دیتے ہیں دراصل دونوں جماعتوں نے بہت عرصہ پہلے ہی اینگلو انڈین رائے کو ہموار کرنے کی امید چھوڑ دی تھی۔ ...... ہم انتہا پسندوں Extremists کے کچھ اور ہی ارادے ہیں۔ یہ معاملہ مزاج سے متعلق ہے اور ہمارے ساتھ نوجوان خون ہے۔ ہمارا اصول خود اعتمادی نہ کہ گداگری ہے"[8]

اعتدال پسندوں کا مطالبہ بھی زیادہ مختلف نہیں تھا وہ اپنی کامیابی کا انحصار برطانوی حکمرانوں کی نیک نیتی پر رکھتے تھے اور تلک کے طرز عمل کو ترچھی نظروں سے دیکھتے تھے ان کے نزدیک عوامی تحریک قابل ملامت اور مردود شئے تھی۔

تلک کے بدخواہوں نے ان پر الزام لگایا کہ تلک تشدد کے حامی ہیں۔ ایسا کہا جاتا ہے کہ شیبو اجی

---

7. Nevinson, H.W. New Spirit in India PP. 32-33.

8. Ibid. P. 73.

ذریعہ ہونے والے افضل خاں کے قتل کو انھوں نے جائز قرار دیا اور چاپیکر Chapekar برادرز کی جنہوں نے
رینڈ Rand کو قتل کیا تھا حوصلہ افزائی کی۔ لیکن تلک نے شیواجی کو اس لئے حق بجانب قرار دیا تھا کہ عظیم
شخصیتیں اخلاقیات کے عام اصولوں سے بلند و بالا اور مبرا ہوتی ہیں "۹/" اور چاپیکر اور بنگالی بم باری کرنے
والوں کے متعلق کیسری اخبار نے لکھا تھا "قتل کے یہ واقعات عام قتلوں سے مختلف پہلو رکھتے ہیں کیونکہ قاتل
نے ان کو جرم سمجھ کر نہیں کیا بلکہ کار خیر سمجھ کر کیا تھا" 10

1897ء میں پونہ کے اندر رینڈ Rand کے قتل کے بعد تلک پر بم باری کے مبلغ ہونے کا الزام پہلے پہل
اینگلو انڈین پریس نے لگایا تھا۔ ٹائمس آف انڈیا Times of India نے جو کہ اینگلو انڈین پریس کا
نمائندہ تھا۔ ۔ اس شک کا اظہار کیا کہ تلک کی تحریروں سے متاثر ہو کر پونہ کے برہمن خفیہ سازشیں کر رہے
تھے انجام کار تلک کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی گئی اور انھیں مجرم قرار دے کر قید کر دیا گیا 1908ء میں تلک
پر حکومت کو خفیہ یا کھلے عام بم باری کی دھمکی سے مرعوب کرنے کے الزام میں پھر مقدمہ چلایا گیا 11

1910ء میں لندن ٹائمز کا ایک بیرون ملک مسائل کا نامہ نگار ویلنٹائن چرول Valentine Chirol
سیاسی حالات کا جائزہ لینے کے لئے ہندوستان آیا۔ برطانوی افسروں نے جو تلک کو برطانوی حکومت کا دشمن سمجھتے تھے
اس کی بھرپور امداد کی۔ یہاں تک کہ پولس رپورٹ اور تمام خفیہ کاغذات کو بھی اس کے حوالے کر دیا۔ چرول
نے یہ الزام لگایا کہ مدعی (تلک) اور رینڈ Rand اور آیرسٹ Ayerst کے قتلوں میں بالواسطہ رشتہ پایا جاتا
ہے اور تلک مجرم ہے یہ الزامات رولیٹ کمیٹی Rowlatt کی رپورٹ میں دوہرائے گئے ہیں اس میں کہا گیا ہے کہ
"رینڈ اس دوران قتل کیا گیا جب کہ دکن کا مشہور صحافی تلک اپنے ملک کی آزادی کے حصول کے لئے ہندوستان
کے عوام کو برطانوی حکومت سے ٹکرانے کے لئے اشتعال انگیز مواد شائع کر رہا تھا" 12

جب تلک نے اس بدنام کن بیان کے مد نظر چرول کے خلاف عدالت سلطانی (Kings) میں جو کہ
عدالت عالیہ کے جج Justice ڈارلنگ Darling اور خصوصی ججوں کی جماعت پر مشتمل تھی
ازالہ حیثیت عرفی کا دعویٰ دائر کیا تو وہی ہوا جو متوقع تھا یعنی طرفداری کا رجحان رکھنے والے جج اور جوری نے

---

9. Kesari, june 15, 1897.

10. Ibid. May 12, 1908. Trial Exhibit. N.P, 51.

11. Chirol Valentine Indian unrest P. 48

12. Selection committee Report (1918) P. 13.

تلک کو قصور وار ٹھہرا کر مدعا علیہ چرول کے حق میں فیصلہ سنا دیا کیوں کہ حکومت برطانیہ کی تمام قوت اس کی پشت پناہی کر رہی تھی۔

لیکن نمایاں طور پر سیاسی تعصب کی بنیاد پر دیے گئے اسٹریچی (Strachey) ڈاور (Davar) اور ڈارلنگ (Darling) کا یہ فیصلہ ان کے ابنائے وطن کے دلوں میں تلک کی قدردانی اور مدح سرائی کو کم نہ کر سکا۔ ان کے نئے قتل کے اشتعال اور اعانت سے انکار ان کی برأت کے لیے کافی تھا کسی ثبوت کی ضرورت نہ تھی۔ کیا انھوں نے 27 ستمبر 1905 کے "کیسری" اخبار میں یہ نہیں لکھا تھا "کسی کو افسروں کے قتل کے لئے اکسانا ایک نامردی کی بات ہے"[13]!

1914 میں انھوں نے ایک بیان شائع کیا تھا "مجھے یہ کہتے ہوئے کوئی ہچکچاہٹ نہیں محسوس ہوتی کہ ہندستان کے مختلف حصوں میں ہونے والے تشدد کے یہ واقعات میرے لئے نفرت اور ناگواری کا باعث ہی نہیں ہیں بلکہ میرے خیال میں ان واردات نے ہماری سیاسی ترقی بہت حد تک سست کر دی ہے"[14]۔

تاہم یہ سچ ہے کہ تلک، گاندھی کے مثل نہ تھے یعنی وہ عدم تشدد کے اصول میں کامل یقین نہیں رکھتے تھے وہ گرین (Green) کی طرح جنگ کو "قتل عوام" سے تعبیر نہیں کرتے تھے۔ لیکن گرین کی طرح وہ بھی مدافعانہ جنگ کو جائز قرار دیتے تھے۔ گو کہ مدافعانہ جنگ اور جارحانہ جنگ میں امتیاز کرنا ممکنات سے ہے۔ آزادی حاصل کرنے کے لئے مسلح خروج کرنے کو وہ جائز سمجھتے تھے۔ انھوں نے ان لوگوں کو سراہا جنھوں نے ملکی مفاد کے مدنظر اپنی جانوں کو خطرے میں ڈال دیا تھا ظالم و جابر فرمانرواؤں کے قاتل کے لئے صدیوں سے نعرہ ہائے تحسین بلند ہوتے رہے ہیں مثلاً قدیم یونان میں ہپرکوش (Hipparchus) اور ہرموڈیس Harmodius وغیرہ کے قاتل اور بیسویں صدی میں ریسپوٹین (Rasputin) کے روسی قاتل اسی زمرے میں آتے ہیں۔ مگر جیسا کہ تلک کا خیال تھا کہ اخلاقی فیصلے محرکات Motives پر مبنی ہوتے ہیں نہ کہ کسی بیرونی عمل پر۔ تو پھر یہ معاملہ کردار کی شکل اختیار کر لیتا ہے جو کسی پسندیدگی (Approval) یا ناپسندیدگی (Disapproval) کی پرواہ نہیں کرتا۔

کسی بھی معاملے میں تلک نے تشدد کے استعمال کی حمایت نہیں کی اور یہ خواہش ظاہر کی کہ ہندستانی

---

13 - Tilakanche Kesaritil Lekha, Vol. II P. 538.

14 - Mahratta, August 30, 1914.

تحریک عدم تشدد کے ذریعہ سے چلائی۔

تلک کے نام نہاد پستی اخلاقیات کے بارے میں غلط فہمی ہے۔ در اصل اپنی کتاب گیتا رہسیہ Gita Rahasy میں انھوں نے مغربی اخلاقی فلسفے کی خامیوں۔ مادہ پرستی، افادیت پسندی اور مقاصد پرستی کی طرف توجہ دلائی ہے۔ انھوں نے ان خصائص کا گیتا کی تعلیمات سے موازنہ کیا ہے جن کا مطالبہ فرد کی ہستی کو کامل و اکمل ہستی میں فنا کرنے، اس کا علم مطلق حاصل کرنے، اور اس کی رضا جوئی میں گم ہو جانے کا ہے جو کہ کرم یوگ کا حقیقی رنگ و روپ ہے۔

اپنی صوبہ جاتی زندگی میں ہندو فرقہ کی حمایت در اصل تلک کی بڑی بد نصیبی رہی۔ وہ جانتے تھے کہ گائے کشی، مسجدوں کے سامنے گانے بجانے کی ممانعت اور مذہبی جلوس میں جھنڈا وغیرہ لے کر چلنا جیسی حرکتوں میں انتہاپسندی انگریزوں کی "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کی پالیسی کا نتیجہ تھی ان حرکتوں کے نتائج میں جو فسادات ہوئے وہ غیر ملکی اقتدار کے قیام کے لئے بے حد اہم تھے۔ مسلمان انگریزوں کے ہاتھ کے کٹھ پتلی بن کر رہ گئے تھے۔

یہ سب جاننے کے بعد ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ اپنے غصہ کا اظہار وہ حاکموں پر کرتے نہ کہ ان کے کارندوں پر۔ بدقسمتی سے مسلمانوں کو ان کے غیر دانشمندانہ اقدام سے باز رکھنے کی کوشش کی بجائے اور انھیں اپنا ہم نوا بنانے کے بجائے انھوں نے ہندؤں کو ان کے خلاف منظم کر کے اور محرم کے جلوس کا جس میں ہر سال بڑی تعداد میں ہندو حصہ لیتے تھے مقاطعہ کر کے اور ہندؤں کو مسلمانوں سے علیحدہ کر کے ان کے مقابلہ میں لا کھڑا کیا۔ یہ حقیقت ان پر روشن ہونی چاہئے تھی کہ مسلمانوں کو جبر و استبداد سے ہندوؤں کی محبت پر مجبور کرنا ناممکن ہے۔ گنپتی تہوار اور شیواجی کی سالگرہ وغیرہ نے اقلیتوں کے ذہنوں میں یقیناً تشویش اور خدشات پیدا کئے ہوں گے خصوصاً جبکہ حکومت کے نظم و نسق کے ارباب حل و عقد ان اندیشوں کو ہوا دینے پر تلے ہوئے تھے۔

لیکن تصویر کا ایک دوسرا رخ یہ بھی ہے۔ 1888 کے شروع میں 'کیسری' میں ایک مضمون کے ذریعہ مسلمانوں کو سرسید احمد خاں کی صلاح کانگرس کی شمولیت سے بچنے کی۔ پر اظہار غم کرتے ہوئے انھوں نے یہ امید ظاہر کی تھی کہ مسلمانوں میں تعلیم کا فروغ ہونے پر روشن دماغ افراد قومی تحریک میں ضرور حصہ لیں گے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان 1916 کا لکھنؤ معاہدہ خاص طور سے تلک کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ سلف گورنمنٹ کی تجویز پر بات کرتے ہوئے انھوں نے اس معاہدے کے بارے میں کہا تھا۔

"کچھ لوگوں کا ایسا خیال ہے کہ ہم ہندوؤں نے مسلمان بھائیوں کو حد سے زیادہ بہت کچھ دیا ہے جب میں یہ الفاظ کہتا ہوں کہ ہم مسلمانوں کو جو بھی دیدیں وہ بہت زیادہ نہیں ہوگا بلکہ اگر آزاد حکومت کے کل اختیارات

مسلمانوں کی طرف منتقل کر دیے جائیں تو مجھے اس کا کوئی غم نہیں ہوگا تو مجھے یقین ہے کہ یہ ہندستان کے تمام ہندوں کی آواز ہے . . . . . جب ہم دونوں ایک تیسری مخالف جماعت کے خلاف برسرپیکار ہیں تو ہم آپس میں نسلی عتبار سے، مذہبی اعتبار سے اور مختلف سیاسی جماعتوں کے اراکین کے اعتبار سے ۔ غرض ہر لحاظ سے متحد ہیں یہ آج کا سب سے اہم واقعہ ہے،" (15)

پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ پر ترکی کے شہنشاہ کی نسبت اپنائے گئے رویہ سے ہندستانی مسلمان بہت زیادہ آزردہ خاطر ہو گئے تھے کیوں کہ انھیں خوف تھا کہ سلطان کی حکومت کی تباہی کے ساتھ ہی نظام خلافت روم کے پاپائی نظام کی مانند مذہبی امور تک محدود ہو کر رہ جائے گا ۔ گاندھی جی ہندستان میں برطانوی عزائم اور ترکی کے متعلق اتحادیوں کے فیصلے سے بہت زیادہ متفکر تھے ان ناانصافیوں کی اصلاح کے لئے انھوں نے حکومت کے خلاف عدم تعاون کی مہم شروع کی ۔ مرکزی خلافت کمیٹی نے اس پروگرام کی تائید کی اور گاندھی جی کی قیادت کو تسلیم کر لیا ۔ تلک اگرچہ انتہائی بیمار تھے اور بستر مرگ پر پڑے تھے لیکن انھوں نے پھر بھی مسلمانوں کی عثمانی حکومت کی سالمیت کے تحفظ کے مطالبہ کی پوری پوری اور مخلصانہ حمایت کی ۔ انھوں نے کہا ۔

"ہندستان چاہتا ہے کہ ترکی میں مسلم قوت جوں کی توں قائم و برقرار رہے ۔ میرا خیال ہے کہ خلافت کی اس تحریک میں مسلمانوں کی مدد کرنے کا ارادہ نہایت معقول ہے ۔ اور اس سلسلہ میں مہاتما گاندھی کی قیادت کو سب کی حمایت حاصل ہونی چاہیے" (16)

یہ بدنصیبی کی بات ہے کہ تلک کے خیالات سے خصوصاً ابتدائی زندگی میں فرقہ وارانہ عناصر کو قدرے تقویت ملی ۔ ان کی قیادت نے باہمی تعلقات میں درشتی پیدا کر دی ۔ ان کے درمیان خلیج بڑھ گئی اور ایک دوسرے کے خلاف بدگمانیاں اور شکوک مضبوط تر ہو گئے ۔ سید احمد خاں نے مسلمانوں کو علیحدگی پسندی کی جو ترغیب دی اس کا ردعمل ہندوؤں پر بھی ویسا ہی ہوا اور سیاسی مقاصد کے لئے بھی الگ تنظیم کے قیام کی خواہش میں بھی شدت آ گئی ۔ مہادیو گووند رانا ڈے اور رابندر ناتھ ٹیگور، آربندو گھوش اور جی کے گوکھلے وغیرہ دیگر رہنمایان قوم اس معاملے میں تلک سے بہت آگے تھے ۔

خود غرض سیاسی جماعتوں نے تلک کی سیاست کو ٹھکرا کر انھیں بہت زیادہ بدنام کر دیا تھا ۔

---

15. Tilak. B. G. Indian National Congress Lucknow Session - December 1916. Writing & Speeches op.cit PP 223-24.

16. Tahmankar D. V. op.cit P. 303.

تلک کوئی سماجی مصلح نہیں تھے دراصل وہ سناتن دھرم کے کٹر پیرو تھے لیکن وہ ایک غیر ملکی حکومت کے شدید مخالف تھے اور اس کی قوت کو ایک طرف تصادم اور دوسری جانب سماج کو متاثر کرنے والے غیر اخلاقی معاملات کی اصلاح کے ذریعہ ختم کرنے کی کوشش کی۔ لیکن راسخ الاعتقاد لوگوں نے ان اصلاحی کاموں کی مخالفت کی اور چونکہ ہندوؤں کا ایک بڑا طبقہ اس مخالفت میں شامل تھا اس لیے تلک کی یہ کوششیں بے اثر ثابت ہوئیں۔ ایسی دور رس کارتقی کے لئے اپنے آپ کو خطرات میں ڈالنا قطعی دانشمندانہ نہیں کہا جاسکتا۔

دراصل تلک خواتین کی تعلیم، روزمرہ کے معاملات میں ان کی شرکت اور شادی کے لئے ضروری کم سے کم عمر کی حدیں کا تعین کرکے ان کو سماج میں سربلند کرنا چاہتے تھے۔ ذات پات اور چھوت چھات کی وبا کے بارے میں تو ان کے خیالات کسی بھی سماج مصلح کو مسرور کر سکتے تھے۔ انھوں نے اس بحث تک کی بھی مخالفت کی کہ ویدوں کی رسوم کا ماننا صرف کچھ مخصوص ہندو ذاتوں کی اجارہ داری ہونی چاہیئے اور ساتھ ہی چھوت چھات کی برائی کو ہندو سماج کے نام پر ایک شرمناک دھبہ تصور کیا انھوں نے بمبئی کی 1918ء کی پچھلے طبقوں کی کانفرنس Depressed Class Conference میں یہ اعلان کیا۔ - - - - - - -

"اگر خدا بھی چھوت چھات کو برداشت کر لیتا تو میں اسے قطعی خدا تسلیم نہ کرتا۔ . . . . چھوت چھات کے وباکی تخلیق کے کچھ بھی اسباب رہے ہوں لیکن اس نظریہ کی گنہگارانہ اور مجرمانہ حیثیت سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ چھوت چھات کا خاتمہ ہونا چاہیئے . . . . پرانے دور کے ضابطہ پرست برہمنوں کی غلطیوں کی تلافی کی جانی چاہیئے" 17/

جب پرنج پیا Pranjpe نے ان سے ایک ایسے مسودہ پر دستخط کرنے کو کہا جس میں چھوت کو قابل ملامت ٹھہرایا گیا تھا تو تلک نے انھیں لکھا "میں چھوت چھات سے متعلق تمام باتوں کے خاتمہ کے درپے ہوں۔ خواہ وہ ساتھ کھانا کھانے کے بارے میں ہو یا چھوت چھات کے سلسلہ میں" 18/

1919ء میں پرنج پیا اور تلک میں بہت شدید اختلاف تھا۔ پرنج پیا کو تلک کا جواب ایسا تھا جیسے کہ گویا وہ ان کے اعتقادات کا ضابطہ تھا۔

میں اس کا قائل نہیں ہوں کہ سماجی تعمیر نو کے پروگرام سیاسی آزادی سے پہلے شروع کئے جائیں میرے نزدیک دوسری چیز زیادہ اہم ہے۔ اپنی قسمت خود بنانے کی قوت کو حاصل کئے بغیر میرے خیال میں قوم

---

17. Bhupal s. (ed). Tilak Reminiscences Vol II, PP. 204-5 and The Mah-ratta: March 20, 1918.
18. Tilak reply to Pranjpe December 12, 1919. in all abid Tilak, P.323.

کی خبر ہے بنیاد پر اصلاح ناممکن ہے اور میں نے تمام عمر اسی نظریہ کی ترغیب دی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک سچا قوم پرست ... پرستی ابھی کی خواہش کرتا ہے ۔ ایسی اصلاح یا وہ اصلاحی تحریک جس کی بنا قطعی طور پر عہد ماضی کی روایات اور اصولوں کی توہین پر رکھی گئی ہو ان کے نزدیک کسی حال میں بھی پسندیدہ تعمیری کارنامہ نہیں کہی جا سکتی۔ اس لئے وہ کسی بھی اصلاحی کام کے آغاز سے پہلے بالکل واضح طور پر ملکی مفاد کی برقراری اور اس کے فروغ کو مدنظر رکھتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہم سماجی اور سیاسی اصلاح کے نام پر اپنے ملکی اداروں کو انگریزیت کے رنگ میں رنگ کر ان کی قومی خصوصیات کو زائل نہیں کرنا چاہیئے" 19/

1920ء میں کانگریس ڈیموکریٹک پارٹی (Congress Democratic Party) کے افتتاح کے سلسلہ میں جو محضرنامہ انھوں نے نکالا تھا اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنی راسخ الاعتقادی سے کس قدر دور جا چکے تھے ۔ اس میں یہ تحریر تھا کہ پارٹی "ذات پات، رسم و رواج پر مبنی تمام سماجی، سیکولر یا سماجی برائیوں کے خاتمہ کی وکالت کرے گی۔" 20

تہذیب و تمدن کو جدید رنگ میں رنگنے کے سلسلے میں "تلک" بہت قدامت پسند تھے ہندوستان کی قدیم روایات، جیسے ہندو مذہب کے فلسفے اور اخلاقیات کا بہت احترام کرتے تھے لیکن انھوں نے ان کی توضیح و تشریح کے لیے جدید ناقدانہ اور تقابلی طریقے اختیار کئے تھے ۔ سماجی سوالات پر ان کا جواب یہ تھا کہ ذات پات کے نظام میں تبدیلی کی ضرورت ہے ۔ بلکہ خاندان کا یہ خیال ہو کر اسے بالکل ختم ہو جانا چاہیئے ۔ لیکن تبدیلیاں ایک غیر ملکی حکومت کے بنائے گئے آئین کے ذریعے نہیں کی جانی چاہئیں۔ سیاسی معاملات میں پارلیمانی نظام حکومت یعنی خود مختار صوبوں کے وفاق کے علاوہ ان کے خیال میں اور کوئی دوسرا بہتر راستہ نہیں تھا

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ سماج اور ریاستوں کی تنظیم میں انقلاب کے خواہاں تھے لیکن ان اصولوں اور جوہر روحانی میں جو ہندوستان کو قدامت سے میراث میں ملے تھے کوئی تبدیلی نہیں چاہتے تھے ۔ بہرحال یہ جسم اور ذہن، فکر و عمل کے مابین اس تقسیم کی صحت میں کوئی بھی جائز طور پر شک کر سکتا ہے جیسا کہ افلاطون اور روسو نے کیا ہے ۔ سماج تو دماغ ہی دماغ ہے اور جو کچھ سوسائٹی کے مظاہر ہیں سب اسی کا پھیلاؤ ہیں ۔ اس لئے یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ جس قسم کے سماجی انقلاب کا منصوبہ تلک بنا رہے تھے وہ دماغ کی مکمل تبدیلی کے بغیر ممکن ہو سکتا ہے ۔

---

19. Ibid, PP 313-23.

20. Tendulkar, op. cit. Vol. I, [illegible]

اربندو گھوش

اربندو گھوش Aurobindo Ghose قومی تحریک میں حصہ لینے والے ایسے نوعمر رہنما تھے جو تقسیم بنگال کے سبب ایک آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑے تھے وہ حکومت کو للکارنے اور عوامی تحریک شروع کرنے والے ذہین رہنماؤں کی کہکشاں کے سب سے درخشندہ ستارے تھے۔ سی۔ آر۔ داس جنہوں نے علی پور بم باری کے مقدمہ میں ان کا دفاع کیا تھا انھوں نے گھوش کو "وطن پرست شاعر قوم پرستی کا پیغمبر" اور انسانیت کا حامی" لکھا ہے اور تاریخ کی عدالت عالیہ سے ان کے حق میں فیصلہ دینے کی پرزور اپیل کی تھی۔

اس اپیل کو ۵۰ برس ہو چکے ہیں اور اب وہ وقت آگیا ہے کہ ان کے کارہائے نمایاں پر کسی حد تک آزادی رائے سے تبصرہ کیا جائے۔ اگرچہ تاریخ نے کچھ ایسے حقائق پیش کئے ہیں جو کم و بیش آفاقی طور پر تسلیم کئے جاتے ہیں لیکن اس کے لئے بدنصیبی سے انسانوں کی ذات اور ان کی حرکات پر ایسے فیصلے صادر کرنا جو عوام کی رضامندی کے عین مطابق ہوں آسان نہیں ہیں۔ اس معاملہ میں جب کہ سیاسی جماعتوں کے نظریات اور مورخوں کے ذہن بیسویں صدی کے پہلے عشرہ میں پائے جانے والے اختلافات سے آج تک متاثر ہیں تو یہ اور بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ بہرحال تحریک آزادی کی تاریخ کو سمجھنے کے لئے اربندو گھوش کے نظریات پر سنجیدگی سے غور کرنا ضروری ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ انھوں نے بنگال میں عدم تقسیم تحریک Anti partition agitation کو نظریاتی اور عملی دونوں طرح سے جو ادی اور ہندستان کی سیاست میں نمایاں کردار ادا کیا۔ بال گنگا دھر تلک نے اور انھوں نے تحریک کے نظریات اور پروگرام کو ترتیب دیا جس نے گاندھی جی کی قیادت میں عملی شکل اختیار کر کے وطن کو آزادی کی معراج سے ہمکنار کر دیا۔ قوم پروروں کے سیلاب میں ان کی ذات کے اثرات بہت قوی تھے جنہوں نے ملک کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

اربندو گھوش ایسے غیر معمولی ذہانت کے حامل تھے جو بہت کمیاب ہے۔ گھوش کی عقل و فراست وسعت اور گہرائی دونوں اعتبار سے عظیم تھی۔ وہ کئی زبانوں کے ماہر تھے۔ انگریزی زبان ان کے لئے مادری زبان کی طرح تھی اور وہ اس کے الفاظ کے خزانے بافرہنگ اور الفاظ کے صحیح انتخاب اور مناسب استعمال پر حیرت انگیز قدرت رکھتے تھے۔ وہ لاطینی سے بھی بخوبی واقف تھے اور انھیں یونان میں اس زبان پر وظیفہ ملا تھا۔ انہیں فرانسیسی زبان کا بھی بخوبی علم تھا اور وہ جرمن اور اطالوی زبانوں سے بھی واقفیت رکھتے تھے۔ ہندستان واپس آ گئے پھر انھوں نے بنگالی اور سنسکرت زبانیں بھی سیکھ لی تھیں اور ان میں مہارت حاصل کر لی تھی ان زبانوں کی مہارت کے باعث انھوں نے تاریخ اور ادب۔ ہندستانی اور یورپین۔ کا وسیع علم حاصل کر لیا تھا۔

چونکہ ادب اپنے خالق کی دماغی کیفیات کا مظہر ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ہی معاشرے اور زندگی کا صحیح عکاس بھی ہوتا ہے اس لئے اربندو گھوش کے وسیع مطالعہ نے انھیں انسانی نفسیات کا ماہر بنا دیا تھا۔ مثلاً وہ محرکات جو انسان میں جوش عمل پیدا کرتے ہیں، وہ مقاصد جن کے حصول کے لئے سماج کوشاں رہے ہیں اور وہ جذبات احساسات جو زندگی کی جنگ میں کامیابی اور ناکامی کے سبب پیدا ہو کر انسان کو انبساط اور مایوسی سے ہمکنار کرتے ہیں بہرحال ان کی پختگی ادبی وابستگی نے فطری طور پر ان کے ذہن کے احساساتی تصوراتی اور جذباتی میلانات پر اور بھی جلا کر دی لہٰذا ان کے تاریخ اور فلسفہ کے مطالعہ میں ان کی پرجوش اور غیر معمولی ذہانت سے بھرپور کوششوں کا رنگ جھلکتا ہے۔ بدنصیبی سے ان یکطرفہ ادبی رجحان کی سائنس کے ذریعہ اصلاح نہ ہو سکی

تاریخ میں وہ ان انقلابی تحریکوں کے سماجی اور سیاسی تنظیم سے جس کا افتتاح کلیس تھینس Cleos Thenes کے ذریعہ ہوا اور روسی آئین Roman Constitution جس کا افتتاح گریکی gracchi نے کیا ہے بہت متاثر ہوئے۔ اسی لئے جون آف آرک John of Arc کی ان دلیرانہ کوششوں کے جو فرانس کو انگریزی قبضہ سے آزاد کرانے کے لئے اس کے بڑے مداح تھے۔ پھر انھوں نے آزاد اور خود مختار حکومت کے قیام کے لئے امریکی انقلاب اور آئرلینڈ کی تحریک کو بے پناہ سراہا انھوں نے ایک نظم پارنیل Parnell کی موت پر لکھی "نجات دہندہ۔ جس سے لوگ بہت زیادہ خوف زدہ رہتے تھے اور جس سے لوگ نفرت بھی کرتے تھے" دوسری نظم آئرلینڈ کے قوم پرور لوگوں پر۔ جنہوں نے اپنی مادر وطن آئرلینڈ کو مجبور زخمی اور عذاب میں مبتلا دیکھ کر اسے ہنگامہ خیز کرنے اور دہشت ناکی سے مسلح کر دیا تھا۔

سب سے زیادہ انھوں نے فرانسیسی انقلاب کی تشکیل اور حمایت کی جس نے پانچ برس کے مختصر عرصہ میں تیرہ صدیوں سے منجمد سماجی اور سیاسی انتشار کو دھو ڈالا۔ اس انقلاب نے روبس پیر Robespierre اور دانتے Danton جیسے لوگوں کو پیدا کیا جنہوں نے اپنے بے درد کلہاڑوں کے قومی وار سے جاگیرداری اور مطلق العنان حکومت کے زہریلے درختوں کو گرا ڈالا۔ وہ ایک ایسے نپولین کی تمنا کرتا تھا جس نے فرانس کے اداروں میں انقلاب لا کر فرانس کو حیات تازہ بخشی تھی۔

انگلینڈ میں جہاں انھوں نے اپنی زندگی کے چودہ برس گذارے۔ اس کے بارے میں عجیب متضاد جذبات رکھتے تھے۔ انگریزی ادب سے انھیں بے پناہ لگاؤ تھا۔ جسے وہ انسانی ذہن کی سب سے اعلیٰ تخلیق تصور کرتے تھے۔ لیکن انگریزی تہذیب بلکہ پوری مغربی تہذیب ان کے نزدیک مادہ پرست اور روح کو پژمردہ کر دینے والی تھی۔ اور انگریزی معاشرہ اور اس کے تمام دستور قطعی ناقابل تقلید تھے اسی طرح اس کی اندرونی سیاست بالکل بے کیف تھی۔ انگلینڈ کو جمہوری نظام قائم کرنے میں رانی میڈ (Runny made) سے مل

۱۸۱۸ تک بارہ صدیاں لگیں۔ ان کی برف کے چشمہ جیسی سست رفتاری کا فرانسیسی انقلاب کی طوفانی روی سے کیا مقابلہ ہو سکتا ہے۔ فرانس کے انقلابی رہنماؤں کے سامنے پم (Pym) اور ہیمپڈن (Hampden) بالکل بونے لگتے تھے۔ ہندستان میں جو انگریز حکام تھے وہ متوسط درجہ کے ناشائستہ اشخاص تھے جن کے ذہن روحانیت سے خالی اور جن میں کوئی فیاضانہ جذبہ نہ تھا اور ان میں اپنے محکوم لوگوں کو سمجھنے کی لیاقت بھی مفقود تھی وہ لوگ خود پسند، اکڑفوں، خودستا اور صرف اپنے ہی مفاد کو مد نظر رکھنے والے تنگ دل لوگ تھے۔ دنیا پرستی میں ڈوبی ہوئی انگریز تہذیب ہندستانی روحانیت سے بھرپور تہذیب سے بالکل اسی طرح مختلف تھی جس طرح قطب شمالی سے قطب جنوبی۔ ان دونوں میں کسی بھی قسم کی تہذیبی یا سیاسی مصالحت ناممکن تھی۔

اربندو کا دل جذبات کے ابلتے ہوئے کڑھاؤ کے مانند تھا۔ ان کی محبت اور نفرت کھولتے ہوئے سفید لاوے کی مانند تھی۔ ان کے دل میں ہندستان سے محبت بالکل ایک پجاری کے مشابہ تھی جس نے خدا کے حضور عبادت کے لئے تمام علائق دنیوی سے کنارہ کشی کرلی ہو۔ غیر ملکی حکومت کے خلاف ان کے دل میں نفرت اتنی ہی شدید تھی جتنی کسی بیٹے کے دل میں اس وقت پیدا ہو سکتی ہے جب وہ کسی راکشس کو شمشیر بکف اپنی ماں کی چھاتی پر سوار دیکھ لے۔ انھیں قومی عظمت کا بہت شدید احساس تھا اور وہ ہر ذہنی کردار سے شدید نفرت کرتے تھے۔ ان کا حوصلہ بہت بلند تھا۔ اگر ہندستانی لوگ غلطی پر ہوتے تو وہ ان کو بھی سرزنش کئے بغیر نہیں بخش سکتے تھے حکومت کے نافذ کردہ تمام قواعد و اعمال کی مخالفت میں خاص طور سے بہت زیادہ تندخوئی اور بے رحمی کا ثبوت دیتے تھے لیکن وہ اپنی برہمی کو اس قدر نہیں بڑھنے دیتے تھے کہ وہ بہک کر نازیبا بات استعمال کر جائے یا کسی سوقیانہ پن کا اظہار کرے اور اس طرح وہ مغرور و خود پسند حکمرانوں کے انتظامی احکام کے ناشائستہ طرفداروں سے اپنے کو ممتاز رکھتے تھے۔

ان کا دماغ ہر لمحہ بےچین رہتا تھا وہ اپنے وطن کے لوگوں کی کمزوریوں پر اور ان لوگوں پر جنھوں نے ہندستانیوں کو آزادی سے محروم کر دیا تھا، صرف ناراض ہی نہیں تھے بلکہ عمل کے لئے بھی بےچین تھے تاکہ ہندستانیوں کو آزادی کو جلد سے جلد حاصل کیا جا سکے۔ ان کی تحریریں اور تقریریں ان کی ذہنی کشمکش کی آئینہ دار تھیں۔

[illegible] کے ذہن میں اس کشمکش میں توازن پیدا کرنے کے لئے ان کے دماغ کی مشین کی ساخت میں ایک [illegible] کے ذہنی توازن کو برقرار رکھتا تھا خوابوں میں رہنے والے پر اسرار طور پر خیال پرست [illegible] ان پر مکمل تنہائی اور خاموشی کے دورے پڑتے تھے۔

شروع ہی میں انھوں نے "یوگ" کی مشقیں شروع کیں۔ بعد ایک شخص سے مشورہ کیا جو "یوگ" کی مشقوں کے علم میں ممتاز تھا۔ اس نے ان کو اپنے اندر کی آواز پر پختہ یقین رکھنے کی صلاح دی ویدانت اور بھگوت گیتا کے مطالعہ نے انکے صوفیانہ میلانات کو بہت تقویت دی۔ بنکم چندر چٹرجی کی تحریروں نے انھیں مسحور کیا اور فرد کے کردار اور قومی معاملات کے بارے میں انھوں نے جو نظریات قائم کئے وہ زیادہ تر بنکم کی آنند مٹھ (Anand Math) چرترا (Charitra) اور دھرم تتوا (Dharam Tatva) کتابوں سے متاثر ہونے کا نتیجہ تھے۔ بنکم کے بارے میں ان کی رائے تھی "میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ بنکم نے اسی طرح اپنے طور پر کاملیت حاصل کر لی تھی جیسے کہ افلاطون (plato) نے اپنے طور پر یا سسرو (Cicero) یا ٹیسیٹس (Tacitus) نے اپنے طور پر یا فرانسیسی ادب میں والٹیر (Voltaire) فلابرٹ (Flaubert) اور اناطولے فرانس (Anatole france) نے "21۔ وہ سسٹر نویدیتا (Sister Nivedita) کی بھی وہ ممنون تھے جن کے "کالی" پر لکھے ہوئے مضامین (Essays) نے ان کو بہت متاثر کیا تھا۔ بنکم کی تعلیمات سے ـــــ اخلاقی قوتوں کے حصول کے لئے انھوں نے جو سہ رخی فارمولا بنایا تھا۔ وہ انھوں نے بنکم سے حاصل کیا تھا۔ (1) ایثار۔ اور بھگتی (2) خود انضباطی و مداومت عمل اور تنظیم (3) حب الوطنی ہی کو مذہب قرار دینا۔ ہندستان کی کیا تصویر ان کے دماغ میں تھی اس کی وضاحت انھوں نے "بندے ماترم" کے گانے میں کی ہے۔

"یہ اس وقت تک نہیں ہوگا جب تک کہ وہ (یعنی ماتا) ایک عظیم الوہیت کی شکل نہ اختیار کرلے اور اس کی خوبصورتی کا وہ روپ ہو جو دماغ پر چھا جائے اور دل کو مسحور کرے جس سے امید اور خوف جیسی ادنیٰ چیزیں ماتا کی محبت اور خدمت کے جذبہ سے سرشار ہونے کے باعث کافور ہو جائیں اور وہ حب الوطنی نمودار ہو جو معجزہ دکھانے کی اہل ہو۔ اور جو ایک قوم کو تباہی و بربادی جس کی تقدیر بن چکی ہے فنا ہونے سے بچالے" 22

ان کی علی پور جیل میں ایک برس تک قید تنہائی نے ان کے اندر کے انقلابی عمل کی تکمیل کر دی۔ وہ جب جیل سے نکلے تو بالکل بدل چکے اور اس کے کچھ دن بعد غور و فکر اور مراقبہ کے لئے اپنی سرگرم سیاسی زندگی کو خیر آباد کہہ کر اور تمام عملی معاملات اور مطالبات سے آزاد ہو کر پانڈیچری میں آگئے اور آخر میں قرار

---

21. Aurobindo Ghose, Essays Vol III, P.330.

22. Aurobindo Ghose Bankim, Tilak, Dayananda, P.13.

وحوش کی جگہ ایک پرسکون استقلال و پختگی نے لے لی۔ انھوں نے باقی زندگی قدیم رشیوں کی طرح اپنے آشرم میں گذاردی جہاں وہ اپنے شاگردوں کی رہبری کرتے تھے جو کوئی بھی علم کی پیاس لے کر آتا تھا اس کے مسائل کو حل کرتے تھے اور انسانیت کی فلاح کے لئے مذہبی فلسفے پر رسالے یا کتابیں لکھتے رہتے تھے۔

اس طرح اربندو کی عملی زندگی کے تین دور ہیں۔ پہلا دور 1889ء میں کیمبرج یونی ورسٹی میں ان کے داخلہ سے شروع ہوکر 1905ء میں ختم ہوجاتا ہے۔ یہ تیاری کا زمانہ تھا وہ اس دور میں مطالعہ، تعلیم و تجربات اور غور وفکر میں مصروف رہے۔ دوسرا دور جس میں 1905 سے 1910 تک کا وقفہ شامل ہے بڑا مختصر اور طوفانی لیکن ہندستان کی تاریخ میں بڑا اہم تھا۔ وہ قومی تحریک کے سب سے اہم رہنما تو نہیں تھے لیکن وہ اس تحریک کے سب سے زیادہ فصیح و خوش بیان نمایندہ ضرور تھے

1910 میں انھوں نے کلکتہ چھوڑ کر پانڈیچری میں سکونت اختیار کرلی تھی ان کی علیحدگی اور آخری زندگی کے حالات سے مختلف قسم کے قیاسات کئے گئے ہیں۔ جو ان کی مدح وستائش پر مبنی نہیں ہیں۔ بھگوت گیتا کے کرم یوگا کا پیغامبر بغیر کسی کرم (Karma) کے 'یوگ' میں مستغرق ہوگیا تھا۔

ان چالیس سالوں کے دوران 'یوگ' کی ان مشقتوں کو پھر سے شروع کرکے جاری رکھا جن کو بڑودا (Baroda) میں شروع کرکے ختم کر چکے تھے۔ انھوں نے "گیان" اور "دھیان" "مراقبہ" اور "تصور" کے ذریعہ کامل ہونے والا اور ماوراء العقل جذبات و حسیات کے حصول کے لئے ریاضتیں کیں انھوں نے طویل مضامین اور زندگی کے مسئلہ پر طویل رسالے بہت لکھے۔ مثلاً بھگوت گیتا کی ایک طویل تفسیر اور ویدوں کی تشریح۔ اپنی بے پناہ خط و کتابت میں بھی انھوں نے ذاتیات، مذہب، اخلاق اور ادب وغیرہ سے متعلق طرح طرح کے مضامین پر طبع آزمائی کی۔ ان کا لامحدود فہم وذکا سے بھرپور مشرقی و مغربی مصنفوں کا مطالعہ متعدد صفحات پر مشتمل ہے۔ ان کی تحریرات کا اسلوب دلکش نثر کی ایک عمدہ مثال ہے۔

لیکن یہ حقیقت ہے کہ بیانات اور کتابوں کی تصنیف سے قطع نظر ان چالیس سالوں کا وقفہ تاریخی اہمیت کے لحاظ سے بالکل لاحاصل یا بنجر نظر آتا ہے کیوں کر اس دوران جب ہندستان کرو یا مرو کے وحشتناک مرحلے سے گذر رہا تھا تو یہ ذہین ترین انسان جس کی جادو بیانی نے کبھی پہاڑوں سے سمندر تک کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اب ہمالیہ کی غاروں میں رہنے والے پرانے درویشوں کے مانند تنہائی میں اپنے مرکز کی جستجو اور غور وفکر میں اپنے تقریباً ویران آشرم میں مقید تھا۔

ان کی پراسرار کوششیں انھیں ان کے فوق البشر کے نصب العین کے کتنے قریب لاسکیں اس کے بارے میں کچھ کہنا تو ممکن نہیں ہے لیکن یہ سچ ہے کہ ہندستان کے تباہ حالات پر ان کی ذات کا اثر بس برائے نام ہی پڑا

اگرچہ انھوں نے ہندستانی تحریکوں میں عملی طور پر حصہ لینے سے انکار کردیا لیکن پھر بھی ان کی دلچسپی اور توجہ اس طرف سے کم نہیں ہوئی۔ لیکن جب ملک نے ان سے ایک قومی اخبار کے ایڈیٹری کی جگہ سنبھالنے کو کہا تو انھوں نے انکار کردیا۔ 923ء میں سی۔ آر۔ داس، اربندو سے ملے اور سوراج پارٹی کے پروگرام پر تبادلۂ خیال کیا تو اربندو نے ان کی مدد کی لیکن داس نے فرقہ وارانہ مسئلہ کا جو حل تجویز کیا تھا اس سے انھوں نے اختلاف کیا۔

وہ مسلمانوں کے جداگانہ انتخاب کے خلاف تھے اور کلکتہ کارپوریشن میں مسلمانوں کے لئے کچھ جگہیں مخصوص کرنے کے بھی مخالف تھے۔ خلافت سے متعلق گاندھی جی کے نظریہ کو بھی منظور نہیں کیا۔

لاجپت رائے اور پرشوتم داس ٹنڈن 925ء میں پانڈیچری گئے 932ء کی گول میز کانفرنس کے موقع پر انھوں نے کانگریس کے فرقہ وارانہ اصولوں کی منظوری کے سلسلہ میں اپنی مخالفت کو پھر سے دوہرایا۔ انھوں نے یہ پیش گوئی بھی کی کہ ان اصولوں کی منظوری مسلمانوں کو ہمیشہ کے لئے ایک جدا سیاسی ہستی بنا دے گی۔

دوسری جنگ عظیم کے آغاز پر انھوں نے ایک بیان جاری کیا جس میں کہا گیا تھا۔

" ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ یہ لڑائی صرف اپنے تحفظ کے لئے ہی نہیں لڑی جا رہی ہے بلکہ یہ تہذیب اور اس کی حاصل کردہ بلند پایہ سماجی، اور ثقافتی، اور روحانی قدروں کے تحفظ کے ساتھ ساتھ ساری انسانیت کے مستقبل کے تحفظ کے لئے بھی ہے۔ اس لئے اب کچھ بھی ہو ہماری بے لغزش حمایت اور ہمدردی اس کے ساتھ ہے۔ ہم برطانیہ کی فتح کی توقع کرتے ہیں تاکہ عالم کی تمام اقوام میں امن و اتفاق و اتحاد کے دور کا آغاز ہو اور ایک بہتر اور زیادہ محفوظ نظام حیات دنیا میں تشکیل ہو سکے۔"

مارچ 942ء میں سر اسٹیفورڈ کرپس [illegible] حکومت برطانیہ کی جانب سے جنگ میں ہندستان سے امداد کا مطالبہ لے کر آئے۔ اربندو نے اس پیشکش کا خیر مقدم کیا اور کرپس کو مبارکباد بھیجی۔ انھوں نے راج گوپال آچاریہ اور مونجے کو اپنی طرف سے ایک خبر بھیجی اور دہلی میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کے پاس اپنا پیغامبر بھیج کر اس پیش کش کو منظور کر لینے کی صلاح دی اگرچہ ان کا مشورہ مانا نہیں گیا۔

جب پندرہ اگست کو ملک کا اقتدار مکمل طور پر ملک کے ہاتھ میں آیا تو اربندو نے قوم کو خطاب کرتے ہوئے اپنی بے پناہ مسرت کا اظہار کیا اور کہا کہ آخر کار میرے سب سے بڑے خوابوں میں سے ایک شرمندۂ تعبیر ہو گیا اور میرے دوسرے خواب ایشیا کے لوگوں کی آزادی، بہتر، درخشاں اور معیاری زندگی کے حصول کے لئے عالمی تنظیم، ہندستان کی تعلیمات اور رسوم کے مطابق انسانوں کی روحانی ترقی، اور سماجی و انفرادی کاملیت کی سمت میں انسانیت کا ارتقا بھی تقریباً پایۂ تکمیل کو پہونچنے والے محسوس ہوتے ہیں۔

اس لئے تحریک آزادی کی تاریخ میں ان کی زندگی کے پہلے دو دور ہی قابلِ لحاظ ہیں اور ان پریشانیوں اور کشمکش کے اوقات میں ان کے سیاسی خیالات بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

کیمبرج یونیورسٹی جانے سے پہلے آربندو گھوش ہندستان سے بالکل الگ رکھے گئے تھے (St. Paul's School) نام کے ایک دن کے اسکول میں وہ اپنے مطالعہ میں غرق رہتے تھے اس لئے انھیں اور اپنے مشکل حالات کے باعث دوسرے لڑکوں میں خلط ملط ہو جانے کے مواقع بہت کم مل پاتے تھے لیکن جب وہ یونیورسٹی گئے تو وہاں ان کو ایک کشادہ ماحول ملا۔ وہ ہندستانی طالب علموں سے ملتے اور ان سے ربط رکھتے تھے۔ اور بنگالی مضامین اور اپنے والد کے خطوط کے ذریعہ ہندستان کے افسوسناک حالات سے آگاہ ہوتے رہتے تھے۔ تاریخ میں انقلابی تحریکوں کے مطالعہ نے ان کے باغیانہ جذبات کو مشتعل کر دیا تھا۔ اور ان کے دل میں اپنی مادرِ وطن کی آزادی کا اشتیاق پیدا کر دیا۔

یونیورسٹی میں انھوں نے دو فیصلے کئے۔ وہ لوٹس اینڈ ڈیگر (Lotus & Dagger) نام کی خفیہ جماعت میں جو کہ نئی نئی وجود میں آئی تھی شامل ہو گئے اور دوسرے انھوں نے اپنے ملک کی خدمات کے لئے زندگی کو وقف کرنے کا تہیہ کر لیا۔ اپنے والد کے مجبور کرنے پر وہ انڈین سول سروس کے امتحان میں بے دلی سے بیٹھے ضرور اور دانستہ ناکامی کی کوشش کی تھی اس طرح سرکاری ملازمت سے جس سے انھیں شدید نفرت تھی بچ گئے۔

1893ء میں ریاست بڑودا کی ملازمت کا چارج لینے کے لئے وہ ہندستان آئے لیکن اس کے کچھ ہی دنوں بعد انھیں بڑودا کالج میں انگریزی پڑھانے کے لئے منتقل کر دیا گیا۔ زندگی کے اس دور میں آربندو جو کہ مغربی تہذیب میں رچے بسے تھے "تیزی سے مشرقی بنتے جا رہے تھے۔ ہندوؤں کے حامی اور سناتن دھرم اکثر ہندو، اور کالی (Kali) کے پجاری بنتے جا رہے تھے۔ 1890ء اور 1893ء میں اپنے دوست دیش پانڈے کے حکم پر انھوں نے بمبئی کے "اندو پرکاش" اخبار میں جو مضامین لکھے ان میں انھوں نے کانگرس سے مایوسی کا اظہار کیا۔ اور کہا کہ "کانگرس آبِ حیات کا کنواں میدانِ جنگ میں قومی معیار اور اتفاق و محبت کی مثال پیش کرنے میں ناکام رہی تھی" 23۔ اس کی کارگزاریوں نے کوئی اثر نہیں ڈالا ہے کیونکہ اس نے مل کر کام کرنا نہیں سیکھا بلکہ صرف باتیں کرنا سیکھا یا تھا" اس نے اپنی تحریک کو متوسط طبقے کے تعلیم یافتہ لوگوں تک ہی محدود کر لیا تھا۔ اور عوام کا تعاون نہیں لیا تھا۔ اس طرح کانگرس

---

23. Mukherjee, Haridas & Uma; Shri Aurobindo's Political Thought, New Lamp for Old. PP. 68-

نے کھوکو کو اس جگہ پہنچا دیا تھا جہاں وہ غیر اہم اور بے فیض ہوگئی تھی۔24 کانگریس اس حقیقت کو بھی نہیں سمجھ سکتی تھی کہ ہماری امیدوں کی تکمیل اور ہمارے مستقبل کی بنیاد ہمارے اپنے ہاتھوں پر ہے۔25 کانگریس کے تمام نظریات بے علم لوگوں سے مستعار ہوگئے تھے جو کہ محض سیاسی تبدیلی ہی سے مطمئن تھے لیکن اس کے برعکس ہندستانی عوام صرف ہندستانی مسائل کے حل اور نظام حکومت میں ہی دلچسپی نہیں رکھتے تھے بلکہ انھیں ان محرکات اور قوتوں سے بھی غرض تھی جو حکومت کو چلاتے ہیں۔ ہندستان کے رجحانات فرانسیسیوں اور یونانیوں سے کہیں مشابہت رکھتے تھے جن کے نزدیک مذہب اور کلچر تخیلات سے زیادہ اہم تھے۔

ان کے نزدیک ہندستان کو ایک ایسے سماجی انقلاب کی ضرورت تھی جو میکالے (Macaulay) کی پیش گوئی کے مطابق انجام کی طرف نہ لے جاتے بلکہ جو سیاسی شعور کو صاف کرے اور سیاسی غلبے کی مکمل روشنی میں نشو ونما پاکر ہندستان کی مخفی طاقتوں کو آشکار اور کامل کر دے۔"26

اپنے تقلیدی نظریات کے سبب کانگریس نے اپنے نام کے استعمال کے حق کو ختم کر دیا تھا کیونکہ وہ غیر ہندستانی بن گئی تھی۔ مزید یہ کہ اس کے طریقہ کار قطعی ناقابل قبول تھے۔ یہ ایک غیر ملکی حکومت اور جو اس کے بل پر قائم تھی اس کے اور محکوم لوگوں کے درمیانی تعلق کو نہیں سمجھ پائی۔ اس کی تھوڑی سی سیاسی حمایت کی حاکم طبقوں کو خوش کرنے والی عرضداشتیں اور آزادی پسند انگریزوں کے ضمیر کو جگانے کی کوشش والی پالیسی بالکل غلط اور شرمناک تھی۔ ہندستان میں کسی بھی سیاسی پارٹی کا فرض یہ تھا کہ وہ عوام کے سہارے اپنی قوت کو بڑھاتی اور اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر خود اعتمادی سے بھرپور پرزور تحریک چلاتی تاکہ انگریز یہ حقیقت تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتے کہ آزادی ہندستان کا حق ہے۔

ممالک متحدہ امریکہ نے یہی کیا تھا۔ اور آئرلینڈ کے لوگ بھی یہی مردانہ طریقہ کار اختیار کئے ہوئے تھے۔ اٹلی والوں نے بھی آسٹریا کے لوگوں کو اپنی ذاتی کوششوں سے ملک سے باہر نکال پھینکا تھا۔ ہندستان کو بھی یہی راستہ اپنانا چاہیئے تھا۔

یہ نظریات اس زمانہ میں بہت زیادہ ترقی یافتہ تھے۔ غالباً یہ حد سے زیادہ غیر ملکی تھے۔ اس لئے وہ یہاں کی سیاست کے ساکن سمندر میں کوئی ہلکی لہر بھی نہ پیدا کر سکے۔ آربندو کو اس کے لئے برسوں انتظار کرنا پڑا کہ لوگ انکی بات سنیں۔ انھیں دنوں قومیت کی لہر چل پڑی اور جب تقسیم بنگال نے ان کے لئے موقع فراہم

---

24. Ibid, P. 81 25. Ibid, P. 108.

26. Ibid, P. 112.

کیا اور لوگ ان کی بات سننے کو تیار ہوئے تو وہ اپنے پیغام کے ساتھ میدان میں آ گئے۔

اربندو یہ جانتے تھے کہ ہندستان کی آزادی کا مسئلہ صرف سیاسی مسئلہ نہیں ہے بلکہ اس سے بہت زیادہ عمیق ہے۔ دراصل سیاسی مسئلہ تو عظیم تر اخلاقی مسائل کا ایک جز تھا ایک پہلو تھا اگرچہ سماجی زندگی کا بعد اہم پہلو کہا جا سکتا ہے۔ سماج درحقیقت فرد کا ہی ایک بڑھا ہوا نمایاں روپ ہے لہٰذا سماجی مسائل کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے فرد کی فطرت اور اس کے طرز عمل کو سمجھا جائے۔

اس لئے آزادی کے سپاہی کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ کیوں لڑا جائے اور کس مقصد کے لئے لڑا جائے۔ ہندستان کی روایات جن کا سلسلہ مہابھارت کی لڑائی میں کئے گئے ارجن کے سوالات سے ملتا ہے اسی نظریہ کی تائید کرتی ہیں کہ سیاسی مقاصد کو وسیع النظری کے ساتھ فلسفیانہ انداز میں سوچا جانا چاہیئے۔

اپنی تربیت کے لحاظ سے بھی جو بنیادی طور پر مغربی تھی اور جس پر ہندستانیت کا محل تعمیر ہوا تھا اور اپنی ذہنی ساخت کے سبب بھی یعنی ان دونوں وجوہ سے۔ انھوں نے فرد اور سماج، فطرت اور تاریخ اور بندہ و خدا سے متعلق ایک نئے فلسفہ کی بنیاد رکھی۔ جس سے مشرقی اور مغربی' روحانی اور مادہ پرستی' اور مذہبی اور سائنسی نظریات کی مصالحت ہو سکے۔

انھوں نے ۱۹۱۴ء سے ۱۹۲۱ء تک اپنی میگزین "آریہ" میں اس فلسفہ کی مفصل تشریح و تبلیغ کی۔ اگرچہ یہ حقیقت ہے کہ اس فلسفہ کا خاکہ ان کے ذہن میں اس وقت سے موجود تھا جب انھوں نے 'بندے ماترم'، کرم یوگی' اور اخبار 'دھرما' (بزبان بنگالی) کی ایڈیٹری کی تھی کیوں کہ ان میں پیش کئے گئے نظریات میں اسی فلسفہ کی جھلکیاں ملتی ہیں۔

اربندو کے نزدیک ہندستان کی تحریک آزادی دراصل خود شناسی کے جذبہ کے اظہار کی کوشش تھی اس جذبہ کے دو پہلو ہیں۔ ایک تو اجتماعی طور پر پوری قوم سے متعلق ہے اور دوسرا انفرادی طور پر اس کے اجزا یعنی افراد سے متعلق ہے۔ اپنی رنگا رنگی کی تکمیل ہی اس کائناتی جذبہ کا اظہار ہے۔ یہ فلسفہ کائنات اور اس میں پائی جانے والی مخلوق مثلاً بے جان مادہ، جاندار خلقت اور انسانی روح کی مجموعیت سے متعلق ہے کائنات کا وجود اسی کائناتی جذبہ پر مبنی ہے۔ جو اعلیٰ ترین حقیقت یا برہم ہے اور سب سے برتر معقول شعور یا احساس کا نام ہے۔ اور یہی تمام مخلوق کا خالق ہے۔ یہ لافانی ہے ازل سے ہے اور ابد تک قائم رہے گا یہ تخیل کی حدود سے ماوراء ہے۔ یہ مطلق العنان، ناقابل فہم اور ناقابل تشریح ہے۔

لیکن چوں کہ مادہ، روح اور ذہن، اس کے مظہر ہیں اس لئے انسانی شعور میں اس کی حقیقت توحید فی التثلیث کی شکل میں نمایاں ہوتی ہے یعنی یہ وجود یا قوت احساس یا مسرت میں ظاہر ہوتی ہیں۔ مسرت

کی صورت میں خودی خود اپنے آپ کا شعور حاصل کرتی ہے اور اپنے وجود کو اس طرح دیکھ لیتی ہے جیسے آئینہ میں عکس دیکھا جائے۔ یہ اپنی اور دوسروں کی خودی کا نمونہ کائناتی گوناگونی عجیب وغریب اور جو اس نفس سے محسوس ہونے والی دنیا اور نسبتی وجود یعنی حقیقی وجود حقیقی شعور اور حقیقی مسرت کے مقابل کی تخلیق کرتا ہے۔ جس کی شبیہ فہم بشر سے دور ہے۔ وہ مختلف شکلیں اختیار کر لیتا ہے۔ خالق اپنی خود مختاری کو اپنی تخلیق کے ذریعہ آزادی سے ظاہر کرتا ہے۔ تخلیق کی ترتیب ایک دائرے کی مانند ہے جو عروج و زوال کے دو قوس میں منقسم ہے۔ حاکم برتر، یا اعلیٰ خودی ذہن میں اترتا ہے جو روح کا کثیر العناصر حصہ ہے۔ ذہن زندگی کے وجود میں ظاہر ہوتا ہے اور اس کے قیام میں بھی مدد دیتا ہے۔ زندگی جو کہ روح کے نزول کی دوسری اسٹیج ہے مادہ میں قیام کرتی ہے جو نزول کی تیسری اسٹیج ہے۔ مادہ اپنے اندر حقیقت اعلیٰ کو پوشیدہ رکھتی ہے جو اس کی مدرک ہے تینوں اشکال چونکہ حاکم اعلیٰ کی ہیں اس لئے کوئی بھی واہمہ نہیں ہے۔

روح کا ذہن، 'زندگی' اور مادہ میں نزول کا دوسرا تمثیلی پہلو بھی ہے یعنی مادہ کا زندگی میں، زندگی کا ذہن میں اور ذہن میں مافوق الفطرت میں عروج۔

دماغ کامل و فورخ اپنی تمام تر علیتوں کے ساتھ فرد ہے وہ عروج کے زینے کے درمیانی حصہ پر ہے وہ اوپر دیکھتا ہے تو پاتا ہے کہ حاکم حقیقی کی قربت کے لئے ابھی اسے بہت قدم اوپر چڑھنا پڑیگا۔ وہ اپنے اندر جھانکتا ہے تو دیکھتا ہے کہ ایک ناقابل بیان صبحی روشنی فہم اور اک نفس، زندگی اور مادہ کے پردوں سے جھلک رہی ہے اور یہ روشنی اگرچہ پردوں میں پوشیدہ ہے لیکن موجود ہے۔ اس کو اس کی منزل کی طرف بڑھنے کے لئے پکارتی رہتی ہے مادہ اور روح دونوں کی تکمیل انسان کے وجود میں ہو جاتی ہے مادہ اس کو اس کا جسم اور روح، زندگی سے متعلق حرکات مثلاً شعور، احساسات، خواہشات وغیرہ عطا کرنے کے ساتھ ساتھ ان حرکات کو کنٹرول کرنے کے لئے عقل عطا کرتا ہے لیکن انسان کائناتی ذہن کا مرکز بھی ہے۔ اسی لئے اس کے دو پہلو ہیں۔ مثبت پہلو یعنی پاک ہستی، منزہ شعور، اور حقیقی مسرت میں ظہور۔ اور منفی پہلو۔ یعنی محدود ہونے کی خامیاں، تکالیف اور موت۔

انسان ہی ایک ایسی ہستی ہے جس کو یہ موقع اور استحقاق ملا ہے جو آفاقی عناصر کو انفرادی اور روحانی کو جسمانی عناصر میں پھر سے حاصل کر سکتا ہے اسی لئے انسان برتر و اعلیٰ یعنی حاکم حقیقی کے حصول میں یقین رکھتا ہے۔ اس یقین کا خاتمہ زندگی کی روحانیت پر ہوتا ہے یعنی جب زندگی، بلندی، طاقت اور تکمیل کو پہنچ جاتی ہے۔ آربندو کہتے ہیں وہ شخص نجات پا گیا جو کائناتی شعور کو پہونچ گیا اور جس نے خود کو ازلی ابدی حاکم مطلق میں خود کو ضم کر دیا اور وہ پھر بھی زندہ ہے اور حرکت میں ہے اور اس برتر و

اعلیٰ قوت کی طاقت اور زور سے اپنا کام کرتا ہے جو اس کے اندر پوشیدہ ہے اس روحانی تبدیلی اور حصول کا سبب سے بڑا نتیجہ ہے روح، دماغ، قلب اور حرکت عمل کی مکمل آزادی[27]

روحانیت کے حصول کا ذریعہ ہے "یوگ" یوگ کی ریاضت سے وہ دماغ جو زندگی اور فطرت کے جھگڑوں میں سپنسار رہتا ہے یہ تعلق ختم کرلیتا ہے اور اعلیٰ ذات کی جانب بڑھنے کے لئے آزاد ہوجاتا ہے۔ جب انسان اس مرتبہ پر پہونچ جاتا ہے تو اس کی رضا قادر مطلق کی رضا کی تابع ہوجاتی ہے اور وہ قدرت کے ہاتھوں میں کھلونا بن جاتا ہے روح مادہ پر غالب آجاتی ہے اور انسان عارف کامل یا فوق البشر کا درجہ حاصل کرلیتا ہے

انسان جس کی جڑیں برتر و بالا مافوق الفطرت ہستی میں جمی ہوئی ہیں اور جو اس ہستی کا محرک ہے اور اسی ہستی کی جستجو میں ہے وہ خود بھی اتم ترین ہستی کی طرح تنہا بھی ہے اور کثرت بھی وہ اپنا اظہار انفرادی طور پر بھی اور سماج کی شکل میں بھی، دونوں طرح کرتا ہے۔ دراصل فرد اور سماج ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ فرد اپنے موجود ہونے کے سبب ایسا ہے سماج کے ذریعہ انسان اپنی خامیوں کی تلافی کرتا ہے جو کہ فطری طور پر اس میں پائی جاتی ہے۔ فرد کی کچھ نفسیاتی جسمانی، مادی اور احساس و شعور سے متعلق ضروریات ہوتی ہیں جو اپنی تکمیل کے لئے ہر وقت جدوجہد کرتی رہتی ہیں۔ فرد گویا ایک دماغ ہے جو یہ جانتا ہے کہ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونا چاہئے۔ فرد کی ضرورتیں، قوتیں اور ذوق جستجو انفرادی اور اجتماعی دونوں زندگیوں میں یکساں ہیں۔ وحدت کثرت اس سے آزادی اور ہم آہنگی کا تقاضا کرتی ہیں یہ سماج ہی ہے جو ایسے حالات بناتی ہے جس سے زندگی اور اس کی نشو و نما کے سامان فراہم ہوں اور انسان اپنے کو آشکارا کرسکے۔ اور اپنے کو پہچانے جو فرد کی قابلیت اور مجموعہ افراد کی ہم آہنگی کے لئے ضروری ہیں۔

سماج ایک اکائی ہے اس میں کل نوع انسانی شامل ہے اور یہ کائناتی اتحاد اور قوت کا بھی مظہر ہے نوع انسانی کے اندر فرد مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک آزاد ہستی۔ آزادی کے ساتھ اپنی نشو و نما کرنے سے کل کی ترقی میں معاون بنتا ہے اور اس کی اپنی قابلیت پذیر ترقی کے لئے سماج امداد کرتا ہے اور اسے حوصلہ عطا کرتا ہے۔

فرد اور جماعت دونوں اپنے کو آشکارا کرنے کے عمل میں مصروف ہیں۔ فرد اپنے کو جو "ایغو" قدرت نے عطا کئے ہیں وہ اس سے آگے بڑھنے کی کوشش میں ہے جماعت اپنے اصل کی جانب بڑھنے اور اپنی صحت تما وحقیقت کو پالینے کے لئے۔ جماعت فرد کی آفاقیت ہے جو ایک بلندتر ہستی ہے جو فرد پر کنٹرول کرکے اس کو

---

27. Aurobindo Ghose, The Life Divine Vol II, P. 718.

اس کے حقیقی مقصد کی طرف رجوع کرتی ہے۔ سماج اور فرد کے مقاصد میں کوئی فرق نہیں ہے خواہ وہ عمل کے
اعتبار سے کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں۔ سماج وہ کام کرتا ہے جو فرد کی ضرورتوں کو پورا کرنے میں اور اس کی قوتوں
کو بڑھانے میں معاون ہوں۔ اسی مقصد کے حصول کی خاطر یہ جماعتیں بناتا ہے جو افراد کے درمیان رہ کر
کشمکش اور غلطیوں کے ارتکاب سے گذرتے ہوئے انسانی وحدت کے شعور کی جانب رواں دواں ہوتی ہے
جسمانی، حیاتی، نفسیاتی اور روحانی ضرورتیں مکمل طور پر مذہبی، سماجی، فرقہ بند معاشی اور سیاسی
ذرائع مثلاً گرجوں، ذاتوں، طبقوں، انجمنوں، قوم، انسانیت اور کائنات کے ذریعہ پوری کی جاتی ہیں۔
سماجی جماعتوں کے نظام مراتب میں "نیشن" (قوم) کو نبی نوع انسان کے بعد سب سے بلند مرتبہ
حاصل ہے۔ آج کے دور میں اس کی یہ پوزیشن انسانیت کے سماجی ارتقا کے باعث ہے لیکن یہ آخری مرحلہ
نہیں ہے اور نہ انسان اس پوزیشن قائم رہ سکتا ہے انسان کو عالمی سماج اور عالمی سلطنت کے قیام کی
طرف بڑھنا چاہیئے۔

اربندو نے انسانی سماج کی ترقی کے سلسلے میں جرمن مورخ لیمپرحت (Lampaecht) کی
اسکیم پر عمل کیا ہے۔ اس اسکیم میں پانچ نفسیاتی مدارج ہیں۔ اشاراتی وعلامتی (مذہبی)، خصوصی نسلی
روایتی انفرادی اور داخلی۔ دنیا اس وقت اپنی ارتقا کی چوتھی منزل میں ہے۔ جہاں فرد آزاد ہے
اور مساوات انسانی سے معمور ہے اور نیشن یا قوم اس کا سماجی عکس ہے۔ مختلف سماجی جماعتوں نے اس
درجے پر پہونچنے میں مختلف وقفے لئے ہیں قوم قومیت کے بیج کو نشو ونما پاکر ایک درخت بننے میں کافی
طویل وقفہ لگا لیکن ایک مرتبہ بیج پڑجانے کے بعد یہ لازمی ہے نیشن (قوم) کا درخت آگے اور بڑھے۔ ناموافق
یا موافق ہر طرح کے حالات میں۔ نہ تو غیر ملکی حکومت اور نہ ہی زبان، مذہب اور تہذیب کی تبدیلیاں
اتنی قوت رکھتی ہیں کہ اس کی مخالفت کرسکیں اور آخر کار یہ اپنی وہ اصلی شکل اور فطرت اختیار کر ہی لیتا
ہے جو قدرت نے مقدر کردی ہے۔

یورپ کی تاریخ میں اس طریقہ کار کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں فرانسیسی قومیت کا بیج اس
وقت بویا گیا جب قدیم گال (gaul) کے باشندوں اور ٹیوٹن (قدیم جرمن قوم) نے متحد ہوکر ایک
ایسی سرزمین پر جو قدرت نے ان کے لئے قرار دیا تھا مل جل کر رہنا طے کیا۔ گال کے باشندوں کی زبان اور ان
کا مذہب ختم ہوگیا۔ یہ جدید سماج جس کو ابھی اپنا شعور وادراک نہیں ہوا تھا کئی نشیب وفراز یا انقلابات
سے گذرا ازمنہ وسطیٰ میں اس کے کئی ٹکڑے ہوگئے اور جو حصہ بڑا تھا وہ انگریزوں کی عملداری کا اس
وقت تک ایک جز رہا جب تک کہ جون آف آرک (Joan of arc) کی بہادری اور بصیرت

افروزی کے سبب وہ آزاد نہیں ہوا بوربان (Bourbon) خاندان نے آزاد شدہ علاقوں میں استقلال پیدا کیا۔ اس کے بعد پھر فرانس انقلاب کی آتشیں آزمائش سے گذرا جس کے بطن سے جدید فرانس نے جنم لیا خود شناس اور حصول حشم وجاہ کے لئے بے تاب قوم پرستی کا بیج ڈالنے کے بعد اس کے مقصد کے حصول کے لئے بارہ سو سال سے زیادہ لگے۔

اگر اتنے وسیع وعریض اور اس قدر زبردست اور مختلف فرقوں کی آبادی پر مشتمل ہندستان جیسے ملک کو اپنے مقصد کے حصول میں فرانس کی نسبت دوگنا وقت بھی لگا تو کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کہ ہندستان اپنی بلوغت کی منزل تک زیادہ سست رفتاری سے پہونچا کیوں کہ ہندستان کی قوم پروری کو لامحدود مصائب اور تقریباً نا قابل مصالحت اختلافات سے گذرنے کے لئے راہ بنانی پڑی۔ لیکن ہندستان تمام گذشتہ زمانوں میں قرہنا قرن سے ایسے روایات، ایسے اقدار زندگی اور ایسے مقصد حیات کو اپنے سینہ سے لگائے رکھا تھا ان کا لازمی نتیجہ یہی یہ تھا کہ پختہ ہو کر وہ ایک آزاد قوم کا درجہ حاصل کرے۔ عالمی ترقی کے آئندہ دور میں نسانی اتحاد اور انسان برادری کی وحدت اور انسان کے روحانی بننے کی جب دوسری منزل دنیا کی ترقی میں آئے گی تو ہندستان سب سے اونچی سیڑھی پر ہوگا۔

آربندو کے فلسفہ کی معقولیت اور منطق پر بھی دوسرے فلسفوں کی مانند تنقید کے لئے دروازے کھلے ہیں۔ اس لئے اور بھی کہ ان کا فلسفہ وجدانی حقائق اور خیالی دلائل پر مبنی ہے اگرچہ یہ دلائل بڑے دلفریب اور قائل کردینے والے انداز میں پیش کئے گئے ہیں۔ اس کے باوجود اس کا انحصار بے ثبوت تاویلات، غیر واضح اصطلاحات اور غیر منطقی استدلال پر ہے آربندو کا نظریہ یہ تھا کہ عقلی دلائل دماغ کے ایک کمتر ہتھیار ہیں۔ اور وہ اس کے پیدا کردہ نتائج کو عارضی اور یکطرفہ خیال کرتے تھے۔ عقل میں قوت انعکاس ہوتی ہے اور یہ باطن میں قدرتے تربیت کا مادہ پیدا کرتی ہے اس میں تربیت کے حصول کی قدرت ہوتی ہے اور اسے بیرونی دنیا میں استعمال بھی کرسکتی ہے لیکن اس کی حدیں زندگی کی عملی ضرورتوں پر ختم ہوجاتی ہیں اور اس کی جانچ محدود ہے۔ منطق، سائنس اور فلسفہ روح کے اسرار تک رسائی نہیں حاصل کرسکتے اور اسی لئے آربندو نے بڑی صاف گوئی سے یہ بات واضح کردی ہے" جہاں تک فلسفہ کا معاملہ ہے تو میں یہ بتادینا چاہتا ہوں کہ میں کبھی بھی فلسفی نہیں

---

28. Shri Aurobindo, On himself and on the Mother, P. 348.

نہ کوئی فلسفی"29

لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ غیر معمولی ذہانت اور بلند روحانیت کے مالک تھے اُن کے شاعرانہ تخیلات میں انسانی زندگی اور مقاصد کے متعلق ان کے نظریات ملتے ہیں۔ جتنی وسیع النظری اور فصاحت ان کے خیالات میں ہے کم مفکروں میں ملتی ہے۔

بہر حال تاریخی اعتبار سے فلسفہ کی معقولیت لوگوں کے خیالات اور کردار کو متاثر کرنے میں کوئی کام نہیں کرتی۔ ہندستان کے سیاسی مسائل کے معاملہ میں آربندو کا طریقہ کار ان کے ذاتی فلسفیانہ نظریات کے رنگ میں زیادہ رنگا ہوا تھا۔ ہندستانی ذہن یعنی ہندو اور مسلمان انیسویں صدی کے دوران خیالات اور طرز عمل کے اعتبار سے یکساں رخ اختیار کئے ہوئے تھے شروع میں مذہب کو مکمل طور پر نہ سہی اولاً ہندستانی سے متعلق سمجھتے تھے اور بعد میں مذہب کو وہ سیاست کی معاونت اور حوصلہ افزائی کرنے والی شے کے طور پر تصور کرنے لگے۔ ان کے دماغ کی رفعت تیز رفتاری سے آگے بڑھی۔

ہندؤں میں بنکم چیٹرجی اور مسلمانوں میں سید احمد خاں اس تبدیلی کے لئے بہت حد تک ذمہ دار تھے۔ بنکم چندر (1838 — 94) انیسویں صدی کے فلسفہ ثبوتیت اور تخیل پرستانہ انسان دوستی کے قائل ہو گئے اور کامٹے (Augute Comte) جیسے فلسفیوں کے افکار کے مطالعہ بعد معتقد تھے۔ اور انھوں نے اسی فلسفہ کی روشنی میں بھگوت گیتا کی تفسیر لکھی۔ شری آربندو اینڈ دی نیو تھاٹ ان انڈین پالٹیکس" Shri Aurobindo and The New Thought in Indian Politics" کے مصنفوں کے خیال میں بنکم کا کرشن پرانی ہندو علم الاساطیر کا دیوتا نہیں ہے بلکہ تمام زمانوں کے لئے ایک مثالی حیثیت رکھتا ہے جس کے اتحاد پیدا کرنے والے رویہ کے زیر اثر ہندستان کے مخالف اور بے آہنگ حصوں نے ایک متحد قوم کی شکل اختیار کر لی۔ 29

سید احمد خاں نے قرآن کی تفسیر کی بنیاد پر یہ ثابت کیا کہ اس کی تعلیمات جدید سائنسی اور سماجی نظریات کے عین مطابق ہیں۔

---

29. Mukharjee, Haridas and Uma Sri Aurbindo And the New Thought in Indian Politics. P. XV

آربندو نے جو کہ بنکم چندر کے اثرات کافی پہلے ہی قبول کر چکے تھے۔ تحریک پر بے پناہ زور دیا۔ انھوں نے مذہب سے ہندوستانی مسائل کے حل کا کام لیا۔ انھوں نے ہندوستان کی تاریخ، تہذیب، تمدن اور سیاسی کوششوں کی توضیح اپنے فلسفہ کی روشنی میں کی۔ بہ ظاہر فوق البشر کا تصور انھوں نے بنکم سے حاصل کیا۔

آربندو نے اپنی زندگی کو تین خاص مقاصد کے لئے وقف کر دیا تھا۔ قوم پروری، آزادی اور زندگی کو روحانیت بخشنا۔ ان کی قوم پروری کی ہیئت اور مفہوم میں ان کی مخصوص ذہانت کے نقوش ملتے ہیں لیکن قومی تحریک کے دوسرے رہبروں کی مانند انھوں نے بھی تاریخ کے اوراق میں اس کے منبع اور کردار کی جستجو کی ہے۔

انھوں نے ہندوستان کی تاریخ میں قومیت کا حلقی میلان پایا۔ اس کی جڑیں ویدوں کے بھجنوں میں ملیں جو کہ سمارٹ (samanat) اور چکرورتن (chakravartin) کے نظریات کی ضابطہ سازی اور اسومیدھا (Asuamedha) اور رجسیو یا جنس (Rajsuya yagmas) کی مذہبی ہدایات کی حامل تھیں۔ ویدوں نے ہندوستانی کلچر کی روحانی بنیادیں قائم کیں جن پر مستقبل کی قوم کی تعمیر ہوگی۔ رامائن دھرم کی حکومت کی تصویر کشی کرتی ہے جو کہ ہندوستان کے ارتقا کی دوسری منزل ہے۔ مہابھارت میں اس سماج کا تذکرہ ہے۔ جو روح کی جستجو، ایک مثالی حکومت کی تلاش اور ایک مثالی، سیاسی اور سماجی ارتقا کی کھوج میں سرگرداں ہے۔ بدھ مت کا عروج ترقی کی منزل بہ منزل رفتار میں ایک نقطہ انقلاب بن کر نمودار ہوا چنانچہ ویدوں کی پرانی تہذیب ختم ہوگئی، انتشار پیدا ہوگیا، حکومتوں کا تانتا بندھ گیا۔ ویسی بھی اور غیر ملکی بھی۔ اگرچہ وہ سب وفاقی قوتوں کا شکار ہوکر ختم ہوگئیں۔ لیکن ان سب میں سے ہر ایک کا رجحان یہی تھا کہ اتحاد کامیابی کا ضامن ہے ہندوستان میں بیرونی حکومت نے بھی۔ انگلینڈ، روس، اسپین، اٹلی اور دیگر ممالک کے بیرونی فتوحات کی طرح اختلاف میں کمی اور یک جہتی پیدا کرنے میں مدد دی بیرونی حکومتوں نے جو خارجی اتحاد پیدا کیا تھا اس سے نفسیاتی یک جہتی اور قومیت کے شعور کی نشوونما ہوتی ہے لیکن اس نشوونما کا انداز مختلف ممالک کے مخصوص حالات کے مطابق تھا اور اس سے جو تبدیلی ہوئی وہ بھی مختلف حالات کے حساب سے مختلف تھی۔

مسلمانوں کی حکمرانی نے اس اندرونی جذبہ کو متحرک کیا جو اندر اندر قومیت کی تعمیر کی جانب چل رہا تھا لیکن جس کا ابھی تک شعور نہیں پیدا ہوا تھا۔ ہندوستان میں مغل حکومت کے بارے میں آربندو

کہا "جب مغل نے حکومت کی تو اس نے اپنی قوت کے غرور میں اور اپنی ناقابل تسخیر عظمت کے اعتماد میں ایک سپاہی اور ایک فاتح کی مانند حکومت کی . . . . اس نے اپنے ہی لوگوں پر اعتماد کیا۔ ان کو ذمہ داریوں اور اختیارات سے نوازا۔ اور اپنی فتح کے تحفظ کے لئے ان کی ذہانت اور قوت بازو کو استعمال کیا اور اسی اعتماد اور اپنی اندرونی قوتوں کی لیاقت کے بھروسے پر وہ ہندوستان پر ایک صدی سے زائد عرصہ تک حکومت کر سکا" 30

برطانوی فتح نے اس عمل کی تکمیل کر دی۔ اس نے روایتی، سیاسی، معاشی اور سماجی نظام کو کھوکھلا کر کے رکھ دیا۔ ایک طرف تو حاکم طبقہ کو برباد کیا اور دوسری طرف دیہی نظام کو تباہ کر ڈالا۔ اس نے ہندوستانی ذہنوں کے سکون کو بری طرح درہم برہم کر دیا۔ لیکن پھر بھی اگرچہ مغربی تہذیب بنیادی طور پر ہندوستانی تہذیب سے قطعی مختلف تھی لیکن اس کے جھٹکوں نے ہندوستان کی خود شناسی کے احساس کو دماغ کی چوکھٹ سے اوپر اچھال دیا اور زمانہ کے شکم نے نیشنلزم کو جنم دیا۔

مختلف مذہبی عقائد اور مختلف حصوں میں آباد تمام ہندوستانی ایک ایسے نوزائیدہ بچے کی خصوصیات اور شکل اختیار کر گئے۔ جس نے سب کو اپنی طرف کھینچا اور ہر ایک کو اس میں اپنا پن نظر آنے لگا۔ جہاں تک آربندو کا معاملہ ہے تو ان کے نسب کا سلسلہ ویدوں سے جا ملا اور اس درآمدیت کی نوعیت روحانی تھی۔ اس انعام کی پشت پر خود دیبی قوت خاموشی سے اندر اندر کام کر رہی تھی۔ وہ کالی ماتا کی شکل وصورت میں ظاہر ہوئی۔ یعنی مجسم قوت۔ جو تمام تخلیقات کو عالم وجود میں لاتا ہے

ان کے لئے نیشنلزم حقیقتاً ایک مذہب تھا اور مادر وطن کا لفظ ایک محاورہ نہیں بلکہ لغوی معنی میں حقیقت کا درجہ رکھتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں "نیشنلزم لافانی حاکم اعلیٰ کی ایک مقرر کردہ شکتی (طاقت) ہے اور اس عالمگیر توانائی میں سما جانے سے پہلے اس پر خدا کے بتائے ہوئے احکام اور فرائض کی انجام دہی فرض ہے" 31

ان کے لئے نیشنلزم حقیقتاً ایک مذہب تھا۔ پہلے دور کی مثال رحم مادر میں وجود کی تکمیل پر آنے والی ارتقا کی مختلف منازل سے دی جا سکتی ہے۔ دوسری منزل جدوجہد کی ہے۔ یعنی آزمائش اور ابتلا نفس۔ اس کے بعد کامرانی۔ اور آخری منزل تکمیل کی ہے۔ صریحاً قوم پروری کا جذبہ پہلے

---

30. Ibid, P.344.

31. Ibid, P.226.

کچھ ہی لوگوں کے دماغ میں جاگتا ہے پھر رفتہ رفتہ دیگر میدانوں میں پھیلتا ہے اور آخر کار پورے سماج میں پھیل جاتا ہے۔ اس کی معراج پر بھی مختلف لوگوں اور مختلف جماعتوں میں اس کی شدت مختلف درجے کی ہوتی ہے اور اس کے مختلف پہلوؤں پر زور دیا جاتا ہے۔ آربندو نے کہا ہے کہ "نیشنلزم صرف اس کا نام ہے کہ نیشن رقوم اکے اندر مجموعی وحدت کے شعور کی ایک زبردست جذباتی لگن پیدا ہو جائے۔ یہ وحدت ایسی وحدت ہے جس میں اس کے تمام اجزائے ترکیبی خواہ وہ کسی قدر کثیر نظر آتے ہوں اور خواہ وہ بظاہر اپنے عمل میں غیر مساوی ہوں لیکن پھر بھی بنیادی طور پر ایک اور مساوی ہوں"[32]

اگر انھوں نے قوم پروری کو خود آگاہی کے ہند و فلسفے کا جوہر خیال کیا تھا تو وہ اس سے بھی باخبر تھے کہ ہندستان بہت سے مذاہب اور تہذیبوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ انھوں نے لکھا ہے۔

اگرچہ موجودہ ہندستان کی قومیت میں دیگر اقوام بھی شامل ہیں اور اس کی تہذیب میں دنیا کی کئی اور تہذیبیں مجموعی طور پر داخل ہو چکی ہیں۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندو تہذیب اس میں بنیادی اور مرکزی حیثیت کی ہے اور مختلف تہذیبوں کے زیر اثر رہنے اور متنوع اثرات کے تحت آنے کے باوجود یہ مستقل طور پر خود کو ان تمام بیرونی ملک میں رابطوں کے ذریعہ پھیلاتی رہی ہے یہاں تک کہ اس نے دنیا کی ان تمام تہذیبوں پر جو ہندستان میں آکر جمیں اپنا ایک تاریخی نشان قایم کر دیا ہے ...... عیسائیت اور اسلام دونوں ہندستان میں قیام پذیر رہیں گے اور ہندستانی تہذیب کی موجودہ زندگی اور تصورات کے ضروری عناصر بن گئے ہیں" ہندو مذہب اسی طرح عیسائیت نہیں اختیار کرے گا جس طرح مسلم دور حکومت میں اس نے مسلمانیت اختیار نہیں کیا تھا۔ ہندستانی عیسائی بھی ہندو نہیں بنیں گے اور نہ مسلمانوں کو ان کا مذہب ترک کرا کے ہندو بنایا جا سکے گا۔ دنیا کے مختلف مذاہب اور تہذیبیں جو ہندستان میں آباد ہو چکی ہیں وہ ہمیشہ یہاں رہیں گی ایک مشترک قومی زندگی کے اجزا کی تشکیل کریں گے اور جدید ہندستان کی ملی جلی تہذیب کے ارتقا میں حصہ لیں گی"[33]

مارچ ۱۹۰۹ء کے 'بندے ماترم' کے ایک مضمون میں انھوں نے مسلم مسئلہ کا تذکرہ کیا

---

32. Ibid, P. 226.

33. Mukherjee, Haridas & Uma. Bande Matram and Indian Nationalism, P. 93-94

ہے اور سوالات کے جواب میں کہا ہے" ہم مسلمانوں کے سامنے کیا پیش کریں جس سے ان کو ہمارے ساتھ شریک ہونے کی ترغیب ہو سکے۔

یہ ظاہر ہے کہ نیشنلسٹ لوگ مراعات دینے میں حکومت کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے اور نہ کہ مشترکہ مفاد کا ڈھول پیٹنے سے مستقل اتحاد قائم ہو سکتا تھا۔ رائے عامہ کو ہموار کرنے کی اپیل کی راہ میں بہت سی پریشانیاں آئیں کیوں کہ مسلمانوں میں مذہبی جذبہ قوم پروری کے جذبات سے زیادہ شدید ہے" ایسے حالات میں اگر رائے عامہ کو ہموار کرنا ہے تو یہ تب ہی ممکن ہے جب مسلمانوں کے دلوں میں ان کے قومی بھائی ہندوؤں کے لئے بھائی چارہ کا جذبہ جگایا جائے۔ بھائی چارہ کی سیاسی نمائش یا محض زبانی ادعا کچھ کام نہ کرے گا۔ احساسات کے کانوں میں یہ آوازیں "دروغ بانیاں" تصور ہوں گی۔ اور عدم سنجیدگی سے محض زبانی اقرار کر لینے سے کوئی صحیح معنوں کا اتحاد نہیں قائم ہو سکتا۔ لیکن اگر تمہاری قوم کے وہ نوجوان جن کے دماغوں میں مادر وطن کی شبیہہ کا تخیل روز بروز ابھر رہا ہے اپنے دلوں میں یہ جذبہ پیدا کر لیں یعنی ان کے دلوں میں سب کے لئے بھائی چارہ کا نظریہ ہو تو اس بھائی چارہ کے رویہ کے سبب مسلمانوں کی نسبت بھی انھیں اپنے دل میں اسی اپنائیت کے جذبہ کا احساس ہوگا . . . . یہ کام کسی حکمت عملی یا تدبیر سے نہیں ہو سکتا اور نہ کوئی منطق اس سلسلہ میں کارگر ثابت ہو سکتی ہے۔ اگر کام بن سکتا ہے تو صرف دل سے دل کو پکارنے سے۔ جب ہمارے مسلمان بھائی اور خدمات کے کاموں کے ذریعہ اپنے دلوں میں قوم پروری کے جذبہ کو خود بخود پیدا ہوتا ہوا پائیں گے تو دل کی ناقابل مزاحمت آواز اس جذبہ کو دل پر نقش کر دے گی اور وہ صحیح معنوں میں قوم پروری کا مفہوم سمجھ جائیں گے" 34/

سیاست اور قوم پروری کو مذہب کے ساتھ شامل کر لینے کے کچھ نتائج بڑے غلط نکلے۔ مذاہب کی زبان بڑی مطلق العنان ہوتی ہے اور ان کے تقاضے بھی غیر معمولی وفا شعاری کا مطالبہ کرتے ہیں اسی لئے مذہبی اختلافات ان کے پیروؤں کے درمیان ناقابل مصالحت نکتے کھڑے کر دیتے ہیں اور کسی قسم کی مفاہمت کو دشوار بنا دیتے ہیں۔ مذاہب کے مطلق العنانیت سے بھرپور نظریات کے سیاسی معاملات میں جو ایک دنیوی مسئلہ ہے عموماً منحوس ثابت ہوئے ہیں جیسا کہ ہندستان جو آزادی

34- Mukherjee, Haridas and Uma, Sri Aurobindo and The New Thought. PP. 29. 50.

نے تقسیم کی تحریک کے دوران بنایا تھا۔ ان کا پہلے چندرن گور (Chandarangore) اور پھر پانڈیچری (Pandy cherry) چلا جانا ان کی ناکامی کی علامت کا اظہار تھا۔

مذہبی نظریات کے جو نتائج ہوئے ان پر شاید اربندو نے بھی افسوس کیا ہوگا۔ کیونکہ ان ہی نظریات کے سبب ہندستان کے اتحاد کا مقصد جس کی انھوں نے تعلیم دی تھی، نامکمل رہ گیا اس نے ہندوؤں میں اپنے حال و ماضی کی نسبت بے جا تکبر پیدا کر دیا۔ اور ان میں جارحانہ وطن پرستی کا میلان پیدا کر دیا۔ دوسرے اس سے مسلمانوں کے دلوں میں ہندوؤں کے خلاف اندیشے اور پختہ ہوگئے اور ان اندیشوں نے ہندو غلبہ کے اندیشہ کا جواز پیدا کیا۔ کالی کی پوجا کے ذریعہ قوم پروری کے جذبہ کی افزائش غیر ہندو عوام کو پسند نہیں آسکتی تھی جب کہ بنگال کی تقریباً آدھی (۴۶٪) اور ملک کی ایک چوتھائی آبادی انھیں غیر ہندو افراد پر مشتمل تھی۔ بنگال کے باہر کالی پوجا والی بات نے ہندوؤں میں بھی اتنا جوش پیدا نہیں کیا جتنا بنگال میں کیا تھا۔ مہاراشٹر میں تلک نے حب الوطنی کے جذبات کو شیواجی کی زندگی کی جھلکیاں دکھا کر اور گنیش پوجا کے ذریعہ ابھارنے کی کوشش کی۔ پنجاب میں آریہ سماج کے اثرات کے تحت ہندوؤں کا نعرہ کالی پوجا یا گنیش پوجا نہ ہو کر قدیم ویدک دور کے احیا جدید کا نعرہ تھا۔

قومی شعور کو جگانا جو ایک سیماب صفت طریق عمل ہے اربندو کا ایک عظیم مقصد تھا اور دوسرا اتنا ہی اہم آزادی کا حصول تھا۔ اس کے حصول کے لیے ان کی قربانی بھی عظیم تھی۔ اولاً انھوں نے پہلی مرتبہ صاف صاف واضح ترین الفاظ میں اس بات کا اعلان کیا کہ ہندستان کی سیاسی جدوجہد کی آخری منزل اور اس کا مقصد کیا ہے۔ انھوں نے غیر ملکی حکومت کے معنی اور اس کے اثرات و نتائج کی وضاحت کی اور یہ ثابت کیا کہ یہ ہماری قومی خودداری اور اخلاقی فلاح سے قطعی بے ہنگ ہے ایک ملک کے لیے غیر ملکی حکومت کا پابند رہتے ہوئے اپنی مکمل فطری صلاحیت کے مطابق ترقی کرنے کے امکانات نہیں کے برابر ہیں ان کے الفاظ میں ہندو فلسفہ کے مطابق خود آگاہی اور خودداری مذہب کا مقصد ہوتے ہیں۔ ایسی حالت میں جبکہ بیرونی اثرات نے ہمیں مفلوج اور ہماری ترقی کی ڈور کو توڑ ڈالا ہو تو انسانیت کے عظیم مقصد کا حصول مشکل ہی دکھائی دیتا ہے"/35

ان کا نظریہ یہ تھا کہ محکومی نے لوگوں کو تماسک (Tamasek) بنا دیا ہے "یعنی ایک

---

35. Mukherjee Haridas and uma Sri Aurobindo and the New thought P.P. 295

طرح کی جسمانی، ذہنی اور اخلاقی بے بسی نے انھیں بالکل گرادیا ہے وہ دھول اور کیچڑ میں رینگنے والے کیڑوں کی طرح ہیں۔''36

اس لئے قوم پروروں کی تحریک کا مقصد تھا قوم کی روحانی عظمت کو واپس لانا اور اس کے لیے پہلی شرط تھی سیاسی آزادی۔ حقیقت یہ تھی کہ قومی شان و شوکت سماج کی زندگی میں سانس کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور جو قوم اس کو حاصل کرنے میں یا اس کے حصول کے بعد قائم رکھنے میں ناکام ہوگئی اسے مرجانا چاہیئے اور تاریخ ایسی لاشوں سے بھری پڑی ہے۔ ایک ابھرتی ہوئی قوم کو عزت و شان حاصل کرنا چاہیئے ورنہ اس کی بقا ناممکن ہے۔

مکمل آزادی اسی طریقہ کار سے منسلک تھی۔ نوآبادیات کے طرز کی خود اختیاری حکومت یا اس جیسی کوئی بھی چیز جو کسی بھی طرح ملک کی مکمل آزادی میں مزاحم ہو اس سے وہ مفاہمت کی گنجائش نہیں رکھتی۔ آزادی میں آربندو کا طریقہ تھا جو کہ اعتقاد اور ایمان کا معاملہ ہے اس لیے قطعی کسی مصالحت کا امکان ہی نہیں تھا۔ آربندو اپنے اپنے اعتقاد میں اتنے پختہ تھے کہ اپنے اصولوں کو توڑنے کی نسبت انھوں نے کانگرس سے علیحدگی کو پسند کیا انھوں نے بہت قبل 1893ء ہی میں کانگرس پر غیر قومی ہونے کا الزام لگا کر اس کی مذمت کی تھی اور 1900ء سے 1910ء تک کیے گئے اس کے اعمال پر یہ کہہ کر ملامت کی کہ وہ سب بزدلانہ اور خلاف شان اقدامات تھے جس نے اس کو سوراجیہ کے اس مقصد سے دور کر دیا تھا جو کلکتہ میں طے کیا گیا تھا اور اس کی تنگ نظری کو بھی برا بھلا کہا جو کہ ذہنیتوں کی تابعداری اور سلامتی کی سطح سے اوپر اٹھانے میں ناکام رہی ہے۔ اور ان ذلیل نظریات کی بھی مذمت کی جن کی وجہ سے بے روح خود غرضی نے ذہنیتوں کو مسموم کرکے زمین پر رینگنے والے کیڑوں کی صف میں لاکھڑا کیا تھا۔''/37

انھیں مارلے (Morley) کی اس تقریر پر بھی بہت غصہ تھا جس میں انھوں نے پیشن گوئی کی تھی کہ '' ہندستان میں آفتیں اور خونریزیاں شروع ہوجائیں گی اگر انگریز یہاں سے چلے گئے '' ان کے نزدیک یہ بیان بے حد گستاخانہ اور قطعی کھوکھلا تھا لیکن ایسی تباہی ناگزیر تھی تو وہ اس تباہی اور افراتفری کو اس برطانوی امن (جنگ کی ممانعت برطانیہ عظمی کی ماتحت سلطنتوں

---

36. Ibid. 219

37. Mukhergee Haridas and uma Sri Aurobindo's Political thoaght P.177

کو اسے بہتر سمجھتے تھے۔ جواہرلال نہرو کے لاہور سوراجیہ کے اعلان سے تیس برس پیشتر آربندو نے اس نظریہ کو پیش کر دیا تھا۔

ملک کے سامنے برطانوی حکومت سے نجات ہی ایک ممکن مقصد تھا۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اس مقصد کو کیسے حاصل کیا جائے؟ اس کا جواب یہ تھا کہ سب سے پہلے قومی تحریک کو متوسط طبقے کے حدود کے باہر لاکر عوام میں پھیلایا جائے جس کو وہ ہندستان کا غریب اور کچلا ہوا طبقہ کہتے تھے۔ انھوں نے کہا "اپنے عوام کی قوت میں یقین ہماری تحریک کی بنیاد ہے اور اسے تقویت دینے کے لئے موقع ملنے پر بے خوف اور حوصلہ مندانہ اقدامات کرنا ہی ایسا طریقہ ہے جس سے ہماری قومی تحریک تیزی کے ساتھ کامیابی کی طرف بڑھ سکتی ہے۔ جس کی ایشیا کو ضرورت ہے اور جس کا مطالبہ ہندستان کرتا ہے۔"[38]

دوسرے یہ کہ قومی تحریک ایسی ہو "جو مختلف آدمیوں، فرقوں اور جماعتوں کو غرض یہ کہ تمام انسانوں کے روبرو جیسا کہ تلک نے کہا تھا کہ وہ اگرچہ مختلف نظر آتے ہیں لیکن در اصل ان میں وحدت کا جوہر ہے وراث پرش (Purusha Virat) مساوات کا جوہر رکھ سکے"[39]

مساوات کے نظریہ میں سوشلسٹ حکومت کے قیام کا تصور مضمر ہے آربندو کا خیال تھا کہ سوشلزم کے بغیر جمہوریت ایسے میلانات پیدا کرے گی جو کبھی تکمیل پذیر نہ ہوسکیں گے۔ سوشلسٹ جمہوریت ہی واحد سچی جمہوریت ہے کیوں کہ اس کے بغیر کار ہائے منصبی میں مساویانہ اور ہم آہنگ تقسیم ممکن نہ ہوسکے گی" جو کہ ذات پات کے نظام کا بنیادی نظریہ تھا۔[40]

تیسرے یہ کہ سوراج کو جب ہندستان کی سب سے مقدم اور اہم ضرورت تسلیم کر لیا گیا تو اب اس کے حصول کے لئے متحدہ تنظیم کی ضرورت لاحق ہوئی۔ اس میں یہ بات مضمر تھی کہ غلبہ رکھنے والی قوتوں کے خلاف مکمل جنگ جاری کی جائے۔ جنگ کس طرح کی جائے اس کا انحصار تدابیر جنگ جوئی اور صلاحیت پر ہوگا۔ اگر حالات اجازت دیں تو مسلح بغاوت قطعی

38: Mukherjee, Haridas and Uma. Sri Aurobindo and New Political Thought in Indian Politics P. 220.

39. Mukherjee, Haridas and Uma, Sri Aurobindo's Political thought P.137.

40. Mukherjee, Haridas and Uma Sri Aurobindo and New - Thought in Indian Politics P. 159.

جائز اور مناسب ہے اور اس میں کسی اخلاقی پستی یا ضمیر کی ملامت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا دوسرے حالات میں بے مزاحمت مخالفت، مقاومت، مجہول) ہی سب سے کارگر ہتھیار ہے پوشیدہ طور پر عوامی تحریک اور عام بائیکاٹ کے ذریعہ بیرونی اقتدار کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ آزادی حاصل کرنے کے لئے تشدد کی راہ اختیار کرنے کو یکسر خارج نہیں کیا گیا تھا۔

لہذا اربندو نے خاموشی کے ساتھ پوشیدہ طور پر رضاکاروں کی ایسی سپاہ تیار کرنے کے لئے جس پر مستقبل کی مسلح بغاوت کا انحصار تھا کچھ سوسائٹیز بنائی تھیں۔ آزادی کے پروگرام کا یہ حصہ ان کے بھائی بریندر گھوش کو سونپا گیا تھا۔

لیکن ان کے پروگرام کا خاص حصہ بے مزاحمت مخالفت پر مبنی تھا۔ اس کا مقصد ایک ایسی قبول عام قوت کا عالم وجود میں لانا تھا جو مختلف شعبوں سے غیر ملکی لوگوں کو رفتہ رفتہ ہٹا کر ان کی جگہ ہندستانیوں کو دلا دے۔ انھوں نے صلاح دی "کہ موجودہ حالات میں انگریز سے تعاون یا کسی بھی ایسے کام سے جو ان کی تجارت یا نظام حکومت میں معاون ہو یہ یک وقت سب کا انکار کسی انتظامیہ کی تشکیل نہیں کر سکتا"، [41] انھوں نے مزید کہا۔

" ہمیں ایک ایسی عوامی جماعت کی تشکیل کرنا ہے جو ایک جابرانہ بیرونی نظم و نسق کے مقابلہ میں اسی کے برابر صف آرا ہو۔ اور اس کی حریف کی حیثیت سے کام کرے۔ موجودہ نظم و نسق ایک معمولی کچل دینے والا مطلق العنان نظام نہیں ہے بلکہ ایک خاموش سرایت کن اور پر اسرار نظام ہے۔ یعنی ایک ایسا نظام ہے جس نے ہماری قومی زندگی کے ہر شعبہ کو اپنی مضبوط گرفت میں لے لیا ہے۔ اور یہ ہرگز اپنے آکٹوپس کیڑے کی طرح اپنی زبردست گرفت کو ذرا بھی ڈھیلا کرنے پر بآسانی راضی نہ ہوگا۔ اس عوامی جماعت کو زبردست قوتوں کے ذریعہ ایک ایک کرکے ہماری قومی زندگی کے تمام حصوں پر جھگڑنا ہوگا۔ اور اس طرح اپنی معراج یعنی آزادی کو حاصل کرنا ہوگا۔ یہ کم سے کم ذمہ داری ہمیں پوری کرنی ہے"۔ [42]

بے مزاحمت مخالفت درحقیقت اپنی قوت کے ذریعہ اپنی ترقی کی بہترین پالیسی تھی۔ اپنی ترقی کی پالیسی میں ہر شعبہ شامل ہے" صرف یہی نہیں کہ سودیشی اور قومی تعلیم۔ بلکہ

---

41. Mukherjee, Haridas and Uma, Sri Aurobindo's Political Thought p. 44.
42. Ibid

قومی دفاع، قومی عدالتیں، پنچایتیں، صحت عامہ، قحط کے خلاف بیمہ سے محافظت یا قحط کی صورت میں امداد جہاں تک بھی اور جیسے بھی مسائل ہوں جہاں تک ہمارا ہاتھ پہونچ سکے۔ یا جن کے کرنے کی ضرورت ہو"[43]
پروگرام کی حسب ذیل فہرست میں وضاحت کی گئی تھی۔

(1) حکومت کے کل اداروں کا بائیکاٹ اور تعلیم صرف ہندستانی اسکولوں کے ذریعہ

(2) برطانوی مال کا بائیکاٹ اور صرف دیسی سامان کی خریداری

(3) نظام حکومت کا مقاطعہ

(4) سرکاری نظم ونسق کی ماتحت عدالتوں کا مقاطعہ اور اپنی ثالثی عدالتوں کا قیام

(5) گورنمنٹ کی فوج اور پولس کا بائیکاٹ اور ایک ہندستانی دفاعی لیگ کی تنظیم

آخر کار مقاومت مجہول کو دفاعی اور متحرک شکل اختیار کرنی چاہیئے۔ یعنی حکومت کی قانون شکنی اور ٹیکس کی عدم ادائے گی پر آجانا چاہیئے جس سے پورا نظام حکومت مفلوج ہو جائے"۔ ایک محکوم قوم کا آزادی حاصل کرنے کے لئے پہلا فرض یہ ہے کہ تمام خدشات کو بالائے طاق رکھ کر کسی بھی طرح اور کوئی بھی قربانی دینے میں پس وپیش نہ کرے"[44]

اس مقصد کی خاطر۔ گاؤں، اضلاع اور صوبہ کے تعاون سے ایک ایسی قومی اور مرکزی جماعت کا قیام جو قوم کی ضرورتوں کو پورا کر سکے ضروری ہے۔ یہ جماعت یا تو کانگرس خود بنائے یا کانگرس کے باہر کے لوگ اس کا انتظام کریں۔

آربندو کی مقاومت مجہول کی پالیسی کی مخالفت میں دو دلائل آئے ایک میں تو وہ لوگ شامل تھے جو لڑائی جھگڑے سے اس لئے دست بردار ہو گئے تھے کہ ان کے نزدیک یہ ایک گناہ تھا۔ آربندو نے ان کے جواب میں کہا کہ سیاست عوام سے متعلق ہے اور عوام ایک راہب کا رویہ اختیار نہیں کر سکتے انسانی فطرت کو نظر انداز کر دینا۔ ناانصافیوں کو تشدد کو نجات دینے والے کے اٹھے ہوئے ہاتھ کو جب وہ مقابلہ میں وار کرنے کے لئے اٹھے مفلوج کر کے جواز عطا کرتی ہے بھگود گیتا کی تعلیم ان لوگوں کے لئے جو جنگ کو گناہ اور جھگڑے کو اخلاق کی گری ہوئی شکل تصور کر کے اس سے دور بھاگتے ہیں بھرپور ہیں۔
دوسری دلیل یہ تھی کہ مقاطعہ سے نفرت پیدا ہوتی ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ نفرت کی کھائی کو

43- Aurbindo, The Doctrine of Passive Resistance PP. 73-74.
44- Ibid P. 77.

محبت سے پُر کیا جائے۔ انصاف سے ناانصافی کو دور کیا جائے۔ اور گناہوں کو پارسائی کے ذریعہ ختم کیا جائے"
واضح ہو کہ درحقیقت مقاطعہ نفرت حرکت ہرگز نہیں ہے بلکہ ایک طرح سے دفاع کی تحریک ہے۔ مقاطعہ کی ناپسندیدگی بالکل اسی طرح ہے جیسے کسی پر قاتلانہ حملہ کیا جا رہا ہے قاتل پر اپنی دفاع میں حملہ کرنے سے باز رہنے کی صلاح دی جائے۔ آربندو نے بتایا کہ سیاست برہمنوں یا شودروں کے بس کا روگ نہیں "کیوں کہ یہ چھتریوں کا کام ہے اور چھتری نظریات کے تحت ہی ہماری سیاسی تحریک چلنی چاہیئے سیاست میں برہمنوں کے نظریات کی شمولیت کا صاف مطلب یہ ہے کہ "ورن سنسکار" کی تعلیم دی جا رہی ہے۔"45

رابندر ناتھ ٹیگور

بیسویں صدی کے آغاز میں قومی تحریک کے نقوش دھندلے پڑ گئے تھے۔ انڈین نیشنل کانگرس کی کوششیں دس برس سے زیادہ عرصہ میں بھی سلف گورنمنٹ کے مقصد کو پورا تو کیا کرتیں اس کے قریب بھی نہیں پہونچی تھیں۔ برطانوی شہنشاہیت کی شان و شوکت اپنے عروج پر تھی۔ لوگوں پر قہر کا سناٹا طاری تھا۔ حاکم طبقہ بالکل پر سکون اور مطمئن تھا۔

بڑی مذہبی تحریکیں جنہوں نے انیسویں صدی کے اواخر میں ہندو اور مسلمانوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا ٹھنڈی پڑ چکی تھیں۔ برہمو سماج جس میں دو بندر ناتھ (Debendra Nath) کی کوششوں سے کچھ جان پڑ گئی تھی۔ پھر سے منتشر ہو گیا تھا۔ اور رابندر ناتھ ٹیگور Rabindra Nath Tagore کی اتحاد کی تمام کوششیں ناکام ہو گئی تھیں ویکانند کی موت کے بعد رام کرشن مشن نے کوئی ان کا ہم پلہ رہنما نہیں تیار کیا تھا۔ اور یہ مشن صرف بیرونی ممالک میں کچھ وفود بھیجنے اور اپنے ملک میں سماجی بہبودی کا مرکز قائم کرنے پر ہی قانع رہ گیا تھا۔ تھیاسوفیکل سوسائٹی Theosophical Society جو تعلیم یافتہ نوجوانوں کو قائل کرنے میں ناکام ہو گئی تھی۔ اب قدیم ہندستان میں مغربی علوم کے مشترک تعلیمی تجربات کی جانب اپنا رخ پھیر دیا تھا۔

آریہ سماج کے جارحانہ مناظرے کے میدان جو مغربی یو۔پی اور پنجاب تک محدود ہو چکے تھے اور وہ ملائم ہوتے جا رہے تھے لیکن اس کے قابل تعریف کارنامے اس کے بانیان میں تعلیم کے مقاصد

---

45. Ibid, PP. 2-3.

اور لائحہ عمل کے انتظامات کے باوجود مقبول ہوتے جا رہے تھے۔

سر سید کے مذہب کی تعمیر نو کا معاملہ بھی نامکمل رہا وہ کٹر لوگوں سے بہت زیادہ خوف زدہ ہو گئے تھے جنہوں نے ان کے تعلیمی پروگرام کو تہس نہس کر دینے کی دھمکیاں دی تھیں۔ البتہ انھوں نے تعلیم یافتہ مسلمانوں کے نظریات کانگرس سیاست سے پھیر دیے تھے۔

یہ حقیقت عیاں ہوتی جا رہی تھی کہ ہندستان کے مسائل بہت الجھے ہوئے ہیں اور یہ ضروری ہو گیا ہے کہ ان پر نئے طریقوں سے کئی محاذ سے حملہ کیا جائے۔ مذہبی اور سماجی درستگی بہت ضروری تو تھی لیکن سیاسی تبدیلی سب سے اہم ضرورت تھی۔ بہر حال سیاسی تبدیلی کے لئے اخلاقی و ذہنی انقلاب ضروری تھا۔ ایک ایسا انقلاب جو بیکار رسوم کی زنجیروں اور غیر ملکی تہذیب کی اندھی تقلید دونوں سے رہائی دلائے مغربی تعلیم کے باوجود بھی ہندستانی ذہن اپنے معتقدات میں اختلاف رکھتا تھا۔

یہ لازمی ہو گیا تھا کہ افراد اور سماج کے مسائل کی تبلیغ کرنے والے مفکر اپنے اثرات کو استعمال کر کے ہندستانی ذہن کو تحریک آزادی کی طرف مائل کریں۔ یہ حقیقت کہ تحریک آزادی ہندستان کے ان روشن خیال افراد نے شروع کی جنہوں نے فطری طور پر نظریاتی اور اخلاقی قوتوں کو غیر معمولی اہمیت دی اس دور کی تاریخ میں اخلاقی عناصر کو خصوصی اہمیت بخشتی ہے۔ مذہبی رہنماؤں فلسفیوں اور ادیبوں نے لوگوں کی منزل کا تعین کرانے میں سب سے اہم کردار ادا کیا

سیاسی تحریک کو درحقیقت ہندستان کے اقتصادی نظام کی تبدیلیوں نے بہت متاثر کیا کیونکہ تعلیم یافتہ ذہین طبقہ کے وجود میں آنے اور ارتقا کرنے کا دارومدار ہی ان تبدیلیوں پر تھا اور سیاسی کارروائیوں کے لئے محرکات اقتصادی کھنچاؤ اور دباؤ سے ہی فراہم ہوئے لیکن سیاسی مقاصد کے تعین اور مقابلے کے طریقوں کو طے کرنے میں نظریات نے بھی بڑی حد تک کام کیا۔ انیسویں صدی کے معاشی اور صنعتی جمود نے بیسویں صدی کے نظریات کے پنپنے اور پختہ ہونے کے لئے زمین ہموار کر دی تھی۔

اس دور کے ان اخلاقی، سماجی، اور سیاسی فلسفوں کو سمجھنا ضروری ہے جنہوں نے افراد اور جماعتوں کو آزادی کی جنگ پر آمادہ کیا۔

صدی کے آغاز میں اندرون ملک دو قسم کے نظریات عام ہو رہے تھے۔ پہلی شاخ میں وہ قدامت پرست طبقہ تھا جو رادھا کانت دیب Radha Kant Deb کے دھرم سبھا کے پیرو تھے بنکم چنٹر جی اس میدان کے سب سے زبردست کھلاڑی تھے انھوں نے اپنے نیو ہندوازم New Hinduism کی تصدیق کے لئے ہربرٹ اسپنسر Herbert Spencer بینتھم Bentham

اور مل (Mill) کو پیش کیا۔ اس جدید ہندوازم کے مطابق کرشن پیغمبر تھے اور بھگوت گیتا مقدس مذہبی کتاب تھی۔ انھوں نے پرانے ہندو سماج میں مغرب کی تمام نئی قدریں پائیں۔ مثلاً مساوات، انصاف آزادی اور جمہوریت۔ ان کی بلند ذہانت اور ان کے ادبی مقام نے جو انھوں نے اپنی ادبی تخلیقات مثل آنند متھا (Anand math) ناول وغیرہ کی اشاعت سے حاصل کیا تھا ان کے نظریات کو بہت عزت بخشی۔ اس دوران انھوں نے مغربی برتری کے گیت گانے والے متکبر لوگوں کے ناپسندیدہ نظریہ کے لیے اصلاح کن مواد جو نہایت ضروری تھا فراہم کر دیا تھا۔ ان کے بارے میں یہ کہنا درست ہوگا کہ جدیدیت کو انھوں نے نامنظور نہیں کیا۔ کیوں کہ انھوں نے اس کو اپنے فلسفہ پر اپنانے کی کوشش کی ہے۔ ان کا کرشن کے بارے میں نظریہ بجائے اس کے کہ وہ ان کو الوہیت کا درجہ دیں۔ یہ تھا کہ انھیں وہ ایک انسان کامل اور جدید کا پیغمبر مانتے تھے۔

تھیا سوفیکل سوسائٹی نے قدامت پسندی کے اصول مشتہر کیے اور ہندو جوانوں میں اپنی پرانی رسوم ورواج پر تفاخر پیدا کرنے میں مدد دی لیکن اس نے پرانے رسوم کے جواز کی بنیاد عقلی دلائل پر رکھی۔

آریہ سماج جس نے جارحانہ انداز میں ویدک ہندو دھرم کو دنیا کے تمام مذاہب سے قرار دینے کا اعلان کیا تھا وہ قومی تحریکات کی ایک مضبوط معاون ثابت ہوئی۔

سوامی وویکانند نے صرف ہندو مذہب کا تحفظ نہیں کیا بلکہ وہ اپنی لڑائی ان لوگوں کے میدان میں جاکر بھی لڑے جو مغرب کے غلبہ واقتدار کے علمبردار تھے۔

دوسری شاخ اپنے کو رام موہن رائے کی تعلیمات سے وابستہ کرتی تھی جنھوں نے برہمو سماج کی بنیاد رکھی۔ دیبیندر ناتھ ٹیگور (Debendranath Tagore) نے اس تنظیم کو قوت بخشنے کی اور ایسے عناصر سے جمع کرنے کی کوشش کی جو اس کے پرستاروں کی جذباتی ضرورکو پورا کر سکیں۔ اس کے ہندو مذہب کی نفی کرنے والے کچھ اصولوں مثلاً بت پرستی، ذات پات۔ اور کیشو چندر سین کا نوا ودھانا (Nava Vidha-na) کے عیسائی عناصر کو اختیار کرنا وغیرہ نے تحریک کو ہندو سماج سے تقریباً منقطع کر دیا ہوتا لیکن اپنشد اور عارفانہ ہندو نظریات اور ہندو مذہب کی دوسروں کے عقائد کے لیے وسیع النظری کے سبب یہ ہندو سماج میں شامل رہ گئی۔ بدقسمتی سے یہ تحریک مختلف فرقہ بندیوں کے سبب ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بے اثر ہو گئی اور یہ صرف کچھ دانشوروں کے عقیدہ کے طور پر باقی رہ گئی تھی لیکن اس نے ان لوگوں کے ذہنوں میں سرایت کرکے ان کی ماہیت

کو بدل دیا۔ یعنی ان کے نظریات کو وسیع کیا اور مبنی بر عقل سیکولر طرز فکر کی نشو ونما کی

مذہبی ثنا خوانوں Dasa ou کی تعداد کم ہو گئی تھی کچھ تو ہندستانیوں کی آنکھوں میں مغرب کی چمک دمک نے اس قدر خیرگی کر دی تھی کہ وہ اپنے ملک کے مقابلے میں مغربی طور طریق کے اندھے مقلد بن گئے تھے۔ لیکن دوسرے لوگ اگرچہ ان کے ذہن بھی مکمل طور پر مغربیت کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے اپنی مادر وطن سے لگاؤ رکھتے تھے۔ البتہ تحریک آزادی کے لئے اور سماج کو متاثر کرنے کے لئے ان لوگوں کی تعداد بہت کم تھی

مغربیت پرستوں کی حریت پسندی کو مذہب کے احیاء جدید کے حامیوں کی تحریک کے طوفان نے بہت کمزور کر دیا تھا خصوصاً ماضی کو روحانی انداز میں از سر نو تشکیل کرنے سے جو آخر کار صدی کے پہلے دس سالوں میں دھماکہ خیز قوم پرستی کی شکل اختیار کر گیا۔ اس طرح یہ میدان زیادہ تر قدامت پرستوں سے بھر گیا جس میں بہت سے انگریزی تعلیم یافتہ اور روشن خیال لوگ بھی تھے گاؤں اور قصبات میں بسنے والے معاشی بدحالی کے شکار لوگ عادۃً قدامت پرست تھے نہ کہ عقیدۃً۔ جمہوری نظریات کی تعریف اور توصیف نے تعلیم یافتہ طبقہ کو عوام اور اپنے مذہبی عقائد کی ہمدردی کے لئے اکسایا۔ اس احیاء جدید رجحان کی یہ بدنصیبی رہی کہ فرقہ وارانہ جذبات شدید ہو گئے اور اختلافات کی لہریں تیزی سے بہنے لگیں۔

انیسویں صدی کے اواخر میں ان حالات کے دوران جب عوام میں بدامنی اور سیاسی ذہنوں میں ناامیدی پھیل رہی تھی۔ ہندستان کو یہ سوچنا پڑا کہ یہ مسئلہ صرف اتحاد، خود اعتمادی اور ایثار ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اور وہ منتر جو افراد کو جگا سکتا ہے وہ تھا اعتماد، محبت اور خدمت کا جذبہ۔

اس ضرورت نے ایسے لوگوں کو جنم دیا۔ جنہوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں سے جنگ آزادی کے شعلوں کو ہوا دی۔ اس پریشانی کے دور میں ظاہر ہونے والے تمام افراد میں ٹیگور کا نام بہت اہم ہے۔ وہ ہر معاملہ میں فہم و فراست کے مالک تھے۔ نظم، ڈرامہ، کہانی، مضامین اور خطوط وغیرہ تقریباً ہر قسم کی نقاشی ان کے قلم نے کی۔ اور وہ کوئی کم درجہ کے نقاش بھی نہیں تھے۔ سماجی دائرہ کار میں۔ مذہب، سماجی بھلائی، سیاسی اور معاشرتی ترقی، اور تعلیم کے شعبوں میں ان کی کارگزاریاں ناقابل فراموش ہیں لیکن سب سے پہلے وہ ایک شاعر تھے وہ واقعی ایک کوی (شاعر) تھے ایک ایسے شاعر جس میں عقل اور شاعری کا امتزاج ہو۔ ان کے ملک کے لوگ

انھیں احتراماً گرودیو Gurudev کہہ کر پکارتے تھے۔

رابندر ناتھ دیبیندر ناتھ ٹیگور کے بیٹے تھے جو ایک بعد کا پیدا شخص تھے اور رام موہن رائے کی مبنی بر عقل او توحید پرستی کے پرخلوص پیرو تھے اور جس میں انھوں نے خود ایک ایسا ہی جذباتی عنصر شامل کر دیا تھا۔ جس کی عرصہ سے ضرورت محسوس ہوتی تھی۔

ٹیگور خاندان کلکتہ کے اعلیٰ ترین دولت مند طبقہ سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کی اڑیسہ اور مشرقی بنگال میں ریاستیں تھیں اور اس کے افراد جوراسنکو Jorasanko کے اپنے عالی شان محل میں بڑے عیش و عشرت سے رہتے تھے۔ یہ خاندان نظریاتی اعتبار سے اور لوگوں سے کچھ جدا تھا اور اپنے غیر تقلید پسند مذہبی نظریات کو لئے ہوئے سماج سے کچھ کٹ گیا تھا اور تنہائی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ ٹیگور نے کہا ہے "جب میں پیدا ہوا تب کے پہلے ہی ہمارے خاندان نے اپنی معاشرتی کشتی کے مستقل لنگر کی زنجیروں کو توڑ ڈالا تھا۔ اور زیر کر عام طور پر رائج وحشیانہ اور عموماً برتے جانے والے بکثرت ہندو رواج کے دریا سے باہر نکل چکا تھا اور دیوی دیوتاؤں کی پوجا کے صرف دھندلے نقوش باقی رہ گئے تھے۔"[46]

زیادہ تر ٹیگور خاندان کے مرد اور عورتوں نے جو کہ بڑی ذہانت کے مالک تھے دوسرے نوابوں اور راجاؤں کے برعکس اپنے خالی اوقات کو علم و ادب کی خدمت میں صرف کرتے تھے مثلاً موسیقی، آرٹ، ادب، اور فلسفہ میں۔ رابندر ناتھ اپنے باپ کے نویں لڑکے تھے اور 1861ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے بعد بھی پانچ بچے اور پیدا ہوئے عام حالات میں بچوں کی اس قدر کثیر تعداد کو باپ کی وہ توجہ نصیب نہیں ہو سکتی جس کے وہ مستحق ہیں پھر وہ باپ جو ہمہ وقت دھیان، گیان، استغراق اور مذہبی مراقبہ میں مشغول رہتا ہو اس سے بچوں کے متعلق فرائض سے پہلو تہی اور بھی یقینی تھی اور نتیجہ یہ ہونا ہی چاہیئے تھا کہ بچے کو خود اپنی ہی تدابیر اور مسائل پر چھوڑ دیا جائے اس طرح ان کی اپنی ذہنی آزادی کو پیدائشی ماحول سے ترقی اور نشو و نما کا موقع ملا۔

رابندر ناتھ جو ماں باپ کی نازبرداریوں سے جو انھیں تباہ کر سکتی تھیں بچ گئے اور فطرت

46- Chhalabala, tr. Marjorie Sykes, Ray, Nihar Ranjan
An Artist in Life P. 32

کی گود میں رہ کر بہترین اور صحیح تربیت پا گئے۔

ان کی ایک کشادہ ذہانت، ان کے محو جستجو اور محو مشاہدہ دماغ اور جس میں علم کے متعدد شعبوں سے گہری دلچسپی تھی ان میں ایک نایاب شاعرانہ انداز فکر جس میں موسیقی اور ترنم کا جادو بھرا ہوا تھا اور جو نغمہ وسرور کے اجزائے ترکیبی کے نازک فرق کا بلیغ احساس بھی رکھتا تھا شامل ہو گیا تھا۔

ان کا تخیل غیر معمولی طور پر زرخیز تھا اس کی پرواز آسمان کی بلندیوں کو چھوتی تھی اور اگر ممکن ہوتا تو اس سے بھی آگے جاتی اور ساتھ ہی ان کا تخیل انسانی شخصیت کی عمیق گہرائیوں میں پہونچ کر اس کی فطرت کی صحیح عکاسی بھی کرتا تھا۔

ٹیگور کی رسائی ان معانی تک بھی تھی جو سربستہ راز تھے اور اشیاء اور تصور کا تعلق غیر متوقع طور پر تلاش کر لیتے تھے۔ وہ گھاس کی ایک پتی میں دنیا کے ارتقا کی پوری تاریخ دیکھ کر سکتے تھے اور اس میں اس کا بھی مشاہدہ کر سکتے تھے کہ زمین آسمان بننے کا حوصلہ کرے۔ انسانی جذبات کی نورانی شعاعوں سے ان کا دل منور تھا۔

ایک زندہ و بیدار وجدان نے ان میں وحدت کا وہ شعور پیدا کر دیا جو عالم میں سرایت کئے ہوئے ہے جس نے انھیں لامحدود ہستی کی بصیرت عنایت کی لامحدود اور محدود میں جو تعلق اور ہم آہنگی ہے اس کے تاثرات ان کے دل کی دھڑکن بن گئے تھے۔ ل

محنت کی غیر معمولی صلاحیت، فطری لگن، آزادی کا جوش اور سچائی کے لئے بے مثا عقیدت نے انھیں ایک فنکار کے درجہ سے بلند کر کے انسانی عقائد کے تحفظ کا اعلیٰ ترین شاعر بنا دیا۔

ٹیگور نے اپنی تعلیم خود اپنی ذات کے بل پر حاصل کی اور جو کچھ وہ ہوئے اس کے وہ خود معمار تھے۔ وہ تمام زندگی اپنی زندگی کی کاملیت کے لئے جد وجہد کرتے رہے۔ انھوں نے سنگیت، شاعری، ڈرامہ، کہانیاں، تفسیریں، سیاست، فلسفہ اور تعلیم سے اپنا تعلق بنائے رکھا اور اپنے جستجوئے حق کی آزمائش میں ترقی کی راہ پر لگے رہے اور سچائی اور حقیقت پسندی کے اپنے روز افزوں ترقی پذیر تصورات کے ماتحت ہی اپنی زندگی کو ڈھالتے رہے۔

اپنی زندگی کے پہلے دور میں جب ان کا ذہن بہت رسیلے نغمے بکھیر رہا تھا تو اس وقت انھوں نے مشرقی و مغربی علوم کا ایک ذخیرہ بکھیر دیا۔ انگریزی رومانی شاعری، روشن خیالی اور مثبتی نظریات کے حامل فلسفہ، اور ان کی نئی سائنس نے ان کے دماغ کی چکی کے لئے جو کے دانے کا کام کیا

قدیم سنسکرت کی پرانی روایات جن میں ویدا اپنشد ، مہابھارت ، رامائن ، بدھ ادب اور کالی داس کے ڈرامے اور نظم شامل ہیں ان سب نے ان کے دماغ کو اپنے سانچہ میں ڈھالا از منہ وسطیٰ کے وشنو سادھوؤں اور سنگتوں کے گیتوں اور شاعری نے انھیں کافی متاثر کیا اور موجودہ بنگالی ادب کے لئے نوئے تنقید اور موازنے کے لئے مواد فراہم کیا ۔

رابندر ناتھ ایک ایسے بحرانی دور میں سے جس کی نزاکت روز بروز بڑھتی جا رہی تھی قوموں کے درمیان باہمی مخاصمت ، قوموں کی اندرونی منافقتیں ۔ مملکتوں کے تصادم نوشتہ تقدیر کی طرح دنیا کی تباہی و بربادی کی جانب رواں دواں تھے ۔ لیکن آفت پذیر دنیا کی کشمکش کے خلاف شاعر کا سنجیدہ ردعمل اس کی افراتفری سے بہت بلند اٹھا ۔ انھوں نے ان موجودہ ابتریوں کے اس پار اپنی بصیرت کی آنکھوں سے ایک نئی دنیا کا نظارہ کیا اور ان کے باطنی تجربات نے ان پر وہ دنیا ظاہر کر دی جس میں لامحدود مسرت اور خوشیاں موجزن تھیں ان کا دل انسان کے لئے لامحدود پیار سے بھرا ہوا تھا اس دور کے تجربے نے ان کی شاعری کو متاثر کیا ۔ اس میں انسان کی سماجی پریشانیوں اور روحانی سرخوشی کا امتزاج تھا یہ بہادری سے طوفان کے مقابلہ میں جم گئی اگرچہ تلخ حقیقتوں نے امیدوں کی لہروں کو بہنے سے بہت روکا لیکن ان کا باطنی شعور یاس کے تمام افکار پر غالب آیا ۔ ان افکار کے پرے سچائی ، کائنات میں وحدت کے دریافت کی مسرت کی سرشاری ، انسان اور فطرت کے مابین ہم آہنگی ، آخر کار مقصد کی کامیابی فطرت میں پائی جانے والی بے آہنگی ، دنیا ، درد و کرب ، مرض و موت کی مہلیت ، انسانوں کی باہمی نفرت اور ایک دوسرے پر ظلم کی حماقت ان سب کو انھوں نے پا لیا ۔ لیکن ٹیگور کی خوش قسمتی تھی کہ ان کے جیون دیوتا (باطنی رہنما) سے انھیں اس قدر تقویت ملی کہ وہ اس طغیانی خیز طوفان کو پار کر گئے اور ذہنی سکون حاصل کرنے میں کامیاب ہے جب انھوں نے دنیا کا مطالعہ کیا تو دیکھا کہ مغرب و مشرق کے درمیان ناقابل مصالحت اختلافات کے تصادم موجود ہیں ۔ مغرب کی کامیابی ، مادی برتری اور مشرق پر اس کی حکومت ان کی نگاہ میں میں سچی انسانیت کے بدترین دشمن تھے ۔ ہندوستان کو اس کا ماضی آواز دے رہا تھا کہ اسے حقارت و ذلت سے نکالا جائے ۔

ان کے ملک کے پس منظر نے ان کے واسطے ایک وہ مادی اسٹیج تیار کیا ۔ جہاں ان کے دماغ میں کشمکش پیدا ہوئی ۔ وہ بنگال کے ایک دوسرے کے فرق نے ان کے ذہنی ارتقا کی ساخت کو تیار کیا ایک بنگال تو دریائے گنگا کا تھا یعنی عیش و عشرت کا ایک زرخیز ملک جہاں ناقابل یقین درجہ تک

سرسبز و شاداب میدان ہیں اور جس میں ہرے بھرے چشمے ہیں جن میں چھوٹی چھوٹی خوبصورت چڑیاں ررام چڑیاں جن کی غذا مچھلی ہے، باز، بڑی بڑی سروں والی چیلیں ٹیلیفون کے تاروں یا ریت پر بیٹھی رہتی ہیں جہاں وہ دریا کی آہستہ خرام موجوں سے باہر آکر اپنی چوڑی پیٹھ کو سورج کی آگ سے سینکتی ہیں۔ جہاں اونگھتے ہوئے یا تیز رفتار ریتو ارد کھائی دیتے ہیں اور جس میں وہ عظیم دریا ہے جس کی تمام ہندستان پوجا کرتا ہے۔ وہ اس کی ان طوفانی لہروں سے جو آسمان کے برستے ہوئے پانی سے امڈتی ہیں اس کے خوفناک شور او تقابل، اس کے بادلوں اور بجلی کے انتہائی نفیس و نازک سکون و سکوت سے اور اس کے وسیع رقبوں سے بخوبی آشنا ہے۔"[47]

" اور ایک دوسرا بنگال۔ جو باہر پاکی وادی سے نکلا ہے، خشک اور تپتا ہوا نیلے پتھروں کا میدان جہاں سال اور کانٹے دار پودوں کے جنگل پائے جاتے ہیں، جہاں چھوٹے چھوٹے کھجور اور پام کے درخت اگتے ہیں اور جہاں موسم بہار میں پلاس اپنے لال رنگ کے پھول ہر جگہ بکھیر دیتا ہیں"[48]
پہلا بنگال تو ٹیگور کی شاعری، ڈرامہ اور کہانیوں کا سنہرا بنگال تھا اور دوسرا بنگال ایک سخت ضدی بنگال تھا جو فطرت کے خلاف ایک شدید جنگ میں مصروف تھا۔ اور اپنے مفاد اور فلاح کی خاطر انسانیت کو اور ہندستان کے مستقبل کے شہریوں کی تربیت کی کارروائیوں کو چیلنج دے رہا تھا۔

ان دو رخے جذبات نے ٹیگور کو ان کے مقصد سے روشناس کیا۔ یعنی نوع انسان کے اختلافات کو آنکھا دیں بدلنا اور جھگڑتے ہوئے لوگوں کو ہم آہنگی پیدا کرنا اور فطرت اور انسان کو ایک محاذ پر لاکر ان میں مصالحت کرا دینا۔ وہ انسان کی سالمیت کی وکالت کرتے تھے جو سب کو اپنے اندر شامل رکھتا ہے۔ یعنی ایزدی، فطری، اور انسانی۔ یہی ان کا مذہب تھا اور انھوں نے اسے صرف منطقی استدلال اور ماوراء الطبیعاتی دلائل سے نہیں بلکہ اس سے زیادہ اپنے تجربات سے حاصل کیا تھا/[49]

ٹیگور کو ایک ایسے فرد کے مشابہ قرار دینا جو کسی مصدقہ اور معلوم مذہب یا عقیدہ کا قائل ہو۔

---

47. Thompson, E.J. Rabindernath Tagore, His Life and works P. 7.

48. Ibid

49. Tagore Rabindra Nath. The Religion of Man Chapter V The vision.

قطعی نامکمل ہے راسخ العقیدہ ہندو دھرم، اس کے مندروں، پیچیدہ رسموں، معرفت کے میدان میں اس کی کرم تھیوری۔ بار بار مرنے اور پھر جنم لینے کے چکر، اور درجہ بدرجہ قایم رہنے والا سماجی نظام جس کی ذات بنیاد تھی۔ ان سب کو انھوں نے ایک برہمو کی حیثیت سے کب کا خیرباد کہہ دیا تھا برہمو طبقہ کو متحد کرنے کی کوشش برہمو سماج میں ناکام ہو جانے کے بعد ان کی دلچسپی ختم ہو گئی وہ اس کی سچائی کے پیمانے اور ما فوق الفطرت تزکیۂ نفس سے غیر مطمئن تھے۔ وہ مذہب جو رہبانیت پر زور دے اور دنیا کو ترک کرنے کی بات کرے اسے وہ بے کار سمجھتے تھے اور نہ وہ ان مذاہب ہی کے حامی تھے جنہوں نے نوع انسان کو دو طبقوں میں منقسم کر دیا ہے۔ ایک وہ جو جنت میں جائیں گے دوسرے وہ جو ہمیشہ جہنم میں جلتے رہیں گے۔

ان کے نزدیک روح کا خدا کے وجود میں ضم ہو جانے کا اشتیاق اور خدا کو اپنے اندر محسوس کرنے کی کوشش ہی کا نام مذہب تھا۔ ان کا کہنا ہے" جو احساس مجھے ہمیشہ رہا وہ تھا اپنی شخصیت کا گہرا اطمینان۔ جو ہر طرف سے چشموں سے بہتے ہوئے آ کر میری فطرت کے دھارے کے ساتھ رواں ہوا" 50/۔ (ان کی یہ ایک نظم ہے)

وہ نئے انسان کے آمد کی خبر دینے والا ہے

" دیکھو دیکھو وہ انسان آ رہا ہے۔ جو غیر فانی ازلی اور ابدی ہے

اور اس ارض فانی کے ذرات اور اس کے پھول ہر چہار جانب کپکپا رہے ہیں

طلوع ہوتے ہوئے سورج کی چوٹیوں سے یہ پکار سامعہ نواز ہو رہی ہے۔ ڈرومت ڈرومت یہ پکار ایک نئی زندگی کا مژدہ سنا رہی ہے۔ ہزاروں صداؤں سے فضا آسمانی کی دھجیاں اڑ رہی ہیں۔ فتح، فتح، انسان کی بیداری کی" 51/

ان کے براہ راست مشاہدہ سے جس نے ان کی روح کو سرخوشی کے نور سے منور کر دیا تھا۔ کئی اہم نتیجے برآمد ہوئے۔ سب سے پہلا تو یہ کہ تخیل، احساسات اور مشاہدہ کو دلائل اور عقل پر برتری حاصل ہے۔ مشاہدہ نے ایسی سچائی سے روشناس کرایا جو کہ لامحدود، دوامی اور آفاقی حیثیت کی حامل تھی۔ عقل۔ مقام اور وقت کی پابند تھی۔ اس نے ان حقائق کو جو فطرت نے عطا

---

50. Das Gupta, S.K. Rabindranath, The Poet and the Philosopher P.64.

51. Ray. Nihar Ranjan, opcit P. 21, P. 40.

کئے۔ جمع کر کے تصورات اور سائنس کے نظام کی تشکیل کی لیکن یہ عقل نہیں بلکہ ایک قلبی ہی کیفیت ہے جو وقتاً فوقتاً تمام کائنات کی رگ و پے میں سرایت کرنے والی شخصیت کا شعور حاصل کر کے انسانی شخصیت کے پہلو کو اجاگر کرتی ہے۔" 52

انھوں نے شخصیت کی تعریف اس طرح کی ہے "شخصیت انسان کے اندر ماورائی وحدت کا شعور و ادراک ہے۔ واقعات کی تمام تفصیلات کو جو اس کی انفرادیت کے تحت اس کے علم، احساس، خواہش، رضا اور حرکت سے تعلق رکھتی ہیں اس کی اپنی نظر آتی ہیں۔" 53

یہ شخصیت ایک منفی پہلو بھی رکھتی ہے کیوں کہ یہ فرد کی علیحدگی پر مبنی ہے لیکن ثانی اعتبار سے علم محبت اور عمل کی وسعت کے ذریعہ یہ لامحدود ہو جاتی ہے۔

فرد کی محدود شخصیت کا نمو خدا کی لامحدود شخصیت کے اضافی پہلو سے ارتقا کی منزلیں طے کر کے ہوا ہے۔ اس طرح تخلیق کا چکر لامحدود سے شروع ہوتا ہے جو اپنی ذات کو محدود میں نفوذ کرتا ہے اور یہ محدود کچھ لامحدود میں ضم ہو جاتا ہے اس طرح محدود ایک سلسلہ ہے جس میں قدرت کا ارتقا بے جان سے جاندار تک ہوتا ہے لیکن اس مقام پر پہنچ کر یہ فطری ارتقاء اپنے آخری عروج پر پہونچ جاتا ہے اور ایک نیا مقام آجاتا ہے جو فطرت سے ماوراء ہوتا ہے تب وہ "خدا" اس کا حاکم بن جاتا ہے اور اپنی رضا کی متابعت کا اس کو حکم دیتا ہے۔

اس طرح انسان ایک ایسی شخصیت ہے جو اپنے سے بلند تر شخصیت کی جستجو کرتا ہے۔ یہ تلاش انسان کو اپنی ذات اور اس لامحدودیت میں انسیاب کراتی ہے جو کہ رنگ، نسل اور ایسی دیگر محدود شخصیتوں سے پرے معاشرے کی شکل میں چھپی ہوئی ہے اجتماعی انفرادی کاملیت کا راستہ یعنی وہ راستہ جہاں انسان کو اچھائی، خوبصورتی اور سچائی کے آگے کا مشاہدہ بھی ہو جاتا ہے۔
انسان رنگ، نسل، مذہب اور قومیت سے بے نیاز انسان کی تلاش میں افتاں خیزاں چلا جا رہا ہے یہ اعتقادی یا غیر استدلالی مذہب نہیں ہے۔ یہ تمام مذاہب سے مل کر بنا ہوا ایسا مذہب ہے جس میں تمام مذاہب کی روح بسی ہوئی ہے۔ یہ مذہب انسان کو تمام پابندیوں سے آزاد کراتا ہے جو غیر یقینی ہے جو اس کی شخصیت کی ارتقا میں حائل ہوتے ہیں۔ یہ ان قدروں پر زور دیتا

---

52. Tagore, Rabindranath, The Religion of Man, P. 132.
53. Ibid, P. 119.

ہے جن کو یہ دنیا نظر میں نہیں لاتی۔

ٹیگور نے ہندوؤں کے بنیادی اصول کو تسلیم نہیں کیا۔ انھوں نے سنسار (موت وحیات کا چکر) تناسخ کے اصول میں یقین نہیں کیا۔ جس کے مطابق زندگی اور موت کا ایک مستقل چکر (پھیر) قائم ہے۔ ان کے نزدیک اس زندگی کے بعد مستقبل کی زندگی میں خواہشات، نفس، دولت اور نام وغیرہ کا کوئی تسلسل نہیں ہوگا اور اس زندگی کے بعد مستقبل کی زندگی میں بعد ازمات میں تکمیل نہیں کیا جا سکتا۔ اس زندگی کے بعد زندگی قائم نہیں رہ سکتی کیوں کہ موت اس زندگی کے حساب کو بالکل بند کر دیتی ہے۔ انھوں نے کہا تھا: "ہمیں ان کے درمیان اپنے لافانی ہونے کا کوئی دعویٰ کر کے پھر کبھی واپس نہیں آؤں گا۔" خدا کے اندر بذریعہ محبت ختم ہو جانے ہی کا نام ان کے نزدیک پنر جنم تھا۔

انھوں نے فرقہ واریت اور اس کے انسانی عدم مساوات کے بنیادی اصولوں کی ملامت کی۔ ان کا نظریہ تھا کہ یہ دنیا انسان کے لئے ایک پُر فریب بھول بھلیاں ہے اور انسان کو دکھ سکھ کی وادیوں سے گذرنا ہے۔ انھوں نے راہبانہ نظریات کی مخالفت کی۔ اس عقیدے کو بھی کہ ہم نہیں کیا کہ نفس کشی کے ذریعہ انسان کو نجات حاصل ہو سکتی ہے۔

ٹیگور دوسرے مذہب کے پاک لوگوں کے زیر سایہ تنگ اور سخت اصولوں سے بھی متاثر نہیں ہوئے جن چیزوں کی ان کے اندر قدر و منزلت تھی وہ تھے رحم، محبت، قربانی، خدمت، سچائی اور سب سے بالاتر اپنی ذات کی ارتقا کے ذریعہ کامل و لامحدود ہستی کا اپنے اندر عرفان کی کوشش۔

ٹیگور کا یہ تصور کہ انسان کی شخصیت مجموعی طور پر اللہ کی شخصیت کے مماثل ہے انسان کو عزت و شان کے عروج پر پہونچا دیتا ہے۔ شخصیت کے تصور میں احساسات، نظریات اور عمل کے ذریعہ آزادی جو کردار کا وہ پہلو ہے جو ہر مزاحمت اور پابندی سے آزادی کی ترغیب دیتا ہے۔ چاہے یہ پابندی ماضی کی وراثت کے اصولوں کی ہو یا موجودہ رفتار زمانہ کی پیدا کردہ ہو۔ شامل ہے۔ یہ سماجی پابندی اور سیاسی بندشوں کے خلاف بانگ دہل اعلان تھی انھوں نے اپنی نظم و نثر کے ذریعہ اپنے ملک کے لوگوں کو حوصلہ مند، خود اعتماد، آزاد اور اس شخصیت کے قابل بننے کی پُر زور تلقین کی ہے جو بحیثیت ایک انسان انھیں ملی ہے۔ اپنے ایک مشہور گیت میں انھوں نے ہندستانی عوام کو للکارا ہے۔

اگر تیری پکار پر کوئی تیرے پیچھے نہ چلے تب بھی تو اکیلا ہی آگے چل
اکیلا ہی آگے چل، اکیلا ہی آگے چل
اگر کوئی تجھ سے بات نہ کرے اس لئے اے تو اے تو اے بدنصیب اکیلا
اگر ہر آدمی تجھ سے منہ موڑ لے تب بھی تو کھلے دل سے اپنی روح کے پیغام کو
فرض یاد دلانے والی بلند آواز سے پکار 54/

ذاتی مذہب اور انفرادی کوشش کے رجحان نے ان کی فطرت، انسان اور سماج سے متعلق اصولوں کو قطعیت عطا کر دی۔ ان کے لئے دنیا فریب، مایا اور غیر حقیقی شے نہیں تھی اس کے برعکس فطرت نے انسان کو محبت اور عیش و عشرت اور لطف اندوزی کے لئے اور حکومت کرنے کے لئے اپنی آغوش میں بٹھایا۔ ٹیگور نے ازمنہ وسطیٰ کے سادھوؤں کو پسند نہیں کیا جو اس ڈر سے کہ کہیں مادی دنیا کی رنگینیاں ان کی روح کو غلط راستے پر نہ ڈال دیں۔ برفیلی پہاڑی چوٹیوں پر آنکھ بند کئے مراقبہ میں بیٹھے رہتے تھے وہ تو اپنے احساس و شعور کے ذریعہ رنگ و روپ اور آواز کے سحر کو پی جانے میں یقین رکھتے تھے۔ ان کے نزدیک فطرت ایک خوبصورت شے تھی جس کا لطف ہمیشہ اٹھایا جانا چاہیئے۔ لیکن ان کے نزدیک فطرت غلام بھی تھی اور ساتھی بھی۔ انسان کا دماغ اس کی پوشیدہ قوتوں کو حاصل کر کے اپنی آزادی کو نمایاں کرنے کے لئے اسے استعمال کرتا ہے۔

یہ نظریہ کائنات حقیقتہ الحقائق کا مظہر ہے۔ اس تصور کی تائید کرتا ہے جو انھوں نے اپنشد Upanished اور قرون وسطیٰ کے سادھوؤں کے گیتوں میں پایا تھا مثلاً اپنشد کی تعلیم ہے کہ
وہ سب کچھ جو اس متحرک دنیا میں حرکت کرتا ہے وہ آقائے حقیقی کی قیام گاہ بننے کا مستحق ہے 55/
کبیر کی گیت ہے

" وہاں زندگی اور موت کی راگ کا زیر و بم ہے — خوشی ابل پڑتی ہے اور خلاء بسیط نور سے منور ہو جاتا ہے — وہاں وہ بے آواز موسیقی سامعہ نواز ہوتی ہے — یہ ان دنیاؤں کا زندہ جاوید نغمہ ہے — وہاں کروڑوں سورج اور چاند کی شمعیں جل رہی ہیں — وہاں نقارے بجتے ہیں اور عاشق سرور میں جھومتا ہے۔ وہاں محبت کے گیت گونج رہے ہیں اور نور کی شعاعیں نازل ہو رہی ہیں"56/

شخصیت کے جس پہلو سے ٹیگور کا گہرا تعلق ہے وہ اپنی ذات کے احساس، شعور، اور اس

54- Tagore Rabindranath 55- Isha Upanished.
56- Tagore Rabindranath One Hundred Songs of Kabir.

فرد سے متعلق ہے جس کا دل محبت سے معمور ہے۔ انیسویں صدی کے انگریز لبرل فلسفیوں اور روسو (Rausseau) کی انفرادیت کی روحانی توضیح ہے اسی ضمن میں اور اسی لبرل انفرادیت کے تحت یہ دنیا کا نظام چلتا ہے۔ سماج، حکومت، قوم، سیاست تجارت نے جنگ وغیرہ اس دنیا کے لئے التزامی کہرے کے مانند ہیں۔ ٹیگور کے مطابق:

" انسان کی دنیا میں ہر جگہ تصورات کے غلبہ نے انسانی حقائق کا خون کر رکھا ہے اس سے ہستی اعلیٰ منفعل ہے۔ جب ہم ایک مرتبہ بقاء اصلح کے سائنسی اصول کو سچ مان لیں تو فوراً انسانی شخصیت کے پورے عالم کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک اکتا دینے والے صحرائے ریگزار میں تبدیل کر دیتی ہے۔ جہاں کل اشیاء اسرار زندگی سے محروم ہو کر معمولی نظر آتی ہیں"[57]

فرد کی مادی حیثیت کا سماج کی اس علیحدگی کے تعلق کے اس تصور کو تسلیم کرنا غالباً ممکن نہ ہو ٹیگور نے خود یہ تسلیم کیا ہے کہ فرد کی دنیا کی تمام شخصیتوں کی کثرت میں اس برتر و بالا ہستی کو تلاش کرتا ہے لیکن حقیقتہ الحقائق کے اس پہلو پر وہ کوئی تفصیلی روشنی نہیں ڈالتے جو سماج کے وجود میں مضمر ہے بہرحال جو کچھ بھی ہو۔ لیکن ہندستان کے سماجی ماحول میں جہاں فرد سخت سماجی پابندیوں میں قید ہے۔ یہ ضروری تھا کہ فرد کا آزادانہ طرز عمل اور خود روی پر زور دیا جاتا۔ اور دلیری کے ساتھ زور دیکر یہ کہا جاتا کہ فرد کو حق ہے کہ اپنے آپ کو آشکارا کرے۔

ٹیگور کے مطابق انسان کا اعلیٰ مقصد شخصیت کی تکمیل تھی۔ لیکن یہ تکمیل مراقبہ میں بیٹھ کر، دنیا کے جدوجہد سے کنارہ کشی کر کے اور خود کو اپنی ذہنی گفا میں دفن کر کے نہیں بلکہ یہ تکمیل زندگی کے دریا کے راستہ میں آنے والی تمام رکاوٹوں کو اکھاڑ ڈالنے کے لافانی عزم کے ذریعہ ہونی چاہیئے ان کے ڈرامے مکتا دھر (Mukta Dhara) میں اسی مقصد کو ظاہر کیا گیا ہے بودھی ستوا (Bodhistua) اور دی پرانی کرونکا (The Parani Karunika) کے مانند بھی کہتے ہیں کہ " جب تک ہر انسان نروان حاصل نہ کرے تو میں خود اس وقت تک نروان کی منزل میں داخل نہیں ہو سکتا ہوں۔

ٹیگور کے مسلک کے مطابق نجات عمل سے مل سکتی ہے نہ کہ ترک دنیا سے۔ ان کا کہنا ہے کہ "ترک دنیا کے ذریعہ نجات حاصل کرنا میرا مقصد نہیں ہے میں تو اس کی لذت دنیا کی لاتعداد پابندیاں

57- Tegore Rabindranath. Personality. P 37.

پناہ کر حاصل کروں گا" پھر وہ کہتے ہیں :۔

" یہ کیسے ممکن ہے کہ میں اپنی نجات کی خاطر اس پریشانی حال اور آفتوں میں گھری ہوئی دنیا کو چھوڑ کر گوشۂ تنہائی میں سمادھی لگادوں" / 58

ٹیگور نے اس عقیدہ پر زور دیا ہے کہ انسان فطرت اور ضرورت سے مجبور نہیں ہے۔ اس کی قسمت نے اس کو پابند نہیں کر دیا ہے در اصل اس کے اندر بے پناہ اضافی قوت موجود ہے جس کے استعمال سے وہ اپنی جسمانی اور حیاتیاتی ضرورتوں کا علم حاصل کرتا ہے اور سائنس اور فلسفہ کا بہترین نظام قائم کرتا ہے۔ وہ ہمدردی اور بھائی چارے کے جذبات کے وافر مادے کو سجا کر اس سے نظریات اور اخلاقیات کے اصول تیار کرتا ہے۔ اس کے پاس تخیل اور احساسات کی کثیر مقدار ہے اور وہ ان کے ذریعہ آرٹ کے بہترین نمونے ایجاد کرتا ہے اس کی خود آگاہی کی بے مثال قوت مذہب کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ مختصر یہ کہ شخصیت کے سحر سے خود اپنی دنیا کا انتخاب کرنے، اس کی تخلیق کرنے اور تعمیر کرنے کی قوت عطا کرتا ہے۔ جو حرکات و سکنات میں رنگ و روپ ہیں۔ غرض ہر طرح تصوراتی سائنس کی اس دنیا سے مختلف ہوتی ہے جس کی افادیت جو اس کے لامحدود اجزائے ترکیبی پر منحصر ہے اس اختلاف کا سبب ہے اس اختلاف میں الوہیت کے رموز پنہاں ہیں۔ یہ پردہ ان چیزوں کے بعد اس شعور کو جگاتی ہے جو صرف خدا ہی نہیں ہے جس کی انسان کو ضرورت ہے بلکہ خدا بھی اس کی ضرورت اتنی ہی محسوس کرتا ہے تاکہ انسان کے وجود میں خدا کا وجود شامل ہو جائے اس لئے انسان صرف خدا سے لینے والا ہی نہیں ہے بلکہ خدا کو دیتا بھی ہے۔

اپنے حاکموں کے قدموں میں بندھے پڑے ہندستان کے لوگوں کے لئے اس سبق کی تعلیم آزادی کی پہلی شرط تھی انیسویں صدی کے آخری دس سالوں سے بیسویں صدی کے اوّل دس سالوں میں لکھی گئی تمام نظموں اور نثری مضامین میں ٹیگور نے یہی پیغام دیا ہے۔ اس کے سرایت کرنے والے اثرات نے کام کیا اور یہ مغرور اور منکسر مزاج سب کے لئے جاندار بن گیا۔ بنگال میں نئی طاقت کا سیلاب آگیا۔ جو بیسویں صدی کے آغاز پر پھٹ پڑا۔ اور رفتار اور قوت میں تیز تر ہو کر تمام سیاسی مزاحمتوں کو روندتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔

ٹیگور کوئی سیاستداں نہیں تھے بلکہ ایک سادھو تھے۔ انھوں نے لوگوں میں ایک نئی روح

58- Chakravarti. A. Mitra S. K. Sen, Sachin and Ray, Nihar Ranjan. Rabindranath (Greater India Series) P. 41.

پھونک دی تھی۔ وہ نئے دور کے ایک پیغمبر تھے جو وقت کے آغوش میں آج بھی زندہ ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ ملک کے بنیادی مسائل سے گہرا تعلق رکھتے تھے۔ جس میں سے ایک تقسیم بنگال کا مسئلہ بھی تھا۔ تقسیم بنگال کے خلاف تحریک میں انھوں نے مشعل راہ بن کر کام کیا۔ اور ان کے تعاون نے اس تحریک کو کل ہند حیثیت عطا کر دی لیکن انھوں نے محسوس کیا کہ صرف سیاست سے کام نہیں چل سکتا۔ اس لئے انھوں نے سائنس، آرٹس اور انگریز کلچر کے کالجوں کے ساتھ شانتی نکیتن میں وشوا بھارتی یونیورسٹی اس لئے قایم کی تاکہ قومی تعلیم کی ماڈل تعلیم گاہ کا کام دے۔

ٹیگور کا فرد کی منفرد شخصیت سے سماج کی اجتماعی شخصیت تک گریز غیر یقینی ہے وہ کبھی کبھی سماج کی مادی حقیقت سے برطانوی افادیت پسندوں کی طرح منحرف نظر آتا ہے۔ لیکن دوسری جگہوں پر اس کو ایک مذہبی عقیدے کے نام دیتا ہے اور کبھی وہ سماج کو ایک ایسی اجتماعی شخصیت خیال کرتا ہے جس کے ذریعہ انسان خود شناسی و خود آگاہی کی جانب بڑھتا ہے مثال کے طور پر وہ اپنے ایک لیکچر مغرب میں قومیت (Nationalism in the west) میں سماج کی تعریف مندرجہ ذیل الفاظ میں کرتا ہے۔

" سماج کے قیام کا کوئی ماورا مقصد نہیں ہے بلکہ اس کا وجود ہی خود اس کا مقصد ہے کیوں کہ اس سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ انسان ایک مدنی الطبع مخلوق ہے، کیوں کہ ایک انسان سے دوسرے انسان کا قدرتی میل ملاپ اسی سے نمایاں ہوتا ہے۔ تاکہ انسان ایک دوسرے کی مدد سے زندگی کے مقاصد متعین کر سکیں " / 59

اس سے اس نظریہ کی توثیق ہوتی ہے کہ اپنی فطرت ہی کے لحاظ سے انسان مدنی الطبع ہے اور اس لئے اس سے اس نظریہ کی تردید ہوتی ہے کہ یہ ایک محض تخیل ہے، ایک مقصد کو خود متعین کر کے اس کو پرانز بنانے کے لئے مصنوعی ترکیب بازی ہے۔

وہ سماج کے فطری ہونے کے نظریہ کو یہ کہہ کر اور تقویت دیتے ہیں کہ "سماج کی تعمیر انسان کے ان اخلاقی اور روحانی آرزوؤں کے اظہار کے لئے کی گئی ہے جو کہ اس کی برتر و اعلیٰ فطرت میں پائی جاتی ہے 60 یہ آرزوئیں دو ہیں "پہلی آرزو تو انسان کی ہم آہنگ ترقی کے لئے خواہشات اور جوش و خروش

59- Tagore, Rabindranath, Nationalism P. 9.
60- Ibid P. 120.

پر قابو پانا ہے۔ اور دوسری آرزو اپنے دلوں میں لوگوں کے لئے بے لوث محبت پیدا کرنا ہے"/61
یہ خیال در اصل روسو (Rausseau) کی کتاب (Contrat sociale) اور "گرین"
اور (Bosanquet) کے نظریات کو دہراتا ہے۔ کیوں کہ وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ معاشرہ فرد کے
جماعت بن جانے کی خواہش کا نام ہے یعنی اس کی عقلی یا اخلاقی خواہش کی واضح تصویر۔ یہ
وہ نظریہ ہے جس کی مخالفت کچھ حقیقت پسندوں مثلاً Grahamwallas اور
Hobhause نے کی ہے۔

سماج خواہ فطری اور مادی ہو یا مصنوعی اور مشینی۔ یا دونوں کا امتزاج ہو۔ بہر حال
بیش قیمت قدروں کا حامل ہے اور ان میں سے آزادی سب سے اہم ہے یہ انسانی شخصیت
کی نشوونما کے لئے بنیادی چیز ہے۔ ٹیگور کا کہنا ہے کہ" آرزو جو آزاد ہو اسے دوسری آزاد آرزوؤں
کی ہم آہنگی حاصل کرنے کے لئے جستجو کرنی چاہیئے اور اسی میں روحانی زندگی کی اہمیت ہے"/62
وہ آگے کہتے ہیں" وہ شخصیت کے لامحدود مرکز کو جو کہ آزادی کی شکل میں ظاہر ہو کر لطف عطا کرتا
ہے آزادی کے دوسرے مرکز بنانے چاہئیں تاکہ وہ اس کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر متحد ہو سکے۔ خوبصورتی
ان چیزوں میں پائی جانے والی ہم آہنگی ہے جو قانونی ضابطوں کی پابند ہیں اور محبت ان خواہشات
میں پائی جانے والی ہم آہنگی ہے جو مکمل آزاد ہیں/63

فطرت نے جس سماج کی تخلیق کی ہے اس کے مقابلہ میں قوم ایک مصنوعی ڈھانچہ ہے۔ ٹیگور
کا کہنا ہے کہ" نیشن یا قوم افراد کے سیاسی اور اقتصادی نقطۂ نظر سے باہمی ربط ضبط کے لحاظ سے وہ
پہلو ہے جسے کسی میکانکی مقصد کے حصول کی خاطر منظم ہو کر تمام آبادی قبول کرتی ہے"/64
اس مقصد کا تعلق بقائے نفس سے ہے اور بقائے نفس صرف قوت کا رخ ہے نہ کہ انسانی نظریات
"" قوت بڑھتی ہے تنظیم وسیع ہو جاتی ہے اور مختلف اقوام کے درمیان حسد، اور تقابل تلخ
تر ہو جاتا ہے قوم میں بلند تر جماعتی حیات کی ہم آہنگی ختم ہو جاتی ہے اور اس میں خرابیاں آجاتی

61- Ibid P. 120

62- Tagore, Rabindranath, Personality P. 101.

63- Ibid

64- Tagore, Rabindranath, Nationalism. P. 9.

ہیں۔ اور دہشت پھیل جاتی ہے اور پھر ایک ایسی گاڑی بن جاتی ہے جسے صرف حرص و ہوس کھینچتی ہے اور اس سے شرمناک جرائم کے ارتکاب کی ترغیبات ابھرتی ہیں۔

بدقسمتی سے یہی " خیالی پیکر نیشن بن کر ہندستان پر حکومت کر رہا ہے " یہ حکمرانی انسانیت کے جذبات سے یکسر خالی ہے اس کے نمائندے ہماری آرزوؤں میں خواہ امداد کا بہانہ بنائیں یا مزاحمت کریں دونوں حالتوں میں حقارت آمیز دوری سے کرتے ہیں ۶۵/ " ان کی بے رحم پالیسی ہماری زندگی تباہ اور ہمارے لوگوں کے مستقبل کو برباد کر کے مستقل طور پر کمزور کر سکتی ہے "/۶۶ ٹیگور کا یہ بھی کہنا ہے کہ " اس نجیں کے قوم کے راج میں محکوم کا شک و شبہات چھپا کرتے رہتے ہیں اور یہ اندیشے ایک بڑے دماغ اور اور منظم ذہانت اور اخلاقیات میں پیدا ہونے ہیں۔ لہذا سزائیں مقدر ہوتی ہیں۔ جو اپنے پیچھے انسانی دل سے رستے ہوئے خون کے دھبے پر آلام و مصائب کی لکیریں چھوڑ جاتے ہیں۔ ان سزاؤں کو محض ایک نامعلوم قوت دے رہی ہے جس میں یہ نظر آتا ہے کہ ایک دور دراز ملک کی پوری آبادی نے اپنے انسانی وجود کو بالکل کھو دیا ہے " /۶۷

ہندستان میں برطانوی حکومت پر ایک خوفناک فرد جرم ہے نیشنلزم ان ویسٹ (Nationalism in west) میں وہ لیکچر جو پہلی جنگ عظیم کے دوران ۱۹۱۶ء میں انھوں نے ممالک متحدہ امریکہ میں دیے تھے۔ ان میں اس قوم کی مذمت کا کافی مواد ملتا ہے بے رحمی کے ساتھ خونریزی، مالی تباہ کاری قیمتی یادگاروں کا انہدام اور جہاں تک ہندستان کا سوال ہے ۱۹۱۹ء کے دردناک حادثات ان کی خوفناک پیشین گوئیوں کی تصدیق کرتے ہیں۔

لیکن بہرحال تسلیم کرنا پڑے گا ٹیگور نے جو الزامات عائد کئے ہیں وہ درحقیقت اس شہنشاہیت سے متعلق ہیں جو انیسویں صدی کے سرمایہ داران قومیت کی پیداوار تھی نہ کہ اس نیشنلزم پر جو اس کا اصل روپ ہے

ٹیگور میں اس نظریہ کے استدلال کا سامنا کرنے کی اخلاقی جراءت تھی جس کا مطالبہ یہ تھا کہ انسانیت کے مفاد کی خاطر تمام نظام شہنشاہی ختم کر دینے چاہئیں۔ ایشیا، افریقہ

65- Abid P.13

66- Abid P.14

67- Abid P.7

یہ دنیا کے کسی بھی حصے کے لوگوں کو بیرونی حکومتوں کی غلامی کے شکنجوں سے آزاد کیا جانا چاہیے ہندستانی آزادی کو دوسرے غلام ملکوں کی آزادی میں معاون بننا چاہیے ایک عالمی سماج کی تشکیل ہونی چاہیے۔ جس میں تمام انسانیت کی شمولیت ہو۔ کیوں کہ عالم گیر آزادی ہی انسان کی شخصیت کی کامرانی کا یقین دلا سکتی ہے۔ کیوں کہ یہ میکانکی تعلقات کو انسانی تعلقات میں تبدیل کردے گی یہ ایک ایسی دنیا کو عالم وجود میں لائے گی جس کا خواب بااصول اور مقصدی نظریات کے لوگ دیکھتے رہے ہیں یہ انسان اور انسان کے تعلقات کو منفرد شخص سے بڑھا کر فرقہ اور فرقے سے کائنات اور کائنات سے لامکاں تک لے جائے گی" ۶۸/ جب یہ عالم گیریت حاصل ہو جائے گی تب "اس کے ماسوا سب کچھ یعنی نجی سرمایے کا تعیش، قوموں کے حقوق وغیرہ سب اس کے تابع ہو جائیں گے۔ انسان کی روح تب فتحیاب ہو جائے گی اور اس کے لئے جو تاریخی مہم مقدر تھی وہ پایۂ تکمیل کو پہونچ جائے گی" ۶۹/

انھیں مثالی اصولوں کی روشنی میں ٹیگور نے ہندستان کے مسئلہ کو لیا جس کے دو رخ تھے۔ ایک مستقل اور دوسرا عارضی۔ فوری یا عارضی مسئلہ تقسیم بنگال کا نمودار ہوا اور مستقل مسئلہ میں ایسے امور شامل ہیں۔ جیسے کہ آئندہ سماج کا کیا ڈھانچہ ہوگا اور ہندستان کے آزاد ہو جانے کے بعد اس کا جدید کلچر کیا ہوگا۔

مستقل مسئلے کے حل کا انحصار حسب ذیل امور پر تھا۔ (۱) ماضی کو ذہن نشین کرنا یعنی پوری قوم کے افکار اور تاریخ کی سند سے قوم کے کردار اور مروجہ خیالات کا علم (۲) مغربی تہذیب کے تصادم کے اثرات کی حقیقت اور قدر کو سمجھنا (3) ہندستانی سماج پر شاہی حکومت کے اثرات کا صحیح اندازہ کرنا اور (۴) جدید مغربی تہذیب اور قدیم ہندستانی تہذیب کی قدروں کے درمیان امتیازات اختیار کرنا جس سے اہم مغربی تہذیب کے کچھ اہم عناصر اپناتے وقت اپنی پرانی قدریں محفوظ رہ سکیں۔

اگر چہ اس ضمن میں کہنے کے لئے رابندر ناتھ کے پاس بہت کچھ ہے لیکن انھوں نے ہندستانی تاریخ کی تعبیر کو ہی ہندستان کے مستقبل کے تعمیر کی بنیاد قرار دیا اور بدقسمتی سے ان کی زندگی کے تعمیری دور میں ہندستان کی تاریخ کا مطالعہ ابتدائی مراحل میں تھا اور

68- Tagore, Rabindranath, Towards Universal ... P. 94.

69. Ibid P. 100.

افسوس یہ ہے کہ یہ کام زیادہ تر انگریزوں نے کیا جن کے خیالات ایک تو ملکہ وکٹوریہ کے زمانہ کے مصنفوں سے متاثر تھے جو حسد کے سبب خود کو کالے لوگوں سے نسلی طور پر برتر تصور کرتے تھے۔ اور دوسرے عیسائیوں کی ایشیا کے مذہبی اور سماجی اداروں سے بے جا حقارت کے مواد نے بھی ان لوگوں کے خیالات کو بہت گندہ کر دیا تھا خود دار ہندستانیوں کا ان بے ہودہ اور نامناسب نظریات کے خلاف شدید ردعمل قطعی فطری فعل تھا۔ مزید یہ کہ آج بھی قدیم ہندستان کے تاریخی حقائق کا مجموعہ مکمل طور پر دستیاب نہیں ہے انیسویں صدی کے آخر میں یہ اور بھی قلیل تھا لہٰذا نتیجہ یہ ہوا کہ توہمات کو کھل کھیلنے کا موقع ملا اور رومانی حب الوطنی کی آرزو کو ایک وسیع میدان دوڑ کے لئے مل گیا۔

ٹیگور بھی ان خامیوں سے مستثنیٰ نہ رہ سکے۔ لیکن ان کی تیز فہم و فراست سنسکرت کی کتابوں سے کچھ نتائج اخذ کئے جو آسانی سے رد نہیں کئے جا سکتے ان میں سے دو یہ ہیں۔

(۱) ہر دور میں ہندستان کی تاریخ کا رجحان کثرت میں وحدت و اتحاد کی تلاش کی طرف رہا ہے یا دوسرے الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ اس کا میلان مختلف فرقوں، تہذیبوں عبادت کے طریقوں رسموں اور نظریات میں پائے جانے والے اختلافات میں مصالحت اور منتشر تہذیبوں کو ہم آہنگ کر کے ان کو یکجا کرنے کی جانب رہا ہے۔

(۲) یہ کہ سماجی نظام کو سیاسی نظام اور حکومت پر انسانیت کے اقدار کے اعتبار سے برتری حاصل تھی دونوں کے تعلق نے آزادی اور خود نمائی کی محبت ایک طرف اور قیام امن و نظام کی متابعت دوسری جانب۔ ان دونوں میں کشمکش کی صورت پیدا کر دی

ان میلانات اور قوتوں کے اس کھیل کا خاکہ ہندستانی تاریخ کے مختلف منازل میں کھینچا جا سکتا تھا ٹیگور کے مطابق پہلی منزل کا افتتاح آرین کے زمانہ میں ہوا اور اس کی انتہا بدھ ازم کے زوال پر ہوئی اس دور میں آریوں اور غیر آریوں اور دراوڑ کے مابین مفاہمت اور ان کی تہذیبوں زبانوں اور رسموں کو یکجا کرنے کی کوشش کی گئی اس کے ساتھ یہ دور برہمنوں اور چھتریوں کے مخالف نظریات کے درمیانی چپقلش کی گواہی بھی دیتا ہے۔ ویدوں اور ان میں مذکور مختلف دیوتا اور ان کے سردار برہمن دیدہ ریزی سے بنائے گئے عبادت اور قربانی کے طور طریق، آتش پرستی پجاریوں کی اہمیت، سماجی نظام کا کٹرپن اور عقلیت، مذہبی امور میں برتری، اور زندگی کے نظریہ کی قدامت میں برہمنوں کے مخصوص خصائل کی تصویر کشی ہے۔

برہمن رشی جیسے یجناوالکیا (yajnavalkaya) اور وشِشٹ (Vaishitta) کلچر کے روحانی مبلغ تھے۔ پرشورام ان کا ایک اوتار تنہا برہمن اوتار (Awtaar) تھا درونا (Doona) کرپا (Kripa) اور اشوا تھاما (Ashuathama) وہ برہمن سورما تھے جو پانڈو کے خلاف جنگ میں برہمنوں کے سردار تھے وید اور سومرتی میں ان کا مذہب اور قانون منضبط تھا چھتریوں کا فلسفہ، ان کا مذہب اور ان کی تاریخ اونپشد، بھگودگیتا، مہابھارت اور رامائن میں منضبط تھے۔ ان کی تعلیم ایک ملحدانہ مذہب کی تھی۔ آفتاب جس کی علامت ہے اور وشنو رام، اور کرشن اور گوتم بدھ جو سب کے سب چھتری تھے اس کے اوتار ہیں۔ یدھشٹر، ارجن اور کرشن مہابھارت کی جنگ میں چھتریوں کے کمانڈر تھے۔

چھتریوں کا مذہب عبادت اور محبت کا مذہب تھا۔ اس نے اعلیٰ اخلاق مثلاً خواہشات کے جال سے آزادی، اولوالعزمی اور جاں نثاری کی تعلیمات دیں اور ان کو پھیلایا۔ یہ رسموں کا پابند مذہب نہیں تھا اور اس نے ظاہر پرستی کو نظر انداز کیا۔ کرشن اس کے عظیم معلم تھے جو چھتری شہزادے تھے۔ بھگودگیتا ان کی مذہبی کتاب ہے ایک چھتری بادشاہ رام اس کے مثالی کردار تھے جن کے صلاح کار اور پجاری رشی وشوامتر ایک چھتری تھے۔ رام نے برہمنوں کے ہیرو پرشورام کو شکست دی۔ شیو کی کمان کو توڑا۔ برہمنوں کو پست کر کے جنگل کو خالی کرایا۔ زمین پر ہل چلایا غیر آریوں پر فتح پائی گوہاکا (guhaka) اور (Chandla) چانڈلا کو حاصل کیا۔ اور شمال وجنوب کو ایک کردیا۔

آخر کار برہمنوں اور چھتریوں میں مفاہمت ہوگئی۔ اور ہندوؤں میں برہما، وشنو اور شیو کی تثلیث بن گئی۔ کرشن، رام، اور بدھ کے علاوہ پرشورام ایشور کے اوتار تسلیم کئے گئے اور وید، اونپشد بھگودگیتا، مہابھارت اور رامائن وغیرہ سب پاکیزہ مذہبی کتابیں سمجھی جانے لگیں۔ وحدانیت اور اصنام پرستی کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے وحشتناک خون کا پیاسا اور موت سے کھیلنے والا غیر آریوں کے زود رادہ (Rudra) کو اور اسرار و رموز کے آزادی پسند شہنشاہ، روحانی سرخوشی کے مالک، وید کے شیو کو ایک کردیا۔

بدھوں کے دور نے ایک نئے باب کا آغاز کیا۔ بدھ کی روحانیت نے زندگی کو وسعت اور تحریک بخشی اور اختلافات کی دیواروں کو گرا کر۔ غریبوں، مجبوروں، بدنصیبوں اور بیکسوں پر ترس کھانا سکھایا انھوں نے انسانوں کے روبرو درست چال چلن، انکساری، رحم اور

اور خدمت پسندی کے بلند نظریات رکھے۔

لیکن پھر باہر کے لوگ گھس آئے۔ ساکاس (Sakas) کشن (Kushan) اور ہنس Hunas قبیلوں نے یورش کی اور شمالی ہندستان پر چھاگئے۔ پھر ایک نئی تنظیم وجود میں آئی باہری لوگ ہندو ہوگئے لیکن یہ شمولیت نامکمل تھی۔ آریوں کی اقلیت لاتعداد غیر آریوں سے بغل گیر ہوگئی اور اس سے ایک بہت سخت اور کٹر فرقہ پرستی وجود میں آئی۔ جس میں سماج کا عضوی یا افرادی اتحاد ضم ہوگیا۔ عقائد کے اختلافات ختم نہ ہوسکے اور تمام اختلافات ان کے میکانکی طور پر پہلو بہ پہلو جمع ہوگئے۔ مذہب میں تزکیہ نفس اور اخلاقیات کی پاکیزگی میں پہلی سی شدت باقی نہ رہی اور ان کی جگہ کھوکھلی رسوم کی اندھی تقلید نے لے لی۔ غیر شائستہ طور طریق، عوام کی بے حرمتی سماجی نفاق، غرور و کبر کی فراوانی اور اخلاص کی کمی سماج کا خاصہ بن گئی

اب ایک نئے ڈرامے کے لئے اسٹیج تیار ہوگیا تھا۔ مرکزی ایشیائی قبائل جو اسلام قبول کرچکے تھے انھوں نے حملے کرکے ملک میں گھسنا شروع کیا۔ لیکن بنیادی طور پر مسلم حکومت ہندو حکومت سے مطابقت رکھتی تھی یہ بھی آزاد حکومت کے انھیں اصولوں پر مبنی تھی جو پہلے سے ہندو راجاؤں میں چلے آرہے تھے۔ اس سے کٹرپن اور سختی کو زبردست دھکا پہونچا۔ جس کے جال میں ہندو مذہب پھنسا ہوا تھا۔ اس کے محرکات نے بھکتی تحریک کو تقویت دی۔ جو کہ عقائد و اخلاق کے ٹھہرے ہوئے گندے پانی کو پار کرکے کرشنا اور ویشنو وائٹز (Vaishnauites) کی پرانی تعلیمات کی شفاف اور جان بخش پانی میں پہونچ گیا۔

تحریک کے بارے میں وہ کہتے ہیں :۔

" درمیانی ادوار کی تاریخ میں ہمیں ہندو اور فاتح مسلمانوں کے درمیان مذہبی جھگڑوں کے نقوش ملتے ہیں۔ ہمیں ان دونوں کی تاریخ میں سادھوؤں اور سنتوں کا ایک سلسلہ نظر آتا ہے اور اس کہکشاں میں بہت سے مسلم ستارے دکھائی دیتے ہیں جنہوں نے مذہبی اختلافات کی کھائی کو ذاتی تعلقات کے ذریعہ بھرا ہے۔۔۔۔۔۔ انھوں نے اس چیز کو کیا جس پر سب متفق تھے اور سب کے مفاد مشترک تھے انھوں نے یہ تسلیم کیا کہ سچائی کے معنی ہیں سب اپنی ہی طرح بلکہ اپنے وجود کا ہی حصہ سمجھا جائے۔۔۔۔۔۔۔ ان سادھوؤں اور بھکتوں کا لافانی پیغام آج بھی ہندستان کی رگوں میں لہو بن کر دوڑ رہا ہے اگر ہم اس کی روشنی میں قدم اٹھائیں تو ہم سیاسی اور معاشی نظام کو بہتر بنا سکتے ہیں اور تحریک کو قوت بخش سکتے ______

ہیں" ۷۰ا

مغلوں کی نسبت ان کا خیال تھا

"مغل شہنشاہ انسان تھے وہ صرف حاکم نہیں تھے۔ وہ ہندستان میں رہے اور یہیں مر گئے۔ انھوں نے پیار بھی کیا اور لڑے بھی۔ ان کی حکومت کی یادگاریں کارخانوں کے کھنڈرات میں نہیں بلکہ آرٹ کے لافانی نمونوں میں موجود ہیں اور صرف عظیم عماراتی نمونوں کی شکل میں نہیں بلکہ مصوری سنگیت اور دھاتوں کی نقاشی اور سوتی اور رادتی کپڑوں میں بھی موجود ہیں" ۷۱ا

لیکن مسلم تہذیب ناکام ہو گئی کیوں کہ اول تو "یہ لوگوں کے نظریات اور تخلیقی کارناموں کو ابھار نہیں سکی" دوسرے اس لئے کہ "وہ ہماری نگاہ کو اس دنیا تک پہونچانے میں ناکام رہی" ۷۲ا۔ وہ دنیا یعنی ہندستان سے باہر کی دنیا۔

اس لئے ہماری سست رو یا آسودہ خاطری کے نظریہ کو ایک دھکا لگانے کی ضرورت تھی "کیوں کہ ہم اب بھی اپنی دیہاتی پناہ گاہوں میں گھسے ہوئے تنگ دنیا کے افق کو تنگ نظری سے دیکھ رہے تھے" ۷۳ا۔ برطانوی حکومت نے یہ دھکا بھی لگا دیا" یہ لوگ صرف انسانوں کی مانند سادگی سے نہیں آئے بلکہ اپنے ہمراہ ایک نئی مغربی تہذیب بھی لائے .... ذاتی میدان میں یہ لوگ مسلمانوں کی نسبت ہم سے زیادہ دور رہے لیکن یورپی تہذیب کے سفیروں کی حیثیت سے انھوں نے ہم سے اور اگلے آنے والوں کی بہ نسبت زیادہ گہرا اور وسیع تعلق قائم کیا" ۷۴ا ان کی کامیابی کا راز "ان کی تلاش حق کے لئے ان کی یک جہتی میں مضمر تھا وہ ذہنی کاہلی، پرفریب واہموں، سطحی مماثلت، اور اپنی پرانی ذہانت کے گیت گانا جیسی بے کار حرکتوں کا شکار نہیں تھے" ۷۵ا

ہندستان کی مغرب نے بیش قیمت خدمات انجام دی ہیں۔ اس نے انسان پر انسان

---

70. Tagore, Rabindranath, Greater India quoted by Amiya Chakravarty, Tagore Reader P. 189.

71. Tagore, Rabindranath Personality. P. 18.

72. Tagore, Rabindranath Universal Man P. 342.

73. Ibid 74. Ibid 75. Ibid P. 343.

کے مظالم روکنے کے لئے جذبات وادراک کا ایک خزانہ عطا کیا ہے یعنی" ایسے اقدارِ زندگی عطا کئے ہیں جن کے خلاف الہامی احکام اور قدیم سے قدیم روایات بے کار جدوجہد میں مشغول ہیں" 76/ عقل کے دائرہ کار میں انھوں نے توہمات سے ہماری عقیدت کو چھین لیا دلائل پسندی کی بنیاد رکھی اور عملی میدان میں انسان کے حقوق کو ظاہر کیا" 77۔ اس طرح ہندستان کے افکار میں انقلاب آ گیا۔

لیکن بہر حال ملک و قوم پر مغربی تہذیب کے غلبہ اور شہنشاہیت پسند حکومت کے اقتدار نے جس کا نتیجہ انسانیت پر بے بہا مظالم اور حکمرانوں کے تکبر کی شکل میں نمودار ہوا ان سب نے ایشیاء کی عزت کو خاک میں ملا دیا ہندوستان میں برطانوی حکومت ایک بے روح مشین تھی جو ہندوستان کی رعایا کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتی تھی اور اپنے آپ ہی کو سب کچھ سمجھتی تھی۔ یہ غیر تخلیقی تھی اور اپنے رنگ پر نازاں ہونے کا زبردست احساس رکھتی تھی جانبدار متعصب اور دوسروں کو اپنے اغراض کے لئے استعمال کرنے کے جذبہ سے بھر پور اور مستبدانہ تھی" یہ ایک اسٹیم رولر (Steam Roller) کے مانند تھی جو وزن اور طاقت میں بہت بھاری بھرکم اور اپنے فوائد بھی رکھتا ہے لیکن جس زمین پر چلتا ہے اس کو کچل کر رکھ دیتا ہے اور زرخیزی نہیں عطا کرتا" 78/

برطانوی حکومت کی بظاہر بے پناہ قوت اور اس کی شہنشاہیت کے دبدبے کی مت نہ کرتے ہوئے اور ماضی کی داستانوں سے حوصلہ لیتے وقت ٹیگور کے اپنے اس عقیدے میں کبھی لغزش نہیں ہوئی کہ ہندستان ایک دن اٹھے گا اپنی روحانی قوت کو مجتمع کرے گا اور عالمگیر وحدت انسانی کے تخیل کے فروغ میں اپنا کردار ادا کرے گا۔ انھوں نے کہا:۔

"میں آج اسی پر زندہ ہوں کہ ہمارا نجات دہندہ آنے والا ہے۔ وہ ہمارے درمیان اسی قعر ذلت میں پڑے ہوئے غریب ہندستان میں پیدا ہوگا۔ میں اس پیغام کا منتظر ہوں جو وہ اپنے ساتھ لائے گا اس کے وہ پرشکوہ الفاظ جن میں نجات کا وعدہ ہوگا اسی مشرقی افق سے ابھر کر گونجیں گے اور سامع سننے والوں کو قوت اور اعتماد بخشیں گے" 79/

---

76. Ibid. Page No 346 77. Ibid. Page No 347.

78. Sen Sachin, Political Philosophy of Rabindranath Tagore P. 72.

79. Tagore, Rabindranath, Towards Universal Man Page 359.

ان کا یقین تھا کہ قسمت کا چکر ایک دن برطانوی لوگوں کو ہندستان چھوڑنے پر مجبور کر دے گا وہ ہندستان کو آزاد دیکھنا چاہتے تھے۔ 80/" اس منفی وجہ سے نہیں کہ غلامی ایک غیر اخلاقی چیز ہے یا انسانی شخصیت کی متضاد شے ہے اور نہ ہی اس وجہ سے کہ برطانوی حکومت نے ہندستان کو غربت اور پریشانیوں میں ڈال دیا ہے بلکہ ان وجوہات کی بنا پر جو انسان کو اشرف المخلوقات بناتی ہیں۔" کیوں کہ اس نے (ہندستان نے) اپنے عظیم افراد کے ان بیش بہا الفاظ کی قرنہا قرن کے دوار میں حفاظت کی ہے" کہ ۔" خدا لا محدود ہے، خدا کی ذات میں سکون ہے، خیر خواہی اس کی ذات میں ہے۔ تمام مخلوق کی وحدت ذات باری تعالیٰ میں ہے" 81/

لیکن ٹیگور نے اس آزادی کا خاکہ کہاں سے پایا؟ ہندستان کے ماضی نے اس کے کچھ رنگ و روپ نمایاں کئے۔ مغرب کے تجربات نے یہ ظاہر کیا کہ کن سے اجتناب کیا جائے اور کن کو قبول کیا جائے اور ان کے فلسفہ نے جو انسانی اور خدائی شخصیتوں کے اقدار کے بارے میں تھا اس نے بھی ان کی مدد کی اور اس سلسلہ میں رہنمائی کی۔

برطانوی حکومت سے پیشتر ہندستان کی تہذیب کے متعلق ٹیگور کا نظریہ یہ تھا کہ وہ سماج کی سمت یا سماج سے منسلک تھا نہ کہ آج کی یورپی تہذیب کی طرح حکومت سے منسلک۔ یہ اختلاف ان کے لئے بڑا اختلاف تھا۔ سماج نے افراد کو رضا کارانہ طور پر باہمی امداد کے لئے منظم کیا تھا سماجی اور معاشی تنظیم نے آپس کے مفادات کا تحفظ کیا اور تقسیم عمل کو فروغ دیا۔ یہاں تک کہ ذات پات کا جامد نظام بھی بنیادی طور پر فوت کے اعتبار سے باہمی امداد اور تقسیم عمل پر مبنی تھا جیسا کہ بھگوت گیتا میں کہا گیا ہے" سماج اہلیت کی بنیاد پر جو پیشوں کی صورت میں تھا تقسیم ہو گیا تھا 82/" لیکن بعد میں موروثی اصول، مذہبی اختلافات، اور ذاتوں کی مختلف درجات میں تقسیم نے سماجی تنظیم کو بے حس کر دیا اور یہ تنظیم خرابیوں کا سمندر بن گئی۔

حکومت یا سیاست میں زبردستی قانونی پابندیاں لادی جاتی ہیں۔ ٹیگور کے انیسویں صدی کی حریت پسندی میں یہ تھا کہ حری دباؤ کم سے کم ہونا چاہیئے" تاکہ افراد اور سماج کو زیادہ سے

80- Ibid P. 358.

81- Ibid P. 196.

82- Bhagavad Geeta IV (13).

زیادہ آزادی کا احساس ہو سکے۔ ہندستان کے معاملات میں جہاں کے عناصر جبر کرنے والی غیر ملکی مطلق العنان حکومت تھی۔ وہاں سماج پر اس معاملہ میں اور زیادہ زور دیئے جانے کی ضرورت تھی اسی لئے انھوں نے اس بات کی حمایت کی کہ سیاسی تحریک سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ خود اعتماد، خودکار، اور ترقی پذیر سماج کی تعمیر کی جائے۔ اور سماج سے ان کا مطلب ایک متوسط طبقہ کے تعلیم یافتہ افراد کے مختصر سے حلقہ سے ہرگز نہیں تھا۔ بلکہ ہندستان کے گاؤں میں بسنے والے لاتعداد عوام ان کے نزدیک سماج کا اہم جزو تھے بظاہر ان کا خیال لوگوں کے معاملات میں حکومت کی مداخلت کو کم سے کم کرکے اقتدار کو اپنے لوگوں کے ہاتھ میں سونپنا تھا بعد میں گاندھی جی کی قیادت میں اس منصوبہ کی تکمیل ٹیگور کے نظریات کی آئینہ دار ہے

بہر حال یہ بتانا ضروری ہے کہ ٹیگور نے سماج اور حکومت میں علیحدگی کا جو ذکر کیا ہے وہ حکومت اور سماج کی علیحدگی بیسویں صدی کے آغاز کے ہندستان کے حالات اور وکٹوریہ کے دور کے انگلینڈ کے حالات سے مماثلت رکھتی ہے۔ لیکن اس کی کوئی عملی یا نظری بنیاد نہیں ہے۔ سماج اور حکومت ایک سکے کے دو پہلو ہیں۔ عام آزاد سماج میں معاشی حالات اور ملک کے عام حالات حکومت کے حدود اور دائرہ کار کا تعین کرتے ہیں۔ پہلے سے بنائے گئے اصولوں کو بروئے کار نہیں لایا جاتا۔ "تاریخ آزاد تجارت کے نظریۂ اضافت، مسلمہ عقائد کی نفی کرنے والوں کی نفی، صرف اپنے مفاد کو مدنظر رکھنے کے باوجود دوسروں کے مفاد پر نگاہ رکھنے کے اعمال، اور طاقت یا ترغیب و تحریص کے محرکات کی اطاعت پذیری یا ان سے انحراف ان سب کی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔

یہ نظریہ کہ وہ سیاسی نظام قومیت کی بنیاد پر حکومت کے قیام کی شکل میں اپنے کو ظاہر کرتا ہے وہ اس نظام کے مقابلہ میں فطرت سے کم مطابقت رکھتا ہے جو سماج کی بنیاد پر قائم ہو حسب ذیل نتائج کے ظہور کا ذمہ دار ہے۔ (1) یہ کہ مشرق اور مغرب کے سماج اور ان دونوں کے کلچر انتہا درجہ بنیادی طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہیں (2) یہ کہ ایک قوم ہونے کے جذبہ کا ارتقا ہندستان کے ذہن و مزاج سے مناسبت نہیں رکھتا تھا (3) یہ کہ مغرب میں نیشنلزم نے جو شکل اختیار کرلی ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کمزوروں پر ملوکیت پرستانہ اقتدار قائم ہوگیا۔ دنیا کی مختلف قوموں میں ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کی حد تک مقابلہ کو اکسایا ہے۔ حسد، شکوک و شبہات اور جنگ کو جنم دیا ہے اور اسی سے وہ تمام بین الاقوامی رقابتیں ابھری ہیں جو ان اقدار کے

جو انسانی شرف کا جوہر ہیں نہ صرف برعکس ہیں بلکہ ان کا انکار کرتی ہیں ٹیگور کے ان دلائل پر بحث کرنا اس لیے ضروری نہیں ہے کہ وہ بادی النظر میں مبالغہ آمیز اور یکطرفہ ہیں۔

مشرق و مغرب کا فرق کوئی بنیادی یا خصائص کا فرق نہیں ہے بلکہ یہ اختلاف صرف کم و بیش کا ہے۔ مشرق میں سماج کا ارتقا مغرب کے سماج کے ارتقا کے مقابلہ میں سست تر رہا ہے جاگیردارانہ نظام سے تجارتی نظریہ یا بنیا پن اور اس بنیے پن سے سرمایہ داری تک مغرب میں یہ سلسلہ مستقل طور پر رہا ہے۔

دوسری طرف ایشیا کا انقلاب تقریباً تیرھویں صدی سے انیسویں صدی عیسوی تک بالکل بند رہا یہاں تک کہ برطانوی نظام حکومت نے اس میں ہل چل پیدا کی۔ ایک کو روحانی اقتدار کا منصب عطا کرنا اور دوسرے کو مادی حکومت کا نام دینا نہ صرف نا موزوں ہے اور صرف ناموزوں ہی نہیں بلکہ محض بے جا غرور و تکبر ہے۔ یعنی خطرناک خود فریبی ہے

ٹیگور نے ہندستان کے سماج اور تہذیب میں افسوس ناک خامیوں کو تسلیم کیا وہ مذہبی اختلافات فرقہ وارانہ اور نامعقول نااتفاقیوں سے اس قدر بدظن تھے کہ انھیں یہ کہنا پڑا کہ "ہندستان میں کبھی سچی قوم پروری کا شعور نہیں تھا" انھیں اندیشہ تھا کہ "یہ ذاتی تفرقہ جس نے قومی اتحاد کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کر رکھی ہیں کہیں ہمارے سیاسی اتحاد میں سدراہ نہ ثابت ہوں"[83]

بہرحال وہ ہندستانی سے بے پناہ محبت کرتے تھے اور ان کے دل کی گہرائیوں میں یہ جذبہ موجزن تھا کہ کروڑوں بے سہارا ہندستانیوں کو ناقابل تصور قوت والے اور نام نہاد مہذب، انگریز اقوام کے پنجہ سے چھڑائیں اور انسانی اقدار سے جہاں تک وہ دور جا چکے تھے وہاں سے ان کو شرف انسانی تک واپس لائیں۔ اور شہنشاہیت پسندانہ طاقت کا جو بے جا خوف و ہراس ان پر طاری تھا اس سے ان کو نجات دلائیں۔ انھوں نے ہندستان میں ایسی قوم پروری کی توقع کی جو کہ نہ انتہائی پسند جھگڑالو اور تباہ کن نہ ہو بلکہ ایسی قوم پروری لانی چاہی جو صحت بخش اور مذہبی یعنی انسانیت پر مبنی ہو، ان کے نزدیک انسانی اقدار ہی نجات کا واحد راستہ بن سکتی ہے[84]

---

83. Tagore Rabindranath Nationalism, P. 106.

84. Tagore Rabindranath Letter to Friend.

ٹیگور قوم پروری کو اور خاص طور سے اس کے نفرت پھیلانے والے نتائج سے بخوبی واقف تھے لیکن وہ سیاست میں گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ 1905 سے 1910 تک وہ قطعی طور پر تقسیم بنگال کی تحریک میں لگے رہے لیکن حاکموں سے حمایت کی بھیک مانگنا یا سیاسی دریوزہ گری کو وہ نظر حقارت سے دیکھتے تھے اس لئے انھوں نے ملک کے سامنے سماج کی تعمیر نو اور خود اعتمادی پر مبنی سیاست کا پروگرام پیش کیا۔

شور و ہنگامہ سے معمور سیاسی ایجی ٹیشن ان کی نفیس، حساس، بھائی کی محبت سے بھرپور صاحب تمیز شخصیت کو کیسے راس آسکتی تھی اس لئے وہ اس میدان سے ہٹ گئے اور قومی تعلیم پر اپنی پوری توجہ مرکوز کردی۔ وہ یہ یقین رکھتے تھے کہ سماج کی خدمات کو ہر چیز پر تفوق حاصل ہے۔ اور اگرچہ انھوں نے ایسا کر کے سیاست کی قدر و قیمت کو کم کرنے کی کوشش کی لیکن ان کا سماجی ترقی اور فلاح پر زور دینا بالکل درست تھا لیکن جب کبھی بھی وقت نے تقاضا کیا وہ اپنے خیالات کا اظہار کرنے میں نہیں ہچکچائے اور اظہار کے وقت انھوں نے حکومت یا اپنے عوام کی خوشی یا ناراضگی کی پرواہ نہیں کی۔ جلیانوالہ باغ کے قتل عام پر ان کا سرکار کو ملامت کرنا اور اپنے 'سر' (Sir) کے خطاب سے دست برداری دینا پہلی بات کی تصدیق ہے اور انگریزوں کا مقاطعہ کرنے اور غیر ملکی اشیاء جلانے پر انھوں نے گاندھی جی کو برا بھلا کہا تھا۔ یہ دوسرے قول کی تصدیق کرتا ہے۔

ان کا تعمیری سماجی کام، صداقت پسندی اور انسانیت نوازی کے اصول سے متاثر تھا۔ انھوں نے ہندستان کی ان روایات کو جن کا تعلق روحانیت سے تھا تلاش کرنے اور ان کو پھر سے زندہ کرنے کی کوشش کے ساتھ ساتھ مشرقی اور مغربی تہذیب کے اصول کے صحیح اختلاط کی کوشش کی۔ اگرچہ وہ مغرب پر سختی سے نکتہ چینی کرتے تھے لیکن اسی کے ساتھ مغرب نے علم کی ترقی میں جو حصہ لیا ہے اس کے اعتراف میں فیاض بھی تھے مثلاً سائنس اور انسان کی فلاح کے لئے فطرت کے قوتوں کی تسخیر۔ ان کے دل میں دنیا کے ان تمام افراد کے لئے بے پناہ احترام تھا جو انسانی اتحاد اور بھائی چارہ کے جذبات کو فروغ دیتے تھے

ہندستان کے عام مسائل میں فرقہ وارانہ اتحاد اور ہم آہنگی ایک بڑا مسئلہ تھا انھوں نے محسوس کیا کہ "ہندو اور مسلمان صدیوں سے ایک دوسرے کے ساتھ ایک سرزمین پر رہ رہے ہیں لیکن پھر بھی ایک دوسرے سے کتنے جدا ہیں" لیکن انھوں نے محسوس کیا کہ "جب تک

ہمارے کردار کی وہ خامیاں جن کے سبب یہ عالم ہے ختم نہیں ہوجاتیں یہ مشکلات ہماری سیاسی زندگی کی ہر راہ کے ہر قدم پر روڑے اٹکاتی رہیں گی اور ہم کبھی اپنی عظیم کوششوں کو کامیابی کی منزل تک نہ لے جا سکیں گے" 85/

انہیں اس کا یقین تھا کہ اگر ہم اپنے اندرونی نزاعات یا اختلافات پر قابو پالیں تو ہم اس قابل ہوجائیں گے کہ ان تمام بیرونی کوششوں کا مذاق اڑائیں جو ہم میں اختلاف پیدا کرنے کے باعث ہیں" 86/ ان کے خیال میں ایک اختلاف تو تعلیم یافتہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی تعداد کا فرق ہے۔ کیوں کہ اس طرح ہندو لوگ زیادہ تعداد میں سرکاری ملازمتوں میں داخل ہو کر حکومت کی زیادہ حمایت کے مستحق بن گئے تھے جب تک یہ فرق ختم نہیں ہوتا ہم دل سے ایک نہیں بن سکتے" 87/

انھوں نے ہندوؤں کے دلوں میں مسلم حکومتوں کے خلاف جلن و حسد کے جذبہ پر بحث کرتے ہوئے ان کا مقابلہ انگریز حکومت سے کیا اور کہا" لیکن ہندستان میں برطانوی حکومت شخصی نہیں ہے۔ بلکہ دفتری ہے اس لئے یہ ایک واہمہ ہے اور فن کے لحاظ میں اپنے کو ظاہر کرنے کے لئے اس کے پاس کچھ نہیں ہے" 88/

دوسری طرف" ہندو اور مسلمان ہندستان کے دو بڑے فرقے ہیں۔ ہمیں اس ایثار، صبر، ذہانت احتیاط اور جبر علی النفس کے اظہار کے لئے آمادہ رہنا چاہیئے جو سیاسی اتحاد کے لئے ضروری ہے" 89/ یہ بدنصیبی تھی کہ اندرونی بغض و عناد نے انہیں ایک دوسرے سے دور رکھا۔ "ہندو کے نزدیک مسلمان ناپاک ہے اور مسلمان ہندو کو ملحد قرار دیتے ہیں" یہ بدظنی ہندستانی ہم آہنگی کے ادراک اور مذہبی اور فرقہ وارانہ اختلافات میں مفاہمت کرانے کے تاریخی جذبے کے متضاد ہیں اور انہیں ختم کیا جانا چاہیئے۔

85- Tagore Rabindranath Towards Universal Man, P. 105.

86- Ibid

87- Ibid P. 106.

88- Tagore Rabindranath, Personality P. 18.

89- Tagore Rabindranath Towards Universal Man P. 106.

اپنے وطن سے محبت، ہندستان کے بسنے والوں سے محبت، اپنے عظیم ماضی پر فخر، اور اس کے کلچر پر فخر جس کی بنیاد انسانیت نوازی پر تھی اور اس کے مستقبل پر یقین ۔ یہ تھا ٹیگور کا ہندستانیوں کے لئے پیغام ۔ لیکن ٹیگور نے قوم سے آگے انسانیت پر نظر ڈالی انھوں نے کہا

"اور میں اب بھی یقین رکھتا ہوں کہ مکمل انسانیت میں ہم آہنگی ایسی شے ہے جہاں مفلسی اس کے باطنی خزانوں کو چھین نہیں لیتی ہے ۔ جہاں شکست فتح کا، موت حیات جاودانی کا دروازہ کھول سکتی ہے اور جہاں دوامی عدل کی تقسیم میں وہ بھی جو سب سے پیچھے ہیں اپنی توہین کو سنہری فتح وعظمت میں بدل سکتے ہیں"۔ ۹۰

ایم کے گاندھی

گاندھی جی اس حیرت انگیز عدم تشدد کی تحریک کے سب سے بڑے لیڈر تھے جنھوں نے ہندستان کو اس کی آزادی کے عظیم مقصد سے ہمکنار کیا ۔ اپنی پچھترویں سالگرہ پر ۲ اکتوبر ۱۹۴۴ کو انھیں بہت سے مشہور لوگوں کی طرف سے جو اپنی سائنسی، فلسفیانہ، مدبرانہ یا ادبی خدمات کے باعث عالمی حیثیت کے حامل تھے مبارک باد کے خطوط وصول ہوئے ۔ ان میں سے ایک موجودہ دور کے عظیم سائنسداں آئن اسٹائن (Eenstein) بھی تھے ۔ انھوں نے گاندھی جی کے بارے میں لکھا تھا:۔

"وہ اپنے عوام کا ایسا رہنما ہے جسے کسی بیرونی قوت کی مدد حاصل نہیں ۔ ایک ایسا سیاستداں ہے جس کی کامیابی کسی ہنر یا کسی میکانکی اشیاء کی مہارت پر نہیں بلکہ صرف اس کی شخصیت پر مبنی ہے ۔ جو ہر شخص کو حاصل کرنے کی طاقت رکھتی ہے ۔ ایک فاتح جنگجو ہے جس نے طاقت کے استعمال سے ہمیشہ نفرت کی ۔ ایک عقل و فراست و انکساری سے آراستہ شخص ہے اور پختہ عزائم اور بے لوچ استقلال سے مسلح ایسا شخص جس نے اپنے عوام کی ترقی اور فلاح کے لئے اپنی تمام قوت صرف کردی اور ایک ایسا شخص جس نے یورپ کے جنگلی پن اور بربریت کا مقابلہ انسانی شرافت سے کیا اور اس طرح ہر منزل پر بلند و برتر رہا ۔ آئندہ نسلیں مشکل سے یقین کریں گی

---

90 - Tegore, Rabindranath, Nationalism. P. 1380.

کہ کوئی ایسا خون اور گوشت کا مجسمہ بھی واقعی اس روئے زمین پر کبھی چلتا پھرتا رہا ہوگا۔"۹۱

اس غیر معمولی تحریک کی صحیح ہیئت اور کردار کو سمجھنے کے لئے جو حقیقی معنوں میں اس عدیم المثال انسان نے چلائی، اس کی رہنمائی کی اور اسے قائم رکھا اور ان کے ایجاد کردہ عمل کے طریقوں کو سمجھنے کے لئے جو بالکل انوکھے اور ناقابل یقین نظر آئیں گے۔ یہ ضروری ہے کہ اس حیرت خیز منظر کی نوعیت اور اس کے سرچشمہ کا تجزیہ کیا جائے جو انھوں نے اپنے ملک کے عوام اور بہت سے بیرونی ملکوں میں رہنے والے افراد کے ذہنوں پر اثر ڈالا۔

گاندھی جی انسانیت کی تاریخ میں قدرت کا غیر معمولی مظہر ہیں۔ دنیا نے انھیں مہاتما کہا یعنی عظیم روح، اگرچہ انھوں نے بارہا بڑی کربناک انکساری کے ساتھ اس خطاب سے مبرہ ہونا چاہا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ تاریخ میں ایسے انسان کی مثال ملنی مشکل ہے جو کروڑوں انسانوں کو قربانی دینے کے لئے نہ صرف تیار کرے بلکہ اگر وہ حدوں سے تجاوز کرکے عدم تشدد کے اصول کی خلاف ورزی پر آمادہ ہوں تو انھیں روک دینے کی قوت و صلاحیت بھی رکھتا ہو۔ اس کے اخلاقی اصولوں کا عروج اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک ہی آواز میں اس نے بھٹکے ہوئے پرجوش حوصلہ مند لوگوں کو اس وقت روک دیا تھا جب وہ بلندی سے قریب تر تھے سب سے قریبی اور سب سے عزیز تر ساتھی ان کے خلاف بدگمانیوں اور غلط فہمیوں کا شکار ہوئے، ان کے مخالف اور بداندیش نکتہ چینی کرنے والوں نے ان کو گالیاں دیں اور ان لوگوں نے جو ذرائع کی پرواہ کئے بغیر مقصد کے حصول کی خواہش رکھتے تھے انھیں (گاندھی جی نے) قطعی رد کر دیا۔

جبکہ ان کی اپنی زندگی، اور ہندستان کی خاطر حاصل کی گئی ناقابل فراموش کامیابیاں ہی ان کو تاریخ کی نامور اور مشہور ہستیوں کی صف اول میں رکھے جانے کا استحقاق دیتی ہیں اور ان کی سچائی اور عدم تشدد کی تعلیم اور ذاتی حیثیت میں ان پر مخلصانہ عمل کا بلند کردار ان پر بقائے دوام کی مہر ثبت کرتا ہے۔ ان کو پیغمبر و ولی کی صف میں رکھا جائے یا نہ رکھا جائے لیکن ان کی ذاتی زندگی پاکیزگی، انسانیت کے لئے ان کی آفاقی محبت انسانیت کی اچھائی میں ان کا اعتماد اور سچائی کے لئے ان کی انتہائی لگن۔ انھیں ان عظیم روحوں کی صف میں ضرور کھڑا کر دیتی ہے جو نوع انسان کے فلاح کی خاطر وقتاً فوقتاً وجود میں آتی رہتی ہیں۔

گاندھی جی بڑی کشمکش اور پریشانیوں کے عالم میں پیدا ہوئے اور اسی ابتر دور میں پرورش پائی، حاکم و محکوم طبقے کے درمیان سیاسی اعتبار سے بڑے تلخ تعلقات تھے۔ ایک طرف غرور و تحقیر کا جذبہ تھا اور

91- Tendulkar, D.G. Mahatma Vol VI PP. 357-58.

دوسری طرف غصہ اور غلامی کا احساس۔ حاکم محکوم طبقے کی رائے عامہ کی طرف سے بالکل غافل تھے اور عقل ـــــ اور کردار کے لحاظ سے انھیں خود سے کمتر تصور کرتے تھے۔ اسی لئے اعتماد اور ذمہ داری کے قابل نہیں سمجھتے تھے۔ دوسری طرف سمجھ دار، تعلیم یافتہ اور اعلیٰ خاندان کے افراد بے چارگی اور بےعزتی کے جذبہ سے پریشان رہتے تھے جو حکومت کے بے معنی خوف کے سبب کوہ آتش فشاں کی مانند وقتاً فوقتاً پھٹتا رہتا تھا۔

ملک میں جو عظیم بے اطمینانی پھیلی ہوئی تھی اس کے اظہار اور مقابلہ کو ایک ادارہ عطا کرنے کے لئے 1885ء میں انڈین نیشنل کانگرس کو وجود میں لایا گیا۔ لیکن برسوں گذر گئے اور کانگرس حکومت کو اپنی جانب ملتفت نہ کر سکی۔ صدی کے اختتام پر تمام وابستہ امیدیں کمھلا رہی تھیں اور جوش و خروش ٹھنڈا پڑنے لگا تھا۔ نئی اور زیادہ جذبات و تکرار سے لبریز آوازیں ابھرنے لگیں جنہوں نے زیادہ زوردار حرکت عمل کی وکالت کرنی شروع کی۔

اگر عوام میں تشویش اور تحریک پیدا ہوئی تو اس کے اسباب محض سیاسی نہیں تھے۔ بڑی حد تک یہ اسباب معاشی تھے۔ صنعتی ترقی پر زور دینے والی شاہی حکومت کی پالیسی نے خانگی دستکاری اور فنکارانہ کاریگری کو ختم کر دیا تھا اور دیہی زندگی کو منتشر اور مفلوج کر کے عام بدامنی پھیلا دی تھی اور یہی بدامنی تحریک کا سبب بن گئی۔

ان کے اثرات اخلاقی اور فکری میدانوں میں ظاہر ہونے لگے۔ ہندستان کی زندگی ان دنوں حیرت انگیز مخلوط مجموعہ (Curious Medley) ہو کر رہ گئی تھی۔ جدیدیت جس کا زور ذہن اور عقل، عورت اور افراد کی آزادی، اور اس بات پر تھا کہ قوم پرستی کو سماجی تنظیم کی بہترین شکل تسلیم کی جائے تاکہ شہریوں کے اندر وفاداری کے جذبات اس کے صلہ میں پیدا ہوں۔ اور انسان کو خودشناسی اور خدمت کے زیادہ سے زیادہ مواقع حاصل رہیں۔ یہ تھے خیالات جو پھیل رہے تھے لیکن اس کا طریقہ کار بہت سست اور بے آہنگ تھا۔ ملک آبادی اور رقبہ دونوں لحاظ سے بڑا تھا۔ افلاس اور جہالت میں بھی غرق تھا۔ بہت مہذب اور زندگی کی اعلیٰ قدروں پر فخر کرنے والا ہندستان اپنی انہی اعلیٰ اقتدار کو موجودہ حالات میں از سر نو زندہ کرنے کے لئے جدوجہد میں مصروف تھا۔

لیکن عام لوگ ان اقدار کو بلا دلیل و حجت صرف اپنے رسم و رواج کے ذریعہ قائم کئے ہوئے تھے۔ رسم و رواج کا نظم اس درجہ شدید اور سخت تھا کہ مغربی علوم، سائنس، فلسفہ، تاریخ اور ادب سے روشناس افراد بھی اعتقادات اور اصول میں اتنے پختہ تھے کہ وہ کسی تنقید اور استدلال کے قریب

سے بھی نہیں گذرے تھے۔

بڑے بڑے قصبوں میں جہاں یونیورسٹی کے تربیت یافتہ پیشہ ور لوگ پائے جاتے تھے وہاں کچھ حلقے ایسے مل سکتے تھے جو اپنے طور وطرز میں مغربیت کی نقل کرتے تھے لیکن مجموعی طور پر ان کے دماغ خصوصاً سماجی اور مذہبی معاملات میں قدامت کے رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ مشرقی قدامت پسندی اور مغربی حریت پسندی کا یہ اختلاط قطعی طور پر ناسازگار اور میکانکی تھا۔ ان دونوں نظریات میں بنیادی اتحاد اور معقولیت پر مبنی اتفاق پیدا کرنے کی کوشش میں کم کامیابی حاصل ہوئی۔

جدیدیت میں انتہاپسند گروہ کے افراد اس بات کے حامی تھے کہ قدامت کو پوری طرح ختم کر دیا جائے قدامت پرست انتہاپسند ایک مضبوط اور بلند و بالا دیوار چین کی مانند دیوار کھڑی کر دینے کی خواہش رکھتے تھے تاکہ جدیدیت کے داخلہ کا راستہ بند ہو جائے۔ ان دونوں میں سے کسی ایک جماعت نے بھی ان کوششوں کے فضول اور بے کار ہونے پر غور نہیں کیا۔

لیکن بہت سے متوسط مکتبہ خیال کے لوگ بھی ابھر رہے تھے جن کی کوشش تھی کہ قدیم کو جدید سے بلکہ مغرب تک سے مختلف مقدار میں ملا دیا جائے۔ کچھ لوگ ایسے احیاء مذہب کے حامی تھے جو کسی بھی عقیدے سے متفق نہ تھے اور انھوں نے ہندستان کے ماضی کو تھام رکھا تھا کیونکہ ان کے خیال میں ان ادوار میں ہندستان پر برتر و اعلیٰ روحانی تہذیب کا حامل رہ چکا تھا۔ اگرچہ مابعد کے دور میں اس میں زوال آ گیا۔ ان کے سامنے اہم کام یہ تھا کہ لوگوں کے غیر طبعی میلانات کو ختم کر کے ان میں قدیم اور حقیقی پاکیزگی مجتمع کی جائے۔ اور جدید مغربی تہذیب کے اچھے اور کارآمد حصے لے کر پرانی تہذیب میں پیوند لگائے جائیں۔

کچھ دوسرے لوگ نہ تو مکمل طور پر قدیم تہذیب سے ہی راضی تھے اور نہ ہی پیوند والی بات کو پسند کرتے تھے۔ ان کے نزدیک سماج ایک متبدل اور ارتقاپسند نظام ہے جو تکمیل اور تفریق کے ذریعہ عمل ترقی پذیر ہے۔ یہ دوسری تہذیب کے ان عناصر کو تو نہ یہ خود اپنا لیتے جو کارآمد ہوتے ہیں لیکن افراط اور شمولیت کے سماجی طریق عمل میں ایک تسلسل ہے اور اس طرز عمل کی عقلی اصولوں پر تنظیم کبھی بھی ممکن نہیں ہوتی اور اسی لئے مفکر فلسفی اور ادیب شک کے شکار ہو جاتے ہیں اور خود کو غیر یقینی حالت میں پاتے ہیں لیکن سرگرم قسم کے لوگ دلیل طلب یا شکی نہیں ہوتے۔ وہ ارادہ کرتے ہیں اور اپنے اخذ کئے ہوئے نتائج کی بنیاد پر سرگرم عمل ہو جاتے ہیں خواہ وہ نتائج منطقی ہوں یا نہ ہوں۔ خیالات اور عمل کے رہنماؤں میں کچھ قدامت پرست ہیں کچھ حریت پسند اور اب بھی کچھ ایسے ہیں جو انقلابی ہیں۔

تلک، ٹیگور، گاندھی، اربندو اور جواہرلال ان مکاتب خیال کے مثالی نمائندے تھے۔

گاندھی جی 2 اکتوبر 1869 کو بحر عرب کے سامنے ایک ساحلی قصبہ کاٹھیاوار کے ایک خوشحال ویش گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کرم چند گاندھی ایک بہت ذی اثر انسان تھے۔ وہ پوربندر، راجکوٹ اور بیکانیر (Wankaner) کی ریاستوں میں چیف منسٹر یا وزیر اعلیٰ رہ چکے تھے وہ راجکوٹ کے مقام پر واقع راجستھان کی کورٹ کے ممبر رہ چکے تھے جس کے ذمہ سرداروں اور ان کے قبائیلیوں کے درمیان نزاعات کی سماعت کرتے تھے لیکن نہ تو وہ دولت ہی جمع کر سکے اور نہ کوئی جائداد ہی بنا سکے اور نسبتہً غریب رہے۔ بہرحال وہ پختہ عزائم اور بلند اصولوں والے انسان تھے گاندھی جی نے ان کے بارے میں کہا ہے کہ وہ سچے، بہادر، رحم دل اور اپنی برادری سے محبت کرنے والے شخص تھے" وہ بے حد دیانتدار، غیر جانب دار اور اپنے مالک کے بے حد وفادار تھے۔

گاندھی جی کو بھی یہ سب خصائص ورثہ میں ملے تھے۔ ان کی والدہ ایک صوفی منش اور بہت مذہبی عورت تھیں۔ روزانہ پوجا پاٹ کرنا، مندر جانا، برسات کے چار ماہ کے روزے رکھنا اور پوتر ہندوؤں کے لیے جو سخت گیر حلف مقرر ہیں ان کو لینا اور بیماری اور کسی رکاوٹ کے بغیر ان پر عمل کرنا ان کا معمول تھا انھوں نے یہ تمام خصائص اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کو بھی ورثہ میں دیئے ہوں گے۔

ان کی ابتدائی زندگی تین حصوں میں منقسم ہے۔ اور ہر دور کا عرصہ مختلف ہے پہلے حصے میں ایک بڑھتے ہوئے بچے اور اسکول جانے والے نوجوان کی شکل میں ان کے نسلی خط و خال اور ماحول کے اثرات نمایاں نظر آسکتے ہیں۔ یہ دور 1969ء سے 1888 تک رہا جب وہ قانون کی تعلیم کے لیے انگلینڈ گئے دوسرا دور تین برسوں سے بھی کم کا ایک مختصر سا وقفہ ہے لیکن یہ تین سال ان کے کردار اور ذہن کو ایک خاص رخ کی طرف موڑنے اور ان کے مستقبل کو طے کرنے میں بڑے فیصلہ کن رہے ہیں۔ 1891 کے دوران میں ہی وہ ہندوستان واپس آئے اور دو سال تک وہ اس کوشش میں لگے رہے کہ کہیں یکسو ہو کر جم جائیں لیکن ناکام رہے۔

تیسرا دور جو 1893ء سے 1915ء تک کا ہے وہ غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے یہی وہ دور ہے جس میں انھوں نے اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنایا۔ افریقہ میں چلائی گئی تحریک میں پیش آئے ہوئے حادثات ان کے تلاش حق کے سلسلہ کے تجربات تھے وہ ایک طویل اخلاقی جنگ کی دہکتی ہوئی بھٹی سے گذرے جس نے قوم ہی کو سماجی اور سیاسی طور پر متاثر ہی نہیں کیا بلکہ گاندھی جی کی روحانی ترقی کے لحاظ سے بھی اہم ثابت ہوئی۔ کچا لوہا، فولاد، اور پتیل جلا جلا کر سونا بن گیا۔ ان کی ترقی کے ضمن میں خاندانی اثرات، ماحول

اور تجربات نے ان کی زندگی میں جو پارٹ ادا کیا اس پر دھیان دینا ضروری ہے کیونکہ آغاز کی زندگی ہی میں مستقبل کے نقوش دکھائی دے جاتے ہیں۔

اسکول کے ایک طالب علم کی حیثیت سے وہ بہت تنہائی پسند اور شرمیلے تھے جنھیں نہ تو تعلیم سے کوئی لگاؤ تھا اور نہ کھیل کود جسمانی ورزش سے۔ انھوں نے اسکول کے معائنہ کے وقت ٹیچر کے اکسانے کے باوجود بھی نقل کر کے ہجے کی غلطیوں کو درست کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ بہت رحم دل اور معاف کر دینے والے انسان تھے۔ انھوں نے شدید شہوانی جذبات کا اظہار کیا اور رقابت کی کربناکیوں سے بھی گذرے۔ لیکن باپ سے جو ان کو محبت تھی اور جس طرح اس معاملہ میں ان کی جوش عقیدت تھی وہ بہت ہی جاذب ہے۔ وہ اپنی والدہ سے بے حد محبت کرتے تھے۔ بہت کم عمری میں بھی ان میں صاف گوئی، پردہ داری اور فریب دہی سے نفرت کے غیر معمولی نشانات ملتے ہیں۔ وہ غلطی کرتے تھے لیکن اپنی غلطی تسلیم کرنے کی بے پناہ اخلاقی جرأت رکھتے تھے حالانکہ اس سے انھیں شدید ذہنی اذیت پہونچتی تھی۔

ان کے کردار کی حیرت انگیز خوبی یہ تھی کہ وہ ایک قدامت پسند ماحول میں رہتے ہوئے بھی تجزیہ پسند ذہنیت اور آزاد دماغ رکھتے تھے اور نئے نئے راستے اپنانے اور نئے تجربات کرنے کے لئے نئے نئے اقدام کرنے میں وہ کبھی نہیں ہچکچائے۔ مثلاً جب ان سے یہ کہا گیا کہ آزادی کے حصول کے لئے گوشت کا استعمال ضروری ہے تو انھوں نے خاندانی مخالفت اور پابندیوں کو بالائے طاق رکھ کر ایک سال تک گوشت بطور غذا استعمال کیا یہ کام والدین کی لاعلمی میں کیا گیا تھا۔ لیکن ان کا ضمیر اس پردہ پوشی (Secracy) سے اس قدر پریشان تھا کہ انھوں نے سب کچھ اپنے والدین سے کہہ کر معافی طلب کی جو منظور کر لی گئی۔ تجزیہ ختم ہو گیا۔ لیکن خیال ذہن سے چپکا رہا۔ انھوں نے دوسروں پر بھی اور اپنی ذات پر بھی تجربات کئے۔ کیونکہ دوسروں کی اصلاح کا میلان انھیں طالب علمی کے زمانے ہی سے تھا۔ یہ وہ میلان تھا جس نے انھیں تباہی کے غار کے کنارے تک پہونچا دیا۔ لیکن اس معاملہ میں ناکامی سے ان پر کوئی اثر نہیں پڑا اور جس قدر وقت گزرتا گیا رجحان پختہ تر ہوتا گیا۔

تجربات کا جذبہ ان میں تمام زندگی برقرار رہا یہاں تک کہ انھوں نے اپنی سوانح حیات کو ——— The story of My Experiments with Truth ... تلاش حق میں تجربات کا نام دیا ہے۔ یہ تجربات گاندھی جی کی شخصیت کی ایک سب سے اہم خصوصیت پر روشنی ڈالتے ہیں۔

وہ اپنے عزائم کو بغیر کسی پرواہ کے عملی جامہ پہنانے کی ایسی قوت رکھتے تھے جو بہت کم لوگوں میں ملتی ہے۔ اپنے عہد کو پورا کرنے کے لئے وہ اپنی زندگی کو بھی داؤ پر لگا دینے سے نہیں ہچکچاتے تھے۔ اپنے

ذہن میں کسی حقیقت کے عیاں ہوتے ہی وہ اس پر اس پختگی کے ساتھ عمل کرتے تھے جو قطعی ناقابلِ شکست ہوتی تھی۔ وہ حیرت انگیز استقامت کے مالک تھے کوئی بھی ناکامی ان کو ان کے مقصد سے ہٹا نہیں سکتی تھی۔

گاندھی جی کو مذہبی رجحان اپنی والدہ سے ورثہ میں ملا تھا۔ مذہبی شعور کی مثال علم الحساب، شاعری یا موسیقی میں کمال فن سے دی جا سکتی ہے۔ کوئی کم ماہر ہوتا ہے کوئی زیادہ لیکن غیر معمولی طور پر مہارت کا حصول صرف چند کے حصہ میں آتا ہے۔ گاندھی جی انھیں میں سے ایک تھے اگرچہ یہ پھول بعد کے اوقات میں پوری طرح کھلا۔

ان کی شروع زندگی کا مذہب انتہائی مبہم تھا۔ اپنے والد کے سامنے بیٹھ کر وہ ایک پنڈت سے رامائن سنا کرتے تھے اور اپنے والد اور دوسرے مذاہب مثلاً جین، پارسی، اور اسلام کے پیرؤں کے درمیان ہونے والے مباحثے بھی ان کے گوش گذار ہوتے تھے۔ انھوں نے اپنی والدہ کے ساتھ وشنو، شیو اور رام کے مندر دیکھے اور وہ کبھی کبھی ان کو ساتھ پر ان ناتھی (Pranaami) فرقہ کے مندر بھی لے جایا کرتی تھیں جہاں کوئی بت نصب نہیں تھا۔ دیواروں پر قرآنی آیات کندہ ہوتی تھیں اور تمام پجاری غیر ہندو لباس پہنتے اور غیر ہندو طریق پر عبادت کرتے تھے اس وقت ان کے دل میں تمام مذاہب کے احترام کا جذبہ پیدا ہوا۔ عیسائیت سے البتہ انھیں کراہیت رہی اس طرح منوسمرتی کے مطالعہ نے بھی ان کے ذہن پر کوئی خاص اثر نہیں ڈالا اور مندروں میں جانا بھی انھیں زیادہ پسند نہ آیا۔ مذہبی تجربات نے پھر بھی ان کے دل میں خدا کے وجود کا پختہ یقین پیدا نہیں کیا۔ اس کے برعکس ان میں دہریت پیدا ہو گئی۔

لیکن فطرت اور نسلی اثرات سے ان کا ذہن اس طرح بن گیا تھا کہ مذہب ان کی زندگی کا سب سے اہم محرک تھا۔ اسی لئے اگرچہ مذہبی شعور پختگی کو بھی نہیں پہونچا تھا لیکن یہ عقیدہ پیدا ہو چکا تھا کہ "اخلاقیات پر ہر شے مبنی ہے اور سچائی تمام اخلاقیات کا نچوڑ ہے" سچائی ان کا واحد اہم مقصد بن گئی جسے تلاش کرنا چاہئے۔ اور بعد کو جوان کا ذہن بنا اس کے اصول کے مطابق انھوں نے قرار دیا کہ سچائی خدا ہے اور خدا سچائی ہے۔ اس لئے برائی کے بدلے بھلائی کرنا ان کے اندر جاگزیں ہو گیا۔

گاندھی جی نے بھی دوسرے ہندوستانی نوجوانوں کی مانند انگلینڈ جانے کی خواہش کی کیونکہ وہ انگلینڈ کو "فلسفیوں اور شاعروں کی سرزمین اور تہذیب کا مرکز" تصور کرتے تھے۔[92] لیکن ان کی

92. Pyarelal, Mah[illegible] [illegible]ndhi the early Phase, P. 224

والدہ نے جو اپنی قدامت پرستی کے سبب کالے پانی پار جانے کی سخت مخالف تھیں انھیں اس وقت تک جانے کی اجازت نہیں دی جب تک ان سے تین قسمیں نہ لے لیں کہ وہ گوشت، شراب اور عورت کو ہاتھ نہ لگائیں گے۔ یہ انیس برس کا ناتجربہ کار انسان ستمبر 1888 کو اس انگلینڈ میں پہونچ گیا جو سماجی انقلاب کی کشمکش سے دوچار تھا۔ ملکہ وکٹوریہ کا دور خاتمہ پر تھا اور نئے نظریات پیدا ہو رہے تھے برطانوی صنعت و حرفت کو للکار دیا گیا تھا اور آزادانہ تجارت جس میں تمام سیاسی جماعتیں یقین رکھتی تھیں زد میں آگئی تھیں۔ اشتراکی نظریات کی نمو د تے جس سے بعد میں مزدور پارٹی وجود میں آئی اسوقت تک صرف دو جماعتوں کا سیاسی نظام چل رہا تھا اس کے لئے مسئلہ کھڑا کر دیا تھا پارنیل (Parnell) کی ہوم رول (Home Rule) تحریک شباب پہ تھی۔ غیر مقلدانہ نظریات اور امریکی موضوعیت پسند فلسفے مثلاً ایمرسن (Emerson) والٹ (Walt) ہوائٹ مین (Waitman) اور تھوریو (Thoreau) کے فلسفے مل (Mill) بینتھم (Bentham) اور گرین (Green) کی حریت پسندی کو للکار رہے تھے۔ رسکن Ruskin اور تھوریو (Thoreow) فطرت پرستی اور سادگی کے نئے نظریات کی ترغیب دے رہے تھے ٹالسٹائی (Tolstoy) عیسائیت کی نئی تفسیر و توضیح پیش کر رہا تھا۔ سبزی خور (Vegetarians) خبطی (Faddists)، انفرادیت پسند Individualists انگلستان کے شہنشاہیت مخالف انگلستانی (Little Englanderse) ہوم رولر Home Ruler تھیوسوف، باطنی صوفی اور معتقدان اکملیت۔ آسودہ حال اور اعلیٰ طور پر منظم ہو کر سب وکٹورین نظام کو دھکے پر دھکا لگا رہے تھے۔

گاندھی اپنی غیر واضح آرزوؤں، مبہم نظریات اور غیر یقینی عقائد لئے ہوئے انگلینڈ پہونچے ان کا علم محدود تھا کیونکہ وہ علم برائے علم کے قائل نہیں تھے انھوں نے اپنے مخصوص مقاصد کے حصول کے لئے مطالعہ کیا تھا۔ ان کی ہندوستانی زندگی کے تجربات ملک کے کونے میں پڑے ہوئے شہروں کی ہل چل سے دور اور بے نیاز صوبائی سماج تک محدود تھے۔ انھوں نے کبھی کوئی ایسا یونیورسٹی سے ملحق کالج بھی نہیں دیکھا تھا جو ان کے نظریات کو وسعت بخشتا۔ وہ مغربی طور طریق اور طرز زندگی کے بارے میں کم علم رکھتے تھے۔ جب انھوں نے پلے ماؤتھ (Ply mouth) میں کہرے اور بارش کے دوران قدم رکھا تھا تو ان کا ذہنی سرمایہ صرف ان کے ناپختہ فطرت، ذہانت اور جذبات تھے۔ ان کا اہم مقصد اس لیاقت کا حصول تھا جو انھیں ایک معقول رقم کمانے میں مدد دے

سکے اور ہو سکتا ہے کہ وہ اس قابل ہو جائیں کہ اپنے باپ کے پیشے کے اندر داخل ہو سکیں۔ ان کے دل میں اس دوران بلند مقاصد نہیں تھے۔ ایک کامیاب بیرسٹر بننے کے لئے انھوں نے سوچا کہ انھیں ایک کامیاب انگریز (English Man) بننا چاہئے اور اسی لئے وہ انر ٹمپل (Inner Temple) میں داخل ہو گئے۔

انھیں اس کا احساس نہیں ہوا کہ قدرت نے ان کو اس کردار کے ادا کرنے کے لئے نہیں بنایا تھا۔ ان کی قسمیں ان کی راہ میں بہت مزاحم ثابت ہو رہی تھیں اور ان کی تمام لاشعوری قوتیں انھیں مخالف سمت میں دھکیل رہی تھیں۔ قسمت نے انھیں اس منزل کی طرف کھینچ لیا جو انھوں نے خواب میں نہیں دیکھی تھی۔

گوشت نہ کھانے اور صرف ساگ ترکاری پر گذر کرنے کی جو قسم انھوں نے کھائی تھی اس نے ان کی فیشن پرست زندگی کی خواہش کو دبا دیا اور رفتہ رفتہ وہ کفایت شعاری، سادگی، خدمت گذاری اور بھائی چارہ کے نظریات کے حامی ہوتے گئے۔

مزید یہ کہ انھوں نے یہ سیکھا کہ صرف باطن سے ابھرنے والے خیالات کافی نہیں ہیں بلکہ ان خیالات کو عقل خرد اور اخلاق کے ترازو پر تولنے کے بعد ہی ان کو صحیح مانا جا سکتا ہے۔

انگلینڈ کے مختصر قیام نے جو تین سال سے کم مدت کا تھا، نوعمر گاندھی میں ایک تبدیلی پیدا کر دی۔ ان کے مذہبی شکوک رفع ہو گئے اور وہ دہریت کے ریگزار سے نکل کر مذہب کی ضرورت کے قائل ہو گئے۔ اگرچہ وہ یہ طے نہ کر پائے کہ کون سا مذہب اپنایا جائے۔ انھوں نے سماج کا ایک نیا فلسفہ سیکھا تھا اور زندگی کے اصولوں اور سائنس پر مبنی تشریح کا ادراک کیا تھا۔ وہ سالٹ (Salt) جیسے سبزی خور ول ایڈورڈ کارپنٹر (Edward Carpenter) جیسے سادگی پسندوں اور انسانیت پرست نظریات کے حامل برنارڈ شا (Bernard Shaw) سڈنی اولیور (Sidney olior) (جو بعد میں مزدور وزارت میں وزیر ہند مقرر ہوا) اور کیر ہارڈی (Kair Hardie) اور ریمزے میکڈانلڈ (Ramsay Mac Donald) جیسے سوشلسٹوں اور میٹ لینڈ (Maitland) اور انا بلفورڈ Annoi Kingsford جیسے باطن پرستوں جس نے تھیوسوفیکل سوسائٹی قائم کی خصوصاً میڈم بلاوٹسکی Madam Blavatsky کرنل آل کاٹ (Col - olcott) اور مسز اینی بیسنٹ اور عیسائی مبلغین جیسے ڈاکٹر پارکر (Dr Parker) متشککین جیسے بریڈلا (Bradlaugh) اور قدرتی علاج کے ماہرین مثل ڈاکٹر آلنسن (Dr Allinson) اور ڈاکٹر جوسیا اولڈ فیلڈ

Dr. Josia Oldfield وغیرہ کی صحبت میں رہے ان لوگوں نے عجیب طرز کی مغربی تہذیب کی نمائندگی کی
ایڈورڈ کارپنٹر (Edward Carpenter) کے الفاظ میں "تہذیب اور اخلاقیات کا پورا ڈھانچہ
تیزی سے کھوکھلا ہوتا جا رہا ہے۔ جائداد، تجارت، مختلف فرقوں کے تعلقات، جنسی تعلقات، شادی حب
الوطنی وغیرہ کے اخلاقی پہلو تحلیل ہوتے ہوئے ایک بعید منظر کی مانند دور ہٹتے چلے جا رہے ہیں نطشے
(Nietzsche) نے تمام عیسائی ایثار، بے نفسی اور دوسروں کی خدمت کے جذبات کو پھونک
کر رکھ دیا ہے۔ اور برنرڈ شا نے احکام عشرہ کو جو بقول مذہب موسوی اللہ تعالے نے حضرت موسیٰ
کو دیئے تھے مٹا دیا ہے"93/۔ ان رابطوں نے ان کے آتش شوق کو تیز کر دیا۔

ان کے منتخب مطالعہ جات نے ان کے غیر قدامت پرست نظریات کو پختہ کر دیا۔ کیونکہ
قانون کتابوں کے علاوہ انھوں نے نئی زندگی اور نئی تحریکوں پر لکھے ہوئے ادب کا مطالعہ کیا۔
انھیں انگلینڈ میں ایڈون ایرنالڈ کی کتاب The Songs Celestial جو بھگوت گیتا کی تعلیمات
کا آزادانہ اظہار و بیان ہے اور لائٹ آف ایشیا (Light of Asia) جو گوتم بدھ کی سوانح حیات
ہے، ان کو پڑھ کر انھیں ہندوستانی نظریات کا علم ہوا تھیوسوفی پر انھوں نے میڈم بلاوانسکی کی
(Key To Theosophy) کا مطالعہ کیا انھوں نے انجیل پڑھی اور پہاڑی کا وعظ سے بہت متاثر
ہوئے۔ کارلائل کی کتاب Heroes Hero worship and the Heroic in History کے باب
(Hero the Prophet) نے ان کو حضرت محمدؐ اور اسلام سے روشناس کیا۔

پھر بھی ان کا تجربہ ہی تھا کہ علم و مطالعہ جس نے ان کی بے یقینی دور کر کے مذہب میں ان کے عقیدہ
کو پختہ کیا۔ جب پریشانیاں ناقابل حل نظر آتی تھیں، جب طرز زندگی میں تبدیلی ناگزیر معلوم ہوتی تھی اور جب
برائی کی ترغیب و تحریص نے ان کو اخلاق کی تباہی کے کنارے پر لاکر کھڑا کر دیا تو ان کو محسوس ہوا کہ "ان
آزمائش کے اوقات میں تجربہ کے مقابلہ میں مذہب کا علم بھوسی کی حیثیت رکھتا ہے"94/ ان
کا خیال تھا کہ اگر فضل خداوندی نے ان کو بچا نہ لیا ہوتا تو وہ ہلاک ہو گئے ہوتے۔

مذہب کے علاوہ انھیں سماجی سیاسی اور انفرادی مسائل میں بھی دلچسپی تھی۔ انھوں نے سبزی
خوری، معتدلانہ ضبط اور نفس کشی کی عادت ڈالنے اور عیش پرستی سے اجتناب کرتے ہوئے انھوں

---

93. Ibid. P. 238

94. GANDHI. M.K. Autobiography P. 98.

نے سائنس اور عقلی جواز تلاش کئے۔ ضبط تولید، عورت، مزدور اور سرمایہ دار اور حکومت سے متعلق سوالات نے ان کی توجہ اپنی طرف منعطف کرائی۔ ان کو غریبی کے سماجی مسئلہ اور سماج میں انقلاب لانے کے وسائل و ذرائع سے گہری دلچسپی ہوگئی۔ ان کی فطری انفرادیت پسندی اور عقلیت پسندی نے ان کے اندر رسم و رواج اور روایات مروجہ پر کڑی نکتہ چینی کا جذبہ پیدا کیا۔ اور مذہب، سماج اور سیاست کے بارے میں جو کٹرے خیالات و افکار چلے آ رہے تھے ان پر بے چون چرا عمل نہ کرنے کا رجحان نمودار ہوا۔

1891 میں گاندھی جی ہندستان واپس آئے۔ انھیں وکالت کی سند مل گئی تھی اور وہ ہائی کورٹ میں بحیثیت وکیل شامل کر لئے گئے تھے۔ انھوں نے ہندستان میں وکالت کا حق پالیا تھا لیکن گاندھی جیسے ذہن اور نظریات والے شخص کے لئے حالات زیادہ موافق نہیں تھے۔ اس لئے بمبئی اور راجکوٹ میں مسلسل دو سال کی کوشش کے باوجود وہ اپنی زندگی کو مضبوطی سے ایک ڈھرے پر نہ جما سکے لیکن یہ دو برس ان کے ذہنی نشو و نما کے اعتبار سے بہت اہم ہیں کیونکہ اسی عرصہ میں وہ ایک ایسی ہستی کے زیر اثر آ گئے جو عالم بھی تھے اور مفکر بھی اور اسی کے ساتھ روحانی حیثیت سے بزرگ بھی یعنی راج چندر راوجی بھائی ستیہ وادھنی (Rajchandra Raoji Bhai Satiyavadhni) انھوں نے گاندھی جی کو مشورہ دیا کہ وہ گیتا کا مطالعہ کریں اور سچائی کی تلاش میں مسلسل ان کی رہنمائی کرتے رہے۔ جین مذہب کے پیرو ہوتے ہوئے انھوں نے خود ہندو، عیسائی اور اسلام مسائل کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور تبدیلی مذہب کی صلاح دینے سے ہمیشہ بچتے رہے تھے۔

یہ دیکھتے ہوئے کہ ہندستان میں کامیابی کے امکانات بہت کم ہیں انھوں دادا عبداللہ اینڈ کمپنی کی اس پیش کش کو منظور کر لیا کہ وہ ایک مقدمہ میں جو زیر کاروائی تھا قانونی مشیر ہو جائیں۔ اپریل 1893ء میں گاندھی جی جنوبی افریقہ روانہ ہو گئے۔ انھوں نے سوچا تھا کہ وہ کچھ ماہ بعد لوٹ آئیں گے لیکن مہینے برسوں میں اور برس دہائیوں میں تبدیل ہو گئے۔ وہ بائیس برس بعد افریقہ کو چھوڑ پائے۔

پہونچنے کے کچھ دن بعد انھیں ایک بہت روح فرسا تجربہ ہوا جو ذاتی طور پر ان کے لئے ہی توہین آمیز نہیں تھا بلکہ اس نے ان کے قومی و وطنی جذبات کی آبرو پر بھی کاری زخم لگائے تھے۔ انھوں نے بے جا نسلی امتیاز کو ختم کرنے اور ہندستانیوں کی سماجی حیثیت کو بلند کرنے کا بڑی شدت سے بیڑا اٹھایا۔ ان کا ذاتی مفاد عوام سے متعلق فرائض میں ضم ہو گیا اور ان کے خود کردہ ارادوں کے مطالبات نے انھیں جنوبی افریقہ میں اس وقت تک قیام پر مجبور کر دیا جب تک وہ لوگ مطمئن نہ ہو جائیں۔ بائیس سال کا مکمل وقفہ سنسنی خیز واقعات اور ایک بے مثال رزمیہ کش مکش کی داستانوں سے

بھرا پڑا ہے۔

مخالفت کی کہانی دو حصوں میں منقسم ہے پہلے حصہ میں 1894 سے 1906 تک کا وقفہ شامل ہے جب افریقی ریاستیں نوآبادیات میں شمار کی جاتی تھیں۔ دوسرا حصہ 1906 سے شروع ہوتا ہے جب نوآبادی نظام سیاسی خوداختیاری نظام کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ یہ دور 1906 سے شروع ہوتا ہے جب نوآبادی نظام (Gandhi - Smats) معاہدے پر ختم ہوتا ہے۔

پہلے حصہ کے دوران تحریک صرف اس پر مرکوز تھی کہ ہندستانیوں کو دھمکی دی گئی تھی کہ ان کو حق رائے دہندگی سے محروم کر دیا جائے گا اور ان پر تین پونڈ سالانہ کا فی کس جبری ٹیکس لگا دیا جائے گا اس طرح کے تفرقہ آمیز ضابطے ہندستانیوں کی خودداری فطرت کو سخت ناگوار تھے۔ گاندھی جی نے ان کے خلاف آواز اٹھانے کا فیصلہ کیا اور تمام ہندستانیوں کو اس تحریک میں حصہ لینے کی ترغیب دی۔

اپنی سچائی اور حقیقت پرستی کے بل پر انھوں نے اس تحریک کو شدید اثرانداز قوت، بے انتہا دہشتناک طاقت اور انتہائی باریک بینی کے ساتھ منظم کیا۔ لہٰذا ٹرانسوال میں ہونے والی کارروائیاں موقوف ہوگئیں۔

لیکن یہ سکون عارضی تھا جیسے ہی ٹرانسوال اور آرنج فری اسٹیٹ (Orange free state) کو حقوق حکمرانی عطا ہوئے رجسٹریشن ایکٹ (Registration Act) پاس کر دیا گیا اور دوسری تہدید آمیز کارروائیاں کی جانے لگیں۔ اس کے جواب میں گاندھی جی نے سول مقاومت تحریک شروع کر دی جس کے نتیجہ میں ہزاروں ہندستانی مرد، عورت اور بچے نٹال (Natal) چلے گئے۔ گفت و شنید شروع ہوئی اور ہندستانیوں کی شکایات اور پریشانیوں کی جانچ کے لئے ایک کمیشن مقرر کر دیا گیا۔ ہندستانیوں کے مطالبات مثلاً تین پونڈ ٹیکس کا خاتمہ۔ ہندستانی شادیوں کی منظوری، تبدیلی وطن میں سہولت بہم پہونچانا، مکانات پر قبضہ اور مزدوری کے لئے باضابطہ اقرارنامہ لکھوانے کی رسم کا خاتمہ، وغیرہ تسلیم کر لئے گئے۔ جون 1914 میں انڈین ریلیف بل (Indian Relief Bill) پاس کر دیا گیا اور جنوبی افریقہ کے جھگڑے ختم ہوگئے۔

یہ گاندھی جی کی زبردست فتح تھی۔ گوکھلے نے اس کو ایک حیرت انگیز طلسم کہا ہے جس نے عام مزدوروں کو نامور سورماؤں (Heroes) کی صف میں کھڑا کر دیا۔ انھوں نے کہا "گاندھی میں بے پناہ اور اعلیٰ روحانی قوت ہے جو اپنے اردگرد عام لوگوں کو بہادروں اور شہیدوں کا مرتبہ

عطا کر سکتی ہے" 95۔ اور خود ہراساں و پریشان اسمٹس (Smuts) یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوا کہ:۔
"میں ہندستانیوں کو پسند نہیں کرتا۔ ان کی کسی قسم کی مدد کرنے کے لئے بھی قطعی تیار نہیں لیکن
میں کیا کروں؟ تم لوگوں نے ہماری ضرورت کے وقت مدد کی تھی۔ ہم تم پر تشدد کیسے کر سکتے ہیں؟ میں
اکثر خواہش کرتا ہوں کہ تم لوگ بھی انگریزوں کی طرح تشدد پر آمادہ ہو جاؤ لیکن تم اپنے دشمن کو بھی تکلیف
نہیں دو گے۔ تم لوگ صرف خود تکلیف اٹھا کر فتح حاصل کرنے کے حامی ہو۔ اپنے خود بنائے ہوئے خوش خلقی
اور برادری کے اصولوں کی حمایت سے انحراف نہیں کروگے اور یہی وہ بات ہے جو ہم کو قطعی بے کس اور لاچار
بنا دیتی ہے" 96/

اس باب میں گاندھی جی کے ذریعہ جنوبی افریقہ میں چلائی گئی تمام اعلی تحریکوں کا تذکرہ ممکن نہیں ہے
لیکن ہندوستانی تحریک آزادی کا یہ رہنما اپنے جنوبی افریقہ کے تجربات سے اس قدر جلا پا چکا تھا کہ اس
کے ہندستانی کارناموں کو سمجھنے کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ اس نے جنوبی افریقہ میں کیا کیا اور
کیا سیکھا۔

گاندھی جی انگلینڈ چھوڑنے سے پیشتر ہی کچھ عقائد اپنا چکے تھے۔ ان میں ایک مذہب کی ضرورت پر پختہ یقین
بھی تھا لیکن وہ یہ نہ سمجھ پائے کہ کون سا مذہب سب سے بہتر ہے وہ اپنے عیسائی متعلقین کے ساتھ اس
جستجو میں بھی لگے ہوئے تھے۔ اپنے پیشہ کے کام سے پری ٹوریا (Pretoria) گئے وہاں وہ اپنے
موکل کے ایک وکیل اے۔ ڈبلو بیکر A. W. Baker سے ملے جو ان کے مقدمہ کا انچارج تھا اور
ایک بے ضابطہ سا معمولی قسم کا مبلغ بھی تھا۔ گاندھی جی نے اس سے کہا "میں نہیں جانتا کہ میں کس مقام
پر آ چکا ہوں۔ میری زندگی کیا ہے اور میرا عقیدہ کیا ہونا چاہیئے۔ میری خواہش ہے کہ میں اپنے مذہب کا اور جہاں
تک ہو سکے دوسرے مذاہب کا بھی سنجیدگی سے مطالعہ کروں"97/

بیکر (Baker) نے جو جنوبی افریقہ کے عام عیسائی مشن کا ڈائرکٹر بھی تھا انھیں اتوار کے
دن دعا میں شریک ہونے کی دعوت دی اور انھیں انجمن احباب (Society of friends)

95- Tendulkar, D.G. opcit, Vol I. P. 159.

96- Polak. K. St. Visva Bharti Quarterly, Gandhi Memorial Peace Number P. 110.

97. Gandhi, M.K. Autobiography. P. 151.

سے متعارف کرایا۔ جن میں ایک شخص کوٹس (Coats) نامی تھا۔ جو انجمن احباب کا کارکن تھی۔ اس نے انجیل، پارکر کی شرح اور ٹیلر کی کتاب Analogy اینالوجی کا دیگر کتابوں کے لئے مطالعہ کا مشورہ دیا اگرچہ وہ عیسائی دین کے مذہبی لٹریچر سے واقف ہو گئے لیکن ان کا ضمیر اس کو قبول کرنے اور تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ ہوسکا۔ ولنگٹن میں ایک عیسائی اپنا جدید مذہب شخصیت کی کانفرنس میں بھی انھوں نے شرکت کی۔ اس کے ممبران کی لگن سے وہ بہت متاثر ہوئے لیکن عیسائیوں کا یہ نظریہ کہ حضرت عیسی خدا کے بیٹے اور بشکل انسانی خدا ہیں اور انسانوں کے واحد نجات دہندہ ہیں۔ انھیں معقول نہیں معلوم ہوا۔ انھوں نے 1893 میں پریٹوریا (Pretoria) کے دوران قیام تقریباً اسی کتابوں کا مطالعہ کیا ان میں ایڈورڈ میٹ لینڈ (Edward Maitland) کی کتاب 'راہ کمال' (The Perfect way) جو کہ جدید عیسائیت کے عقائد کی تردید کرتی ہے اور انجیل کی شرح (The New Interprelation of the Bible) کے ساتھ ٹالسٹائی کی کتاب (The Kingdom of the God is within you) کا بھی مطالعہ کیا جس سے وہ بہت متاثر ہوئے۔ انھوں نے اس کے بارے میں لکھا ہے "اس کتاب کی آزاد خیالی" اس کے بلند اخلاقی مسائل' اور سچائی' کے سامنے مسٹر کوٹس Coates کی دی ہوئی تمام کتابیں پوچ اور بے معنی نظر آتی ہیں۔"98 گاندھی جی نے مزید تسلیم کیا کہ "اس کتاب کے مطالعہ نے میرے شکوک اور وسوسوں کو ختم کر کے عدم تشدد (Ahinsa) میں میرا عقیدہ پختہ کر دیا۔"99

1893 کے خاتمہ پر وہ آخر میں پریٹوریا سے ہندستان آنے کے لئے ڈربن (Durban) لوٹ آئے۔ لیکن جب انھیں جنوبی افریقہ میں موجود ہندستانیوں کے خلاف خطرناک قسم کی نئی دھمکیوں اور شورش کا علم ہوا تو اپنی موجودگی کو ضروری سمجھتے ہوئے انھیں وہاں ٹھہرنا پڑا۔

ڈربن میں بھی انھوں نے مذہبی مطالعہ جاری رکھا۔ انھوں نے اپنی لائبریری میں ٹالسٹائی کی لاتعداد تصانیف جمع کرالیں اور ان کا بڑی توجہ سے مطالعہ کیا وہ خود کو "اس عظیم رہنما کا ادنی پیرو اور ان کو اپنے رہبروں میں سے ایک رہبر تسلیم کرتے تھے۔"100 یہ حقیقت ہے کہ گاندھی جی اپنے ذہن میں موجود زیادہ

98- Ibid. P.172.

99- Pyarelal op cit Vol I. P. 627.

100- Ibid P. 628.

تردید کے لئے جس میں صرف ان کے مذہبی عقائد ہی نہیں بلکہ اپنے ذاتی اطوار، سماج اور حکومت سے متعلق نظریات کے لئے بھی ٹالسٹائی کے ممنون احسان تھے۔ مزید یہ کہ انھوں نے بھی اپنے مذہبی عقائد خصوصاً ہندو مذہب سے متعلق عقائد کے لئے وہی تنقیدی طرز عمل اپنایا جو عیسائی مذہب کی توضیح کے سلسلہ میں ٹالسٹائی اپنا چکے تھے۔ گاندھی جی نے بھی ٹالسٹائی کی طرح ہندو مذہب کی ان باتوں کو تسلیم نہیں کیا جو ان کے اخلاقی شعور اور استدلال پر پوری نہیں اتریں۔

ایسوٹیرک کرسچین یونین (Esoteric Christian Union) کے میت لینڈ (Maitland) سے ان کی خط وکتابت نے جو ان کے نظریہ مذہب کے کٹرپن کے خلاف تھے اسے تقویت بخشی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عیسائیت سے نہ صرف ان کی پرانی مغائرت دور ہو گئی بلکہ وہ بغیر اس کے نظریات کے قائل ہوئے عیسائی مذہب کے بڑے مداح بن گئے۔ عیسائیت کے علاوہ گاندھی جی ہندو مذہب کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے بہت بے قرار تھے کیوں کہ انھوں نے اب تک محض سرسری مطالعہ کیا تھا لیکن وہ اس پر سنجیدگی سے سوچ رہے تھے۔ اس سلسلہ میں راجہ چند بھائی سے ان کو کافی مدد ملی۔ انھوں نے گاندھی جی کے بہت سے سوالات کا جواب دیا اور مطالعہ کی تجویز رکھی۔ گاندھی جی کے سوالات اس لحاظ سے بہت دلچسپ تھے کہ وہ ان دنوں ان کے ذہن میں پیدا ہونے والے شکوک و مسائل پر روشنی ڈالتے ہیں۔ یہ سوالات عام مذہبی موضوعات پر ہوتے تھے۔ مثلاً خدا، کائنات اور انسان کی اہمیت اور ان کے آپس کے باہمی تعلقات۔ نجات (مکت) اور اس کے حصول کے ذرائع، اور شر کا وجود لیکن کچھ سوالات ایسے بھی ہوتے تھے جو ان کے مخصوص شبہات کے آئینہ دار ہوتے تھے۔ مثلاً ہندوؤں کے اوتار کا عقیدہ ویدوں کے الہامی ہونے کا عقیدہ، ہندوؤں، مسلمانوں اور عیسائیوں کی مذہبی کتابوں کو الہامی کتابیں تسلیم کرنا، مختلف مذاہب کی تقابلی حیثیت اور ان سب کا صرف اپنے سچے ہونے کا دعویٰ اور عیسائیوں کا عقیدہ تثلیث اور مذہب مسیحیت کی قطعیت کا نظریہ یعنی یہ کہ مسیحی تعلیمات خطا اور نقص سے مبرا ہیں۔

گاندھی جی کے زیر مطالعہ مختلف کتابیں رہیں۔ اوپنشد (Upanishads) میکس مولر (Max Muller) کی "ہندوستان ہم کو کیا سکھاتا ہے" (What India can teach us) پاتنجلی (Patanjali) کی کتاب "یوگا سوترا" (Yoga Sutra) فلسفہ کے چھ نظام "سادرشنا" "یوگا شسٹ" (Yogavasishtha) اور بھگوت گیتا آخری کتاب ان کے لئے روحانیات کے حوالہ فراہم کرنے کی کتاب تھی اس کتاب میں ان کے نزدیک ہندو مذہب کا نچوڑ موجود تھا۔ کیونکہ ان کے خیال میں ایشا اوپنشد (Esha Upanishad) کی پہلی نظم اس

کا لب ولباب ہے۔

راج چند جین مذہب کے پیرو تھے انھوں نے گاندھی جی کو جین مذہب کے مخصوص اصول اور سچائی اہنسا (عدم تشدد) اور عہد واقرار کی قدر وقیمت کے بارے میں بتایا۔

گاندھی جی کے مسلم دوستوں نے انھیں اسلام کا مطالعہ کرنے کی صلاح دی۔ انھوں نے کارلائل (Carlyle) کی کتاب (Heroes and Hero worship) میں محمدؐ پر لکھے ہوئے ایک باب کے علاوہ Sale کیا ہوا قرآن کا ترجمہ اور اورنگ (Irving) کی سیرت رسولؐ (Life of the Prophet Md.) کو بھی پڑھا۔ انھوں نے زرتشت کے اقوال بھی پڑھے

گاندھی جی نے تمام مذاہب کی سچائیوں کو سمجھنے کے لئے انتہائی خلوص سے کوشش کی تھی لیکن، ان کا مقصد نہ تو فلسفیانہ تھا اور نہ اصولی۔ وہ عملی انسان تھے اور ایسے نظریات کی جستجو میں تھے جن پر ایک عملی زندگی کی بنیاد رکھی جا سکے۔ وہ اپنے غیر واضح ماورائی مقاصد کے لئے عقلی جواز کی تلاش میں تھے مذاہب کے تقابلی مطالعہ نے ان کی اس تلاش کو انجام تک پہونچایا کہ کون سا ایسا مذہب ہے جو کامل اور سب سے بالاتر ہے وہ آخر کار حسب ذیل نتائج پر پہونچے۔

"ذاتی طور پر میں یقین رکھتا ہوں کہ ہر مذہب اپنے پیروؤں کے لئے کامل واکمل ہے البتہ جہاں تک بقیہ لوگوں کا سوال ہے ان کے لئے سب کے سب نامکمل ہیں۔ بلا کسی جانبداری کے آزادانہ طور پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ تمام مذاہب مکمل بھی ہیں کیونکہ ترقی کے ایک خاص منزل پر پہونچ کر شاستروں کے منضبط اصول بھی مزید مدارج ترقی حاصل کرنے میں زنجیر پا کا کام دیتے ہیں۔ .... اسی لئے اس دنیا میں کسی کے لئے بھی نجات حاصل کرنے کی خاطر اپنا مذہب چھوڑ کر دوسرا اپنانا مناسب نہیں ہے ہر شخص اپنے مذہب کی پیروی کرنے کے بعد نجات پا سکتا ہے۔ نجات کے معنی ہیں تمام دنیاوی لگاؤ اور نفرت وغیرہ سے مکمل رہائی اور یہ تمام مذاہب کا مقصد ہے۔"[101]

ان نتائج کی تائید ان کے بائیس سالہ جنوبی افریقہ کے دوران قیام چلائی گئی تحریکوں میں پیش آنے والے آلام ومصائب کے تجربات نے کر دی۔

ذاتی توہین کے ہر موقعہ پر اور دوران تحریک قومی احترام کی حمایت یا ہندستانیوں کی پریشانیوں

---

101. Ibid, p. 331.

اور شکایتوں کے اظہار کے سلسلہ میں اٹھائے گئے ہر قدم پر ان میں ایک نفسیاتی ردعمل ہوا کرتا تھا کہ طرز زندگی بدل دیا جائے یا تمام معاملات سے دست برداری اختیار کر لی جائے۔ گاندھی جی کے الفاظ میں یہ سب سچائی کے ساتھ کئے گئے ان کے تجربات تھے۔ ان میں ذاتی زندگی سے متعلق تمام معاملات مثلاً خوراک، کپڑے، صحت اور صفائی، علاج معالجہ، گھر کے چھوٹے کام (گھریلو نظام)، مفید فن، کاریگری اور عبادت شامل تھے طریقہ کار اور تفصیلات کی جانچ تنہائی کے گوشوں (آشرم) جیسے کہ فونکس پارک (Phoenix Park)، جو 1904ء میں انھوں نے قائم کیا یا ٹالسٹائی فارم جو 1910ء میں انھوں نے شروع کیا۔ جنوبی افریقہ میں گذری ہوئی شدید زندگی ایک دہکتی ہوئی بھٹی کی طرح تھی۔ جو فولاد کو پختگی عطا کرتی ہے۔

جنوبی افریقہ کے عارضی قیام کے خاتمہ تک ان کی زندگی خود عائد کردہ فولاد کی مانند سخت ذہنی اور اخلاقی تربیت کے سبب اور بھی درست ہوگئی تھی۔ پنچ روپ جلف جو لوگ سوترول اور جین مذہب کے ضوابط کے تحت لازم ہیں ان پر وہ عقیدہ قائم کر چکے تھے بلکہ ان پر عمل درآمد بھی کر رہے تھے۔ اور ایک مکمل فلسفہ، ذاتی زندگی کی تربیت اور بنی نوع انسان سے تعلقات کے ضوابط اور ان کے علاوہ سماج، معاشیات اور حکومت کے منزل مقصود کے بارے میں طے پا چکا تھا۔ جو عظیم اخلاقی و روحانی عمارت انھوں نے تعمیر کیا اس کی بنیاد مذہب تھا۔

گاندھی جی مذہب کو زندگی کا آخری مقصد اور سب کچھ تصور کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے نظریہ کی اکثر و بیشتر تشریح کی ہے۔

"تمام زندگی مذہب کے تحت چلنی چاہئے۔"102 "میرا دل" میرے الفاظ، میرے اعمال سب اس ماوراء ہستی کے رہین ہیں۔"103 "خدا ایک ایک سانس پر حاکم و قادر ہے۔"104 "میری تمام زندگی مذہبی روح سے اچھی طرح بھیگی ہوئی ہے۔ .... میری سیاست اور

---

102. Harijan December, 29. 1933 Hingorani A.T. All Religions One True extracts from writings and speeches of M.K. Gandhi. P.IIS.

103. Harijan February, 2, 1934. Ibid P.171.

104. Harijan March 2, 1934 Ibid P.172.

میرے تمام دیگر حرکات مذہب سے ماخوذ ہیں۔"105/

جب کوئی اپنی زندگی کو اس قدر بلند معیاری زندگی بنا لیتا ہے کہ وہ تمام حرکات و سکنات کو ایک بلند ترین نظریۂ حیات سے ہم آہنگ کر لیتا ہے۔ تو اس کی پرکھ کے لئے بھی معمولی لوگوں سے جدا پیمانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ گاندھی جی کی سیاست کو مذہب سے الگ رکھ کے دیکھا جائے تو وہ ایک معمہ معلوم ہوگی۔

بہر حال یہ یاد رکھنا چاہئے کہ گاندھی جی کے ذہن میں جمود نہیں تھا۔ بعض حالات میں تو وہ خود مراقبہ اور محاسبۂ نفس کے ذریعہ اپنے خیالات میں برابر نظر ثانی، توسیع یا ترمیم کیا کرتے تھے۔ درحقیقت وہ یہ سمجھتے تھے کہ تمام مذاہب میں مزید ترقی کی گنجائش پائی جاتی ہے۔ ایک لحاظ سے سب مکمل اور دوسرے لحاظ سے سب نامکمل ہیں لیکن تکمیل کی سمت بڑھ رہے ہیں۔

مثال کے طور پر اپنے جنوبی افریقہ کے قیام کے دوران انھوں نے مذہب کے روحانی پہلو پر زور دیا یعنی سچائی (ستیہ)، عدم تشدد (اہنسا)، مقاومت مجہول اور انسانیت کا اکرام و احترام۔ انھوں نے اپنی ذاتی زندگی کو پانچ قسموں کے مطابق ڈھال لی۔ جو مذہبی زندگی کے بنیاد کی حیثیت رکھتی تھیں۔ سچائی (ستیہ) اور عدم تشدد (اہنسا) مذہب کے اساس تھے لیکن چوری نہ کرنے کی قسم (یعنی استیہ) کا منشا یہ ہے کہ محض زندہ رہنے کے لئے جتنا ضروری ہے اس سے جو بھی فاضل ہے اس سے انکار و پرہیز کرنا اس قسم میں شامل ہے۔ ضبط نفس شہوانی (برہم چریہ) صرف اس لئے نہیں ہے کہ جسم کی تمام توانائی خدمت خلق میں صرف کی جائے بلکہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ انسان اپنے نفس کی جنسی لذت کی خواہش کو جو سب سے بڑی خواہش انسان کے اندر ہے اس سے دستبردار ہو جائے اور اس کے بعد اس میں یہ جذبہ پیدا ہونا چاہئے کہ وہ مال و دولت کے ترک (اپاری گرہ) کو اپنا سکے۔ یعنی املاک و جائداد رکھنے کی خواہش پہ قابو پا جائے۔

عہد کے مطابق انھوں نے اپنی ضرورتوں کو کم سے کم کر لیا تھا۔ اپنی زندگی کی ذاتی ضرورتوں کے معاملہ میں دوسروں پر بھروسہ کرنا چھوڑ دیا تھا۔ سادہ کھانا، سادہ پہننا اور معمولی سے مکان میں رہائش شروع کر دی تھی۔ اپنے ازدواجی فرائض کو ترک کر دیا تھا۔ اپنے پیشے سے سبکدوش ہو گئے تھے اور اپنا تمام وقت عوام کی خدمت کے لئے وقف کر دیا تھا۔

---

105. Ibid

گاندھی جی سب مذاہب کی برابری اور اتحاد کے حامی تھے ان کا کہنا تھا کہ ہر مذہب خدا کی طرف سے بھیجا گیا تھا۔ اوتار یا پیغمبر جو بے مثل بلند کردار کے مالک تھے۔ انقلاب لانے کا ذریعہ بنے لیکن بہر حال وہ انسان تھے اس لئے احکام الٰہیہ کے سمجھنے اور ان کے اظہار میں۔ ان کی شخصیتوں اور زمان و مکاں کی ضروریات کے تحت اختلافات پیدا ہوئے۔

اس طرح اگرچہ تمام مذاہب کی بنیاد ایک ہے لیکن اس کے باوجود سچائی اور عدم تشدد سب کی مشترک بنیاد ہے اور اس بنیاد پر جو محل تعمیر ہوئے ہیں ان کی وضع قطع مختلف ہے۔

یہ تصور کہ اصول میں یکسانیت اور فروع میں اختلافات ہیں دو ذرائع سے اخذ کئے گئے تھے ہندو مذہب کا عقیدہ "ات وتیاد" (یعنی مسئلہ غیر ثنیہ) اور جین مذہب کا عقیدہ "سید واد" (یعنی مشروط اثبات صحت وجود یا یہ مسئلہ کہ جس معاملہ میں اختلاف ہے اس میں ہر شخص کو اختیار ہے کہ جس کی چاہے پیروی کرے)

انھوں نے اپنی رہنمائیں جو انھوں نے اپنے اخبارات میں شائع کرلئے ان نظریات کی تشہیر کی وہ بیانات جن سے ان نظریات کا پتہ چلتا ہے حسب ذیل ہیں:۔

"میں اس نظریہ پر پہونچا ہوں کہ اگر اس مقام یا معاملہ کی تلاش جہاں پر دنیا کے تمام مذاہب متفق ہوں مناسب اور ضروری ہے تو اس کے لئے ایک ہی ماسٹر کنجی (Master Key) کی ضرورت ہوگی اور وہ ماسٹر کنجی سچائی اور عدم تشدد ہے"/106

"تمام سچائی ہم نامکمل انسانوں کے ذریعہ ظاہر ہوتی ہے۔ وہ اضافی ہے۔ ہم میں سے ہر شخص اپنی بصیرت کے مطابق عمل کر سکتا ہے"/107

"ہر چیز کو عقلی استدلال پر پرکھا جانا چاہئے اور آخر کار یہ نتیجہ نکلے گا کہ اس کے علاوہ کوئی اور دوسرا راستہ ہمیں پریشانیوں میں ڈال دے گا"/108

"بے شک اس دنیا میں کچھ چیزیں ایسی پائی جاتی ہیں جو فہم بشر سے ماورا ہیں ہم ان کو دلائل کی زد پر لانے سے انکار نہیں کرتے بلکہ وہ خود اس زد پر آنے سے گریز کرتی ہیں۔ فطرت نے جس

106- Harijan, March 30, 1947. Ibid P. 129-20

107- Harijan, April 27, 1947. Ibid P. 232.

108- Harijan, February 15, 1942. Ibid.

طرح ان کے وجود کی تعبیر کی ہے وہ خود عقل وفہم کو مقابلہ کی دعوت دیتے ہیں"109/
"میں ادویتا" (غیر تثنیہ) پر یقین رکھتا ہوں۔ انسان کی لازمی وحدت پر میرا یقین ہے"110/
"اپنے نقطہ نظر کے لحاظ سے ہر شخص درست ہے لیکن یہ بھی ناممکن نہیں ہے کہ ہر شخص غلط ہو"111/
"میں ایدویتا (یعنی غیر تثنیہ) کا معتقد ہوں اور میں عقیدہ ثنویت کی بھی حمایت کر سکتا ہوں اس لئے مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے کہ اس کا (یعنی دیتا) کا وجود تسلیم کروں یا نہ کروں اور مجھے لوگ بہت سے پہلو رکھنے والا حقیقت مادہ کا قائل (انیکن تواد ی) کہیں یا سید وادی (وحدت کا قائل) اپنے تجربات کے اعتبار سے میں نے ہمیشہ اپنے کو صحیح پایا ہے اور اپنے ایماندار نقادوں کی نگاہ میں غلط ثابت ہوا ہوں پس اس اصول کو پسند کرتا ہوں کہ حقیقتیں متعدد ہیں"112/

ایک طرف حقیقت کے واحد ہونے کے اصول نے گاندھی جی کو ان کے افکار میں عالم گیر وسعت عطا کی اور انسانوں کو جانچنے پرکھنے میں خواہ وہ دوست ہوں یا دشمن، ادارے ہوں یا مذاہب ایک عظیم فیاضی بخشی اور دوسری جانب ان کا غیر تثنیہ نواز نظریہ ان کے اندر خدا کے وجود کی وحدت اور اسی طرح بنی نوع انسان کی وحدت، مذاہب اور کائنات میں وحدت کے اعتقاد ویقین پیدا کرنے کا ذمہ دار ہوا۔ وہ اس بات کا بار بار اعادہ کرنے سے کبھی نہیں گھبراتے تھے کہ تمام مذاہب مکمل بھی ہیں اور نامکمل بھی لیکن پھر بھی تکمیل کی جانب ارتقائی منزلیں طے کر رہے ہیں حقیقت یہ ہے کہ دنیا کے ظاہر میں جو کچھ دکھائی دے رہا ہے اس سے بالاتر ہو کر وہ صرف انسان کے اندر کے جوہر اور مذہب کی قدر وقیمت کے قائل تھے۔ وہ لازمی طور پر ایک صوفی منش انسان تھے اگرچہ وہ اپنے متصوفانہ تجربات کا زیادہ ذکر کرنے کے عادی نہ تھے لیکن ان کی باطنی آواز کے ایسے بہت سے حوالے دیئے جا سکتے ہیں جب بحران اور ذہنی کربناکی کے عالم میں اس نے پیچیدہ معموں کو حل کر دیا۔ پریشانی اور ذہنی کشمکش کو ختم کر کے انھیں قلبی طمانیت بخشی ہے۔ یہ تجربات ان کے ستیہ گرہ کی تحریک اور ان کے برت کے دور کے پہلے کے ہیں۔ وہ اچانک نمودار ہوئے فیصلہ

---

109. Ibid.

110. Yong India, December 4, 1924.

111. From Yoravada Mandir, Chapter X.

112. Ibid.

کن اور ناقابل تسیخ ثابت ہوتے۔

بہر حال مذہب نہ تو صرف عقل کا معاملہ ہے اور نہ اندھی تقلید کوئی مذہب کہا جا سکتا ہے جہاں عقل کا کوئی دخل ہی نہ ہو۔ یہ انسانی ذہن کا ایک باطنی اور فطری میلان ہے۔ یہ ایک شخص کی خود کے لئے اور دوسرے لوگوں کے لئے اخلاقی پابندیاں اور حدیں مقرر کرتا ہے۔ اس کی آخری منزل خودشناسی و خودآگاہی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر انسانی فرد جملہ تمام افراد سے بہر جہت مل کر ایک ہو جائے اور اس کا نچلا نفس یعنی نفس امارہ بالاتر نفس یعنی نفس مطمئنہ کے تابع فرمان ہو جائے۔

ان کی جنوبی افریقہ کی تقریروں اور تحریروں میں نہ تو کسی مخصوص مذہب کے اصولوں اور نظریات کا حوالہ ملتا ہے اور نہ ہی ہندو مذہب کے رسم و رواج پر ہی انھوں نے کوئی توجہ دی ہے۔ ہندوستان میں بھی انھوں نے صرف اس بات کو ہی نہیں دوہرایا کہ انھوں نے مذہب سے کیا سیکھا یا مذہب کی باطنی اہمیت کیا ہے بلکہ تمام مذاہب کی انفرادیت اور برابری کا بھی اظہار کیا ہے۔ بہر حال ہندوستانی ماحول میں ان کی منتقلی نے ان کی توجہ شدت کے ساتھ ملک کی مذہبی حالت کی طرف منعطف کر دی یہاں اسلام اور ہندو مذہب ان کے سامنے آئے اور انھیں ایسے راستوں اور ذرائع کے بارے میں سوچنے پر مجبور کیا جس سے ان کے درمیان سمجھوتا ہو سکے۔ اس لئے انھوں نے ہندو مذہب کا جس کے عقائد کو ہندوستان کی بڑی اکثریت مانتی تھی بڑا گہرا تجزیہ کیا تاکہ یہ طے ہو سکے کہ اسلام اور ہندوستان میں پائے جانے والے دوسرے مذاہب کے لئے ہندوؤں کا رویہ کیا ہونا چاہئے۔ فرقہ وارانہ مسائل میں دخل انداز ہونے سے ان کے خیالات، الفاظ، اور عمل کو اس سے بھی زیادہ تقویت ملی جتنی جنوبی افریقہ میں تھی۔ یہ مسئلہ معمولی اہمیت کا مذہبی مسئلہ ہی نہ تھا بلکہ اس کی جڑیں تحریک آزادی سے ملتی ہیں۔ درحقیقت سیاسی اور مذہبی سوالات لاینحل طور پر آپس میں خلط ملط ہو گئے تھے۔

اس لئے مذہب پر گاندھی جی کے خیالات بڑی اہمیت کے حامل تھے کیونکہ تمام سیاسی؛ گاندھی جی خود کو سناتن دھرمی ہندو کہنے کے شائق رہتے تھے۔ انھوں نے جو اس لفظ کی حیرت انگیز تشریح کی ہے اس کی روشنی میں یہ سچ بھی ہے۔ اس کی سچائی کو للکارنا اس لئے بھی ناممکن ہے کہ ہندو مذہب ایک تغیر پذیر یا سیماب صفت فلسفہ ہے۔ یہ ایک پرانا مذہب ہے جس نے تاریخی ارتقا کے دوران بہت کچھ مواد جمع کیا ہے۔ یہ اسلام، بدھ مذہب اور زرتشت مذہب کی مانند کسی فرد خاص

کو اپنی اشاعت یا تبلیغ نہیں قرار دیتا۔ ہندو مذہب میں گا تھ، انجیل یا قرآن کسی طرح صرف ایک ہی کتاب نہیں ہے۔ کسی کتاب کو الہامی اور اس کے احکام کو واجب الاذعان سمجھا جائے۔ اس کے بارے میں بہت اختلاف رائے ہے۔ مزید یہ کہ ان کی شرحیں بھی بہت ہیں مثلاً رگوید کی جو بہت مقدس کتاب ہے اس کی کئی مختلف شرحیں ملتی ہیں نتیجہ یہ ہے کہ ہندوؤں میں سے کوئی فرد یا کوئی فرقہ یہ دعوے نہیں کرسکتا کہ وہ تنہا ہندو مذہب کا ترجمان ہے۔ کوئی مستقل ادارہ یا مذہبی نظام گرجا کی طرح کا ایسا نہیں ہے۔ جو قانون بنانے اور اعمال کے بارے میں ہدایات متعین کا مجاز ہو۔ یہ ایک ترقی پذیر مذہب ہے اس کے نظریات اور طریقہ کار مختلف زمانوں سے تبدیل ہوتے چلے آرہے ہیں اس کا یہی ابہام یا غیر واضح ہونا اس کی قوت بھی ہے اور کمزوری بھی۔ تقریباً تین ہزار سال کے طویل وقفہ تک اس کا تسلسل اور پھر سے زندہ ہو جانا اور لذکر یعنی اس کی طاقت کا ثبوت ہے اور اس کی مختلف فرقہ پرست جماعتیں اور ان کے آپسی اختلافات اس کا دوسرا پہلو یعنی اس کی کمزوری کی دلیل ہے۔

گاندھی جی نے ویدوں، اپنشدوں، بھگوت گیتا اور پرانوں کو الہامی کتب تسلیم کیا لیکن کچھ شرائط کے ساتھ۔ مثلاً ایک تو یہ کہ تنہا وید کو ہی الہامی کتاب نہیں سمجھا جانا چاہیئے۔ یا یہ تصور کرنا چاہیئے کہ ان چار ویدوں پر ہی تمام الہامی پیغامات اور علوم ختم ہوگئے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ہر لفظ یا ہر آیت کو الہامی نہ کہنا چاہیئے بلکہ کچھ مخصوص تعلیمات الہامی سمجھی جاسکتی ہیں۔ تیسرے یہ کہ کوئی بھی ان کی کسی تشریح کی پابندی پر مجبور نہیں ہے خواہ وہ تشریح کتنی ہی نکیمانہ کیوں نہ ہو انھوں نے کہا: "اگر وید کے اسباق عقل کے منافی اور تجربات کے متضاد ہیں تو انھیں مسترد کیا جانا چاہیئے۔"[113]

یہ اس کٹر مذہبی راستہ سے الگ طریقہ تھا جو احکام و رسوم کے ماخذ کو مستند اور ناقابل بحث قرار دیتا تھا۔ یہ ایک جدید معترضانہ ذہن کا نظریہ ہے جو مذہبی معاملات میں انسانی عقل کے فیصلے کو آخری مانتا ہے۔

انھوں نے ہندو اور دیگر تمام مذاہب کو بھی انھیں پیمانوں سے ناپا ہے مثلاً انھوں نے خدا کے وجود میں اپنے یقین کو پرکھا اور یہ نتیجہ نکالا کہ "سچائی ہی خدا ہے۔" خدا کے شخصی وجود کے

---

113. Tendulkar, D.G. ...e Vol II P. 361.

نظریہ سے ایک دہریہ منکر ہو سکتا ہے لیکن یہ ثابت کرنا کہ سچائی ایک مطلق اور برتر و اعلیٰ حقیقت نہیں ہے کسی کے لئے ممکن نہیں اس فارمولا سے خدا کی تمام خصوصیات اخذ کی جا سکتی ہیں مثلاً یہ کہ وہ برتر و اعلیٰ، ماورائے ادراک حقیقت ہے۔ عالمگیر قانون، خالق کل، پالن ہار، جلانے اور مارنے والا، محیط کل بغیر متغیر اور تمام معاملات حیات، حق، محبت اور اچھائی میں محیط مکمل ہے۔ وہ عقل اور وجدان سے سمجھا جاتا ہے۔ وہ ایک راز بھی ہے اور اسے ایک مافوق البشر ہستی کے ظہور میں بھی دیکھا جا سکتا ہے اس عقیدہ سے انھوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ کل عالم ایک قرینے سے بندھا ہوا ہے اور نوع انسان ایک اکائی ہے۔ انسانوں کے درمیان عدم تشدد کے رشتے قائم کئے بغیر اس اتحاد کے بارے میں نہیں سوچا جا سکتا۔ اس لئے انسانی مساوات اور عالمی امن کے قیام کے عقیدے کے لئے عدم تشدد ایک بنیادی عنصر ہے۔ عدم تشدد اور سچائی کو عملی زندگی میں داخل کرنے کے لئے عہد کی پابندی نفس پر قابو اور دنیوی اشیاء کے معاملے میں خواہشات پر قابو نہایت ضروری ہیں۔

گاندھی جی نے بت پرستی، گائے کے تحفظ، تناسخ یعنی ایک جسم سے دوسرے جسم میں چلا جانا یا قالب بدلنا اور کرم کی حمایت کی دلیلیں دی ہیں۔ ان معاملات میں انھوں نے مذہبی علماء کی بہ نسبت عقل کا سہارا لیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کا عقلی استدلال درست ہے یا نہیں روایات پرستوں کے خیال سے ان کے دلائل بحث طلب ہیں۔ بہر حال گاندھی جی کسی قانون کے ظاہری معنوں پر نہیں جاتے تھے بلکہ اس کی روح سے تعلق رکھتے تھے جیسا کہ ان کے اس عمل سے ظاہر ہے جو کہ انھوں نے ایک موت کی اذیت میں پڑے ہوئے بچھڑے کو اس اذیت سے نجات دلانے کے لئے کیا تھا۔

انھیں ذات پات سے شدید ترین دشمنی تھی خصوصاً اس کے گندے پہلو "چھوت چھات" کو تو وہ بدگوشت کی مانند سمجھتے تھے وہ اس سے اس قدر نفرت کرتے تھے کہ اس کی مذمت کے لئے ان کے پاس الفاظ نہیں تھے۔ حد یہ کہ ان کا کہنا تھا کہ اگر چھوت چھات کو ختم نہیں کیا گیا تو ہندو مذہب ختم ہو جائے گا۔ اس برائی کی مذمت میں انھوں نے کہا۔

"اگر مجھے یقین ہو جاتا کہ یہ (چھوت چھات) ہندو مذہب کا لازم جزو ہے تو صرف اسی ایک بنیاد پر میں بذات خود ہندو مذہب کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیتا"۔ 114 انھوں نے یہ بھی کہا کہ چھوت

114- Fischer, Louis, Gandhi, P. 165

چھات کی وبا کو ختم کر دیا جائے تو ہندو مسلم اتحاد آسان ہو جائے گا۔

وہ مذہبوں کی برائی میں یقین نہیں رکھتے تھے۔ سرودھرم سمانتو Sarvo Dharma Samanatua ، انھوں نے کہا ہے "میں دیگر تمام مذاہب کو بھی اتنا ہی محترم سمجھتا ہوں جتنا اپنے مذہب کو۔"115/ اور چونکہ میں ایک سناتنی ہندو ہوں اس لئے میں ایک عیسائی، بدھ اور مسلم ہونے کا دعوی کرتا ہوں۔"116/ انھوں نے مزید کہا کہ "تمام مذاہب کو مساویانہ نگاہ سے دیکھنے کے معاملے میں صرف یہی نہیں کہ ہم دیگر مذاہب کی قابل قبول خصوصیات کو اپنے مذاہب میں شامل کرنے سے ہچکچائیں گے بھی نہیں بلکہ اسے اپنا فرض تصور کریں گے۔"117/

گاندھی جی کے ان خیالات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے سناتن دھرم کو تمام قدیم رعایاتی پیچیدگیوں سے بری کر دیا تھا۔ حقیقت سے بعید نہیں ہو گا اگر گاندھی جی کو سب مذاہب کا ماننے والا ایسا غیر فرقہ پرست شخص تسلیم کر لیا جائے جس کے خیالات کسی مخصوص دائرے میں محدود نہ ہوں بلکہ جو تمام مذاہب کے فلسفوں سے مسائل جمع کر لیتا ہو۔ بدقسمتی سے ان کی زبان خصوصاً ان کے کچھ ہندو عقائد جیسے گائے کا احترام، بت پرستی، ورن آشرم اور اوتار کے بار بار دہرانے سے غیر ہندوؤں کچھ غلط فہمیاں پیدا کر دیتی تھیں۔

یہ حقیقت ہے کہ سیاست پر مذہبی نظریات کا اثر نہیں پڑنا چاہئے حالانکہ عملی زندگی میں زیادہ تر ایسا ہی ہوتا ہے لیکن کسی خاص مذہب کے زیر سایہ چلنے والی سیاست سیکولرزم کی راہ میں نفسیاتی رکاوٹیں پیدا کر کے فرقہ وارانہ رجحان میں ترقی کرتی ہے۔

گاندھی جی کا مذہب صرف دھیان گیان اور مراقبہ تک یا جلوۂ جمال ربانی کے حصول تک محدود نہ تھا بلکہ ان کا مذہب عمل اور سچائی کے برابر وسیع سے وسیع تر میدانوں کی قوت محرکہ کے مکمل استعمال سے تلاش و جستجو بھی تھا۔ ان کے نزدیک علم اور واقفیت کا مطلب قوت ارادی سے کام لینا تھا اور ان کا یقین کرم یوگ یعنی مسلسل عمل میں تھا۔ بغیر رکے مسلسل کام تمام عمر کام عمل کا مقصد تھا "معرفت نفس اور تکمیل کی جستجو

---

115 - Report of the first Annual Meeting of the federation of International Fellowship Satyagraha Ashram Sabarmati January 1948. P.17. (Hingram, op cit. P. 241.)

116 - Harijan, April, 27. 1947, Ibid P. 237.

117 - Fischer, L. op cit. P. 361.

اپنی تکمیل اور تمام نوع انسان کی تکمیل یہ اسی مقصد کے شکل ہے جو گوتم بدھ نے اپنے لئے چنا تھا یعنی تب تک نجات نہ حاصل کی جائے جب تک ایک ایک ذی روح نجات نہ پا لے۔

وہ کون سا راستہ تھا جس پر چل کر اس مقصد کا حصول ممکن تھا؟ یہ راستہ تھا سچائی اور عدم تشدد کا راستہ جہاں اپنی اور دوسروں کی تکمیل کی راہ میں آنے والی ان تمام دیواروں کو گرا دیا جائے جو کہ اپنی اور تمام مخلوق کی ترقی میں مزاحم ہوں۔ انھوں اس طریقہ کا نام عزم پختہ کے ساتھ جمار ہنا رکھا یعنی ستیہ گرہ (استقامت بالحق) اس جستجو کی پہلی شرط ہے عدم تشدد یعنی ان لوگوں سے بھی محبت رکھی جائے جو اس جستجو میں مزاحم ہیں۔ اور ان کو سچائی کی خاطر دکھ اٹھانے پڑے۔ اپنی آزادی، اپنی جائداد حتیٰ کہ زندگی تک کو بھی قربان کر دینے کے لئے آکسایا جائے یہ طریقہ تھا جس کی تعلیم تھوریو (Thoreau) اور ٹالسٹائی (Tolstoy) نے دی تھی۔ کہ برائی کے ساتھ عدم تعاون اور اجتماعی مزاحمت کارد؟ اپنایا جائے اور اگر یہ مزاحمت ذہن کو صحیح کرے تو مخالف پارٹی جو اگرچہ وقتی طور پر اپنے فوری ذاتی مفادات اور گمراہ کن جذبات کے فریب میں پھنسی ہوئی ہے۔ غلط کاریوں، توہمات اور بدگمانیوں کی اس دھند کو چھانٹنے کی کوشش کریگی جس نے ذہن و نظر کو بصیرت سے محروم کر رکھا ہے اور پھر اگر صحیح ذرائع سے صحیح مقاصد کی جستجو کی جائے گی تو کامیابی یقینی ہے۔

گاندھی جی نے ٹالسٹائی (Tolstoy) اور تھیوریو (Thoreau) کے جدید دور میں بنائے ہوئے اس پرانے طریقہ کو اتنے بڑے پیمانے پر اپنایا کہ تاریخ اس کی مثال نہیں پیش کر سکتی آزادی کے حصول کے لئے ستیہ گرہ کے ذریعہ عوامی مزاحمت کا استعمال دنیا کی تاریخ میں حیرت انگیز... اضافہ ہے۔

گاندھی جی کے مذہب کی شاندار عمارت سچائی اور عدم تشدد کے دو ستونوں پر کھڑی تھی وہ جانتے تھے کہ سچائی کسی بھی مذہب کے لوگوں کا غیر مشترکہ جائداد یا دوسرے الفاظ میں اجارہ نہیں بن سکتی سچائی آفاقی ہے اور گاندھی جی کی زندگی کا مقصد اس آفاقیت کو تمام مذاہب میں سمو دیتا تھا تاکہ ان کے تحاد کو تقویت مل سکے۔ 1920ء میں ایک مضمون "ینگ انڈیا" میں انھوں نے لکھا تھا۔

"مذہب سے میری کیا مراد ہے مجھے اس کی تشریح کرنی ہے۔ یہ ہندو مذہب نہیں ہے جسے میں لازمی طور پر تمام مذاہب سے بلند شمار کرتا ہوں۔ بلکہ یہ وہ مذہب ہے جو ہندو مذہب پر فضیلت رکھتا ہے۔ جو کہ ایک فرد کی فطرت میں انقلاب لاتا ہے اور جو اس کو نہایت مضبوطی کے ساتھ ہمیشہ پاکیزگی عطا کرنے والی سچائی کے تابع کرتا ہے۔ یہ انسانی فطرت کا بیش بہا اور عظیم ترین جوہر ہے

جدوجہد [illegible] وقت تک بیقرار رکھتا ہے جب تک وہ سچائی کا حصول نہ کرے اپنے خالق کو نہ پہچانے اور اس عالم خالق اور اپنے درمیانی تعلق کی وقعت کا احساس نہ کرے۔“118

گاندھی جی کے نزدیک مذہب نہ تو محض ایک عقلی معاملہ تھا اور نہ ایک فلسفیانہ سلسلہ جس سے دل کی تسکین ہو سکے۔ یہ رسم ورواج اور نظریات کا ایک مخصوص نظام بھی نہیں تھا۔ یہ حقیقی زندگی اور روزانہ کے فرائض کی ادائیگی میں ظاہر ہونے والی حرکت عمل کا اصول تھا۔ گاندھی جی کا عقیدہ تھا: ”ایسی خیالی سچائی بیکار ہے جو سچائی کے حامل شخص کو سچائی کی خاطر مٹنے کے لئے تیار نہ کردے۔ مذہب انسان کو اس کی ذات یا شخصیت کو مکمل ظہور کے حصول کی طرف لے جاتا ہے اور یہ فرد کو عدم خودی کی بندشوں سے آزاد کرتا ہے۔ مذہب کا یہ نظریہ فرار پسندوں کے نظریات کے قطعی منافی ہے۔ یہ اس نظریہ سے انحراف کرتا ہے کہ زندگی ایک فریب ہے۔ مایا ایک بوجھ ہے اور اس کی تمام جدوجہد کامیابی اور ناکامی ہے۔ اس کے برعکس یہ انسان کو دوسروں کے ساتھ تعاون کرتے ہوئے اپنی قوتوں کے احساس اور اپنے فرائض کی انجام دہی پر اکساتا ہے۔“ اس طرح انھوں نے بتایا ہے کہ روحانی قوتیں کسی بھی مادی قوت مثلاً لاتعداد فوج، مہلک ہتھیار، بے پناہ دولت اور بہت مبالغہ آمیز صنعت سے زیادہ عظیم اور قوی ہیں۔

فلسفۂ حیات کے اس عقیدہ کو لے کر اور مذہب کو انسانی حرکت وسکنات پر حکمراں تسلیم کرکے انھوں نے ناگزیر طور پر یہ نتیجہ نکالا کہ مذہبی اور روحانی قدروں پر مبنی سیاست بالکل بے مزہ ہے ”ایک لاش کی طرح ہے جو صرف جلنے کے لئے موزوں ہوتی ہے۔“

ایک رسالہ ”ہند سوراج یا انڈین ہوم رول (Hind Swaraj or Indian Home Rule) میں انھوں نے مذہب کی بہ نسبت سیاست پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ یہ رسالہ 1909 میں اس وقت لکھا گیا جب (Thoreau) رسکن اور تھوریو (Rus Kin) اور ٹالسٹائی (Tolsloy) کی تعلیمات ان کے ذہن میں تازہ تھیں۔ رسکن (Ruskin) کی کتاب ”انٹو دس لاسٹ“ (Un to This Last) کے مطالعہ نے ان پر گہرا اثر ڈالا انھوں نے لکھا ہے ”جس کتاب نے مجھ پر فوری اور عملی انقلاب پیدا کیا وہ ”انٹو دس لاسٹ“ تھی اس نے فوری طور پر ایسی حیرت انگیز اور بے نظیر یکسوئی عطا کر دی کہ میں کتاب میں تجویز کردہ طریقہ پر عمل

118- Young India, May 12, 1920, Neither a Saint nor a Politician.

کرنے کے لئے ایک دم تیار ہوگیا۔

ٹالسٹائی کا اثر بہت گہرا اور سرایت کن تھا۔ وہ ٹالسٹائی کو اپنا استاد سمجھتے تھے اس کی کتاب "خدا کی سلطنت تمہارے اندر ہے" (The Kingdom of God is within you) ان کی ذات پر چھا کر رہ گئی تھی۔ انھوں نے تسلیم کیا ہے کہ اس کتاب کے اثرات مجھ پر دائمی ہیں۔

گاندھی جی انگلینڈ کی بنات خوردوں کی حمایت کی جماعت کے ذریعہ بالواسطہ تھوریو (Thoreau) سے متعارف ہو چکے تھے لیکن ۱۹۰۷ء میں براہ راست اس کی کتابوں والڈن (Walden) اور (Civil Disobedience) کے ذریعہ وہ تھوریو سے متعارف ہو گئے۔ تھوریو کی تقلید کرتے ہوئے انھوں نے اپنی جنوبی افریقہ کی تحریک کو مقاومت مجہول (Civil Disobedience) کا نام دیا۔ اور ہند سوراج میں اس نظریہ کو سمویا کہ "اگر انسان یہ محسوس کر لے کہ غیر منصفانہ قوانین کی پابندی غیر انسانی فعل ہے تو کسی انسان کا جور و استبداد بھی اسے غلامی پر مجبور نہیں کر سکتا یہی سلف رول مفہوم رول کی کنجی ہے"۔/۱۱۹

ہند سوراج تین سوالات پر مشتمل ہے پہلا سوال یہ ہے کہ انگریزوں نے ہندستان پر فتح کیسے حاصل کی تھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہندستان بزور شمشیر فتح نہیں کیا گیا۔ بلکہ خود ہندستان نے اپنے آپ کو غیر ملکی لوگوں کے حوالہ کر دیا۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ ہندستان اپنی آزادی کیسے حاصل کر سکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ روئے زمین پر کوئی بھی طاقت لوگوں کی مرضی کے خلاف ان پر حکومت نہیں کر سکتی یہ غلامی صرف اس لئے ہے کہ نیم مغرب زدہ ہندستان اور دولت مند ملازم پیشہ افراد مثلاً ڈاکٹر، وکیل تاجر، زمیندار، اور سرکاری ملازم وغیرہ برطانوی حکومت کی مدد کرتے ہیں اگر وہ اس حمایت اور مدد سے دستبردار ہو جائیں تو انگریزوں کو حکومت چھوڑنی پڑے گی۔ تیسرا اور اہم سوال گاندھی جی کے سامنے یہ تھا کہ آزادی کے بعد ہندستانی سماج اور تہذیب کی کیا شکل ہونی چاہئے؟ ان کا کہنا تھا۔ کہ ہندستان اس وقت تک حقیقی آزادی حاصل نہیں کر سکتا جب تک یہ مغربی تہذیب کو چھوڑ اپنے قدیم سماجی، معاشی اور سیاسی نظام کو نہیں اپنا لیتا۔

مغرب پہ یہ فوری براہ راست اور غیر منصفانہ حملہ ایک ایسے ذہن کی پیداوار تھا جس کی جستجو شکوک و شبہات کی حدوں سے نکل کر حال میں تیقن کی حدوں میں داخل ہوئی تھی اگرچہ بعد کے

119- Gandhi, M.K. Hind Swaraj, P.6.

خود حکمرانی نے فرد اور جماعت کی شدت میں کمی کر دی تھی لیکن اس کی اصلی صورت میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی تھی اخبار "آریہ پتھ" Aryan Path 1938ء کے 'ہند سوراج' نمبر کے ایک پیغام میں انھوں نے اعلان کیا ہے "اگر میں اس کتابچہ کو دوبارہ رکھتا تو ممکن تھا کہ میں الفاظ میں کچھ ہیر پھیر کر سکتا تھا۔ لیکن ان تیس طوفانی برسوں میں جس سے میں گذر کر آیا مجھے ایسا کچھ بھی دیکھنے کو نہیں ملا جو مجھ سے اس میں ظاہر کئے گئے خیالات کو تبدیل کرا سکے"۔/120

اس لئے کم سے کم کچھ بنیادی نکتوں پر اس رسالہ کو گاندھی جی کے مستند نظری نظریات کا مظہر قرار دیا جا سکتا ہے ان میں سب سے زیادہ بحث طلب ان کا جدید تہذیب کی مذمت کرنا تھا۔

جدید تہذیب ان کے نزدیک لازمی طور پر ایک سطحی شے ہے جو انسان کی روح سے کوئی تعلق نہیں رکھتی بلکہ دنیا کے ظاہری اسباب اور انسانی زندگی کے ظاہری پہلوؤں سے ہی واسطہ رکھتی ہے۔ اس کے عقل و خرد کی حد بس یہاں تک ہے کہ فطرت کی قوتوں پر قابو پائے اور مادہ کی دنیا میں ہونے والے انقلابات کے اسباب اور اثرات کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ بیرونی دنیا کے مظاہر اور فطرت کے معاملات میں حد درجہ مشغول رہنے کی وجہ تہذیب کا منشا یہ رہ گیا ہے کہ جسمانی ضروریات کے پورا کرنے کے وسائل و ذرائع میں اضافہ کرے اور مادی خوشحالی کو ترقی دے۔ اس کے نزدیک ان مقاصد میں کامیابی ہی زندگی کا آخری نصب العین ہے یہ مذہب اور اخلاقیات میں اسے کسی قسم کی کوئی دلچسپی نہیں ہے

یہ مشینوں کی بنیاد پر قائم صنعتی نظام انسان کی آرام طلبی کی خواہشات کو شہ دیتا ہے۔ صنعتی ترقی نے آبادیوں کو شہری علاقوں میں مرکوز کر دیا ہے اور شہری زندگی میں لاتعداد برائیاں پیدا کر دیں ہیں۔ ان میں سے ایک بیماریوں میں اضافہ بھی ہے جس کی وجہ سے ڈاکٹروں اور دواؤں کی غیر صحت مند نشو و نما ہو رہی ہے دوسری برائی یہ ہے کہ تصنع کو پھولنے پھلنے کا موقع ملا ہے۔ اور سماجی تعلقات میں پیچیدگیاں نمودار ہوئی ہیں جن سے عدالتوں اور وکیلوں کی

---

120. Gandhi, M.K. Hind Swaraj or Indian Home Rule. The Aryan Path. Special Hind Swaraj Number, September, 1938.

مزدوروں کو لاحق ہوتی ہیں اور پیسہ برباد ہوتا ہے تیسری برائی سرمایہ اور محنت میں کشمکش ہے جس کی میں پیس دینے والی یکسانیت اور فیکٹریوں کے کام میں خلاف انسانیت میلانات۔ اس کے ریلوں نے ملک کا سکون غارت کر دیا ہے اور بیماریاں پھیلانے میں مدد دی ہے۔ انھوں نے دیہاتی زندگی کی خوشی اور اس کے فطری طرز کو تباہ کر دیا ہے۔ اس تہذیب نے ایک طرح سے نوجوانوں کو اخلاقی تعلیم سے محروم کر دیا ہے۔

افراد، اقوام اور فرقوں میں غیر صحت مند مقابلہ اور رقابت کی ذمہ داری بھی جدید تہذیب کے سر آتی ہے۔ ان سب کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ تشدد، ہتھیار بندی اور جنگ و جدل میں ترقی ہوتی رہی۔

یہ ہولناک تہذیب ہندستان کو بد اخلاقی اور بزدلی کی طرف ڈھکیل رہی ہے۔ اس نے ملک کے جسم میں جدیدیت کے تمام جراثیم کا انجکشن لگا دیا ہے مثلاً صنعتیت، شہریت سرمایہ داری، غریبی، ریلوے کے ذریعہ رسل و رسائل کا انتظام، وکلا، عدالتیں اور ڈاکٹر خوشامد پسندی اور فرقہ وارانہ تصادم، شراب خوری اور بداخلاقی۔ اور سب سے بڑھ کر ایک تعلیمی نظام حکومت کی طرح

جو ذہنوں کو مفلوج کر دینے والا، آزادی کی روح کو کچل دینے والا، خود اعتمادی کو ختم کرنے والا نسلوں کی قدیم مذہبی قدروں میں بے یقینی پیدا کرنے والا ہے۔

تاکہ ہندستان اپنی کھوئی ہوئی روح کو پھر حاصل کر سکے۔ گاندھی جی نے ہندستان کو انتباہ دیا کہ تہذیب جدید کو بالکلیہ مسترد کر دینا ضروری ہے۔ اس کے فنی طریقہ کار، اس کی مشینری، مادیت کا رجحان رکھنے والی اس کی تعلیم، اس کا منافی مذہب کلچر، جس کی مثال انھوں نے ایک طوائف سے دی ــــ دولت کی فراوانی، عیش و عشرت کی جستجو، جو حریت پسند، اور باہمی رقابت کی شکار سماجی تنظیم کے قیام کے بجائے انھوں نے قدیم ہندستانی دیہاتوں کی خود کفیل آزاد اور پر سکون زندگی کی تجدید کر کے ایک مثالی تہذیب کی بنیاد رکھنے کے خواب دیکھے ایسی تہذیب کے زیر اثر ہر شخص ایسے خاندانی پیشے کو اپنائے گا اور کسی اونچ نیچ کے بغیر ہر شخص برابر ہوگا۔ خواہ وہ بہتر ہو یا بدتر۔ اس طرح کے جمہوری گاؤں میں سب کو اپنی بساط کے مطابق ترقی کا پورا موقع ملے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ آزاد اکائیاں آزادانہ طور پر عوام کے لئے مزدوری معاشی کارروائیاں کرنے والی وفاقی تنظیموں میں شامل ہو جائیں گی۔

اس سیاسی تعلیم کے تحت افراد کو پوری آزادی حاصل ہوگی۔ لیکن حکومت کا دائرہ انتہائی کم ہوگا۔
اس تعمیر نو کا مطلب تھا نفرت کی جگہ محبت تشدد کی جگہ ایثار نفس، اور مادی طاقت کے
بجائے روح کی طاقت۔ یہ تہذیب خود غرضانہ تن پروری اور بے دینی کو ختم کر کے اصول مذہبی پر
یقین اور نیکی و پارسائی کے سنہرے دور کا افتتاح کرے گی۔

گاندھی جی کا خیال عدم تشدد کے ذریعہ ایک ایسے غیر حکومتی سماج کی تشکیل تھی جس
میں افراد اور ادا شدہ الفاظ، اپنے خیالات، اور اعمال میں سچائی اور عدم تشدد کی روح سے بھرپور
ہوں جس میں کوئی ایک دوسرے کو ناجائز طور استعمال نہ کر سکے اور نہ کسی قسم کی نابرابری ہو، اور
نہ کسی کا کوئی ملک ہو، جہاں افراد اور سماج اپنی فن کارانہ مہارتوں اور اپنے مقبوضات کا اپنے کو
امانت دار تصور کرتے ہوں۔ جہاں زندگی سادہ، غیر مرکزی اور فطری اور دیہی ہو۔ جس میں
صنعت کم سے کم ہو اپنی دال روٹی کے لئے ہر شخص دست کاری اختیار کئے ہوئے ہو۔ جہاں طاقت
کے ذریعہ تحفظ کرنے والی فوج نہ ہو بلکہ امداد اور خدمت کے لئے صرف پولس ہو۔ جہاں ریل گاڑی
نہ ہو اور مناسب دقت دور کرنے کے علاوہ مشین کا استعمال نہ ہو اور مشین ہر حال انسان کی غلام
رہے نہ کہ آقا۔ اور جہاں نہ ڈاکٹر ہوں، نہ وکیل ہوں، نہ منصف ہوں۔ بلکہ فیصلہ دینے کے لئے
پنچایتیں ہوں۔ اور جہاں نہ تو کسی قسم کی جسمانی سزا ہو اور نہ کوئی ایسی سیاسی جماعت ہو جو
طاقت کے بل پر حکومت کرے۔

عدم تعاون تحریک کے تلخ تجربات اور انسانی کمزوریوں کے احساس نے انہوں نے
حقائق کی شدت میں کچھ نرمی۔ اور اپنے مثالی نظریات میں تبدیلی لانے کے لئے مجبور کر دیا تاکہ
ان لوگوں کے کردار کے مطابق بنایا جا سکے جن میں ان خصوصیات کی کمی تھی جو سنجیدہ گرہی لوگوں میں
ہونی چاہئیں لیکن یہ ہم آہنگی ان کی طبیعت کے قطعی خلاف تھی۔ اس لئے ہچکچاہٹ اور
کے آگے جانے اور پیچھے ہٹنے کے واقعات ملتے ہیں

مثلاً مشینری کے معاملہ میں ان کا نظریہ تبدیل ہو گیا انھوں نے نہ صرف یہ کہ سنگر سلائی
مشین ہی کے استعمال کی اجازت دی بلکہ سنگر سلائی مشین جیسی مشین بنانے کے فیکٹری کے قیام
کو بھی صرف اس شرط کے ساتھ قبول کر لیا کہ وہ عوام کے قبضہ میں رہیں گی۔ اگر مشین بغیر روح کو ٹھیس پہنچائے
کئے ہوئے جسمانی امداد میں معاون ہو تو اس کے استعمال پر ان کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔
اسی طرح اگرچہ ۱۹۰۹ میں انھوں نے پارلیمانی نظام حکومت کو چار دن کی چاندنی کہہ کر اس کی

شدید مذمت کی تھی لیکن انھوں نے بعد میں اسی نظام کے مطالبے کی حمایت کی اور ۱۹۲۰ء میں یہ یہ اعلان کردیا کہ فی الحال جدید الفاظ میں میرا سوراج ہندستان کی پارلیمانی حکومت کا قیام ہے[۱۲۱]
لیکن شدید عملی معاملہ میں سب سے زیادہ حیرت انگیز رعایت انھوں نے اہنسا عدم تشدد اور مقاومت مجہول میں کی۔ انھوں نے تسلیم کیا کہ زندگی بعینی تشدد پر قایم رہتی ہے اور یہ بتلایا کہ قتل، ہنسا تشدد اس حالت میں نہیں ہے جب ایک ایسے شخص کی جان لی جارہی ہو۔ جس نے کسی کی جان لی تھی اس کی مثالیں یہ ہیں (۱) ان جانداروں کے اجسام کا ضائع کردینا جن کو انتہائی اذیت پہونچائی گئی تھی۔ ان جانداروں میں ایسے انسان بھی شامل تھے جو عنقریب واقع ہونے والی سست رفتار یقینی موت کی کربناک اذیت سے دوچار تھے (۲) ایک ایسی لڑکی کی جان ختم کردینا جس کو تشدد کی دھمکی دی جارہی ہو اور اس سے بچنے کی کوئی شکل نہ ہو۔

عدم تشدد کو انھوں نے تین درجات میں رکھا تھا (۱) روشن اور پاک صاف مبنی بر اصول (۲) آزمائی مصلحت۔ جس کو عملی حیثیت کا لحاظ رکھتے ہوئے بطور پالیسی اپنایا گیا ہو نہ کہ بطور اصول (3) مجہول۔ بزدلوں کا دستور۔ اپنے آخری ایام میں وہ یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ ان کے پیرؤں کی ایک کثیر تعداد عدم تشدد کے اصول پر اس کو ایک عقیدہ سمجھ کر عمل نہیں کرتے ہیں بلکہ اس لئے عمل کرتے ہیں یا تو وہ اسے مصلحت کا تقاضا سمجھتے ہیں یا پھر اس تشدد کا متبادل سمجھتے ہیں جو نا ممکن العمل نظر آتا ہے۔ انھوں نے یہ تسلیم کیا کہ چوں کہ لوگ عدم تشدد پر عمل پیرا ہونے کے لئے نا رضامند ہیں۔ اس لئے انھوں نے اپنے پروگرام کا صرف ایک جزء ان کے سامنے رکھا۔

اس منصوبہ کا مقصد ہندستان میں جمہوریت لانا تھا جمہوریت کی حمایت کے لئے ان کے نزدیک دو اسباب تھے پہلا تو یہ کہ جمہوری ذہن قطعیت کا معتقد نہیں ہوتا ہے یہ اپنے صوابدید (Syadvada) کے فلسفہ کی بنیاد پر کام کرتا ہے۔ یعنی وہ کام بھی ہو سکتا ہے اور نہیں بھی ہو سکتا۔ دوسرے یہ کہ جمہوریت گنتی کے اصول پر مبنی ہے۔ سر پھوڑنے پر نہیں۔ یعنی دوسرے الفاظ میں یہ عدم تشدد پر مبنی ہے کیوں کہ ان کی جمہوریت میں اقلیتوں کے مذہب، تہذیب، اور طرز عبادت پر کسی بھی طرح کے دباؤ کی گنجائش نہیں تھی۔ انھ یہ

121- Young India, 1919-1922 September 22, 1920, quotes the interview of Gandhi with the representative of the London Times appearing in Young India, December, 29, 1920.

نے کہا کہ" ایمان اور یقین کے معاملات میں اکثریت کا قانون کوئی حیثیت نہیں رکھتا" /۱۲۲
بہ عدم مداخلت کا اصول فرد کے لئے بھی تھا۔ انھوں نے کہا کہ" ہر فرد کو اس مذہب کو ماننے کا حق
ہے جو اسے سب سے اچھا لگے اور حکومت اس میں کسی مداخلت کی مجاز نہیں ہے" 123۔
اس کا مطلب یہ ہے کہ" حکومت کو ضرور بالضرور سیکولر ہونا چاہیئے" /۱۲۴

یہ ہے منزل کی مثالی سوسائٹی جو عدم تشدد پر مبنی تھی اور جس میں کوئی حکومت ہی
نہ تھی۔ اس کا اور موجودہ دور کی حکومتوں کا جو طاقت اور فریب کے ستونوں پر کھڑی تھیں۔
دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ گاندھی جی کے اس پلان کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو مقصد کے حصول کیلئے
تربیت دیں۔ اس لئے یہ ضروری تھا کہ سوسائٹی کے لئے متحرک جذبات و متحرک عملی قوت اخلاقی اور
روحانی قوت ہی ہو اور حکومت کے اجزا کی طرح تشکیل کی جائے جو اس کاروائی میں ممد و معاون ثابت
ہو۔ ان سب کے باوجود انھوں نے معاملہ کو یوں صاف کر دیا کہ" میں ہندستان سے آج ہی ان طریقوں
پر عمل کرنے کو نہیں کہتا جو میری کتاب" ہند سوراج "میں دیے گئے ہیں" 125

بنیادی نکتے یہ تھے (1) سب کا زیادہ سے زیادہ بھلا ہو (2) حکومت میں زیادہ سے
زیادہ تعداد میں لوگوں کو نمائندگی (3) لوگوں کے معاملات میں حکومت کی کم سے کم مداخلت
(4) فرد کی قیمت اور اہمیت کا احساس۔ ان تمام نظریات سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اس منصوبے
کا مقصد جمہوری حکومت قائم کرنا تھا۔ انھوں نے پرزور الفاظ میں یہ بات کہی" سوراج عوام
کی منتخب کی ہوئی ایسی پارلیمنٹ ہوگی جس کو مالیات، پولس۔ بری، بحری افواج، عدالتوں اور
تعلیمی اداروں پر مکمل اختیار حاصل ہوگا" /۱۲۶

اس پارلیمنٹ میں ایک ایوان قانون ساز مجلس کا ہوگا جس کے ممبران میں عوام کے کچھ بالواسطہ
طور پر منتخب شدہ نمائندے شامل ہوں گے اس میں نمائندگی کا حق صرف ان لوگوں کو حاصل ہوگا جنہوں نے

122- Young India 1919 - 1922 August 4, 1920, P. 860

123. Harijan, November 23, 1947. 124- Harijan, August 24, 1947.

125. Young India 1919-1922 December 8, 1920, P. 885.

126- Ibid.

ذاتی سوراجیہ (اپنے نفس پر قابو) کو حاصل کر لیا ہوگا۔ اور جو دیانت دار اور بے غرض ہوں گے۔ ان کا انتخاب ایسے رائے دہندگان کریں گے جو اپنے ہاتھ سے محنت کرنے والوں کی حیثیت سے رجسٹر میں اپنا نام درج کرا چکے ہیں۔

حکومت کی اکائیاں۔ گاؤں کی پنچایتیں ہوں گی جن کو بڑے اختیارات حاصل ہوں گے روایاتی حکومت (Traditional Stat) کا دائرہ کار محدود ہوگا۔ مثلاً اس کا کام ملکی دفاع، امن و امان کا قیام اور بڑے بڑے کارخانوں کی نگرانی ہوگا۔

عدل گستری پنچایتیں اور ایڈھاک (عارضی) ثالث کریں گے۔ عدالتوں کا ایک طویل درجہ بند سلسلہ نہ ہوگا بس چند عدالتیں ہوں گی۔ یہ فیصلے جلد اور سہل الحصول ہوں گے اور وکلا کی فیس بہت کم ہوگی۔

سماج کی بنیاد مساوات پر ہوگی اور فرقہ واریت اور خصوصاً چھوت چھات کو بالکل ختم کر دیا جائے گا۔ افراد کی تقسیم خاندانی پیشہ ورانہ میلانات (ورن دھرم) کے اعتبار سے ہوگی۔ لیکن ہر پیشہ کے لوگوں کا مرتبہ برابر ہوگا۔ خواہ ان کی آمدنیوں میں کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو۔ اپنی روزی کے لئے ہر شخص کو کام کرنا پڑے گا۔ لیکن دانشمند افراد زائد جسمانی اور دماغی کام بھی کر سکتے ہیں۔

اس سماج میں دولت کی تقسیم اگرچہ غیر مساویانہ لیکن منصفانہ ہوگی۔ اور اس تقسیم میں یہ خیال رکھا جائے گا کہ دولت کے اعتبار سے ابھی فرق زیادہ نہ ہو۔ صنعت، زمین اور دیگر املاک کے مالک اپنی جائیداد کو امانت سمجھیں گے۔ کارخانوں کے مالک مزدوروں کو اپنا ساجھی دار سمجھیں گے اور سرکاری کارخانوں میں مزدوروں کو بھی انتظامیہ میں نمائندگی کا حق ملے گا۔ زمینداروں کو بھی کسانوں کے برابر ہی حقوق ملیں گے اور اگر زمیندار ایسا کرنے سے انکار کریں گے تو زمین ضبط کر لی جائے گی۔

بڑے پیمانہ پر صنعتی کاروبار اور ٹرانسپورٹ جاری رہیں گے۔ لیکن حکومت اس پر قابض اور نگراں رہے گی لیکن ضروری اشیاء جیسے کھانے وغیرہ کا سامان اور کپڑے وغیرہ کا انتظام کسانوں اور دستکاروں کے ہاتھ میں رہے گا

جنگلات، دریا، آمد و رفت اور خبر رسانی کا نظام حکومت اپنے ہاتھ میں لے لیگی۔

منافع خوری اور مسابقت کو ختم کیا جائے گا۔ جوا، شراب اور عصمت فروشی جیسی مخرب اخلاق حرکتوں پر پابندی لگائی جائے گی۔

نظام تعلیم مکمل طور پر تبدیل کیا جائے گا۔ تعلیم قومی زبانوں کے ذریعہ دی جایا کرے گی اور

ہندی زبان کو ہندستان کے مختلف گروہوں کی مخلوط و مشترک زبان (LINGUAFRANA) کے طور پر پڑھایا جائے گا۔ تعلیم کا نظام دست کاری کے نقطۂ نگاہ کو مدنظر رکھ کر بنایا جائے گا اور کتابی تعلیم کردار کی تعمیر کے تحت اور فن کارانہ مہارت حاصل کرنے کے لئے ہوگی۔ مذہبی تعلیم کو اسکولوں میں اس لئے نہیں دی جائے گی کہ حکومت کی مداخلت کو شاید ہمیشہ ناگوار تصور کیا جائے گا"/27

سماج کی بنیاد پر تعمیر کردہ حکومت کے متعلق گاندھی جی کے خیالات ان کی تحریرات میں بکھرے ہوئے ہیں انھیں کبھی اتنی فرصت نہیں ملی کہ انھیں ایک مسلسل مضمون کی شکل دے سکتے

اگرچہ وہ اپنے مجوزہ اور مثالی منصوبے کی کچھ باریکیوں سے کہیں کہیں پہلو تہی کر گئے ہیں۔ لیکن انھوں نے اپنے اس عقیدے سے کوئی سمجھوتہ نہیں کیا کہ سماج ایک اخلاقی ہستی کا نام ہے جو افراد کو ان کی اخلاقی صلاحیتوں کو سمجھنے اور ابھارنے کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ حکومت کو بہرحال وہ کوئی روحانی وجود تصور نہیں کرتے تھے انھوں نے اس کو انسانی کمزوریوں کے لئے ایسی مراعات کے طور پر تسلیم کیا جسے سماج کے اندر سچائی اور عدم تشدد کی خوبیاں پیدا ہوتے ہی ختم کر دیا جائے۔

یہ انسان کی تاریخ کا المیہ ہے کہ دنیا کے عظیم ترین اور اعلیٰ ذہانت کے حامل مذہبی پیشواؤں کے پیروؤں نے ہمیشہ ان کی تعلیمات سے انحراف کیا ہے اور کمال یہ ہے کہ اپنے آقاکی تعلیمات سے منحرف ہوتے وقت بھی وہ مسلسل اس مذہب اور اس کے مبلغ میں اپنے یقین کا دعویٰ کرتے تھے۔ یہی بدنصیبی، بدھ مذہب، عیسائیت اور اسلام کے ساتھ رہی۔ اس طرح کا معاملہ پاکباز زندگی کے لئے آٹھ رخی راستے Eight fold Path of Righteous conduct کے ساتھ رہا جس کی آخری منزل نروان (نجات) کا بدرجہ اکمل حصول تھی۔ عیسیٰ نے عالمگیر محبت، عدم مزاحمت، اور امن کا پیغام دیا اور محمدؐ نے خدا کی وحدانیت، مساوات انسانی، عمل صالح، اور راضی برضائے الٰہی رہنے کی تاکید فرمائی۔ ان عالمگیر رہنماؤں کے پیروؤں نے ان احکام و فرائض پر عمل کرنے کا پوری تاریخ میں کیا نمونہ پیش کئے ہیں۔ ان تمام افسوسناک واقعات کو شرح و بسط سے بیان کرنا ضروری ہے جن سے فرنہاقوں کی تاریخ کے اوراق پر بدنما دھبے پڑے ہوئے ہیں، خونریزی، تباہی، بےرحمی اور تشدد کی لاتعداد داستانوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ ہندو مذہب کی روداد بھی اس سے بہتر اور مختلف نہیں ہے۔

---

127. Harijan, March 16, 1942, quoted in Bose N.K. Studies. P. 267.

"تاریخ کے اس پیچ وخم کے علوم نے بہت سے لوگوں کو گاندھی جی کے منصوبے پر سوچنے اور اس کی کامیابی اور ناکامی پر تحقیق کرنے کے لئے مجبور کر دیا۔ ٹیگور کا خیال تھا" شاید دکھایا نہ ہو سکے شاید وہ بھی بدھ اور حضرت عیسٰی کی طرح لوگوں کی ناانصافیوں کو ختم کرنے میں ناکام رہے لیکن وہ ایسے شخص کی مانند ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔ جس نے آنے والے زمانے کے لئے اپنی زندگی کو سبق آموز بنا دیا"۔ 128

گاندھی جی مطالعہ باطن کے عادی تھے جو ہمیشہ مراقبہ کے ذریعہ اپنے عمل کا محاسبہ کیا کرتے تھے اور اپنے حرکات و سکنات پر نکتہ چیں رہے تھے۔ وہ سچائی کو متحرک اور ہمیشہ وسعت پذیر حقیقت تصور کرتے تھے اور اپنے اعمال اور اپنی خامیوں کو جانچتے رہنا اپنا فرض خیال کرتے تھے۔ اگرچہ ان کی یہ متواتر جانچ پرکھ ان کی زندگی کے ساتھ ہی ختم ہوئی لیکن ان میں جو بے پناہ خود اعتمادی تھی کہیں کہیں آہستہ آہستہ ابھرنے والے شبہہ کے نقوش اس بارے میں ملتے ہیں کہ آیا ان کو معرفت نفس کا وہ مقام حاصل ہو گیا تھا جو ان کے اغراض و مقاصد کے حصول کے لئے لازمی ہے وہ سچائی اور عدم تشدد پر اپنے یقین میں ڈگمگاتے نہیں تھے۔ لیکن ملک میں بڑھتے ہوئے تشدد اور مسلمانوں اور ہندوؤں کے تیزی سے بگڑتے ہوئے تعلقات نے ان کے اندر اس روحانی قوت کے وجود کے احساس کو ہلا دیا تھا جو انسانوں کے دماغ کو پھیر دینے والی بھی جاتی تھی۔

جب 1915 میں جنوبی افریقہ سے واپس آئے تو کامیابی کی خوشی سے ان کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ انھوں نے اقرار ناموں سے پابند یا آزاد، تمام غریب، جاہل اور مایوس لوگوں کو اپنی سحر انگیز، حوصلہ مند، تحمل اور طاقت ور رہبری میں تحریک کے لئے اکسایا۔ جس نے جنوبی افریقہ کے سفید فام لوگوں کو متحیر کر دیا تھا۔ اس لئے ہندستان میں بھی اسی معجزہ کی توقع بالکل فطری بات تھی وہ اس بات پر مطمئن تھے اور سنجیدگی سے یہ خیال کرتے تھے کہ وہ عدم تشدد پر مبنی تحریک کے ذریعہ ہندستان کی قیادت کرکے اسے آزادی سے ہمکنار کر دیں گے۔ انھوں نے واقعی معنوں میں خود کو معدوم کرکے صفر کے برابر کر دیا تھا اور اس طرح اخلاقی صلاحیت اور قوت بن گئے تھے۔ اس لئے نتیجۃً اگر کوئی خرابی آجاتی تھی۔ یا کوئی فرد یا جماعت ان کے معیار سے گرتی نظر آتی تھی تو

128. Visva Bharti Quarterly, Gandhi Memorial peace Number. 1938. Rabindranath Tagore's articles, P. 13.

وہ اسے اپنی ہی ناکامی اور غلطی سمجھتے تھے اور اس کی تلافی کے لئے برت وغیرہ کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ نفس کشی کی کوشش کرتے تھے۔ البتہ آخری دنوں میں ان کے ذہن پر افسردگی اور ناامیدی کے بادل چھاگئے تھے لیکن پھر بھی وہ اس کے خلاف مردانہ وار برسرپیکار رہے۔ ابتدائی دور میں اگرچہ ان کے پیروؤں کی کجروی اور غلط کاریوں نے انھیں مایوس نہیں کیا تھا وہ ان کی غلطیوں پر انھیں ملامت کردیتے تھے اور خود نیا بتی کفارہ ادا کردیتے تھے لیکن وہ کبھی بھی مستقبل سے مایوس نہیں ہوتے تھے اور نہ امید کا دامن چھوڑتے تھے۔

مثلاً جب ۱۹۱۹ کے رولٹ بل کی مخالفت میں ستیہ گرہ شروع کی گئی تھی تو احمد آباد اور بمبئی میں لوگوں نے ہڑتالیں اور دیگر تباہ کن حرکات شروع کردی تھیں۔ تو انھوں نے نہ صرف یہ کہ تشدد کی مذمت کی بلکہ ۷۲ گھنٹے کا برت رکھا۔ بلکہ برسرعام یہ بھی تسلیم کرلیا کہ یہ تحریک ایک بہت بڑی ہمالیہ پہاڑ کی سی غلطی تھی۔ 1912 میں شہزادہ ویلز کی آمد پر بمبئی میں فساد اور افراتفری پھیلی تو وہ گہرے غم میں ڈوب گئے۔ اور احمد آباد کانگرس کے نمائندوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ " میں صرف سچائی کا متلاشی ہوں۔ اس کی جستجو کے لئے متواتر کوشش جاری رکھنے کا دعوی کرتا ہوں۔ لیکن میں یہ مانتا ہوں کہ میں ابھی اس کو پا نہیں سکا ہوں۔ سچائی کو کامل و اکمل طور پر حاصل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ نفس کی اور اپنے تقدیر کی معرفت نامہ حاصل ہو جائے۔ یہ چیز ہے جسے کہتے ہیں کامل ہونا" /۱۲۹

انھوں نے بار بار یہ اظہار کیا کہ " میں ہرگز کامل انسان نہیں ہوں بلکہ اس منزل سے ابھی بہت دور ہوں اس کے راستہ سے واقف ہوں لیکن راستہ سے واقف ہونے سے کوئی منزل تک نہیں پہونچ جاتا ہے" /۱۳۰ 1924 میں مسلسل ہندو مسلم فسادات کے بعد جو کہ ان کے دہلی میں ۱۸ ستمبر سے 8 ار اکتوبر تک کے تاریخی برت سے صرف عارضی طور پر بند ہوئے انھوں نے بڑے افسوس کے ساتھ کہا کہ " میں نے اپنی نا اہلی کو تسلیم کرلیا ہے" /131 برٹ ڈی لائٹ

129- Tendulkar, D.G. op.cit Vol II P, 98.

130- Ibid, P, 170.

131- Ibid, P, 240.

[illegible]) کو تحریر کردہ اپنے ایک خط میں انھوں نے یہ تسلیم کیا" میں جانتا ہوں میں اکثر ناکام ہو جاتا ہوں، کبھی کبھی اس کا مجھے شعور ہوتا ہے لیکن بسا اوقات تو میں بے خبر ہی رہتا ہوں۔ میں اپنی ناکامیوں کا رنج و غم کے ساتھ شدید احساس رکھتا ہوں۔ البتہ میرے اندر جو روشنی ہے وہ پائیدار اور واضح ہے "132/

اس طرح کے لاتعداد بیانات پیش کئے جا سکتے ہیں کہ کبھی گاندھی میں ابھرنے کی جو عظیم طاقت تھی وہ ہر شکست پر غالب آجاتی تھی۔ حتی کہ ناکامیوں پر بھی غالب آجاتی تھی اور 1931 کی گول میز کانفرنس اس کی ایک مثال ہے۔

لیکن 1939 کے بعد ان کی پاک اور پر سکون روح کی نور افشانی پر تاریک بادلوں کے سائے چھانے لگے تھے۔ دوسری جنگ عظیم میں جس طرح ہندستان کو اس کی مرضی کے خلاف گھسیٹا گیا اور جو فرقہ وارانہ تلخی پیدا ہوگئی تھی اور بے کسی کے احساسات جس طرح عام طور پر پھیل گئے تھے۔ ان سب نے کانگرس کو مجبور کیا کہ وہ ایسی کارروائیوں کے اختیار کرنے پر غور کرے تاکہ ملک کا کھویا ہوا وقار واپس آجائے اور مایوسی کی جو فضا پیدا ہوگئی ہے وہ دور ہو جائے۔ چنانچہ ۱۹۴۲ آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے گاندھی جی کی رہنمائی میں برطانوی حکومت سے ہندستان چھوڑ دینے کا مطالبہ کیا۔ اس فیصلے پر عمل درآمد کے کسی اقدام سے پہلے ہی گاندھی جی اور دیگر کانگریسی رہبروں کو آہنی سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا گیا۔

۱۹۴۴ میں اپنی رہائی کے بعد انھوں نے ملک کو جبر و تشدد، مایوسی، نفرت، اور غصہ کے شعلوں میں گھرا ہوا پایا۔ لیکن سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ فرقہ وارانہ فسادات کی آگ تمام ملک کو نگل جانے کے لئے بیتاب تھی۔

اگست ۱۹۴۶ میں مذہبی منافرت کا آتش فشاں پھٹ پڑا۔ گاندھی جی دوڑ کر بنگال پہنچے پھر بنگال سے بہار اور بہار سے دہلی بھاگے وہ ہر جگہ گئے اور ہر جگہ انھی نفرت کی آگ کو ٹھنڈا کر کے امن و امان قائم کر کے ایک معجزہ دکھا دیا۔ لیکن ان بہادرانہ جانفشانیوں نے انھیں تقریبًا توڑ کر رکھ دیا۔ آزادی، مساوات اور محبت کی وہ دنیا جس کی تعمیر کے خواب انھوں نے تیس سال کی طویل اور محنت طلب مدت میں دیکھے تھے۔ دھوئیں کی مانند ختم ہوتی معلوم ہو رہی

132- Visva Bharati Quarterly, Gandhi Memorial Peace Number 1938.
Ethel Mannin's article, P. 102.

تھی انھوں نے اپنے ظاہری سکون کو قائم رکھا اور اپنی روح کے تربیتی طور پر نفس کشی کے اعمال کو مزید سخت کر دیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا دل بے یقینی اور غم سے پارہ پارہ تھا۔

انھوں نے سریرام پور (نواکھالی) سے امیہ چکرورتی (Amiya Chakravarti) کو لکھا "میں اندھوں کی طرح روشنی کو ٹٹول کر تلاش کر رہا ہوں میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ میرے پاس وہ صبر اور وسائل نہیں ہیں جن کی ان حالات میں ضرورت پڑتی ہے۔ تکالیف اور برائی مجھ پر چھا جاتی ہیں اور میں اپنے ہی جسم کی رطوبت میں پگھلا رہتا ہوں" 133/

پیارے لال کو راز دار بنا کر انھوں نے بتایا "میں سمجھتا ہوں کہ میرے اندر ضروری اہلیت کی کمی ہے اور اسی لئے میں اہنسا (عدم تشدد) کی کنجی نہیں حاصل کر سکا" 134/

اس اداسی میں بھی اپنے مقاصد و اصول کے موثر ہونے پر ان کا اعتقاد متزلزل نہیں ہوا۔ انھوں نے ملیل کو لکھا "سچائی عدم تشدد مکمل ہیں۔ وہ کبھی ناکام نہیں ہو سکے۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ میں ان کا ترجمان ناکام ہو جاؤں۔" 135/

3 جنوری 1947 کو انھوں نے پھر اس کا اعادہ کیا کہ "میں محسوس کرتا ہوں کہ مجھ میں کہیں نہ کہیں بڑی زبردست کمی ہے جس کی وجہ سے یہ سب ہو رہا ہے۔" انھوں نے سوال کیا کہ "خدا مجھے اس تاریکی سے نکال کر کب اپنا نور عطا کریگا" 136/

1947 میں تمام سال یہ دل شکستگی اور شکوک کا انداز قائم رہا۔ مئی میں انھوں نے ڈاکٹر پدھان چندر راؤ کو (جو بعد کو مغربی بنگال کے وزیر اعلیٰ بنے) بتایا "جب ہر طرف غصہ اور غضب ناکی کی آگ پھیلی ہوتی ہے تو میں چین سے نہیں بیٹھ پاتا" 137/۔ مئی میں انھوں نے بے حد مایوسی سے کہا تھا "میری زندگی کا کام شاید تمام ہونے کو ہے" 138/۔ جون میں انھوں نے پچھتاوے کے طور پر کہا تھا "تعمیری کام کے مقابلے میں عام نافرمانی (مقاومت مجہول) کی تحریک چلا کر میں نے غلطی کی تھی۔۔۔۔۔۔ میں گھبرا گیا تھا کہ کہیں میرے ساتھی بیگانے نہ بن جائیں اور اسی لئے میں نے نامکمل عدم تشدد کا سہارا لیا تھا" 139/

---

133 - Pyarelal, Mahatma Gandhi The Last Phase Vol I P. 430.

134 - Ibid 431. 135 - Ibid P. 466

136 - Ibid P. 470. 137 - Ibid vol. II. P. 191

138 - Ibid. P. 210 139 - Ibid, P. 314.

جولائی میں آصف علی کو (جو بعد میں ممالک متحدہ امریکہ میں ہندستانی سفیر ہوئے) انھوں نے لکھا تھا: "میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ہمارا طریقہ کار سطحی عدم تشدد پر مشتمل تھا۔ ہمارے دل تشدد کے حامی تھے"/140۔ انسان کے دوامی مسئلہ اور انسانی روح کی مسلسل محنت کشی کو جن کے لئے وہ حل کرنے کی فکر میں تھے۔ ان الفاظ میں ظاہر کیا تھا: "میری روح مجھے ایک طرف کھینچتی ہوں اور جسم دوسری طرف۔ ان دونوں متضاد قوتوں کی کشمکش سے رہائی تو ممکن ہے لیکن جد وجہد کو بہت سست رفتاری اور اذیت ناک منزلوں سے گذرنا ہوگا۔ اس جد وجہد میں جسم کو مسلسل صلیب پر چڑھنا ہوگا تاکہ روح کو آزادی حاصل ہو سکے"/141

اندرونی کشمکش ایک ایسے اذیت ناک مرحلے پر پہونچ گئی تھی کہ ان کا دل چیخ اٹھا: "اے خدا میں تجھ سے دعا کرتا ہوں کہ مجھے ان وحشی انسانوں کی خونریزی کا مجبور تماشائی بنانے سے بہتر ہے کہ مجھے ان آنسوؤں کی وادی سے اٹھالے .... پھر بھی میں جانتا ہوں کہ تیری ہی مرضی غالب رہے گی"/142

حکومت کے منتقل ہونے کے بعد ان کو نئی روشنی ملی اور جو دھند چھایا ہوا تھا دور ہوگیا۔ انھوں نے سوال کیا: "اگر ہندستان اب عدم تشدد کا استعمال نہیں کرتا تو وہ میرے کس کام کا"/143
ان کی تکلیف اس قدر شدید تھی کہ وہ سوچنے لگے تھے کہ "میں اپنی چتا پر لیٹا ہوا ہوں"
ان کے دکھی دل سے چتا کے وقت گائے جانے والے دردناک نغمے کی سی آواز نکلتی "تم یہ سمجھ لو کہ یہ ایک مردہ لاش ہے جو تم سے یہ سب کہہ رہی ہے"/144
اس طرح دسمبر کا مہینہ گذر گیا۔ ایک مہینہ بعد ایک شریر دیوانے کی گولی نے اس دردمندی اور محبت کے پیامبر کی زندگی کا خاتمہ کردیا۔ وہ اپنے دل میں اپنے قاتل کے لئے معافی کا احساس اور اپنے ہونٹوں پر رام کا نام لئے اس دار فانی سے چلا گیا۔

140- Ibid, P. 322
141- Ibid, P. 324
142- Ibid. P. 461
143 Ibid, P. 686.
144- Ibid. P. 685.

گاندھی جی کی زندگی کے آخری ایام میں پیدا ہونے والے شبہات اور ان کی تکلیف دہ موت سے تاریخ کی معقولیت اور انسان کی تقدیر کے متعلق خوفناک سوالات کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ ایسے سوالات کرنا آسان ہیں لیکن ان کا جواب تقریباً ناممکن سا لگتا ہے۔ مثلاً انسانیت کے کچھ سب سے بڑے محسن تشدد اور نفرت کا شکار کیوں ہو جاتے ہیں؟ سقراط، عیسیٰ اور گاندھی سچائی، اچھائی، قربانی اور خدمت گذاری کے پجاری تھے۔ پھر بھی انھیں اپنی اخلاقی سرفرازی کی قیمت اپنی اپنی زندگیاں دے کر چکانی پڑی۔ کیا ایک معمولی آدمی ایک غیر معمولی خصوصیت سے اس قدر تعصب رکھتا ہے کہ اس خصوصیت کو مٹانے کی کوشش میں وہ اس کے حامل کو بھی زیست و نابود کر دے۔ کیا تاریخ فوری اور عارضی ملتی صفت کی معقول پائدار اور مستقل کے مقابلے میں واقعی حمایت کرتی ہے اگر ایسا ہے تو پھر انسان کی سعی و کوشش کہاں جاکر ختم ہوگی اور بنی نوع انسان کو کس منزل کی طرف کھدیڑا جا رہا ہے۔

یہ مانا گیا ہے کہ سچائی اور خوبیوں میں کمال صرف پیغمبروں میں ہوتا ہے۔ معمولی آدمی مد بر سیاست داں اور ناظم وغیرہ اس میدان میں عمل پیرا نہیں ہو سکتے۔ اس لئے ان لوگوں کو اصولوں سے سمجھوتا کر لینا چاہیئے اور اپنے اعمال و افعال کو عام آدمیوں کے اعمال و افعال سے ہم آہنگ کر لینا چاہیئے کیونکہ وہ مستقبل کو دور تک نہیں دیکھ سکتے۔ ان کی نگاہیں ضرور محدود ہوتی ہیں اور ان کے مقاصد دور رس نہیں ہوتے۔ زندگی ان کے نزدیک ایک مخلوط معاملہ ہے وہ عام طور پر بھلائی کو ترجیح تو دیتے ہیں لیکن ان کی نگاہ زیادہ تر اس پر مرکوز رہتی ہے کہ کون برائی کم برائی ہے اس کے برعکس گاندھی جی نے ہمیشہ سچے مقاصد کا انتخاب کیا اور اس کے حصول کے لئے ذریعہ عدم تشدد کو قرار دیا انھوں نے انسانی کمزوریوں کو نظر انداز کر دیا وہ یہ نہیں محسوس کر سکے کہ معیاری اصولوں کے لئے تمام زندگی وقف کر دینے والے چند لوگ ہی ہوتے ہیں اور اگرچہ وقتی طور پر ان بلند نظریات پر عمل کے لئے کافی لوگوں کو کسایا جا سکتا ہے لیکن ایسے لوگ زیادہ وقفے تک اس میدان میں نہیں ٹھہر پاتے۔ ان حقائق کو نظر انداز کر دینا ہی ان کی مایوسیوں کا سبب تھا۔

بہت سے لوگ انھیں ناممکن عینیت پسند خیال کرتے ہیں جس کی کامیابیاں اس کی بہت سی ناکامیوں کے ہم وزن ہیں۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ جنوبی افریقہ کی کامیابی محض عارضی تھی سفید لوگوں کی ذہنیت نہیں بدلی تھی اور نہ ان کا نسلی امتیاز ہی کم ہوا تھا جبکہ ایسا ہونا چاہیئے تھا اگر ستیہ گرہ کو کامیاب تسلیم کرنا جائے۔ رولٹ ایکٹ کی منسوخی کے لئے کیئے گئے ۱۹۱۹ کے ستیہ گرہ کو بہت بڑی ہمالیہ پہاڑ

جیسی اندازہ کی غلطی کہا گیا ہے۔ 1920ء کی ستیہ گرہ چوری چورا کے المیہ پر جاکر ختم ہو گئی اور یہ اور پنجاب میں جو مظالم ہوئے تھے ان کا مداوا کرنے اور خلافت کے حامیوں کے مطالبے کو پورا کرانے میں ناکام ہو گئی نمک کی ستیہ گرہ کی تحریک تو مکمل آزادی کے حصول کے لئے چلائی گئی تھی لیکن اس کے بجائے اس کا اختتام گاندھی ارون معاہدے کی شکل میں ظاہر ہو گیا۔ اس معاہدے نے گاندھی جی کو فریب دے کر گول میز کانفرنس سے ایک بے معنی سمجھوتہ کرنے پر راضی کر دیا تھا۔

سول نافرمانی کی جو تحریک، جو 1930ء سے 1934ء تک صرف 1930ء کے ایک عارضی وقفہ کے ساتھ چلی اور انفرادی ستیہ گرہ کی تحریک جو 1940ء–41ء میں چلائی گئی اور 1942ء کی "انگریزو بھارت چھوڑو" کا ریزولیوشن جو تحریک کی شکل اختیار نہ کر سکا ان سب کا بہ ظاہر نام ہی اثر رہا۔

لیکن ان تمام حقائق سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ یہ تمام ستیہ گرہ کی کارروائیاں بالکل لاحاصل کوششیں تھیں۔ ہندوستان کی جنگ آزادی کے دو پہلو تھے۔ سطحی نقطۂ نظر سے تو یہ بیرونی حکومت کو ختم کرنے کی جدوجہد تھی لیکن حقیقت میں یہ ایک اخلاقی جنگ تھی۔ جیسا کہ گاندھی جی نے بارہا کہا کہ سوراج کا مطلب ان زنجیروں کو توڑنا تھا جنہوں نے لوگوں کے ذہنوں کو مفلوج کر دیا تھا اور یہ زنجیریں تھیں خوف، خود غرضی بے چینی، بزدلی اور دیگر طرح طرح کی زنجیریں۔ گاندھی جی کی تعلیمات بلکہ اس سے زیادہ ان کی ذات نے ہندوستان کو انقلاب پر آمادہ کیا۔ بزدلی اور خوف کی جگہ بہادری اور ہمت نے لے لی۔ اور خود غرضی کی جگہ مقصد کے حصول کے لئے قربانیوں اور مصائب برداشت کرنے کی طاقت کے جذبے نے لے لی۔ اپنے اوپر بھروسہ کرنے اور خودداری کا ایک نیا احساس بیدار ہوا اور ہندوستان نے اپنے اندر اپنی تقدیر کو چمکتے ہوئے نور کو دیکھنا شروع کیا۔ اور ہر تحریک کے بعد ملک کے طول و عرض میں خوف و رجا کی ایک لہر دوڑ جاتی تھی اور تمام ہندوستانیوں کے دلوں کو ایک ساتھ دھڑکنے پر مجبور کر دیتی تھی۔ ان کے الفاظ اور کارناموں نے ملک کے ماحول کو اس قدر تقدیس عطا کر دی تھی کہ اس نے لوگوں کے معیار کو بلند اور پاکیزہ بنا دیا۔ تھا گاندھی جی نے خود کو ملک کے کروڑوں لوگوں سے ہم آہنگ کر لیا تھا ان کے سکھ دکھ میں شریک ہو گئے تھے اور اپنی زندگی کو ان کے سانچہ میں ڈھال لیا تھا۔ ہندوستان میں یہ شعور بیدار ہوا کہ وہ عوام جو ہندوستان کے لاکھوں گاؤں میں بستے ہیں دراصل وہی ہندوستانی ہیں۔ شہزادے، امراء اور تعلیم یافتہ لوگ اپنے اثرات، اپنی دولت، اور اپنے علوم کو کھیتوں، دوکانوں اور کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی جانب سے بطور امانت اپنے پاس رکھتے تھے ان کی فلاح و بہبود سب سے اعلیٰ و ارفع مقصد ہے۔ اور ان کی آزادی حقیقی سوراجیہ ہے۔

عوام غریب، جاہل اور مصیبت زدہ تھے لیکن اگر ان کے طبقاتی پردوں کو چاک کیا جائے تو ان کے درمیان ایک ایسا طبقہ بھی ملے گا جو سماج پر ایک شرمناک داغ تھا۔ یہ تھے پسماندہ لوگ یعنی وہ اچھوت جو سماجی حقوق سے محروم اور جن کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ملک کی سب سے بڑی خدمت جو گاندھی جی نے انجام دی وہ یہ تھی کہ انھوں نے ملک کے ضمیر کو اس کے لئے بیدار کیا کہ وہ اس سیہ کار نظام کو توڑ کر اس گناہ کو ختم کرے جو قدیم وقتوں سے چلا آرہا تھا۔

تاریخ میں ان کی مثال ڈھونڈھنا بیکار ہے اور کسی کا کسی سے مقابلہ کرنے کی مہم میں مشغول ہونا قطعی سودمند نہیں ہے۔ عظمت کا کوئی وزن یا پیمانہ تو مقرر نہیں ہے۔ کیونکہ عظیم انسان اپنا معیار خود مقرر کرتا ہے۔ کسی بھی عظیم شخصیت کو اس کی وقتی کامیابیوں کی بنیاد پر نہیں پرکھا جاسکتا۔ ان کا نور کافی بعد سے جھلکتا ہے اور انسانوں کی راہ کو وقت کے طولانی میدانوں میں روشن کرتا رہتا ہے۔

گاندھی جی اپنے منصب کے لحاظ سے ان درخشاں ہستیوں کی صف میں شامل ہیں جنھوں نے بنی نوع انسان کو آہستہ آہستہ بلکہ غالباً لغزش پا کے ساتھ اور تھکی ہوئی سانسوں سے کوہ طور کی بلندیوں پر پہونچایا ہے۔ جہاں بنی نوع انسان کی وحدت، عالمگیر امن، اور عالمگیر مسرت و شادمانی کے زرق برق مناظر نگاہ کے سامنے آتے ہیں۔

پانچواں باب

مسلم افکار و سیاست

صدی کے شروع ہونے کے وقت دنیائے اسلام اپنی سیاسی اور ثقافتی زندگی میں ایک نازک صورت حال کے قریب پہنچ رہی تھی۔ انیسویں صدی میں جن افکار اور جس قسم کی سیاست کی نشو و نما ہوئی تھی۔ وہ افراد اور قوم کے جدید معاصر کی مذمت کی جانب لے جا رہے تھے۔ انیسویں صدی نے یہ دیکھا تھا کہ ایک کے بعد دوسری مسلم ریاست تباہ و برباد ہو کر مغرب کے قبضہ اقتدار میں چلی گئی۔ بحر اٹلانٹک Atlantic سے بحر الکاہل (Pacific) تک یہی عمل جاری تھا۔

انیسویں صدی میں افریقہ میں بحر احمر سے بحر اوقیانوس تک جو مسلم پٹی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ سب یورپین طاقتوں نے اپنے اندر بانٹ لیا تھا۔ جب 1905ء میں جرمنی نے قیصر جرمنی (Wilhelm II) ولیم کو ٹینجر (Tangier) اس غرض سے بھیجا کہ افریقہ مال غنیمت میں وہ بھی اپنے حصہ کا مطالبہ کرے اس وقت تک کل افریقہ جو صحرائے صحارا Sahara کے شمال میں تھا۔ بہ استثناء مصر فرانس کے حلقہ اثر و اقتدار میں آ چکا تھا۔ مصر پر برطانیہ نے 82ء میں قبضہ کر لیا تھا اور مصر اور سوڈان برطانوی حکم برداری کی زد میں آ چکے تھے

دولت عثمانیہ۔ یورپ کا مرد بیمار خاتمہ کے قریب پہنچ رہی تھی عیسائی ریاستیں آزاد ہو چکی تھیں اور 12-1911ء کی جنگ بلقان نے ترکان آل عثمان کا یورپ سے اخراج واقعتہً ہی ختم کر دیا تھا اور پہلی جنگ عظیم کے بعد ان کا ایشیائی وطن بھی پرزے پرزے ہو جانے کے خطرے میں مبتلا تھا لیکن اس بعید شگوفہ تقدیر سے مصطفےٰ کمال کی بہادرانہ کوششوں نے اسے بچا لیا۔

مغربی ایشیا میں ہلالی جھنڈے تلے زرخیز علاقے جو عرصے سے عثمان کی ظالمانہ اور نالائق حکومت کے نیچے کراہ رہے تھے اور جس کا جنگ کے بعد خاتمہ ہو گیا وہ مغربی سامراج کا شکار ہو گئے۔ ایران شاہان قاچار کی مجہول حکومت کے زیر سایہ انقلاب کے لئے تیار تھا جو 1907ء میں شروع ہوا۔

اس درمیان میں برطانیہ نے بحر فارس اور اس کے ساحل پر اپنا اقتدار قائم کر لیا تھا۔ اور روس شمال پر قابض و متصرف تھا۔ ایران کے شعر اپنے خوبصورت ملک کی اس زبردستی آبرو ریزی پر فریاد کناں تھے وسط ایشیا کے مسلم خان لوگوں کو زار روس کا ایٹم رولر پیس رہا تھا۔ افغانستان کے پنج ڈیہہ حادثہ کے بعد مجبور ہو کر برطانیہ کے حلقہ اثر میں آ گیا تھا۔

جنوبی اور مشرقی ایشیا کی مسلم حکومتیں بھی یورپین طاقتوں کے پنجے میں تھیں۔ برطانیہ فرانس اور ہالینڈ حاصل کلام یہ کہ بیسویں صدی کے آغاز پر آزادی کا سورج مطلع آسمان پر غروب ہو رہا تھا اور تمام ممالک پر جہاں مسلمان آباد تھے مستقل تاریکی ان پر چھائی ہوئی نظر آتی تھی۔

ہندوستان جس کے اندر مسلم اقلیت کی ایک بڑی تعداد آباد تھی اس کے جلد یا بدیر آزادی حاصل کرنے کی توقع کامیابی تقریباً بالکل نہیں تھی۔ مملکت برطانیہ اپنے اقتدار اور خوشحالی کے آخری ہر درجہ پر تھی اور وہ اس بات کا کوئی اشارہ نہیں کر رہی تھی کہ کروڑوں باشندگان ہند پر جو شکنجہ گاڑ رکھا تھا اس میں ذرا بھی ڈھیل دینے کو تیار ہے لیکن چاروں طرف گھری ہوئی تاریکی میں روشنی اور امید کی کرن بھی نظر آتی تھی اگرچہ ابھی بہت دھندلی اور کمزور تھی۔ انڈین نیشنل کانگریس باوجود اس کے کہ گورنمنٹ نے اس کو تکبر کے ساتھ نظرانداز کرنے اور حقارت کے ساتھ اس پر نظر ڈالنے کا رویہ اختیار کیا تھا اور باوجود اس کے کہ خود غرض آستاں بوسان حکومت اور گم کردہ مداحین حکومت برطانیہ مخالفت کر رہے تھے وہ استقلال کے ساتھ بلا شور و ہنگامہ ہندوستان میں آزاد ذمہ دار حکومت قائم کرنے کے مقصد کے حصول کے لئے اپنا کام کر رہی تھی۔

تحریک کے لیڈران کے سامنے پرابلم یہ تھا کہ کس طرح ایک انتہا پسندانہ بلکہ درحقیقت ایک انقلاب انگیز تبدیلی عوام کے رویے میں پیدا کریں۔ اس تبدیلی کا منشا یہ تھا کہ ایک بنیادی تغیر پیدا کیا جائے اور لوگ ذات پات اور فرقہ سے اوپر اٹھ کر قوم کا تخیل اپنے اندر پیدا کریں۔ اقتصادی ثقافتی اور سیاسی طاقتیں حکمران قوم کی خواہشات کے برخلاف زمین تیار کر رہی تھیں لیکن ضرورت تو اس بات کی تھی کہ کھلم کھلا سمجھ بوجھ کر عزم محکم کے ساتھ نئے سماجی مقاصد کے لئے قدم اٹھایا جائے تاکہ از منہ وسطے کے فرسودہ حالات لوگوں کے دماغوں سے نکل جائیں۔

لوگوں میں قومیت کا احساس پیدا کرنے کے لئے تاکہ وفاداری کا مطلع زیادہ وسیع اور نیشنلزم اجتماعی اعمال کے لئے اولین محرک ہو بہت سے واقعات کا یک جا ہونا ضروری ہے دستہ اور نادانستہ دونوں طرح۔ اپنے آبائی وطن سے محبت جسے حب الوطنی کہا جاتا ہے تو کوئی عالمگیر جذبہ ہے

اور نہ کوئی قدرتی جذبہ ہے۔ اور نہ فطرتاً انسان کے اندر ودیعت کیا گیا ہے اگرچہ اس کی بنیاد وجدان پر ہے جو انسان کی فطرت میں مضمر ہے اور اس کی ایک مثال عشق بازی نیشنلزم کا بیج بعض سماجی حالت میں جمتا ہے اور جب آب و ہوا موافق ہوتی ہے۔ تو یہ پھل پھول کر ایک ایسا جذبہ ہو جاتا ہے جو بقیہ سب جذبات پر غالب آجاتا ہے اور مختلف تاریخی وجوہ اس کی شکل و صورت کو بناتے ہیں۔

ازمنہ وسطیٰ کے یورپ کی طرح برطانوی حکومت کے قبل کا ہندوستان اس جذبہ سے خالی تھا وسطیٰ اور قدیم زمانہ میں جماعتی تنظیم کے اصول کی بنیاد نسل، خونی رشتے، فرقہ اور کلچر تھے۔ قدیم ہندوستان میں جن پد (اجتماعی ہیئت) قبیلوں کے گروہ تھے۔ وسطیٰ زمانہ میں ہندوؤں کے اندر راجپوت، جاٹ وغیرہ اور دوسرے گروہ بہ بنیاد نسل اور مسلمانوں میں مغل پٹھان ایرانی، تورانی اور عرب وغیرہ تھے ہندوؤں اور مسلمانوں کے یہ گروہ اس بات کی طرف راغب تو ہوئے تھے کہ مل کر ایک ہو جائیں لیکن مذہبی برادری میں ضم ہو کر ایک ہو جانے کا صرف ایک مبہم سا تخیل ان کے پاس تھا ہندوؤں میں جو گروہ تھے خواہ وہ لسانی ہوں یا علاقائی ان کا اگرچہ کلچر مشترک اور ایک تھا۔ اور مذہب بھی ایک تھا۔ لیکن عمل وہ ایسا کرتے تھے کہ گویا جلعدہ جلعدہ سیاسی جماعتیں ہیں اور یہی بات مسلمانوں کے لئے بھی صحیح تھی ہندو اور مسلم دونوں کے فضلاء و علماء صرف تخیل میں اپنے اپنے فرقوں کو ایک وحدت خیال کرتے تھے لیکن عمل میں وفاداریاں خون کے رشتوں خواہ وہ واقعی ہوں یا روایتی، یا محض خیالی پر مبنی تھیں نہ کہ ہمسائگی یا علاقائی رشتوں پر۔ برطانیہ کی حکومت کے بعد اقتصادی سیاسی اور ثقافتی دباؤ کے نیچے اس قسم کی سوسائٹی ٹوٹنے لگی۔ لیکن جیسا کہ اول جلد میں کہا گیا ہے کہ ہندوستان کی اقتصادیات میں اگرچہ تبدیلی آئی لیکن وہ تبدیلی اتنی وسیع یا مضبوط نہ تھی کہ وہ سماجی نظام کی تہوں میں ایک سماجی انقلاب برپا کر سکتی۔

دیہات میں بسنے والوں میں جو کل باشندگان ہند کے 80% فیصدی کا آزوقہ مہیا کرتے تھے تبدیلی محض سطحی طور پر ہوئی اور جو تبدیلی ہوئی بھی وہ ایسی نہ تھی کہ ایک جامد زندگی کو برقی قوت متحرکہ میں بدل دے۔ صرف شہر جن میں کل 12% فیصدی ہندوستانی رہتے ہیں نئے اثر کے اندر آئے۔ شہروں کا بھی حال یہ تھا کہ یہاں کے لوگ بجائے صنعتی کاروبار کرنے کے دوسرے پیشوں میں لگے ہوئے تھے۔

اس طرح قومیت کا شعور پہلے شہروں میں پیدا ہوا اور وہاں سے دھیرے دھیرے کل ملک میں پھیلا لیکن اسے روکاوٹوں اور مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا خاص کر ان لوگوں کی طرف سے جو روایات کے پابند تھے کیونکہ جو عادات و اطوار قرنوں سے لوگوں کے دماغ میں جڑ پکڑ چکے ہوتے ہیں اور جن سے لوگوں کو والہانہ تعلق پیدا ہو جاتا ہے وہ تو مخالفت کی صف میں کھڑی ہی کرتے ہیں۔

اور یہ جب کہ سماجی اور اقتصادی تبدیلی کی رفتار سست ہو اور قدامت پرستی کی خفیہ یا علانیہ حمایت حکومت کے اثر اور دباؤ سے کی جائے۔ اور خاص کر جب کہ وہ حکومت ایک بیرونی حکومت ہو تو لازمی طور پر رفتار مدھم اور ناہموار ہوگی۔ بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ شاہراہ ہی سے الگ ہو جائے۔

بیسویں صدی کے آغاز کے وقت ہندوستان کے سماج نے ایک متوسط طبقہ کو ارتقا کی منزلیں طے کرا کے قائم کر دیا تھا جو اگرچہ چھوٹا تھا لیکن ذی اثر تھا سیاسی شعور سے بے بہرہ عوام کے برخلاف جو ازمنہ وسطیٰ کی روایات میں غرق تھے۔ اس متوسط طبقہ میں اپنے سیاسی حقوق اور ذمہ داریوں کا احساس پیدا ہو گیا تھا ہندوستان کا اہل علم طبقہ دوسرے ملکوں کے اہل علم طبقوں کی مانند یہ چاہتا تھا کہ ہندوستان کو وہی سیاسی درجہ حاصل ہو جو دوسرے آزاد ملکوں کو حاصل ہے۔ اگرچہ شروع شروع میں ان کے سامنے جو مقصد تھا وہ باہم اور آخری منزل کے نشانات دھندلے تھے۔ لیڈران جائز طور پر مواقع کی تلاش میں تھے تاکہ سیاسی اور انتظامی امور کے متعین اور کنٹرول کرنے کے لیے وہ اپنی فطری صلاحیتوں کو بروئے کار لا سکیں۔

دوسرے ملکوں کی طرح ہندوستان میں بھی ایسے سربرآوردہ اشخاص موجود تھے جن کی قوت تمیز یہ کا رجحان یہ تھا کہ اپنے دلی خیالات کو ظاہر کرنے کے لیے مواقع حاصل کریں۔ قیادت کا یہ قدرتی جذبہ رکاوٹ سے دوچار ہوا اور اس لیے لازمی تھا کہ تعمیری صلاحیتیں مخالف طاقتوں کی تخریب پر لگ جائیں۔ برطانوی حکمران ہرگز اس پر تیار نہ تھے کہ ہندوستان کے اہل علم طبقہ کے ادعا اور مقاصد کی واجبیت اور حقانیت کو تسلیم کریں اور برابر وہ جہاں تک اور جب تک ان سے ممکن ہوا وہ ان سب کو ملیا میٹ کرنے کی کارروائیاں کرتے رہے۔ حتیٰ کہ حالات نے ان کو سپر ڈالنے پر مجبور کیا۔

1885 سے انڈین نیشنل کانگرس منظم مخالفت پیش کر رہی تھی یہ زیادہ پر اثر اس وجہ سے نہیں ہوئی کہ اس کو نہ صرف ایک بیرونی حکومت کی طاقت، امرا اور روسا اور مالکان اراضی طبقات کے اثرات سے ٹکر لینا تھا۔ بلکہ خود ہندوستان کے متوسط طبقہ میں کچھ ایسے گروہ بھی تھے جو ہچکچاہٹ اور شک میں گرفتار تھے جن میں مسلمان فرقہ کی ایک کثیر تعداد شامل تھی۔

اس کی وجہ بتلانا مشکل نہیں ہے کہ راجاؤں کا طبقہ، تعلقداروں، امرا کیوں مخالف تھے۔ مقدم الذکر ڈو کہ تمام حقوق اور ان کا منصب برطانوی حکمرانوں کا عطیہ تھا اور دولت مند تو ہمیشہ یہی چاہتے ہیں کہ حالات جیسے ہیں ویسے ہی رہیں اور کسی قسم کا انقلاب نہ ہو لیکن پھر بھی اسی طبقہ کے چند لوگ ایسے تھے جنہوں نے اپنے فرقہ کو دھوکا دیا اور باغیوں کے گروہ میں شامل ہو گئے۔

انیسویں صدی میں ہندوستان کے متوسط طبقہ نے بیرونی حکومت کو بذات خاص رد نہیں کیا۔

بلکہ اس کی تمام خرابیوں کے باوجود اس کو احکم الحاکمین کی جانب سے مامور سمجھتے تھے اور یہ خیال کرتے تھے کہ اس کی فیاضانہ اور ظالمانہ دونوں طرح کے برتاؤ باشندگان ہند کی ترقی اور اصلاح کے لیے ہیں۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے وہ بھی ہندوؤں کی طرح تین گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ اوپر کا طبقہ متوسط طبقہ اور غیر تعلیم یافتہ محنت کش عظیم تعداد میں نیچے کا طبقہ۔ ہندوستان کے مذہبی فرقوں میں یہ سب سے بڑی اقلیت تھی ہندوستان کی آبادی مذہب کے نقطہ نظر سے ۱۹۰۱ میں حسب ذیل تھی۔

ہندو	65.5	فیصدی
مسلم	24.3	〃
دیگر	10.2	〃

1941 میں یعنی حصول آزادی کے بالکل قریب اس تناسب میں بہت ہی خفیف تبدیلی ہوئی تھی

ہندوستان کے باشندے یکساں طور پر ایک ہی قسم کے اثر سے متاثر تھے اور ہر حلقہ اور ہر طبقہ میں یکساں ترقیاں ہو رہی تھیں۔ مگر ہندوستان ایک بڑا ملک ہے۔ اور باوجود اس کے کہ سڑکیں نہیں ریلوے تعمیر کی گئی اور ترسیل اور رسائل کے سائل میں ترقی ہوئی اور باوجود اس کے کہ انتظامیہ یکساں تھا اور اس کے علاقوں کا ایک دوسرے پر اقتصادی امور میں بھروسہ بھی یکساں تھا پھر بھی ہندوستان۔ نسل زبان اور مذہب کی بنا پر بٹا ہوا تھا۔ عقائد اور طریقہ عبادت۔ رسم و رواج اور پرسنل لا۔ اس اختلاف کے باوجود دو اہم امور تھے۔

اول تو ایک اٹوٹ تاریخی اور روایتی سلسلہ تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ مذہبی رجحانات زندگی کے مقاصد آرٹ لٹریچر موسیقی اور طریقہ رہائش زندگی ان سب کا جھکاؤ یکسانیت کی جانب تھا اصولی طور پر ہندو اور مسلمان دونوں اعتقاد رکھتے تھے کہ انفرادی اور اجتماعی دونوں زندگیوں میں مذہب بالا ہے۔ دونوں کا ذہن متصوفانہ تھا دونوں کے لیے مادی اور دوسرے دنیوی اغراض و مقاصد کی کشش تھی۔ دونوں روزمرہ کی زندگی میں ایک ہی طرح کی رہائش اور طریقہ عمل اختیار کرتے تھے۔ زبان۔ لباس، کھانے پینے گھریلو انتظامات۔ شادی موت اور دوسرے مراسم اور کاروبار وغیرہ میں بہت باتیں مشترک تھیں۔ دونوں گاؤں اور شہروں میں ایک ساتھ رہتے اور ایک دوسرے سے ملتے چلتے تھے دونوں ایک ماڈرن اسکولوں میں حاضری دیتے اور ایک ہی کریکولم پڑھتے تھے۔

ہندو اور مسلم عوام جو دونوں فرقوں کی زبردست اکثریت کے حامل تھے ایک دوسرے سے بالکل منفرق نہ تھے

دونوں اپنے رسم رواج کے قوانین پر عمل کرتے تھے جو مذہب کے مقدس قوانین سے مختلف تھے۔ دونوں گاؤں میں ایک ہی طرح کی زندگی گذارتے تھے اور گاؤں کے طبقے کے ضروری اور ایک دوسرے پر انحصار کرنے والے اجزا تھے دونوں اپنی محنت سے گاؤں کی آبادی کو زندہ رکھنے اور ان کے فلاح و بہبود کا سامان فراہم کرتے ہیں برابر کے حصہ دار تھے۔

دونوں کے اندر اختلاف شہروں اور اعلیٰ طبقوں میں زیادہ نمایاں تھا۔ وہ لوگ جو روایتی تعلیم کے عالم تھے ان میں مسلمانوں کی مذہبی زبان عربی اور فارسی تھی۔ اور ہندوؤں کی سنسکرت۔ دونوں خواہ وہ تعلیم یافتہ ہوں یا غیر تعلیم یافتہ روزمرہ کی زندگی میں ہندوستانی زبان استعمال کرتے تھے بہت سے مسلمانوں نے سنسکرت کی تعلیم حاصل کی اور ماڈرن ہندوستانی زبان مثل ہندی، پنجابی، بنگالی وغیرہ میں اشعار بھی لکھے۔ اسی طرح ہندوؤں میں ایک بڑی تعداد نے فارسی زبان میں کمال حاصل کیا اور اردو زبان کو علم کے اظہار کے لئے استعمال کیا۔

دوسری متعلق بات خیالات جدیدہ اور جو کچھ اس کا قدر و قیمت تھی ان سب کی تبلیغ تھی نیشلزم کا افکار عقلیہ، سائنس، صنعت، تجارت اور انتظامیہ کے فنی نکتے۔ لیکن ان امور کے علاوہ جنہوں نے قومیت کے احساس کو نشو و نما دیا ایسے بھی دیگر امور تھے جو ان کے خلاف اثر انداز ہو رہے تھے۔

ہندوؤں اور مسلمانوں میں جو یکسانیت کا مواد ہے اور اسی طرح جو اختلافات ہیں وہ سب سینکڑوں سال سے موجود تھے لیکن برطانوی حکومت سے قبل ان کو کوئی سیاسی اہمیت حاصل نہ تھی یہ ایک عام بات ہندو حضرات کی ملازمت میں جو مسلم افسران اور ان کی ماتحتی میں جو سپاہی تھے وہ ہندوؤں کی متابعت میں دشمن مسلمانوں سے لڑے اسی طرح ہندوؤں نے بھی اسی طریقہ کا عمل جاری کیا۔ 1711 سے 1858 تک منظم جنگوں اور لڑائیوں کی بے شمار ایسی مثالیں ہیں جن میں جنگ جو قومیں مشترک تھیں۔ سیاست چند محدود خاندانوں یا ایک فرقہ کے ایک بہت چھوٹے گروہ سے تعلق رکھتی تھی۔

دونوں فرقوں کی بے شمار تعداد کا ذہن لازمی طور پر غیر سیاسی تھا کیونکہ ان کا حکومتوں کے بنانے یا ان کی پالیسیوں کے ڈھالنے اور اثر انداز ہونے میں کوئی حصہ نہ تھا۔ برطانوی حکومت کا ایک نمایاں اثر یہ ہوا کہ متوسط تعلیم یافتہ طبقہ میں معاملات حکومت میں دلچسپی لینے کا ذریعہ پیدا ہوا یعنی ان کا ذہن سیاسی بنا جس قدر وقت گذرتا گیا یہ سیاسی ذریعہ نشو و نما پاتا گیا اور وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔

وہ لازمی پہلو جو سیاسی اعمال کو تمام دیگر اعمال سے الگ کرتی یعنی اقتصادی، سماجی اور مذہبی وہ ہے طاقت کا پہلو۔ سیاست لازمی طور پر طاقت کے عمل دخل کا نام ہے یہ حکم اور اطاعت کا ایک رشتہ ہے

جس کی بنیاد یہ ہے کہ قوت استعمال کرنے کی طاقت موجود ہو۔ جب کوئی ایک گروہ اپنی اس خودی کا احساس اپنے اندر پیدا کر لیتا ہے تو وہ اس رشتہ کو استعمال کرنا چاہتا ہے۔ اور بیرونی لوگوں کے اس کے استعمال کرنے پر غضبناک ہونا ہے۔ اس احساس کا نشوونما اندرونی توانائی سے شروع ہوتا ہے اور حقیقت پر منتج ہوتا ہے۔ لیکن بہرحال اس میں رکاوٹ پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ برباد ہو سکتا ہے جس انحصار اس گروہ کے اندرونی اور دوسرے ماحول پر ہوتا ہے۔

ہر ملک میں قومیت کی تعمیر اس طرح ہوتی ہے کہ اختلافات کے پاس یکسانیت کے امور کا پتہ لگایا جاتا ہے۔ وہ ممالک جو آزادی کی نعمت سے بہرہ ور ہوتے ہیں وہاں اور دوسرے عام امور کی طرح اس اتحاد کو پیدا کرنے اور پالنے کے کام کے لئے حکومت ایک طاقت ور آلہ ہوتی ہے۔ کیونکہ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ قوموں نے حکومتوں کو جنم دیا ہے لیکن اسی طرح یہ بھی صحیح ہے کہ حکومتوں نے قوموں کو جنم دیا ہے۔ مثال کے طور پر ممالک متحدہ انگلستان یا ممالک متحدہ امریکہ یا کناڈا یا جنوبی افریقہ آسٹریلیا جرمنی اور ممالک متحدہ سوویت روس حکومتوں کی پیداوار ہیں۔

ایشیا اور افریقہ کی حکومتیں آج کل اپنے ابنائے وطن کی یکجہتی کو نشوونما کرنے میں مشغول ہیں تاکہ وہ ترقی کر کے ایک نیشن (Nation) قوم بن جائیں لیکن اگر بدقسمتی سے کسی ملک پر بیرونی حکومت کا اقتدار جم ہوا ہے۔ تو وہ نہ صرف یہ کہ یکجا کرنے کے اقتدار ذریعہ سے محروم بنتا ہے بلکہ تفرق و انتشار پیدا کرنے کی جو ترکیبیں بیرونی طاقت اپنے وجود کی مدافعت میں کرتی ہے اس سے نپٹنا بھی ہوتا ہے لیکن بظاہر تو اجتماع ضدین معلوم ہوگا مگر ہوتا یہی ہے کہ اپنی مرضی کے بالکل خلاف ایسی طاقتوں کو رواں دواں کر دینے پر مجبور ہوتی ہے جو باشندگان ملک میں وحدت پیدا کر دیتی ہیں۔

یہ ہندوستان کی بدقسمتی تھی۔ کہ نہ صرف اپنے اندرونی اختلافات کو ہموار کرنے کا کام کرنا تھا نسلی، ثقافتی اور اعتقادی جس کا ہر نیشن کو اپنی تعمیر کے اوقات میں سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بلکہ اسے ہندوستان کے فرقوں کے باہمی اختلافات اور تنازعات سے بھی لڑنا پڑا جو دانستہ اور نادانستہ دونوں طرح اکسائے گئے تھے اس لیے نیشنلزم کا ارتقاء دو قوموں کے درمیان کشمکش سے تعبیر تھا۔ مرکزی اور لامرکزی۔ اندرونی طور پر یہ کشمکش دراصل ماڈرن جدید طرز رہائش اور طرز فکر اور پرانے عادات و خیالات کے مابین تھی یعنی سماج کا یہ تخیل کہ وہ لباسی مفادات کے دھاگے میں بندھی ہوئی ہے باوجود اس کے کہ اس کے اندر مختلف نسل مختلف کلچر رکھنے والے ہیں اور مذہبی گروہ بھی ہیں۔ اور اس کے مقابلہ میں یہ تخیل کہ سماج، قبیلوں، فرقوں اور چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے ایک ڈھیلے مجموعے کا نام ہے جو ایک عرصہ تک ایک بااقتدار قوت کی وجہ سے بجا رہے

پھر اس کے بعد پھوٹ کر متعدد خود مختار گروہوں میں تقسیم ہوگیے۔

انیسویں صدی میں جو اقدامات قومی شعور پیدا کرنے کے لیے کیے گیے ان کا ذکر ایک دوسرے باب میں کیا گیا ہے۔ اس موقع پر یہ ضروری ہے کہ بیسویں صدی میں اس کارروائی کے اندر مدوجزر پر بحث کی جائے

ہندوستان کے اندر باشندگان کے ذہنی تخیلات اور سیاست کا وسیع جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ سوسائٹی کے اندر مختلف انوع تنازعات تھے بیسویں صدی میں منزل تو سلف گورنمنٹ تھی اگرچہ اس کی بنیاد تعمیر اور عمل دخل کے بارے میں اختلافات تھے کشمکش کے ابتدائی زمانوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں نے ڈومینین اسٹیٹس زیر سایہ برطانیہ کو منزل مان لیا تھا اور دونوں نے آخری زمانہ میں آزادی کامل کے مطالعہ کیا۔ اختلافات تحفظ حقوق کے دستوری انتظامات پر ہوا۔

تحریک آزادی کے آخری ایام میں جو اہمیت ہندو مسلم افتراق کو دی گئی اس سلسلہ میں اس بات پر نظر کرنا دلچسپ ہوگا کہ ہندو مسلم افکار اور ان دونوں کے عملی کوششوں میں کس درجہ یکسانیت تھی۔

انیسویں صدی میں ایک نمایاں مماثلت رام موہن رائے جو پہلے نصف صدی میں گزرے ــــــ اور سرسید احمد خاں میں نظر آیگی جو اسی صدی کے دوسرے نصف میں گزرے۔ دونوں نے مذہب اخلاقیات اور سماجی امور میں عقل کی رہنمائی کو بالاتر تسلیم کیا دونوں نے اس بات کی کوشش کی کہ ان کا مذہب عقل کے ترازو پر پورا اترتا ہے اور نیچر کے قوانین پر مبنی ہے فرق صرف اتنا تھا کہ ایک میں سچائی اونشدمیں اور دوسرے میں قرآن کے ذریعہ ظاہر ہوئی۔ دونوں خدا انسان اور نیچر کے بارے میں اور ان کے باہمی رشتوں کے بارے میں یکساں خیالات رکھتے تھے۔ دونوں خدا کی وحدانیت، نیچر کی حقیقت اور فطرت انسانی کے عقائد رکھتے تھے۔ دونوں زندگی میں ترک دنیا کے تخیل کے خلاف تھے اور اس کے بھی خلاف تھے کہ دنیا ناپید اور محض وہم وخیال ہے۔ دونوں سماجی برائیوں اور خلاف فہم مراسم کو مٹانے کے خواہشمند تھے جنھوں نے سماج کی طاقت کو توس لیا تھا اور اس کے اخلاق کی پاکیزگی کو گندہ کردیا تھا۔ دونوں کے نزدیک موجودہ سوسائٹی کی تمام برائیوں کا واحد حل یہ تھا کہ مغربی تعلیم، ماڈرن سائنس کے مختلف شعبوں کو حاصل کیا جائے دونوں کے نزدیک مغربی طرز کی ذمہ دار حکومت ایک سب سے زیادہ معیاری قسم کی گورنمنٹ ہے جسے حاصل کرنے کے لیے ہندوستانیوں کو کوشش کرنی چاہیے۔ دونوں میں سے کسی کو بھی یہ یقین نہ تھا کہ ہندوستان سماجی اور ارتقا کی اس منزل کو پہنچ گیا ہے جہاں اس قسم کی ذمہ دار حکومت فی الفور قائم ہو سکے دونوں فرقہ دارانہ اتحاد اور ہندوستانی کلچر کے مشترک ہونے کے قائل تھے۔

انیسویں صدی کے دوسرے نصف حصہ میں ایک نئے مزاج کی نشوونما نظر آتی ہے ــــــ

انسانوں کے ذہن پر عقل کا غلبہ کمزور ہو گیا اور جذبات حاوی ہونے لگے۔ معتقدات عقل پر غالب آ گئے اور مذہب پر نکتہ چینی کی مذمت ہونے لگی۔ کہا جاتا تھا کہ مقدس کتب الہام انبیاء اور کلام خداوندی ہیں اور انسان کے غلط کار انکار کرتا۔ یہ نہیں رکھے جا سکتے۔ جذبات کو اکھاڑ پھینکنے کے لیے رد شو کی بغاوت کا باب دوہرایا گیا اور رومانیت کو قوت بخشی گئی ہندوستان افکار اور ادب میں اس کے خاص رنگ و روپ نمایاں ہوئے یعنی حواس خمسہ کی چمک دمک نیچر کے حسن کو رزمیہ شاعری کے انداز میں جوش و خروش سے بیان کرنا عورت پر فریفتگی۔ ماضی کے کارناموں پر فخر افراد کی قدر و قیمت پر زور دینا اور خود اپنی ذلت کی سرفرازی۔

ہندوستانی زبانوں کے شاعر اور مفکر جو مختلف فرقوں میں تھے وہ سب اپنے اپنے انداز میں ہندوستان کی اس اسپرٹ کے آئینہ دار تھے لیکن چونکہ لغوی معانی کے اعتبار سے سطحی اختلافات نظر آتے تھے اور چونکہ ہر ایک اپنی مقدس کتاب کی اتباع پر زور دیتا تھا اس لیے ایک دوسرے کے چہرے کو پہچاننے میں رکاوٹ پیدا ہوئی جب جذباتیت اپنے معمول کے راستہ میں رواں دواں ہوئی ہے اور عقل کو بالائے طاق رکھ دیا جاتا ہے تو لازمی طور پر اختلافات ناقابل مصالحت اور اس کی خلیج ناقابل عبور ہو جاتی ہے۔

مغرب نے جس مربیانہ سرپرستی کا ادعا کر رکھا تھا اور نہایت آسانی سے یہ امید باندھے تھا کہ مشرق کے لیے اور کوئی راستہ سوائے اس کے ہے ہی نہیں کہ مغرب کے ترقی پسندانہ نمونے کی آنکھ بند کر کے تقلید کرے۔ اس کے خلاف ہندوستان کے ذہن و فکر میں جو صحت مندانہ ردعمل ہوا اس سے اختلافات میں اور بھی اضافہ ہو گیا مغرب کا یہ مندرجہ بالا ادعا اور امید دونوں اتنے ذلت خیز تھے کہ گویا زخم پر نمک چھڑک دیا گیا ہو جیسا کہ اس پہلے کی جلدوں میں بیان کیا گیا ہے پہلا ردعمل تو یہ تھا کہ ہندوستان نے اپنی کمتری کو تسلیم کر لیا اور بیرونی لوگوں کی تقلید کرنے اور ان کی خوبیوں کو اپنانے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ جذبہ کل انیسویں صدی میں قائم رہا۔ اس کے بعد ردعمل ایک بالکل نئی شکل اختیار کر گیا ایک نئی صورت اور ایک نیا جذبہ خود داری نمودار ہوا جس کا انجام یہ ہوا کہ ایشیا کے ماضی پر اس لیے فخر کیا جانے لگا کہ تمام بڑے بڑے مذاہب اور بڑی بڑی تہذیبوں کا وجود یہیں ہوا ہے اور اسی کے ساتھ یہ کسی قدر مبالغہ آمیز خیال بھی کہ ہندوستان کو روحانیت کی وراثت ملنے کی وجہ سے برتری حاصل ہے اور اسی کے مساوی یہ مبالغہ آمیز خیال بھی کہ مغرب کی مادہ پرستی قابل مذمت ہے ان سب نے مل کر خود داری کا ایک جذبہ اور ایک افسردہ کن کوشش جدت پسندی کی پیدا کی۔

ہندو رہبران فکر و قائدین سماج نے ہندوستان کے عہد ماضی کی عظمت پر بڑا زور دینا شروع کیا

جب کہ اس نے فلسفیانہ ادبی، فنی اور ثقافتی میدانوں میں عجوبہ روزگار کامیابیاں حاصل کی تھیں مسلم
مفکرین اور شعراء اسی طرح اسلام کے عظیم خصائص کا بطور مذہب اور بطور ایک نئے مذہب کے
پیغمبر ہونے کے محمد کی خوبیوں اور اس حیثیت سے کہ وہ ایک جدید ملت کے معمار تھے جس کو ایک خدا کی
طرف سے عائد کیے ہوئے مشن کا فرض ادا کرنا تھا بڑی مدح و ثنا کرتے تھے یہ لوگ بڑے فخر کے ساتھ اس
بات کو یاد دلاتے تھے کہ مسلمانوں نے علم، سائنس اور لٹریچر کے شعبوں میں کیسے کیسے کارہائے نمایاں انجام
دیے ہیں یہ لوگ کہتے تھے کہ اسلام جس تیزی کے ساتھ پھیلا اور جس طرح اس کی فوجوں نے مشرق
و مغرب میں حیران کن کامرانیاں حاصل کیں وہ اس بات کا ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ اسلام ایک مذہب حق ہے
ان دونوں نئی قوتوں کا اپنے اپنے ماضی پر اتنا فخر و غرور ظاہر کرنا تھا کہ یہ دونوں دو قومیں ہیں اور
دو ایسی دنیاؤں میں رہتے ہیں جو ایک دوسرے سے علیحدہ اور بہت دور دور ہیں یہ ایک عظیم فرضی خیال
پیدا ہو گیا جسے عملی نمودار قوتوں نے پرورش کی اور پھیلایا۔

یہ بات کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تفریق کی خلیج جس طرح آزادی کے قریب آتی گئی وسیع
تر ہوتی گئی ایک نہایت بدنصیبی کا شگوفہ تھا۔ ہندوؤں کی آبادی کی عظیم اکثریت تھی کل آبادی کے دو تہائی سے
زیادہ تھے مسلمان بھی ناقابل لحاظ اقلیت نہ تھے کیونکہ وہ کل آبادی کی ایک چوتھائی تھے اس معاملے میں
ہندوستان کچھ عجیب نہ تھا تقریباً ہر ملک کی آبادیوں میں اکثریتی اور اقلیتی فرقے مختلف تناسب سے موجود تھے
آزاد ممالک میں سے بیشتر نے اس کا حل نکال لیا تھا اور مذہب، زبان اور نسل کے اختلافات کے باوجود اپنے
اندر مکمل یکجہتی پیدا کر لی تھی۔

اقلیتوں کے مسائل کا حل ناقابل حصول بالکل نہیں ہے دانائی اور موافق حالات سے انہیں بہ
کامیابی حل کیا جا سکتا ہے ان کے فقدان کا نتیجہ ناکامی ہوگا جس چیز کی ضرورت ہے وہ صرف اس ارادہ کے
لیے خیر سگالی ہے کہ ہم سب بھائی بھائی کی طرح ایک واحد قوم بن جاتے ہیں اب یہ ضرورت کا عرصہ ہے
جو واقعات درمیان میں آئے ان کا ہم ذکر کرتے ہیں اور یہ دیکھیں کہ ان واقعات نے سال بہ سال کے عرصوں
میں خصوصاً معاملات زیر مطالعہ پر کیا اثر ڈالا تاکہ یہ سمجھ میں آ سکے کہ وہ نتائج جو پیدا ہوئے
کیوں پیدا ہوئے۔

I. "Wir wollen sein ein einzig Volk von Brüdern"
F. Schiller Wilhelm Tell.

مغرب کے اثر اور دباؤ کے ماتحت انیسویں صدی کے ہندوستان کے اندر سماجی اور مقصدی افکار کے کئی چشمے ابلنے شروع ہو گیے تھے۔ بیسویں صدی کے آغاز کے وقت ہندوستان کے دماغ میں ایک عظیم ہلچل دو وجہوں سے پیدا ہوئی تھی ایک مادی حالات بے حد مصیبت ناک ہو گیے تھے اور دوسرے مغرب ہندوستانی کلچر کی خوبیوں کو چیلنج دے رہا تھا اس لیے عزت کا اور اسی طرح مادی فلاح دونوں کا تقاضہ تھا کہ فلسفہ اور گورنمنٹ کے محاذوں پر متحد حل پیش کیا جائے۔

مسلم آرا پر دنیا کا دباؤ

جیسا کہ اس سے قبل کی جلد میں بتلایا گیا مسلم لیڈران میں دو گروہ تھے ایک جدید اور دوسرا قدیم اول الذکر قوم کے اس طبقے سے تعلق رکھتے تھے جنہوں نے اس انتظام کے تحت تعلیم پائی تھی جو مغربی طرز پر قایم ہوا تھا اور دوسرے وہ تھے جنہوں ان مذہبی اور عربی اسکولوں میں تعلیم پائی تھی جو وسطی زمانے کے مدارس کے طرز کے تھے۔ اول الذکر پر مغرب کا براہ راست اثر پڑا لیکن مذہبی مدارس پر بھی بالواسطہ اثر پڑا کیوں کہ سیاسی اور اقتصادی ماحول جن میں وہ زندگی گذار رہے تھے ان میں مغربیت پیوست تھی۔ اور اس وجہ سے بھی ان کا دور رابطہ اپنے ہم مذاہب سے تھا خواہ وہ ہندوستان کے ہوں یا مغربی ایشیا کے اس نے ان کو دنیا کی بدلتی ہوئی حالت کے سامنے لا کھڑا کر دیا تھا۔ جب وہ باہر گئے اور مقدس مقامات کی زیارت کی تو ان کے سامنے مسلم ممالک کا وہ کلچر سامنے آیا جس نے جدیدیت کا اثر قبول کر لیا تھا۔

جدید تخیل کے حامل لیڈران کا رخ نئے تعلیم یافتہ طبقہ کی جانب تھا۔ لیکن اگرچہ ان کی ساخت ایک چھوٹے سے گروہ کی تھی لیکن ان کی اہمیت ان کی تعداد کی نسبت سے کہیں زیادہ تھی مسلمانوں کے ذہن اہل علم طبقہ میں وہ لوگ شامل تھے جو روزگار کرتے تھے مثلاً وہ سوداگر جو ماڈرن طرز کی تجارت و صنعت کرتے تھے یا زمیندار ان یا وہ لوگ جو سرکاری ملازمتوں میں تھے یا جرنلسٹ تھے وغیرہ۔ ان کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ قوم کے لیڈر ہیں اور قوم کی رائے عامہ کے معمار بھی ہیں حکومت ہند نے انکی حیثیت بطور ایک علیحدہ گروہ کے اس لیے تسلیم کر لی کہ وہ لوگ حکومت کے تعاون کے خواستگار تھے حکومت ان سے مشورے کرتی تھی اور اپنے اغراض کے لیے ان کو استعمال کرتی تھی گورنمنٹ ان پر جو توجہ مبذول کرتی تھی اور جو مراعات ان کو دیتی تھی ان دونوں نے ان کا وزن اپنی قوم میں بہت بڑھا دیا تھا اور اس لیے ان کی اس صلاحیت میں اضافہ ہو گیا تھا کہ وہ قوم کی رائے کو جدھر چاہیں موڑ دیں۔

روایاتی لیڈران یعنی علمائے علم کے جذبات پر بلاشبہ اپنا اثر و اقتدار رکھتے تھے لیکن ان کی قیادت مذہبی تھی نہ کہ سیاسی ان میں یہ طاقت تھی کہ وہ جاہل اور غریب کاریگروں، کاشتکاروں اور محنت کش مزدوروں کو مذہبی جہاد پر ابھار دیں اور جنون کی حد تک ابھار دیں تاکہ وہ جان قربان کرنے کے لیے بھی تیار ہو جائیں۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے جنگ آزادی میں بہادرانہ کارنامے انجام دیئے لیکن عام طور پر ان کا کردار ثانوی درجہ کا رہا قومی اور فرقہ وارانہ دونوں قسم کی تحریکوں میں آزادی کے حصول میں ان کے کارنامے بڑی قیمت کے حامل تھے لیکن ان کی صف سیاسی طور پر منتوق تھی اور جدید مغربی تعلیم یافتہ لیڈروں نے ان کی اہمیت پر سایہ ڈال کر اسے دھندلا کر دیا تھا۔ وہ عوام جو تعلیم جدید سے بہرہ ور نہیں تھے ان کے نزدیک بھی وہ سیاست جو انسان کی روٹی کا بندوبست کرے مذہب سے زیادہ مستحق توجہ تھی۔

قدامت پرست علماء کا اثر دھیرے دھیرے کم ہو رہا تھا اول تو ملک میں سیاسی شعور کی نشو و نما ترقی پر تھی۔ اور دوسرے مذہبی بنیاد پر جہاد کے بے کار ہونے کا احساس جیسا کہ سید احمد بریلوی اور 1857 کی بغاوت کے میدانوں نے ثابت کیا پیدا ہو رہا تھا اس لیے عیسائی حکمرانوں کے خلاف روایاتی مخالفت کو ترک کر کے سیاسی شورش کے موجودہ زیادہ چالاک طریقوں کی جانب راغب ہو رہے تھے اور اس میدان کی صحیح قیادت صرف علوم جدیدہ کے ماہرین ہی کر سکتے تھے۔ علماء کا اثر و اقتدار گھٹ رہا تھا کیوں کہ وہ لوگ پرانے طریقوں سے بندھے ہوئے ہونے کی وجہ سے دشمنان اسلام کی مخالفت کرتے تھے لیکن اس کے لیے جن وسائل کی ضرورت ہے وہ ان کے پاس نہیں تھی وہ کوئی ایسی بااثر جمعیۃ بھی قائم نہ کر سکے (کیوں کہ اس کے لیے بڑے سرمایہ کی ضرورت تھی جو ان کے پاس کہاں تھی) جو کوئی ڈیرپا دستوری یا قانونی پروگرام چلا سکے۔

مسلمانوں کو ہندوؤں سے جو خوف لاحق رہا ہے اور جس طرح وہ ان سے بدگمانی کرتے رہے ہیں ان کا ناجائز فائدہ اٹھا کر جدید لیڈران میدان میں علماء سے آگے نکل گئے اور اسی کے ساتھ وہ یہ بھی کوشش کرتے رہے کہ حکومت کی ہمدردی اور حکومت کی جانب سے مراعات ان کو حاصل ہوتے رہیں خوش حال مسلمان مالکان آراضی، سوداگر اور پیشہ ور لوگوں نے ان کی حمایت کی۔

مغرب نے ثقافتی اور اخلاقی برتری کا جو ادعا کیا تھا اس کے خلاف مسلمانوں کا ردعمل تین منزلوں سے گزرا۔ درتو وہ تھا جو مسلمانوں نے محسوس کیا کہ ان کے غرور کو ٹھیس لگی ہے اور اس لیے انہوں نے فیصلہ کیا کہ رجعت قہقری کر کے گوشہ نشین اور بے تعلق ہو جائیں یہ ذہنیت 1857 تک

قایم رہی اس منزل میں مسلمانوں نے اس بات پر نظر ڈالنا شروع کیا کہ کس طرح وہ پرانے زمانے کے عروج کو واپس لائیں۔ اور اپنی کھوئی ہوئی طاقت پھر سے حاصل کر لیں اس تحریک کی بنیاد شاہ ولی اللہ دہلوی نے رکھی اور انگریزوں کے خلاف سید احمد شہید بریلوی کے مقدس جہاد پر جا کر ختم ہو گئی۔

جہاد کی ناکامی اور جس بے رحمی سے اس بغاوت کو کچلا گیا اس نے دوسری منزل کی نشان دہی کی مسلمانوں نے بزور شمشیر انگریز سے مقابلہ کرنے کے قطعی بے کار ہونے کا احساس کر کے یہ تسلیم کر لیا کہ انگریز کی حکومت ناقابل تسخیر ہے اور حکمرانوں سے صلح و مصالحت کے لیے اپنے کو تیار کیا انھوں نے کتب مقدس کی شرح و تفسیر اس انداز میں شروع کی تاکہ مغرب کو متاثر کر سکیں۔ یہ ترقی پسندانہ خیالات سے ہم آہنگ ہیں اس کے لیڈر سید احمد خاں تھے جن کا انتقال 1898 میں ہوا۔

ان کی موت کا زمانہ وہی زمانہ ہے جب ہندوستان کی اسلامی دنیا کے معاملات نے ایک نئی کروٹ لی۔ بیرون ملک میں جو واقعات پیش آئے انھوں نے مسلمانان ہند کی رایوں پر گہرا اثر ڈالا اس لیے ضرورت ہے کہ عالم اسلام میں جو واقعات پیش آئے ان پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے انیسویں صدی کے آخر میں مسلمان مملکتوں کی زیادہ تعداد یا تو براہ راست یورپین شہنشاہیتوں میں ضم ہو گئی تھی یا ان کے حلقہ اثر میں آ گئی تھی۔ حکومت آل عثمان تنہا وہ مملکت تھی جو ابھی تک اپنی آزادی اور اقتدار باقی رکھے ہوئے تھی لیکن اس تیزی سے شکست و ریخت ہو رہی تھی کہ پوری عمارت بس گرانے والی ہی معلوم ہوتی تھی اور یہی ظاہر ہوتا تھا کہ ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی۔

لیکن بہر حال مغرب کا حملہ محض سیاسی نہ تھا۔ اس اسلامی زندگی اور اسلامی تہذیب کی جڑ پر ضرب لگائی تھی اس لیے اس نے سیاسی اقتدار اور مذہبی مقاصد دونوں کے لیے خطرہ پیدا کر دیا تھا یہ تو ظاہر ہے کہ مسلمان مقابلہ کے لیے میدان میں اتر پڑے لیکن ان کے ردعمل نے کئی رنگ و روپ اختیار کیے کچھ مفکرین نے مغربی کلچر کو بالکلیہ رد کر دیا اور اعلان کر دیا کہ شہنشاہیت کا جو ڈھونگ مغرب نے کھڑا کر دیا ہے اس کے سامنے جھکنے کا کوئی سوال نہیں ہے۔ کچھ لوگوں نے فلسفیانہ نظریات کو کام میں لا کر کچھ ایسی چیزوں کو منظور کر لیا جن میں عملاً افادیت تھی۔ لیکن مذہبی، اخلاقی اور سماجی تصورات کو رد کر دیا اور کچھ ایسے بھی تھے جنھوں نے دونوں تہذیبوں میں بلا اسلامی اصولوں کو قربان کیے تطابق پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اور ہاں کچھ ایسے بھی تھے جو ان امور کو ایک دوسرے سے ملا دینا اور ان کی ترتیب دینا چاہتے تھے۔ لیکن جو کچھ بھی طریقہ کار رہا ہو سب کے سب کا معاملہ یہ تھا کہ وہ کل ماڈرن کلچر کی ناواقفیت

پر مبنی تھے اور اس لیے ماڈرن کلچر کی فلسفیانہ اور سماجی بنیادوں کا وہ اندازہ نہ کر سکے۔ مسلم مصنفین نے مجموعی طور پر مغرب کے دماغ کے عقلی تنقیدی اور اجتہادی نظریات کو صحیح طور پر نہیں سمجھا اور نہ یہ جان سکے کہ سماجی ارتقا میں مادی اور اقتصادی امور کا کیا اثر ہوتا ہے۔

شروع شروع کا ردعمل تو یہ تھا کہ مغربی کلچر کے رنگ و روپ کو روزمرہ کی عملی کارروائیوں مثلاً فوج کی تکنیک انتظامی تدابیر اور سائنسی اور صنعتی علوم میں مقبول کر لیا جائے اس مداخلت بے جا نے سوسائٹی میں عدم توازن اور ٹکراؤ پیدا کر دیا اور افراد کے ذہنوں میں مذہبی اخلاقی اور سماجی امور پر تنقیحات قایم ہو گئیں بعض بنیادی مسائل یہ تھے مثلاً عالمگیریت بہ خلاف قومیت عقائد بمقابلہ عقل۔ خدائی قوانین اور روایات (تقلید) بہ خلاف انسانی قوانین اور تجدید مذہب اور سیاست کا امتزاج بہ خلاف دونوں کے متفرق ہونے کے حاصل کلام یہ ہے کہ مذہب بہ خلاف حکومت۔

III ابتدائی مسلم مفکرین

ایک بے حد ممتاز مفکر جس نے مسلمانوں کے خیالات پر عظیم اثر ڈالا وہ جمال الدین افغانی (97-1833) تھے وہ پان اسلام ازم (اتحاد اسلام) کے بانی تھے لیکن اسی کے ساتھ وہ ایک ماڈرن قسم کے مصلح بھی تھے۔ ان کے اغراض و مقاصد دو تھے۔ (1) مغرب سے مشرق پر نیشنلزم کا جو سیلاب آ رہا ہے اسے مغرب کے مبنی بر عقل و فہم اقدار سائنس اور فنی مہارتوں کو اختیار کر کے ان کے ذریعہ سے بند باندھ کر روکنا۔[2] اور (2) اسلام کی قدیم عظمت کی عملی زندگی کو ترقی دے کر اپنے اندر کی باقی طاقت پیدا کر کے اور ترک دنیا اور تقدیر پر بھروسہ کر کے بیکاری کی زندگی کو خیرباد کہہ کر پھر سے واپس لایا جائے۔

جمال الدین افغانی ایک بے چین انسان تھے اور ان میں آگ سی بھری تھی وہ ملک بہ ملک پھرتے رہے اور ہر جگہ وہ مسلمانوں کے مقاصد اور ان کے جذبات کے شعلوں کو ہوا دیتے رہے وہ ان کو یاد دلاتا تھا کہ اگر آج اسلام پر برے دن آ گئے ہیں اور مغرب کے حملوں کے آگے سر جھکانے پر مجبور ہوا ہے تو وہ سب صرف اقوام مسلم اور ان کی حکومتوں کی کمزوریوں کا نتیجہ ہے انھوں نے بتلایا کہ علاج یہ ہے کہ مذہب کا احیاء جدید کیا جائے اور سیاسی طاقت پھر سے قایم کی جائے

2. Nuseibeh. H.K. The Ideas of Arab Nationalism. P. 122.

کیوں کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے ایسا پیوست ہیں کہ ان کو الگ کیا ہی نہیں جا سکتا اسلامی ممالک پر ان کی رائے کا فوری اثر ہوا ان کے اتحاد اسلام کے نعرے نے اتحاد عرب (پان عرب) تحریک کو جنم دیا۔ ان کی زوردار جوشیلی تقریروں کا نتیجہ ایران میں دستوری شورش کی شکل میں نمودار ہوا۔ سید احمد خاں پر جو اعتراضات انھوں نے کیے اس نے ہندستان کے علماء کو متاثر کیا کہ وہ انڈین نیشنل کانگرس سے تعاون کر کے آزادی کی جدوجہد میں حصہ لیں افغانی نے مسلمانوں کو از سر نو زندہ ہونے کا پرجوش پیغام دیا اور اپنے خلاف مغرب ستون میں مسلمانوں کے دماغ کو یہ بتلا کر باندھ دیا کہ اسلام کا حقیقی دشمن عام طور پر یورپ اور خصوصی طور پر برطانیہ ہے

ان کے شاگرد شیخ محمد عبدہٗ (1905-1849) نے جو ایک زمانہ میں جامعۃ الازہر قاہرہ کے ایڈیٹر (صدر) بھی رہ چکے تھے اپنے استاد کے پیغام کو تعلیم کے ذریعہ سے پھیلایا۔ بے شمار اہل علم الازہر کے اندر بھی اور الازہر کے باہر بھی ان کے شاگرد ہو گیے اپنی شاہکار کتاب تفسیر قرآن میں انھوں نے پچھلے مفسرین سے الگ راہ بتائی ہے اور اپنے پیش روؤں سے زیادہ معقولیت پسندانہ نقطۂ خیال اور وسیع النظری کا ثبوت دیا ہے قران کی تعلیمات کو جدید خیالات کی مطابقت کے ساتھ پیش کرنے کی عبدہٗ کی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ماضی سے حال کی جانب مستقل راستہ تعمیر ہوا۔

ان کے شاگردوں میں ممتاز مصنف و صحافی محمد رشید رضا (1935-1865) "مینار قاہرہ" کے مشہور معروف ایڈیٹر بھی تھے وہ صاحبان اتحاد اسلام میں تھے اور انھوں نے خلافت پر ایک کتاب لکھی ہے جس میں اس اصول موضوعہ پر زور دیا ہے کہ اسلام کے اندر روحانیت اور ریاست دونوں کا اجتماع ہے لیکن بہر حال وہ عوامی اقتدار اور مشاورتی حکومت کے حامی تھے لیکن ان کو ایک جمہوری حکومت کے نظام کا کوئی فہم و ادراک نہ تھا۔ ان کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے پیغمبر کی زندگی اور ان کے کردار پر خصوصیت کے ساتھ زور دیا ہے اور ان کو انسان کامل کی حیثیت سے پیش کیا ہے ان کے تمام پیروں کے لیے ایک اسوۂ کامل۔ مجموعی طور پر ان کے خیالات اپنے اپنے استاد کے مقابلہ زیادہ قدامت پرستانہ اور تنگ نظرانہ تھے ۔

افغانی نے جس مکتبہ فکر کی بنیاد رکھی اس نے اسلام کی تعلیم دی جس میں مسلمانوں نے مذہبی اور دنیوی دونوں کے لیے ہدایات تھیں لیکن اسی کے ساتھ انھوں نے جدید تخیلات جیسے آزادی مساوات، الفرائیت، سائنس اور نیچہ کو بھی اختیار کیا۔ اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ قران ان کی تعلیم دیتا ہے مذہب کے مقابلہ میں عقائد کو عقل پر اور عالمگیریت کو نیشنلزم پر زبردست ترجیح دی ——

اس کا مزاج روایاتی اور قدامت پرستانہ تھا اور مذہبی عقائد پر جو الزامات لگائے جاتے ہیں ان پر تنقید کے لیے کارآمد نہ تھا۔

کچھ اور بھی مکتبہ فکر تھے جنھوں نے مغربیت میں زیادہ مخلصانہ اور زیادہ انتہا پسندانہ تعلق پیدا کیا لیکن وہ اتنے مشہور نہ تھے اور ان کی راہوں کا اثر افغانی اور ان کے پیرؤں سے کم تھا۔ ان کا ذکر بھی اہم ہے کیوں کہ ان لوگوں نے شریعت کے احکام کا از سر نو جائزہ لینے کی تبلیغ کی تاکہ ان کو حالیہ سماجی رجحانات کے مطابق بنایا جا سکے جہاں تک کہ اخلاقی قدروں کا سوال ہے وہ لوگ افغانی سے اتفاق کرتے تھے اور وہ لوگ بھی ترک دنیا اور بے عملی کے مخالف اور اپنے کو آشکارا کرنے اور عمل کرنے کے معترف تھے۔

طٰہٰ حسین ایک آزاد خیال مفکر نے مسلمانوں کو دعوت دی کہ وہ آزاد دماغ پیدا کریں۔ ان کے الفاظ یہ تھے ہم اس عہد میں اس طرح زندہ نہیں رہ سکتے کہ اقوام یورپ کو جو سیاسی اور ذہنی آزادی حاصل ہے اسے ہم بھی حاصل کریں لیکن (؟) کے ساتھ ہم ان تمام باتوں کے لیے جو ذہن کی پرورش کرتی اور سائنس، فلسفہ لٹریچر اور آرٹ کی تہ میں جو احساسات ہیں ان کو پالتی ہیں ہم ان پر بھروسہ کرنے کے لیے مجبور ہیں۔[3]

نیشنلزم کا دم بھرنے والے بہت تھے ان میں جن لوگوں نے سب سے زیادہ اس کو اجاگر کیا وہ مصطفےٰ کمال مصری 1908-1874 تھا جس نے اپنی نیشنلسٹ پارٹی علاقائی حب الوطنی اور سیکولرزم کی بنیاد پر قایم کی دوسرے عبدالرحمن الکواکبی (1902 - 1849) تھے جو روایات عرب پر عقیدہ رکھتے تھے۔ اسلامی عقائد اور اصول کے مبلغ ہوتے ہوئے ایک نیشنلسٹ اور دستور پسند تھے اور مغربی طرز کی جمہوریت کے زبردست حامی تھے۔

اس طرح قبل اس کے کہ یہ صدی ختم ہو اسلامی مفکرین کو مذہبی، سماجی، انفرادی اعمال سیاست وغیرہ سبھی قسم کے مسائل کا سامنا تھا۔ پرانی قدریں نئی قدروں سے ٹکرا رہی تھیں اشخاص کے ساتھ وفاداری کا تقابل ان جماعتوں سے وفاداری کا تھا جو ایک فرد یا ذات میں مفرد تھی اور اسی طرح خاندان، جرگہ، قبیلہ، مذہب، فرقہ کے ساتھ وفاداری کا تقابل ایک قومی حکومت میں ضم ہو جانے سے علم اور سماجی اداروں سے معاملہ میں انھیں کے قایم رکھنے کا تقابل تبدیلی اور آگے بڑھنے سے خود کو اعتراض کا محاذ سمجھنے اور خود کو آشکارا کرنے کے جذبات کا مقابلہ اپنے کو دبانے اور مسائل کی کورانہ تقلید سے آزادی عمل کا تقدیر سے عالمگیر سوسائٹی (امت محمدیہ) کا نیشنلزم سے اور یہ

3. Gibb. H.A.R. Studies in the Civilization of Islam. P. 278.

سوال کہ اسلام نے جو ضابطہ اخلاق امروزہی کے احکام بنائے ان کو مانا جائے یا رد کر دیا جائے۔

ماڈرن طریقہ اختیار کرنے کی تحریک ازمنہ وسطیٰ کی اقتصادیات کے پس منظر میں شروع ہوئی۔ اس کا منشا یہ تھا کہ یورپ میں جس طرح اقتصادیات کا عمل دخل ہے اسی کی نقل کی جائے لیکن یہ لوگ نہ تو اس کے اصول کو سمجھتے تھے اور نہ ان سماجی بنیادوں سے واقف تھے جن پر اس کی عمارت کی تعمیر ہوئی تھی۔ ہندوستان کے مسلمان اگرچہ دو ایک دوسرے سے مختلف اداروں میں تعلیم پاتے تھے لیکن وہ سب اپنے مذہب اور بربنائے مذہب سیاست کی روایات میں گھتے ہوئے تھے۔ ان دونوں اداروں کے تعلیم پانے والوں میں صرف زیادہ اور کم اہمیت دینے کا تھا۔ مغربی تعلیم یافتہ لوگ اپنے مسائل کے سیاسی پہلو سے زیادہ دلچسپی لیتے تھے اور وہ لوگ جو پرانے طرز کی روایتی تعلیم حاصل کرتے تھے ان کی دلچسپی مذہب میں زیادہ تھی۔

ان سب باتوں کے باوجود بیسویں صدی کے آغاز میں مسلم سیاست کا زیادہ تر رجحان روٹی اور سالن کے مسائل، ملازمتوں میں حصہ لینے، گورنمنٹ کی سرپرستی اور ان سے مراعات حاصل کرنے اور اپنے فرقہ میں تعلیم پھیلانے کی جانب تھا۔ چونکہ اپنے فرقہ کے اندر اتحاد اور اتفاق پیدا کرنا ان امور کے حاصل کرنے کا وسیلہ بن سکتا تھا اس لیے اس بات کی کوشش کی گئی کہ مسلمانوں میں وحدت اور یک جہتی کا جذبہ پیدا ہو۔ جیسے "مسلم نیشنلزم" کا لقب بھی بلا سوچے سمجھے دے دیا گیا ہے۔ اس کا انجام فی الفور یہ ہوا کہ مسلم فرقہ الگ تھلگ ہو گیا اور دوسرے فرقوں سے مختلف نظر آنے لگا۔ بالخصوص ہندوؤں سے اس لیے اس بات کی تلاش ہوئی کہ اسلام کی شناخت کرنے کے خصائص کیا ہیں یعنی اسلام کے بنیادی اصول اور اعمال صالحہ کیا ہیں اور ان کا ماڈرن زندگی سے کیا تعلق ہے اور اس بات کی بھی جانچ شروع ہوئی کہ تاریخ میں اس کا کیا کردار رہا ہے اور مستقبل اس کا کیا ہے۔

ابھی تک ان مسائل پر دفاعی نقطہ نظر سے نظر ڈالی جاتی تھی مسلم فرقہ کے لیڈران اعتذار میں مبتلا تھے۔ وہ اسلام کی حقانیت کو ثابت کرتے اور یہ ثابت کرنے کے لیے کہ یہ مغرب کے ترقی پسندانہ اور آزاد تخیلات سے مطابقت رکھتے ہیں مضطرب تھے۔ وہ اپنے سیاسی ثقافتی عظمت کے لیے تاریخ کی گواہی پیش کرتے تھے اس طرح تاریخ کو عقائد کے مبنی برحق ثابت کرنے کے لیے استعمال کیا گیا۔ جہاں جہاں ناکامیاں ہوئی تھیں ان کو یا تو محو کر دیتے تھے یا یہ کہتے تھے کہ یہ نتیجہ تھا اسلام کے اعمال سے انحراف کا اور

بدعات کا جو اسلام سے بالکل متضاد ہیں داخل کرنے کا۔

جمال الدین افغانی اور ان کا مکتب فکر دماغ سے کٹ کر جارحیت کو اپنا رہا تھا۔ ان کے نزدیک اسلام بحیثیت مذہب اور بحیثیت ایک سماجی سیاسی ادارے کے کامل واکمل ہے وہ مسلم معاشرہ اور مسلم حکومتوں کے زوال کا سبب یہ بتلاتے تھے کہ مسلم حکومتیں کمزور ہو گئیں اور معاشرہ نے اسلامی عقائد پر یقین کھو دیا ورنہ اسلام میں کوئی نقص نہیں۔ جس سے یہ ابتر حالت پیدا ہوئی ہو۔ علاج یہ تھا کہ اسلام کو پھر زندہ کیا جائے اور حکومت کی طاقت کو واپس لایا جائے۔

اقبال IV

بیسویں صدی میں مسلم افکار کی قیادت کرنے والوں میں سب سے زیادہ ممتاز اور اسی کے ساتھ سب سے زیادہ بااثر محمد اقبال تھے وہ 1873ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے انھوں نے اپنی تعلیم ایک مستشرق دانشور سے شروع کی جس نے ان کو فارسی اور عربی پڑھائی اور قرآن سے تعارف کرایا اس کے بعد وہ انگریزی اسکول میں داخل ہوئے اور اپنی مزید تعلیم گورنمنٹ کالج میں حاصل کی جس کا الحاق پنجاب یونیورسٹی سے تھا۔ ان کو قدرت کی جانب سے غیر معمولی ذہن اور دماغ عطا ہوا تھا۔ وہ ایک نہایت جذباتی لڑکے تھے بہت جلد بات سمجھ لیتے اور اسی جلدی سے اس کا جواب بھی دیتے۔ لیکن مزاج ناہموار تھا ان کا دماغ بے حد حساس۔ بلند پرواز فکر کا حامل اور متصوفانہ تھا۔ اور پہلے گم کردہ راہ ہونے کے بعد آخر کار وہ ایک انتہائی مذہبی رنگ کے خدا پرست ہو گئے ان کی روح میں اسلام کے لیے ایک عمیق ترین جذبہ اس کے شاندار ماضی پر فخر اور اس کی موجودہ مسکنت پر شرمندگی موجزن تھی۔

قدرت نے ان کو شاعری کے لیے ودیعت کیا تھا۔ انھوں نے اس وقت بھی جب وہ لڑکے تھے اردو میں اشعار نظم کیے ہیں۔ جس طرح ان کی عمر ترقی کرتی گئی ان کا غیر معمولی ذہن اپنے کو آشکار اکرتا گیا۔ اور ان کو وہ اختیار حاصل ہوا جو کم لوگوں کو حاصل ہوتا ہے کہ انھوں نے دو زبانوں اردو اور فارسی میں اشعار کہے دونوں زبانوں میں انھوں نے ایسے عہد آفریں اشعار کہے جو اس وقت تک باقی رہیں گے جب تک یہ زبانیں باقی ہیں۔

مذہب فلسفہ اور ادب ان کی خ دلچسپی کے موضوعات تھے ان کا تعلیمی دور شاندار تھا اور اس شان پر تاج یوں رکھا گیا کہ وہ اسی کالج کی فیکلٹی میں مقرر ہو گئے تلاش علم میں وہ کیمبرج اور میونخ بھی گئے کیمبرج میں ان کی میک ٹاگمرٹ سے ملاقات ہوئی جو ہیگل کے فلسفہ کے شارح تھے میونخ جہاں انھوں نے "ایران میں مابعد الطبیعات کی نشوونما" کے عنوان سے مقالہ لکھا۔ جرمن افکار کا مطالعہ کیا۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں وہ ٹی، ڈبلو آرنلڈ کے محبوب شاگرد تھے جو اسلامی کلچر کے مداح تھے۔ چند ماہ انھوں نے لندن یونیورسٹی میں عربی بھی پڑھایا اور بیرسٹری کی ڈگری بھی حاصل کی۔

اس کے بعد 1908 میں وہ اپنے وطن واپس آئے اور گورنمنٹ کالج میں فلسفہ کے پروفیسر مقرر ہوئے اور ان کو قانون کی پریکٹس کرنے کی بھی اجازت تھی۔ گورنمنٹ کی ملازمت ان کو تکلیف دہ معلوم کیوں کہ وہ ان کو اپنے خیالات کے اظہار کرنے اور ان کی آزادی پر پابندی عائد کرتی ت کا دل وکالت کے پیشہ میں بھی نہ تھا تیس سال تک وہ شاعر سے معاش س تیس سال کی مدت ایسی ہے جس میں ان کو مجموعہ روزگار کامیابی اور عالم گیر ل ہوئی۔

یورپ روانہ ہونے سے قبل اقبال ایک شاعر تسلیم کئے جا چکے تھے جس سے روشن مستقبل کی امید یں تھیں۔ رو ش کی ملامت وشیرینی، طرز ادا کا تنوع وتازگی، عالیشان تخیلات تصو کشی اور نوادرات ینے والی جدت اشعار میں موسیقی وترنم ان تمام چیزوں نے ان کو تمام ادب کا اول درجہ کا درخشندہ ستارہ بنا دیا تھا لیکن فن شعر گوئی کے کمال کے باوجود ابھی روایتی شاعرانہ اظہار خیال سے الگ کوئی راہ نہیں بنائی تھی۔

لیکن دماغ کے اندر انقلاب آ رہا تھا جس کا آغاز یورپ میں ہوا جہاں تین سال رہے اور یہ تین سال سیاسیات اور تصورات دونوں لحا کے حامل تھے۔ یہ وہ سال تھے جو پہلی جنگ عظیم کی تباہی و پیش

بیسویں صدی کے پہلے دس سال میں ایک عبر یورپین کی نگاہ میں انسانوں کو جلانے والی ایک ایسی بھٹی نظر آتا تھا جس کیا سیاسی ابل رہی تھی۔ دو اچھلنے والی ملوکیتیں انگلستان اور فرانس۔ اور بعد میں اچھلنے والی جرمنی اور اٹلی اور منصوبہ بند قومیں جو توسیع کی حرص میں مبتلا تھیں مثل روس سے ہلاکت خیز مقابلہ میں مشغول تھیں

ایک نیشن دوسرے نیشن سے بازاروں کو وسعت دینے، اپنے اثرات کا حلقہ بڑھانے۔ لوٹ کھسوٹ کرنے میں ایک دوسرے پر بازی لے جانے کی کوشش میں تھا۔ یہ رقص الموت یورپین سیاست کے کے لیڈران کو تو مدہوش کیے ہوئے تھا لیکن اس نے مسلم حکومتوں کو خوف اور مایوسی کی بدحواسی ریاالہر دوڑا دی تھی کیوں کہ مغرب کی توسیع پسندی کے ہدف ایشیا اور افریقہ کے مسلم ممالک ہی تو تھے

اقبال کا ردعمل ملوکیت کے بھوت اور نیشنلزم کے درندے کے خلاف یکساں تھا البتہ معلوم ہوتا تھا کہ مغرب کی انسانیت نے ان تمام اصولوں کو ترک کر دیا ہے جو ایک مذہبی ذہن و مزاج رکھنے والے اور انسانیت سے محبت کرنے والے صوفی صفت شخص کو عزیز تھے اس لیے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ اب وہ آخر تک نیشنلزم کے مضبوط دشمن رہے۔ یورپ کی واپسی کے بعد جو نظمیں انھوں نے لکھیں انھیں للکارا کہ

ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست۔

(ہر ملک ہمارا ملک ہے کیوں کہ ہر ملک ہمارے خدا کا ملک ہے)

اور مزید ا۔

تفریق ملل حکمت افرنگ کا مقصود اسلام کا مقصود فقط ملت آدم

(یورپ کی حکمت کا مقصد قوموں میں اختلاف پیدا کرنا ہے اور اسلام کا مقصد صرف انسان کا نیشن ہے

علاوہ اس کے کہ جو کچھ اقبال نے یورپ میں دیکھا۔ ہندستان سے جو کچھ انھوں نے سنا اس سے انھیں ایک سخت دھکا لگا۔ 1905ء میں لارڈ کرزن نے تقسیم بنگال کا شاخسانہ صرف ہندستانیوں میں خانہ جنگی کا بم گرانے کے مقصد سے تھا۔ تقسیم کے خلاف ایک زور دار شورش برپا ہوئی جس کی کارروائیوں میں زیادہ تر ہندوؤں نے حصہ لیا۔ وہ مسلمان جو تقسیم کو اپنے مفادات کے سلسلہ کی مراعات سمجھتے تھے اس ایجیٹیشن سے ناراض ہو گیے اور دونوں فرقوں کے تعلقات میں تلخی پیدا ہو گئی۔ اور کرزن کا یہی منشا تھا۔

اقبال جو اس برتاؤ پر غم و غصہ سے بھرا ہوا تھا جو یورپین طاقتیں مسلمانوں سے کر رہی تھی ہندوؤں کے اس رویہ سے سخت بیزار ہوا۔ ان کے اندر نیشنلزم کے پھول کی ابتدائی کونپلیں جو نکلی تھیں وہ اس غرض مندانہ اور حد سے متجاوز خود پرستی کی آندھی میں مرجھا گئیں۔ اقبال جس نے "ہندوستاں ہمارا" کا نغمہ سنایا تھا اس نے ایسا محسوس کیا کہ گویا اس کی آنکھیں کھل گئی ہیں۔ تقسیم بنگال نے ہندستان کو اس کے دماغ کے باہر پھینک دیا اور اس جگہ پر اسلام آ گیا۔

یورپ نے اس کو نیشنلزم کا مخالف اور اتحاد اسلام کا حامی بنا دیا تھا اور وہ احساس ذلت اور احساس ناکامی سے کانپ رہا تھا۔ تقسیم نے اس کو صاف صاف شدید قسم کا فرقہ پرست بنا دیا۔ جس کے بعد دنیا بھر اور ہندوستان کے اندر جو واقعات پیش آئے انھوں نے اس کے اس رویہ پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔

یورپ سے واپسی کے بعد کے پندرہ سالوں نے دیکھا کہ شاعر کے ذہنی و فنی کمالات نے پر پرواز پیدا کیا ہے اور وہ فلک الافلاک کی بلندیوں کے بھی اوپر چلا جا رہا ہے لیکن وہ ایک تنہا عقاب تھا جو خلاء بسیط میں پرواز کر رہا تھا۔ غوغائے عالم اور شورشوں سے الگ تھلگ ایک زندگی بسر کرتا رہا۔ اس نے اس زمانہ میں زیادہ تر فارسی میں اور بہت کم اردو میں لکھا۔ اور اس طرح شالی طور پر اس نے ثابت کیا کہ اسلام قید مقامی سے آزاد اور عالم گیر ہے۔

ان کی کل حرکات بس اس محدود تھیں کہ سال میں ایک مرتبہ وہ انجمن حمایت اسلام کے اجلاس تک سفر کرتے تھے اور وہاں مناسب موقع ایک نظم پڑھتے تھے لیکن ہر نظم جذبات سے پر ہوتی تھی جس میں ماضی کی شان و شوکت کو دوہرایا جاتا تھا اور حال کے مصائب کا رونا رویا جاتا تھا اور مومنین کو پکارا جاتا تھا کہ بیدار ہوں اٹھ کھڑے ہوں اور اس وقت تک دم نہ لیں جب تک کہ اسلام جس مقصد سے دنیا میں آیا تھا وہ پیدا نہ ہو جائے۔ لیکن ان سب باتوں کا اثر اڑ جاتا تھا۔ ہوتا یہ تھا کہ نظم کے دوران لوگ سسکی بھر کر روتے اور آنسو بہاتے تھے پھر خاموشی اختیار کر لیتے تھے۔ جو پھر دوسرے سال جا کر ٹوٹتی تھی جب وہ پھر اپنی نظم سناتے تھے۔

ان ہی سالوں کے اندر دنیا کو ہلا دینے والے واقعات پیش آئے جنگیں ہوئیں مملکتیں تہ و بالا کر دی گئیں۔ خاندان اکھڑ گیے اور مقدس ادارے اچانک ختم ہو گیے۔ ہندوستان بھی ہندو اور مسلمان دونوں۔ گاندھی جی کی عدم تشدد پر مبنی زوردار تحریک سے جاگ اٹھا اور سانس لینا شروع کیا۔ بعض ایسے مواقع اس زمانہ میں ضرور آئے جب مناسب موقع کی نظم اقبال نے کہی ورنہ ان کی زندگی کی ہموار رفتار حسب معمول رہی۔

1927ء میں اقبال نے ایک چھلانگ لگائی اور سیاسی اکھاڑے میں اترے ان کی زندگی کے آخری دس سال اس بات کے لیے وقف تھے کہ قوم مسلم اپنے پروگرام کی منزل کو پا سکے۔ لیکن اقبال نوشتہ تقدیر میں یہ نہ تھا کہ وہ اپنے خواب کی تعبیر اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں۔ حسب ذیل قطعہ انھوں نے اپنے لوح مزار کے لیے تجویز کیا تھا۔

سرودے رفتہ باز آید کہ ناید | نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارے ایں فقیرے | دگر دانائے راز آید کہ ناید

(سرود رفتہ پھر آئے یا نہ آئے۔ وہ ہوا جو حجاز سے چل چکی تھی واپس آئے یا نہ آئے اس جملہ نشین ایام ختم کے قریب آ گئے ہیں کوئی دوسرا دانائے آئے یا نہ آئے) /4

دو علمی طاقتیں جنھوں نے اقبال کے دماغ کی ساخت تیار کی وہ تھیں (1) قرآن (2) فلسفہ مغرب اور سائنس بالخصوص انیسویں صدی کے شروع کے علوم جب کہ نیٹشا، ولیم جیمس اور ہنری برگساں کا مخالف عقلیت فلسفہ پسند کیا جا رہا تھا۔ لیکن بیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں ہندوستان اور یورپ کے اندر زندگی، انسان اور واقعات کے تجربات بھی وہ طاقتور اسباب تھے جنھوں نے ان کے دماغ کی وہ حالت بنائی اور انسانوں اور اداروں کے بارے میں ان کے خیالات کا مجسمہ تیار کیا۔

ہندستان میں مذہب کے فلسفہ کا چشمہ عشق، جذبات اور روحانیت کے ساحل پر آ لگا تھا ٹیگور اور آربندو گھوش کے جیسے مفکرین کی آراء کی شرح کرتے ہوئے جیسے کہ کہا گیا ہے ان لوگوں کے فلسفہ کی بنیاد داخلی تجربات پر ہے۔

اقبال نے انھیں مسائل سے بحث کی جن سے دوسرے مفکرین ہند بحث کر رہے تھے لیکن اسلامی کلچر کی تصویر بنانے میں وہ اپنے ماحول کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکے۔ انھوں نے بھی اور شاید دوسروں سے زیادہ زوردار طریقہ پر عقل پر جذبات کی سربراہی کا پیغام دیا عقل اور فلسفہ کے بارے میں انھوں نے لکھا کہ۔

تو اپنی خودی اگر نہ کھوتا ...... زناری برگساں نہ ہوتا
ہیگل کا صدف گہر سے خالی ...... ہے اس کا طلسم سب خیالی
انجام خرد ہے بے حضوری ...... ہے فلسفہ زندگی سے دوری
افکار کے نغمہ ہائے بے صوت ...... ہیں ذوق عمل کے واسطے موت

جہاں تک کہ قرآن کے مطالعہ کا تعلق ہے اقبال کا رویہ بالکل قدیمانہ رنگ کا تھا ان کا یقین تھا

4- IQBAL, M. Zarbi-Kalim in Kulliyat P. 237.

5 - IQBAL, M. Six lectures on the reconstruction Islamic thought.

کہ قرآن الہام ربانی ہے اور اس کتاب کا ہر لفظ اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیغمبر اسلام محمدؐ کے قلب پر نازل کیا گیا ہے۔ ان کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ اگرچہ مذہبی تجربات (الہام) پیغمبر کے ایک پاکباز صوفی کے مانند ہوتے ہیں لیکن وہ اس منصب سے بہت بلند درجہ رکھتا ہے، ایک ذات خیر محض کا وجدان دونوں میں مشترک ہے یعنی صوفی باصفا اور پیغمبر میں لیکن صوفی کے لیے اس کا مطلب سکون قلب احساس الحکیت اور بے چون وچرا ہونے کے ہے لیکن پیغمبر کا حال یہ ہوتا ہے کہ اس کے اندر دنیا کو ہلا دینے والی نفسیاتی طاقتیں بیدار ہوتی ہیں جن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دنیا کو مکمل طور پر بدل کر ایک نئے سانچے میں ڈھال دے" وہ اس تجربہ سے لوٹ کر وقت کے دھارے میں اپنے کو ڈال دیتا ہے تاکہ وہ تاریخ کے مضرات کو قابو میں لائے اور ایک جدید روزگار تازہ آئین پیدا کرے "/51۔ قرآن اور پیغمبر اعلیٰ ترین احکام و حاکم اعلیٰ ہیں جن کی پابندی ہر مسلمان پر لازم ہے۔

اقبال نے فلسفہ مغرب کا بہ کثرت مطالعہ کیا تھا۔ ان کی تحریرات ثابت کرتی ہیں کہ وہ قدیم اور جدید دونوں قسم کے فلسفیوں کے مرہون منت ہیں۔ وہ افلاطون کی تعلیمات کو اسلام کے مخالف قرار دیتے ہیں۔ افلاطون کے خیالات کا جو منافی اسلام ہیں مسلمانوں پر اثر پڑا۔ ارسطو کے خیالات کا دھارا زیادہ موافق سمت بہتا نظر آیا۔ لیکن وہ حد سے زیادہ مادہ پرست تھا اس لیے اس کو بھی پوری طرح قبول نہیں کیا گیا۔

ماڈرن لوگوں میں اقبال نے لیبنٹز (LEIBNITZ WARD) نیٹشا، برگساں، وارڈ (ward) اور دوسرے اصلاح شدہ مادیت کے ماننے والوں کو ترجیح دی۔ ان کا فلسفہ کس قدر ترمیم کے ساتھ ان لوگوں سے مستعار لیا گیا تھا مثلاً لیبنٹز نے وجود کی اکائی کا جو فلسفہ اپنایا تھا انھوں نے اسی کو خودی اور فرد اور ملت کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ اسی طرح نیٹشا کے فوق البشر کی تھیوری سے جو کامل و اکمل ہونے کا تصور رکھتی ہے اور برگساں کا فلسفہ ہے کہ علم حاصل کرنے کا ذریعہ باطنی شعور ہے یہ سب وہی ہیں جن کو اقبال نے معمول سے بلند ایک متصوفانہ اعمال خودی کے رنگ روپ میں پیش کیا ہے۔

گرچہ انھوں نے اپنے خیالات کی عمارت کی بنیاد قرآن کو قرار دیا ہے لیکن دراصل بات یہ ہے کہ ان تخیلات کا منبع زیادہ تر فلسفہ مغرب ہے انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ:-

(۱) قرآن ایک دین کامل کی تعلیم دیتا ہے جو انسان کی روحانی اور مادی دونوں زندگیوں

میں بالیقین ہدایت و رہنمائی کرتا ہے۔

(2) قرآن آخری الہام الٰہی ہے۔ اس میں تمام سابق انبیاء کی تعلیم شامل ہیں اور اب آئندہ الہام کا دروازہ بند ہو گیا۔

(3) اسلام کی تعلیمات تمام دیگر مذاہب کی تعلیمات سے افضل ہیں وہ عالمگیر، ابدی اور ناقابل ترمیم ہیں۔

(4) محمدؐ آخری پیغمبر ہیں۔

(5) قرآن اور پیغمبر نے جو روشنی دکھائی ہے صرف اس پر تمام بنی نوع انسان کو اغراض و مقاصد مقررہ کے حصول کے لیے بھروسہ کرنا چاہیئے۔

اقبال کو یقین تھا کہ انھوں نے اسلام کے متعلق تخیلات و تصورات میں انقلاب پیدا کر دیا ہے اور انھوں نے ایک گم کردہ راہ اور رنج رو دنیا کو صحیح پیغام پہنچا دیا ہے۔ اپنے بارے میں وہ کہتے ہیں۔

درجہاں خورشید نوزائیدہ ام	رسم و آئین فلک نادیدہ ام
نغمۂ من از جہان دیگر است	ایں جرس را کاروان دیگر است
ہیچ کس رازے کہ من گویم نگفت	ہم چوں فکر من در معنی نہ سفت
سر عیش جاوداں خواہی بیا	ہم زمیں ہم آسماں خواہی بیا

(میں دنیا میں ایک نوزائیدہ سورج ہوں۔ ایک نادیدہ جنت کا میں رسم و آئین ہوں۔ میرا نغمہ دوسری دنیا کا ہے اور میرا گھنٹا دوسری دنیا کے لیے بج رہا ہے۔

میں جو راز بیان کر رہا ہوں وہ کسی اور نے بیان نہیں کیے اور معنی کے موتی جس طرح میں نے پروئے ہیں کسی اور نے نہیں پروئے۔

اگر تم ابدی راحت کا راز جاننا چاہتے ہو تو آؤ۔ تم زمین چاہتے ہو تو آؤ اور آسمان چاہتے ہو تو آؤ) اس دعوی کو تسلیم کرنا اور اس کو لغوی معنی میں صحیح تسلیم کر لینا مشکل ہے اقبال فلسفی کم اور شاعر زیادہ تھے۔ ان کی شاعری میں۔ فلسفہ، مذہب، اخلاقی تخیلات بھرے ہوئے ہیں اور غالباً اردو شاعری کے اندر غیر مرئی تخیلات کے اظہار میں ان کی کوئی دوسری مثال نہیں ہے۔ لیکن ان کا فلسفہ ہوا میں ان کی شاعری کے پروں پر اڑتا ہے جس کی کشش تو بہت ہے لیکن یقین دلانے والا نہیں کینٹول اسمتھ (CANTWELL SMITH) جو اسلامی تصورات، تاریخ اور سیاست کا بہ نظر غائر مطالعہ

کرنے والا ہے۔ کہتا ہے کہ

"وہ ایک صوفی ہے جس نے تصوف پر حملہ کیا اور غالباً ایسا آزاد خیال ہے جس نے آزاد خیالی پر حملہ کیا۔ مجموعی طور پر ان کے اثرات کا جو تاریخی نتیجہ نکلا وہ یہ تھا کہ اس نے ہندستان نے مسلمانوں کے اندر آزاد خیالی کو کمزور کرنے کا انجام دیا اور اس کی جگہ ایک آزاد خیالی کی مخالف قومیت پرستی اور ایک ایسی کہربائی قوت کو جنم دیا جس کی تائید محض اعتذار سے کی جاسکتی ہے"[6]

اتنا اور کہا جاسکتا ہے کہ اگرچہ اقبال کے اندر شدت کا یہ احساس تھا کہ وہ ایک نئے پیغام کے پیامبر ہیں اور محمدؐ کی اصلی تعلیمات کو جدید رنگ میں پیش کر رہے ہیں، لیکن اس معاملہ میں ان کی جو خدمت تھی اس کے بارے میں ان کو پورا یقین نہ تھا۔ ایسے اوقات بھی آئے ہیں جب انھوں نے اعلان کیا کہ ان کا یہ کارنامہ ایسا ہے جس کی کوئی مثال اس سے قبل نہیں ملتی۔ لیکن دوسرے اوقات میں انھوں نے کتب مقدسہ کے احکام بعینہٖ قائم کر رکھنے کی تبلیغ کی۔ متقدم الذکر کی مثال حسب ذیل اشعار ہیں۔

خیز و پا بر جادۂ دیگر بنہ .... جوش سودائے کہن از سر بنہ (اسرار خودی)

تقلید سے ناکارہ نہ کر اپنی خودی کو ...... کر اس کی حفاظت کہ یہ گوہر ہے یگانہ (کلیات)

اس کے خلاف حسب ذیل اشعار میں اعلان کیا گیا ہے۔

اجتہاد اندر زمان انحطاط ...... قوم را برہم ہمی پیچد بساط (رموز بے خودی)

آخر ان کا پیغام تھا کیا؟ اقبال نے ماضی میں جھانک کر شان و شوکت کے مواد کا نظارہ کیا انھوں نے حال کے مسلمانوں کے سامنے ایک آئینہ رکھا جس میں وہ اپنے مدوخال کی خرابیوں اپنی کمزوریوں کو دیکھ سکتے تھے جو ان کے خیال میں اس موجودہ ذلت پر منتج ہوئے جو آج دنیائے اسلام کے مسلمانوں پر طاری ہے اور انھوں نے مستقبل پر نگاہ کر کے ایک حیات نو سے معمور اسلام کی شوکت کا نظارہ دکھلایا۔

بہرحال ان کی تاریخ دان کا اشتباہ اور ان کا پیغام کوئی نیا نہ تھا اسلامی دنیا میں تنبیہ کرنے والے وقتاً فوقتاً آتے رہے ہیں۔ انیسویں صدی میں جمال الدین افغانی اور ان کے شاگردوں نے

6- Cantwell Smith, W. Islam in Modern History. P.44, N.P.

مسلمانوں کو پکارا تھا کہ اپنا گھر درست کرلیں تاکہ مغرب نے جو چیلنج دیا ہے اس کا مقابلہ کر سکیں ہندستان میں شاہ ولی اللہ اور ان کے مکتبۂ فکر نے افغانی سے بھی پہلے اسی طرح کا پیغام دیا تھا۔

اقبال کی تعلیمات کا مواد کچھ مختلف نہ تھا۔ لیکن جس طرز ادا سے انھوں نے اس کو پیش کیا وہ ان کی انفرادیت ہے۔ انھوں نے اپنے خیالات کو فلسفیانہ مباحث کا لباس پہنا دیا جسے تعلیم یافتہ طبقہ سمجھ سکتا تھا اور انھوں نے ان خیالات کو عظیم الشان تخیلات اور مدہوش کن موسیقیت سے اپنی شاعری کے محاکات کو پوری طرح کام میں لاکر (جو ایک عجیب و غریب وسیلہ ان کے پاس تھا) بھر دیا۔

پیغام یہ تھا کہ فرد کو یاد دلایا گیا کہ اس کائنات کے نظام میں اس کا کتنا بلند مقصد ہے اور اس کا ایک ارفع مقام تقدیر سے طے ہے جو وہ اپنی رضا اور عزم سے حاصل کر سکتا ہے۔

ان کے فلسفہ کا مرکزی خیال جس پر انھوں نے کل عمارت تعمیر کی ہے وہ فرد کا تصور ہے وہ اس تصور تک علم کی تصوری سے پہنچے ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق علم کے دو پہلو ہیں ایک داخلی اور دوسرا خارجی۔ داخلی علم بالواسطہ تجربات کا نتیجہ نہیں ہوتا وہ حواس خمسہ کی بنیاد پر نہیں قائم ہے بلکہ ایک نادر چیز ہے۔ یہ فی الفور حاصل ہوتا ہے اس کا تجزیہ نہیں کیا جاسکتا اور نہ اسے الفاظ کے سانچے میں ڈھالا جاسکتا ہے یہ کل یا حقیقۃ الحقائق جیسا وہ ہے اس کا احساس و ادراک ہے یہ ایک صوفیانہ ادراک ہے۔

لیکن بہر حال اس میں کہ باقی طاقتیں ہیں اور یہ آگے بڑھنے والی چیز ہے۔ یہ ہر فرد کے باطن میں پوری قوت سے موجود رہے اور کبھی کبھی اس کی چمک دمک دماغ پر نمایاں ہوتی ہے لیکن جیسا کہ صوفیوں نے کہا اس کو حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اور پیغمبر کے تصور میں یہ اپنے کمال کو پہنچ جاتی ہے۔ ایک صوفی کی ریاضت سے اس کا باطن روشن ہو جاتا ہے اور اس کو اطمینان قلب حاصل ہوتا ہے۔ پیغمبر جو اس قدرت مدرکہ سے بھرپور بہرہ ور رہتا ہے۔ وہ الہام کی طاقتوں کے زور سے دنیا کو بدل دینے کی کوشش کرتا ہے۔

عام علم دوسری جانب احساس جسمانی سے متعلق ہے اور حواس خمسہ یا عقل کے ذریعہ پھلتا پھولتا ہے یہ حواس خمسہ سے محسوس ہونے والا شعور جسے عقل کا نام دیا جاتا ہے وہ دو حصوں میں منقسم ہے داخلی اور خارجی اور اس کی نشو و نما اس طرح ہوتی ہے کہ بیرونی دنیا سے استفادہ کر کے اس پر حاکمیت حاصل کی جائے لیکن انسان کا باطن جو اس کا اصل وجود ہے۔ وہ نیم

شعوری قوت مدارکہ کے احساس میں پیوست ہے اور وہ اس مظہری وجود خودی سے متعلق ہے جو زمان و مکان کی دنیا میں کار فرما ہے ۔ درحقیقت بلند و بالا ہستی اپنے متعلقہ ادراک سے جدا کوئی چیز نہیں ہے لیکن بلند و بالا ہستی حکم خداوندی سے رواں ہوتی ہے جسے "امر" کہا جاتا ہے ۔ اور اس کا مظہری رخ تخلیق الٰہی ہے جسے "خلق" کہتے ہیں ۔

انسان کی ہستی اگرچہ محدود ہے لیکن یہ ہستیاں بہت سی چیزوں کا مجموعہ ہیں جو باہم مل کر ایک باضابطہ نظام بنائے ہوئے ہیں ۔ ان میں بہت سے مناصب ہستی کے ہیں ۔ سب سے نچلا طبقہ جمادات کا ہے ۔ جس میں نہ زندگی ہے اور نہ دماغ ہے لیکن اس میں ارتقائی قوتیں مضمر ہیں ۔ مادہ کے ارتقا سے زندگی کا ظہور ہوتا ہے ۔ ترکاریاں اور اس کے بعد جانوروں کے مختلف اقسام آخر کار یہی جانور انسان بن جاتا ہے ۔ خدا کی ہستی سب سے بلند و بالا ہے ۔ اور وہ روح مطلق اور خود مختار ہے ۔ وہ لامحدود اور ابدی ہے ۔ اس کے لامحدود ہونے میں " یہ تخلیق اعمال کے امکانات پر قدرت کاملہ رکھنا بھی شامل ہے " لیکن یہ انسان ہے جو زمان و مکان کو اور دوسری صفات مثل تخلیق، علم حاضر و ناظر ہونے کی صلاحیت وغیرہ کو قادر مطلق اور اس کی مطلق تخلیقی قوتوں سے اخذ کرتا ہے وہ اول بھی ہے اور آخر بھی وہ حاضر بھی ہے اور ماورا سلا ادراک بھی ۔

محدود ہستی انسان کی خودی جو قوت کی پیداوار ہے وہ تخلیق کی سب سے بلند رکن ہے لیکن انسان کی وہ ہستی ہے جو نشوونما پاتی ہے اور ترقی کرتی رہتی ہے اور برابر اس امر کی جدوجہد میں رہتی ہے کہ وہ ان صفات کو حاصل کرے جو بدرجہ اکمل ذات الٰہی میں موجود ہیں ۔

اس طرح ہستیوں کے نظام میں خدا کے بعد انسان کا سب سے بڑا درجہ ہے اور تمام مخلوقات اس سے کمتر ہیں ۔ انسان ایک جامد ہستی نہیں بلکہ برابر ترقی کرنے والی ہستی ہے ۔ وہ اپنی آخری منزل کو اپنی ہی کوششوں سے پہنچ سکتا ہے ۔ اس کوشش کا مقصد اپنی خودی کو مضبوط و مربوط اور کامل بنانا ہے تاکہ اس کو اپنی طاقتوں کا ادراک پیدا ہو ۔ اور اپنے اعمال اور اپنی قوتوں سے " زندگی کا چشمہ سے سمندروں سے نکالے " خودی کی زندگی کہربائی قوتیں رکھتی ہے کیونکہ یہ جدید عزائم و مقاصد سے اور ان کو حاصل کرنے کی پرجوش اور محبت آمیز کوششوں سے نشوونما پاتی ہے ۔ کسی تخیل کی راہ یا کوئی عمل جو خودی کو کمزور کر دے اسے رد کر دینا چاہیئے ۔

اقبال نے غیر محدود ذات الٰہی اور محدود ذات انسان کا جو رشتہ اپنی رائے میں قائم کیا ہے اس کا مقابلہ ہندو نظریئے سے کیا جاسکتا ہے ۔ موخر الذکر خدا کے لیے پرماتما یعنی ہستی مطلق کا لفظ

استعمال کرتا ہے۔ اور انسان کے لیے جیو آتما یعنی ہستی فرد) کا اول لا محدود۔ ابدی واجب الوجود ہے اور دوسرا زمان و مکان سے محدود اور تخلیق شدہ ہے۔ اقبال نے خدا کے متعلق جو خیالات ظاہر کیے ہیں خواہ وہ اس کے مظہری رخ کے بارے میں ہوں یا ذاتی۔ وہ قرآن سے زیادہ ہندو دھرم کے عقیدے سے ملتے جلتے ہیں۔ قرآن نے جس خدا کی تعلیم دی ہے وہ اپنے دونوں رخوں میں یعنی رحمان ورحیم ہونے اور قادر مطلق اور حاکم اعلیٰ ہونے میں۔ انسان سے بہت بلند واقع ہے۔ وہ ناقابل تمثیل ہے۔ اس تک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ اور وہ دیر آشنا ہے۔

اقبال خدا کو ہندو فلسفہ کی طرح ایک دوست اور ساتھی کی حیثیت سے پیش کرتا ہے (مثلاً) دو نظموں شکوہ اور جواب شکوہ میں ایک بچے کی طرح خدا کی ناانصافیوں اور مسلمانوں کو نظر انداز کر دینے کی شکایت کی ہے۔ اور خدا نے مسلمانوں کو جواب دیا ہے کہ وہ اس کے احکام سے منحرف ہو گیے ہیں اور انسان خدا کا نائب یا خلیفہ ہے اور اس کی ترقی کا مقصد یہ ہے کہ خدا کا معاون بن جائے

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے ... خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے۔ (کلیات)

لیکن ان کی زندگی کا مقصد حصول طاقت ہے۔

زندگی کشت است و حاصل قوت است ... شرح رمز حق و باطل قوت است (اسرار خودی)

وحدت کی حفاظت نہیں بے قوت بازو ... ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات (کلیات ضرب کلیم)

ایک دوسری نظم میں یہ مقصود حسب ذیل الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے۔

یقیں محکم عمل پیہم، محبت فاتح عالم ... جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

قہاری، وغفاری، قدوسی وجبروت ... یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان (کلیات صفحہ 275)

ان خیالات نے انسان اور سماج کے عملی مسائل کے بارے میں اقبال کے خیالات کو متعین کیا۔

انسان کی اخلاقی منزل اپنے وجود، الغرض یا ہستی کو کمال تک پہنچانا ہے۔ اس لیے جو کچھ بھی اپنی ہستی کو متحد کرنے اس کو بڑھاوا دینے اور اسے طاقت پہنچانے میں مدد و معاون ہے وہ عمل صالح ہے اور جو بھی اس کے خلاف ہو یعنی اسے منتشر کرے یا اس میں نرمی یا کمزوری پیدا کرے وہ برائی ہے۔ کمال ہونے کے لیے جن راستوں سے چلنا پڑتا ہے مثلاً نیکی اور اوصاف الٰہیہ کو اپنے اندر پیدا کرنا اور اس کے شکل بن جانا۔ تعمیر خودی میں ہے خدائی (مرا اپنی ہستی کی تعمیر میں خدائی ہے)

خدا کی دو خاص صفتیں ہیں۔ جمال اور جلال۔ حسن اور حاکمیت۔ رحم اور مالکیت ان دونوں میں سے ایک پہلو محبت کا ہے اور دوسرا طاقت کا۔ محبت تخلیق کا اصول اور بقا کی قوت ہے۔

محبت انسان کو سماج کے کامل نظام میں پیوست کرتی ہے اور انسان کو خدا تک پہنچاتی ہے یعنی کاملیت تک لے جاتی ہے۔ ان تمام پر جو خدا نہیں ہے یعنی فطرت یا فرد۔ انسان یا جماعت کے اندر شیطنت کا مادہ ہے صرف حاصل کرنے کے لیے طاقت کی ضرورت ہے اس طرح جہاں اسلام ایک طرف روحانی ترقیات کے اعلیٰ ترین کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ دنیوی امور کو ترک نہیں کرتا۔ انسانی اعمال کا محرک عقل کو نہیں بلکہ محبت (عشق) کو ہونا چاہیئے۔

عقل در پیچاک اسباب و علل ..... عشق چوگان باز میدان عمل

عقل را سرمایہ از بیم و شک است ..... عشق را عزم و یقیں لاینفک است

(عقل سبب اور نتیجہ کی پیچیدہ رسی میں جکڑی ہوئی ہے اور عشق میدان عمل میں پولو کا کھیل کھیلتا ہے۔ عقل شک اور خوف سے معمور ہے لیکن عشق سے عزم و یقین جدا کیے ہی نہیں جا سکتے) صرف عشق ہی انسان کی ہستی کو صاحب عزم اور نورانی بنا سکتا ہے۔

نقطۂ نوری کہ نام او خودی است ..... زیر خاک ما شرار زندگی است

از محبت می شود پاینده تر ..... زنده تر، سوزنده تر، تابنده تر

(روشنی کے مرکز کا نام ہستی یا خودی ہے۔ یہ زمین کی ساخت میں زندگی کا شعلہ ہے زیادہ زندہ، زیادہ سوز رکھنے والی اور محبت سے زیادہ چمک دار بن جانے والی)

لیکن انسان زندگی کی راہ پر اکیلا نہیں چلتا ہے۔ فرد اور جماعت دونوں ایک دوسرے کے لیے آئینہ ہیں" ان کی مثال ایسی ہے جیسے زنجیر اور اس میں لگے ہوئے موتی یا مثل کہکشاں اور اس کے ستارے" فرد جماعت سے قدر و قیمت حاصل کرتا ہے اور جماعت فرد کے منظم ہونے سے بنتی ہے۔ انسان کا جسم اور اس کی روح۔ اس کا ظاہر اور اس کا باطن۔ اس میں نشو و نما پانے کی آرزو اور اپنے کردار کو ضابطہ کے اندر رکھنا۔ اس کی زبان اور اس کی روایات۔ ان سب کے لیے وہ جماعت کا رہین منت ہے۔ ہستی کی وحدت جماعت کی کثرت میں جڑ پکڑے ہوئے ہے اور ہستی کے اندر کثرت فرد کی تعمیر کرتی ہے ایک فرد تنہا رہ کر اغراض و مقاصد زندگی کو نہیں پا سکتا۔ جماعت اس کو ضوابط کا پابند کرتی اور آزاد بناتی ہے۔

زندگی کی کشمکش سے نپٹنے کے لیے افراد کا جماعت میں شامل ہونا ضروری ہے اور غرض یہ ہے کہ خودی کی توسیع ہو اور انسان کی امکانی قوت کا مظاہرہ ہو۔

فرد را ربط جماعت رحمت است ..... جوہر او را کمال از ملت است

لیکن خودی کی تکمیل صرف پیغمبر اسلام کی رہنمائی میں حاصل ہو سکتی ہے کیوں کہ "دنیا کی زندگی ان کے مذہب سے بندھی ہوئی ہے اور بلا ان کے آئین کے زندگی ناممکن ہے"

جماعت افراد کا ایک ایسا مجموعہ ہے جن سب کا مقصد ایک ہو۔ اس مقصد کے رنگ و روپ سے جماعت کی قدر و قیمت اور پائداری کا اندازہ کیا جائے گا۔ وہ مقصد یہ نہیں ہے کہ دوسروں پر غلبہ حاصل کیا جائے۔ یا دولت جمع کر کے شہوانی عیش و راحت کے لیے ادنیٰ جذبات کو بھڑکایا جائے۔ یا مادی یا نسلی یا قومی مفاد کو فروغ دیا جائے۔ جو جماعتیں ان اغراض کے لیے موجود ہیں وہ پائدار نہیں ہو سکتیں۔ کچھ دنوں ان کا فروغ رہ سکتا ہے۔ اور وہ بعض گروہوں کے لیے فوائد حاصل کر سکتی ہیں۔ لیکن وہ تصادم، مخالفت، مقابلوں اور جنگ کو جنم دیتی ہیں اور بنی نوع انسان کے امن و امان اور مرفہ الحالی کے لیے خطرہ ہیں۔

حیات تازہ لائی ساتھ اپنے لذتیں کیا کیا..... اقابت، خود فروشی، ناشکیبائی، ہوسناکی

(تہذیب جدید کتنی جدید، مزید ابطلتریں لائی ہے۔ اقابت، غرور، بے صبری اور ہوسناکی)

فساد قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب..... کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف

(یورپ کا کلچر دل اور دماغ کی گمراہی ہے۔ کیوں کہ اس تہذیب کی روح پاک نہ رہ سکی)

بیکاری و عریانی و میخواری و افلاس..... کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات

اس کے برخلاف اسلام کی تعلیم بالکل مختلف نوعیت کے اقدار پر مبنی ہے۔ مساوات، آزادی، انسان کی برادری، عورت کی عزت، مرد اور عورت کے کاموں میں فرق، غلامی کا استیصال۔ اسلام انسانی برادری کو مختلف قوموں (نیشن) میں بانٹنے کے خلاف ہے جو ایک دوسرے سے اس لیے در پیے جنگ رہتے ہیں کہ طاقت یا فریب سے ایک دوسرے پر غلبہ حاصل کر سکے۔

اسلام تمام بنی نوع انسان کے بھائی چارہ کا قائل ہے۔ یہ تسلیم نہیں کرتا کہ نسل، زبان، علاقہ یا اقتصادی مفادات کے بندھنوں سے انسان سماج کے اندر باندھا جائے۔ اصل بندھن عقائد اور مقاصد ہیں۔

بتان رنگ و بو کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا ..... نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

اب ما از ہند و روم و شام نیست ..... رز و بوم ما بجز اسلام نیست

(رنگ اور نسل کے بت کو توڑ دے اور اپنے کو ملت میں گم کر دے تاکہ تورانی ایرانی اور افغانی کا فرق باقی نہ رہے۔ میری پیدائش نہ تو ہند نہ ترکی نہ شام سے ہے۔ اس کا کوئی وطن اور کوئی علاقہ بجز اسلام کے

نہیں ہے۔

اسی اسلامی معاشرہ کا ولا ویز نظموں میں طویل تذکرے کیے ہیں جن میں اس کے ماضی کی شان و شوکت بیان کی ہے اور اس کی موجودہ زمانہ کی دردانگیز حالت پر رقت خیز مرثیہ پڑھا ہے۔ ان کے قول کے مطابق ابتدائی زمانے کے مسلمان فاتح عالم حکمران عالم پاسبان تھا اور دنیا کو تہذیب سے آراستہ کرنے والے تھے موجودہ دنیا ان کی شان و شوکت سے آراستہ کی گئی ہے اور ان کی خاک سے نشوونما پاتی ہے اگرچہ یہ صحیح ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے اپنی خوبیوں اپنے جوش و خروش اپنے یقین کو کھو دیا ہے لیکن پھر بھی اقبال مستقبل سے مایوس نہیں ہے ان کے قول کے مطابق طلوع ہوتے ہوئے سورج کی روشنی میں رات گریزاں ہو گی اور یہ باغ پھر نغمہ توحید (خدا کی وحدانیت) سے گونجے گا۔

انھوں نے یورپ کو للکار کر کہا کہ خدا کی زمین کے ساتھ دوکان کا سا برتاؤ نہ کریں۔ کیوں کہ یورپ جن اقدار کو بیش قیمت سمجھ رہا ہے وہ زرکم عیار ثابت ہو گا۔ یہ تہذیب اپنے ہی خنجر سے خودکشی کرے گی کیوں کہ جو آشیانہ شاخ نازک پر بنے گا وہ ناپائدار ہو گا۔

انھوں نے جس طرح اسلام کی مدح و ثنا اور دوسری تہذیبوں کی مذمت کی ہے اس کی ایک مثال" نازی" تحریک میں ملتی ہے جب وہ آرین قوم اور ان کے کلچر کے قصیدہ خواں تھے ایک نظم میں جو "اسپین" کے اندر مسجد قرطبہ کی زیارت کے بعد انھوں نے کہی ہے اس میں چیخ کر کہا ہے۔

اس کا مقام بلند اس کا خیال عظیم...... اس کا سرور اس کا شوق اس کا نیاز اس کا ناز

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ..... غالب و کار آفریں، کارکشا کارساز

(کلیات اقبال صفحہ 382)

(اس کا منصب بلند اس کا خیال عظیم ہے۔ اس کا نیاز ہی اس کی شان و شوکت ہے مومن بندے کے ہاتھ خدا کا ہاتھ ہے۔ غالب، کار آفریں اور کارکشا)

اقبال کو ترقی پسند (لبرل) کہا جائے یا قدامت پرست اس کا فیصلہ کرنا مشکل ہے وہ ایک مجدد تھے جن کا یقین یہ تھا کہ وہ اسلام جس کی تعلیم محمدؐ نے دی تھی اس میں موجودہ زمانہ کی ترقی پسندی کے تمام اقدار موجود ہیں۔ ان مسائل کو جس طرح اسلام نے سمجھا ہے وہ مغرب سے زیادہ نفیس اور جدت پسندانہ ہے اگرچہ مغرب نے کلچر میں بہت سے پہلوؤں سے

بڑی ترقی کی ہے۔ لیکن یہ سب ترقیات ان بنیادوں پر ہوئی ہیں جو مسلمانوں نے ڈالی تھیں مثلاً
علم طبیعیات اور علم الحیات۔ لیکن مغرب نے مذہب سے انکار کر دیا اس کی سماجی تنظیم اور
اس کے مادہ پرست نظریات اسے اپنے کو خود تہس نہس کرنے کی طرف لے جارہے ہیں صرف
ایک قسم کی جدت کی اجازت ہو سکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ مسلمان پھر اسی یقین کے جذبہ کو حاصل
کر لیں جن سے پیغمبر کے زمانہ کے اور ان کے بعد فوراً جو لوگ آتے ان کے زمانہ کے مسلمانوں کی
روحوں میں سرایت کیئے ہوئے تھا۔

اقبال کا سماجی فلسفہ صرف بظاہر آزاد خیالانہ (لبرل) ہے کیونکہ انھوں نے آزاد خیالی
بنیادی اصول کو نظر انداز اور رد کر دیا ہے۔ دماغ کی آزادی اور فرد کی مسلم الثبوت اسناد
مسائل کی غلامی سے آزادی خواہ وہ مذہبی ہوں یا سماجی یا ذہنی اور مذہب اخلاقیات اور
سیاست کے مسلمہ عقائد کو نکتہ چینی کر کے جانچنے کی آزادی اور سماج کو جمہوری نمائندہ اداروں
کے انسان کے بناتے ہوئے قوانین ہی کا پابند ہونا۔

اقبال مذہب پر نکتہ چینی کا یقین نہیں رکھتے تھے ان کے نزدیک اسلام ایک ایسا مذہب
تھا جو بہ ذریعہ الہام الہی نازل ہوا تھا اور عقلی بحث و مباحثہ سے ارفع اور مجید تھا۔

1927 کے قریب یہ شاعر فلسفی پبلک لائف (عوامی خدمت کی زندگی) میں داخل ہو گیا
تھا وہ پنجاب کی قانون ساز اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے 1930 میں انھوں نے سائمن کمیشن
کے سامنے شہادت دی اور مسلم لیگ کے الہ آباد سیشن کی صدارت کی۔ جہاں انھوں نے
فرقہ وارانہ مسائل کے حل کے لیے ہندستان کے شمال و مغرب میں ایک خود مختار مسلم علاقہ
کی تجویز پیش کی 32-1931 میں انھوں نے لندن میں دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت
کی۔ مسلم لیگ کی پالیسیوں کو ڈھالنے میں عملی حصہ لیا اور گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935
کے تحت جو انتخابات ہوئے۔ ان میں انھوں نے مسلم لیگ کی ایسی حمایت کی جو بڑا وزن
رکھتی تھی۔ اس سلسلہ میں ان کی سب سے بڑی کامیابی یہ تھی کہ انھوں نے جناح کو موڑ کر اس
راہ پر لگا دیا کہ ہند کے صوبوں کی از سر نو تقسیم فرقہ وارانہ بنیادوں پر ہونا چاہیے اقبال نے جو
خطوط جناح کو لکھے تھے۔ ان کے پیش لفظ میں جناح کہتے ہیں۔ "ان کے خیالات مجموعی طور پر میرے
خیالات سے مطابقت رکھتے تھے اور آخر کار ہندستان کو جن دستوری مسائل سے سامنا تھا ان
کا پوری طرح چھان بین اور ان کا مطالعہ کرنے کے بعد ان کی رہنمائی میں میں بھی اسی نتیجہ پر پہنچا۔

اور وقت گزرنے کے بعد یہی چیز عامتہ المسلمین کی متفقہ مرضی معلوم ہوئی۔ جیسا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے لاہور ریزولیوشن میں آخر کار ظاہر ہوئی۔ اور جسے عام طور پر پاکستان ریزولیوشن کہا جاتا ہے 23 مارچ 1940 کو پاس ہوا۔ 7/

1908 میں یورپ سے واپسی کے بعد اقبال کی شہرت مسلمانوں کے رہنما، فلسفی اور محب کی حیثیت سے برابر بڑھتی جا رہی تھی۔ اسرار خودی کی اشاعت نے ان کو نہایت مستحسن شاعر اسلام کی تسلیم کرا لیا۔ اس کا آر۔ اے نکلسن نے ترجمہ کیا اور 1920 میں یہ انگریزی میں شائع ہو گئی اور برطانیہ کے مفکرین مثل ایم۔ سی ٹیگھارٹ (MC TAGGART) اور ہربرٹ ریڈ (HERBERT-READ) نے اس پر موافق انداز میں تبصرہ کیا ان باتوں نے ان کی قوم میں ان کی عزت و عظمت کو بہت بڑھا دیا۔ 1922 میں ان کو جب "سر" کا خطاب ملا تو ان کی شہرت پر مہر تصدیق ثبت ہو گئی۔ اور ممتاز علماء و دانشور کی صف میں ان کے بلند مرتبے کو قایم کر دیا۔ اس سے مسلمانوں کے غرور کو بھی تسکین ملی کیونکہ ان کی قوم میں بھی ایک ایسا شاعر پیدا ہو گیا جو ٹیگور کا ہم پلہ تھا۔

اب وہ دونی طاقت سے بولنے لگے۔ انھوں نے قوم کو اس بات پر ملامت کرنا شروع کیا کہ اس نے ایک عذر گناہ مسکینی اور دفاع کا رویہ اختیار کر رکھا تھا اور ان کو قرآن کے صحیح معنی کے بارے میں۔ اور دنیا میں اسلام کی کیا اہمیت ہے ان موضوعات پر لکچر دیے۔ ان کی شاعری اور ان کے لکچر جو مدراس اور حیدرآباد میں دیے گیے تھے اور "تشکیل جدید افکار اسلام" کے نام سے طبع ہوئے ہیں وہ سب مل کر بگل کی پر شور آواز کے مشابہ تھے۔ ان چیز وں نے مل کر مسلم فرقہ نے ایک انقلاب پیدا کر کے انھیں اپنے حق پر جمے رہنے والے ایک جارحیت پسند اسلام کی جانب اکسایا جو اس بات پر یقین کامل رکھتا تھا کہ اسلام کو بحیثیت مذہب، فلسفہ یا سماجی۔ اقتصادی اور سیاسی نظام اولیت و فوقیت حاصل ہے۔

سیاسیات پر اقبال کا اثر تین طرح سے پڑا۔ اوّل یہ کہ انھوں نے جذباتیت پر بڑا زور دیا اور اسی قدر عقل کے اقتدار کی مذمت کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیاست میں صفائی کے ساتھ سوچنے کا مادہ مفلوج ہو گیا اور نامعقو لیت ابل پڑی جو جا کر تشدد پر منتج ہوئی۔ دوسرے

7- Letters of IQBAL to JINNAH, Published by Sheikh M. Ashraf Lahore 1943. forewards P. 4-5.

انھوں نے اسلام اور اسلامی تہذیب کے یگانہ روزگار ہونے پر اتنا زور دیا کہ انھوں نے
دوسرے فرقوں سے سیاسی سمجھوتہ تقریباً ناممکن بنا دیا۔ تیسرے انھوں نے جس طرح
مکمل طور پر دوسرے مسائل کو جو مقصدی مثل حب الوطنی تھے اور مادی مثل اقتصادیات
تھے نظر انداز کر کے تنہا مذہب کے معاملات پر زور دیا۔ اس نے تاریخی تجربے اور
سماجی بنیادوں کے بارے میں ان کے نظریات کو فاسد کر دیا۔ مذہبی نقطۂ نظر سے مسائل
کو جانچنے کے انداز نے موجودہ دنیا کے رجحانات کو صحیح طور پر سمجھنے میں رکاوٹ ڈالا۔
اور اس لیے مستقبل کی تصویر کو دھندلا کر دیا۔ ہندستان کی تقسیم کا ایک بڑا سبب ان
کے تخیلات اور خود ساختہ اصول موضوعہ کی ساخت ہے۔

انھوں نے احساس اور جذبات کو اتنا بلند اور ارفع درجہ دے دیا جس کے لیے
انھوں نے لفظ عشق استعمال کیا کہ ان کی تمام سیاسی اور فلسفیانہ تمام تصنیفات پر یہ
جلی حروف سے لکھا ہوا ہے سیکڑوں طریقوں اور بے شمار نظموں میں انھوں نے عشق کا
عقل سے مقابلہ کیا ہے جس میں عقل کی مذمت کی ہے۔ کچھ کا حوالہ اوپر دیا جا چکا ہے
ان کے مکتوبات سے وہ احساسات (یا عشق) پیدا ہوتے ہیں جو عقل سے بالاتر ہیں اس
لیے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ سماج کی بنیاد خالص عقائد پر ہونی چاہیے جو عقل سے ماورا
ہے۔ اقبال کہتے ہیں۔

عقل تجزیہ کرنے والی ہے اور عقل کی رہنمائی اس فرقہ کی زندگی کو پارہ پارہ کرنے
کا خطرہ پیدا کرتی ہے جو صرف مذہب کے دھاگوں سے آپس میں بندھی ہوئی ہے اور سماج
وحدت کی بنیاد عقیدہ ہے عقل سے نہیں فرقہ سے تعلق رکھتا ہے۔[8]

عقل کے بارے میں وہ کہتا ہے؛ غافل از خود شو اگر فرزانہ
(اگر تم عقلمند ہو تو عقل کی ذرا بھی پرواہ نہ کرو) کیونکہ

عشق کے ہیں معجزات سلطنت و فقر و دیں ...... عشق کے ادنیٰ غلام صاحب تاج و نگیں
عشق مکان و مکیں عشق زمان و زمیں ..... عشق سراپا یقین اور یقین فتح باب

---

8 - Banu Razia Farhat, Khubat-IQBAL (Urdu) Hali Publishing House, Kitab Ghar. (Delhi) P, 93.

(سلطنت، طمانیت قلب، اور مذہب سب عشق کے معجزے ہیں تاج اور انگشتری کے مالکان سب عشق کے ادنیٰ غلام ہیں) عشق ہی مکان ہے اور عشق ہی اس کا مکین عشق ہی وقت ہے اور زمین ہے عشق سراپا یقین ہے اور یقین فتح کا دروازہ کھولتا ہے۔

اسلام کی سوسائٹی اسی طرح مسلمانوں کے رہنے کی جگہ تھی جیسے انگلستان کا ملک انگریزوں کے رہنے کی جگہ اور جرمنی جرمنوں کے "مسلم سوسائٹی ایک ذہنی حقیقت تھی اور یہ کوئی چیز ذہن کے باہر نہیں تھی۔ لیکن یہ تو ہر سوسائٹی کے بارے میں صحیح ہے۔ •

لیکن انھوں نے یہ نظریہ قایم کیا کہ مسلم سوسائٹی اور دوسری سوسائٹیوں میں ایک بنیادی فرق ہے ہمارے معاشرہ کا بنیادی اصول نہ تو زبان کے ایک ہونے نہ ایک قبیلہ ہونے نہ اقتصادی ضروریات پر ہے بلکہ ہم سب ایک ایسی برادری کے فرد ہیں جسے پیغمبر (جن پر صلوٰۃ و سلام منجانب اللہ ہو) اس بنیاد پر قایم کیا تھا کہ تخلیق کا منظر واحد ہے اور ہم سب یکساں طور پر ان روایات کے وارث ہیں جو تاریخ نے ہم کو بخشی ہے۔ اسلام تمام مادی بندشوں کو نظر انداز کرتا ہے۔ اور اس کا سماجی نظام ایک ذہنی تخیل پر مبنی ہے جس کا جسم انسانوں کے اس مجموعہ سے بنتا ہے جو قدرتاً نشو و نما پانے اور وسعت اختیار کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں"/ 9

یہ بیان مبہم ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کے فلسفہ کی یہ ضد ہے جس میں مادی پہلو روح کا ایک لاینفک حصہ قرار دیا گیا ہے اور جس کا بنیادی خیال یہ ہے کہ زمان و مکان کی دنیا خودی کی تخلیقی حرکات کا ایک جزو ہے سوسائٹی کی تشکیل میں ایک ذہنی تخیل کو بیرونی دنیا سے الگ کر دینا تو ایسا نظر آتا ہے کہ افلاطون کے فلسفہ کے سامنے سپر ڈال دی گئی ہے جو تخیلات کی حقیقت اور مظاہرات کے غیر حقیقی ہونے پر یقین کی تعلیم دیتا ہے۔

تن و جاں را دو تا گفتن کلام است ...... تن و جاں را دو تا دیدن حرام است

(جسم اور روح کو دو کہنا بحث طلب ہے لیکن جسم اور جان کو دو دیکھنا حرام ہے) (زبور عجم صفحہ 216)

---

9 - IQBAL P. 90

ایک طرف تو وہ انسان کے اخلاقی اور مذہبی ضروریات انھیں کامی دوانی سمجھ کر زدر دنیا ہے دوسری جانب اقبال جسم کی ضروریات کو جو زمین اور اس کے فیض کے بغیر پوری نہیں ہو سکتی ہیں بالکل نظر انداز کر جاتا ہے سماج کا کوئی تخیل ،ہلذا اس کا کسی علاقہ سے ربط و تعلق ہونے کے ناممکن ہے کیوں کہ یہ ویسے ہی اہم اور ضروری ہے جیسے کہ اس کی انسانی بنیاد۔

اس کے علاوہ قوموں کے عروج وزوال کے بارے میں اقبال مذہبی پہلو کو جو اہمیت دیتے ہیں وہ ناقابل قبول ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ قطعی خلاف انصاف ہے مذہب سے کہیں زیادہ رشتہ داریوں اور اقتصادی ضروریات نے سوسائٹیوں کی تشکیل میں حصہ لیا ہے مثال کے طور پر تمام ابتدائی اور قدیم زمانہ کی حکومتیں قبیلوں کی بنیاد پر قایم تھیں یعنی عوام کا ایک گروہ ایک موروثی امراء کا جرگہ اور ایک با وقار شاہی خاندان ازمنہ وسطیٰ کی فرانس، جرمنی، انگلستان اور اسپین کی حکومتیں جو ٹیوٹن (جرمن) گوتھ اور دوسرے قبائل سے بنی تھیں جو یورپ کے مختلف حصوں میں رومن امپائر کے ٹوٹنے کے بعد بس گیے تھے۔ ان کے سیاسی طور پر متحد ہونے میں ان کا مذہب مسیحیت قبول کر لینا محض سطحی اثر رکھتا تھا بعض جنگجو اور حوصلہ مند بادشاہوں مثل شارلمین (SHARLEMANE) اوٹاس (OTTOS) اور فریڈرک (FREDRICK) کی کوششیں کہ رومن کیتھولک (قدامت پرست) گرجا کے نظام کو پائے مقدس کو استعمال کر کے اور اس کے ذریعہ سے تمام عیسائیوں کو متحد کر کے شہنشاہیتوں کو قایم کریں قطعی ناکام رہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ مذہب میں کوئی نقص تھا بلکہ وجہ یہ تھی کہ مضبوط اقتصادی طاقتوں نے نمودار ہو کر سوسائٹی کے جاگیر دارانہ نظام کو پارہ پارہ کر دیا تھا۔

ACHAEMENIDS (ایکانی) آرین قوم کے چھوٹے چھوٹے راجگان تھے جو ایران کے مغربی حصہ پر حکومت کرتے تھے۔ انھوں نے رفتہ رفتہ امتیاز حاصل کیا اور اپنی سلطنت کی توسیع کی جب وہ شہنشاہیت کے درجہ تک پہنچے تو انھوں نے زرتشت کا مذہب اختیار کر لیا نصف ہزار سالہ کے بعد ساسانیوں کے سامنے یہ مسئلہ درپیش تھا کہ مانی (MANI) یا زرتشت کا مذہب قبول کریں اس طرح ایران کی حکومت زرتشت کے مذہب یا اسلام کی پیداوار نہ تھی۔

تاریخ کے یہ قطعی خلاف ہے کہ اس نظریے کو قائم کیا جائے کہ سوسائٹیوں یا حکومتوں کی تنظیم میں مذہب مخصوص یا واحد بنیاد ہے۔ یہ دعویٰ بھی کہ یہ ایک دوسرے سے جوڑنے کی طاقت رکھتا ہے کمزور ہے۔ اسلام کی تاریخ مذہبی اور سیاسی دونوں پہلوؤں سے غور کرنے پر اس نظریے کے ناقابل قبول ہونے کی بہ کثرت شہادتیں پیش کرتی ہے اسلام کی تاریخ باہمی تنازعات اور جنگوں سے بھری ہوئی ہے۔ علوی بہ خلاف اموی خارجی بہ خلاف اموی شیعہ بہ خلاف سنی، فاطمی بہ خلاف عباسی غزنوی اور سلجوقی بہ خلاف خلافت بغداد سنی آل عثمان ترک بہ خلاف شیعہ صفوی، ہندوستان کے مغل بہ خلاف ازبک، وسط ایشیا و شیعہ سلاطین دکن ترک بہ خلاف عرب وغیرہ وغیرہ۔ حتیٰ کہ آج بھی یورپ کی شہنشاہیت اور اسرائیل کی جارحیت کوئی ذرا بھی نشان مسلمانوں میں یا عربوں میں اتحاد کا نہیں ملتا۔

جہاں تک مذہب کا تعلق ہے اقبال نے مسلم فرقوں کے باہمی اختلافات کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی ہے ان کا خیال یہ تھا کہ جو بھی اختلافات ہیں محض جزوی امور ہیں۔ اگرچہ ملا صاحبان ان معاملات میں غلو کرتے ہیں اور ایک دوسرے کی اس حد تک مذمت کرتے ہیں کہ کافر تک گردان دیتے ہیں لیکن یہ کوئی اہم بات نہیں ہے کیونکہ ہر فرقہ عقائد کی بنیادوں پر یقین رکھتا ہے۔ اور خیالات کے ربط و ترتیب سے جب نظریہ قائم کیا جائے تو یہ اختلاف ختم ہو جاتے ہیں۔ یہ رائے واقعات کے خلاف ہے کیونکہ ان اختلافات کی کوئی وجہ ہو ان اختلافات نے اکثر تشدد اور خون ریزی کو جنم دیا ہے۔ جیسا کہ خارجیوں معتزلیوں شیعوں شمالی افریقہ کے ادریسیوں سوڈان کے مہدیوں، لابیریا کے سنوسیوں، عرب کے وہابیوں اسماعیلیوں اور قریشیوں کے ایک دوسرے پر ظلم کرنے اور خون بہانے کے واقعات سے مثال کے طور پر ثابت ہوگا۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ مذہب ایک پیچیدہ معاملہ ہے یعنی ایک عقیدہ کا مسئلہ اس کا باطنی ادراک اور ظاہر ہیں اس کے اعمال بندھے ٹکے اصول اور احکام، رسم و رواج تہوار، ضابطے اور نظام اقبال نے کوشش کی کہ اسلام کو دو اصولوں سے مطابق کریں جو بدیہی ہیں۔ یعنی "(1) خدا ایک ہے اور (2) محمدؐ ان پاک اشخاص کی صف کے آخری شخص ہیں جو انسانوں کو صراط مستقیم بتلانے کے لیے وقتاً فوقتاً ہر ملک اور زمانہ میں ظہور پذیر ہوئے"

۱۵ ر اقبال کی یہ کوشش معاملات کو حد سے زیادہ سادہ بنا دینے کے مترادف ہے ان اصولوں اوران کے ساتھ ایمان، عبادت، انفرادی اور اجتماعی اعمال، روحانی اور دینوی احکام کے بارے میں بے شمار شرحیں شارحین کے نقطہ نظر سے اور اس زمانہ کے تقاضوں سے بھی میں وہ رہتے تھے پیدا ہوئیں۔

یہ ہیں وہ اسباب جن سے مذہبی فرقہ، عقائد، مکتبہ فکر، مقلد اور غیر مقلد اختلافات بدعات اور تفرقے ہر مذہب میں پیدا ہوئے ہیں۔ خواہ وہ ہندو مذہب ہو یا بدھ مذہب یا عیسائیت اسلام کے لیے بھی کوئی استثنا نہیں ہے اس معاملہ میں ایک مذہب کو دوسرے مذہب پر امتیاز دینا ناممکن ہے۔ کیونکہ سب بد اعمالیوں اور اختلافات اور فرقہ دارانہ تصادم کے شکار ہوئے ہیں۔ خاص وجہوں میں ایک وجہ ہے جس کی بنا پر جو مذہب بڑی زبردست طاقتوں کا مظہر ہے۔ وہ سوسائٹی کی تشکیل کی کوئی مستقل بنیاد نہ بن سکا۔

یہ بات کہ خود دنیائے اسلام میں برابر اس امر کی کوششیں ہوئیں کہ سیاست کو مذہب سے جدا رکھا جائے تاریخ سے ثابت ہے۔

عام طور پر یہ یقین کیا جاتا ہے کہ بنی امیہ کی خلافت کی بنیاد یہ تھی کہ عرب کو غیر عرب پر نسلی برتری حاصل ہے۔ بنی امیہ کے متعلق یہ شہرت ہے کہ وہ اسلام سے لاپرواہ تھے۔ ان ہی لوگوں کے سر یہ ذمہ داری ہے کہ انھوں نے خلیفہ کے مذہبی فرائض اسکے دینوی فرائض سے الگ کر دیا۔ امامت اور امارت۔ جو دونوں کے اتحاد کا بنیادی اسلامی نظریہ ہے اس کے انتہائی خلاف ہے۔

عباسیوں نے اس خلیج کو اور بھی وسیع کر دیا۔ صوفیوں اور علماء کا نمایاں ہونا جو صرف مذہبی امور اور اعمال تک اپنی حرکات وسکنات تک محدود رکھتے تھے۔ مذہب اور امور دینوی کے اتحاد کے قلعہ میں ایک شگاف تھا۔

مذہب اور امور دینوی کو الگ الگ کرنے کے معاملہ میں عباسیوں نے اس طرح اور اضافہ کر دیا جب کہ اسلام کی قدیم سادگی کو انھوں نے ترک کر دیا۔ اور ایران کے عظیم

---

10 - Shamloo Speaches and Statements of IQBAL (Lahore) P.117.

شہنشاہوں کی شان و شوکت کو اختیار کر لیا۔ ان کے رسم و رواج اور رہن سہن کے طریقوں کو اپنایا جس طرح وہ تکبر کے ساتھ عوام سے الگ رہتے تھے یہ بھی رہنے لگے۔ اور ان ہی کی طرح دربار شاہانہ کے آداب اختیار کر لیے انھوں نے حکومت کے اصول اور انتظامیہ کے ضوابط بازنطینیوں اور ساسانیوں سے سیکھے اس کے بعد کے عہد میں بہت سے وہ اعلیٰ مقاصد اور زندگی کے اصول جو محمدؐ نے اور ان کے فوراً بعد آنے والے خلفاء نے تعلیم دی تھی ترک کر دیے گیے۔

مسلم بادشاہوں اور سلطانوں نے اسلامی نظم و معاشرہ (ملت) کو توڑ کر ریزہ ریزہ کر دیا اور ملت کے تخیل کو گھٹا کر صرف روحانیت اور پرسنل لا اور مذہبی مراسم تک محدود کر دیا۔ انھوں نے شریعت کا نظام علما کے ہاتھ میں دے دیا اور امور سلطنت میں وہ مذہبی قوانین کے بجائے عقل پر مبنی احکام پر عمل کرنے لگے۔ مسلم سوسائٹیوں نے بھوسی تو رکھ لی لیکن مغز کو چلے جانے دیا۔ مساوات انسانی، عورت کا احترام غلاموں کی آزادی، غریبوں حاجتمندوں یتیموں بیواؤں کی امداد، خیرات سلطانی اقتدار اور بزور شمشیر تسخیر و توسیع ملک سے گریز ان سب کے تصورات گلدستہ طاق نسیاں ہو گیے عظیم الشان شہنشاہیتیں تعمیر کی گئیں۔ دولت طاقت عیش و عشرت کے پیچھے دوڑ شروع ہوئی فنون لطیفہ مثلاً پینٹنگ فن عمارت سازی، موسیقی ادب کی غذائے متروک قرار دیے گیے۔ تلوار کی امارت ناز و نعمت میں پال کر بگاڑ دی گئی۔ قدامت پرست علما اور درباری مصنفین کی ہمت افزائی کی گئی فوجی قوت پر بھروسہ نے اخلاقی قدروں کو پامال کر دیا اور اسے بھی مٹا دیا کہ سلطانی دراثتہ قایم رہے اور عوام کی رضامندی قیادت کی بنیاد ہو۔

ان باتوں کے ابھرنے سے مسلم حکومتوں کی بنیادیں ہل گئیں اور انھیں نے مغرب کی مداخلت کا دروازہ کھولا۔ مسلم حکومتیں مغرب کے اقتدار میں آگئیں اور جب مغرب کو سیاسی اقتدار حاصل ہو گیا تو اس نے کلچر کے اندر بھی اپنا عمل دخل جمایا۔ مذہب اور حکومت دونوں خطرے سے دوچار ہوئے اس کے بعد ردعمل شروع ہوا جمال الدین افغانی، محمد عبدہٗ، رشید رضا اور سید احمد خاں جیسے لوگوں نے خطرے کا احساس کیا لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ وہ اس طاقت کی صحیح نوعیت کا اندازہ نہ کر سکے جو دنیائے اسلام کو نئے سانچے میں ڈھال دیتی۔

اقوام مسلم کو جس بات کا سامنا تھا وہ یہ نہیں تھا کہ مذہب کا احیاء جدید کیا جائے
بلکہ ضرورت ایک انتہا پسندانہ تبدیلی کی تھی یعنی چاہئے یہ تھا کہ قدامت پرستی کی جگہ علوم
جدیدہ کی روشنی میں راہ بنائی جاتی۔ پرانے جامد روایتی طریقوں کو ترک کر کے ترقی پسندی
کو اختیار کیا جاتا اور مستند احکام مندرجہ کتب مقدسہ کی جگہ خود ساختہ سیکولر قوانین کی
اطاعت واجب کی جاتی۔ عالمگیریت کی جگہ نیشنلزم کو اختیار کیا جاتا اور مقدرات کو کودانہ
جان لینے کے بجائے۔ عقلیت کو فروغ دیا جاتا۔ اسلامی مفکرین کے دماغ میں یہ کشمکش پورے
انیسویں صدی میں جاری وساری رہی لیکن بیسویں صدی میں جدت پسندی نے عمل کے
نقطہ نظر ڈالنے کی وجہ سے غلبہ حاصل کرنا شروع کیا اور اب ریشنلزم (عقلیت) نیشنلزم
(قومیت پسندی) کا یقینی طور پر جم جانا نظر آ رہا ہے ہر مسلم ملک اپنے طرز کی اپنی سوسائٹی بنا
رہی ہے۔ خود اپنا نظام سلطنت قایم کر رہی ہے اپنے قوانین وضع کر رہی ہے جو اس کی
اس اقتصادیات کی بنیاد پر بنائے جاتے ہیں جو اس کے وسائل اور مواقع کے مطابق
اسے حاصل ہے۔ اور خود اپنا کلچر تعمیر کر رہا ہے ہر ایک اپنی انفرادیت اور دوسروں سے
تفریق کا ادراک کر رہا ہے۔

اقبال جن سے امید تھی کہ وہ اس معاملہ کو زیادہ سمجھیں گے سادہ لوحی سے یہ تصور
کر بیٹھے کہ مذہب ہی وہ مخصوص بلکہ اصل عنصر ہے جو قوموں کے عروج وزوال کو لاتا
ہے اور سماجی تنظیموں میں انقلاب بپا کرتا ہے۔ انھوں نے مادی اور اقتصادی عناصر کو
قطعاً نظر انداز کر دیا اور سماجی اور سیاسی شعور کی نشوونما ان کے طاقتور اور اکسانے والے
اثرات سے وہ ناواقف نظر آتے ہیں۔

انھوں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ کل ہندوستان کے بنیادی مسائل ہندو اور مسلمان
دونوں کے ایک تھے یعنی بھوک، افلاس، بیماری، جہالت اور یہ کہ ان کا حل مذہبی نظام
سے ممکن نہ تھا بلکہ ان کا علاج صرف سیاسی تحریک تھی انھوں نے اس کا بھی اندازہ
نہیں۔ آزادی اور ذمہ دار اور اقتدار اعلیٰ کی مالک سیاسی نظام کا مطالبہ صرف
ہندستان کی بنیادی ضروریات کو پورا کرنے کی غرض سے تھا۔ ان ضروریات کو پوری کرنے
کے لیے جو کارروائیاں کی جا رہی تھیں ان کا تقاضہ یہ تھا کہ مختلف فرقوں میں سے کسی کے
ساتھ امتیاز نہ برتا جائے اقتصادی معاملات میں جن کا تعلق قومی مفاد سے ہے فرقوں

کے اندر امتیاز برتنا بدیہی طور پر ناممکن ہے۔

بد قسمتی سے اقبال جو اپنی تربیت اور تعلیم دونوں لحاظ سے متوسط طبقہ کے تخیلات اور تعصبات میں گندھے ہوئے تھے وہ عوام الناس کی ضروریات کی کسی قسم کی جان کاری نہ رکھتے تھے ان کی پوری توجہ متوسط طبقہ کے مسلمانوں پر مرکوز رہی جن کی تعداد اور جن کا اثر بیسویں صدی میں روز افزوں ترقی پر تھا یہ بات ان کی نظموں اور ان کی تقریروں سے پوری طرح واضح ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال نے اپنی نظموں میں مزدوروں اور کسانوں کو سراہا ہے لیکن ان کے کل خیالات کا رخ اونچے طبقہ کے مسلمانوں کی جانب ہے ان کی اردو شاعری کی زبان سے اس کے پاکیزہ اور مرصع خزانہ الفاظ اس کے شاندار تلمیحات اور اور استعارے علمی حوالے اور ارفع طرز ادا سے ایک سہل کوش اور سوفسطائی زندگی کی تیز خوشبو آتی ہے انھوں نے مذہبی زندگی کے لیے جو زوردار وعظ و پند پیش کیے ہیں ان سب کے مخاطب مغربی تعلیم کے تعلیم یافتہ نوجوان تھے وہ جو بار بار جنگ جویانہ معرکوں اور فتوحات عسکری خوبیوں اور مسلسل منصوبے کو یاد دلاتے رہتے ہیں ان کا کوئی تعلق غریب اور کچلے ہوئے طبقہ سے نہ تھا انھوں نے اردو زبان کو جو ہندستان کے مسلمانوں کے ایک بااثر حلقہ کی زبان ہے کہ بدلہ میں فارسی زبان کو اختیار کرنا ایک واضح ثبوت اس بات کا تھا کہ ان کا رجحان شہری متوسط طبقہ کی طرف ہو گیا تھا۔ وہ سیاسی مسائل جن کو انھوں نے پیش کیا اور ان کے حل کا جو طریقہ تجویز کیا ان دونوں کا پلہ متوسط طبقہ کی جانب بہت بھاری تھا۔

لیکن یہ امر مشتبہ ہے کہ جب انھوں نے الہ باد مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ دسمبر 1930 میں پیش کی تو وہ واقعی ہندستان کی تعلیم اور ایک بااقتدار مسلم ریاست کے قیام کا خیال رکھتے تھے۔

ہندستان کے مختلف فرقوں میں اتحاد اور تعاون کا جو فقدان ہے اس کا تجزیہ کرتے ہوئے انھوں نے بورژوا (متوسط شہری طبقہ) کے مفاد کو اہمیت دی ہے۔

"غالباً ہم ایک دوسرے کی نیتوں پر شک کرتے ہیں اور اندر اندر ہم دوسرے پر غالب آنے کو سوچ رہے ہیں۔ غالباً باہمی تعاون کا خیال ہمارے اندر اتنا مضبوط نہیں ہے

کہ ہم ان اجارہ داریوں کو ترک کر دیں جو حالات نے ہمارے ہاتھ میں دے دی ہیں اور ہم غالباً اپنی خود پسندی قومیت کے لبادے کے نیچے چھپانا چاہتے ہیں۔ حالانکہ اوپر سے ہم کشادہ قلب اور حب الوطنی کا دعوی کرتے ہیں لیکن اندر سے ہم اسی طرح تنگ نظر ہیں جس طرح ایک ذات یا ایک قبیلہ۔ غالباً ہم اس بات کو تسلیم کرنے پر راضی نہیں ہیں کہ ہر فرقہ کا یہ حق ہے کہ وہ اپنے ثقافتی روایات کے مطابق آزادی کے ساتھ پھلے پھولے۔"

شک اور خوف کی ان باتوں کو دور کرنے کے لیے انھوں نے اپنی اسکیم پیش کی قطعی طور پر یہ اسکیم ہندوستان کو دو آزاد خود مختار با اقتدار سلطنتوں میں تقسیم کرنے کی نہ تھی۔ یہ تو صرف ایک پلان علاقوں کی از سر نو تشکیل کا تھا۔ ملک کا وہ حصہ جہاں مسلمان کثرت سے آباد تھے کو بقیہ حصہ سے الگ کر دیا جاتے۔ ان کو امید تھی کہ اگر ان کا پلان پنجاب، صوبہ شمالی و مغربی، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک اندرونی طرز پر خود مختار ریاست قایم کر دی جاتی تو اس سے ہندوستان کا مسئلہ حل ہو جاتا" یہ ان کے (یعنی۔ مسلمانوں کے) احساس ذمہ داری کو بڑھا دے گا۔ اور ان کے حب الوطنی کے جذبات میں گہرائی پیدا کرے گا۔ اس طرح ہندستان کے سیاسی سماج میں اپنی ترقی کے مکمل مواقع پانے کے بعد شمالی مغرب کے مسلمان بیرونی حملوں کے خلاف خواہ وہ حملے تصورات کے ہوں یا سنگینیوں کے ہندستان کے بہترین پاسبان ثابت ہوں گے" [1]

ان کا مقصد یہ تھا کہ" ایک ہم آہنگ اور ہمساز قوم کی تعمیر کریں"

یہاں پر کوئی تذکرہ دو قوم کی تھیوری کا یا ہندو اور مسلمانوں کے نا قابل اصلاح اختلافات کا نہیں ہے ان کے اختلافات کا تجزیہ کر کے اس کی ابتدا یوں بتلائی کہ یہ ان کی سطحی اور سیکولر وجوہات سے پیدا ہوتے جیسے کہ ایک دوسرے کی نیتوں کے بارے میں غلط فہمی مغلوب ہونے کا خوف تعصب اور حقوق سے حسد۔

انھوں نے جو پلان پیش کیا وہ ان کی محبوب تھیوری کا مکمل رد ہے

ہے ترک وطن سنت محبوب الہی ... دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی۔

(وطنیت) کو ترک کرنے کے بعد ہی اللہ کی محبوب سوسائٹی عالم وجود میں آتی ہے

1- Ibid. P. 13.

تو بھی پیغمبر کے پیام کی صداقت کی گواہی دے)
مارچ 1932 میں انھوں نے لاہور کی صدارتی تقریر میں تو شمال و مغرب میں
ایک اندرونی آزاد مسلم ریاست کی اسکیم کو بھی پیش نہیں کیا۔ جو بھی ان کے خیالات
تھے ان کو حسب ذیل بیان میں واضح کیا ہے

"یہ ظاہر ہے کہ کوئی فرقہ وارانہ مصالحت خواہ وہ وقتی ہو یا مستقل اس وقت
مسلمانوں کو مطمئن نہیں کر سکتی جب تک کہ وہ بطور اساس یہ تسلیم نہ کرے کہ مسلم
فرقہ کو ان صوبوں میں جہاں ان کی واقعی اکثریت ہے وہاں ان کو اکثریت کے حقوق حاصل
ہوں گے۔ اس میں شک نہیں کہ اس بات کی یقین دہانی کی گئی ہے کہ جداگانہ انتخابات
قایم رہیں گے اور صوبہ سرحد کا منصب تسلیم کر لیا گیا ہے لیکن ان کے علاوہ مکمل
صوبائی آزادی پارلیمنٹ سے ہندستان کے صوبوں کو اقتدار اعلیٰ کا منتقل ہونا وفاق
کی اکائیوں میں مساوات، رعایا کو فیڈرل سنٹرل اور پراونشیل میں بانٹنے کے بجائے صرف
فیڈرل اور صوبوں میں بانٹنا، پنجاب اور بنگال میں اکثریتی حقوق سندھ کو بلا شرط
ایک علیحدہ صوبہ بنانا مرکز میں ایک تہائی حصہ، یہ ہیں ہمارے مطابات /12

ان مطالبات کا ہرگز یہ منشا نہیں ہو سکتا ہے کہ ملک کو دو الگ ریاستوں میں
بانٹ دیا جائے۔ اقبال نے جو مطالبات پیش کیے ان کو جائز قرار دینے کا سبب مذہبی
اختلافات نہ تھے بلکہ خوف اور غصہ" /13

یہ تجویز کرنے کا ارادہ نہیں ہے کہ اگر اقبال 1940 میں زندہ رہے ہوتے جب
مسلم لیگ نے پاکستان کا ریزولیوشن پاس کیا تو وہ اس کو اپنی برکتیں نہ دیتے مطلب
صرف اتنا ہے کہ اپنی موت کے وقت تک جو 1938 میں واقع ہوئی اقبال نے اپنے آپ کو
پاکستان کے نقطۂ نظر سے وابستہ نہیں کیا تھا لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ان کی شاعری
فلسفیانہ تحریرات اور ان پبلک بیانات سے مسلمانوں کی علیحدگی پسندی کے تخیل کی زبردست
حمایت ہوئی انھوں نے مسلمانوں کے جس مزاج کی پرورش کی اس نے صلح کو اگر ناممکن نہیں

---

12 - Ibid, P.44
13 - Ibid, P.45.

تو مشکل ضرور بنا دیا۔

دیوبند کا مدرسہ

دیوبند کے مدرسہ کا ان علماء کے ذریعہ قایم ہونا جنھوں نے 1857ء کی بغاوت میں حصہ لیا تھا اس سے پہلے باب میں بیان کیا جا چکا ہے۔ اس مدرسہ کے دو اغراض تھے (1) مسلمانوں میں قرآن اور حدیث کی اصل تعلیمات کی تبلیغ و اشاعت کرنا اور (2) ہندستان کے بیرونی حکمرانوں کے خلاف جذبہ جہاد کو زندہ رکھنا۔

ان لوگوں نے اندازہ کر لیا تھا کہ ہندستان کی آزادی نہ صرف ہندستان کے حق میں ضروری ہے بلکہ تمام دنیا کے مسلمانوں کے حق میں بھی ضروری ہے اور ان کی نگاہ اس معاملہ میں بالکل صاف تھی کہ ہندستان کی آزادی بلا ہندو مسلم اتحاد اور دونوں کے تعاون کے حاصل نہیں ہو سکتی۔

ان لوگوں نے انڈین نیشنل کانگرس کے قیام کا خیر مقدم کیا تھا اور جب 1888ء میں سر سید احمد خاں نے اپنے برطانوی اتالیق کے اثر میں آکر مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا کہ کانگرس کی شرکت سے گریز کریں تو علماء دیوبند نے سر سید کے رویہ کی مذمت کی اور ایک مذہبی حکم (فتویٰ) سر سید کی تنظیم انجمن محبان وطن (PATRIOTIC ASSOCIATION) کے خلاف اور اسی کے ساتھ محمڈن اینگلو اورنٹیل ایسوسی ایشن کے خلاف جس کے سکریٹری اور روح رواں علی گڑھ کالج کے پرنسپل بیک (BACK) تھے صادر کیا۔ سر سید کی یہ کوشش کہ وہ اپنی اسکیم میں علماء کا تعاون حاصل کریں۔ علماء دیوبند نے رد کر دی کیونکہ دونوں کے سیاسی نظریات ایک دوسرے سے بہت زیادہ مختلف تھے۔

انیسویں صدی کے آخر تک دیوبند پنپ نہ سکا۔ کیونکہ حکومت اس پر ایک سخت نگاہ رکھتی تھی۔ یہ اپنے وجود کو نہایت مشکل حالات میں کسی طرح گھسیٹتا رہا سب سے بڑی پریشانی سرمایہ کی تھی کیوں کہ وہ لوگ جو امداد کر سکتے تھے وہ موجودہ حکمرانوں سے خوف زدہ تھے۔ لیکن پھر بھی یہ مدرسہ عزم و ہمت کے ساتھ اپنے اصولوں پر اڑا رہا اور اپنے طے شدہ راہ پر چلنے میں اس کے پائے استقلال کو کبھی لغزش نہیں ہوئی۔

شروع شروع میں جو طلباء اس میں داخل ہوئے ان میں ایک محمود الحسن بھی تھے

وہ تمام عمر اس ادارے میں رہے اولاً طالب علم کی حیثیت سے پھر ایک معلم کی حیثیت اور آخر میں اس کے پرنسپل (مہتمم) کی حیثیت سے۔

1858ء میں پیدا ہوئے اور 1857ء میں جب بغاوت کا آغاز ہوا تو وہ اپنے والد کے ساتھ میرٹھ میں تھے گھر میں انھوں نے باغیوں کے بہادرانہ کارناموں کو سنا اور برطانوی مظالم کی بربریت آمیز داستانیں بھی سنیں انھوں نے اپنی آنکھ سے شمالی ہندوستان کا اعلیٰ طبقہ کے مسلمانوں کی وسیع پیمانہ پر بربادی دیکھی اور ان کی روح میں شگاف ہو گیا۔

دیوبند کے مدرسہ میں پندرہ سال کی عمر میں داخل ہوئے اور اپنی تعلیم ختم کرنے کے بعد وہیں معلم ہو گیے۔ 76-1875ء میں انھوں نے محمد قاسم نانوتوی اور رشید احمد گنگوہی جیسے فاضل اجل اور سرتاپا شفقت استادوں سے تعلیم حاصل کی تھی اور انھیں لوگوں کے فیض سے ان کے اندر علم گہری پاکیزگی اور آزادی سے محبت پیدا ہوئی۔

88-1887ء میں ان کو اس ادارے کے سربراہ ہونے کا ارفع درجہ حاصل ہوا اپنی زندگی کے اوائل ہی میں انھوں نے اپنے مشن (مقصد زندگی) کا فیصلہ کر لیا تھا جس کے لیے اپنی زندگی کے آخری دن تک وہ جدوجہد کرتے رہے۔ ان کا مشن ہندوستان کو آزاد کرانا تھا 1905ء میں انھوں نے اپنے پلان کی عملی نشوونما شروع کی اور دو محاذوں پر اپنا کام شروع کیا۔ ایک ملک کے اندر اور دوسرا ملک کے باہر۔ دونوں کو ایک ساتھ اور ایک وقت میں مسلح بغاوت کے لیے کھڑا ہونا اور انگریزوں کو ہندوستان سے باہر کھدیر دینا تھا

ہندوستان میں ان کے مشن کا ہیڈ کوارٹر دیوبند تھا اور اس کی شاخیں، دلی، دیناج پور، امروٹ، کراچی، کھیڈا اور چکوال میں تھیں۔ بیرون ہند یاغستان جو شمالی مغربی سرحد پر ایک چھوٹی سی ریاست تھی کارروائیوں کا مرکز قرار دی گئی۔ سید احمد شہید اور مولوی عنایت علی اور شرافت علی کے پیرو جو اب تک انگریزوں کے خلاف جہاد جاری رکھے ہوئے تھے انھوں نے مرکزی فوجی انتظام مہیا کیا اور حاجی ترنگ زئی ان کے لیڈر مقرر کیے گیے قریب رہنے والے قبیلوں اور ہندوستان سے آدمیوں اور رضاکاروں کی شرکت کی توقع تھی۔ یہ بھی امید تھی کہ افغانستانی حمایت کریں گے۔

اس مسلح بغاوت کی تنظیم صرف مسلمانوں کا مسئلہ قرار دے کر نہیں کی گئی تھی۔ پنجاب سکھوں اور بنگال سے انقلابی پارٹی کے ممبران کو تعاون کی دعوت دی گئی تھی۔ دیوبند

میں محمود الحسن کی جائے رہائش کے قریب ایک مکان ان لوگوں کے رہنے کے لیے کرایہ پر لیا گیا تھا۔ یہ کل تیاریاں خفیہ طریقہ پر کی گئیں تھیں عبید اللہ سندھی جنھوں نے مذہب سکھ کو ترک کر کے اسلام قبول کر لیا تھا۔ دیوبند میں کام کرتے تھے اور جمیعتہ الانصاری کی تنظیم انھوں نے قایم کی بعدہٗ وہ دلی چلے گیے۔ جہاں مدرسہ نظارۃ المعارف حکیم اجمل خاں اور وقار الملک علی گڑھ کی سرپرستی میں کھولا گیا۔

۱۹۱۱ء مسلمانوں کی تاریخ میں ایک نازک وقت تھا۔ تقسیم بنگال پر نظر ثانی کر دی گئی تھی۔ ہندستان کا دار السلطنت کلکتہ سے دلی کر دیا گیا تھا۔ عیسائی صوبوں نے حکومت آل عثمان کے خلاف جنگ بلقان چھیڑ دی تھی۔ اس کے بعد فوراً پہلی جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ جس میں ترکی، جرمنی اور ان کے حلیفوں کے ساتھ برطانیہ اور ان کے اتحادیوں سے برسرِ جنگ ہوا۔ سنکیانگ (SINKING) کے سرحدی صوبہ نے برطانیہ کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔

محمود الحسن ان واقعات سے انتہائی مشتعل ہوئے اور انھوں نے سوچا کہ وقت آگیا ہے کہ برطانیہ کے خلاف مسلح کارروائی کی جائے ایک پلان بنایا گیا اور ریشمی رومالوں پر لکھے ہوئے خطوط پلان کے تمام شرکا کو جاری کیے گیے عبید اللہ کو افغانستان روانہ کیا گیا۔ اور خود سرحد پر جانے کا انھوں نے منصوبہ بنایا۔ اسکیم کی بدقسمتی یہ تھی کہ حبیب اللہ کو اس کی تائید پر آمادہ نہ کیا جا سکا بلکہ اس کے برخلاف وہ گورنمنٹ آف انڈیا کو ہندستان کے انقلابیوں کی حرکات وسکنات سے برابر اطلاع دیتے رہے۔ اور اسی طرح اس جرمن مشن کے بارے میں خبریں پہنچاتے رہے جو کابل اس غرض سے آیا تھا کہ مرکزی طاقتوں کی موافقت میں ان کی مداخلت حاصل کریں راجہ مہندر پرتاپ اور برکت اللہ اس مشن کے ممبر تھے۔ جرمن مشن کی واپسی کے بعد یہ دونوں افغانستان میں رہ گیے تاکہ ہندستان کی آزادی کے لیے اپنی کوششوں کو جاری رکھیں۔

اس موقع پر محمود الحسن کو معلوم ہوا کہ گورنمنٹ آف انڈیا نے ان کو گرفتار کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ڈاکٹر ایم۔ اے انصاری (دہلی) کی مدرسے سے انھوں نے بعجلت تمام ہندستان کو خیرباد کہا اور مکہ چلے گیے اور گرفتاری سے بچ نکلے یہ واقعہ 1916 کا ہے۔

مکہ پہنچنے پر وہ غالب پاشا سے ملے۔ جو اس وقت حجاز کے گورنر تھے اور ان کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ ایک خط لکھ کر دیں جس میں یہ وعدہ کریں کے برطانیہ کے خلاف ہندستان کی بغاوت کی پوری ہمدردی اور مکمل تائید کریں گے۔ یہ خط خفیہ ذرائع سے ہندستان لایا گیا اور اس کی نقلیں تقسیم کی گئیں۔

جب کچھ زمانہ کے بعد انور پاشا سلطنت ترکیہ کے وزیر دماغ اور جمال پاشا جو جنوبی افواج کے کمانڈر تھے مکہ آئے تو ان سے انھوں نے گذارش کی کہ ہندستان کی سرحد تک ان کے سفر کا بندوبست کر دیا جائے اور قسطنطنیہ جانے کی بھی تجویز پیش کی لیکن بدقسمتی کو کیا کہیئے کہ مکہ کے شریف حسین نے انگریزوں کے ترغیب دینے پر حکومت آل عثمان کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ محمود الحسن معہ حسین احمد مدنی اور دو اور ساتھیوں کے برطانیہ کے حوالے کر دیے گیے۔ اور برطانیہ نے ان کو جلاوطن کر کے مالٹا بھیج دیا جہاں وہ قیدی کی حیثیت سے رکھے گیے۔/ 14

لڑائی ختم ہونے کے بعد وہ اور ان کے ساتھی بمبئی لے جاتے گیے اور جنوری 1920 رہا کر دیے گیے۔ جہاز سے اترتے ہی وہ فوراً خلافت کمیٹی کے دفتر گیے اور باوجود اپنی بیماری اور کبرسنی کے پورے اخلاص اور دل گردے سے ہوتا ہے اپنے آپکو تحریک میں ڈال دیا وہ علی گڑھ گیے اور یونیورسٹی کے اسٹاف اور طلباء سے اپیل کی کہ ان اداروں کا بائیکاٹ کریں جو گورنمنٹ سے امداد لیتے ہیں اور جدید نیشنل یونیورسٹی (جامعہ ملیہ اسلامیہ) میں جسے قایم کرنے میں انھوں نے مدد دی تھی شامل ہو جائیں۔

انھوں نے جمعیتہ علماء ہند کی دلی کی کانفرنس کی صدارت کی اور 21 نومبر ۱۹۲۰ء کو اپنے افتتاحی خطبہ میں سیاسیات ہند پر اپنے سیاسی عقائد کا اظہار کیا انھوں

---

14 - The account is based upon Husain Ahmad Madni's Autobi-ography (NAQSHI HAYAT) published in 1953. In his earlier book, Safarnama-i Shaikh-ul-Hind written in 1922, these facts were either omitted or denied, because the conditions did not permit their revelation

نے مسلمانوں کے مذہبی پیشواؤں سے اپیل کی کہ وہ مقامات مقدسہ پر مسلم اقتدار کے قیام کے لیے اور ہندستان کو جابرانہ حکومت کی غلامی سے نجات دلانے کے لیے برابر جنگ کرتے رہیں انھوں نے مختلف فرقوں کے مابین اتحاد و اتفاق اور سماجی میل کو مضبوط کرنے کے لیے حسب ذیل الفاظ میں نصیحت کی ا۔

"آپ لوگ خوب سمجھ لیجیے کہ اگر اس کے خلاف حالات (انتراق) قائم رہے تو ہندستان کی آزادی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ناممکن بنادیں گے دفتری حکومت کا آہنی پنجہ روز بروز سخت ہوتا جائے گا۔ اور جو اسلامی اثرات کے دھندلے نقوش رہ گئے ہیں وہ بھی صفحہ وجود سے حرف غلط کی طرح مٹا دیئے جائیں گے۔ اس نے اگر ہندستان کے دونوں فرقہ اور حربی نسل سکھ کو ملا کر یہ تینوں صلح و آشتی سے رہیں تو میری سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیسے ایک چوتھی قوم خواہ وہ کسی قدر طاقتور ہو۔ ہندستانیوں کے مشترکہ مقاصد کو اپنی متشددانہ اور جابرانہ حکومت کے بل پر شکست دے سکے گی"[15]

پانچ سو علما جو اس کانفرنس میں شریک تھے انھوں نے اس فتوے پر دستخط کیے جس میں مسلمانوں سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ گورنمنٹ سے ترک موالات کریں اور تمام سول اور ملٹری ملازمتوں سے علیحدہ ہو جائیں۔

محمود الحسن کا اس کانفرنس کے کچھ ہی دنوں بعد انتقال ہو گیا۔ ان کا خرقہ خلافت ان کے محبوب شاگرد حسین احمد مدنی کے باوقار کندھوں پر پڑا جو مالٹا میں ان کے ساتھی تھے۔ اور احیاء اسلام اور ہندستان کی آزادی کے متعلق وہی رائے رکھتے تھے جو ان کے استاد کی تھی۔

حسین احمد مدنی

حسین احمد مدنی 1957-1879 دیوبند میں محمود الحسن کے محبوب شاگرد تھے لیکن قبل اس کے کہ وہ دیوبند میں اپنی تعلیم مکمل کریں ان کے والد نے مکہ ہجرت کر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ 1316H - (1889-90 A.D) اس لیے پورا خاندان مکہ چلا گیا۔ حسین احمد نے اس کے بعد سولہ سال

15- Ibid, P. 33.

13DPD 71-17.

حجاز میں بسر کیے۔ صرف کبھی کبھی ہندستان بھی آجاتے تھے جب 1332ھ ہجری میں (1914 A.D) محمود حسن مکہ پہنچے تو حسین احمد جنھوں نے اب تک سیاسیات میں کسی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ ہندستان کی آزادی کے مشن کے پرجوش حمایتی بن گئے وفادار شاگرد اپنے استاد کا معتمد اور مشیر ہو گیا اور جب وہ جلاوطن کر کے مالٹا بھیجے گئے اور وہاں قید کر دیے گئے تو وہ ان کے ساتھ ساتھ تھا۔

1920ء کی رہائی کے بعد وہ خلافت اور ترک موالات کی تحریک میں ایک پرجوش کارکن تھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد جو تحریک خلافت کے رہنما تھے۔ ان کی دعوت پر انھوں نے عربی مدرسہ کا کلکتہ میں چارج لیا جو ابھی حال میں قایم کیا گیا تھا یہاں سے وہ سلہٹ چلے گیے جہاں ایک استاد کی حیثیت سے چھ سال تک درس حدیث دیتے رہے۔ 1928ء میں دیوبند کے ہیڈ ماسٹر کی حیثیت سے ان کا انتخاب ہوا اور اس کے بعد کے تیس سال انھوں نے دیوبند کی خدمت میں گزارے اس اس زمانہ میں جب کہ وہ تعلیمی کاموں میں مشغول تھے۔ وہ تحریک آزادی جنگ میں بڑے جوش و خروش سے حصہ لیتے رہے۔ اپنی سیاسی کارروائیوں اور قانون کی خلاف ورزی کی وجہ سے وہ کئی مرتبہ قید کیے گیے۔ کوئی چیز۔ گورنمنٹ کی ترغیب و تحریص، مسلم لیگ کی مخالفت، مخالف علماء کے حملے اور خود ان کی قوم کے بچھڑے ہوئے لوگوں کی گالیاں آزادی ہند اور ہندو مسلم اتحاد کے بارے میں جو انھوں نے پختہ اور پرجوش عقیدہ قایم کیا تھا اس سے ان کے پائے استقلال میں ذرا بھی لغزش نہ پیدا کر سکی۔

حسین احمد اپنے لائق احترام استاد اور رہنما محمود الحسن کے کہنے پر میدان سیاست میں آئے تھے لیکن ان کی سیاست جذباتی نہ تھی۔ سوسائٹی اور حکومت کے مسائل کے بارے میں یہ ان کا ایک نقطہ نظر تھا۔ یہ ان کی تحریرات سے پوری طرح ثابت ہے جو انھوں نے ہندستان کی سیاست اور اقتصادیات اور بین الاقوامی امور پر لکھے ہیں۔

مذہبی معاملات میں ان کا علم گہرائی اور وسعت دونوں میں غیر معمولی تھا لیکن یہ سخت تعجب کی بات ہے کہ کس طرح ایک مولوی نے ہندستان کی سیاسی اور اقتصادی تاریخ اور مغربی طاقتوں کے اسلامی ملکوں سے تعلقات کے بارے میں اس عظیم مقدار میں اطلاعات فراہم کریں اس میں شک نہیں کہ مکہ میں ان کی دس سال سے ڈیوڑھی مدت تک تقریباً مکہ کی رہائش جو مسلم ممالک کا مرکز ہے اور اس کے تقریباً پانچ سال تک مالٹا کی قید و بند میں رہنے سے مسلم ممالک کے بہت سے لوگوں سے ان کی ملاقاتیں ہوئیں اور یورپ یعنی جرمنی، آسٹریا اٹلی

وغیرہ کے لوگوں سے بھی ملے ان لوگوں سے بین الاقوامی معاملات پر انھوں نے بہت کچھ معلومات حاصل کیں۔

محمود الحسن کے برخلاف جن کے خیالات ان کے موقع بہ موقع کی تقریروں اور ان کے پیروؤں کی اطلاعات میں بکھرے پڑے ہیں حسین احمد نے ایک کثیر مقدار میں اپنی تصنیفات اور تحریرات چھوڑی ہیں جن میں ان کے خیالات واضح طور پر درج ہیں۔

دوسرے اہم سنجیدہ ہندو اور مسلم مفکرین کی طرح حسین احمد بھی جس بات پر سب زیادہ زور دیتے تھے وہ انسانی زندگی کے اغراض و مقاصد کے بنیادی اصول دونوں رخ سے تھے۔ خواہ وہ اندرونی طور پر اس کی ابدی روح کے بارے میں اور بیرونی طور پر انسان اور فطرت سے ہم آہنگی کے بارے میں اس کے کلی رویہ کا اظہار۔

ایک مسلم اسکالر (عالم) کی حیثیت سے ان کا کامل یقین تھا کہ قرآن کلام الہی اور حدیث یعنی پیغمبر کے ارشادات اور اعمال کا مجموعہ۔ انسانی زندگی کے ہر دو پہلوؤں کے لیے مکمل ہدایت ورہنمائی رکھتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مذہب کلی طور پر۔ انسانی زندگی کے ہر شعبہ کے لیے مکمل ہدایت اور ضابطہ ہے اور اس لیے صرف اعتقادات، عبادات اور اخلاقیات ہی کو اس کے زیر ہدایت برتنا چاہیے بلکہ ان امور کو بھی جن کا تعلق سماج، اقتصادیات، سیاست یا کلچر کے معاملات سے ہے۔ روحانی اور دنیوی معاملات میں کوئی تصادم نہ ہونا چاہیے۔

اس لیے سچا مسلمان وہ جو خیالات، کلام اور عمل سب میں احکام الہیہ کا مطیع ہے اور کسی حکم کو جو اس کے خلاف ہو ماننے سے انکار کرتا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ کوئی مسلمان اپنی آزادی کسی دنیوی حکمران کو رہن نہیں کرسکتا اس لیے وہ کسی طرح اور کسی حالت میں ایک ایسے غیر مسلم ماہری کا مطیع نہیں ہوسکتا ہے جس کا قانون اور جس کی گورنمنٹ کا مقصد یہ ہے کہ اسلامی تصورات اور اسلامی طرز زندگی کو تباہ وبرباد کر دے۔

اس لیے ہر مسلمان کا یہ مذہبی فرض ہے کہ وہ حتی المقدور اپنی پوری طاقت لگا کر ہندستان پر سے برطانیہ کی مملکت کو اکھاڑ پھینکے۔ بے شمار حوالے دیے جاسکتے ہیں جن میں مسلمانوں کو پرجوش طور پر ابھارا گیا ہے کہ بیرونی حکمران کے خلاف بغاوت کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ اور ہندستان کے دوسرے فرقوں کے اتحاد و تعاون سے غلامی کا جوا اپنے کندھوں سے اتار پھینکیں۔

اس اپیل کے ساتھ ہی ساتھ بغاوت کو حق بہ جانب قرار دینے کے لیے مفصل بیانات دیے گیے ہیں۔ اپنی سوانح حیات کے 336 صفحات میں سے دو سو صفحات صرف اس بات کی تفصیل پر صرف کیے گیے ہیں کہ برطانوی ملوکیت کے کتنے تباہ کن نتائج ہوتے ہیں۔ ان میں حسب ذیل باتیں قابل ذکر ہیں (1) باشندگان کی اہانت نسلی اور قومی امتیازات برت کر اور اونچی ملازمتوں سے ان کو محروم کر کے (2) ملک کی اقتصادی تباہی مال گزاری کے نظام اور صنعت و تجارت کو برباد کر کے (3) غلط نظام عدلیہ جو مقدمہ بازی اور رشوت خوری کی ہمت افزائی کرتا ہے اور انصاف میں دیر ہونے اور بہت زیادہ خرچ کرانے کا ذمہ دار ہے۔ (4) قانون سازی کی کارروائیوں سے ہندستان کو الگ تھلگ رکھنا اور (5) بیرونی اقتدار کے سبب عامۃ الناس کے اخلاق کی گراوٹ۔

اسی تصنیف کی دوسری جلد میں کافی اوراق اس کی تفصیل پر کیے گیے ہیں کہ کس طرح مغربی طاقتوں نے حکومت آل عثمان کے ساتھ معاملات میں سنجیدہ وعدوں کی خلاف ورزی کی اور دھوکہ دہی سے کام لیا۔ یہ بھی بتلایا گیا ہے کہ ان تمام طاقتوں میں برطانیہ کا نامۂ اعمال سب سے زیادہ سیاہ ہے۔ ان واقعات سے یہ لازمی نتیجہ نکلتا ہے کہ برطانوی اسلام کے سب سے بڑے دشمن ہیں اور مسلمانوں کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے وجود کی بقا اور اپنے مستقبل کی زندگی کے لیے برطانوی مملکت کو جو ایشیا اور افریقہ کے اقوام کے لیے ایک خطرہ ہیں تباہ و برباد کر دیں/16

لیکن مدنی کے خیال کے مطابق مسلمانان عالم کی نجات ہندستان کی آزادی پر منحصر ہے اسی کو حاصل کرنے کے لیے شاہ ولی اللہ کی تحریرات سے ایک تحریک انیسویں صدی میں چلائی گئی جس کا انجام 1857ء کی بغاوت ہوا لیکن بغاوت کے بعد جس بے رحمی اور بربریت کا اظہار کیا گیا اس نے جوش کو مدھم کر دیا۔ اور تحریک کو ایک نیا موڑ دینے کی ضرورت پیش آئی یہ کام انڈین نیشنل کانگرس نے کیا جس کے شروع ہی میں ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت اور انتہائی اہمیت کو سمجھ لیا تھا۔

حسین احمد یہ تسلیم کرتے تھے کہ کانگرس ہی طاقت چھیننے کا خاص آلہ ہے اور باوجود اس کے کہ ان کو بہت اشتعال دیا گیا اور اختلافات کیے گیے لیکن 1920ء میں جو فیصلہ انھوں نے کانگرس کے نظام کی حمایت کا کیا تھا اس میں ان کے دل کے اندر کبھی تذبذب پیدا نہیں ہوا خاص کر جب

---

16 - Madni Husain Ahmad, "NAQSH-I-HAYAT" (Urdu) 2 Vols

کہ 1929ء میں کانگرس نے یہ اعلان کردیا کہ ہندستان کی آخری منزل آزادی کامل ہے۔ ان کا ہندستان کے مسائل پر واضح رویہ اور کانگرس بالکلیہ حمایت کی بنا پر ان کو بہت سے تنازعات کا سامنا کرنا پڑا۔

ان تمام مسائل میں جس نے تلخ ترین جھگڑا کھڑا کیا وہ ہندو مسلم اتحاد کا مسئلہ تھا ان کا عقیدہ تھا کہ ہندستان کے باشندوں کو مذہبی اختلافات کے باوجود ایک متحدہ قوم بننا چاہیے تاکہ آزادی حاصل ہو اور سب کے فلاح و بہبود کی حکمت عملیوں کی کارروائیاں کی جاسکیں ایک تقریر میں انھوں نے کہا کہ زمانہ حاضرہ کی قومیں ملک کی بنیاد پر مبنی ہیں نہ کہ نسل اور مذہب کی بنیاد پر۔

قبال نے یہ سمجھا کہ انھوں نے اس تصور پر حملہ کیا ہے کہ قوم کی اصل اساس مذہب ہے اور جس قومیت کی بنیاد نسل، زبان یا ملک ہے وہ ملعون ہے ان کے نزدیک علاقائی بنیاد پر قایم قومیت اسلامی تصورات کے خلاف تھی۔ انھوں نے ایک مضمون لکھا جس میں یہ بحث کی کہ مدنی کے دعوی کی تائید نہ تو عربی زبان کرتی ہے اور نہ اسلامی لٹریچر۔ انھوں نے ان کے علم کو بھی ناقص بتلایا اور ایک نظم میں ان کا مضحکہ اڑایا۔

حسین احمد نے مجبوراً جواب لکھا کیوں کہ اقبال کے خیالات سے قومیت کے مفاد کو سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ یہ ایک مختصر رسالہ ہے جس کا نام متحدہ قومیت اور اسلام ہے/17 بڑے عالمانہ انداز میں انھوں نے مسئلہ کے دو پہلوؤں پر بحث کی ہے (1) قوم کے معنی اور اس کی تعریف اور اس میں اور ملت میں کیا فرق ہے اور (2) قرآن، حدیث اور اسلامی تاریخ اس بارے میں کیا بتلاتے ہیں۔

انھوں نے ابتدائی، متوسط اور حال تینوں زمانوں کے عربی لغات کا ذکر کیا ہے یہ بات ثابت کرنے کے لیے کہ لفظ "قوم" سے علاوہ اور معنوں کے جن میں وہ استعمال ہوسکتا ہو۔ مراد مردوں اور عورتوں کا کوئی وہ گروہ ہے جو کسی مشترک مقصد کے لیے ساتھ مل کر جد و جہد کرنے کے لیے

17- Madni Husain Ahmed 'Mutahadda Qaumiyat aur Islam (Urdu) Published the Nazim-e Majlis Qaumi-mal Maarif Deoband. U.P.

اپنے آپ کو پابند کریں۔ ضروری نہیں ہے کہ وہ مقصد مذہبی ہی ہو۔

قرآن کا طرز کلام اس معنی کی تصدیق کرتا ہے کیوں کہ قرآن نے خدا کے پیغمبروں اور ان ایمان نہ لانے والوں دونوں کو ایک قوم کہا ہے مثلاً محمدؐ اور قریش۔ قرآن میں ایک ایسے گروہ کا تصور بھی موجود ہے جو مختلف مذاہب کے لوگوں سے مرکب ہو مثلاً پیروان عاد اور فرعون۔

لیکن پیغمبر اسلام کی مثال اس معنی کی تائید میں سب سے زیادہ یقین دلانے والی شہادت ہے کیونکہ اپنی پیغمبری کے چودھویں سال پیغمبر محمدؐ نے مدینہ کے یہودیوں اور اپنے مسلمان پیرؤں کو اس بات پر متحد کیا کہ دونوں نے اقرار صالح کے ساتھ یہ معاہدہ کیا کہ وہ بت پرست عربوں کے خلاف جو مدینہ پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہے تھے ان کے خلاف جنگ کریں گے۔ شرائط معاہدہ یہ تھے کہ ہر فریق اپنے مذہب کی پیروی میں آزاد ہوگا۔ لیکن بقیہ تمام معاملات میں یہودی اور مسلمان ایک قوم متصور ہوں گے۔

لفظ "ملت کے بالکل مختلف معنی ہیں اس سے مراد صرف وہ گروہ ہوتا ہے جو مذہب اور احکام الہیہ (شریعت) کی بنیادوں پر منظم ہو اس کا اعلان ہر مذہبی گروہ پر ہو سکتا ہے خواہ اس کے اقرار کا مشترک مذہبی کوئی بھی ہو۔

چنانچہ ان سب کا نتیجہ یہ ہے کہ اسلام غیر مسلموں سے مل کر ایک متحدہ قومیت کی تعمیر میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالتا۔ بلکہ غالباً وہ اس کی ہمت افزائی کرتا ہے۔ دیگر تصورات اس اتحاد کی زبردست تائید کرتے ہیں ہندو اور مسلمان دونوں زیادہ تر ایک ہی نسل کی پیداوار ہیں سیکڑوں سال سے ایک ملک میں رہائش نے ان میں یکساں رویہ اور طرز زندگی بنا دیا ہے۔ وہ ایک مشترک زبان بولتے ہیں اور ان میں تاریخی روایات بھی مشترک ہیں دونوں نے مل کر اپنا الگ الگ مذہب اور پرسنل لا قائم رکھتے ہوئے ایک یکساں ادب، فنون لطیفہ اور موسیقی کو تعمیر کیا ہے۔ گاؤں اور شہروں میں وہ بے شمار زندگی کے مسائل میں ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہیں یہی حال اقتصادی امور، اسکولوں، کالجوں، ڈسٹرکٹ بورڈوں، میونسپل بورڈوں اور قانون ساز اسمبلیوں کا بھی ہے۔

المختصر متحدہ قومیت کی تعریف حسب ذیل الفاظ میں کی جا سکتی ہے۔

"متحدہ قومیت سے میری مراد ایسی طرز کی متحدہ قومیت ہے جیسی کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم

نے مدینہ کے بسنے والوں کے مابین قایم کی تھی۔ یعنی میری خواہش یہ ہے کہ باشندگان ہندستان خواہ ان کا کوئی مذہب ہو وہ اس حیثیت سے کہ ہندستانی ہیں اور ایک ہی ملک کے رہنے والے ہیں۔ وہ سب مل کر ایک قوم بن جائیں۔ انھیں کے ساتھ تمام باشندگان ہند کو اپنے مذہبی عقائد کے اقرار و اعلان، اپنے مقاصد حیات اور طریقہ عبادت میں آزاد ہونا چاہیے اور ان کو اس کی بھی آزادی ہونی چاہیے کہ وہ اپنے مذہبی رسم و رواج، تیوہاروں اور مذہبی ہدایت ناموں میں بھی آزاد ہوں اور جہاں تک ان کا مذہب اجازت دے پرامن طریقہ پر اپنے مذہب کی تبلیغ کرنے میں بھی آزاد ہوں۔/ 18

اقبال نے اعتراض کے رخ سے جو قطعہ لکھا تھا اس کا یہ جواب دیا ہے۔

ترسم نہ رسی بکعبہ اے اعرابی..... کایں رہ کہ تو میروی بانگلستان است

(اے صحرائے عرب کے صحرانورد مجھے خوف ہے کہ تو مکہ کے قدس مقام پر نہیں پہنچے گا کیونکہ تو جس سڑک پر جا رہا ہے وہ انگلستان جاتی ہے)

جہاں تک ابوالاعلیٰ مودودی کا تعلق ہے۔ حسین احمد نے ان کے مذہبی آراء کی کل طور پر تردید کی جن کے متعلق انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ سنیوں کے عقائد کے بالکل خلاف ہیں اور خارجیوں اور انھیں کی قسم کے لوگوں کی صف میں آتے ہیں۔ مودودی کا یہ کہنا کہ مسلمان صرف ایک اپنی علیحدہ سوسائٹی کے اندر ہی رہ سکتے ہیں اور غیر مسلموں کے ساتھ سیاسی اقتدار میں شریک نہیں ہو سکتے بالکل غلط اور ناقابل قبول ہیں۔

دستور میں ایک آزاد اور بلا تقسیم ہندستان کا دستور کیا ہو اس پر وہ واضح رائے رکھتے تھے۔ حسب ذیل مدات میں ان کا ملخص بیان کیا جا سکتا ہے۔

(1) ہندستان کی حکومت ایک پبلک ہوگی اور اس کا صدر عام انتخاب سے چنا جائے گا۔ منصب سے ارفع انتظامی افسر کے اختیارات برتے گا۔

(2) مرکزی حکومت میں مسلمان اقلیت میں ہوں گے لیکن، ان کے مذہبی، سیاسی اور اقتصادی حقوق کا تحفظ کیا جائے گا۔ مرکز صرف چند امور کو اپنے ہاتھ میں رکھے گا۔ یعنی دفاع۔ خارجہ حکمت عملی رسل و رسائل، سواری، باربرداری اور مالیات۔ ماقبی امور صوبہ کے اختیار میں ہوں گے مذہبی

18- Ibid, P. 53

شہنشاہوں کی شان وشوکت کو اختیار کر لیا۔ ان کے رسم ورواج اور رہن سہن کے طریقوں کو اپنایا جس طرح وہ تکبر کے ساتھ عوام سے الگ رہتے تھے یہ بھی رہنے لگے۔ اوران ہی کی طرح دربار شاہانہ کے آداب اختیار کر لیے انھوں نے حکومت کے اصول اور انتظامیہ کے ضوابط بازنطینیوں اور ساسانیوں سے سیکھے اس کے بعد کے عہد میں بہت سے وہ اعلیٰ مقاصد اور زندگی کے اصول جو محمدؐ نے اور ان کے فوراً بعد آنے والے خلفاء نے تعلیم دی تھی ترک کر دیے گیے۔

مسلم بادشاہوں اور سلطانوں نے اسلامی نظم و معاشرہ (ملت) کو توڑ کر ریزہ ریزہ کر دیا اور ملت کے تخیل کو گھٹا کر صرف روحانیت اور پرسنل لا اور مذہبی مراسم تک محدود کر دیا۔ انھوں نے شریعت کا نظام علماء کے ہاتھ میں دے دیا اور امور سلطنت میں وہ مذہبی قوانین کے بجائے عقل پر مبنی احکام پر عمل کرنے لگے۔ مسلم سوسائیٹیوں نے بھوسی تو رکھ لی لیکن مغز کو چلے جانے دیا۔ مساوات انسانی، عورت کا احترام غلاموں کی آزادی، غریبوں حاجتمندوں، یتیموں، بیواؤں کی امداد، خیرات سلطانی اقتدار اور بزور شمشیر تسخیر و توسیع ملک سے گریز ان سب کے تصورات گلدستہ طاق نسیاں ہو گیے۔ عظیم الشان شہنشاہیتیں تعمیر کی گئیں۔ دولت طاقت عیش و عشرت کے پیچھے دوڑ شروع ہوئی فنون لطیفہ مثلاً پینٹنگ فن عمارت سازی، موسیقی ادب کی غذائے متروک قرار دیے گیے۔ تلوار کی امارت ناز و نعمت میں پال کر بگاڑ دی گئی۔ قدامت پرست علما اور ادبی مصنفین کی ہمت افزائی کی گئی فوجی قوت پر بھروسہ نے اخلاقی قدروں کو پامال کر دیا اور اسے بھی مٹا دیا کہ سلطانی وراثۃً قایم رہے اور عوام کی رضامندی قیادت کی بنیاد ہو۔

ان باتوں کے ابھرنے سے مسلم حکومتوں کی بنیادیں ہل گئیں اور انھیں نے مغرب کی مداخلت کا دروازہ کھولا۔ مسلم حکومتیں مغرب کے اقتدار میں آگئیں اور جب مغرب کو سیاسی اقتدار حاصل ہو گیا تو اس نے کلچر کے اندر بھی اپنا عمل دخل جمایا۔ مذہب اور حکومت دونوں خطرے سے دوچار ہوئے اس کے بعد ردعمل شروع ہوا جمال الدین افغانی، محمد عبدہٗ، رشید رضا اور سید احمد خاں جیسے لوگوں نے خطرے کا احساس کیا لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ وہ اس طاقت کی صحیح نوعیت کا اندازہ نہ کر سکے جو دنیائے اسلام کو نئے سانچے میں ڈھال دیتی۔

اقوامِ مسلم کو جس بات کا سامنا تھا وہ یہ نہیں تھا کہ مذہب کا احیاءِ جدید کیا جائے بلکہ ضرورت ایک انتہا پسندانہ تبدیلی کی تھی یعنی چاہیئے یہ تھا کہ قدامت پرستی کی جگہ علوم جدیدہ کی روشنی میں راہ بنائی جاتی۔ پرانے جامد روایتی طریقوں کو ترک کر کے ترقی پسندی کو اختیار کیا جاتا اور مستند احکام مندرجہ کتب مقدسہ کی جگہ خود ساختہ سیکولر قوانین کی اطاعت واجب کی جاتی۔ عالمگیریت کی جگہ نیشنلزم کو اختیار کیا جاتا اور معتقدات کو کورانہ جان لینے کے بجائے۔ عقلیت کو فروغ دیا جاتا۔ اسلامی مفکرین کے دماغ میں یہ کشمکش پوری انیسویں صدی میں جاری و ساری رہی لیکن بیسویں صدی میں جدت پسندی نے عمل کے نقطۂ نظر ڈالنے کی وجہ سے غلبہ حاصل کرنا شروع کیا اور اب ریشنلزم (عقلیت) نیشنلزم (قومیت پسندی) کا یقینی طور پر جم جانا نظر آ رہا تھا۔ ہر مسلم ملک اپنے طرز کی اپنی سوسائٹی بنا رہا ہے۔ خود اپنا نظامِ سلطنت قایم کر رہی ہے اپنے قوانین وضع کر رہی ہے جو اس کی اس اقتصادیات کی بنیاد پر بنائے جاتے ہیں جو اس کے وسائل اور مواقع کے مطابق اسے حاصل ہے۔ اور خود اپنا کلچر تعمیر کر رہا ہے ہر ایک اپنی انفرادیت اور دوسروں سے تفریق کا ادراک کر رہا ہے۔

اقبال جن سے امید تھی کہ وہ اس معاملہ کو زیادہ سمجھیں گے سادہ لوحی سے یہ تصور کر بیٹھے کہ مذہب ہی وہ مخصوص بلکہ اصل عنصر ہے جو قوموں کے عروج و زوال کو لاتا ہے اور سماجی تنظیموں میں انقلاب بپا کرتا ہے۔ انھوں نے مادی اور اقتصادی عناصر کو قطعاً نظر انداز کر دیا اور سماجی اور سیاسی شعور کی نشوونما ان کے طاقتور اور اکسانے والے اثرات سے وہ ناواقف نظر آتے ہیں۔

انھوں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ کل ہندوستان کے بنیادی مسائل ہندو اور مسلمان دونوں کے ایک تھے یعنی بھوک، افلاس، بیماری، جہالت اور یہ کہ ان کا حل مذہبی ذرائع سے ممکن نہ تھا بلکہ ان کا علاج صرف سیاسی تحریک تھی انھوں نے اس کا بھی اندازہ نہیں [illegible]۔ آزادی اور ذمہ دار اور اقتدار اعلیٰ کی مالک سیاسی نظام کا مطالبہ صرف ہندستان کی بنیادی ضروریات کو پورا کرنے کی غرض سے تھا۔ ان ضروریات کو پوری کرنے کے لیے جو کارروائیاں کی جا رہی تھیں ان کا تقاضہ یہ تھا کہ مختلف فرقوں میں سے کسی کے ساتھ امتیاز نہ برتا جائے اقتصادی معاملات میں جن کا تعلق قومی مفاد سے ہے فرقوں

کے اندر امتیاز برتنا بدیہی طور پر ناممکن ہے۔

بدقسمتی سے اقبال جو اپنی تربیت اور تعلیم دونوں لحاظ سے متوسط طبقہ کے تخیلات اور تعصبات میں گندھے ہوئے تھے وہ عوام الناس کی ضروریات کی کسی قسم کی جان کاری نہ رکھتے تھے ان کی پوری توجہ متوسط طبقہ کے مسلمانوں پر مرکوز رہی جن کی تعداد اور جن کا اثر بیسویں صدی میں روز افزوں ترقی پر تھا یہ بات ان کی نظموں اور ان کی تقریروں سے پوری طرح واضح ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال نے اپنی نظموں میں مزدوروں اور کسانوں کو سراہا ہے لیکن ان کے کل خیالات کا رخ اونچے طبقہ کے مسلمانوں کی جانب ہے ان کی اردو شاعری کی زبان سے اس کے پاکیزہ اور مرصع خزانہ الفاظ اس کے شاندار تلمیحات اور اور استعارے علمی حوالے اور ارفع طرز ادا سے ایک سہل کوش اور سوفسطائی زندگی کی تیز خوشبو آتی ہے انھوں نے مذہبی زندگی کے لیے جو زرد دار وعظ و پند پیش کیے ہیں ان سب کے مخاطب مغربی تعلیم کے تعلیم یافتہ نوجوان تھے وہ جو بار بار جنگ جویانہ معرکوں فوجی فتوحات عسکری خوبیوں اور مسلسل منصوبے کو یاد دلاتے رہتے ہیں ان کا کوئی تعلق غریب اور کچلے ہوتے طبقہ سے نہ تھا انھوں نے اردو زبان کو جو ہندوستان کے مسلمانوں کے ایک بااثر حلقہ کی زبان ہے کہ بدلہ میں فارسی زبان کو اختیار کرنا ایک واضح ثبوت اس بات کا تھا کہ ان کا رجحان شہری متوسط طبقہ کی طرف ہوگیا تھا۔ وہ سیاسی مسائل جن کو انھوں نے پیش کیا اور ان کے حل کا جو طریقہ تجویز کیا ان دونوں کا پلہ متوسط طبقہ کی جانب بہت بھاری تھا۔

لیکن یہ امر مشتبہ ہے کہ جب انھوں نے الہ آباد مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ دسمبر 1930ء میں پیش کی تو وہ واقعی ہندوستان کی تعلیم اور ایک با اقتدار مسلم ریاست کے قیام کا خیال رکھتے تھے۔

ہندوستان کے مختلف فرقوں میں اتحاد اور تعاون کا جو فقدان ہے اس کا تجزیہ کرتے ہوئے انھوں نے بورژروا (متوسط شہری طبقہ) کے مفاد کو اہمیت دی ہے۔

"غالباً ہم ایک دوسرے کی نیتوں پر شک کرتے ہیں اور اندر اندر ہم دوسرے پر غالب آنے کو سوچ رہے ہیں۔ غالباً باہمی تعاون کا خیال ہمارے اندر اتنا مضبوط نہیں ہے

کہ ہم ان اجارہ داریوں کو ترک کر دیں جو حالات نے ہمارے ہاتھ میں دے دی ہیں اور ہم غالباً اپنی خود پسندی قومیت کے لبادے کے نیچے چھپانا چاہتے ہیں۔ حالانکہ اوپر سے ہم کشادہ قلب اور حب الوطنی کا دعوی کرتے ہیں لیکن اندر سے ہم اسی طرح تنگ نظر ہیں جس طرح ایک ذات یا ایک قبیلہ۔ غالباً ہم اس بات کو تسلیم کرنے پر راضی نہیں ہیں کہ ہر فرقہ کا یہ حق ہے کہ وہ اپنے ثقافتی روایات کے مطابق آزادی کے ساتھ پھلے پھولے۔"

شک اور خوف کی ان باتوں کو دور کرنے کے لیے انھوں نے اپنی اسکیم پیش کی قطعی طور پر یہ اسکیم ہندوستان کو دو آزاد خود مختار با اقتدار سلطنتوں میں تقسیم کرنے کی نہ تھی۔ یہ تو صرف ایک پلان علاقوں کی از سر نو تشکیل کا تھا۔ ملک کا وہ حصہ جہاں مسلمان کثرت سے آباد تھے کو بقیہ حصہ سے الگ کر دیا جاتے۔ ان کو امید تھی کہ اگر ان کا پلان پنجاب، صوبہ شمالی و مغربی، سندھ اور بلوچستان کو ملاکر ایک اندرونی طرز پر خود مختار ریاست قایم کردی جاتی تو اس سے ہندوستان کا مسئلہ حل ہوجاتا "یہ ان کے (یعنی۔ مسلمانوں کے) احساس ذمہ داری کو بڑھا دے گا۔ اور ان کے حب الوطنی کے جذبات میں گہرائی پیدا کرے گا۔ اس طرح ہندستان کے سیاسی سماج میں اپنی ترقی کے مکمل مواقع پانے کے بعد شمالی مغرب کے مسلمان بیرونی حملوں کے خلاف خواہ وہ حملے تصورات کے ہوں یا سنگینیوں کے ہندستان کے بہترین پاسبان ثابت ہوں گے" [1]

ان کا مقصد یہ تھا کہ "ایک ہم آہنگ اور ہمساز قوم کی تعمیر کریں۔"

یہاں پر کوئی تذکرہ دو قوم کی تھیوری کا یا ہندو اور مسلمانوں کے ناقابل اصلاح اختلافات کا نہیں ہے ان کے اختلافات کا تجزیہ کرکے اس کی ابتدا یوں بتلائی کہ یہ ان کی سطحی اور سیکولر وجوہات سے پیدا ہوئے جیسے کہ ایک دوسرے کی نیتوں کے بارے میں غلط فہمی مغلوب ہونے کا خوف قبضہ اور حقوق سے حسد۔

انھوں نے جو پلان پیش کیا وہ ان کی محبوب تھیوری کا مکمل رد ہے

ہے ترک وطن سنت محبوب الٰہی .... دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی۔

(وطنیت) کو ترک کرنے کے بعد ہی اللہ کی محبوب سوسائٹی عالم وجود میں آتی ہے

1- Ibid. P. 13.

تو بھی پیغمبر کے پیام کی صداقت کی گواہی دے؟

مارچ 1932 میں انھوں نے لاہور کی صدارتی تقریر میں تو شمال و مغرب میں ایک اندرونی آزاد مسلم ریاست کی اسکیم کو بھی پیش نہیں کیا جو بھی ان کے خیالات تھے ان کو حسب ذیل بیان میں واضح کیا ہے

"یہ ظاہر ہے کہ کوئی فرقہ وارانہ مصالحت خواہ وہ وقتی ہو یا مستقل اس وقت مسلمانوں کو مطمئن نہیں کر سکتی جب تک کہ وہ بطور اساس یہ تسلیم نہ کرے کہ مسلم فرقہ کو ان صوبوں میں جہاں ان کی واقعی اکثریت ہے وہاں ان کو اکثریت کے حقوق حاصل ہوں گے۔ اس میں شک نہیں کہ اس بات کی یقین دہانی کی گئی ہے کہ جداگانہ انتخابات قایم رہیں گے اور صوبہ سرحد کا منصب تسلیم کر لیا گیا ہے لیکن ان کے علاوہ مکمل صوبائی آزادی پارلیمنٹ سے ہندستان کے صوبوں کو اقتدار اعلیٰ کا منتقل ہونا وفاق کی اکائیوں میں مساوات، رعایا کو فیڈرل سنٹرل اور پراونشیل میں بانٹنے کے بجائے صرف فیڈرل اور صوبوں میں بانٹنا پنجاب اور بنگال میں اکثریتی حقوق، سندھ کو بلاشرط ایک علیحدہ صوبہ بنانا مرکز میں ایک تہائی حصہ، یہ ہیں ہمارے مطالبات /12

ان مطالبات کا ہرگز یہ منشا نہیں ہو سکتا ہے کہ ملک کو دو الگ ریاستوں میں بانٹ دیا جائے۔ اقبال نے جو مطالبات پیش کیے ان کو جائز قرار دینے کا سبب مذہبی اختلافات نہ تھے بلکہ خوف اور غصہ" /13

یہ تجویز کرنے کا ارادہ نہیں ہے کہ اگر اقبال 1940 میں زندہ رہے ہوتے جب مسلم لیگ نے پاکستان کا ریزولیوشن پاس کیا تو وہ اس کو اپنی برکتیں نہ دیتے مطلب صرف اتنا ہے کہ اپنی موت کے وقت تک جو 1938 میں واقع ہوئی اقبال نے اپنے آپ کو پاکستان کے نقطۂ نظر سے وابستہ نہیں کیا تھا لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ان کی شاعرانہ فلسفیانہ تحریرات اور ان پبلک بیانات سے مسلمانوں کی علیحدگی پسندی کے تخیل کی زبردست حمایت ہوئی انھوں نے مسلمانوں کے جس مزاج کی پرورش کی اس نے صلح کو اگر ناممکن نہیں

12- Ibid, P. 44

13- Ibid, P. 45.

تومشکل ضرور بنا دیا۔

دیوبند کا مدرسہ

دیوبند کے مدرسہ کا ان علما کے ذریعہ قایم ہونا جنھوں نے 827ء کی بغاوت میں حصہ لیا تھا اس سے پہلے باب میں بیان کیا جا چکا ہے۔ اس مدرسہ کے دو اغراض تھے (ا) مسلمانوں میں قرآن اور حدیث کی اصلی تعلیمات کی تبلیغ و اشاعت کرنا اور (2) ہندستان کے بیرونی حکمرانوں کے خلاف جذبہ جہاد کو زندہ رکھنا۔

ان لوگوں نے اندازہ کر لیا تھا کہ ہندستان کی آزادی نہ صرف ہندستان کے حق میں ضروری ہے بلکہ تمام دنیا کے مسلمانوں کے حق میں بھی ضروری ہے اور ان کی نگاہ اس معاملہ میں بالکل صاف تھی کہ ہندستان کی آزادی بلا ہندو مسلم اتحاد اور دونوں کے تعاون کے حاصل نہیں ہو سکتی۔

ان لوگوں نے انڈین نیشنل کانگرس کے قیام کا خیر مقدم کیا تھا اور جب 888ء میں سر سید احمد خاں نے اپنے برطانوی اتالیق کے اثر میں آکر مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا کہ کانگرس کی شرکت سے گریز کریں تو علماء دیوبند نے سر سید کے رویہ کی مذمت کی اور ایک مذہبی حکم (فتوی) سر سید کی تنظیم انجمن محبان وطن (PATRIOTIC ASSOCIATION) کے خلاف اور اسی کے ساتھ محمڈن اینگلو اورنٹیل ایسوسی ایشن کے خلاف جس کے سکریٹری اور روح رواں علی گڑھ کالج کے پرنسپل بیک (BACK) تھے صادر کیا۔ سر سید کی یہ کوشش کہ وہ اپنی اسکیم میں علماء کا تعاون حاصل کریں۔ علماء دیوبند نے رد کر دی کیونکہ دونوں کے سیاسی نظریات ایک دوسرے سے بہت زیادہ مختلف تھے۔

انیسویں صدی کے آخر تک دیوبند پنپ نہ سکا کیونکہ حکومت اس پر ایک سخت نگاہ رکھتی تھی۔ یہ اپنے وجود کو نہایت مشکل حالات میں کسی طرح گھسیٹتا رہا سب سے بڑی پریشانی سرمایہ کی تھی کیوں کہ وہ لوگ جو امداد کر سکتے تھے وہ موجودہ حکمرانوں سے خوف زدہ تھے۔ لیکن پھر بھی یہ مدرسہ عزم و ہمت کے ساتھ اپنے اصولوں پر اڑا رہا اور اپنے طے شدہ راہ پر چلنے میں اس کے پائے استقلال کو کبھی لغزش نہیں ہوئی۔

شروع شروع میں جو طلبا اس میں داخل ہوئے ان میں ایک محمود الحسن بھی تھے

وہ تمام عمر اس ادارے میں رہے اولاً طالب علم کی حیثیت سے پھر ایک معلم کی حیثیت اور آخر میں اس کے پرنسپل (مہتمم) کی حیثیت سے۔

1851ء میں پیدا ہوئے اور 1857ء میں جب بغاوت کا آغاز ہوا تو وہ اپنے والد کے ساتھ میرٹھ میں تھے گھر میں انھوں نے باغیوں کے بہادرانہ کارناموں کو سنا اور برطانوی مظالم کی بربریت آمیز داستانیں بھی سنیں انھوں نے اپنی آنکھ سے شمالی ہندوستان کے اعلیٰ طبقہ کے مسلمانوں کی وسیع پیمانہ پر بربادی دیکھی اور ان کی روح میں شگاف ہو گیا۔

دیوبند کے مدرسہ میں پندرہ سال کی عمر میں داخل ہوئے اور اپنی تعلیم ختم کرنے کے بعد وہیں معلم ہو گیے۔ 76-1875ء میں انھوں نے محمد قاسم نانوتوی اور رشید احمد گنگوہی جیسے فاضل اجل اور سراپا شفقت استادوں سے تعلیم حاصل کی تھی اور انھیں لوگوں کے فیض سے ان کے اندر علم گہری پاکیزگی اور آزادی سے محبت پیدا ہوئی۔

88-1887ء میں ان کو اس ادارے کے سربراہ ہونے کا ارفع درجہ حاصل ہوا اپنی زندگی کے اوائل ہی میں انھوں نے اپنے مشن (مقصد زندگی) کا فیصلہ کر لیا تھا جس کے لیے اپنی زندگی کے آخری دن تک وہ جدوجہد کرتے رہے۔ ان کا مشن ہندستان کو آزاد کرانا تھا 1905ء میں انھوں نے اپنے پلان کی عملی نشو ونما شروع کی اور دو محاذوں پر اپنا کام شروع کیا۔ ایک ملک کے اندر اور دوسرا ملک کے باہر۔ دونوں کو ایک ساتھ اور ایک وقت میں مسلح بغاوت کے لیے کھڑا ہونا اور انگریزوں کو ہندستان سے باہر کھدیڑ دینا تھا

ہندستان میں ان کے مشن کا ہیڈ کوارٹر دیوبند تھا اور اس کی شاخیں، دلی، پنجاب پورے امروٹ، کراچی، کھیڈا اور چکوال میں تھیں۔ بیرون ہند یاغستان جو شمالی مغربی سرحد پر ایک چھوٹی سی ریاست تھی کارروائیوں کا مرکز قرار دی گئی۔ سید احمد شہید اور مولوی عنایت علی اور شرافت علی کے پیرو جو اب تک انگریزوں کے خلاف جہاد جاری رکھے ہوئے تھے انھوں نے مرکزی فوجی انتظام مہیا کیا اور حاجی ترنگ زئی ان کے لیڈر مقرر کیے گیے قریب رہنے والے قبیلوں اور ہندستان سے آدمیوں اور رضاکاروں کی شرکت کی توقع تھی۔ یہ بھی امید تھی کہ افغانستانی حمایت کریں گے۔

اس مسلح بغاوت کی تنظیم صرف مسلمانوں کا مسئلہ قرار دے کر نہیں کی گئی تھی۔ پنجاب سکھوں اور بنگال سے انقلابی پارٹی کے ممبران کو تعاون کی دعوت دی گئی تھی۔ دیوبند

میں محمود الحسن کی جائے رہائش کے قریب ایک مکان ان لوگوں کے رہنے کے لیے کرایہ پر لیا گیا تھا۔ یہ کل تیاریاں خفیہ طریقہ پر کی گئیں تھیں عبید اللہ سندھی جنھوں نے مذہب سکھ کو ترک کر کے اسلام قبول کر لیا تھا۔ دیوبند میں کام کرتے تھے اور جمیعتہ الانصاری کی تنظیم انھوں نے قایم کی بعدہٗ وہ دلی چلے گیے۔ جہاں مدرسہ نظارۃ المعارف حکیم اجمل خاں اور وقار الملک علی گڑھ کی سرپرستی میں کھولا گیا۔

۱۹۱۰ء مسلمانوں کی تاریخ میں ایک نازک وقت تھا۔ تقسیم بنگال پر نظر ثانی کر دی گئی تھی۔ ہندستان کا دارالسلطنت کلکتہ سے دلی کر دیا گیا تھا۔ عیسائی صوبوں نے حکومت آل عثمان کے خلاف جنگ بلقان چھیڑ دی تھی۔ اس کے بعد فوراً پہلی جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ جس میں ترکی، جرمنی اور ان کے حلیفوں کے ساتھ برطانیہ اور ان کے اتحادیوں سے برسر جنگ ہوا۔ سنکیانگ (SINKING) کے سرحدی صوبہ نے برطانیہ کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔

محمود الحسن ان واقعات سے انتہائی مشتعل ہوتے اور انھوں نے سوچا کہ وقت آگیا ہے کہ برطانیہ کے خلاف مسلح کارروائی کی جائے ایک پلان بنایا گیا اور ریشمی رومالوں پر لکھے ہوئے خطوط پلان کے تمام شرکاء کو جاری کیے گیے عبید اللہ کو افغانستان روانہ کیا گیا۔ اور خود سرحد پر جانے کا انھوں نے منصوبہ بنایا۔ اسکیم کی بدقسمتی یہ تھی کہ حبیب اللہ کو اس کی تائید پر آمادہ نہ کیا جا سکا بلکہ اس کے برخلاف وہ گورنمنٹ آف انڈیا کو ہندستان کے انقلابیوں کی حرکات وسکنات سے برابر اطلاع دیتے رہے۔ اور اسی طرح اس جرمن مشن کے بارے میں خبریں پہنچاتے رہے جو کابل اس غرض سے آیا تھا کہ مرکزی طاقتوں کی موافقت میں ان کی مداخلت حاصل کریں راجہ مہندر پرتاپ اور برکت اللہ اس مشن کے ممبر تھے۔ جرمن مشن کی واپسی کے بعد یہ دونوں افغانستان میں رہ گیے تاکہ ہندستان کی آزادی کے لیے اپنی کوششوں کو جاری رکھیں۔

اس موقع پر محمود الحسن کو معلوم ہوا کہ گورنمنٹ آف انڈیا نے ان کو گرفتار کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ڈاکٹر ایم۔ اے انصاری (دہلی) کی مدد سے انھوں نے بعجلت تمام ہندستان کو خیرباد کہا اور مکہ چلے گیے اور گرفتاری سے بچ نکلے یہ واقعہ 1916ء کا ہے۔

مکہ پہنچنے پر وہ غالب پاشا سے ملے۔ جو اس وقت حجاز کے گورنر تھے اور ان کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ ایک خط لکھ کر دیں جس میں یہ وعدہ کریں کہ برطانیہ کے خلاف ہندستان کی بغاوت کی پوری ہمدردی اور مکمل تائید کریں گے۔ یہ خط خفیہ ذرائع سے ہندستان لایا گیا اور اس کی نقلیں تقسیم کی گئیں۔

جب کچھ زمانہ کے بعد انور پاشا سلطنت ترکیہ کے وزیر دماغ اور جمال پاشا جو جنوبی افواج کے کمانڈر تھے مکہ آئے تو ان سے انھوں نے گذارش کی کہ ہندستان کی سرحد تک ان کے سفر کا بندوبست کر دیا جائے اور قسطنطنیہ جانے کی بھی تجویز پیش کی لیکن بد قسمتی کو کیا کہیئے کہ مکہ کے شریف حسین نے انگریزوں کے ترغیب دینے پر حکومت آل عثمان کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ محمود الحسن معہ حسین احمد مدنی اور دو اور ساتھیوں کے برطانیہ کے حوالے کر دیئے گیے۔ اور برطانیہ نے ان کو جلا وطن کر کے مالٹا بھیج دیا جہاں وہ قیدی کی حیثیت سے رکھے گیے۔/ 14

لڑائی ختم ہونے کے بعد وہ اور ان کے ساتھی بمبئی لے جائے گیے اور جنوری 1920ء رہا کر دیئے گیے۔ جہاز سے اترتے ہی وہ فوراً خلافت کمیٹی کے دفتر گیے اور باوجود اپنی بیماری اور کبرسنی کے پورے اخلاص اور دل گردے سے جو تا ہے اپنے آپکو تحریک میں ڈال دیا وہ علی گڑھ گیے اور یونیورسٹی کے اسٹاف اور طلبا سے اپیل کی کہ ان اداروں کا بائیکاٹ کریں جو گورنمنٹ سے امداد لیتے ہیں اور جدید نیشنل یونیورسٹی (جامعہ ملیہ اسلامیہ) میں جسے قایم کرنے میں انھوں نے مدد دی تھی شامل ہو جائیں۔

انھوں نے جمعیتہ علماء ہند کی دلی کی کانفرنس کی صدارت کی اور 21 نومبر 1920ء کو اپنے افتتاحی خطبہ میں سیاسیات ہند پر اپنے سیاسی عقائد کا اظہار کیا انھوں

---

14 - The account is based upon Husain Ahmed Madni's Autobi-ography (NAQSHI HAYAT) published in 1953. In his earlier book, Safarnama-i Shaikh-ul-Hind written in 1922, these facts were either omitted or denied, because the Conditions did not permit their revelation

نے مسلمانوں کے مذہبی پیشواؤں سے اپیل کی کہ وہ مقامات مقدسہ پر مسلم اقتدار کے قیام کے لیے اور ہندستان کو جابرانہ حکومت کی غلامی سے نجات دلانے کے لیے برابر جنگ کرتے رہیں انھوں نے مختلف فرقوں کے مابین اتحاد و اتفاق اور سماجی میل کو مضبوط کرنے کے لیے حسب ذیل الفاظ میں نصیحت کی ا۔

"آپ لوگ خوب سمجھ لیجئے کہ اگر اس کے خلاف حالات (افتراق) قایم رہے تو ہندستان کی آزادی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ناممکن بنادیں گے دفتری حکومت کا آہنی پنجہ روز بہ روز سخت ہوتا جائے گا۔ اور جو اسلامی اثرات کے دھندلے نقوش رہ گئے ہیں وہ بھی صفحہ وجود سے حرف غلط کی طرح مٹا دیئے جائیں گے۔ اس نے اگر ہندستان کے دونوں فرقہ اور حربی نسل سکھ کو ملاکر یہ تینوں صلح و آشتی سے رہیں تو میری سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیسے ایک چوتھی قوم خواہ وہ کسی قدر طاقتور ہو۔ ہندستانیوں کے مشترکہ مقاصد کو اپنی متشددانہ اور جابرانہ حکومت کے بل پر شکست دے سکے گی" 15

پانچ سو علماء جو اس کانفرنس میں شریک تھے انھوں نے اس فتوے پر دستخط کیے جس میں مسلمانوں سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ گورنمنٹ سے ترک موالات کریں اور تمام سول اور ملٹری ملازمتوں سے علیحدہ ہوجائیں۔

محمود الحسن کا اس کانفرنس کے کچھ ہی دنوں بعد انتقال ہوگیا۔ ان کا خرقہ خلافت ان کے محبوب شاگرد حسین احمد مدنی کے باوقار کندھوں پر پڑا جو مالٹا میں ان کے ساتھی تھے۔ اور احیاء اسلام اور ہندستان کی آزادی کے متعلق وہی رائے رکھتے تھے جو ان کے استاد کی تھی۔

حسین احمد مدنی

حسین احمد مدنی 1957-1879 دیوبند میں محمود الحسن کے محبوب شاگرد تھے لیکن قبل اس کے کہ وہ دیوبند میں اپنی تعلیم مکمل کریں ان کے والد نے مکہ ہجرت کر جانے کا فیصلہ کرلیا۔ 1316H - (1889-90 A.D) اس لیے پورا خاندان مکہ چلا گیا۔ حسین احمد نے اس کے بعد سولہ سال

15۔ Ibid, P. 33.

13DPD 71-17.

حجاز میں بسر کیے۔ صرف کبھی کبھی ہندستان بھی آجاتے تھے جب 1332 ہجری میں (1916 A.D) محمود الحسن مکہ پہنچے تو حسین احمد جنھوں نے اب تک سیاسیات میں کسی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ ہندستان کی آزادی کے مشن کے پرجوش حامی بن گیے وفادار شاگرد اپنے استاد کا معتمد اور مشیر ہو گیا اور جب وہ جلاوطن کر کے مالٹا بھیجے گیے اور وہاں قید کر دیے گیے تو وہ ان کے ساتھ ساتھ تھا۔

1920 کی رہائی کے بعد وہ خلافت اور ترک موالات کی تحریک میں ایک پرجوش کارکن تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد جو تحریک خلافت کے رہنما تھے۔ ان کی دعوت پر انھوں نے عربی مدرسہ کا کلکتہ میں چارج لیا جو ابھی حال میں قایم کیا گیا تھا یہاں سے وہ سلہٹ چلے گیے جہاں ایک استاد کی حیثیت سے چھ سال تک درس حدیث دیتے رہے۔ 1928 میں دیوبند کے ہیڈ ماسٹر کی حیثیت سے ان کا انتخاب ہوا اور اس کے بعد کے تیس سال انھوں نے دیوبند کی خدمت میں گزارے اس اس زمانہ میں جب کہ وہ تعلیمی کاموں میں مشغول تھے۔ وہ تحریک آزادی جنگ میں بڑے جوش و خروش سے حصہ لیتے رہے۔ اپنی سیاسی کارروائیوں اور قانون کی خلاف ورزی کی وجہ سے وہ کئی مرتبہ قید کیے گیے۔ کوئی چیز۔ گورنمنٹ کی ترغیب و تحریص، مسلم لیگ کی مخالفت، مخالف علما کے حملے اور خود ان کی قوم کے بچھڑے ہوئے لوگوں کی گالیاں آزادی ہند اور ہندو مسلم اتحاد کے بارے میں جو انھوں نے پختہ اور پرجوش عقیدہ قایم کیا تھا اس سے ان کے پائے استقلال میں ذرا بھی لغزش نہ پیدا کر سکی۔

حسین احمد اپنے لائق احترام استاد اور رہنما محمود الحسن کے کہنے پر میدان سیاست میں آئے تھے لیکن ان کی سیاست جذباتی نہ تھی۔ سوسائٹی اور حکومت کے مسائل کے بارے میں یہ ان کا ایک نقطہ نظر تھا۔ یہ ان کی تحریرات سے پوری طرح ثابت ہے جو انھوں نے ہندستان کی سیاست اور اقتصادیات اور بین الاقوامی امور پر لکھے ہیں۔

مذہبی معاملات میں ان کا علم گہرائی اور وسعت دونوں میں غیر معمولی تھا لیکن یہ سخت تعجب کی بات ہے کہ کس طرح ایک مولوی نے ہندستان کی سیاسی اور اقتصادی تاریخ اور مغربی طاقتوں کے اسلامی ملکوں سے تعلقات کے بارے میں اس عظیم مقدار میں اطلاعات فراہم کریں اس میں شک نہیں کہ مکہ میں ان کی دس سال سے ڈیوڑھی مدت تک تقریباً مکہ کی رہائش جو مسلم ممالک کا مرکز ہے اور اس اس کے تقریباً پانچ سال تک مالٹا کی قید و بند میں رہنے سے مسلم ممالک کے بہت سے لوگوں سے ان کی ملاقاتیں ہوئیں اور یورپ یعنی جرمنی آسٹریا اٹلی

وغیرہ کے لوگوں سے بھی ملے ان لوگوں سے بین الاقوامی معاملات پر انھوں نے بہت کچھ معلومات حاصل کیں۔

محمود الحسن کے برخلاف جن کے خیالات ان کے موقع بہ موقع کی تقریروں اور ان کے پیرؤوں کی اطلاعات میں بکھرے پڑے ہیں حسین احمد نے ایک کثیر مقدار میں اپنی تصنیفات اور تحریرات چھوڑی ہیں جن میں ان کے خیالات واضح طور پر درج ہیں۔

دوسرے اہم سنجیدہ ہندو اور مسلم مفکرین کی طرح حسین احمد بھی جس بات پر سب زیادہ زور دیتے تھے وہ انسانی زندگی کے اغراض و مقاصد کے بنیادی اصول دونوں رخ سے تھے۔ خواہ وہ اندرونی طور پر اس کی ابدی روح کے بارے میں اور بیرونی طور پر انسان اور فطرت سے ہم آہنگی کے بارے میں اس کے کلی رویہ کا اظہار۔

ایک مسلم اسکالر (عالم) کی حیثیت سے ان کا کامل یقین تھا کہ قرآن کلام الہی اور حدیث یعنی پیغمبر کے ارشادات اور اعمال کا مجموعہ۔ انسانی زندگی کے ہر دو پہلوؤں کے لیے مکمل ہدایت و رہنمائی رکھتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مذہب کلی طور پر۔ انسانی زندگی کے ہر شعبہ کے لیے مکمل ہدایت اور ضابطہ ہے اور اس لیے صرف اعتقادات، عبادات اور اخلاقیات ہی کو اس کے زیر ہدایت برتنا چاہیے بلکہ ان امور کو بھی جن کا تعلق سماج، اقتصادیات، سیاست یا کلچر کے معاملات سے ہے۔ روحانی اور دینوی معاملات میں کوئی تصادم نہ ہونا چاہیے۔

اس لیے سچا مسلمان وہ جو خیالات، کلام اور عمل سب میں احکام الہیہ کا مطیع ہے اور کسی حکم کو جو اس کے خلاف ہو ماننے سے انکار کرتا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ کوئی مسلمان اپنی آزادی کسی دینوی حکمران کو رہن نہیں کرسکتا اس لیے وہ کسی طرح اور کسی حالت میں ایک ایسے غیر مسلم باہری کا مطیع نہیں ہوسکتا ہے جس کا قانون اور جس کی گورنمنٹ کا مقصد یہ ہے کہ اسلامی تصورات اور اسلامی طرز زندگی کو تباہ و برباد کر دے۔

اس لیے ہر مسلمان کا یہ مذہبی فرض ہے کہ وہ حتی المقدور اپنی پوری طاقت لگا کر ہندستان سے برطانیہ کی مملکت کو اکھاڑ پھینکے۔ بے شمار حوالے دیے جا سکتے ہیں جن میں مسلمانوں کو پرجوش طور پر ابھارا گیا ہے کہ بیرونی حکمران کے خلاف بغاوت کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ اور ہندستان کے دوسرے فرقوں کے اتحاد و تعاون سے غلامی کا جوا اپنے کندھوں سے اتار پھینکیں۔

اس اپیل کے ساتھ ہی ساتھ بغاوت کو حق بہ جانب قرار دینے کے لیے مفصل بیانات دیے گیے ہیں۔ اپنی سوانح حیات کے 336 صفحات میں سے دو سو صفحات صرف اس بات کی تفصیل پر صرف کیے گیے ہیں کہ برطانوی ملوکیت کے کتنے تباہ کن نتائج ہوئے ہیں۔ ان میں حسب ذیل باتیں قابل ذکر ہیں (1) باشندگان کی اہانت نسلی اور قومی امتیازات برت کر اور اونچی ملازمتوں سے ان کو محروم کر کے (2) ملک کی اقتصادی تباہی مال گزاری کے نظام اور صنعت و تجارت کو برباد کر کے (3) غلط نظام عدلیہ جو مقدمہ بازی اور رشوت خوری کی ہمت افزائی کرتا ہے اور انصاف میں دیر ہونے اور بہت زیادہ خرچ کرانے کا ذمہ دار ہے۔ (4) قانون سازی کی کارروائیوں سے ہندستان کو الگ تھلگ رکھنا اور (5) بیرونی اقتدار کے سبب عامۃ الناس کے اخلاق کی گراوٹ۔

اسی تصنیف کی دوسری جلد میں کافی اوراق اس کی تفصیل پر کیے گیے ہیں کہ کس طرح مغربی طاقتوں نے حکومت آل عثمان کے ساتھ معاملات میں سنجیدہ وعدوں کی خلاف ورزی کی اور فریب دہی سے کام لیا۔ یہ بھی جتلایا گیا ہے کہ ان تمام طاقتوں میں برطانیہ کا نامۂ اعمال سب سے زیادہ سیاہ ہے۔ ان واقعات سے یہ لازمی نتیجہ نکلتا ہے کہ برطانوی اسلام کے سب سے بڑے دشمن ہیں اور مسلمانوں کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے وجود کی بقا اور اپنے مستقبل کی زندگی کے لیے برطانوی مملکت کو جو ایشیا اور افریقہ کے اقوام کے لیے ایک خطرہ ہیں تباہ و برباد کر دیں/16

لیکن مدنی کے خیال کے مطابق مسلمانان عالم کی نجات ہندستان کی آزادی پر منحصر ہے اسی کو حاصل کرنے کے لیے شاہ ولی اللہ کی تحریات سے ایک تحریک انیسویں صدی میں چلائی گئی جس کا انجام 1857ء کی بغاوت ہوا لیکن بغاوت کے بعد جس بے رحمی اور بربریت کا اظہار کیا گیا اس نے جوش کو مدھم کر دیا۔ اور تحریک کو ایک نیا موڑ دینے کی ضرورت پیش آئی یہ کام انڈین نیشنل کانگرس نے کیا جس کے شروع ہی میں ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت اور انتہائی اہمیت کو سمجھ لیا تھا۔

حسین احمد یہ تسلیم کرتے تھے کہ کانگرس ہی طاقت چھیننے کا خاص آلہ ہے اور باوجود اس کے کہ ان کو بہت اشتعال دیا گیا اور اختلافات کیے گیے لیکن 1920ء میں جو فیصلہ انھوں نے کانگرس کے نظام کی حمایت کا کیا تھا اس میں ان کے دل کے اندر کبھی تذبذب پیدا نہیں ہوا خاص کر جب

---

16 - Madni Husain Ahmed, "NAQSH-I-HAYAT" (Urdu) 2 Vols

کہ 1929ء میں کانگریس نے یہ اعلان کردیا کہ ہندستان کی آخری منزل آزادی کامل ہے۔ ان کا ہندستان کے مسائل پر واضح رویہ اور کانگریس بالکلیہ حمایت کی بنا پر ان کو بہت سے تنازعات کا سامنا کرنا پڑا۔

ان تمام مسائل میں جس نے تلخ ترین جھگڑا کھڑا کیا وہ ہندو مسلم اتحاد کا مسئلہ تھا ان کا عقیدہ تھا کہ ہندستان کے باشندوں کو مذہبی اختلافات کے باوجود ایک متحدہ قوم بننا چاہیے تاکہ آزادی حاصل ہو۔ اور سب کے فلاح و بہبود کی حکمت عملیوں کی کارروائیاں کی جائیں ایک تقریر میں انھوں نے کہا کہ زمانہ حاضرہ کی قومیں ملک کی بنیاد پر بنی ہیں نہ کہ نسل اور مذہب کی بنیاد پر۔

قبال نے یہ سمجھا کہ انھوں نے اس تصور پر حملہ کیا ہے کہ قوم کی اصل اساس مذہب ہے اور جس قومیت کی بنیاد نسل، زبان یا ملک ہے وہ ملعون ہے ان کے نزدیک علاقائی بنیاد پر قایم قومیت اسلامی تصورات کے خلاف تھی۔ انھوں نے ایک مضمون لکھا جس میں یہ بحث کی کہ مدنی کے دعوی کی تائید نہ تو عربی زبان کرتی ہے اور نہ اسلامی لٹریچر۔ انھوں نے ان کے علم کو بھی ناقص بتلایا اور ایک نظم میں ان کا مضحکہ اڑایا۔

حسین احمد نے مجبوراً جواب لکھا کیوں کہ اقبال کے خیالات سے قومیت کے مفاد کو سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ یہ ایک مختصر رسالہ ہے جس کا نام متحدہ قومیت اور اسلام ہے/17 بڑے عالمانہ انداز میں انھوں نے مسئلہ کے دو پہلوؤں پر بحث کی ہے (1) قوم کے معنی اور اس کی تعریف اور اس میں اور ملت میں کیا فرق ہے اور (2) قرآن، حدیث اور اسلامی تاریخ اس بارے میں کیا بتلاتے ہیں۔

انھوں نے ابتدائی، متوسط اور حال تینوں زمانوں کے عربی لغات کا ذکر کیا ہے یہ بات ثابت کرنے کے لیے کہ لفظ "قوم" سے علاوہ اور معنوں کے جن میں وہ استعمال ہو سکتا ہو۔ مراد مردوں اور عورتوں کا کوئی نہ گروہ ہے جو کسی مشترک مقصد کے لیے ساتھ مل کر جد و جہد کرنے کے لیے

17- Madni Husain Ahmed 'Mutahadda Qaumiyat aur Islam (Urdu) Published The Nazim-e Majlis Qaumi-mal Maarif Deoband, U.P.

اپنے آپ کو پابند کریں۔ ضروری نہیں ہے کہ وہ مقصد مذہبی ہی ہو۔

قران کا طرز کلام اس معنی کی تصدیق کرتا ہے کیوں کہ قرآن نے خدا کے پیغمبروں اور ان ایمان نہ لانے والوں دونوں کو ایک قوم کہا ہے مثلاً محمدؐ اور قریش۔ قرآن میں ایک ایسے گروہ کا تصور بھی موجود ہے جو مختلف مذاہب کے لوگوں سے مرکب ہو مثلاً پیروان عاد اور فرعون۔

لیکن پیغمبر اسلام کی مثال اس معنی کی تائید میں سب سے زیادہ یقین دلانے والی شہادت ہے کیونکہ اپنی پیغمبری کے چودھویں سال پیغمبر محمدؐ نے مدینہ کے یہودیوں اور اپنے مسلمان پیروں کو اس بات پر متحد کیا کہ دونوں نے اقرار صالح کے ساتھ یہ معاہدہ کیا کہ وہ بت پرست عربوں کے خلاف جو مدینہ پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہے تھے ان کے خلاف جنگ کریں گے۔ شرائط معاہدہ یہ تھے کہ ہر فریق اپنے مذہب کی پیروی میں آزاد ہوگا۔ لیکن بقیہ تمام معاملات میں یہودی اور مسلمان ایک قوم متصور ہوں گے۔

لفظ "ملت کے بالکل مختلف معنی ہیں اس سے مراد صرف وہ گروہ ہوتا ہے جو مذہب اور احکام الٰہیہ (شریعت) کی بنیادوں پر منظم ہو اس کا اعلان ہر مذہبی گروہ پر ہو سکتا ہے خواہ اس کے اقرار کا مشترک مذہبی کوئی بھی ہو۔

چنانچہ ان سب کا نتیجہ یہ ہے کہ اسلام غیر مسلموں سے مل کر ایک متحدہ قومیت کی تعمیر میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالتا۔ بلکہ غالباً وہ اس کی ہمت افزائی کرتا ہے۔ دیگر تصورات اس اتحاد کی زبردست تائید کرتے ہیں ہندو اور مسلمان دونوں زیادہ تر ایک ہی نسل کی پیداوار ہیں سیکڑوں سال سے ایک ملک میں رہائش نے ان میں یکساں رویہ اور طرز زندگی بنا دیا ہے۔ وہ ایک مشترک زبان بولتے ہیں اور ان میں تاریخی روایات بھی مشترک ہیں دونوں نے مل کر اپنا الگ الگ مذہب اور پرسنل لا قائم رکھتے ہوئے ایک یکساں ادب، فنون لطیفہ اور موسیقی کو تعمیر کیا ہے۔ گاؤں اور شہروں میں وہ بے شمار زندگی کے مسائل میں ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہیں یہی حال اقتصادی امور، اسکولوں، کالجوں، ڈسٹرکٹ بورڈوں، میونسپل بورڈوں اور قانون ساز اسمبلیوں کا بھی ہے۔

المختصر متحدہ قومیت کی تعریف حسب ذیل الفاظ میں کی جا سکتی ہے۔

"متحدہ قومیت سے میری مراد ایسی طرز کی متحدہ قومیت ہے جیسی کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم

نے مدینہ کے بسنے والوں کے مابین قایم کی تھی۔ یعنی میری خواہش یہ ہے کہ باشندگان ہندستان خواہ ان کا کوئی مذہب ہو وہ اس حیثیت سے کہ ہندستانی ہیں اور ایک ہی ملک کے رہنے والے ہیں۔ وہ سب مل کر ایک قوم بن جائیں۔ انھیں کے ساتھ تمام باشندگان ہند کو اپنے مذہبی عقائد کے اقرار و اعلان، اپنے مقاصد حیات اور طریقہ عبادت میں آزاد ہونا چاہیے اور ان کو اس کی بھی آزادی ہونی چاہیے کہ وہ اپنے مذہبی رسم و رواج تیوہاروں اور مذہبی ہدایت ناموں میں بھی آزاد ہوں اور جہاں تک ان کا مذہب اجازت دے پرامن طریقہ پر اپنے مذہب کی تبلیغ کرنے میں بھی آزاد ہوں۔/ 18

اقبال نے اعتراض کے رخ سے جو قطعہ لکھا تھا اس کا یہ جواب دیا ہے۔

ترسم نہ رسی بکعبہ اے اعرابی..... کایں رہ کہ تو میروی بانگلستان است

(اے صحرائے عرب کے صحرانورد مجھے خوف ہے کہ تو مکہ کے مقدس مقام پر نہیں پہنچے گا کیونکہ تو جس سڑک پر جارہا ہے وہ انگلستان جاتی ہے)

جہاں تک ابوالاعلیٰ مودودی کا تعلق ہے۔ حسین احمد نے ان کے مذہبی آراکی مکمل طور پر تردید کی جن کے متعلق انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ سُنیوں کے عقائد کے بالکل خلاف ہیں اور خارجیوں اور انھیں کی قسم کے لوگوں کی صف میں آتے ہیں۔ مودودی کا یہ کہنا کہ مسلمان صرف ایک اپنی علحدہ سوسائٹی کے اندر ہی رہ سکتے ہیں اور غیر مسلموں کے ساتھ سیاسی اقتدار میں شریک نہیں ہو سکتے بالکل غلط اور ناقابل قبول ہیں۔

دستور میں ایک آزاد اور بلا تقسیم ہندستان کا دستور کیا ہو اس پر وہ واضح رائے رکھتے تھے۔ حسب ذیل مدات میں ان کا ملخص بیان کیا جاسکتا ہے۔

(1) ہندستان کی حکومت ایک پبلک ہوگی اور اس کا صدر عام انتخاب سے چنا جائے گا وہ سب سے ارفع انتظامی افسر کے اختیارات برتے گا۔

(2) مرکزی حکومت میں مسلمان اقلیت میں ہوں گے لیکن، ان کے مذہبی، سیاسی اور اقتصادی حقوق کا تحفظ کیا جائے گا۔ مرکز صرف چند امور کو اپنے ہاتھ میں رکھے گا۔ یعنی دفاع، خارجہ حکمت عملی رسل و رسائل، سواری، باربرداری اور مالیات۔ مابقی امور صوبہ کے اختیار میں ہوں گے مذہبی

---

18 - Ibid, P. 53

والا کہا جا سکے۔ پہلے پانچ سالوں میں مسلم لیگ کی سالانہ کانفرنسیں زیادہ تر اظہار وفاداری سیاسی ایجیٹیشن کی مذمت اور گورنمنٹ کی حمایت وامداد کے مواقع فراہم کرتی تھیں۔

اس کے بعد ایک تبدیلی آئی کیوں کہ مسلمانوں سے حکومت کے رویہ میں تبدیلی آ گئی تھی۔ جنگ بلقان اور پہلی جنگ عظیم نے مسلمانان ہند میں وسیع پیمانہ پر غم وغصہ کی لہر دوڑا دی اور لیگ کو مجبور ہو کر کانگرس کی کشمکش کا شکار ہونا پڑا۔1918ء میں علما ایک بڑی تعداد میں اس کے اندر شریک ہو گئے لیکن جب 1920ء میں کانگرس کے سالانہ جلسہ میں ترک موالات کی تجویز منظور ہوئی تو لیگ خوفزدہ ہو گئی۔

1921ء میں لیگ نے قومیت پسندانہ سیاسیات سے ہٹ کر کانگرس کی مخالفت اور فرقہ وارانہ مفادات کے نشو ونما کا علم بلند کیا۔

حسین احمد کا خیال یہ تھا کہ اس کے بعد آئندہ کل عرصہ تک لیگ کا رویہ روز افزوں تخریب اور بربادی کا رہا۔ لیگ نے فرقہ وارانہ نفرت کی آگ کو مشتعل کیا تشدد پر لوگوں کو اکسایا انتقام کے فلسفہ کی تبلیغ کی۔ اور چنگیز خاں اور ہلاکو کے مثال کی نقل کیا سیاسی حقوق کے حصول کے لیے راست اقدام کا اعلان کیا حکومت کانگرس کی سخت مذمت کی اور جنگ کی دھمکی دی۔

انھوں نے لیگ کے دو قومی نظریہ کو رد کر دیا۔ اور یہ پیشنگوئی کی کہ اس سے عظیم مضرات کا غالب اندیشہ ہے کہ ملک کے داخلی اور خارجی دونوں امور میں سخت مضرت کا سامنا کرنا پڑے گا اگر ہندستان کی تقسیم ہو گئی۔ انھوں نے لکھا کہ ہندستان کو دو الگ الگ ریاستوں میں بانٹ دینے سے مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچے گا۔ ان کا اتحاد غائب ہو جائے گا ان صوبوں میں جہاں ان کی اقلیت ہے ان کی سیاسی اور اقتصادی حیثیت تہ وبالا ہو جائے گی اور ان صوبوں میں جہاں ان کی اکثریت ہے ان کی مرکزی حکومت داخلی اور خارجی مشکلات میں مبتلا ہو گی جو مشکلات لاینحل ہوں گے۔ گورنمنٹ اپنی اس حالت سے غیر مطمئن ہو کر کسی دوسری طاقت سے مدد مانگنے پر مجبور ہو گی۔ جس کا انجام یہ ہوگا کہ اقتصادیات کا نشیب وفراز بجائے ان کے ہاتھ میں رہنے کے بیرون ملک کی حکومتوں اور سرمایہ داروں کے ہاتھ میں منتقل ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ گورنمنٹ وسائل آمدنی کے فقدان اور اخراجات کی زیادتی کے باعث اپنی دفاعی ذمہ داریوں کو مناسب طور پر ادا نہ کر سکے گی اور مجبور ہو کر اپنے دفاعی انتظامات سے باندھنا پڑے گا اور اس طرح ملک کا مستقبل ان کے ہاتھ میں دے دیا جائے گا۔[21]

کے ساتھ تھے یعنی دولت مند مسلمان' زمینداران اور تعلقداران و راجگان کے خاندان بڑے بڑے تجار اور اعلیٰ منصب کے پیشہ ور۔ دوسرے اکثریتی فرقہ کے لیڈران یا تو مسلمانوں کے خوف کے جذبات کی گہرائیوں کو ناپنے میں ناکام رہے یا اقلیتی مسائل کی پیچیدگیوں کے سمجھنے میں وہ ہندستان کے مسائل کو برطانیہ کے مسائل کے مثل تصور کرنے کی جانب راغب تھے۔ جہاں کلچر کے اعتبار سے ایک متحدہ سوسائٹی ہے اور سیاسی اعتبار سے ایک وحدانی سوسائٹی بدقسمتی سے مسلم لیگ اسے پسند نہیں کرتی تھی کہ مسلم فرقہ کو اقلیت کی حیثیت دے بلکہ یہ اکثریت سے برابری پر اپنے دعوے کی بنیاد رکھتی تھی جس نے ہندوؤں کے قدامت پرست طبقہ کو ڈرا دیا۔

لیکن سب سے اہم معاملہ جس سے ملک کی تقسیم ہوگئی حکومت کا رویہ تھا۔ گورنمنٹ نے مخالفین کانگرس مسلم لیڈران پر اپنی عنایت بے غایت اور سرپرستی میں اضافہ کرکے اور پروپیگنڈہ کے ذریعہ مسلمانوں کے خوف میں اضافہ کرکے اور ہندو مسلمانوں کے اختلافات زور دے کر علیحدگی پسندی کے رجحانات کی ہر طرح سے ہمت افزائی کی۔ اس پروپیگنڈہ میں سرکاری' غیر سرکاری حضرات اور اینگلو انڈین پریس نے اہم کردار ادا کیا۔

"وہ یعنی مسلمان اس کا پابند ہوگا کہ اس صلحنامہ کے جملہ شرائط پر عمل درآمد کرے جو اس نے غیر مسلموں سے کیے ہیں جس کا ایک تقاضہ یہ بھی ہوسکتا ہے وہ کسی معاملہ میں عالم گیر اسلامی برادری کی تائید یا امداد نہ کرسکے اور مدد نہ کرنے پر مجبور ہو"[20]

حسین احمد نے مسلم لیگ کی سیاسیات کو اپنے اصول کی بنا پر جانچا اور ان کو نہ صرف مجموعی طور پر کل ہندستان کے لیے بلکہ مسلمانان ہند کے واسطے اور دنیا کے واسطے مضرت رساں پایا۔

انھوں نے مسلم لیگ کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہوتے بتلایا کہ اس کی ابتدا 1906ء میں برطانوی افسران کی ترغیب پر آرچ بول (ARCH BOLD) پرنسپل ایم۔ اے او کالج علی گڑھ کو در میان میں ڈال کر ہوئی۔ لیگ کے کرتا دھرتا وہی لوگ تھے جنھوں نے 1906ء کے شملہ ڈیپوٹیشن کی تنظیم کی تھی جو مولانا محمد علی کے الفاظ میں "ایک خود سپردگی" کا کارنامہ تھا۔ یہ گروہ اونچے طبقہ کے مسلمانوں پر مشتمل تھا۔ یعنی اہل ثروت' مالکان آراضی حکومت سے مراعات۔ مثل ملازمتیں اور خطابات وغیرہ طلب کرنے والے۔ ان میں شاید کوئی بھی ایسا نہ تھا جسے پبلک کا لیڈر یا مفاد عامہ کے لیے کام کرنے

---

20 - Madni Husain Ahmed 'Mutaheddda Qaumiyat aur Islam, P. 65

والا کہا جا سکے۔ پہلے پانچ سالوں میں مسلم لیگ کی سالانہ کانفرنسیں زیادہ تر اظہار وفاداری ، ایجیٹیشن کی مذمت اور گورنمنٹ کی حمایت و امداد کے مواقع فراہم کرتی تھیں ۔

اس کے بعد ایک تبدیلی آئی کیوں کہ مسلمانوں کے حکومت کے رویہ میں تبدیلی آ گئی تھی۔ جنگ بلقان اور پہلی جنگ عظیم نے مسلمانان ہند میں دسیع پیمانہ پر غم و غصہ کی لہر دوڑا دی اور لیگ کو مجبور ہو کر کانگرس کی کشمکش کا شکار ہونا پڑا۔ ۱۹۱۸ء میں علما ایک بڑی تعداد میں اس کے اندر شریک ہو گیے لیکن جب 1920 میں کانگرس کے سالانہ جلسہ میں ترک موالات کی تجویز منظور ہوئی تو لیگ خوفزدہ ہو گئی ۔

1921ء میں لیگ نے قومیت پسندانہ سیاسیات سے ہٹ کر کانگرس کی مخالفت اور فرقہ دارانہ مفادات کے نشو و نما کا علم بلند کیا۔

حسین احمد کا خیال یہ تھا کہ اس کے بعد آئندہ کل عرصہ تک لیگ کا رویہ روز افزوں تخریب اور بربادی کا رہا۔ لیگ نے فرقہ دارانہ نفرت کی آگ کو مشتعل کیا تشدد پر لوگوں کو اکسایا انتقام کے فلسفہ کی تبلیغ کی۔ اور چنگیز خاں اور ہلاکو کے مثال کی نقل کیا سیاسی حقوق کے حصول کے لیے راست اقدام کا اعلان کیا۔ حکومت کانگرس کی سخت مذمت کی اور جنگ کی دھمکی دی ۔

انھوں نے لیگ کے دو قومی نظریہ کو رد کر دیا۔ اور یہ پیشنگوئی کی کہ اس سے عظیم مضرات کا غالب اندیشہ ہے کہ ملک کے داخلی اور خارجی دونوں امور میں سخت مضرت کا سامنا کرنا پڑے گا اگر ہندوستان کی تقسیم ہو گئی۔ انھوں نے لکھا کہ ہندوستان کو دو الگ الگ ریاستوں میں بانٹ دینے سے مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچے گا۔ ان کا اتحاد غائب ہو جائے گا ان صوبوں میں جہاں ان کی اقلیت ہے ان کی سیاسی اور اقتصادی حیثیت تہ و بالا ہو جائے گی اور ان صوبوں میں جہاں ان کی اکثریت ہے ان کی مرکزی حکومت داخلی اور خارجی مشکلات میں مبتلا ہو گی جو مشکلات لاینحل ہوں گے۔ گورنمنٹ اپنی اس حالت سے غیر مطمئن ہو کر کسی دوسری طاقت سے مدد مانگنے پر مجبور ہو گی ۔ جس کا انجام یہ ہوگا کہ اقتصادیات کا نشیب و فراز بجائے ان کے ہاتھ میں رہنے کے بیرون ملک کی حکومتوں اور سرمایہ داروں کے ہاتھ میں منتقل ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ گورنمنٹ وسائل آمدنی کے فقدان اور اخراجات کی زیادتی کے باعث اپنی دفاعی ذمہ داریوں کو مناسب طور پر ادا نہ کر سکے گی اور مجبور ہو کر اپنے دفاعی انتظامات سے ہاتھ دھونا پڑے گا اور اس طرح ملک کا مستقبل ان کے ہاتھ میں دے دیا جائے گا۔ 21/

کے ساتھ تھے یعنی دولت مند مسلمان، زمینداران اور تعلقداران و راجگان کے خاندان بڑے بڑے تجار اور اعلیٰ منصب کے پیشہ ور۔ دوسرے اکثریتی فرقہ کے لیڈران یا تو مسلمانوں کے خوف کے جذبات کی گہرائیوں کو ناپنے میں ناکام رہے یا اقلیتی مسائل کی پیچیدگیوں کے سمجھنے میں وہ ہندستان کے مسائل کو برطانیہ کے مسائل کے مثل تصور کرنے کی جانب راغب تھے۔ جہاں کلچر کے اعتبار سے ایک متحدہ سوسائٹی ہے اور سیاسی اعتبار سے ایک وحدانی سوسائٹی بدقسمتی سے مسلم لیگ اسے پسند نہیں کرتی تھی کہ مسلم فرقہ کو اولیت کی حیثیت دے بلکہ یہ اکثریت سے برابری پر اپنے دعوے کی بنیاد رکھتی تھی جس نے ہندوؤں کے قدامت پرست طبقہ کو ڈرا دیا۔

لیکن سب سے اہم معاملہ جس سے ملک کی تقسیم ہوگئی حکومت کا رویہ تھا۔ گورنمنٹ نے مخالفین کانگرس مسلم لیڈران پر اپنی عنایت بے غایت اور سرپرستی میں اضافہ کرکے اور پروپیگنڈہ کے ذریعہ مسلمانوں کے خوف میں اضافہ کرکے اور ہندو مسلمانوں کے اختلافات زور دے کر علیحدگی پسندی کے رجحانات کی ہر طرح سے ہمت افزائی کی۔ اس پروپیگنڈہ میں سرکاری، غیر سرکاری حضرات اور اینگلو انڈین پریس نے اہم کردار ادا کیا۔

"وہ یعنی مسلمان اس کا پابند ہوگا کہ اس صلحنامہ کے جملہ شرائط پر عمل درآمد کرے جو اس نے غیر مسلموں سے کیے ہیں جس کا ایک تقاضہ یہ بھی ہوسکتا ہے وہ کسی معاملہ میں عالم گیر اسلامی برادری کی تائید یا امداد نہ کرسکے اور مدد نہ کرنے پر مجبور ہو"/20

حسین احمد نے مسلم لیگ کی سیاسیات کو اپنے اصول کی بنا پر جانچا اور ان کو نہ صرف مجموعی طور پر کل ہندستان کے لیے بلکہ مسلمانان ہند کے واسطے اور دنیا کے واسطے مضرت رساں پایا۔

انھوں نے مسلم لیگ کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے بتلایا کہ اس کی ابتدا 1906ء میں برطانوی افسران کی ترغیب پر آرچ بول (ARCH BOLD) پرنسپل ایم۔ اے او کالج علی گڑھ کو دربدن میں ڈال کر ہوئی۔ لیگ کے کرتا دھرتا وہی لوگ تھے جنھوں نے 1906ء کے شملہ ڈیپوٹیشن کی تنظیم کی تھی جو مولانا محمد علی کے الفاظ میں "ایک خود سپردگی" کا کارنامہ تھا۔ یہ گروہ اونچے طبقہ کے مسلمانوں پر مشتمل تھا۔ یعنی اہل ثروت، مالکان آراضی حکومت سے مراعات۔ مثل ملازمتیں اور خطابات وغیرہ طلب کرنے والے۔ ان میں شاید کوئی بھی ایسا نہ تھا جسے پبلک کا ایثار یا مفاد عامہ کے لیے کام کرنے

---

20 - Madni Husain Ahmed Mutahadda Qaumiyat aur Islam, P. 65

اور اخبارات کی ادارت میں معاونت کرتے تھے۔ سولہ سال کی عمر میں انھوں نے خود اپنا اخبار "لسان الصدق" نکالا اور ایسے اعلیٰ و ارفع فاضل و ادیب جیسے کہ شبلی و حالی ان کے علم کی پختگی پر انگشت بدنداں تھے۔

ابھی ان کی عمر مشکل سے بلوغ کی ہوگی کہ وہ قدیم روایاتی معتقدات پر شک و شبہ کے شکار ہونے لگے۔ ایک نازک صورت ان کے والد بزرگوار کے ان سخت خیالات سے پیدا ہوئی جو وہ وہابیوں کے بارے میں رکھتے تھے۔ سر سید احمد خاں کی تحریرات پڑھنے کے بعد اس کی رفتار میں تیزی آئی۔ تو وہ اپنے والد کا بڑا ادب و احترام کرتے تھے۔ لیکن ان کے دل پر اس سے چوٹ لگی کہ ان کے والد وہابیوں کی آزاد خیالی کے غضبناک طور پر مخالف تھے اور ان لوگوں سے جو ان سے اتفاق نہیں کرتے تھے، نامعقولیت کے ساتھ عدم رواداری برتتے تھے۔ محبت اور انفرادیت کا دوطرفہ رحجان ان کے اندر بھر آیا یعنی وہابیوں کی محبت اور سر سید کی عقل پسندی۔ ان دونوں نے مل کر ان کے پیروں سے تقلید پسندی کی بیڑی کو کاٹ دیا۔ انہوں نے تقلید کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور تجدید کو اختیار کر لیا۔ دوسرا قدم یہ تھا کہ انہوں نے قدامت سے مانے ہوئے احکام اور مسائل کا جائزہ لیا۔ اور ان کو بھی رد کر دیا۔ اس کے بعد ان کا دماغ شک و شبہ سے بھر گیا اور انھوں نے مذہب ہی سے انکار کر دیا۔ اس کا نتیجہ عقائد سے بیزاری اور خدا کا انکار ہوا۔ کچھ زمانہ تک شک و شبہ اور عدم وفاداری کی تاریک وادی کی صحرانوردی کرتے رہے۔ اپنے کندھوں پر نہ ٹلنے والے ذہنی فکر اور روحانی غم کو لادے اپنے خاندانی روایات کے باغی کی حیثیت سے۔

لیکن آخر کار ایک دن آیا جب وہ اس روحانی کشمکش اور باطنی بے یقینی سے کامیاب ہو کر نکلے۔ ان کے عقائد از سر نو واپس آئے اور اس پختگی کے ساتھ آئے کہ پھر کسی امتحان یا آزمائش نے ان میں جنبش پیدا نہ کی۔ لیکن اس تجربہ نے ان کو ایک مختلف انسان بنا دیا۔ اب وہ اس منزل پر پہنچ گئے تھے جہاں کوئی چیز سوائے انتہائے غم، انتساب قلب، ترک علائق اور زندگی کو بھینٹ چڑھا دینے کے قابل قبول نہیں ہوتی۔ 25/

ان کے خیالات میں اس تبدیلی کے پھر پیدا ہونے کے دو اثرات تھے۔ اول یہ کہ اسلام پر ان

25- Azad, A. K. Tazkira compiled by Fazal-al-Din Ahmed Shirazi (1919) P.306.

وہ ایک جاذب شخصیت کے مالک تھے۔ وہ اپنے وضع قطع میں آمرانہ تنہائی پسند متکبر اور بلند اعزاز تھے۔ لیکن ان میں ذاتی منصوبے بالکل نہ تھے اور وہ عوامی تعریف وتحسین سے قطعی بے نیاز تھے۔ وہ منصب اور دولت کو کبھی خاطر میں نہیں لائے اور بڑے بڑے جلسوں سے دور بھاگتے تھے۔ لیکن وہ کسی سے نفرت یا بغض نہیں رکھتے تھے۔ معاف کرنا ان کی فطرت تھی۔ ان کو نہ تو تعریف وتوصیف اپنی جگہ سے ہلا سکتی تھی اور نہ گالیاں اور اہانتیں۔ سیاسیات میں وہ فرقہ بندی اور گروہ بندی سے بلند تھے وہ دوسرے کے نقطہ نظر کی رعایت صلح مصالحت، میل جول کے وہ خواہشمند تھے۔ لیکن ان میں ایک آہنی استقلال اور عزم تھا جسے کوئی چیز جنبش نہیں دے سکتی تھی۔ ایک بڑے وسیع پیمانہ پر ان کا احترام تھا۔ اور ان پر اعتماد کیا جاتا تھا تمام جماعتوں اور گروہوں کا ان کو اعتماد حاصل تھا خواہ وہ کسی فرقہ کے ہوں یا ان کا کوئی مقصد حیات ہو۔ لیکن ان کے آخری ایام میں مسلمانوں کے ایک بڑے حصہ نے ان کی سیاست سے اختلاف کیا۔ وہ ان چیدہ عالی دماغ ہندستانیوں میں تھے جو امتیاز اور شہرت کے طلب گار نہ تھے لیکن لوگ ان کو تلاش کرتے تھے اور قیادت ان کے سر پر زبردستی تھوپ دی جاتی تھی۔ آزاد وہ شخص تھے جنھوں نے بلا امداد غیرے خود اپنے کو بنایا اور خود اپنے کو تعلیم دی ان کی پرورش اور پرداخت روایاتی طرز کے قدامت پرست علماء کے خاندان کی فضا میں ہوئی لیکن وہ ایسے تھے کہ انھوں نے جدید ذہن ومزاج کے ترقی پسند ہندستانی لیڈروں کے دوش بدوش کام کیا اور ایک آزاد اور ترقی پذیر ہندستان کے جنم لینے میں بہت بڑا حصہ لیا۔

ابوالکلام غلام محی الدین احمد جن کا ادبی نام آزاد تھا۔ 1888ء میں مکہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے ہندستانی والد علماء کے ایک ممتاز خاندان کے وارث تھے اور ان کی عربی نژاد والدہ بھی ایک معزز علماء کے خاندان سے تھیں۔ عربی ان کی مادری زبان تھی اور تقوی اور علم ان کو اپنے والدین سے ورثہ میں ملا۔ ان کا بچپن ایسا تھا کہ وہ ایک قبل از وقت نشو ونما پائے ہوئے بچے کی طرح تھے اور وہ ایک آزاد اور تنقیدی دماغ کے مالک تھے انھوں نے روایاتی تعلیم کا کورس (درس نظامیہ) پندرہ سال کی عمر میں مکمل کر لیا یعنی جس مدت میں لوگ اسے ختم کرتے ہیں اس کا صرف ایک تہائی وقت صرف ہوا۔

بارہ سال کی عمر میں انھوں نے ہندستان کے رسائل میں مضامین لکھنے شروع کر دیے تھے

اور اخبارات کی ادارت میں معاونت کرتے تھے۔ سولہ سال کی عمر میں انھوں نے خود اپنا اخبار "لسان الصدق" نکالا اور ایسے اعلیٰ و ارفع فاضل و ادیب جیسے کہ شبلی و حالی ان کے علم کی پختگی پر انگشت بدنداں تھے۔

ابھی ان کی عمر مشکل سے بلوغ کی ہو گی کہ وہ قدیم روایاتی معتقدات پر شک و شبہ کے شکار ہونے لگے۔ ایک نازک صورت ان کے والد بزرگوار کے ان سخت خیالات سے پیدا ہوئی جو وہ وہابیوں کے بارے میں رکھتے تھے۔ سر سید احمد خاں کی تحریرات پڑھنے کے بعد اس کی رفتار میں تیزی آئی تو وہ اپنے والد کا بڑا ادب و احترام کرتے تھے۔ لیکن ان کے دل پر اس سے چوٹ لگی کہ ان کے والد وہابیوں کی آزاد خیالی کے غضبناک طور پر مخالف تھے اور ان لوگوں سے جو ان سے اتفاق نہیں کرتے تھے۔ نامعقولیت کے ساتھ عدم رواداری برتتے تھے۔ محبت اور انفرادیت کا دو طرفہ رجحان ان کے اندر ابھرا یعنی وہابیوں کی محبت اور سر سیّد کی عقل پسندی۔ ان دونوں نے مل کر ان کے پیروں سے تقلید پسندی کی بیڑی کو کاٹ دیا۔ انہوں نے تقلید کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور تجدید کو اختیار کر لیا۔ دوسرا قدم یہ تھا کہ انہوں نے قدامت سے مانے ہوئے احکام اور مسائل کا جائزہ لیا۔ اور ان کو بھی رد کر دیا۔ اس کے بعد ان کا دماغ شک و شبہ سے بھر گیا اور انہوں نے مذہب ہی سے انکار کر دیا۔ اس کا نتیجہ عقائد سے بیزاری اور خدا کا انکار ہوا۔ کچھ زمانہ تک شک و شبہ اور عدم وفاداری کی تاریک وادی کی صحرانوردی کرتے رہے۔ اپنے کندھوں پر نہ ٹلنے والے دنیائی فکر اور روحانی غم کو لادے اپنے خاندانی روایات کے باغی کی حیثیت سے۔

لیکن آخر کار ایک دن آیا جب وہ اس روحانی کشمکش اور باطنی بے یقینی سے کامیاب ہو کر نکلے۔ ان کے عقائد از سر نو واپس آئے اور اس پختگی کے ساتھ آئے کہ پھر کسی امتحان یا آزمائش نے ان میں جنبش پیدا نہ کی۔ لیکن اس تجربہ نے ان کو ایک مختلف انسان بنا دیا۔ اب وہ اس منزل پر پہنچ گئے تھے جہاں کوئی چیز سوائے انتہائے غم، انتساب قلب، ترک علائق اور زندگی کو بھینٹ چڑھا دینے کے قابل قبول نہیں ہوتی"۔/25

ان کے خیالات میں اس تبدیلی کے پھر پیدا ہونے کے دو اثرات تھے۔ اول یہ کہ اسلام پر ان

25- Azad, A.K. Tazkira compiled by Fazal-el-Din Ahmad Shirazi (1919) P.306.

وہ ایک جاذب شخصیت کے مالک تھے۔ وہ اپنے وضع قطع میں آمرانہ تنہائی پسند حکبر اور بلند اعزاز تھے۔ لیکن ان میں ذاتی منصوبے بالکل نہ تھے اور وہ عوامی تعریف وتحسین سے قطعی بے نیاز تھے۔ وہ منصب اور دولت کو کبھی خاطر میں نہیں لاتے اور بڑے بڑے جلسوں سے دور بھاگتے تھے۔ لیکن وہ کسی سے نفرت یا بغض نہیں رکھتے تھے۔ معاف کرنا ان کی فطرت تھی۔ ان کو نہ تو تعریف و توصیف اپنی جگہ سے ہلا سکتی تھی اور نہ گالیاں اور اہانتیں۔ سیاسیات میں وہ فرقہ بندی اور گروہ بندی سے بلند تھے دوسرے کے نقطہ نظر کی رعایت صلح مصالحت، میل جول کے وہ خواہشمند تھے۔ لیکن ان میں ایک آہنی استقلال اور عزم تھا جسے کوئی چیز جنبش نہیں دے سکتی تھی۔ ایک بڑے وسیع پیمانہ پر ان کا احترام تھا۔ اور ان پر اعتماد کیا جاتا تھا تمام جماعتوں اور گروہوں کا ان کو اعتماد حاصل تھا خواہ وہ کسی فرقہ کے ہوں یا ان کا کوئی مقصد حیات ہو۔ لیکن ان کے آخری ایام میں مسلمانوں کے ایک بڑے حصہ نے ان کی سیاست سے اختلاف کیا۔ وہ ان چیدہ عالی دماغ ہندستانیوں میں تھے جو امتیاز اور شہرت کے طلب گار نہ تھے لیکن لوگ ان کو تلاش کر لے تھے اور قیادت ان کے سر پر زبردستی تھوپ دی جاتی تھی۔ آزاد وہ شخص تھے جنھوں نے بلا امداد غیرے خود اپنے کو بنایا اور خود اپنے کو تعلیم دی ان کی پرورش اور پرداخت روایاتی طرز کے قدامت پرست علماء کے خاندان کی فضا میں ہوئی لیکن وہ ایسے تھے کہ انھوں نے جدید ذہن و مزاج کے ترقی پسند ہندستانی لیڈروں کے دوش بدوش کام کیا اور ایک آزاد اور ترقی پذیر ہندستان کے جنم لینے میں بہت بڑا حصہ لیا۔

ابوالکلام غلام محی الدین احمد جن کا ادبی نام آزاد تھا۔ 1888ء میں مکہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے ہندستانی والد علماء کے ایک ممتاز خاندان کے وارث تھے اور ان کی عربی نژاد والدہ بھی ایک معزز علماء کے خاندان سے تھیں۔ عربی ان کی مادری زبان تھی اور تقوی اور علم ان کو اپنے والدین سے ورثہ میں ملا۔ ان کا بچپن ایسا تھا کہ وہ ایک قبل از وقت نشو ونما پائے ہوئے بچے کی طرح تھے اور وہ ایک آزاد اور تنقیدی دماغ کے مالک تھے انھوں نے روایاتی تعلیم کا کورس (درس نظامیہ) پندرہ سال کی عمر میں مکمل کر لیا یعنی جس مدت میں لوگ اسے ختم کرتے ہیں اس کا صرف ایک تہائی وقت صرف ہوا۔

بارہ سال کی عمر میں انھوں نے ہندستان کے رسائل میں مضامین لکھنے شروع کر دیے تھے

کے واقعہ کو جنم دیا اور ایران کو خطرے میں ڈال رہے تھے۔ اتحاد ثلاثہ جو انگلستان فرانس اور روس پر مشتمل تھا وہ اس کا انتہائی خواہشمند تھا کہ یورپ کا مرد بیمار "کو جس نے اپنی قسمت وسطی یورپین طاقتوں کے اتحاد ثلاثہ سے منسلک کر دی، موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔

برطانیہ کے عالمگیر مفادات نے اس کو ان پالیسیوں کے اختیار کرنے پر مجبور کر دیا تھا جو شمالی افریقہ اور مشرق کے وسطی حصہ کی مسلمان ریاستوں کے مفاد کی منافی تھیں۔ اس رجحان نے ہندوستانی مسلمانوں کے ساتھ رویہ پر بھی اثر ڈالا۔ 1911 میں تقسیم بنگال پر نظر ثانی ایک مثال ہے۔

ہندوستان میں جو عام بے اطمینانی پھیلی ہوئی تھی اور جسے منٹو مارلے اصلاحات دور نہیں کر سکے تھے اس نے مسلمانوں کے غم و غصہ سے مل کر ایک دھماکے کی صورت پیدا کر دی۔ اس موقع پر آزاد نے ہفتہ وار "الہلال" کا اجرا کیا۔ یہ ایک کوہ آتش فشاں کے پھٹنے کے مشابہ تھا جو فضا آسمانی میں آگ ہی آگ پھینکتا ہے۔ اور زمین کے کل جغرافیائی رقبہ کو پگھلے ہوئے لاوا سے بھر دیتا ہے۔ مایوس مسلمانوں کو جو اپنی قسمت کا رونا رو رہے تھے جمود سے نکال کر صاحب ارادہ مردوں میں تبدیل کر دیا جن میں عمل کا عزم تھا۔ اس نے ان لوگوں کی زود یقینی پر بھی ضرب کاری لگائی جو مراعات حاصل کرنے کے لئے حکمرانوں پر بھروسہ کرتے تھے۔

الہلال گورنمنٹ کی نظر میں خطرناک خیالات کا مبلغ تھا خاص کر جہاں تک جنگ کا تعلق تھا اسکی ضمانت ضبط کر لی گئی۔ اور 1914 میں اس کی اشاعت بند ہو گئی۔ اس کے بجائے ایک جدید ہفتہ وار اخبار "البلاغ" نام سے نکالا گیا۔ اس کی زندگی بھی بہت مختصر رہی۔

1916 میں گورنمنٹ نے آزاد کو بنگال سے جلاوطن کر کے رانچی میں نظر بند کر دیا جہاں سے وہ بعد اختتام جنگ 1920 رہا کئے گئے۔

گاندھی جی جنھوں نے جنوبی افریقہ میں ترک موالات کا بحیثیت ایک سیاسی حربہ کے کامیاب تجربہ کیا تھا۔ انھوں کے مسلم لیڈران کی ایک کانفرنس میں ان مظالم کے خلاف جن کی حکومت برطانیہ مرتکب ہوئی تھی اسے استعمال کرنے کی تجویز پیش کی۔ آزاد نے اسکی تائید کی اور ترک موالات کا پروگرام منظور ہو گیا۔ بعدہٗ انڈین نیشنل کانگرس نے اس پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔

آزاد کی زندگی آزادی کی جد و جہد کا ایک جز و بن گئی اس سے جب وہ نکلے تو ان کی حیثیت ایک معمار کی تھی اور یہ ضروری تھا کہ اس تحریک کی نشو و نما اور اس کی کامیابی میں ان کا کتنا حصہ تھا اس کا جائزہ لیا جائے۔

کی زندگی گزارے گا۔ 26/

وہ اس نتیجہ پر بھی پہونچے کہ دنیا کے ۴۰۰ ملین مسلمانوں کی آزادی ہندوستان کی آزادی سے ایک ہی دھاگہ میں بندھی ہوئی ہے۔" 27/

اور پھر ہندوستان کی آزادی ہندو مسلم اتحاد کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ ۱۹۲۱ء میں آگرہ خلافت کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے فرمایا

جو قربانیاں دیوبند اسکول کے لیڈران اور جمعیتہ نے حصول آزادی کے مقصد کے لئے کیں وہ تحریک آزادی ہند کی کتاب کا ایک درخشاں باب ہے اس مقصد کے لئے ان کے دل میں کتنی لگن تھی اس کا مظاہرہ ان کی روزانہ زندگی میں ہوتا تھا کوئی قربانی ایسی نہ تھی جسے انھوں نے پیش ہند کی ہو پیش کرنے کے لئے تیار نہ رہے ہوں خواہ مالی ہو یا اور کسی دیگر قسم کی۔ ان لوگوں نے فیصلہ کر کے اپنی پوری زندگی نو عمری سے موت تک ایک بہت ہی معمولی آمدنی قوت لایموت پر بسر کرتے تھے۔ کم کھا کر اسی کو راحت و آرام قرار دیتے تھے۔ اور اکثر تو اس پر مجبور ہوتے تھے کہ نیم فاقہ کشی پر بسر کریں۔ ان لوگوں نے سالہا سال جلا وطنی کی زندگی بسر کی۔ کبھی تو خود اختیاری اور کبھی دیگر طور پر۔ برطانیہ کے جیل خانوں میں گذاری ان کو گالیاں دی جاتی تھیں۔ ان کے ساتھ برا برتاؤ کیا جاتا تھا زندگی کی معمولی آسانیاں ان کو فراہم نہیں کی جاتی تھیں اور قید خانہ کے سب سے خراب کھانے پر ان کو رکھا جاتا تھا

محمود الحسن حسین احمد مدنی، عبید اللہ سندھی، ابو الکلام آزاد اور کثیر تعداد میں علماء نے ایک حرف شکایت زبان پر لائے ان سختیوں اور زیادتیوں کو برداشت کیا جان پر لادی گئیں اور ان کا انھوں نے یہ سمجھ کر خیر مقدم کیا کہ یہ ملک، بنی نوع انسان اور خدا کی خدمت ہے۔

اس دور میں مسلم افکار کی رفتار کا جائزہ لینے سے متعدد قابل لحاظ نتیجے نکلتے ہیں کرزن کے وائسرائے رہنے کے زمانے میں ہندوستان کے سیاست کی ایک تیز کروٹ نمایاں ہے جس کا نتیجہ لو لا تو یہ ہوا کہ بیرونی حکومت کا جو خوف بیٹھا ہوا تھا اس کی جگہ سوالات اور مخالفتوں نے لے لی۔ تشکر یہ اور وفادار کی

26- Azad. A.K. Qul-i-Faisal, Published by Chaman Book Depot Urdu Bazar, Delhi. P. 103.

27. Azad. A.K. Taza Mazamin compiled by M. Mushtaq Ahmed. Meerut. P. 121.

کے واقعہ کو جنم دیا اور ایران کو خطرے میں ڈال رہے تھے اتحاد ثلاثہ جو انگلستان فرانس اور روس پر مشتمل تھا وہ اس کا انتہائی خواہشمند تھا کہ یورپ کا مرد بیمار کو جس نے اپنی قسمت وسطی یورپین طاقتوں کے اتحاد ثلاثہ سے منسلک کر دی، موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔

برطانیہ کے عالمگیر مفادات نے اس کو ان پالیسیوں کے اختیار کرنے پر مجبور کر دیا تھا جو شمالی افریقہ اور مشرق کے وسطی حصہ کی مسلمان ریاستوں کے مفاد کی منافی تھیں۔ اس رجحان نے ہندوستانی مسلمانوں کے ساتھ رویہ پر بھی اثر ڈالا۔ ۱۹۱۱ میں تقسیم بنگال پر نظر ثانی ایک مثال ہے۔

ہندوستانی میں جو عام بے اطمینانی پھیلی ہوئی تھی اور جسے منٹو مارلے اصلاحات دور نہیں کر سکے تھے اس نے مسلمانوں کے غم و غصہ سے مل کر ایک دھماکے کی صورت پیدا کر دی۔ اس موقع پر آزاد نے ہفتہ وار "الہلال" کا اجرا کیا۔ یہ ایک کوہ آتش فشاں کے مشابہ تھا جو فضائے آسمانی میں آگ ہی آگ پھینکتا ہے۔ اور زمین کے کل جغرافیائی رقبہ کو پگھلے ہوئے لاوا سے بھر دیتا ہے۔ مایوس مسلمانوں کو جو اپنی قسمت کا رونا رو رہے تھے جمود سے نکال کر صاحب ارادہ مردوں میں تبدیل کر دیا جن میں عمل کا عزم تھا۔ اس نے ان لوگوں کی ذور یقینی پر بھی ضرب کاری لگائی جو مراعات حاصل کرنے کے لیے حکمرانوں پر بھروسہ کرتے تھے۔

الہلال گورنمنٹ کی نظر میں خطرناک خیالات کا مبلغ تھا۔ خاص کر جہاں تک جنگ کا تعلق تھا اسکی ضمانت ضبط کر لی گئی۔ اور ۱۹۱۴ میں اس کی اشاعت بند ہو گئی۔ اس کے بجائے ایک جدید ہفتہ وار اخبار "البلاغ" نام سے نکالا گیا۔ اس کی زندگی بھی بہت مختصر رہی۔

۱۹۱۶ میں گورنمنٹ نے آزاد کو بنگال سے جلاوطن کر کے رانچی میں نظر بند کر دیا جہاں سے وہ بعد اختتام جنگ ۱۹۲۰ رہا کئے گئے۔

گاندھی جی جنھوں نے جنوبی افریقہ میں ترک موالات کا بحیثیت ایک سیاسی حربہ کے کامیاب تجربہ کیا تھا۔ انھوں نے مسلم لیڈران کی ایک کانفرنس میں ان مظالم کے خلاف جن کی حکومت برطانیہ مرتکب ہوئی تھی اسے استعمال کرنے کی تجویز پیش کی۔ آزاد نے اسکی تائید کی اور ترک موالات کا پروگرام منظور ہو گیا۔ بعدہٗ انڈین نیشنل کانگرس نے اس پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔

آزاد کی زندگی آزادی کی جد و جہد کا ایک جزو بن گئی اس سے جب وہ نکلے تو ان کی حیثیت ایک معمار کی تھی اور یہ ضروری تھا کہ اس تحریک کی نشو و نما اور اس کی کامیابی میں ان کا کتنا حصہ تھا اس کا جائزہ لیا جائے۔

کی زندگی گزار سکا۔" /26

وہ اس نتیجہ پر بھی پہونچے کہ "دنیا کے ۴۰۰ ملین مسلمانوں کی آزادی ہندوستان کی آزادی سے ایک ہی دھاگے میں بندھی ہوئی ہے۔" /27

اور پھر ہندوستان کی آزادی ہندو مسلم اتحاد کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ 1921ء میں آگرہ خلافت کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے فرمایا۔

جو قربانیاں دیوبند اسکول کے لیڈران اور جمعیتہ نے حصول آزادی کے مقصد کے لئے کیں وہ تحریک آزادی ہند کی کتاب کا ایک درخشاں باب ہے اس مقصد کے لئے ان کے دل میں کتنی لگن تھی اس کا مظاہرہ ان کی روزانہ زندگی میں ہوتا تھا۔ کوئی قربانی ایسی نہ تھی جسے انھوں نے پیش کش کی ہو یا پیش کرنے کے لئے تیار نہ رہے ہوں خواہ مالی ہو یا اور کسی دیگر قسم کی۔ ان لوگوں نے فیصلہ کر کے اپنی پوری زندگی نوعمری سے موت تک ایک بہت ہی معمولی آمدنی قوت لایموت پر بسر کرتے تھے۔ کم کھا کر اسی کو راحت و آرام قرار دیتے تھے۔ اور اکثر تو اس پر مجبور رہتے تھے کہ نیم فاقہ کشی پر بسر کریں۔ ان لوگوں نے سالہا سال جلا وطنی کی زندگی بسر کی۔ کبھی تو خود اختیاری اور کبھی دیگر طور پر۔ یا برطانیہ کے جیل خانوں میں گذاری ان کو گالیاں دی جاتی تھیں۔ ان کے ساتھ برا برتاؤ کیا جاتا تھا زندگی کی معمولی آسانیاں ان کو فراہم نہیں کی جاتی تھیں اور قید خانہ کے سب سے خراب کھانے پر ان کو رکھا جاتا تھا۔

محمود الحسن، حسین احمد مدنی، عبید اللہ سندھی، ابو الکلام آزاد اور کثیر تعداد میں علماء نے ایک حرف شکایت زبان پر لائے ان سختیوں اور زیادتیوں کو برداشت کیا جان پر لادی گئیں اور ان کا انھوں نے یہ سمجھ کر خیر مقدم کیا کہ یہ ملک، بنی نوع انسان اور خدا کی خدمت ہے۔

اس دور میں مسلم افکار کی رفتار کا جائزہ لینے سے متعدد قابل لحاظ نتیجے نکلتے ہیں کرزن کے وائسرائے رہنے کے زمانے میں ہندوستان کے سیاست کی ایک تیز کروٹ نمایاں ہے جس کا نتیجہ اولاً تو یہ ہوا کہ بیرونی حکومت کا جو خوف بیٹھا ہوا تھا اس کی جگہ سوالات اور مخالفتوں نے لے لی۔ تشکر یہ اور وفادار

26- Azad. A.K. Qul-i-Faisal, Published by Chaman Book Depot Urdu Bazar, Delhi. P. 103.

27- Azad. A.K. Taza Mazamin compiled by M. Mushtaq Ahmed. Meerut. P. 121.

اس روشنی میں اگر قرآن کا مطالعہ کیا جائے تو قرآن کا سمجھنا بہت ہی آسان ہو جاتا ہے۔ یہ وہ کتاب ہے جو انسان کو اپنی انفرادی اور اجتماعی دونوں قسم کی زندگیوں کے ہر شعبہ کے لیے ہدایت و رہنمائی فراہم کرتی ہے اس کی تعلیمات کو دو حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔ مذہب اور قانون جہاں تک مذہب کا تعلق ہے یہ صرف اعتقاد (ایمان) اور اچھے اعمال (عمل صالح) پر زور دیتی ہے۔ ایمان کا تقاضہ اللہ کی وحدانیت اور اس کی ذات مطلق اور اس کے صفات پر یقین کرنا ہے۔ اللہ کے ساتھ کسی مافوق الفطرت یا دنیوی شخصیت کو شریک و سہیم کرنا اور کسی چیز یا شخص کو ان صفات میں شریک ماننا منع ہے۔

قرآن یقین دلاتا ہے کہ یہ مذہب نیا نہیں ہے اللہ تعالیٰ نے اس سے قبل کے زمانوں میں اپنے پیغمبروں کو بھیج کر بذریعہ الہام اس کی تعلیم دی ہے۔ اس لیے یہ مذہب ازلی اور ابدی ہے اور ناقابلِ تغیر ہے جیسا کہ قرآن کی بہت سی سورتوں میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کا اعلان ہر قوم کے سامنے اللہ کے پیغمبروں کے ذریعہ کیا گیا ہے۔ 29 یہ مذہب اقوام عالم کے لئے یکساں ہے۔ کیونکہ سچائی ایک ہے اور ہمیشہ قائم رہنے والی ہے۔ محمد پر اس کو پھر بذریعہ الہام نازل کرنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ اگلے لوگوں نے اسے خراب کر دیا تھا وہ اللہ کی توحید کے راستے سے بھٹک گئے تھے جو ایک ایسی سچائی ہے جسے خیال کلام اور عمل پر حاوی ہونا چاہیئے نہ کہ صرف زبان سے کہہ دیا جائے۔

عقیدہ کے علاوہ قرآن نے قانون بھی مرتب کیا ہے (شریعیت) جو ایمان پر عمل کی ظاہری شکل ہے اور جو انسانوں کے کردار کو اصول کا تابع بناتا ہے اور عمل کے معیار مقرر کرتا ہے لیکن یہ قانون زمان و مکان سے نسبت رکھتا ہے۔ اس لئے رسم و رواج اور عبادت میں لوگ مختلف طریقے اختیار کرتے ہیں اور قرآن کا منشا ہے کہ ان معاملات میں کسی قسم کی نزاع نہ پیدا کی جائے۔ قانون صاف صاف بیان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر فرقہ اور ہر قوم کے لئے مختلف قانون اور مختلف معیار قائم کیے ہیں۔

آزاد کہتے ہیں" اللہ پر اعتقاد (دین الہی) کی بنیاد تمام بنی نوع انسان کی مساوات اور برادری ہے نہ کہ تفریق اور نفرت جتنے بھی پیغمبر من جانب اللہ مامور ہوئے انھوں نے یہی تعلیم دی تھی یعنی تمام بنی نوع انسان ایک قوم اور ان سب کا رزاق اللہ ہے"

ان کے مطابق اللہ تعالیٰ ہر شخص کے دماغ میں اس صداقت کو قائم کرنا چاہتا ہے کہ عقائد اور اعمال بنی نوع انسان

---

29. Quran 24:35, 7-13, 46:10, 3:-4

30. Azad A K Tarjuman-ul-Quran Vol. I P 400

سمجھنے، تماکیا۔ ان کے قول کے مطابق اول الذکر کا رویہ اسلام کے انکار کے مترادف ہے اور موخرالذکر کا آن سے افسوسناک ناسمجھی کا۔ اول الذکر کے لیے ان کے قلعہ کو مسمار کرنے کے واسطے کسی طویل بحث کی ضرورت نہیں ہے۔ جیسے ہی ان کے لفظی بحث کا چہرہ بے نقاب کیا گیا کوئی خوددار آدمی اس کی تائید نہ کر سکے گا۔
دوسرے کے لیے اپنے وسیع علم اور اظہار و بیان کے حیرت خیز وسائل کو استعمال کرکے یہ ثابت کیا کہ مسائل کی جو شرح وہ لوگ کر رہے ہیں وہ غلط ہے۔

آزاد کا بھی اقبال کی مانند یہ پختہ عقیدہ تھا کہ قرآن کا آخری الہامی پیام انسانوں کے لئے اور رسول کی زندگی انسانی کردار کے سب سے عظیم اسوۂ حسنہ ہے لیکن اسی کے ساتھ ان کا یہ بھی یقین تھا کہ بہت سے شارحین و مفسرین قرآن مثل رضا وغیرہ بدقسمتی سے اپنے ذاتی اور منجمد افکار سے متاثر ہوکر غلط راہ پر چلے گئے تھے۔ حال میں جو شرحیں کی گئی ہیں ان پر ان کی تنقید حسب ذیل تھی۔

ہندوستان اور مصر کے بعض مصنفین نے جو آزادی افکار کے مدعی ہیں اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ علوم موجودہ کے اصول موضوعہ اور عہد حاضر کے ترقی پسندانہ خیالات کا جواز قرآن سے ثابت کیا جاسکتا ہے اور ماڈرن سائنسی نظریات کو قرآن سے منضبط بھی کیا جاسکتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کا خیال یہ ہے کہ قرآن اس لیے نازل کیا گیا تھا کہ پیغمبر صاحب کے زمانہ کے لوگوں کے کان میں چپکے سے بطور راز ان سب ایجادات اور تحقیقاتی مسائل کو بتلا دیا جائے جو کوپرنیکس (Copernicus) اور نیوٹن اور ڈارون اور ویلس (Wallace) نے بعد کے سالوں میں دریافت کیے اور بلا کسی الہامی کتاب کی مدد کے دریافت کیے۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ صدیوں تک یہ اصول کسی کی سمجھ میں نہ آسکے تاآنکہ یہ مفسرین نمودار ہوئے اور اس کو بیان کیا جو مفکرین کو سیکڑوں سال پہلے سے معلوم تھے۔ اس میں کیا شک ہوسکتا ہے کہ اس قسم کی شرح صرف تفسیر بالرائے ہے۔

جن اصولوں کو انھوں نے اپنایا وہ یہ تھے۔ (۱) قرآن کے الفاظ کے وہی معنی لئے جائیں جو بہر وقت نزول قرآن لئے جاتے تھے اور جو معانی ان الفاظ کے بعد کے زمانوں میں لئے گئے یا جو تعبیر ان الفاظ کی کی گئی ان کو ماننے سے گریز کیا جائے۔ (2) یہ یاد رکھا جائے کہ قرآن کی تعلیم کے اول مخاطب مکہ اور مدینہ کے عرب تھے جو ایک سیدھے سادے غیر تعلیم یافتہ لوگ تھے جن کی کوئی فلسفیانہ یا سائنسی تربیت نہیں ہوئی تھی اور جن کے دماغ کا افق بس یہاں تک محدود تھا کہ جو کچھ ان کو اپنی روایات کے متعلق معلوم تھا یا جو کچھ انھوں نے اپنے ہمسایوں، یہودیوں، عیسائیوں اور صابیوں سے سنا تھا۔

اس روشنی میں اگر قرآن کا مطالعہ کیا جائے تو قرآن کا سمجھنا بہت ہی آسان ہو جاتا ہے۔ یہ وہ کتاب ہے جو انسان کو اپنی انفرادی اور اجتماعی دونوں قسم کی زندگیوں کے ہر شعبہ کے لیے ہدایت و رہنمائی فراہم کرتی ہے اس کی تعلیمات کو دو حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔ مذہب اور قانون جہاں تک مذہب کا تعلق ہے یہ صرف اعتقاد (ایمان) اور اچھے اعمال (عمل صالح) پر زور دیتی ہے۔ ایمان کا تقاضہ اللہ کی وحدانیت اور اس کی ذات مطلق اور اس کے صفات پر یقین کرنا ہے۔ اللہ کے ساتھ کسی مافوق الفطرت یا دنیوی شخصیت کو شریک و سہیم کرنا اور کسی چیز یا شخص کو ان صفات میں شریک ماننا منع ہے۔

قرآن یقین دلاتا ہے کہ یہ مذہب نیا نہیں ہے اللہ تعالیٰ نے اس سے قبل کے زمانوں میں اپنے پیغمبروں کو بھیج کر بذریعہ الہام اس کی تعلیم دی ہے۔ اس لیے یہ مذہب ازلی اور ابدی ہے اور ناقابلِ تغیر ہے جیسا کہ قرآن کی بہت سی سورتوں میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کا اعلان ہر قوم کے سامنے اللہ کے پیغمبروں کے ذریعہ کیا گیا ہے۔[29] یہ مذہب اقوام عالم کے لئے یکساں ہے۔ کیونکہ سچائی ایک ہے اور ہمیشہ قائم رہنے والی ہے۔ محمد پر اس کو پھر بذریعہ الہام نازل کرنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ اگلے لوگوں نے اسے خراب کر دیا تھا وہ اللہ کی توحید کے راستے سے بھٹک گئے تھے جو ایک ایسی سچائی ہے جسے خیال کلام اور عمل پر حاوی ہونا چاہیئے نہ کہ صرف زبان سے کہہ دیا جائے۔

عقیدہ کے علاوہ قرآن نے قانون بھی مرتب کیا ہے (شریعت) جو ایمان پر عمل کی ظاہری شکل ہے اور جو انسانوں کے کردار کو اصول کا تابع بناتا ہے اور عمل کے معیار مقرر کرتا ہے لیکن یہ قانون زمان و مکان سے نسبت رکھتا ہے۔ اس لئے رسم و رواج اور عبادت میں لوگ مختلف طریقے اختیار کرتے ہیں اور قرآن کا منشا ہے کہ ان معاملات میں کسی قسم کی نزاع نہ پیدا کی جائے۔ قانون صاف صاف بیان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر فرقہ اور ہر قوم کے لئے مختلف قانون اور مختلف معیار قائم کیے ہیں۔

آزاد کہتے ہیں "اللہ پر اعتقاد (دین الہٰی) کی بنیاد تمام بنی نوع انسان کی مساوات اور برادری ہے نہ کہ تفریق اور نفرت جتنے بھی پیغمبر من جانب اللہ مامور ہوئے انھوں نے یہی تعلیم دی تھی یعنی تمام بنی نوع انسان ایک قوم اور ان سب کا رزاق اللہ ہے"[30]

ان کے مطابق اللہ تعالیٰ ہر شخص کے دماغ میں اس صداقت کو قائم کرنا چاہتا ہے کہ عقائد اور اعمال بنی نوع انسان

---

29. Quran. 24:35, 7-13, 46:10, 3:-16.

30. Azad. A.K. Tarjuman-ul-Quran. Vol. I. P 400

ختم ... تمام کیا۔ ان کے قول کے مطابق اول الذکر کا رویہ اسلام سے انکار کے مترادف ہے اور موخر الذکر کا قرآن سے افسوسناک نافہمی کا۔ اول الذکر کے لیے ان کے قلعہ کو مسمار کرنے کے واسطے کسی طویل بحث کی ضرورت نہیں ہے۔ جیسے ہی ان کے لفظی بحث کا چہرہ بے نقاب کیا گیا کوئی خود دار آدمی اس کی تائید نہ کر سکے گا۔

دوسرے کے لیے اپنے وسیع علم اور اظہار و بیان کے حیرت خیز وسائل کو استعمال کر کے یہ ثابت کیا کہ مسائل کی جو شرح وہ لوگ کر رہے ہیں وہ غلط ہے۔

آزاد کا بھی اقبال کی مانند یہ پختہ عقیدہ تھا کہ قرآن کا آخری الہامی پیام انسانوں کے لئے اور رسول کی زندگی انسانی کردار کے سب سے عظیم اسوۂ حسنہ ہے لیکن اسی کے ساتھ ان کا یہ بھی یقین تھا کہ بہت سے شارحین و مفسرین قرآن مثل رضا وغیرہ بدقسمتی سے اپنے ذاتی اور منجمد افکار سے متاثر ہو کر غلط راہ پر چلے گئے تھے۔ حال میں جو شرحیں کی گئی ہیں ان پر ان کی تنقید حسب ذیل تھی۔

ہندوستان اور مصر کے بعض مصنفین نے جو آزادیٔ افکار کے مدعی ہیں اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ علوم موجودہ کے اصول موضوعہ اور عہد حاضر کے ترقی پسندانہ خیالات کا جواز قرآن سے ثابت کیا جا سکتا ہے اور ماڈرن سائنسی نظریات کو قرآن سے منضبط بھی کیا جا سکتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کا خیال یہ ہے کہ قرآن اس لیے نازل کیا گیا تھا کہ پیغمبر صاحب کے زمانہ کے لوگوں کے کان میں چپکے سے بطور راز ان سب ایجادات اور تحقیقاتی مسائل کو بتلا دیا جائے جو کوپرنیکس (Copernicus) اور نیوٹن اور ڈاروِن اور ویلس (Wallace) نے بعد کے سالوں میں دریافت کیے اور بلا کسی الہامی کتاب کی مدد کے دریافت کیے۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ صدیوں تک یہ اصول کسی کی سمجھ میں نہ آ سکے تا آنکہ یہ مفسرین نمودار ہوئے اور اس کو بیان کیا جو مفکرین کو سیکڑوں سال پہلے سے معلوم تھے۔ اس میں کیا شک ہو سکتا ہے کہ اس قسم کی شرح صرف تفسیر بالرائے ہے۔

جن اصولوں کو انھوں نے اپنایا وہ یہ تھے۔ (۱) قرآن کے الفاظ کے وہی معنی لئے جائیں جو ہر وقت نزول قرآن لئے جاتے تھے اور جو معانی ان الفاظ کے بعد کے زمانوں میں لئے گئے یا جو تعبیر ان الفاظ کی کی گئی ان کو ماننے سے گریز کیا جائے۔ (۲) یہ یاد رکھا جائے کہ قرآن کی تعلیم کے اول مخاطب مکّہ اور مدینہ کے عرب تھے جو ایک سیدھے سادے غیر تعلیم یافتہ لوگ تھے جن کی کوئی فلسفیانہ یا سائنسی تربیت نہیں ہوئی تھی اور جن کے دماغ کا افق بس یہاں تک محدود تھا کہ جو کچھ ان کو اپنی روایات کے متعلق معلوم تھا یا جو کچھ انھوں نے اپنے ہمسایوں، یہودیوں، عیسائیوں اور صابیوں سے سنا تھا۔

کی آزادی خطرے میں ہے۔ آزاد تھا کہ مسلمانان عالم کی آزادی بلا ہندوستان کے آزاد ہوئے ناقابل حصول ہے اور ہندوستان کی آزادی ہندو مسلم اتحاد کے بغیر ناممکن ہے۔

اقبال اور مودودی اس بات کی تبلیغ کر رہے تھے کہ دونوں کا نہ سماجی اتحاد ممکن ہے نہ سیاسی۔ اور مفید بھی نہیں ہے کیونکہ ایسے اتحاد میں مسلمانوں کے فنا اور ان کے مذہب، کلچر اور طرز زندگی کی تباہی مضمر ہے علاوہ ازیں اسلام ایمان رکھنے والوں اور انکار کرنے والوں میں بطور ایک قوم اتحاد اور اتفاق کو ممنوع قرار دیتا ہے

اس دلیل کا آغاز آزاد نے اسلام کی کتاب مقدس اور رسول کی سنت کے حوالوں سے واضح جواب دیا۔ آزاد یہ کہتے تھے کہ تمام مذاہب کا مغز ایک ہی ہے خواہ دوسرے مذاہب اپنی اصل پاکیزہ تعلیمات سے کتنے ہی ہٹ گئے ہوں مسلمانوں پر لازم کیا گیا ہے کہ وہ تمام پیغمبروں اور کتابوں جو محمد اور قرآن کے نزول کے قبل کی ہیں یکساں اعزاز و اکرام کریں۔ اسلام امن و آشتی لے کر آیا ہے نہ کہ تلوار۔ یہ مذہب کی تبلیغ میں جبر اور زبردستی کو صاف صاف الفاظ میں ممنوع قرار دیتا ہے اور غیر مسلموں کی عبادت گاہوں کی تحقیر جائز نہیں ٹھہراتا[34] اور نہ ان کے رسم و رواج اور طریقہ عبادت کی دست درازی کو پسند کرتا ہے۔

قرآن بار بار اس کی تاکید کرتا ہے کہ وہ غیر مسلم جو مسلمانوں کی مخالفت نہ کریں۔ اور نہ ان سے برسر جنگ ہوں اور نہ ان کو ان کے گھروں سے اجاڑا ہو۔ ان سے تعاون کے طریقہ کا اظہار کریں۔ ان سے اسی کے مطابق جواباً دوست کا سا برتاؤ کرنا چاہئے۔ اسلام میں سیاست مذہب کے تابع ہے۔ یہ تمام اصول اس بات کی ترغیب دینے کے لئے بنائے گئے ہیں کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں میں یک جہتی پیدا ہو۔

آزاد کو اس شدت سے اس بات پر یقین تھا کہ اسلام دنیا میں اسی لئے نازل کیا گیا ہے کہ بنی نوع انسان کے اندر مساوات اور اتحاد، آزادی اور امن و آشتی پیدا ہو کہ انھوں نے ان جنگوں اور فتوحات پر جن سے اسلام نے بڑی بڑی سلطنتیں تعمیر کیں کبھی اظہار تفاخر نہیں کیا۔ وہ مسلمان حکمرانوں کے جابرانہ طرز عمل کو ناپسند کرتے تھے اور اس کو بھی ناپسند کرتے تھے کہ وہ فراعنہ مصر یا قیصر روم یا خسرو ایران کی تقلید کریں۔ اگر وہ اسلام کے قرون اولیٰ کی جنگوں اور محاصروں کا تذکرہ کرتے ہیں تو صرف اس رحم و کرم اور انسانی ہمدردی کو ظاہر کرنے کے لئے کرتے ہیں جن پر ان لوگوں نے عمل کیا بمقابلہ اس طرز عمل کے جو ایسے ہی حالات میں یورپین لوگوں نے عمل کئے تھے۔

جہاں تک رسول کے طریقہ عمل کا سوال ہے آزاد اس جانب اشارہ کرتے ہیں کہ جب مدینہ کی مسلم آبادی کو مکہ کے غیر مسلم قبائل سے خطرہ پیدا ہوا تو محمد نے مدینہ کے قریب کے قبائل سے حسب ذیل شرائط پر ایک معاہدہ کیا

34- Quran, 114/2.

"ان قبائل سے جو مدینہ کے اردگرد رہتے ہیں ہم صلح کرتے ہیں۔ ہم اس بات کا معاہدہ کرتے ہیں کہ ہم سب مل جل کر ایک متحدہ قوم (امت واحدہ) بننا چاہتے ہیں"/35

قومیت کے مسئلہ پر آزاد کے یہ خیالات تھے جس نتیجہ پر وہ پہونچے اس کی تائید میں انھوں نے ایک مضمون "اسلام اور نیشنلزم" کے عنوان سے لکھا"/36

جس کی بنیاد عمرانی دلائل ہیں انھوں نے اس پر بحث اس طور پر کی ہے کہ سماجی ارتقا کن منزلوں سے گزرتا ہے پہلی منزل تو یہ ہے کہ سوسائٹی رشتہ داریوں کی بنا پر قائم ہوتی ہے۔ یعنی ماں خاندان کی بنیاد بجائے باپ خاندان کی بنیاد بنتا ہے پھر جرگہ اور پھر قبیلہ۔ دوسری منزل وہ ہے جب علاقہ خاندان کی جگہ لے لیتا ہے اور اس علاقہ کا گروہ کا تعلق وہاں کی چھوٹی سی ریاست سے جوڑ دیتا ہے۔ اور اس کے بعد ایک بڑے علاقہ اور آخر کار ایک پوری قوم کا جنم ہوتا ہے۔ تیسری وہ ہے جب انسان میں عالمگیریت پیدا ہوتی ہے یا کسی براعظم سے وہ اپنا رشتہ جوڑتا ہے یا مذہبی عالمگیریت (Ecumanicalism) یا اسلام یا بنی نوع انسان سے اپنے کو متعلق کرتا ہے۔

سوسائٹی کے ارتقا کا عالم یہ ہے کہ قبل اس کے کہ وہ مذہبی عالمگیریت اور انسانیت کے معیار کو پہنچے اسے نیشنلزم (قومیت) کی منزل سے ضرور گزرنا پڑتا ہے۔ اس طرح سائنس اور مذہب دونوں نیشنلزم کی ضرورت اور اہمیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ البتہ وہ جارحانہ قسم کا نہ ہو۔ بلکہ اخلاقی اور مادی دونوں قسم کے مفادات کے افراد جو کارروائی کریں اس میں ممد و معاون ہو۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو مسلم اتحاد ایک ناقابل تغیر اور ان کے دل کی گہرائیوں میں جما ہوا عقیدہ بن گیا۔

1912 میں جب وہ "الہلال" کا اجرا کرکے سیاست کے میدان میں کودے تو سب سے بڑا تختہ جس پر وہ قدم جمائے ہوئے تھے وہ ہندو مسلم اتحاد تھا۔ انھوں نے اعلان کیا "میں ایک مسلمان ہوں اور مجھے فخر ہے کہ مجھے تیرہ سو سال کی شاندار روایت ورثہ میں ملی ہے۔ میں اس کا ایک ذرّہ بھی ضائع نہیں ہو جانے دوں گا ایک مسلمان کی حیثیت سے میں اس کے مذہبی اور ثقافتی دائرے میں رہتا ہوں جس میں مجھے ایک مخصوص مقام حاصل ہے میں کسی کو اس میں مداخلت کی اجازت نہیں دے سکتا۔

35- Malihabadi, Abdul Razzaq, Dhiks-i-Azad. P.141 Presidential Address at the Provincial Khilafat Confe-re..ce Agra .1921

36. Azad, AK. Islam and Nationalism Albalagh Agencies. Lahore. 1914

ان تمام جذبات کے ساتھ میرے اندر ایک اور جذبہ ہے جو زندگی کے حقائق نے میرے اندر پیدا کیا ہے۔ اسلام کی روح اس کو ممنوع نہیں قرار دیتی۔ مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میں ایک ہندوستانی ہوں میں ہندوستان کی ناقابل تقسیم قومیت کا ایک جزو ہوں اس متحدہ قومیت کا ایک اہم عنصر ہوں۔ بلا میرے اس کی عظمت کا مندر ناتمام ہے۔ میں اس تعمیر میں ایک ضروری شے ہوں اور کسی حالت میں اس سے دستبردار ہونے کے لئے تیار نہیں ہوں۔/37

اسی مقالہ میں ایک دوسری جگہ انھوں نے بتلایا ہے کہ ہندو اور مسلمانوں کی ۱۱۰۰ سو سال سے ایک ہی تاریخ ہے۔ جس میں ایک زندگی کا ہر گوشہ اور ہر شعبہ باہمی لین دین سے متاثر ہوتا رہا یعنی زبان، شاعری آداب، طرز رہائش، دلچسپیاں، لباس، مراسم، روزمرہ کی زندگی اور دوسرے امور۔ وہ صحیح طور پر اصرار کرتے ہیں یہ مشترکہ وراثت ہماری متحدہ قومیت کا بیش بہا خزانہ ہے۔ ہم اس دولت سے دستبردار ہو کر اس عہد میں واپس جانا نہیں چاہتے جو زندگی میں باہمی مشترک حصہ داری کے قبل تھا۔ اگر ہندوں میں ایسے دماغ موجود ہوں جو ان طریقوں کو از سر نو رائج کرنا چاہتے ہیں جو ایک ہزار سال قبل تھا تو انھیں معلوم ہونا چاہئے کہ وہ ایک ایسا خواب دیکھ رہے ہیں جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوگا۔ اسی طرح اگر مسلمانوں میں ایسے دماغ ہیں جو اس کلچر اور اس سماجی زندگی کو پھر زندہ کرنا چاہتے ہیں جو وہ ایک ہزار سال قبل ایران اور وسط ایشیا سے لائے تھے تو میں ان سے کہتا ہوں کہ جس قدر جلد وہ اس خواب سے بیدار ہو جائیں اسی قدر اچھا ہوگا۔ کیونکہ یہ خیال قطعی غیر فطری ہیں اور ایسے خیالات حقیقت کی زمین میں نمو نہیں پا سکتے۔/38

وہ یہ کہنے سے کبھی نہیں تھکتے تھے کہ ہندوستان کی آزادی اور حق اور حقانیت نے جو فرض ہم پر عائد کیا ہے ان کے لئے ہندوؤں اور مسلمانوں کا ایک اور متحد ہو جانا ضروری ہے۔ دراصل اتحاد پر انھوں نے اس قدر زور دیا کہ یہاں تک کہدیا کہ اگر ایک فرشتہ بادلوں کے اوپر آسمان سے اتر آئے اور دلی کے قطب مینار پر کھڑا ہو کر کہے کہ ہندوستان کو ۲۴ گھنٹے کے اندر آزادی (سوراجیہ) حاصل ہو جائے گی بشرطیکہ ہندوستان ہندو مسلم اتحاد کے نظریہ سے دست بردار ہو جائے تب میں سوراج کے مطالبہ سے دست بردار ہو جاؤں گا لیکن میں اتحاد کو ترک نہیں کروں گا کیونکہ اگر سوراجیہ ملنے میں دیر ہوئی تو یہ تو صرف ہندوستان کا نقصان ہوگا لیکن اگر ہمارا اتحاد برباد ہو گیا تو یہ تمام بنی نوع انسان کا خسارہ ہوگا۔

37- Azad. A.K. Musalman aur Congress (Urdu) PP. 26-27.
38- Ibid. PP. 29-30.
39- Zaidi. A.J. Anwar-e-Abul Kalam (Srinagar) 1959.
Dr. M.U. Qadiri article on "Contribution of Azad on the Renaissance of India culture".

ہندو مسلم اتحاد کے لیے انھوں نے دونوں قوموں سے اپیل کی لیکن انھوں نے مسلمانوں پر یہ خصوصی فرض عائد کیا کہ وہ نیشنلزم کی طرف اپنے اندر نشو ونما کریں اور جنگ آزادی میں قائدانہ کردار ادا کریں۔ ان کے نزدیک یہ مسلمانوں کا مذہبی فرض تھا کہ ہر ممکن ذرائع سے جو انھیں حاصل ہوں وہ ظالموں اور اسلام کے دشمنوں کے خلاف جنگ کریں (جو تعریف محارب میں آتے ہیں) جیسے کہ برطانوی حکومت کی غلامی سے ہندوستان کو نجات دلانے کے لیے ہر ممکن قربانی دینے کے لیے تیار تھے۔ انھوں نے کہا کہ "مسلمان ان شہروں کو چھوڑ دے گا جہاں وہ رہتا ہے۔ جنگلوں میں چلا جائے گا۔ سانپوں اور بچھوؤں سے صلح کریگا لیکن وہ حکومت برطانیہ سے صلح نہیں کرے گا۔"[40]

وہ علی گڑھ مکتبہ خیال اور مسلم لیگ کی پالیسیوں پر جو انھوں نے اختیار کی تھیں سخت غمناک تھے سیاست سے ان کی علیحدگی پر انھوں نے ان کا مذاق اڑایا اور اس کا بھی مذاق اڑایا کہ وہ کانگرس میں اس لئے شامل نہیں ہوئے کہ ان کی قوم تعلیم میں پیچھے ہے اور تعداد کے لحاظ سے اقلیت میں ہے اس لئے اگر جمہوری حکومت قائم ہوئی تو وہ نگل لی جائے گی یہ لوگ اس پر پریشان تھے اگر برطانیہ کا اقتدار چلا گیا تو ان کے حقوق کیا ہوں گے۔ ان کو چاروں طرف خوف ہی نظر آتا تھا یعنی ان کے سیاسی منصب کو خطرہ، ان کے مذہب اور مراسم کو خطرہ، ان کے کلچر کو خطرہ، ان کی زبان ان کی تحریرات اور الغرض ان کی تمام زندگی حتی کہ ان کے مذہب تک کو خطرہ۔

آزاد نے ان کی بزدلی پر ان کو ملامت کیا اور پر جوش انداز میں ان کو سمجھایا کہ اپنے اعمال میں اسلام کی تعلیمات کی پیروی کریں، اپنے دماغوں سے مفلوج کرنے والے خیالات کو نکال دیں اور صرف خدا پر اعتماد کریں جس نے ایمان والوں سے فتح اور حکومت کا وعدہ کیا ہے۔

آزاد کا بنیادی عقیدہ آزادی، اتحاد اور جمہوریت تھا جب تقسیم بنگال نے ملک کو ایک عدیم المثال طوفان میں مبتلا کر دیا تھا اس وقت تشدد پر یقین رکھنے والے انقلابیوں کے ساتھ مشترک ہونے کی جانب وہ راغب تھے تاکہ گورنمنٹ سے مسلح بغاوت کی تنظیم کی جائے۔ بعد کو مزید غور و فکر کے بعد ان تشدد کے طریقہ کے فضول ہونے کا یقین ہو گیا انھوں نے جوش کے ساتھ عدم تشدد مبنی ترک موالات کے پروگرام اپنا لیا اگرچہ انھوں نے اس کو ایک مذہبی مسئلہ نہیں بنایا۔ پاکستان کی اسکیم کے بارے

40- Malihabadi, A.R. op cit pp. 138-39.

میں ان کے خیالات یہ تھے کہ۔

" اس اسکیم کے کل پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مجموعی طور پر یہ صرف ہندوستان کے لئے مضرت رساں نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کے لئے خصوصیت سے نقصان دہ ہے حقیقت یہ ہے کہ تقسیم اتنے مسائل حل نہیں کر سکے گی جتنی کہ وہ پیدا کرے گی اسکیم کسی طرح نہ مسلمانوں کو فائدہ پہونچائے گی اور نہ ان کے شکوک اور خوف کو دور کر سکے گی۔" 41/

عبید اللہ سندھی

دیوبند اسکول کے ایک نہایت ممتاز رکن عبید اللہ سندھی تھے۔ وہ 1871 میں سیالکوٹ کے ایک سکھ خاندان میں پیدا ہوئے تھے جن کی رشتہ داری کا تعلق ملراج (Malraj) سے تھا جو ملتان کے مشہور و معروف دیوان تھے پندرہ سال کی عمر میں انھوں نے سکھ مذہب ترک کر کے اسلام قبول کر لیا اور ترک وطن کر کے سندھ چلے گئے۔ انھوں نے عربی علوم اسلامیہ اور تصوف کو پڑھنا شروع کیا۔ دو سال تک وہ مولانا محمود الحسن کے شاگرد رہے جو سندھ کے مسلم اسکول میں ٹیچر تھے اس کے بعد وہ دیوبند ترک سکونت کر کے چلے گئے اور 1327 ہجری سے 1331 ہجری تک دیوبند میں تعلیم دی وہ اپنے استاد محمود الحسن کے بہت قریبی ساتھی تھے جن کے مشورہ کے تحت انھوں نے "جمعیۃ الانصار" کو قائم کیا گورنمنٹ سے انکی انتہا درجہ کی مخالفت اسکول کے مفاد کے خلاف تصور کی گئی۔ اور وہ دلی کے ایک "نظارۃ المعارف" کو بھیج دیئے گئے جو ابھی حال میں وقار الملک اور محمود الحسن کی سرپرستی میں قائم ہوا تھا حکیم اجمل خاں مختار احمد انصاری اور محمد علی بھی اس اسکول سے متعلق تھے۔

دو سال کے بعد 1915 میں محمود الحسن نے اپنی اس اسکیم کے ماتحت کہ انگریزوں کو ہندوستان سے نکال باہر کیا جائے عبید اللہ سندھی کو کابل روانہ کیا۔ امیر حبیب اللہ نے اس اسکیم میں کچھ دلچسپی ظاہر کی۔ اور عبید اللہ کو مشورہ دیا کہ وہ انڈین نیشنل کانگریس سے تعاون کریں۔ کابل میں ایک کانگریس کمیٹی قائم کی گئی جس کا بعدہ ڈاکٹر انصاری کے مشورے سے انڈین نیشنل کانگریس سے الحاق ہو گیا۔ لیکن اصلیت یہ تھی کہ امیر حبیب اللہ انگریزوں کو ناخوش کرنا نہیں چاہتا تھا۔ انھوں نے عبید اللہ یا اس ہند جرمن مشن کی ہمت افزائی نہیں کی جو اس وقت کابل آیا تھا

لیکن عبید اللہ اور مشن کے ہندوستانی ممبران راجہ مہندر پرتاپ اور برکت اللہ نے ہندوستان کی ایک

41- Zaidi, S.A. "AZAD: the Architect of Unity and freedom" in Zaidi, S.A. (ed): Anwar-e-Abul Kalam (Srinagar 1959).

عارضی حکومت بنائی اور روس ترکی اور جاپان کو اپنے مشن ہندوستان کی آزادی کے لئے ان کی امداد مانگنے کے لئے بھیجے۔ اس بات کی بھی کوشش کی گئی کہ ایک فوج مرتب کی جائے اور پنجاب کے نوجوانوں کو جو بھاگ کر کابل گئے تھے انقلابی فوج کے سردار مقرر کیے گئے۔

اس کے علاوہ تمام مسلم ممالک کو برطانیہ کے خلاف متحد کرنے کیلیے ایک تنظیم "حزب اللہ" (اللہ کی جماعت) کے محمود الحسن کی قیادت میں قائم کی گئی جس کا ہیڈ کوارٹر مدینہ رکھا گیا اور کابل تہران اور قسطنطنیہ دوسرے مراکز ہے۔ یہ اسکیم بروئے کار لائی گئی کہ ہندوستان کے فوجی سامان جنگ و رسد (میگزین) پر قبضہ کر لیا جائے لیکن فیروزپور میں جو پہلی کوشش کی گئی وہ ناکامیاب ہو گئی۔

اس کے علاوہ خطوط (جو غالباً تین تھے) جن کو ریشمی رومال کے خطوط کہا جاتا ہے مہاراجہ مہندر پرتاپ کے دستخط سے جاری کئے گئے جن میں تنظیم کے پلان اور پروگرام کی وضاحت کی گئی تھی۔ جب امیر حبیب اللہ کے قتل ہو جانے کے بعد امیر امان اللہ نے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی تو آزادی کے طلبگاروں کی امیدیں بڑھ گئیں۔ ایک مختصر سی جنگ جو امان اللہ اور برطانیہ کے مابین ہوئی اس میں ہندوستانی کمیٹی کے ارکان نے بیش بہا خدمات انجام دیں جن کو حکومت افغانستان نے بنظر استحسان دیکھا۔ امان اللہ نے اعلان کیا کہ وہ اس کام کو پورا کریں گے جو محمود الحسن نے شروع کیا تھا۔

لیکن جنگ افغان کے بعد کابل کے حالات ایسے ہو گئے کہ عبید اللہ کو مجبوراً افغانستان کو خیرباد کہنا پڑا وہ ماسکو چلے گئے اور وہاں تقریباً سات ماہ رہے۔ اس موقع سے انھوں نے یہ فائدہ اٹھایا کہ سوویت روس کے سوشلسٹ (اشتراکی) نظام کا مطالعہ کیا۔

ماسکو سے وہ قسطنطنیہ اور انگورہ گئے جہاں انھوں نے اس کے بعد کے تین سال صرف کئے۔ 1923ء تا 1926ء۔ یہ وہ ایام تھے جب اتاترک مصطفےٰ کمال پاشا کی مضبوط قیادت کے تحت جب ترکی کی قلب ماہیت کر کے اس میں تغیر کلی لایا گیا۔ عبید اللہ نے اپنی آنکھوں سے تین انقلابات دیکھے۔ ایک کابل میں، دوسرا روس میں جو ایک یوروپین ملک تھا اور تیسرا مسلمانان ترکی میں۔ تیسرا انقلاب ایک ایسے مسلمان کے لئے جو شدت سے مذہبی ہو سخت پریشان کن تجربہ تھا۔

1926ء میں وہ قسطنطنیہ سے براہ راست اٹلی و سوئٹزرلینڈ حجاز گئے جو اب ابن سعود کی حکمرانی کے تحت جا چکا تھا۔ اس کے بعد وہ بارہ سال عرب میں رہے اور ان دنوں میں ان کا مشغلہ سیاست سے بالکل الگ تھلگ صرف درس و تدریس تھا۔ وہ ان جدید خیالات کے دھاروں سے واقف تھے جو اس وقت تک عرب

دنیا میں بسر رہے تھے اس مدت میں انھوں نے کثرت سے مطالعہ اور غور و فکر کیا اور زندگی اور مذہب کے بارے میں خود اپنے ایک فلسفہ کی نشو و نما کی۔

مارچ 1939ء میں وہ ہندوستان واپس آئے اور کراچی کے بندرگاہ پر اترے اپنے ساتھ ایک متنوع اور متحرک جذبات کا خزانہ لائے اور ایسے اسلام پر پختہ عقیدہ جس کے مذہبی، سماجی اور سیاسی اصولوں میں لچک پیدا کر دی گئی ہو وہ اپنی عمر کے سترویں سال کے قریب پہونچ رہے تھے۔ زندگی کے نشیب و فراز اور متضاد مشرقی اور مغربی تصورات کی جنگ نے ان کے دماغ میں نئی نالیوں کو کھود کر تیار کر دیا تھا اس لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ ان کے وہ اصول جن پر ان کا پختہ عقیدہ تھا وہ مسلمانوں اور مجموعی طور پر تمام ہندوستانیوں کو اتحاد، آزادی اور مرفہ الحالی کی جانب لے جائیں گے۔ اس کی تبلیغ کے جوش میں وہ بے صبری نہیں ہوتے تھے بلکہ غصہ میں بھی آ جاتے تھے۔

1939ء سے اپنی وفات تک جو 1944ء میں واقع ہوئی وہ مسلسل اور بلا کوئی تکان محسوس کئے برابر اپنے پیغام کی تبلیغ کرتے رہے۔ بد قسمتی سے وہ ہندوستان بہت دیر میں پہونچے۔ 1939ء تک مسلم لیگ نے مسلمانان ہند کے دماغوں پر اپنا پورا قبضہ جما لیا تھا اور علماء ایک ہاری ہوئی لڑائی لڑ رہے تھے۔ ان کے ترقی یافتہ اور مذہبی حیثیت سے غیر مانوس خیالات اور ان کے تحکمانہ مزاج نے مقلدین اور ندامت پرستوں کو ناراض کر دیا اور ان کے اثر کو اندر سے کھوکھلا کر دیا۔ لیکن پھر بھی اس وجہ سے کہ جو کارہائے نمایاں انھوں نے مقاومت کی ابتداء میں انجام دیئے اور ان کے ممتاز جدید نقطہ نظر کی وجہ سے یعنی ان دو وجہوں سے ان کے خیالات توجہ کے قابل ہیں۔

عبید اللہ کے لئے اسلام زندگی کا سب کچھ تھا۔ اصول بھی اور مقصد حیات بھی لیکن اسلام کا ان کا تصور تنگ نظرانہ یا علیحدگی پسندی کا نہ تھا ان کے نزدیک اسلام ایک عالمگیر اور ابدی مذہب کا دوسرا نام ہے۔ یہ بنی نوع انسان کے بنیادی تصورات کا اظہار، تمام مذاہب کا بنیادی اصول اور خدا کی ذات کا مظہر ہے۔ انسانو کے ضمیر، بھگوت گیتا، عہد عتیق کی پانچ موسوی کتابیں اور انجیل وہ سب اس مذہب کی شرحیں ہیں۔ قرآن، گیتا انجیل یکساں طور پر حق ہیں۔ ان کے شارحین نے بعد کے زمانوں میں انتشار اور تفریق پیدا کی۔

قرآن کا منشا بنی نوع انسان کی برادری قائم کرنا تاکہ افراد کے نفوس کی ایسی تہذیب کی جائے تاکہ وہ سوسائٹی کا ایک نیک سیرت فرد بن جائے اور سماج کو ایسی تربیت دی جائے تاکہ وہ بنی نوع انسان کے خاندان کا ایک لائق رکن قرار پائے۔ اسلام کی منزل مقصود فرد، سماج اور پوری انسانیت کو صالح بنانا ہے اس لئے

جو چیز انسان کو انسان سے ملاتی ہے وہ مذہب ہے اور جو جدا کرتی ہے وہ اس کی مخالف چیز ہے۔

تمام انسانوں کا مذہب ایک ہی ہے جو ازلی اور ابدی ہے لیکن قانون مختلف ہیں ہر سماج اپنے خاص جغرافیائی اور تاریخی ماحول کے تحت اپنے مخصوص قوانین اپنے لیے وضع کرتا ہے جن کو وقت کی تبدیلی کے ساتھ لازمی طور پر بدل جانا ہوگا سیاسی اور اقتصادی نظام جو اول خلفاء اربعہ کے زمانے میں تھے وہ موجودہ زمانے پر منطبق نہیں کئے جا سکتے تعصب کے جوش میں اس چیز کو جو دنیوی اور تبدیلی پذیر ہے قائم رکھنے پر ضد دینا اور دوسرے مذہب سے نفرت کرنا معصیت ہے۔ جو شخص سچائی سے اللہ کی وحدانیت پر یقین رکھنے والا اور احکم الحاکمین کا پرستار ہو وہ تمام انسانوں سے محبت رکھتا ہے اور تمام انسانی برادری کا خدمت گذار ہوتا ہے۔

قانون کی طرح تہذیب بھی خاص حالات اور تصورات کی پیداوار ہوتی ہے۔ تہذیب عروج و زوال منازل سے بھی گذرتی ہے یہی عالمگیر دستور جو جاری ہے اس کی مثال ایران، روما، ہندوستان اور عرب فراہم کرتے ہیں۔ اسلام کا عروج عرب کے بسنے والوں کے حالات کے اندر ایک انقلاب تھا۔ اسلام کو اس کے بعد کئی انقلابوں سے گذرنے کی نوبت آئی نیک سیرت خلفاء راشد کی ماتحتی میں پھر بنی امیہ کے عہد میں عربی تمدن کے ساتھ اور پھر عباسیوں کی ایرانی طرز کی شہنشاہیت پھر سلطنت آل عثمانی اور موجودہ نیشنل جمہوری حکومت۔ نیشنلزم کے خیالات جو اس وقت مسلمانوں کے دماغوں میں پرورش پا رہے ہیں وہ اسلام کے بنیادی اصول کے خلاف نہیں ہیں۔

پیغمبر کی تعلیمات کے دو پہلو ہیں خصوصی اور عالمی۔ فقہ (سوسائٹی کی تنظیم کے ضوابط) اور دین (عقیدہ) پہلا لوگوں کی مخصوص ضروریات سے تعلق رکھتا ہے جو کسی مخصوص زمانہ میں ہوں یعنی ان کے رسم و رواج، آداب اور طرز زندگی۔ دوسرا اخلاق کی اصلاح کرتا ہے دماغ کو پابند ضابطہ اور پاکیزہ بناتا اور ایسے عقائد مرتب کرتا ہے جو عالمگیر ہیں یعنی خدائے واحد پر یقین نیکی کی جزا اور برائی کی سزا اور انسانوں کے ساتھ کیا راست بازانہ برتاؤ کرنا چاہیئے۔

یہ اصول ہندوستان کے حالات پر کس طرح منطبق ہوتے ہیں۔

عبید اللہ کا جواب یہ ہے کہ موجودہ ہندوستان کی تاریخی حیثیت دو آرین نسلوں کے امتزاج سے عالم وجود میں آتی ہے۔ جو ہندوستان میں داخل ہوئے پہلا قبل مسیح کے دوسرے ہزار سالہ اور دوسرا بعد مسیح کے پہلے ہزار سالہ دور میں۔ دو ہزار پانچ سو سال کا فاصلہ ویدک زمانے کے آرین اور بعد کے مسلم آرین قوم کے درمیان حائل ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ دونوں ایک ہی نسل سے ہیں۔ اس تاریخ کے نئے اشوک

اکبر اور اورنگ زیب سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اشوک کو جو شغف بدھ سے تھا وہ اسی طرح کا ہے جو اکبر کی اس کوشش میں پنہاں تھا کہ سب کے لئے ایک مذہب کی تلاش کی جائے (دین الٰہی) جس کی بنیاد قدیم ہندوستانی فلسفہ اور اسلامی تصوف سے مشترک ہو یعنی مطلق وحدانیت (وحدۃ الوجود) اورنگ زیب نے مسلمانوں کے دلوں میں عقائد کی جو کمزوری پیدا کر دی تھی وہ دور کر کے پھر اسے زندہ کرنے کی کوشش کی جن کے نزدیک ہندوستان کی آزادی کا انحصار وحدۃ الشہود کے فلسفیانہ اصول کی تبلیغ تھا۔ خدا کی وحدانیت کے دو طرز شاہ ولی اللہ کے نزدیک جو عبید اللہ کے رہنما اور پیش رو تھے ایک ہی سکے کے دو رخ تھے اور اورنگ زیب ایک ایسی منزل کی جانب گامزن تھا جو اکبر کے مشابہ تھی یعنی ہندوستانی کلچر کے لئے ایک یکساں بنیاد ڈالی تھی۔

محمود الحسن کے اثر سے عبید اللہ نے ہندوستان کی آزادی کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا تھا۔ اسکے لئے انھوں نے بڑی بڑی قربانیاں دیں اور بڑے بڑے خطرات مول لئے۔ اپنی ابتدائی زندگی میں انھوں نے ایک مبنی بر تشدد انقلاب کی کارروائی میں کام کیا لیکن بعد کو وہ کانگریس میں شریک ہو گئے اور گاندھی جی کے عقیدے عدم تشدد اور ترک موالات کو بطور ایک ذریعہ تسلیم کر لیا لیکن بطور عقیدہ تسلیم نہیں کیا۔ وہ اس سچائی کے اپنی زندگی کے آخری وقت تک وفادار رہے۔

ان کا خیال تھا کہ صرف کانگریس ہی ہندوستانیوں کی حقیقی معنوں میں نمائندہ جماعت ہے اور تمام ہندوستانیوں کو اس کی قیادت تسلیم کرنی چاہئے البتہ وہ یہ چاہتے تھے کہ کانگریس اپنی کارروائیوں کو صرف دنیوی معاملات تک محدود رکھے یعنی سیاسی اور اقتصادی اور نہایت ایمانداری سے اپنی کارروائیوں کو مذہبی رنگ دینے سے گریز کرے۔ وہ اس بات پر رنجیدہ تھے کہ گاندھی جی کی قیادت میں کانگریس زیادہ سے زیادہ انکے مذہبی خیالات اور طرز زندگی کی جانب راغب ہوتی جا رہی ہے۔ اور ان کی نظر میں اسی لئے مسلمان زیادہ تعداد میں کانگریس سے بھاگتے جا رہے ہیں اور وہ لیڈر ان جو تحریک خلافت کے زمانے میں ہر دلعزیز تھے اب ان کا اثر عوام پر سے اٹھتا جا رہا ہے بحیثیت ایک مسلمان کے ان کا یقین تھا کہ کانگریس مسلمانوں کی ضروریات اور ان کے مقاصد کا احساس رکھتی ہے اس لئے کانگریس کے زیر سایہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد کے ایک مستحکم علمبردار تھے۔ لیکن اسی کے ساتھ ایک قوم ایک زبان ایک کلچر اور ایک طرز زندگی سب کا ہوا اس سے ان کو سخت اختلاف تھا۔

ہندوستان کے بارے میں ان کا تصور یہ تھا کہ یہ اندرونی طور پر خود مختار ریاستوں اور قوموں کا ایک

دفاق ہے وہ بحث کرتے تھے کہ رقبہ تعداد آبادی زبانوں اور نسلوں کے متنوع کے اعتبار سے ہندوستان کی مثال یورپ سے دی جاسکتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہندوستان کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹ کر بانٹ دیا جائے۔ ہندوستان کا ایک رہنا ضروری ہے اور بلا اس کے ملک کے مسائل حل نہیں کئے جاسکتے ہیں لیکن اس بڑے اتحاد میں اس کے چھوٹے چھوٹے حصے شامل ہونے چاہئیں جن کو سلف گورنمنٹ (خود اختیار حکومت) کے اقتدار برتنے کا اختیار حاصل ہو لیکن یہ سب ناقابل شکست مضبوطی کے ساتھ ایک دوسرے سے مربوط ہوں۔

سیاسی اور اقتصادی امور میں انھوں نے مغرب کے طریقوں کو مکمل طور پر اپنانے پر زور دیا۔ ریپلک طرز کی حکومت، جمہوریت، نمائندہ حکومت، سائنس، ٹکنالوجی (فنی مہارت) اور صنعت یورپ کی تہذیب کے ثمرات ہیں۔ اور یہ انتہائی بیوقوفی ہوگی کہ ان کو ماننے سے انکار کر دیا جائے۔

لیکن عبید اللہ کا خیال تھا کہ انسان صرف ایک اقتصادی شخصیت کا مالک نہیں ہے جسکی کل زندگی کا ماحصل مادی مفادات تک محدود ہوں بلکہ اس کی زندگی کا اصل منشار اخلاقی اور روحانی اوصاف کے لئے ریاضت کرنا ہے۔ مذہب اس کی روح کے لئے اتنا ہی ضروری ہے جتنا کھانا کے لیے ضروری ہے۔ ہندوستان میں بہت سے مذاہب ہیں لیکن بنیادی طور پر سب ایک ہی ہیں کیونکہ ان سب کے فلسفہ کا بنیادی پتھر ایک خدا کے وجود کا ماننا ہے۔ نفس مطلق کی وحدانیت خیالات میں ہم آہنگی دماغو میں ایک دوسرے سے گہرا تعلق اور باہمی ہمدردی کے جذبات پیدا کرنا ہے۔ اسلام قومیتوں کو تہس نہس کرنا نہیں چاہتا بلکہ وہ ان سب کو ایک برادری کے رشتہ میں جوڑ دینا چاہتا ہے۔

VIII احرار

1857 میں لودھیانہ کے علماء کے رہنما خاندان نے اپنی قسمت کی بازی انقلابیوں کے ساتھ لگا دی تھی بہادر شاہ کے فرمان کے مطابق انھوں نے برطانوی فوجوں سے لڑتے رہتے ہوئے دلی کی جانب کوچ کیا عبد القادر جو پیشوا اکابر خاندان تھے اور ان کے صاحبزادگان نے محاصرہ کے دوران غیر متزلزل جرأت کا اظہار کیا جب دلی انگریزوں کے ہاتھ میں چلا گیا تو انھوں نے پٹیالہ کے جنگلوں میں بود و باش اختیار کر لی اور حکومت کی ہر اس کوشش کو جوان کو گرفتار کرنے کی کی گئی ناکام بنا دیا جب عام معافی کا اعلان ہوا تو انھوں نے پھر لودھیانہ واپس آنے کا فیصلہ کیا۔ عبد القادر کا راستہ ہی میں انتقال ہو گیا لیکن عام پبلک نے ان کے خاندان کا پرتپاک استقبال کیا۔

لڑکوں نے اپنا آبائی پیشہ درس دینے کا اختیار کیا لیکن جب 1885ء میں انڈین نیشنل کانگرس کا جلسہ ہوا تو ان لوگوں نے اس کے قیام کا خیر مقدم کیا جب دو سال بعد سر سید احمد خاں نے اپنی مخالفت کا اعلان اور مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا کہ وہ اس میں شریک نہ ہوں اور انھوں نے "انجمن محبان وطن" کی بنیاد رکھی عبدالقادر کے صاحبزادے شاہ محمد نے ایک فتویٰ صادر کیا جس کی رو سے سیاسی اغراض کے لئے ہندوؤں سے تعاون کو جائز اور مناسب قرار دیا۔ اس فتوی پر ہندوستان کے ہر گوشے سے تقریباً ایک ہزار علماء نے دستخط کئے تھے اس کا نام "نصرۃ الابرار" یعنی حق کی فتح تھا۔ اور دسمبر 1888ء میں جو کانگرس کا سیشن الہ آباد میں ہوا اس میں تقسیم کیا گیا۔

لودھیانہ کے آزاد خیال قومیت پسند تحریک کا مرکز بن گیا۔ 1896ء میں ایک ہفتہ وار اخبار نکالا گیا جس کے بعد ایک روزنامہ انگریزی اخبار کا اجرا ہوا اور جس کا نام آبزرور (Observer) تھا اس کے آزادانہ اظہار خیال پر یہ گورنمنٹ کے عتاب کا مستحق قرار پایا اور 1919ء میں اس کی اشاعت بند ہو گئی۔

1912ء کی جنگ بلقان اور اس کے بعد 1914ء کی جنگ عظیم نے مسلمانان ہند کو سخت دھکا لگایا اور ان لوگوں میں خلافت کے مستقبل کے بارے میں انتہائی تشویش پیدا ہوئی۔ 1919ء میں وہ بدترین پریشانیوں کا اس لئے شکار ہوئے کہ اتحادیوں نے ملک عرب اور میسوپوٹامیہ (Mesopotamia) کے تمام مقدس مقامات پر قبضہ کر لیا۔

لودھیانہ کے علماء بہت بے چین تھے اور جب گاندھی جی نے تحریک ترک موالات خلافت کے ساتھ جو زیادتیاں ہوئی تھیں ان کی اصلاح اور مقامات مقدسہ کی واپسی کے لئے جاری کی تو حبیب الرحمن جو شاہ محمد کے پوتے اور ایک 23 سال کے نوجوان تھے وہ کانگرس میں شریک ہو گئے۔ اس کے بعد انھوں نے کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ اپنی موت تک جو 1956ء میں بمقام دلی واقع ہوئی اپنے راہ حق پر قائم رہے۔ وہ حیرت خیز بہت جرأت و استقلال اور قوت برداشت رکھتے تھے۔ اصولوں سے ان کی وفاداری ایسی تھی جس پر شہید فخر کر سکتے ہیں۔ وہ اپنے عقیدے سے ذرا بھی نہیں ہٹے اور چٹان کی طرح ان پر مضبوطی سے قائم رہے۔ حتیٰ کہ کانگرس سے وفاداری گاندھی جی کی قیادت پر ناقابل تزلزل اعتماد اور جواہرلال سے گہرے رابطے بھی ان کو ان سے اختلاف کرنے میں مانع نہ ہوتے تھے اور وہ نہایت صفائی کے ساتھ ان سے گفتگو کرتے تھے اور جن باتوں کو وہ غلط سمجھتے تھے ان کے خلاف ان کو آگاہی دیتے تھے۔ 1929ء میں ابوالکلام آزاد کے مشورے پر انھوں نے مجلس احرار کی بنیاد ڈالی (یعنی آزادوں کی سوسائٹی) اس کے اغراض و مقاصد

حسب ذیل تھے۔

(1) ہندوستان کے لئے کامل آزادی۔

(2) آزاد ہندوستان میں سب کو مذہب کلچر تہذیب اور تعلیم کی آزادی ہو۔

(3) صوبے اندرونی طور پر آزاد ہوں اور داخلی امور میں ان کو اختیار کلی حاصل ہو اور صوبوں کی باہمی رضا مندی سے مرکز کے اختیارات کا تعین کیا جائے۔

(4) مرکزی حکومت صوبائی حکومتوں کا ایک وفاق ہو۔

(ا) مرکزی قانون ساز جماعت میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی تعداد برابر ہو اور اسکی فیصدی دوسرے فرقوں سے ہو۔

(ب) کوئی قانون جس کا اثر مسلمانوں پر پڑتا ہو وہ واپس لے لی جائے اگر مسلمانوں کی ⅔ اکثریت خلاف ہو

(ج) ایک سپریم کورٹ قائم کی جائے جس میں ہندو اور مسلمانوں کے ججوں کی تعداد مساوی ہو۔

(د) مسلمانوں کے خیراتی ٹرسٹ کا ایک محکمہ قائم کیا جائے۔

(ہ) فوج میں دونوں فرقوں کے لوگوں کو بھرتی کیا جائے۔

(و) پسماندہ صوبوں کیلیے، مرکز سے مالی امداد دی جائے۔

(ز) کسی بنیاد پر خواہ وہ قانون ساز جماعتوں کی نمائندگی ہو یا ملازمتوں بھرتی ہو جو بھی خصوصی مراعات دی گئی ہیں وہ سب ختم کر دی جائیں۔

(ح) کلچر، زبان، مذہب تعلیم تمام فرقوں کی عبادت گاہوں کے معاملات میں کسی قسم کا دخل نہ دے

(ط) مسلمانوں کے قوانین پرسنل لا میں کسی طرح کی مداخلت نہ کی جائے۔

(ی) جہاں مذہبی قوانین کے معاملات ہوں وہاں اسے مقدمات کی سماعت کے لئے مسلم ججان مقرر کئے جائیں۔

(5) پاکستان کے قیام کی ایسی مخالفت جس میں جھکنے کا کبھی سوال نہ پیدا ہو۔

ہندوستان کی آزادی کے لئے احرار نے جو قربانیاں دیں اور جن مصائب کو انھوں نے اس فرض کے لئے برداشت کیا وہ ہندوستانی تاریخ کا ایک درخشاں باب ہے۔

مسلم افکار کا جائزہ لینے سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ان کے خیالات کا سب سے زوردار جذبہ یہ تھا کہ وہ اپنے فرقہ کی انفرادیت اس کے کلچر اور مذہب کو ہر قیمت پر قائم رکھنا چاہتے تھے

کل مکتبہ ہائے فکر اس پر متفق تھے۔ اختلافات اگر تھا تو ان دو گروہوں میں تھا جن میں سے ایک کا یقین یہ تھا کہ یہ مقصد ایک متحدہ آزاد ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی سمجھوتے سے حاصل ہو سکتا ہے وہ طبقہ جس کی باگ جمعیتہ علمائے ہند کے ہاتھوں میں تھی۔ ایسا تھا جس کے ساتھ پورا مسلم فرقہ رہا اور 1936ء تک اس کو مسلمانوں کی اکثریت کا اعتماد حاصل تھا اس کے بعد ایک ناگہانی حملہ کی طرح مسلم لیگ جھپٹ کر آگے نکل گئی قیادت کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور دس سال سے کم عرصہ میں اپنے مقصد کو حاصل کر لیا پاکستان کا وہ تصور جو اس نے 1940ء میں بڑی ہچکچاہٹ کے ساتھ زیادہ تر بین دین کے خیال سے پیش کیا تھا نہ کہ ایک سمجھے بوجھے مطالبے کی شکل میں وہ 1947ء میں ایک حقیقت بن گیا۔ یہ کیسے ہوا اس پر آئندہ باب میں بحث کی جائے گی۔

IX مولانا ابوالاعلیٰ مودودی

جیسا کہ اس سے پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ انیسویں صدی کے آخر میں ہندوستان کا مسلم فرقہ پر اضطراب میں مبتلا اور ہراساں تھا۔ اس سے قبل اس نے گورنمنٹ پر بھروسہ کیا تھا سر سید احمد خاں اور ان کے علی گڑھ کے ساتھیوں نے کانگرس اور اس کے سیاسی حقوق کے مطالبات کی مخالفت پر اپنے آپ کو آمادہ کیا تھا حکومت کی عطا کردہ مراعات (جس کا انجام یہ ہوا کہ مشرقی بنگال ایک مسلم اکثریتی صوبہ بنا دیا گیا) ان کی ہمت افزائی ہوتی تھی۔

بدقسمتی سے پاکستان کے خلاف پر تشدد ردعمل اور انگلستان میں لبرل پارٹی کے برسر اقتدار حکومت آجانے سے اس پر قیاس آرائیاں شروع ہوئیں۔ گورنمنٹ کی دو محاذوں پر کیا پالیسی ہوگی۔ اول کانگرس کے اس مطالبہ کے بارے میں کہ ہندوستان کو مزید ترقی یافتہ دستوری حقوق دیئے جائیں اور دوسرے اس سے بڑے مسئلہ پر کہ لبرل گورنمنٹ کی خارجہ پالیسی مسلم قوم کے بارے میں کیا ہوگی۔

اس تشویش کی فضا میں گورنمنٹ نے ایک دورخی پالیسی جاری کی یعنی ایک طرف تو ہندوستان کے لیڈروں میں سے معتدلین کو اپنے گرد جمع کرنے کی اور دوسری جانب تعلیم یافتہ مسلمانوں کے [illegible] انگیز جذبات کو ڈھیلا کرنے کی۔

مارلے وزیر ہند برطانوی سیاست میں ایک انتہاپسند کی حیثیت سے شہرت رکھتا تھا اور ہندوستان کے لبرل (اعتدال پسند) سیاسی لیڈران ان پر اعتماد اور ان کی عزت کرتے تھے انھوں نے گوکھلے کو

ہموار کرلیا۔ اور ان کے توسط سے کانگرس کے اعتدال پسندوں کے بازو کی حمایت حاصل کرلی۔

منٹو نے ایک دورخ والا کردار پیش کیا۔ ایک طرف تو انھوں نے ان مسلمانوں کی ہمت افزائی کی جو ان کے پاس وفد لے کر آغا خاں کی قیادت میں گئے تھے اور دوسری جانب انھوں نے مارلے کو جھانسا دے کر ان کو ان کے اس انتہا پسندانہ نظریئے سے ہٹا دیا جو فرقہ وارانہ بنیادوں پر جداگانہ انتخابات کے بارے میں ان کا تھا۔ مارلے کے سپر ڈال دینے سے اس سرکاری تھیوری کو تقویت حاصل ہوئی کہ مسلمان ایک قوم کے اندر قوم ہیں۔ آغا خاں نے اپنی یادداشت میں تسلیم کیا ہے "کہ لارڈ منٹو کا ہمارے مطالبات کو تسلیم کرلینا وہ سنگ بنیاد ہے جس پر ہندوستان کے دستور کے بارے میں تمام آئندہ والی برطانوی حکومتوں نے تجویزات تعمیر کئے اور اس کا آخری نتیجہ ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان کا جنم ہوا"۔ 42

اس طرح منٹو جو قدامت پرست تھا اور مارلے جو لبرل تھا دونوں نے مل کر آئندہ پاکستان کی بنیاد ڈالی برطانوی پالیسی کے بارے میں ان کے اختلافات رہے ہوں گے مگر جہاں تک ہندوستان کا سوال ہے دونوں کے نظریئے ایک تھے دونوں اس پر یقین رکھتے تھے کہ انگریزی طرز کا سیاسی نظام یا ذمہ دار حکومت ہندوستان کی "قوموں" کے لئے قیاس میں آنے والی بات نہیں ہے۔

ہندوستان کی سیاست میں جداگانہ انتخابات کو رواج دے کر برطانیہ نے اقرار صلح کے ذریعہ وہ ناقابل تغیر رویہ اختیار کیا جس کا انجام یہی ہونا ہی تھا کہ ہندوستان کی تقسیم ہوجائے۔ وزیر ہند کا عام اعلان کہ ہندوستان کے بسنے والے ایک قوم نہیں ہیں بلکہ اقوام ہیں اور اس نظریئے کے دستور میں آجانے کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ تفریق کے جذبات ترقی کریں اور علیحدگی پسندوں کو اپنی افکار کی تبلیغ میں سرگرمی دکھانے کی ترغیب ہو کیونکہ ان لوگوں کو حکومت کی ہمدردی کا پورا یقین تھا۔

اقبال نے گیند اچھال دیا تھا۔ دوسروں نے ان کی تقلید کی۔ اس کے پہلے ہی قوم مسلم کے متعدد ممتاز اشخاص اپنے مسائل کے حل کی تلاش میں سرگرداں تھے تاکہ مسلمانان ہند کی ثقافتی انفرادیت کا تحفظ ہوسکے آغا خاں نے ۱۹۰۷ء میں مسلمانوں کو ایک قوم کی حیثیت سے سوچتے تھے۔ چودھری افضل حق نے ایک اسلامی حکومت کا نعرہ بلند کیا۔ آزاد سبحانی نے حکومت ربانی کا تصور پیش کیا۔ عبیداللہ سندھی ایک ایسی ریاست کا تصور رکھتے تھے جس کی سرحد شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کے مطابق ایک طرف دریائے سندھ اور دوسری جانب دریائے جمنا سے ملی ہو دوسرے اور لوگ بھی تھے جو اسی طرح کے خیالات رکھتے تھے۔

42- Agakhan, The Memoirs. P.95.

ان لوگوں میں ابوالاعلیٰ مودودی جن کی تعلیم قدیم روایاتی انداز پر عربی مدرسوں میں ہوئی تھی قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے تحریک خلافت سے جو پہلی جنگ عظیم کے آخری ایام میں شروع ہوئی تھی بڑی امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں اس کی ناکامیابی نے ان کو بہت پریشان کر دیا۔ انھوں نے کئی سال تشویشناک خیالات میں بسر کئے اور آخر کار ایک ایسے نتیجہ پر پہونچے جو مسلم سیاست کا جہاں تک تعلق ہے اقبال کے نظریے کے عین مطابق تھا لیکن اقبال کے اور ان کے انداز فکر میں یہ فرق تھا کہ وہ مغربی تصورات سے قطعی متاثر نہ تھے انھوں نے قرآن اور حدیث کے لفظی تشریحات پر اپنے خیالات کا محل تعمیر کیا۔ انھوں نے ان تمام مسلمانوں کو شرک (خدا کی ذات یا صفات میں کسی کو شریک کرنا) کے ارتکاب کا مجرم قرار دے کر ان کی سخت مذمت کی جو ان کی شرح سے اختلاف رکھتے تھے اور ان سجدہ ریز پیشانیوں پر غصہ سے برستے تھے۔ اس لئے کہ وہ مصیبت میں مبتلا ہیں۔ اور بروز قیامت عذاب الٰہی کے سزاوار ہوں گے۔ ان گنہگاروں میں وہ ایسے علماء کو بھی شمار کرتے تھے جیسے کہ محمود الحسن حسین احمد مدنی (دیوبندی) اور مولانا ابوالکلام آزاد۔

ان کی تحریرات نے اقبال کی مدح وثنا حاصل کیا۔ اور انھوں نے ان کو مدعو کیا کہ وہ اپنے کام کو حیدرآباد سے پنجاب منتقل کریں اس لئے 1938ء میں وہ پٹھان کوٹ آکر قیام پذیر ہوئے اور دارالسلام قائم کیا تین سال کے بعد انھوں نے جماعت اسلامی (اسلامی سوسائٹی) حکومت الٰہیہ اللہ کی حکومت کی تبلیغ واشاعت کے لئے قائم کیا۔

ان کا مذہب

جہاں تک مذہب کا تعلق ہے وہ ابن تیمیہ کی طرح علماء اللفظ میں سے ان کا عقیدہ یہ تھا کہ

• انسان کو اس کے باطن اور ظاہر کی اصلاح وہدایت کے لئے ایک منظم قانون کی ضرورت ہے۔ انفرادی اجتماعی دونوں میں۔ جو اس کی تمام ضروریات کا کفیل ہو اور جو عالمگیر اور ابدی اصولوں پر قائم ہو۔

ایسا قانون سائنس یا مشاہدہ یا تجربہ کی بنا پر نہیں بن سکتا۔ اسے انسانی عقل سے ماورا ہونا چاہئے اس لئے اس کو اللہ کی رضا اور ہدایت میں تلاش کرنا چاہئے جس نے زمانوں اور مختلف ملکوں میں اپنے پیغمبر بھیجے اور آخری نبی عرب مبعوث ہوئے۔ اللہ نے محمد پر قرآن نازل کیا جس میں اس کے احکام الٰہی درج ہیں اور انسان کے اعمال وافکار وافعال کے لئے مکمل ہدایت ہے۔ یہ قانون الٰہی تمام انسانی کمزوریوں اور ناہلیوں سے بالاتر ہے۔ اس کی حقیقت انسانی جذبوں سے اور خواہشات سے ملوث نہیں ہے اور نہ تو نامعقول امتیازات اور ایں وآں کے فرق مراتب سے مجروح ہے۔ اس کی کاملیت اس بات

کا ثبوت ہے کہ یہ الہام الٰہی ہے۔ یہ قانون انسانی زندگی کے ہر کردار پر حاوی ہے اور اس کے تمام اعمال کا جائزہ اس میں موجود ہے کیونکہ انسان کی زندگی ایک وحدت ہے اور اس کو مختلف خانوں میں بانٹا نہیں جا سکتا۔

ہر فرد پر یہ فرض ہے کہ وہ احکام الٰہی کی بے چوں و چرا اتباع کرے۔ وہ لوگ جو خدا کی اطاعت کرتے ہیں اور کسی غیر اللہ کے سامنے سر نہیں جھکاتے وہ مسلمانوں کی منتخب سوسائٹی ہیں اللہ نے ایمانوں سے وعدہ کیا ہے کہ وہی زمین پر سربلند رہیں گے اور کل بنی نوع انسان پر حکومت کریں گے۔ مودودی کے قول کے مطابق دنیا اسلام ہی کی پابند ہے کیونکہ تخلیق کا کل نظام احکام الٰہی کا پابند ہے جن کو قرآن کی تعلیمات میں درج کر دیا گیا ہے۔ لیکن جہاں تک انسان کا سوال ہے وہ اگرچہ فطرت کے قوانین سے پابند ہے پھر بھی اس کو عقل اور آزاد مرضی عطا کی گئی ہے۔ اس لئے تمام انسان گو فطرۃ مسلمان ہیں لیکن خود اپنی مرضی سے خواہ مسلمان رہیں یا نہ رہیں۔

وہ لوگ جو خدا کے منکر ہیں اور اس کی اطاعت کرنے سے انکار کرتے ہیں انھوں نے اپنی اصل فطرت پر ایک نقاب ڈال لیا ہے اور کافر ہو گئے ہیں اور مومن وہ ہے جو ایک خدائے واحد پر اور اس کے احکام پر اور نافرمانی کی حالت میں اس کے برے نتائج پر اور اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ اس کا فرض ہے کہ پیغمبر کے اقوال اور اسوۂ حسنہ پر عمل کرے۔

اسلام جو فرائض عائد کرتا ہے اس کے پانچ ستون جن کو ارکان کہا جاتا ہے اس میں شامل ہیں اور احکام شریعت کی اتباع اور جن باتوں کو منع کیا ہے ان سے بچنا چاہیئے۔

شریعت میں فرد کے لئے اور اس کے سماجی، اقتصادی اور سیاسی اعمال کے لئے بھی قوانین شامل ہیں اور قوانین وضع کئے ہیں۔ اسلام کے مطابق سماجی نظام یعنی ملت کا شیرازہ نسل وراثت رنگ یا ہمسائگی کے دھاگے سے نہیں بندھا ہے بلکہ صرف مذہب اسلام پر ایمان سے وابستہ ہے اس لئے جو لوگ ایک مذہب پر عقیدہ رکھتے ہیں وہ بلا لحاظ دوسری باتوں کے ایک قوم ہیں مومن غیر مومن سے مل کر ایک متحد، قومیت یا ایک متحدہ حکومت نہیں بنا سکتا ہے۔

اسلامی حکومت میں ہر مسلمان کے حقوق و فرائض یکساں ہیں لیکن غیر مسلم نہ تو شہری ہیں اور نہ اسلامی سوسائٹی کے ممبر ہو سکتے ہیں اور ان کو صرف کے حقوق ملیں گے جن جن کی جان و مال رسم و رواج اور مذہب کا تحفظ کیا جائے گا لیکن جو حکومت کے نظام یا انتظام میں کوئی حصہ نہیں

ے سکتے۔

اسلامی سیاست کا بنیادی اصول خدا کے وجود کا اقرار اس پر یقین اور یہ یقین کہ محمد خدا کے پیغمبر تھے اور مسلم سوسائٹی کی خلافت پر یقین ہے۔

خدا کی حاکمیت کا تصور حکومت الٰہی عہد حاضر کی حکومت اور اقتدار اعلیٰ کے تصور کے بالکل متضاد ہے۔ کیونکہ ہندوستان کا نیشنلسٹ مذہب کو سیاست سے جدا تصور کرتا ہے اور حکومت کو انسان مادی مفاد کی بنیاد پر قائم کرتا ہے وہ ریاست کے ممبران کو صرف ان اشخاص تک محدود کرتا ہے۔ جو خاص ایک جغرافیائی علاقہ میں بستے ہیں اور جو قوانین عوام کے نمائندے وضع کرتے ہیں ان کی اتباع کرتے ہیں۔ وہ قومیت پسندی اور حب الوطن کو لازمی و ابدی مانتے ہیں اور اپنی قوم کے لئے ہر طرح کی قربانی دینے کو جائز قرار دیتے ہیں۔

چونکہ یہ اصول مودودی کے تصور اسلام سے متصادم تھے اس لئے ہندوستان کے مسلمانوں کے سامنے یہ تنقیح طلب مسئلہ کھڑا ہوا کہ آزادی کی جدوجہد میں ان کے کیا فرائض ہیں۔

مودودی کا دماغ اس معاملہ پر بالکل صاف ہے ان کے خیال میں مسلمان ہندوستان کی آزادی کے لئے اسی جوش سے آرزومند ہیں جیسے کہ ہندو۔ لیکن مسلمان آزادی کو ایک ذریعہ سمجھتے ہیں نہ کہ مقصد۔ مقصد یہ ہے کہ ایک ایسی حکومت قائم جائے جس میں مسلمان نہ تو بیرونی اور نہ اندرونی غیر مسلموں کے تابع ہوں۔ یہ حکومت جہاں ممکن ہو گا تقریباً دطن اسلام (یا دارالاسلام) ہو گی۔ مسلمان ہندوستان کی آزاد حکومت میں ہندوستانی کی حیثیت سے نہیں بلکہ مسلمان کی حیثیت حصہ لیں گے۔ اور اس شرط پر کہ ان کو اپنے بچوں کی تعلیم کی تنظیم کرنے اپنے مذہبی اعمال و مراسم ادا کرنے اور معاشرتی قوانین کی پابندی کرنے اور غیر اسلامی رسم و رواج اور اعمال کو دور کرنے کے اختیارات حاصل ہوں۔ ان کو باہر کی دنیا کے مسلمانوں سے اگر ہندوستان کی جنگ ہو تو اس میں وہ شامل نہ کئے جائیں۔

ان کے خیال کے مطابق مسلمان اس نظریہ کو تسلیم نہیں کر سکتا کہ اس کو مذہبی عقائد اور اعمال کی آزادی تو ہو لیکن اپنی ہستی کو ایک متحدہ ہندوستانی قوم میں جہاں تک کہ سیاسی اور اقتصادی معاملات کا تعلق ہے مدغم کر دے۔ اسلام مذہبی اور دنیوی مفاد میں تفریق نہیں کرتا اور انسانی زندگی کو مذہبی اور دنیوی دو حصوں میں کاٹ نہیں سکتا جیسا کہ لیڈران کانگرس کہتے ہیں خاص کر جواہر لال کے خیالات تو اسلام کے قطعی منافی ہیں۔

سیاسی اغراض سے ہندو مسلم اتحاد کو وہ مردود تصور کرتے تھے۔ وہ سیکولرازم کو انکار خدا کے مترادف سمجھتے تھے اس لیے ان کے خیال میں حکومت میں اس کا کوئی مقام نہ ہونا چاہئے وہ اقتصادی مفادات کے اصول کو سیاسی اتحاد کی بنیاد قرار دینے کو اسلام کی نظر میں قابل نفرت قرار دیتے تھے کیونکہ وہ کہتے تھے کہ یہ مذہب اور اخلاقیات کی جگہ چھین لیتی ہے اور سوسائٹی اور حکومت کی بنیاد روحانیت کو بنانے کے بجائے مادیت کو قرار دیتی ہے۔

انھوں نے جدیدیت کی سرتاپا مذمت کی اور یورپ کے باشندوں کے انفرادی اور اجتماعی اعمال پر انتہائی نفرت ظاہر کیا۔ ان کے خیال میں یہ لوگ بداخلاقیوں اور بربریت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ جس سے انھیں اسی وقت نجات مل سکتی ہے جب وہ اسلام کے اصولوں کو تسلیم کرلیں۔

وہ ہندوستان میں ایک جمہوری اور پارلیمانی طرز کی حکومت بنانے کے قطعی خلاف تھا کیونکہ اگر اس طرح کی حکومت بن گئی تو اکثریت غالب رہے گی اور چونکہ اکثریت ہندوؤں کی ہے اس لئے مسلم اقلیت کے لئے اسلامی عقائد کلچر سوسائٹی کی تنظیم کا تحفظ اور ان کو باقی رکھنا ناممکن ہوگا۔

چھٹواں باب

کرزن اور تقسیم بنگال

کسی ملک کی اس سے بڑی بدقسمتی ہو ہی نہیں سکتی کہ ایک بیرونی نسل کے لوگ اس کے حکمراں ہو جائیں ان حالات میں جب فاتح مفتوحہ ملک میں بس جاتا ہے اور اسی کو اپنا وطن قرار دے دیتا ہے اور اپنے پیدائشی وطن سے ناطہ توڑ لیتا ہے تب تو وہ دو پارٹیاں فاتح اور مفتوحہ آپس میں مل جل کر رہتے ہیں اور رفتہ رفتہ یکساں طرز زندگی اور ایک دوسرے کو سمجھنے کا ارتقا ہوتا ہے باوجودیکہ دونوں اپنے اپنے قدیم طریقوں اور رسم و رواج کا کچھ حصہ اپنے لئے قائم رکھیں ۔

لیکن جب فاتح اپنے وطن سے وابستہ رہتا ہے اور مفتوحہ اپنے ملک میں بحیثیت ایک بیرونی مسافر صرف حکومت کرنے اور ملک کو لوٹنے کھسوٹنے کے لئے اقامت اختیار کرتا ہے تو ایسی حالت میں فتح ایک لعنت ہوتی ہے خواہ ایک مہذب قوم کرے یا وحشی ممکن ہے تاریخ اسے اس بنا پر مبنی برحق قرار دیکر کہ مفتوحین سیاسی صلاحیتیں نہیں رکھتے تھے اور ان میں کمزوریاں تھیں لیکن پھر بھی اس واقعہ کی تردید نہیں کی جا سکتی کہ اس قسم کی فتح مفتوحہ قوم کے لیے ان کی مدنی موت کے مترادف ہوتی ہے وہ قوم جو اپنی آزادی کھو دیتی ہے اس میں کسی کام کو شروع کرنے کا نہ داعیہ پیدا ہوتا ہے اور نہ وہ اپنے آپ کو اپنے چنے ہوئے راستہ پر لگا سکتی ہے اور اس سے خود بخود حرکت کرنے کی طاقت سلب ہو جاتی ہے جو زندگی کا اصل جوہر ہے ۔

جب برطانیہ نے ہندوستان کو فتح کر لیا تو برطانوی شہنشاہیت کے مردہ ہاتھ نے ہندوستان کی زندہ دلی کو مفلوج کر دیا کی طاقت کا مکمل مظاہرہ، ان کی درخشاں شان و شوکت ان کی انتظامیہ مشنری جس میں خوب تیل پڑا ہوا تھا اور ان کا بظاہر قیام امن و اماں ان سب نے مل کر ہندوستان

کے باشندوں کو خاموشی سے اس پر رضامند ہونے پر مجبور کر دیا لیکن باوجود اس کے کچھ ناہموار قسم کی اقتصادی ترقی ہوئی اور تعلیم یافتہ متوسط طبقہ میں سماجی ترقی اور سیاسی بیداری کے آثار بھی نمایاں ہوئے اور باوجود اس کے تعلیم گاہیں قائم کی گئیں جو ہندوستان کے دماغوں کو ماڈرن بنانے کا کام کر سکتی تھیں لیکن وہ صرف ایک بیرونی حکومت کی ضروریات کو پورا کرتی تھیں اور باوجود اس کے عدالتیں، ریلوے، سڑکیں اور آمد و رفت کے دوسرے ذرائع مہیا ہو گئے تھے اور باوجود اس کے وسطی زمانے کی قدیم سوسائٹی میں سماجی اور ذہنی ہل چل مچی ہوئی تھی ان سب باتوں کے باوجود اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مفلسی، جہالت اور بیماریوں کے جنازے کی ایک چادر سے اس زمین کا چہرہ ڈھکا ہوا تھا۔ سب سے زیادہ خراب بات یہ تھی کہ تعلیم یافتہ لوگوں کا اخلاقی قدر لونے کے مانند ہو گیا تھا۔

بدقسمتی سے بیرونی ملک کی حکومت نہ صرف قدیم روایات کے تسلسل کو روند ڈالتی ہے بلکہ غلام قوم کے دماغوں کو اور ان کے کردار کو بھی گندہ کر دیتی ہے چونکہ سیاسی عمل کا ان کو اختیار نہیں ہوتا ہے ان میں ایک غلامانہ ذہنیت اور خود سپردگی اور خطرہ مول نہ لینے کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں جن کی وجہ سے انھیں حقائق کا مقابلہ کرنے، ذمہ داری کے ساتھ کام کرنے اور عملی طور پر مفید مصالحتیں کرنے کی طاقت ختم ہو جاتی ہے اور قوم میں بعض اصولی اور عملی رجحان باقی رہ جاتا ہے لیکن انسان کے دماغ کی ساخت ہی ایسی ہے کہ وہ بے حد مخالف حالات میں اپنی فطری آزادی کا ادعا کرتا ہے۔ ہر سوسائٹی میں ہمیشہ کچھ ایسے لوگ ہوتے ہیں جن پر سزا کے خوف یا بخشش کی امید اثر انداز نہیں ہو سکتے کوئی چیز ان کے ضمیر کو جھکانے یا اس میں لچک پیدا کرنے پر قادر نہیں ہوتی ہے

بے اطمینانی کے اسباب

بیرونی حکومت اور لوٹ کھسوٹ کے خلاف رد عمل

اس طرح یہ ہوا کہ غصہ برابر جاری رہا اور حاکمیت وقت سے بغاوت پوری برطانوی راج کے اندر مضمر رہی اگرچہ اس کا اظہار مختلف وقتوں میں مختلف طریقوں سے ہوا اس تاریخ کی دوسری جلد میں ان کوششوں کی داستان تفصیل سے بیان کی گئی ہیں جو برطانیہ حکومت کو اکھاڑ پھینکنے کے لئے کی گئیں۔

1857ء کی بغاوت کے بعد ملک کے مختلف حصوں میں خاص طور پر تشددانہ تحریکات چلتی رہیں لیکن متشدد طبقہ جس کی تعداد اور جس کا اثر روز افزوں ترقی پر تھا اس نے تشدد کے راستے کو فضول قرار دے کر اس کے ترک کرنے کا فیصلہ کیا اس نے اپنے آپ کو اس پر عمل کرنے کے لئے منظم کرنا شروع کر دیا جسے آئینی طریقہ کہا جاتا ہے تاکہ ظلم کا سد باب ہو اور ذمہ دار حکومت کی جانب قدم بڑھے 1885ء میں انڈین نیشنل کانگریس اس غرض سے قائم ہوئی کہ ہندوستان کی رائے عامہ کو منظم کرے اور شکایات کو دور کرنے کے لئے حکومت پر زور ڈالے۔

لیکن بہرحال انیسوی صدی کے دوسرے نصف حصہ میں برطانیہ کا سرمایہ دارانہ صنعتی کاروبار اور اس کی زائیدہ ملوکیت پرستی نے عظیم ترقی کی دنیا کی اقتصادیات میں انگریزوں نے اپنا جال پھیلا دیا اور زمینوں کی تلاش میں لگ گئے جن کو اپنے تیار شدہ مال کے لئے لوٹ کھسوٹ کا استعمال کیا جا سکے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مملکت برطانیہ میں ایک عظیم رقبہ کا اضافہ ہو گیا اور نوآبادیاتی اقتصادی نظام کا رشتہ انگریزوں کے وطن مالوف اور ان کی تابعدار ملکوں مثل ہندوستان کے قائم ہوا۔

ملوکیت پرستی انیسویں صدی کے چوتھے دس سالوں کے بعد دریا کے موجوں کی روانی کی طرح پھیل رہی تھی اور اس صدی کے اختتام سے اس نے اپنی آخری کود مچائی آخری مرحلہ میں اس کے رہنما جوزف چیمبرلین تھے جنھوں نے اپنے گرد مختلف سیاسی جماعتوں سے تعلق رکھنے والے اہل علم و دانشور لوگوں کا ایک گروہ جمع کر لیا قدامت پرست سیاستداں جیسے کہ سالس بری (Salisbury) لبرل حضرات جیسے روزبری (Rosebury)، اسکوئتھ (ASQUITH) اور ہالڈین (Haldane) لیبر لیڈران جیسے سڈنی وب (Sidney Webb)، ایچ جی ولس (H.G. Wells) برنرڈ شا (Bernard Shaw) اور ریمزے میکڈانلڈ (Ramsay Macdonald) ملوکیت پرستی کے تخیل کے زبردست حامی ہو گئے

اس صدی کے آخری دس سالوں میں ملوکیت پرستی کے تخیل کو لازمی قرار دینے کی ایک شدید ہنگامی ضرورت برطانیہ کے رقیبوں کے مقابلہ کی کارروائیوں سے پیدا ہونے والے خطرات کی وجہ سے وجود میں آگئی۔ رقیبوں نے جو عملی چیلنج دیا تھا اس نے قدرتاً برطانیہ کے حکمراں طبقہ کی دفاعی تنظیمات کو مضبوط تر کرنے پر اکسایا اور اس کے جذباتی ردّعمل میں شدید اضافہ کر دیا

لیبر لیڈر کیر ہارڈی (Keir Hardie) اسی زمانے میں ہندوستان آیا تھا اس نے لکھا کہ "سردست برطانوی افسران اور ہندوستانی عوام کے درمیان خلیج وسیع تر ہوتی جا رہی ہے

ہیں نے ماجاؤں کے قیمتی اور لزیز کھانے کھاتے ہیں تعلیم یافتہ متوسط طبقہ کے ساتھ میز پر یک جا بیٹھ کر روٹیاں توڑی ہیں اور رعیت کے ساتھ بھونا بھی چبایا ہے اور ہر حال میں مجھکو غیر متبدل اور یکساں شہادت اس امر کی ملی ہے "1

ہندوستانیوں اور انگریزوں کے لین مساویانہ میل جول کبھی نہیں رہا لیکن 1857ء کے غدر کے بعد اجنبیت میں بہت ترقی ہوگئی تھی نتیجہ کے طور سماجی علیحدگی پسندی بہت بڑھ گئی اور ایک دوسرے سے نفرت کی نشو نما ہوئی۔

ریمزے میکڈانلڈ نے ہندوستان کے اندر برطانوی افسران کے بارے میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ" لیکن یہ لوگ نہایت کند ذہن اور انسانی ہمدردی سے یکسر عاری ہیں 9/10 حصہ ایسا ہے جو اپنے بیرونی عہدوں سے واپس ہوکر یہاں کی جن پر اہر حکمرانی کرتے ہیں ان کے ذہن و مزاج کو سمجھے بغیر آجاتے ہیں۔ اگر ان سے پوچھا جائے کہ یہاں کے رہنے والوں کا مذہب کیا ہے تو یہ ان کا مضمون نہیں ہے اسی طرح محکوم رعایا کے رسم رواج بھی ان کے مضامین سے خارج ہیں اور یہی حال ان کے مسائل کا بھی ہے۔ یہ بھی ان کا مضمون نہیں ہے۔ وہ ایک مختلف نسل کے ہیں اور اسی مختلف نسل کے رہ جاتے ہیں ان کا کام بس مشینی ہے "2

ہندوستان کا قدرتی ردّعمل تشدد آمیز غصہ تھا جو کبھی دبا ہوا تھا۔ اور انھوں نے ناانصافیوں۔ بے عزتیوں اور اہانتوں کو بلا کسی بدلے کے جذبہ کا مظاہرہ کئے ہوئے برداشت کیا۔ لیکن ان کے دلوں میں شرم، تلخی اور احساس ذلت کے جذبات بھرے ہوئے تھے بے کسی اور ناامیدی پر قابو پانے کے لئے کبھی کبھی انفرادی انگریزوں پر تشددانہ حملے کئے جاتے تھے

اقتصادی تباہ حالی

لیکن سماجی اور ذاتی تعلقات تو الگ رہے جس نے سب سے زیادہ بے اطمینانی کی آگ میں ایندھن ڈالنے کا کام کیا وہ گورنمنٹ آف انڈیا کی جانب سے ملوکیت پرستانہ مفادات کو پیش پیش رکھنا تھا

عوام الناس کی اقتصادی تباہ کاری کی نازک صورت اس وقت نمایاں ہوئی جب انیسویں

1- Keir Hardie, India. Imperialism and Suggestions, PP. 102-3.

2. Ramsay Macdonald. Labour and Empire (1907) P.P. 26-27.

صدی کی آخری چوتھائی میں متعدد بار بارش کی کمی کی وجہ سے غذا میں کمی ہوئی اور قحط بھی پڑے بعض صورتوں میں تو فاقہ کشی اور اموات وسیع پیمانہ پر ہوئیں مثلاً 1876-78/3 ، 1896-98/4 1899-1900/5 میں۔

1885ء کے بعد انڈین نیشنل کانگرس کا اجلاس ہر سال ہوتا رہا تعلیم یافتہ طبقہ میں اس کے اثرات تیزی سے پھیلے یہ متوسط طبقہ کے خیالات و آراء کا ترجمان بن گیا۔ تین خاص معاملات پر اس کی توجہ مرکوز تھی۔ (1) نمائندہ حکومت اور مرکزی اور صوبائی مجالس قانون ساز ممبران کی تعداد اور مجالس مذکورہ کے احاطہ عمل میں توسیع (2) اونچی ملازمتوں کو ہندوستانیوں سے ہی پر کرنا (3) ہندوستان کا افلاس۔ دراصل اس نے مفلسی کو نمائندہ حکومت سے منسلک کر دیا تھا جیسا کہ اس کی اس تجویز سے ظاہر ہے جو 1885 میں منظور ہوئی تھی۔

"کانگرس ہندوستان کی کثیر آبادی کے افلاس سے گہری ہمدردی رکھتی ہے اور افلاس کے روز بروز بڑھتے جانے پر اپنی شدید پریشانی کا اظہار کرتی ہے اور اپنے اس مضبوط عقیدے کو ضبط تحریر میں لانا ضروری سمجھتی ہے کہ ایک نمائندہ حکومت کا قیام باشندگان ملک کی حالت کو سدھارنے کا ایک نہایت اہم سیاسی قدم ہوگا" /6۔

کانگرس کے پانچویں اجلاس (1889) میں اقلیتوں کے تحفظات کے اسکیم کی وضاحت کی گئی اور یہ طے کیا گیا کہ:

3- Deaths & deaths over and above the normal deaths in Bombay Presidency and 6 millions and the rest of the famine area. See B.H. Bhatia "Famine in India." PP. 99 - 101.

4- Deaths, Excess of deaths over the normal rate 4.5 million for 1896, 1900. 6.5 million for 1896 India P. 242

5- Deaths Mortality in British Districts - 1.25 million according to Galb, 3.25 according to Digby Ibid. P 261.

6 - The Indian National Congress 1886. Calcutta Resolution no 2 (G.B.) Natesan, The Indian National Congress 2nd Edition Part III. P. 30

"یہ جہاں کہیں پارسی، عیسائی، مسلمان یا ہندو اقلیت میں ہونگے کہ وہاں پارسی، عیسائی اور مسلمان کا وہاں کی قانون ساز اسمبلی میں جہاں تک ممکن ہو کل منتخب شدہ ممبران کی نسبت اس سے کم نہ ہو گی جو تناسب پارسی، عیسائی، مسلمان یا ہندو (جیسی بھی حالت ہو) کی مجموعی آبادی کا اس حلقہ کی کل آبادی کے مقابلہ میں ہو" /7

جہاں تک کہ اونچی ملازمتوں میں ہندوستانیوں کی تقرریاں کا سوال تھا اس پر کانگرس اور بھی بضد تھی اس نے صرف اس بات کا ہی مطالبہ نہیں کیا کہ تمام اونچی جگہوں پر ہندوستانیوں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے بلکہ اس کی مانگ کی کہ سول سروس کے امتحانات اور انگلستان اور ہندوستان میں ایک وقت میں یکساں طور پر لئے جائیں۔

گورنمنٹ کی کارروائیوں پر کانگرس کی نکتہ چینیاں اور اس کی پالیسیاں ہزاروں اخبارات اور بے شمار پلیٹ فارموں سے دوہرائی گیئں اس سے گورنمنٹ صرف خفا ہی نہیں ہوئی بلکہ اس نے اس کا مقابلہ کر کے ختم کر دینے کے لئے قدم اٹھائے۔

کانگرس کے بارے میں اور بالخصوص ہندوؤں کے بارے میں جو کانگرس کی پشت پر تھے حکومت کے رویہ کی تبدیلی کا جوابی ردعمل ظاہر ہوا۔ جو لوگ زیادہ بے صبر اور وہ لوگ جو صاف گو تھے معتدل طبقہ کے لیڈران پر اعتراض کرنے لگے اور اس بات کی تبلیغ پر آمادہ ہوگئے کہ اور زیادہ مہم جویانہ مقابلہ گورنمنٹ کا کیا جائے۔ مثال کے طور پر پنجاب میں آریہ سماج کے لیڈر لاجپت رائے مغربی ہندوستان میں تلک بنگال میں کارخانہ کے افسران بڑودھا میں آربندو گھوش ان سب لوگوں نے کانگرس سے اس بنا پر اپنی بے اطمینانی کا اظہار کیا کہ یہ گھن آنے کی حد تک اور غالباً منافقانہ طور پر برابر تاج برطانیہ سے اپنی وفاداری کا اظہار کرتی رہتی ہے اور گداگری کا ذلیل طریقہ اختیار کر رکھا ہے۔

اس طرح ایک نئی روح کی نشو نما کا آغاز ہو رہا تھا اس کو انگریزوں کے زیادات رو پے عوام کی اقتصادی حالت کی بدتری اور سیاسی جبر و تعدی کے خلاف غصّہ سے تقویت حاصل ہو رہی تھی اس نئی روح نے اپنی غلطیوں کو جانچنے اور اپنی انفرادیت خود اعتمادی اور عزم راسخ قائم کرنے کی جانب رہنمائی کی۔ اس نئی روح کو واقعات عالم نے مفید مواد فراہم کیا کیوں کہ انیسوی صدی کے اختتام کے وقت کل ایشیا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ شمالی افریقہ، مغربی ایشیا، وسطی ایشیا اور مشرق بعید کے تمام ممالک ایک نئی اسپرٹ کی آگ محسوس کر رہے تھے جو مغرب کے تسلط کے خلاف ردعمل اور

---

7 - Resolution No ii (5) 1889 Congress Actual P.14

ایشیا کی پسماندہ اقوام کو نئی زندگی دینے کی خواہش سے مرکب تھی

انیسوی صدی کا زمانہ وہ زمانہ ہے جب تمام دنیا میں نیشنلزم کا ابھار معجزانہ طور پر نمایاں ہوا اس سے نہ مغرب مستثنیٰ رہا اور نہ مشرق۔ اس کا مدعا یہ تھا کہ ایک ایسی سوسائٹی کی تعمیر کی جائے جو ٹھوس ہو اور دور انی مرکزی حکومتیں قائم کی جائیں جن میں ایک زبان ہو کر ایک قسم کی وفاداری ہو اور ایک قومی جذبہ ہو۔ لیکن اس میں اقلیتوں کے لئے خواہ وہ علاقائی ہوں یا لسانی یا مذہبی تحفظات کی مشکل سے گنجائش نکل سکتی تھی فرانس، جرمنی اور برطانیہ میں یک جہتی مساوات اور مرکزیت کی جانب ارجحان تھا۔

آئر لینڈ میں ہوم رول کی شورش کو اتنی کامیابی حاصل ہوگئی تھی کہ انھوں نے لبرل پارٹی کے لیڈر گلیڈ اسٹون کو اس حد تک ہموار کرلیا تھا کہ اب سلف گورنمنٹ کو زیادہ عرصہ تک ٹالا نہیں جاسکتا تھا

جنوبی افریقہ میں بوروں (Boers) نے بغاوت کردی۔ وہ اس بہادری کے ساتھ لڑے کہ انھوں نے برطانوی شہنشاہیت کے اقتدار کو نیچا کردیا اور آزادی پسند بوروں کے جنگجویانہ اوصاف کیلئے تحسین حاصل کیا جاپان نے ماڈرن ازم (جدیدیت) کی جانب بڑے قدم اٹھائے تھے اور اپنے قومی جذبہ کا بہت جلد نمایاں مظاہرہ کیا۔

ان واقعات سے ہندوستان بھی متاثر ہوا۔ اٹلی کی مختلف ریاستوں کے اتحاد نے تعلیم یافتہ طبقہ کو بہت متاثر کیا تھا حتی کہ سورندر ناتھ بنرجی نے تقریروں کا ایک سلسلہ اس پر جاری کیا تھا اور بنرجی کی حیات پر کتاب بھی لکھی۔ تلک اپنی آپ مدد کرنے اور اپنے اوپر بھروسہ کرنے کے پیام کی تبلیغ کر رہے تھے اور عوام کو بیدار کر رہے تھے کہ وہ سیاسی تحریک میں حصہ لیں اور قومی پروگرام پیش کرتے تھے آربند گھوش نے کانگرس کے ایجی ٹیشن کے طریقوں سے اختلاف کیا اور یہ خواہش ظاہر کی کہ پرانے چراغوں کی جگہ نئے چراغ لائے جائیں۔

کرزن کا دور

کرزن کا کردار

اس نازک موقع پر تاریخ نے اپنا منتخب آلہ اس غرض سے نمودار کیا تاکہ زلزلہ کا وہ سلسلہ شروع ہو جس نے نصف صدی سے کم میں برطانوی شہنشاہیت کو زیروزبر کردیا۔

30 دسمبر 1898ء کو کرزن نے ہندوستان کی سرزمین پر اس لیے قدم رکھا کہ وہ اس عہدے کا چارج لیں جوان کے اسکول کے زمانہ سے ان کی "سیاسی حج کا مکہ" رہا ہے لڑکپن میں ان کے دماغ میں سرجارج اسٹیفن کی وہ تقریر سن کر جو انھوں نے ایٹن لٹریری سوسائٹی کے سامنے کی تھی۔ آگ بھر گئی تھی اور انھوں نے کوشش بلیغ کی تھی کہ وہ ہندوستان کے وائسرائے مقرر ہو جائیں گے۔

ان کے دل کی ہوس صرف یہ نہیں تھی کہ وہ اپنی زبردست اور مجنونانہ توانائی کو اکھاڑے میں آتاریں یا ایک طویل اور تھکا دینے والا سفر عالم کے گرد اور مشرق کے گرم اور گرد آلود سرزمین پر اختیار کرنے کے لئے اپنے اندر جذبہ پیدا کریں بلکہ جو کچھ ان کا منشا تھا وہ ٹینسن (Tennyson) کے حسب ذیل قطعہ سے ظاہر ہو گا۔

"اس طرح میں دارالا قاموں ہال اور دیہات کے ان گھروں سے گزروں جہاں فارم کی عمارتیں ہوں، پلوں اور گھاٹوں کو پار کروں، پارک اور احاطوں سے نکلوں اور ہر جگہ میں مسلح اور گھوڑے پر سوار چلوں خواہ کچھ بھی پیش آوے حتیٰ کہ میں اس مقدس پیالے کو پا جاؤں جو حضرت مسیح نے عشاء آخری میں استعمال کیا تھا۔"

حضرت مسیح کا مقدس پیالہ اس معاملہ میں اور کچھ نہیں تھا سوائے برطانیہ کی آخری تقدیر کے تقریباً ہر سال 1882ء سے 1895ء تک وہ جانچ کرنے کے لئے سفر کرتے تھے۔ خاص کر ایشیا کے ممالک کا تاکہ وہ جان سکیں کہ یہ ممالک برطانوی شہنشاہیت کے کس حد تک وفادار ہیں۔ یورپ کی طاقتوں کے درمیان افریقہ پر قبضہ کرنے کے بارے میں جھگڑے پیدا ہو گئے تھے اور ایشیا میں اپنی مملکتوں اور احاطۂ اثر قائم کرنے کے سلسلہ میں جو رقابتیں چل رہی تھیں ان سب کی وجہ سے انگلستان پر شہنشاہیت کی ایک لہر موجزن ہو گئی تھی کرزن نے اسے اپنا فرض سمجھا کہ وہ اس مسئلہ کا مطالعہ کرے اور ایک ایسا حل تلاش کرے جس سے برطانوی شہنشاہیت کے استحکام اور قوت کی کماحقہ یقین دہانی ہو جائے۔

ان کے بہت سے سفروں نے یہ ثابت کر دیا کہ معاملہ کتنا خطرناک ہے جب وہ ایک قلیل مدت کے لئے (92-1891ء) نائب وزیر ہند اور (98-1895ء) تک نائب وزیر خارجہ رہے وہ اپنی اس رائے پر مضبوطی سے قائم ہو گئے اور انھوں نے

8. Tennyson. A. "Sir Galahael" Early Poems Vol II (1888) P. 82

عزم بالجزم کیا کہ شہنشاہیت کے خلاف جو خطرات ہیں ان کو دور کرینگے اور شہنشاہی محل کی طاقت میں نئی روح پھونکیں گے۔

اس کام کو کرنے کے لئے ان میں خصوصی صفات تھے۔ مارلے نے ان کو حسب ذیل الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا تھا:

"آپ نے ہندستان میں کبھی کوئی ایسا وائسرائے جو دماغی قوت میں بلا تکان محسوس کئے یا بلا ایک حرف شکایت کئے محنت کرتے میں اور جذباتی شدت اور وفاداری سے ہندستان کے ہر متعلقہ معاملہ میں بہی خواہی کرنے میں یا جس کے تخیلات میں ہندستان کے مسائل کی عظمت کا ایک ایسا نقش ہو ان سے برتر کیا ان کے برابر بھی نہیں بھیجا۔ آپ نے کبھی اس اوصاف سے زیادہ کا کوئی آدمی سوائے لارڈ کرزن کے نہیں بھیجا"/9

کرزن ایک تیز ذہن والا دانشور تھا۔ اہل علم، مصنف اور مقرر۔ اس کے پاس فکر تھی: نیا کام شروع کرنے کا اور اسے تکمیل تک پہنچانے کا جذبہ تھا۔ اس میں انتظامی قابلیت اعلیٰ درجہ کی تھی۔ اپنے خیالات کو عمل کا جامہ پہنانے میں وہ نہ تو اپنے کو بخشتا ہے نہ دوسروں کو اس کا نعرہ کارگذاری تھا۔

لیکن اس کے کردار میں بعض سنگین خامیاں تھیں وہ حد سے زیادہ ہوس جاہ میں مبتلا تھا۔ سرتاپا غرور میں ڈوبا ہوا اور ضدی تھا۔ وہ مشوروں کو نظر انداز کرتا اور مخالفین کا مضحکہ اڑاتا تھا۔ خود پرست، بے اصول، جلد مشتعل ہونے والا اور وہمی تھا اس میں دوربینی اور ہمدردی کی کمی تھی۔ اور انسانوں کے سمجھنے کا کم مظاہرہ کرتا تھا۔ وہ اپنے ماتحتوں تک کے جذبات کو کچلتے روندتے چلا جاتا تھا۔

سلف گورنمنٹ کے متعلق کرزن کا تصور

سیاست کے متعلق ان کے خیالات انتہائی رجعت پسندانہ تھے وہ اپنے ہی پارٹی لیڈران مثل سالسبری (Salisbury) کو مغائرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا اگر وہ ان کی خارجہ پالیسی سے اختلاف کرتے تھے وہ گلیڈسٹون کو اس لئے ناپسند کرتے تھے کہ وہ

9- Kaith A.B. Speeches and documents on Indian Policy Vol II P.P.88-9

Viscound Morley. of Black boom House of Lords 23 Feb. 1909.

آئرلینڈر کے لیئے ہوم رول کے ہمنوا تھے ۔ لائڈ جارج سے تو ان کو خصوصی نفرت تھی ۔ وہ ایک رجعت پسند اور رئیسانہ دماغ کے آدمی تھے اور جو لوگ بھی جمہوری تحریکات کی ذرا بھی تبلیغ کرتے تھے مثلاً یہ کہ وہ عورتوں کے لئے ووٹ کا حق مانگنے والے ۔ جو عورتوں کو سیاسی حقوق دلانا چاہتے تھے ۔ یا وہ لیبر لیڈران جو گورنمنٹ پر قبضہ کرنا چاہتے ۔ ان سب کو وہ سماج دشمن عناصر تصور کرتے تھے ۔

جہاں تک ہندستان کا تعلق ہے وہ بہت واضح بہت جنگجویانہ اور مکمل رجعت پسندانہ خیالات رکھتے تھے ۔ ان کے خیالات کا تجزیہ دو پہلوؤں سے کیا جا سکتا ہے ۔ (1) ہندستان کے متعلق برطانیہ کی ذمہ داریاں اور (2) ملوکیت برطانیہ کے معاملات میں ہندستان کا کردار ۔ یہ جاننے کے لئے کہ ہندستان کے متعلق برطانیہ کے کیا فرائض تھے ۔ یہ جاننا ضروری ہے کہ ہندستان کیا تھا کرزن نے اعلان کیا کہ :۔

" وہ لوگ یعنی ہندستانی ایک قوم نہیں ہیں نہ ان کی ایک زبان ہے نہ وہ ایک نسل سے ہیں اور نہ ان کا ایک مذہب ہے ۔ وہ لوگ ایک براعظم ایک مملکت میں بلکہ تقریباً ایک الگ تھلگ دنیا ہیں "/10

اس لئے انھوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ "یا انگلستان کے لئے اچھا ہوگا ۔ ہندستان کے لئے اور بھی بہتر اور ترقی پسندانہ تحریک کے لئے بالعموم بہترین ہوگا ۔ اگر شروع ہی سے یہ بات سمجھ لی جائے ہمارا ذرا ارادہ بھی نہیں ہے کہ ہم ہندستان پر کے مقبوضات سے دست کشت ہو جائیں اور یہ بہت زیادہ قیاس کے خلاف ہے کہ ہماری آئندہ نسلیں ایسا ارادہ قائم کریں "/11

کرزن یہ تسلیم کرتا تھا کہ بحیثیت حکمراں برطانیہ کے ذمہ باشندگان ہند کے بارے میں چند ذمہ داریاں ہیں لیکن اسی کے ساتھ وہ سوال کرتا تھا کہ " وہ بے زبان کروڑوں آدمی کون ہیں جو خود اپنی زبان کو نہ پڑھ سکتے ہیں نہ لکھ سکتے ہیں ۔ ہندوستان کے عوام وہ لوگ ہیں جو ریت

---

10 - Curzon, Speech at the Dinner in his honour at Savoy Hotel the London Society of Pilgrims on April 6, 1906, Subjects of the Day, P.23.

11 - Fraser, Lovat India under Curzon and after (Heinman -n 1911) P.P. 23-24.

ہیں اور کسان ہیں اور ان کی زندگی میں کسی قسم کا سیاسی منصوبہ نہیں ہے۔ بلکہ ان کی زندگی کا مقصد خاموشی سے مفلسی میں رہنا اور محنت کرنا ہے۔ جو پلان اور پالیسی کانگرس نے مرتب کی ہے وہ اس بے ہنگم ادنیٰ طبقہ کو ذرا بھی چھو نہ سکے گی۔"12/

ان اصولوں کی منطق کا یہ نتیجہ نکلا کہ انڈین نیشنل کانگرس نے جو مطالبات کئے تھے ان کی کوئی حقیقت نہ تھی جب کہ کرزن نے مہاجن سبھا کے اس مطالبہ کو کہ وہ عام پبلک کے نمائندے ہیں رد کر دیا تو جارج ہملٹن (George Hamilton وزیر ہند نے (1903 - 1895) ان کی پیٹھ اس بات پر ٹھونکی کہ انھوں نے ان کے (یعنی کانگرس والوں) سر خوب توڑے تھے۔ اور مسرت آمیز لہجہ میں کہا کہ "اگر کانگرس ایک یا دو سال میں ختم ہو جائے تو اس کے وجود کو مٹانے کا سہرا آپ کے سر ہوگا"13/

ٹامس ریلے جو کرزن کی اکزیکیوٹو کونسل کا شعبہ قانون کا ممبر تھا اس نے دعویٰ کیا ہے کہ "کانگرس تنہا دیانتداری کے ساتھ ہندو قوم کے اس گروہ کی رائے کا اظہار کرتی ہے جن کو ان مراعات میں جو سیاسی حقوق کے سلسلہ میں دیئے جاتے ہیں ہندستان کے مدعا اور انگریز کے فرض نظر آتے ہیں۔ فصیح البیان بنگالی یا مرہٹہ جو کانگرس میں اپنی کارروائیوں کے لئے مناسب جگہ پاتے ہیں وہ اس قابل ہیں کہ ان کی بات غور سے سنی جائے لیکن ہندستان کے مختلف کردار اور مختلف جذبات رکھنے والوں میں وہ فقط ایک قسم ہیں (اور دوسرے بھی ہیں) وہ لوگ جن پر مختلف چھاپ ہے جیسے کہ مسلمان شرفا جن کی تربیت علی گڑھ میں ہوتی ہے۔ قدیم وراثت کے مالک راجگان ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور بہت سے شریف باخندے جو تعلیم یافتہ ہیں یہ سب لوگ صرف قابل لحاظ نہیں ہیں بلکہ سیاست ہند میں وہ رہبری کا درجہ رکھتے ہیں اور ان میں بہت سے لوگ کانگرس سے اختلاف رکھتے ہیں۔ بعض حقارت سے لاپرواہی ظاہر کرتے ہیں اور بعض کھلی مخالفت ——— کانگرس ایک قبل از وقت اور غیر عاقلانہ کوشش اس بات کی کر رہی ہے کہ انگریز کے سیاسی تصورات کو ہندستان میں آباد کر دے۔ دوسری بات یہ ہے کہ کانگرس جو فرضی دعوے کر رہی ہے وہ اس کی اصل حالت سے کوئی ذرا بھی نسبت نہیں رکھتی۔ جن لوگوں کی نمائندگی کی وہ دعوے دار ہے۔ ان میں سے 99٪ فیصدی نے تو اس کا نام

---

12 - Curzon's speech in the House of Commons, March 28, 1892 in Keith. A.B. op. cit Vol II P. 60.

13 - Hamilton Papers, Hamilton to Curzon, 24 january 1901.

تک نہیں سنا ہے 14/

ملازمتوں کے بارے میں کرزن کے خیالات

یہی منطق ہندستانیوں کو اونچے درجہ کی ملازمتوں کے دینے میں بھی کارفرما تھی 1904
کے بجٹ کی تقریر میں کرزن نے اعلان کیا کہ "ہندستان کی ملازمتوں کی سب سے اونچی جگہوں
پر بطور ایک عام قانون صرف انگریزوں کا تقرر ہونا چاہئے۔ کیونکہ کچھ تو وراثتہ کچھ بلحاظ پیدائشی
تربیت اور کچھ تعلیم اور اصول حکومت سے واقفیت اور دماغ کی عادات اور کردار کی مضبوطی
کے باعث جو اس کام کے لئے لازمی ہیں وہ اس کے مستحق ہیں 15/
اس طرح کانگریس کے پروگرام کے دونوں سیاسی مشن ناموں کو ٹھوکر ماردی گئی۔ اور یہ
بالکل شک سے بالاتر واضح ہوگیا کہ برطانیہ کا کوئی ارادہ نہ توان وعدوں کو وفا کرنے کا ہے۔ جو
1833 اور 1858 میں کئے گئے تھے۔ اور نہ گورنمنٹ میں ہندستانیوں کو کسی بااثر پوزیشن
دینے کا ہے۔

مملوکیت برطانیہ میں ہندستان کے کردار کے بارے میں کرزن کے خیالات

اس لئے شہنشاہیت برطانیہ کے نظام میں ہندستان کا کارمنصبی کیا ہوگا۔ کرزن نے جو
دنیا اور ممالک مشرق کا دورہ کیا تھا۔ اس سے اس پر واضح ہوگیا تھا کہ برطانیہ ایک خطرناک حالت
سے دوچار ہے۔ یہ تنہا رہ گیا ہے۔ اور اس کا کوئی دوست نہیں ہے۔ ہر چہار جانب رقیب ابھر
رہے ہیں۔ اور اس کی حکمرانی کو دعوت مقابلہ دے رہے ہیں۔ اقتصادی اور سیاسی دونوں کی
حکمرانیوں کو۔

ممالک متحدہ امریکہ، جرمنی اور جاپان تیزی سے صنعتی ترقیاں کر رہے تھے۔ اور
بین الاقوامی معاملات میں فرانس، روس اور جرمنی اپنی مملکتوں کی توسیع کے لئے اپنے
مطالبات پیش کر رہے تھے۔ اور اپنی فوجی طاقت کی تعمیر کر رہے تھے۔ جو برطانوی شہنشاہیت

---

14 - Ralegh. J. Lord Curzon in India Vol I, Introduction PP. XVIII-XIX.

15 - Curzon Budget Speech, 30 March 1904. See Speeches by Lord Curzon Vol III P. 410.

کے لئے ایک سنگین خطرہ تھا۔

ممالک متحدہ امریکہ نے فلپائن اور دوسرے جزیروں پر قبضہ کر لیا تھا۔ اور اس طرح جنوبی مشرق ایشیا میں برطانیہ کی توسیع کو روک دیا تھا۔ اس نے وینز ولا (Venezuela) کے تنازعہ میں دخل دینے پر برطانیہ کو ملامت کی تھی۔ افریقہ، مشرق وسطیٰ، چین اور ملایا کے مشرقی علاقوں میں یورپی اقوام کی ہوس رانیوں۔ ان سب نے دور افتادہ برطانوی مملکت کے پاسبانوں کو مضطرب بنا رکھا تھا۔ اس تکلیف دہ صورت حال کے مقابل ہونے پر کرزن نے برطانیہ کے مقبوضہ ہندوستانی مملکت کی اہمیت اور قیمت کا پتہ لگایا۔

گلڈ ہال (Guild Hall) میں شہر لندن کا اعزاز حاصل کرتے ہوئے جو تقریر اس نے کی اس میں کہا کہ:۔

"میں اس مجمع کو یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ شہنشاہیت کا بوجھ اٹھانے میں ہندوستان کتنا حصہ لے سکتا ہے۔ نہیں بلکہ یہ کہ اس نے اب تک کتنا حصہ لیا ہے اگر آپ نیٹال کی نوآبادی کو ایک مضبوط دشمن سے بچانا چاہتے ہیں تو ہندوستان سے مدد مانگئے وہ دے گا۔ اگر آپ سفید فام باشندوں کو پیکنگ میں قتل عام سے بچانا چاہتے ہیں اور ضرورت فوری ہے تو آپ گورنمنٹ آف انڈیا سے کہئے کہ وہ ایک سفارت وہاں بھیجے اور وہ بھیج دے گی۔ اگر آپ سومالی لینڈ میں پاگل ملایا سے لڑ رہے ہیں تو آپ کو جلد معلوم ہو جائے گا کہ ہندوستان کی فوجیں اور ہندوستان کے جنرل اس کام کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہیں اگر آپ امپائر کی دور دراز کی چوکیوں یا کوئلے کے اسٹیشنوں کی مدافعت کرنا چاہتے ہیں خواہ وہ ماریشس میں ہوں یا سنگاپور میں یا ہانگ کانگ میں بلکہ ٹن ٹی سین (Tien - Tsinn) یا شان ہائی کوان (Shan Hai Kwan) تک ان سب کے لئے آپ کو صرف ہندوستانی فوج پر بھروسہ کرنا ہے اگر آپ یوگینڈا میں ریلوے تعمیر کرنا چاہتے ہیں یا سوڈان میں تو آپ ہندوستان کے مزدوروں کی مدد مانگئے"[16]

وہ روز بری (Rose bury) کے الفاظ کا بھی اضافہ کر سکتے تھے جنہوں نے

16- Curzan, Lord Speach on 20th July 1904 Cited by Bennet -C. The carcibt of Empire P, 346.

ہندستان کی مملکت کی قدر و قیمت پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ " یہ مختلف نوع کی ضمانتیں اور مواقع اس کے کارکنوں اور ہر طبقہ کے کام کرنے والوں کے لئے مہیا کرتا ہے " وہ لندن کے تاجروں کو بھی یہ یاد دلا سکتے تھے کہ برطانیہ کے ــــــ سرمایہ کے لگانے کے لئے ہندستان ایک وسیع اور محفوظ میدان ہے ۔

اپنے دوسخت کام کے لئے کرزن نے جس طریقہ سے کام کیا اس کی خصوصیات ان کی خود اعتمادی، تحکمانہ طرز اور مضبوط ارادے تھے۔ اور وہ اپنے اوپر درجہ والوں کی نصیحت کا بھی لحاظ نہیں رکھتے تھے اور نہ دوسروں کے جذبات کا خیال کرتے تھے ۔

بین الاقوامی امور میں ہندوستان

بین الاقوامی میدان میں برطانیہ کے تین خاص رقیب تھے ۔ فرانس، جرمنی اور روس یہ ضروری تھا کہ ان کے ارادوں کو روکا جائے ۔ فرانس نے جنوبی مشرقی ایشیا میں ایک مملکت قائم کر لی تھی اور ہندستان کے جنوبی مشرقی ما حول کے ملکوں پر مشتبہ حرکات کر رہا تھا ۔ منہ سے محروم ہو کر وہ شمالی مغربی افریقہ پر اپنا تسلط قائم کر رہا تھا ۔

مشہد کے واقعہ کے بعد اس نے مشہد میں ایک سفارت خانہ قائم کیا ۔ اور سلطان کی مملکت میں ایک کوئلہ کا اسٹیشن قائم کیا ۔ اس نے برطانیہ کے راستہ کو جو ہندستان اور آسٹریلیا کو جاتا تھا خطرے میں ڈال دیا ۔ اس کا یہ بھی نتیجہ ہوا کہ بحر فارس میں ایک دشمن کو داخلہ مل گیا جو اب تک صرف برطانوی اثر میں تھا ۔

نوجوانوں اور حوصلہ مند قیصر ولہلم دوم (Wilhelm II) کے زیر ہدایت جرمنی نوآبادیاتی اور تجارتی توسیع کے لئے بڑے بڑے پیمانہ کی اسکیمیں رکھتا تھا ۔ قیصر نہ صرف امریکہ میں حصہ بٹانے کی لالچ میں تھا ۔ بلکہ مسلم ممالک کے حقوق کے علمبردار اور مسلمانوں کے دوست ہونے کا بھی دعویدار تھا ۔ جرمنی کا ایک فوجی مشن عثمانی ترکی کی فوجوں کو تربیت دے رہا تھا ۔ جرمنی نے یہ بھی پلان بنایا تھا کہ بذریعہ ریلوے برلن اور بغداد کو جوڑ دے اور جو ریلوے بصرہ اور کویت جا کر ختم ہو ۔ اس کے نمائندوں نے بحر فارس کا معائنہ کیا جس سے انگریزوں کو سخت ناگواری ہوئی ۔ اس نے ایران اور بوشہرہ میں سفارتی دفاتر کھولے ۔ قیصر نے جیمسن (Jameson) کا کا مبارک باد کا (Kruger) کروگر کی پریشانی

پر دیا تھا وہ بہت قابل لحاظ تھا۔

روس سب سے زیادہ طاقت ور حریف تھا۔ روس ایشیا کے مختلف خطوں پر جس طرح بڑھ رہا تھا وہ برطانوی مفاد کے لئے خطرے کا باعث تھا۔ اب تک وسط کے وسیع ممالک کو روس اپنی سلطنت میں شامل کر چکا تھا۔ اور اس طرح روس کی فوجوں کو افغانستان کی سرحد تک لے آیا تھا اور اس سے بھی زیادہ پریشان کن بات یہ تھی کہ وہ آگے بڑھ کر واکھان (Wakhan) کی تنگ وادی سے نکل کر چترال تک پہونچ گیا تھا۔ روس شمالی ایران کو اپنے زیر اقتدار لے آیا تھا۔ اور اتر سے دکھن تک ایک ریلوے لائن بنانے کا منصوبہ تیار کیا (جلفا سے اہواز تک) اور خلیج فارس، بندر عباس، چاہ بہار جو بحر ہند سے ملتے ہیں اپنے استحکامات بنانے کی فکر میں تھا۔ اس نے ایران میں کئی ایک قونصل دفتر قائم کئے اور اس کے ایجنٹ سلطان مقط کے پاس یہ درخواست لے کر گئے کہ انہیں ایک کوئلہ کا کارخانہ تعمیر کرنے کی اجازت دی جائے۔ تبت میں روسی ایجنٹ چین کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ تاکہ وہاں اپنا اثر قائم کریں۔

کرزن ان تمام واقعات کے ابھرنے کے معانی کو خوب سمجھتا تھا۔ اور اس نے شہنشاہیت کے بنیادی فسادات کے تحفظ کے لئے عملی کاروائیاں شروع کیں۔ تمام پوزیشن کی کنجی خلیج فارس تھا۔ ہوشیاری کے ساتھ تدبر اور طاقت کی نمائش کے امتزاج سے سلطان مقط کو مجبور کر دیا گیا اور اس نے جو مراعات فرانس اور روس کو دی گئیں تھیں واپس لے لیا۔ خلیج کے جزائر اور بندرگاہوں میں برطانیہ کی موجودگی پر مہر تصدیق ثبت ہو گئی جنوبی ایران میں تجارتی مشن روانہ کئے گئے۔ بحری ٹیکس پر گفت و شنید ہوئی سڑکیں تعمیر کی گئیں اور ایک تار برقی کی لائن بلوچستان سے ایران ہوتی ہوئی یورپ لے جائی گئی ان کوششوں کا پھل اس وقت ملا جب 1907ء میں ایک اینگلو ایشین (انگلستان اور روس کے درمیان) معاہدے پر دستخط ہوئے اور ایک تین ملکوں کے دوستانہ معاہدے سے روس اور فرانس کی رقابت ہندستان کے مغربی سرحدوں، افغانستان، ایران اور خلیج فارس کے زیر سلاطین مملکتوں سے ختم ہو گئی۔

1903ء میں تبت میں روسی ایجنٹوں کی موجودگی سے گھبرا کر کرزن نے فرانس ینگ ہزبینڈ (Francis young husband) کے زیر کمان ایک فوجی

دستہ لہسا (Lhasa) کو روانہ کیا۔ اہل تبت کو آسانی سے مغلوب کر لیا گیا۔ اور ان پر نصف ملین کے پاؤنڈ کا تاوان جنگ عائد کیا گیا چمبی کی وادی پر اس ضمانت کے لئے قبضہ کر لیا گیا کہ یہ رقم ادا کی جائے گی۔ حکومت انگلستان نے اس جنگی مہم کو منظور نہیں کیا جس کا فوری نتیجہ یہ ہوا کہ چین کا تسلط جو زوال پذیر تھا پھر تبت پر قائم ہو گیا۔

شہنشاہیت کی دفاع کے لئے دو اور طریقے اختیار کئے گئے۔ ایک تو یہ تھا کہ صوبہ شمالی، مغربی کی تنظیم کی گئی اور دوسرے ہندستانی فوج نئے سرے سے منظم کی گئی۔ موخرالذکر نے کرزن کو کچنر سے سرتاپا تصادم میں مبتلا کر دیا جس کا انجام یہ ہوا کہ اس عظیم نوآبادی کا گورنر واپس بلا لیا گیا اور اس کو ذلیل ہونا پڑا۔

کرزن کے خیال کے مطابق شہنشاہیت برطانیہ کے ساتھ ہندستان کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ اس کے بین الاقوامی دفاع کی ضروریات کو پورا کرے اور اسی کے ساتھ اس کے اقتصادی مفادات کو ترقی دے ان اغراض کو حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ :۔

(۱) ہندستان کے اخلاقی اور مادی وسائل کو برطانوی حکمرانوں کے مطلق اقتدار کے تحت ہونا چاہئے تاکہ وہ شہنشاہیت کی بھلائی کے لئے استعمال کئے جا سکیں۔

(۲) ہندستان کو ایک لائق ترین انتظامیہ مہیا کرنا چاہئے تاکہ خاموش اور گونگے عوام مطمئن ہوں اور چند لوگوں کا سیاسی اقدامات کے لئے شور و غل مذموم ہو جائے اس کے معنی یہ تھے کہ انسان اور انسان کے درمیان انصاف کیا جائے۔ قانون کے سامنے سب برابر ہوں۔ ظلم، ناانصافی اور جبر و تعدی سے آزادی حاصل ہو۔ دوسرے الفاظ میں گورنمنٹ عوام کے لئے ہو لیکن عوام کی نہ ہو ــــــــ انھوں نے اس کی اس طرح وضاحت کی۔

"ان کا کام عوام کے حالات کو سدھارنا ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی کرنا ہے کہ متوسط طبقہ کی ہمت افزائی کی جائے کہ وہ گورنمنٹ کے چھوٹے بڑے عہدوں کو سنبھال لیں جس کے لائق ہی وہ نسلی حیثیت سے ہیں"[17] وہ اس کے بہت ہی زیادہ خلاف تھے

17. Mosley. L Curzon The end of an epoch. P. 88

کہ جمہوریتیہ کے خیالات کو ہندستان کے تحتِ براعظم میں درآمد کیا جائے ان کو یقین تھا کہ "آزادی، مساوات اور انسانی برادری ہرگز ہندستانیوں کے لئے نہیں تھی ہیں 18/۔ ان مطالبات کو وہ بعض گمراہ تصور پسند اصحاب کی بڑ خیال کرتے تھے 19/۔

یکم جنوری 1903ء کو دلی دربار میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے پوری سنجیدگی سے یہ اعلان کیا کہ "آئندہ کا ہندستان خدا کے فضل سے ایسا نہ ہوگا جس میں فراخی روز بروز ہورہی ہو جس میں کسی مستقبل کے لئے ہاتھ خالی ہو اور مبنی بر حق بے اطمینانی ہو بلکہ وہ ہوگا جس میں صنعتیں پھیلی ہوئی ہوں گی۔ تعلیم کے مختلف شعبے بیدار ہوں گے۔ خوشحالی روز بروز ترقی کرتی جاری ہوگی۔ اور آسائش اور دولت زیادہ وسیع پیمانہ پر منقسم ہورہی ہوگی۔ میں اپنے ملک کے ضمیر اور اس کے مقاصد پر اعتماد رکھتا ہوں اور میں یقین کرتا ہوں کہ اس کی صلاحیتیں بے پایاں ہیں۔ لیکن جس مستقبل کا نقشہ اوپر کھینچا گیا ہے وہ کسی صورت میں حاصل نہیں ہوسکتا جب تک کہ بالاترین حکومت کے اقتدار کو بے چون و چرا تسلیم نہ کیا جائے اور تاج برطانیہ سے بہتر کوئی بااثر حاکمیت ہو ہی نہیں سکتی جو حالات کو قابو میں رکھ سکے" 20/۔

برطانوی اقتدار اعلیٰ کو طاقتور بنانے کیلئے کرزن کے خیالات

لیکن اگر وہ ان نیشنلسٹوں کے دعوؤں کو جنھیں وہ گستاخی اور مکاری پر محمول قرار دیتا تھا رد کرتا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ ان کے مقابلے کے لئے ایک متبادل شے کی ضرورت کو بھی محسوس کرتا تھا اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اس نے ہندستان کی سوسائٹی کے ان عناصر کو مجتمع کرنا چاہا، جن میں حکمرانوں سے وفاداری کے جذبات ان کے امید اور خوف کو ابھار کر پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ بعض لوگوں میں وفاداری کو شان و شوکت، طاقت اور دولت کے مظاہرے سے اکسائی جا سکتی تھی۔ اور بعض دوسروں میں انصاف کو آشکارا اور انتظامیہ مشنری کی اہلیت

18- Ibid, P. 87

19- Ibid

20- Darbar Speach 1st january 1903. Raleigh Vol II. PP 15-19

کو دکھلا کر اور کچھ اوروں میں برطانیہ کی اخلاقی عظمت اور نظام کی برتری کو نمایاں کرکے لیکن اصل ذریعہ جس سے نئی اسپرٹ کا مقابلہ کیا جا سکتا تھا یہ تھا کہ ایک فرقہ کو دوسرے فرقہ سے بھڑا دیا جائے یعنی توازن کی پالیسی۔

وائسرائے کا عہدہ سنبھالنے کے بعد پہلے سال میں کرزن نے ایک پروگرام تیار کیا تھا جس کے بارہ مدات تھے۔ اور آئندہ کے سالوں میں دو اور اسی قسم کے پروگرام انتظامیہ کو بہتر بنانے کے لئے بنائے گئے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ان فہرستوں کا جائزہ لیا جائے اور کس طرح ان پر عمل درآمد ہوا اس پر بحث کی جائے۔ ان کی تمام اسکیموں میں خواہ وہ اقتصادی ہوں یا انتظامی، ثقافتی ہوں یا سیاسی سب کا بالاترین مقصد یہ تھا کہ تمام انسانی اور مادی وسائل کو جو ہندوستان میں ہیں شہنشاہیت کے وقار اور طاقت کو ترقی دینے کے لئے استعمال کیا جائے۔ ہندوستان کو ایک ایسی کمانی بنایا جائے جس پر ملوکیت برطانیہ خود اپنے بوجھ سے یا اپنے رقیبوں کے دباؤ سے ٹوٹنے کے بجائے اسی پر گھومتی رہے۔

تعلیم یافتہ طبقہ

اس فلسفہ پر اس پالیسی کی بنیاد ڈالی گئی کہ ہندوستان کے عوام کی بے چون وچرا اطاعت حاصل کی جائے جس کو ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقہ نے خطرے میں ڈال دیا تھا۔ اس طرح کرزن یہ چاہتا تھا کہ ان کو ذلیل کرے اور ان کو تہس نہس کر دے۔ اس نے خوشی سے ہنس کر کہا کہ "میرا اپنا یقین یہ ہے کہ کانگریس اس طرح ٹوٹ رہی ہے کہ فنا ہونے والی ہے اور میرے منصوبوں میں ایک منصوبہ یہ بھی ہے کہ میں اسے امن وامان کے ساتھ دفن ہو جانے میں مدد کروں"۔[22]

کلکتہ یونیورسٹی کے تقسیم [illegible] کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی تذلیل کی گئی۔ اس نے گریجویٹ [illegible] سے کہا۔

میں، میں کہتا ہوں کہ میں کوئی غلط یا گستاخانہ دعوے نہیں کرتا ہوں۔ جب میں کہتا

21- Raleigh op cit Vol I, P. 8.

22. Hamilton papers, Curzon to Hamilton 18 November, 1900.

ہوں کہ سچائی کا اعلیٰ سے اعلیٰ اصول بہت زیادہ مقدار میں مغربی تصورات کے اندر ہے۔"/23
اس نے آگے چل کر یہ کہا کہ مکاری اور مدبرانہ فریب دہی ہمیشہ مشرق میں بہت اچھی نگاہ سے دیکھی جاتی رہی ہیں اور یہ بات مشرق کے لٹریچر سے ثابت ہے اس نے کہا کہ "تمہارے عہد میں سچائی کو ایک نیکی قرار دے کر ہمیشہ اس کی مدح ہوئی ہے لیکن ہمیشہ اس میں کچھ شرائط لگا دیے جاتے ہیں اور بے شمار مواقع پر فریب دہی اگر کامیاب ہو جائے اور ایک دیانتدارانہ مقصد کے لئے کی جائے تو اس کی ستائش کی جاتی ہے۔" 24

برک نے یہ علاقلانہ بات کہی تھی کہ ایک پوری قوم پر فرد قرار داد جرم مرتب نہیں کی جاسکتی کرزن نے اس مشورہ کو رد کیا اور انجام یہ ہوا کہ انھوں نے اپنا سر بھیڑوں کے چھتہ میں ڈال دیا تعلیم یافتہ طبقہ اور اخبارات نے ان کے خلاف اس بیان پر جو ہندوستان کے لئے اس درجہ اہانت آمیز تھے آگ اگلنا شروع کر دیا حتیٰ کہ ان کے سرکاری سوانح نگار لارڈ رونالس ڈے (Ronals day) نے تسلیم کیا کہ کرزن نے دور بینی کے فقدان کا تعجب خیز مظاہرہ کیا۔ خواہ جو جوابی حملے کیے گئے وہ چھوٹے رہے ہوں جیسا کہ کرزن کا موقف تھا یا نہ رہے ہوں وہ اس تلخی سے نشوونما پائے تھے جو غیر ہردلعزیز کلکتہ یونیورسٹی ایکٹ سے پیدا ہوئی تھی اور جس نے حکمرانوں اور محکوموں کے تعلقات کو بدتر کر دیا تھا۔

کلکتہ کارپوریشن

کلکتہ کارپوریشن ایکٹ کرزن کی سیاسی پالیسی کی ایک مثال ہے۔ نمائندگی کے اصولوں سے حقارت، کل اختیارات کو برطانوی ہاتھوں میں محدود کرنے پر اعتماد اور عوام کے اثرات کو گھٹانا یہ وہ اصول تھے جو ہندوستان کی رائے عامہ کے براہ راست خلاف تھے۔
بنگال کے لفٹیننٹ گورنر الکز نڈر میکنزی (Alexander Mackenzie) کا خیال تھا کہ بلا ضرورت ممبران کی تعداد بہت زیادہ تھی اور ان کے متنوع مفادات تھے جو

---

23. Speaches by Lord curzon in India Vol II, P222.
24. Ibid

انتظامیہ کی کارروائیوں میں خلل انداز ہوتے تھے۔ 25۔ چنانچہ ان کے اشارے پر کرزن نے جن کی غرض ہی یہ تھی کہ خود مختار اداروں کو دبادیں اس ایکٹ میں ترمیم پیش کیا۔ کلکتہ کارپوریشن کا دستور بدل دیا گیا۔ پبلک کی نمائندگی 50 سے 25 کردی گئی اور کارپوریشن میں برطانوی عناصر کو زبردست غلبہ دیدیا گیا۔

انتظامی اصلاحات

اور دوسری جو انتظامی کارروائیاں کی گئیں ان سب کا محرک وہی ان کا اصل مقصد تھا اگر انھوں نے انتظامیہ مشنری اور اس کے طریقوں کو بہتر بنایا اور نئے محکمے مثل عام آثار قدیمہ قائم کیے پولیس کی جدید تنظیم کی، ریلوے بورڈ کو قائم کیا۔ فنون کی ہمت افزائی کی اور دلی میں وکٹوریہ میموریل جیسی یادگار تعمیر کی اور دوسرے طریقوں سے دلی کو اور زیادہ خوبصورت بنایا۔ زربفت اور کمخواب کے کارخانوں کو منظم کرنے میں دلچسپی لی۔ یا یہ کہ دربار منعقد کیے۔ جن میں تاج کا دربار 1903ء کا ایک ایسے شاندار اور طمطراق سے اور وسیع پیمانہ پر کیا گیا جو اسی طرح کے اور دوسرے تمام نمائشوں سے بڑھ چڑھ کر تھا اور شاہی خاندان کو مدعو کرکے ہندستان کا اس لیے گشت کرایا کہ ہندستان کے ان روایاتی جذبات سے فائدہ اٹھایا جائے جو بادشاہ کو دیوتا کا درجہ دیتے تھے۔ ان سب کا واحد مقصد برطانوی شہنشاہیت کا عزت وشان کو دوامی بنانا تھا۔ انھوں نے جس کام کو خود اپنے کندھوں پر رکھ لیا تھا۔ اس کے لئے اس کے دل کے اندر بہت ہی بہادرانہ امیدیں اور بڑے بلند توقعات تھے حتیٰ کہ وہ یہاں تک کرنے لگے تھے کہ "وہ ہندستان کی تنہا امید تھے۔ اس کے حال کے لئے مشین کی وہ نوک جس پر وہ گھومتی ہے اور اس کے مستقبل کے لئے سنگ بنیاد۔

---

25. Buckland, Bengal under the Lulement Gowrness Vol I. P. 979

26. Home Department, Municipal, july, 1899 Nos. 1-8 P.P. 1-7 and 353-354

27. Mosley. L. op cit. P. 90

مالگذاری کا نظام

لیکن کرزن جانتا تھا کہ "ایک قوم جس کے پاس ان وسائل کا فقدان ہو جن سے وہ روح اور جسم کو ایک دوسرے سے وابستہ رکھ سکے کبھی مطمئن نہیں ہو سکتی ہے۔ یعنی وفادار نہیں ہو سکتی ہے"۔[28] اس سے پہلے دادا بھائی نوروجی نے "ہندستان کی مصیبت زدہ دلخراش خون کھولانے والی کیفیت" کی جانب توجہ دلائی تھی۔/29

انڈین نیشنل کانگریس ہر سال گورنمنٹ کی توجہ ہندستان کے کروڑوں باشندوں کی روزافزوں انتہائی بدحالی اور فاقہ کشی کی جانب توجہ دلاتی رہتی تھی۔ ہندستان کا پریس۔ جن میں زیادہ تر بلند رتبہ اخبارات انگریزی زبان میں نکلتے تھے۔ جیسے کہ بنگالی امت بازار پتریکا۔ مرہٹہ اور ہندو اپنے کالموں کا عوام کی تکالیف اور ان کی مصیبتوں کی کہانیوں سے بھرے رہتے تھے جو اخبارات ہندستانی زبان میں نکلتے تھے وہ بھی کھل کر مذمت کرتے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ کرزن اپنے کو "فوق البشر" تصوّر کرتا تھا۔ اس امر کے بارے میں سب کچھ جانتا تھا لیکن تعلیم یافتہ طبقہ اپنے بدبخت ہموطنوں کی جانب سے جو کوشش کر رہا تھا۔ اس کو حقیر بنانے کے لیے اس نے یہ اعلان کرنے میں کوئی ہچک محسوس نہیں کی کہ انڈین نیشنل کانگریس "کئی عناصر پر مشتمل ایک اقلیت ہے جو اپنے ہندستانی بھائیوں کے جذبات سے قطعی ناواقف ہے"۔ 30۔ کرزن کے خیال کے مطابق "کانگرس جن عناصر سے بنی ہے انھوں نے اس کو قوم کے ایک نہایت مختصر طبقہ سے زیادہ کی نمائندگی کا دعویٰ کرنے کے حق سے محروم کر دیا ہے۔/31.

لیکن بہر حال نیشنل لیڈروں کے اعتراضات کا کچھ اثر تو ہوا ہی کیونکہ جب آر سی دت نے

---

28. Amit Ba ar Pat ika (Calcutta 7 Nove ber 1894)

29. Dada Bhai Nooroji, Dorcity of India . P. 229

30. Masley L. op cit, P. 88

31. Ibid

ان چار کھلی ہوئی چٹھیوں کو شائع کیا جو انھوں نے وائسرائے کو لکھے تھے (1900ء)، تو کرزن کو تیر سا لگا۔ "یہ ایک ایسا اعتراض تھا جس کا کرزن جیسے شخص نے جو یہ یقین کرتا تھا کہ ایک فیض رساں استبدادی حکومت ہی جاہل عوام کے مفاد کے تحفظ اور نشوونما کے لئے ضروری ہے۔ پرجوش استقبال کیا کیونکہ اس کی وجہ سے اسکو دنیا کے سامنے برطانوی حکومت کی فیض رسانیوں کی اشاعت کا موقع ملا"/32.

بدقسمتی سے جو ریزولیوشن اس نے خود تیار کیا وہ ایسا ہی تھا جیسے کہ ایک وکیل بمبئی زمین کے بندوبست اور مالگذاری کی پالیسی کو مبنی برحق ثابت کرنے کی کوشش کرے یعنی وہ صرف ہمارے معترضین کا جواب اور ایک ایسی پبلک کو مطمئن کرتا تھا جو گورنمنٹ سے مشکوک ہو چکی تھی"/33. نہ کہ ایک سوچے سمجھے مکمل پلان کی شکل میں موجود ایک ایسے نظام کا ہے۔ جس کی شاخ در شاخ تفصیل ہندستان کی مکمل اقتصادیات پر اثر انداز ہوں۔ کرزن اپنے معترضین کی آرار کے بارے میں غلط بیانیاں کرنے میں کسی اصول کا پابند نہ تھا۔ اس نے ان لوگوں کے اعتراضات کو جنہوں نے قحط کے وجوہ بیان کئے تھے نظر انداز کر دیا۔ جھوٹ موٹ ان پر یہ الزام لگایا کہ وہ بندوبست استمراری کی مانگ کر رہے ہیں جو کارنوالس نے بنگال میں رائج کیا تھا اور ان تدابیر کو مسترد کر دیا جو بطور علاج تجویز کی گئی تھیں کہ کس طرح بندوبست کی پالیسیوں اور مالگذاری کی تشخیص کو بہتر بنایا جائے۔

کسانوں کو زمینداروں اور مہاجنوں سے تحفظ دینے اور ان میں ذمہ داری اور خوداعتمادی کے جذبات پیدا کرنے کی ان کی تجاویز فیض رساں ضرور تھیں لیکن ناکافی تھیں۔ اور دوسری تجاویز مثلاً محکمہ زراعت کی از سر نو تنظیم۔ پوسا میں ایک تحقیقاتی ادارہ قائم کرنا زراعت کی تعلیم میں ترقی اور نمونہ کے فارموں کا شروع کرنا مفید کام تھے۔ قحط کا قانون جس میں سہولتیں فراہم کرنے کی مفصل ہدایات تھیں اس نے کمی بارش اور قحط سے پیدا شدہ تکالیف میں کمی کر دی لیکن جیسا کہ بعد کے تجربات نے ثابت کیا۔ ان سب کا مجموعی اثر زراعت کی حالت پر بہت ہی حقیر تھا۔ قدرتاً یہ مقصد کہ کاشتکاروں کو تعلیم یافتہ طبقہ کے اثرات سے باہر نکال لیا

---

32. Ronaldshay, Earl of, Life of Lord Curzon Vol II P. 180.
33. Ibid P. 181.

جائے حاصل نہیں ہوا۔

کلکتہ یونیورسٹی

کرزن کا سب سے اونچا منصوبہ یہ تھا کہ تعلیم یافتہ طبقہ کے سیاسی اثرات کو برباد کردیا جائے جن میں بنگال کا تعلیم یافتہ گروہ سب سے ممتاز تھا۔ ان لوگوں پر ان کا پہلا حملہ تو کلکتہ کارپوریشن کی از سرِ نو تنظیم تھی۔ دوسرا اہم طریقہ عمل تعلیم کی از سرِ نو تنظیم تھی جس کا پلان انھوں نے وائسرائے کا عہدہ سنبھالتے ہی پہلے ہی سال میں تیار کرلیا تھا مگر اس پر عمل درآمد دیر سے ہوا۔

1899ء میں ہیملٹن وزیر ہند نے یہ تجویز کیا کہ "تعلیم اس کے نظام اور اس کی نصابی کتابوں پر زیادہ کنٹرول قائم کیا جائے"/34۔ 1900ء میں کرزن نے کلکتہ یونیورسٹی کے جلسہ تقسیم اسناد کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "میری خواہش ہے کہ حکومت اور مختلف صوبوں کی جانب سے ان ذمہ داریوں کو از سرِ نو سنبھالا جائے جن کے بارے میں اب تک دستبرداری کا رجحان رہا ہے"/35۔

1901ء میں رالیے نے اس امر پر انتہائی افسوس ظاہر کیا کہ کلکتہ یونیورسٹی "تقریباً ہمارے ہاتھ سے نکل چکی ہے۔ اور مترتب سازشوں کا شکار ہو کر وہ کسی گروہ یا پارٹی کے مفاد کے لئے استعمال ہو رہی ہے"/36۔

1901ء میں کرزن نے شملہ میں ایک کانفرنس اس غرض کے لئے طلب کی کہ نظام میں اصلاحات پر بحث کی جائے اور اس کی سفارشات کی روشنی میں انھوں نے انڈین یونیورسٹیز کمیشن (Indian Universities Commission) 1902ء میں مقرر کیا۔

---

34. Hamilton Papers Hamilton to Curzon, 18 May, 1899.

35. Speech by Lord Curzon Vol. I, P. 209.

36. Raleigh's note dated 7 February 1901. Home Department, Education A. 1901. Progs nos. 122 - 129.

ان کی یہ شکایت کہ یونیورسٹی کی تعلیم صرف امتحان لینے تک محدود رہ گئی ہے صحیح تھا اور جن الفاظ میں انھوں نے اس کی مذمت کی وہ اگرچہ مبالغانہ انداز میں کہے گئے تھے لیکن بہرحال مجموعی طور پر صحیح تھے۔

کمیشن کی رپورٹ پر کاروائی کی گئی لیکن بالکل غیر منطقی طور پر اس مذموم نظام نے جو اصلاحات پیش کیے اس نے امتحانات کے نظام یا تعلیم میں کوئی ترقی تو کی نہیں البتہ با اقتدار ادارے قائم کرکے مرکز کا کنٹرول اس طرح تھوپ دیا کہ یونیورسٹیاں حکومت کے محکمے بن گئیں جیسا کہ ڈائریکٹر جنرل آف ایجوکیشن آرنج (Orange) گورنمنٹ کے سکریٹری رسلے (Risley) کی خواہش تھی۔ ان لوگوں نے کہا کہ "ہمارا یہ خیال ہے کہ ہندستان میں اعلیٰ معیار کی تعلیم کو جاری کرنے اور اس کو مناسب سطح پر قائم رکھنے کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ گورنمنٹ کے اثر کا استعمال وسیع پیمانہ پر ہو۔"[37]

۱۹۰۴ء میں ایکٹ پاس ہوگیا جو گورنمنٹ کے مقاصد کو برسرکار لایا۔ کونسل کے ہندستانی ممبران اور ہندستانی پریس کے اعتراضات اور احتجاجات کو نظرانداز کردیا گیا۔

تعلیم پر غیر سرکاری اثرات کو کم کرنا تو پروگرام کا صرف ایک تختہ تھا اصل مقصد تو کرزن کا یہ تھا کہ تمام عناصر کو مہیا کرکے کانگریس کے خلاف عملی طور پر لگا دے۔

توازن کی اور وفادار طبقوں، راجگان کو مقابلہ کے لیے جمع کرنے کی پالیسی

پہلا عنصر ظاہر ہے کہ جاگیردار ریاستیں تھیں۔ بہت سی تو ایسی تھیں جنھیں برطانیہ عالم وجود میں لایا تھا کچھ قدیم تھیں لیکن ان سب کا وجود برطانیہ کی حکومت پر منحصر تھا ایک زمانہ تک ان پر بداعتمادی رہی اور وہ ماتحتی اور کس مپرسی میں رکھی گئی تھیں لیکن 1857ء کے غدر کے بعد ان کے ساتھ زیادہ ہمدردانہ برتاؤ ہونے لگا۔" جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا ہے اعلیٰ اقتدار کے مفادات اور راجگان اور ریاستوں کے سربراہوں کے مفادات ایک ہوتے جارہے ہیں دونوں اس بات سے مضطرب تھے کہ موجودہ نظام کو قائم رکھا

---

37. Home Department Education Proceedings December 1903, No. 67-85.

جائے کیونکہ دونوں یہ سمجھتے تھے کہ اس نظام اور ایک اچھی حکومت کے مخالفین کا مقابلہ نہ کرنے سے دونوں یکساں طور پر تباہی کے غار میں گر جائیں گے" ان خیالات کو دماغ میں رکھ کر کرزن نے ان کی وفاداری اور حمایت حاصل کرنے کی طرف کوشش کا قدم بڑھایا ان سے کہا گیا کہ "اب وہ شہنشاہیت کے الگ تھلگ ایک دم چھلا نہ تھے بلکہ اس کے حصہ دار اور آلہ کار تھے"۔ 38/

ان کی سرپرستی اور حفاظت کرنے کا یقین دلایا گیا اور اس کے جواب میں ان سے یہ توقع قائم کی گئی کہ "وہ ان احسانات کے بدلہ میں اعلیٰ با اقتدار گورنمنٹ کے ہر معاملہ میں وفادار رہیں گے اور ہر اس فعل سے احتراز کرینگے جو گورنمنٹ کے لئے نقصان دہ ہو"

یہ شراکت داری جو قائم کی گئی اس نے ان کی کس مپرسی کو ختم کر دیا اور گورنمنٹ سے ان کے قریبی تعلقات قائم ہونے کی ہمت افزائی کی گئی۔ ۱۹۰۱ء میں امپریل کیڈٹ کور (Imperial Cadet Core) اس غرض سے قائم کی گئی تاکہ راجاؤں اور امراء کے گھر کے لڑکوں کی ایک جماعت تیار کی جائے جن کو فن سپہ گری کی تعلیم دی جائے اور فوج میں ان کو کمیشن (عہدہ) مل سکے۔ دوسرا قدم اسی سلسلہ کا یہ تھا کہ راجگان کے خاندان کے لڑکوں کو راجگان کے ترقی یافتہ کالجوں میں تعلیم کا انتظام کیا گیا اس طرح اس گروہ کو مضبوط کرنے کی کوشش کی گئی جس سے راجگان گورنمنٹ سے بندھے ہوئے تھے اور ان کو یہ محسوس کرانے کی سعی تھی کہ دوسرے طبقوں کے ہندستانیوں سے وہ ایک علیحدہ ہستی ہیں۔

جماعتیں، فرقے اور مفادات

ایک یقین جو برطانوی مفکرین، مدبرین، منتظمین، وہ انگریز جو ہندستان میں آباد ہو گئے تھے سرکاری اور غیر سرکاری اور وہ انگریز جو انگلستان گوشہ نشینی کی زندگی گذارتے تھے ان سب کے دماغوں میں ایک دھاگے کی طرح پرو دیا ہوا تھا وہ یہ تھا کہ ہندستان نسلوں، مذہبوں اور کلچرل مفادات کا ایک بے ہنگم مجموعہ ہے۔ ایک بھیڑ ہے جن کے اندر کوئی نقطہ اتحاد نہیں ہے۔

38- Fraser, L. op. cit, P. 210.

ہندستان کے تعلیم یافتہ طبقہ کو یہ لوگ حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے کیوں کہ یہ لوگ ہندستان کو ایک نیشن کہتے تھے اور اس لئے وہ دعویٰ کرتے تھے کہ "ایک نیشن ایک مملکت ہے اور مملکت نیشن ہے/39۔

لیٹن (Lytton) نے سالسبری (Salisbury) کو لکھا "باشندگانِ ہند کے سیاسی نمائندے صرف وہ بابو لوگ ہیں جن کو ہم نے اس لئے تعلیم دی ہے کہ وہ ہندستانی اخبارات میں نیم باغیانہ مضامین لکھیں" سالسبری نے اس سے اپنا اتفاق ان الفاظ میں ظاہر کیا "زیادہ مصنوعی اور کمزور عناصر جن کو ہم نے خود بنایا ہے اور نمایاں درجہ پر لائے ہیں"/40۔

کبن مارلے (Morley) نے یہ تسلیم کیا کہ اگر چہ لوگ کہتے ہیں کہ تعلیم یافتہ طبقہ انتہائی چھوٹا طبقہ ہے" وہاں ایسا تو ہے لیکن ایسا سوچنا فضول اور خطرناک ہے کہ انتہائی چھوٹے حصے کی کوئی اہمیت نہیں ہے"/41۔

ان لوگوں کا یقین تھا کہ نیشنلزم کے خیالات کی نشو و نما ہندستان کے اندر اگر ناممکن نہیں تو کم سے کم بہت دور کے زمانہ کا ایک خواب ہے۔ اس یقین کے ماتحت وہ قدرتاً اپنا یہ فرض سمجھتے تھے کہ مختلف مفادات کو تسلیم بھی کریں اور ان کی ہمت افزائی بھی کریں، کیونکہ اس قسم کی سرپرستی اختلافات کو بڑھاوا دیتی تھی تاکہ باہم ملنے اور متحد ہونے کے خطرات کم سے کم ہو جائیں۔ اس پالیسی پر شروع ہی سے عمل درآمد رہا کیونکہ دوسرے ملکوں کی طرح ہندستان میں بھی بہت سے مفادات اور بہت سی جماعتیں تھیں اقتصادی مفادات، زراعتی، صنعتی اور تجارتی و نسلی مفادات۔ یورپین، اینگلو انڈین، جنگجو قبائل، پسماندہ قومیں، آرین، دراوڑ وغیرہ وغیرہ سماجی جماعتیں، ذات اور گروہ مذہبی جماعتیں۔ ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی وغیرہ ۔۔۔

39_ Barker. E. National Character. PP. 16-17.

40_ Cambridge History of India Vol VI. P. 545.

41- Speech in the House of Commons June 6, 1907 in Morley Viscount, Indian Speeches (1907-9) P. 23

سیاسی مفادات ۔ زمینداران کا گروہ پیشہ وروں کا طبقہ اور دوسرے ان سب نے مل کر
ہر طبقہ کی طاقت کو برطانوی سرپرستی کے سورج کی چمکدار گرم اور توانائی بخش کرنوں نے چوس لیا ۔
ہر طبقہ کے مفادات کا تحفظ اور اس کے لئے حکومت کی حمایت حاصل کرنے کے لئے جماعتوں
کے قیام میں اضافہ ہونے لگا ۔ ایسے اداروں کا اضافہ ہوا جن کا مقصد کسی خاص گروہ کے
لئے سماجی اصلاحات کرنا اور اس کی تعلیمی ضروریات کو پورا کرنا تھا ۔ مثلاً زمیندار ایسوسی
ایشن ، یوریپین ایسوسی ایشن یا اینگلو انڈین ایسوسی ایشن ، برہمن ، کایستھ ۔ ویش راجپوت ،
مرہٹہ ، ڈھانگر اور دوسری سوسائٹیاں اور کانفرنسیں قائم کی گئیں تاکہ گورنمنٹ سے خصوصی
مراعات حاصل کرنے کے لئے اپنے حقوق پر زور دیا جائے ۔

اسکول اور کالج ہندو مسلم اور دوسرے گروہوں اور فرقوں کے نام سے کھلنے لگے اور
سب سے زیادہ یہ ہوا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں نے اپنی الگ الگ درس گاہیں قائم کرلیں اسی طرح
ہندی اور اردو انجمنیں ، بینک اور سیاسی جماعتیں بھی بنیں ۔ آپس میں پھوٹ کے رجحانات
کی نشوونما کے لئے آب و ہوا موافق تھی اور ان کو بڑھنے اور ترقی کرنے کے پورے مواقع

IV تقسیم بنگال

کرزن کے استادی کے ہاتھ نے ان رجحانات کے لئے مہمیز کا کام کیا ۔ انھوں
نے تقسیم بنگال کا جو پروگرام بنایا اس کے لئے وہ ظاہر تو یہ کہتے تھے کہ یہ صوبہ جسامت
میں بڑا ہے اس لئے اس کا انتظام معقول نہیں ہو پاتا ہے ۔ لیکن دراصل یہ ایک ایسی کارروائی
تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ سیاسی فرقوں کے میل جول میں جو روز افزوں ترقی ہو رہی ہے
اسے توڑ دیا جائے کیونکہ اس میل جول سے گورنمنٹ کی مخالفت پر ہندوستان کی رہنمائی
ہوتی ہے ۔ اس کا یہ بھی مقصد تھا کہ برطانوی راج کی قوت کا اس طرح مظاہرہ کیا جائے
کہ یہ ثابت کر دیا جائے کہ وہ اتنی طاقت رکھتی ہے ۔ کہ رائے عامہ کو پائے استحقار سے
ٹھکرا دے ۔

چونکہ تاریخ تحریک آزادی ہند میں تقسیم کی اہمیت بہت زیادہ ہے اس لئے
یہ ضروری ہے کہ اس کا کسی قدر تفصیل سے تذکرہ کیا جائے ۔
شروع زمانہ میں بنگال کے صوبہ کے تین حصے تھے ۔ وانگا (یا نگا) گوڑا اور وریندر

اس کی اپنی انفرادیت تھی۔ نسلی، کلچرل اور لسانی اعتبار سے۔ اس کا دارالسلطنت سینا (Sena) خاندان کی حکمرانی کے زمانے میں وکرم پور میں تھا۔ جو ڈھاکہ کے قریب اور مشرقی بنگال میں تھا۔ وکرم پور اور سیمن سنگھ سنسکرت کی تعلیم کے خاص مرکز تھے۔ اس کے بعد عنان حکومت مسلم حکمرانوں کے ہاتھ میں آئی لیکن اس کے جغرافیائی حدود قائم رہے۔ دارالسلطنت وکرم پور سے ہٹ کر ڈھاکہ کے اور قریب آگیا۔ مسلم حکمرانوں بنگلہ زبان کی سرپرستی کرتے تھے۔ اور اس طرح یہ ترقی کر کے ایک وزنی زبان بن گئی فنون اور کاریگری جن میں بنگال کی ذہانت نمایاں تھی بہت کامیابی کے ساتھ چل رہے تھے۔

1757ء میں انگریزوں نے بنگال کو فتح کر لیا۔ اور جس طرح فتوحات کی دوڑ مغرب، مشرق اور جنوب کی طرف رواں دواں ہوئی بنگال بغیر کسی اسکیم کے پھیلتا چلا گیا۔ ایک وقت وہ بھی آیا جب اصل بنگال کے علاوہ بہار اور اڑیسہ، کُل اتر پردیش جس میں دلی بھی شامل تھا صوبہ متوسط کا ایک ٹکڑا چھوٹا ناگپور اور آسام یہ سب فورٹ ولیم کی پریسیڈنسی اندرون بنگال میں شامل ہو گئے۔

تنظیم جدید کی ضرورت

لیکن ظاہر ہے کہ یہ حد سے زیادہ وسیع رقبہ ذمہ داری کے لحاظ سے تھا۔ 1836ء میں صوبہ جات شمالی مغربی (اتر پردیش) الگ کر دیئے گئے اور ایک لفٹیننٹ گورنر کی ماتحتی میں دے دیئے گئے۔ 1854ء میں گورنر جنرل کو اس ذمہ داری سے بری کر دیا گیا۔ جو اس پر بنگال پریسیڈنسی کے سلسلہ میں عائد ہوتی تھی اور ایک علیحدہ لفٹیننٹ گورنری قائم کی گئی جس کے حدود کا رقبہ 233000 مربع میل تھا اور 60 ملین جس کی آبادی تھی ایک اتنے بڑے صوبہ کا انتظام جس میں بہت سے اضلاع تھے۔ جو ایک دوسرے سے دور دور کے فاصلے پر پھیلے ہوئے ایک انتظامی سرغنہ کے بس کا کام نہ تھا۔ بہت پہلے ہی 1860ء میں انڈگو (نیل) کمیشن نے صوبہ کی تشکیل جدید کی تجویز پیش کی تھی۔

1868ء میں ایک کمیشن اس غرض سے مقرر کیا گیا کہ وہ تحقیقات کرے اور رپورٹ دے۔ کمیشن نے یہ فیصلہ دیا کہ "بنگال میں عملاً کوئی حکومت ہی نہیں ہے"[42] نتیجہ یہ ہوا کہ

---

42. Broom Feild the Partion of Bengal (Paper read at the Indian History Cong ress 1967.

1874ء میں آسام اور بنگال کے تین اضلاع سلہٹ گوال پارہ اور کچار نکال لئے گئے اور ایک چیف کمشنر کی حکمرانی کے ماتحت کر دیئے گئے - 1892ء میں لوشائی کا پہاڑی علاقہ آسام میں منتقل کر دیا گیا۔

جب ولیم وارڈ (William Ward) آسام کا چیف کمشنر تھا تب اس نے صوبہ کی انتظامی اور اقتصادی ترقی کے لئے ایک اسکیم پیش کی جس میں یہ تجویز کیا گیا بنگال کا کچھ حصہ آسام میں منتقل کر دیا جائے/43 لیکن وارڈ کے جانشین ہنری کاٹن (Henry Cotton) نے اسکیم کی مخالفت کی اور اس لئے یہ اور آگے نہ چل سکی/44۔

لیکن ان چھوٹے چھوٹے انتقالات سے نہ تو بنگال کا مسئلہ حل ہوا اور نہ آسام کا ایک بہت بڑا اور دوسرا بہت چھوٹا تھا اور اس لئے 97 - 1896ء میں بنگال اور آسام میں گفتگو کا ایک سلسلہ حل تلاش کرنے کے لئے چلا۔ بنگال کے افسران ہندستان کی رائے عامہ اور یوروپین تجار صوبہ میں کسی قسم کی تخفیف کے خلاف تھے۔ اور اس کے موافق تھے کہ اس کی حیثیت اتنی اونچی کر دی جائے کہ اس کا سربراہ ایک گورنر مقرر ہو جس کی ایک اکزیکیٹیو کونسل ہو لیکن حکومت ہند کے اعلیٰ درجے کے افسران اس کے خلاف تھے کہ یہاں گورنر شپ ایک اکزیکیٹیو کونسل کے ساتھ بنائی جائے۔

صوبوں کی جدید تقسیم ـــــ کرزن کی رائے

یہ وہ موقع تھا جب کرزن ہندستان آیا اور اپنے عہدے کی عنان اپنے ہاتھ میں لیا۔ اس نے دیکھا کہ اس کا دفتر ہندستان کے مختلف صوبوں میں صوبوں کے ایک ٹکڑے کو دوسری جگہ اور دوسرے کو تیسری جگہ لے جانے اور سب کو ہموار کرنے میں لگا ہوا ہے۔ متوسط، پنجاب، بمبئی، مدراس اور بنگال سب کا یہی حال ہے۔ اس کو بہت غصہ آیا اور اس نے پوچھا کہ "کیا اس حکومت کا کوئی افسر اعلیٰ نہیں ہے؟ کیا یہ کوئی تعریف کی بات تصور کی

---

43. Home Department Public A. Progs. May 1897 Nos 204 - 234.

Chief Secretary Assam to Secretary Government of India 25 Nov 1896.

44. Ibid Sir H. Cotton's note 26 January 1897.

جائے گی کہ ان در حقیقت اہم معاملات پر ایک سال سے بحث ہو رہی ہے اور ایک مرتبہ بھی کاغذات وائسرائے کے سامنے پیش نہیں کئے گئے "/45

اس کو غصہ اس وجہ سے آیا تھا کہ جب کہ دفتر ان معاملات کو انتظامی سہولتوں کی تنگ بنیادوں پر سوچ رہا تھا اس نے یہ محسوس کیا کہ ان میں اہم سیاسی امور شامل ہیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ برار کو برٹش انڈیا میں شامل کر لے۔ سندھ اور اوڑیسہ کا مستقبل بھی سوچتا تھا اور چٹاگانگ کے بندرگاہ کو ترقی دینا چاہتا تھا تاکہ کلکتہ کا بوجھ کم ہو جائے۔ اس کے خیال کے مطابق بنگال، آسام، صوبہ متوسط اور مدراس کے حدود اربعہ دقیانوسی، غیر منطقی اور ایسے ہیں جن سے نااہلی پیدا ہوتی ہے۔

سب سے زیادہ وہ ان خطرات سے خائف تھا جو کسی علاقہ کے باشندوں کے ایک جگہ جمع ہو جانے سے لازمی طور پر پیدا ہوتے ہیں اینٹبسن (Abbelson) کی ایک تجویز کے جواب میں کہ برار کو بمبئی کے صوبہ میں شامل کر دیا جائے۔ اس نے لکھا "میں کسی ایسی تجویز پر غور نہیں کر سکتا جو فرقہ قوم کی طاقت اور ان کے اتحاد میں معاون ہو جس کا کوئی نتیجہ بجز دہشت زدگی کے اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ بمبئی (دکن) کر مرہٹے سب سے زیادہ وائق اور ہماری ہندستان میں حکومت کے مخالفین میں سب سے زیادہ خطرناک ہیں اس لئے ہم کیوں خود سے جاکر اور بلا معاوضہ پونا کی خدمت میں ایک سیاسی طاقت زبردست اضافہ کا ہدیہ پیش کریں .... اپنے دشمنوں کی طاقتوں میں اضافہ کریں اور مرہٹہ قوم کے اتحاد کو فروغ دیں"/46

اینٹبسن (Abbelson) نے بنگال کے لئے یہی اصول تجویز کیا اس نے نوٹ لکھا کہ "صوبہ کی سیاست میں مشرقی بنگال کا اثر بہت زیادہ ہے حتیٰ کہ حقیقی سیاسی اہمیت سے اتنا بڑھا ہوا ہے کہ اس کی کوئی نسبت نہیں قرار دی جا سکتی۔ نوبت یہاں تک پہونچ چکی ہے کہ بنگالی بہاری پر اپنا سایہ ڈالے ہوئے تھے۔ اگرچہ بہاری ہر معاملہ میں سوائے

---

45. Home Department, Public Progs. December 1903. Nos 149-160. PP. 3-4. Curzon note dated 24 May 1902.

46. Ibid P. 22. Curzon note dated 8 March 1903.

زبان (یا گابیوں) کے استعمال کے اور ہر معاملہ میں بنگالی سے بہتر ہے یہ سیاسی اور انتظامی نقطہ نظر سے نہایت اہم ہے کہ اس اثر کو گھٹایا جائے اور اس کے لئے دو بڑے مرکزوں میں سے ایک مرکز کو دوسرے سے علیحدہ کر دیا جائے"۔ 47

کرزن نے ان خیالات سے مکمل اتفاق کیا اور یہ اضافہ کیا کہ" بنگال کے یہ مشرقی اضلاع بنگالی تحریک کے بدمعاشی کے اڈے ہیں اور یہ تحریک اپنی نوعیت میں اگر باغیانہ نہیں تو کم از کم غیر دوستانہ تو ہے ہی"۔ 48

اس لئے اس بہانہ سے فائدہ اٹھاکر کہ بنگال کا صوبہ بہت بڑا ہے اور اس کی تشکیل جدید کی ضرورت ہے کرزن اپنے ملوکیت پرستانہ عزائم کے ماتحت بنگال پر سے تعلیم یافتہ طبقہ کا اثر اور بنگال کا پورے ہندستان پر اثر توڑنا چاہتا تھا۔

پبلک میں یہ دلیل پیش کی جاتی تھی کہ بنگال بہت وسیع ہے اور لیفٹیننٹ گورنر پر ایک ناقابلِ برداشت بوجھ پڑ رہا ہے یعنی اس کو ایسے علاقہ کا انتظام کرنا ہوتا ہے جس کا رقبہ ۱۹۰،۰۰۰ مربع میل ہے اور جس کی آبادی 78.5 ملین انسانوں کی ہے اور جس کی مجموعی مالگذاری ۱۹۰.۱ لاکھ روپیہ ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ صوبے کے افسر کا ذاتی رابطہ باقی نہیں رہتا اور کل حکومت کا کام دفتر سے ہوتا ہے جو ہمیشہ ایک نہایت غیر عاقلانہ اور غیر ترقی پسندانہ طریقہ انتظام کا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کلکتہ پر جو توجہ کی جاتی ہے اس سے وہ اضلاع جو مرکز سے دور ہیں اپنے اس حق سے محروم رہتے ہیں جو ان کا ہے۔

کرزن نے ان تمام تجاویز کو ماننے سے انکار کر دیا جو کچھ سرکاری افسران اور غیر سرکاری لوگوں نے پیش کی تھیں مثلاً (۱) بنگال کو ایک گورنر کی پریسیڈنسی میں جس کی ایک کونسل ہو بدل دیا جائے۔ (۲) بہار، چھوٹا ناگپور اور اڑیسہ کو بنگال سے نکال لیا جائے اور بنگلہ زبان بولنے والوں کا ایک بنگال صوبہ بنا دیا جائے ان دو کے علاوہ اور بھی متبادل تجویزیں پیش کی گئی تھیں لیکن وائسرائے نے کسی کی موافقت نہیں کی۔

---

47. Ibid P.39. Abbitsoni mumbdated 23 April 1903

48. Ibid P.68. Curzon's minte dated 1st June 1903

کرزن کی پہلی اسکیم

اب کرزن نے بنگال کے ٹکڑے کرنے کی اسکیم کا مسودہ تیار کرنا شروع کیا۔ اس کا منشا یہ تھا کہ چٹا گانگ کی کمشنری کو معہ اس کے بندرگاہ کے اور ڈھاکہ اور مین سنگھ کے اضلاع کے علاقوں کو آسام میں شامل کر کے بنگال کی آبادی میں ۱۱ ملین کی کمی کر دی جائے لیکن چھوٹا ناگپور اور اڑیسہ کو بنگال ہی میں رہنے دیا جائے۔

یہ اسکیم اگزیکیٹو کونسل نے منظور کرلی اور رسلے (Risley) وزیر ہند نے خطوط مرتب کر کے بنگال، آسام، صوبہ متوسط اور مدراس کے صوبوں کے نام روانہ کر دیئے بدقسمتی سے انھوں نے اس خط میں کرزن کے خیالات کا جن میں ان کا سیاسی خیال بھی شامل تھا اعادہ کر دیا تھا۔ جب کرزن نے ان کاغذات کو دیکھا تو وہ بدحواس ہو گیا۔ اس لئے کہ وہ یہ بات پبلک سے چھپانا چاہتا تھا کہ ڈھاکہ اور مین سنگھ کو بنگال سے سیاسی وجوہ کی بنا پر نکالا جا رہا ہے۔ اس نے مسل پر یہ نوٹ لگایا کہ "جو خط بنگال کو لکھا گیا ہے۔ اگر وہ اسی صورت میں شائع کر دیا گیا تو اس سے بڑا اضطراب پیدا ہوگا۔ اور اس مقصد کو ختم کر دے گا۔ جو ہمارے پیش نظر ہے۔ جب میں نے اپنا نوٹ اپنے ساتھیوں کی خفیہ اطلاع کے لئے لکھا تھا تو میرے خیال میں یہ بات کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں آئی کہ اس کی عبارت کو عملاً دوہرا دیا جائے گا تاکہ بنگال کے اخبارات کا ہر مضمون نگار اس کا تجزیہ کرے جو کچھ میں پرائیوٹ طور پر کونسل چیمبر میں کہتا ہوں وہ ضروری نہیں ہے کہ ایسا ہو کہ اسے مکان کی چھتوں پر سے اعلان کیا جائے۔ وزیر ہند نے ایک ایسا مسودہ تیار کیا ہے جو تباہ کن ثابت ہو سکتا ہے اس لئے میں نے اس پر نظر ثانی کی ہے۔ . . . . اور میں اپنے نوٹ کی نقل وطن کو روانہ کرنا بھی نہیں چاہتا ہوں . . . . یہ کافی ہوگا اگر میں خفیہ طور پر وزیر ہند کو ایک نقل بھیج کر اس بات کی وضاحت کر دوں کہ بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کے اصلی معنی کے اعتبار سے ان کو خط میں شامل کرنا مناسب نہیں معلوم ہوا"۔/49

جب 1903ء میں یہ اسکیم شائع ہوئی تو اس کے خلاف عظیم شور و شغب برپا ہوا پرکلا

49- Ibid. TS. Curzon's minute dated 10 November 1903.

نے اس کی سخت مذمت کی آنند بازار پتریکا (کلکتہ) چارو مہر (مین سنگھ) سنجیونی (کلکتہ) باسومتی (کلکتہ) ڈھاکہ پرکاش (ڈھاکہ) بنگالی (کلکتہ) ڈھاکہ گزٹ (ڈھاکہ) جیوتی (کلکتہ) اور دوسرے بہت سے اخبارات نے غصہ میں بھرے ہوئے مذمت انگیز مضامین لکھے۔ بہت سی انجمنوں نے گورنمنٹ کو میموریل پیش کئے جن میں اس اسکیم کے ہولناک نتائج کی جانب توجہ دلائی بنگال نیشنل چیمبر آف کامرس نے نہایت مضبوطی سے احتجاج کیا اور اپنے مدلل اور مبنی برحق میموریل میں اسکیم کے خلاف جتنے بھی اعتراضات ملکی تعصب کا تذکرہ کیا سینٹرل نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن کلکتہ نے اس اسکیم کی اپنی نامنظوری کی اطلاع دی اس نے اپنے میموریل میں کہا "تہذیب، زبان اطوار و عادات، سابقہ روایات، مالگذاری کے بندوبست کی نوعیت اور سیکڑوں اور وجوہ سے جن میں کچھ بہت زیادہ اور کچھ اس سے کم اہم ہیں ڈھاکہ اور مین سنگھ، پٹرا، نواکھالی اور چٹاگانگ کے باشندگان اور بنگال کے باشندگان کے درمیان اس سے کہیں زیادہ باتیں مشترک ہیں جو اڑیسہ اور چھوٹا ناگپور میں ہیں اور اگر سہولت دینا منظور رہے تو اسے مسٹر رسلے کے خط سے جو ظاہر ہوتا ہے اس کے علاوہ کسی دوسری جانب تلاش کرنا چاہئے۔" /50

بنگال کے زمینداران لفٹیننٹ گورنر کی رہائش گاہ بمقام بلویڈر (Belvedere) ان سے ملے ان لوگوں نے کہا کہ "ایک نسل کے لوگوں کو دو حصوں میں بانٹ دینے اور ان دونوں کو الگ الگ انتظامات کے تحت رکھنے سے ہندستان میں برطانوی حکومت کے وہ اغراض جن کا وہ مدعی ہے۔ یعنی یہ کہ ہمارے اندر نیشنل جذبات پیدا ہوں اور ہم نمائندہ حکومت سنبھالنے کے قابل ہو جائیں فوت ہو جائے گا" /51 .

بے شمار جلسوں میں اس اسکیم پر لعنت بھیجی گئی اور اسے مردود قرار دیا گیا لیکن گورنمنٹ ایک سخت پتھر بنی رہی معزز لیڈران بنگال بحث کرتے تھے التجا بھی کرتے تھے اور پیشین گوئی

50- Report on the Native Newspapers Bengal, July. Dec 1903.

51- Home Dept. Public A Progs. February 1905, Nos 155-157, Babu Sita Nath Roy to Chief Secretary Govt of Bengal, 3 Feb 1904. - Memorandum of the Bengal Chamber of Commerce PP.171-184, Nawab Syed Amir Hussain's letter to Govt of Bengal, dated 17 Feb. 1904. PP. 191-92

بھی کہ اس کے نتائج نہایت ہولناک ہونگے لیکن کسی چیز کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا ڈھاکہ مین سنگھ
اور چٹاگانگ کے باشندوں نے بے شمار جلسے کر کے احتجاج کیا اور مغربی بنگال کے لوگوں
نے اس اسکیم کی مذمت پبلک جلسوں اور پمفلٹوں سے کی۔

کرزن نے یہ ظاہر کرنا تھا کہ اس پر ان باتوں کا کوئی اثر نہیں ہو رہا ہے وہ رسلے سے
اس امر پر اتفاق کرتا تھا کہ اس معاملے کے سیاسی مفادات سب پر بالا ہیں رسلے نے لکھا
کہ "متحدہ بنگال ایک طاقت ہے منقسم بنگال مختلف اطراف میں رسہ کشی کرے گا اور یہ بالکل صحیح
ہے اور یہ اسکیم کی بڑی خوبی ہے" / 53

ایبٹسن (Abbetson) وزیر داخلہ نے تعلیم یافتہ طبقہ کے ایجیٹیشن کو یہ کہہ کر ٹال دیا
کہ اس کے پیچھے ذاتی اغراض کی بنیادیں ہیں اور بیان کیا کہ "بہر حال میں یہ خیال کرتا ہوں کہ شورش
پسندوں کو یہ بات صفائی کے ساتھ نظر آ رہی ہے کہ انتقال سے صوبہ کی ریاست میں خاص بنگال
کا جو زبر دست غلبہ ہے اور جس نے بہار، اڑیسہ وغیرہ کو اپنے سایہ میں چھپا دیا ہے وہ اگر ختم نہیں
تو بہت کم ہو جائے گا لیکن یہ غلبہ ایک برائی ہے اور یہ نہایت ضروری ہے کہ اسے کم کیا
جائے" / 54 .

تقسیم کے خلاف پبلک کے پروپیگنڈے کا مقابلہ کرنے اور مشرقی بنگال کے لوگوں
کو اپنی موافقت میں لانے کے لئے کرزن نے بہ نفس نفیس چٹاگانگ، ڈھاکہ اور مین سنگھ
اضلاع کا دورہ کیا۔ ڈھاکہ میں اپنے سامعین کے مجمع سے اس نے 18 فروری 1904
کو کہا۔

"جب کوئی تجویز پیش کی جاتی ہے کہ ڈھاکہ کو مرکز اور غالباً ایک جدید اور خود کفیل انتظامیہ
کا دار السلطنت بنایا جائے جو اس علاقہ کے باشندوں کو ان کی تعداد کی طاقت اور ان
کے بالاتر کلچر کی وجہ سے اس صوبہ میں جو نیا بنایا جائے غلبہ حاصل کرنے والی آواز عطا

---

52. Ibid, Secretary Central Relatives Association to Chief Secre-tary Bengal 1st March. 1904

53. Ibid, P.3 Risley's note dated 7 February 1904.

54. Ibid, P.7 Abbetson's minute dated 8 February. 1904.

کرے اور مشرقی بنگال کے مسلمانوں میں ایک ایسا اتحاد پیدا کرے جو ان کو مغل وائسرائے اور بادشاہوں کے زمانہ کے بعد نصیب نہیں ہوا ہے اور جو مقامی مفادات اور تجارت کو اس حد تک ترقی دے جو اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ آپ ایک دوسرے انتظامیہ کے دم چھلے بنے رہیں تو کیا یہ ممکن ہے کہ ان اضلاع کے باشندوں کو ان کے لیڈران یہ مشورہ دیں کہ تم ان عظیم فوائد کو خوف کی وجہ سے ترک کر دو کیا آپ لوگ اپنے مستقبل کی جانب سے اتنے اندھے ہیں کہ جو پیش کش کی جارہی ہے اسے مسترد کر دیں "/55

فرقہ وارانہ رقابت اور فرد کو اکسانے فرقہ وارانہ ہم آہنگیوں کو گورنمنٹ کی مراعات کے دھدوں سے نشو ونما کرنا اور اقتصادی خوش حالی کے خوش آئند مستقبل کو دکھلا کر حرص کو اکسانا یہ سب پالیسی کا ایک حصہ تھا۔ دوسرا حصہ وہ تھا جو اس نے براڈرک (Brodrick) وزیر ہند کو اپنے ایک مکتوب میں لکھا جس کے الفاظ یہ تھے :۔

"کلکتہ مرکز ہے جہاں سے کانگرس پارٹی تمام بنگال بلکہ درحقیقت تمام ہندوستان میں پھیلتی ہے اس کے تمام ریشہ دوانیاں کرنے والے اور اس کے بکواسی مقررین یہ سب یہیں رہتے ہیں انکا نظام ایسا مکمل ہے کہ واقعی غیر معمولی نظر آتا ہے وہ کلکتہ کی رائے عامہ پر پوری طرح قابض ہیں اور یہ ہائیکورٹ پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں یہ لوکل گورنمنٹ کو ڈرا دیتے ہیں اور بعض حالات میں گورنمنٹ آف انڈیا پر بھی سنگین اثر ڈالنے سے قاصر نہیں رہتے ان کی تمام کاروائیوں کا رخ اس منشا کی جانب ہے کہ وہ ایک ایسی ایجنسی پیدا کر دیں جو اتنی طاقتور ہو کہ وہ لوگ ایک دن اس قابل ہو جائیں کہ ایک کمزور گورنمنٹ کو مجبور کر کے وہ سب کچھ حاصل کرلیں جو ان کی خواہش ہے "/56 ۔

ڈھاکہ کی تقریر کے موقع پر انھوں نے وزیر ہند کو لکھا کہ :۔

"بنگالی جو اپنے کو ایک قوم تصور کرنے کے خواہشمند ہیں اور وہ اس مستقبل کا خواب دیکھتے ہیں جب انگریز ہندوستان سے دیس بدر کر دیئے جائیں گے اور گورنمنٹ کے ہاؤس کلکتہ میں

55- Curzan's Dacca speech of 18 February 1904. See Speeches by Lord Curzen in India Vol III P. 298.

56- Curzon Papers, Curzon to Brodrick 2 February 1905.

ایک بنگالی بابو مسند نشین ہوگیا یہ لوگ بلاشبہ ان تمام باتوں پر نظمی کے ساتھ غضبناک ہوتے ہیں جن سے اس میں رکاوٹ پیدا ہوا اور جو ان کے خواب کی تعبیر میں دخل انداز ہو اگر ہم اس درجہ کمزور ہیں کہ ان کے شور و غل کے آگے اس وقت جھک جائیں تو پھر کبھی آئندہ ہم بنگا کی تقسیم نہ کرسکیں گے۔ اور نہ بنگال کو گھٹا سکیں گے اور آپ ہندستان کے مشرقی محاذ کو پختہ اور مستحکم کردیں گے جو ایک ایسی طاقت ہے جو اس وقت بھی ڈراونی ہے اور یہ یقینی ہے کہ آئندہ چلکر روزافزوں پریشانیوں کا باعث بنے گی ۔57/

یہ بحث کہ تقسیم کا مطالبہ مسلمانوں نے کیا تھا دعوی بلادلیل ہے۔ یہ بحث کہ تقسیم کا منشا بنگال اور آسام کے مشرقی اضلاع کے پسماندہ مسلمانوں کی حالت کو بہتر بنانا تھا محض بہانہ ہے مسلمانو کی پسماندگی برطانیہ کے قائم کردہ مالگذاری کے نظام اور برطانیہ کے عام انتظامات کی وجہ سے تھی۔ ان علاقوں کے مسلمانوں کی ایک کثیر ترین آبادی کاشتکار تھی جو اس نظام کی شکار تھی ان لوگوں پر ملک کے دوسرے حصہ کے کاشتکاروں کی طرح مہاجن اور زمیندار لوٹ کھسوٹ مچاتے اور جبر و تعدی کرتے تھے کیوں کہ آراضیات کے بارے میں جو قوانین بنے تھے وہ زمینداروں کو موقع دیتے تھے کہ انھیں چکی میں پیس ڈالے اور ان کو مہاجنوں کے چنگل میں پھینک دیں ان بدنصیب انسانوں کے مصائب کا کوئی علاج مہیا نہیں کرتی تھی۔ بنگال میں وقتاً فوقتاً مزارعین کی طرف سے پریشانیاں پیدا ہوتی رہیا ہیں یعنی کسان زمیندار امرا کے خلاف اٹھ کھڑے ہوے ہیں جس نے کبھی کبھی فرقہ وارانہ تعصب کا رنگ بھی اختیار کیا لیکن وہ سب لازمی طور پر اقتصادی تباہ حالی کا مظاہرہ تھا۔ تقسیم نے اس طبقہ کی حالت سدھارنے کے لئے کچھ نہیں کیا نہ تو نام نہاد مسلم لیڈروں نے کسانوں کی زبوں حالی کو دور کرنے میں کسی دلچسپی کا اظہار کیا۔

تقسیم نہ تو اس وجہ سے کی گئی تھی کہ ہندو یا مسلمان کسی نے اس کا مطالبہ کیا تھا اور نہ اس لئے کہ انتظامی مسائل کا اس کے سوا کوئی حل تھا بلکہ صرف یہ وجہ تھی کہ برطانوی حکمراں ہندستان کی قومی یکجہتی کے نشو و نما سے ہراساں ہو گئے تھے اور وہ اس کو ختم کرنے کے لئے مضطرب تھے۔

---

57. Ibid, Curzan to Brodrick, 17 February. 1904.

کرزن کی تقریریں اور ان کے مکتوب بلا ادنیٰ ترین شک و شبہ کے ان کے اصلی جذبہ کو نمایاں کرتے ہیں لیکن مشرقی بنگال کا جو انھوں نے دورہ کیا تھا اس میں ان کو بڑی مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑا ان کے سوانح نگار کے الفاظ میں "ان کی جو تقریریں 1904 میں مشرقی بنگال میں ہوئیں وہ باوجود طرز ادا کی خوش بیانی اور دلائل کی دل نشینی کے سامعین کے دلوں پر کسی قسم کی کوئی جوابی حرکت پیدا نہ کرسکیں" 58

تقسیم کی اسکیم پر نظر ثانی

بہ ظاہر کرزن نے یہ سمجھ لیا کہ نئی تنظیم کی جو اسکیم انھوں نے اوّل بار بنائی تھی وہ اپنی موجودہ شکل میں ناقابل قبول ہے اور یہ محسوس کیا کہ اس سے زیادہ منصوبہ بند اور وسیع تعمیر جدید کی ضرورت ہے یعنی اگر مشرقی بنگال کے لوگوں سے اسے منوانا اور کلکتہ کے اثرات کو کمزور کرنا ہے۔

نظر ثانی کے گیند کو حکومت ہند نے میدان میں رواں کیا اور حکومت بنگال نے اس کا خیر مقدم کیا اور اپنے خط مورخہ 6 اپریل 1901 میں یہ تجویز پیش کی کہ اس پلان کو اور زیادہ وسیع کیا جائے اور بجائے اس کے کہ بنگال کے چند اضلاع آسام میں منتقل کیے جائیں ایک نیا صوبہ عالم وجود میں لایا جائے جس کا دار السلطنت ڈھاکہ ہو۔ گورنمنٹ آف انڈیا نے اس پر مزید اضافہ کیا اور بنگال گورنمنٹ کی اسکیم پر اور بھی نظر ثانی کی وہ اسکیم جو ان تمام مباحث کے نتیجہ کے طور پر آخر کار نکلی وہ یہ تھی کہ بنگال کے صوبہ کی جسامت گھٹا دی گئی اور 1,41,580 مربع میل رقبہ اور 54.4 ملین آبادی اس سے نکال لی گئی اور ایک نیا صوبہ مشرقی بنگال اور آسام کے نام کا جس کا رقبہ 1,06,540 مربع میل اور جس کی آبادی 31 ملین انسانوں کی تھی عالم وجود میں لایا گیا گورنمنٹ کے نقطۂ خیال سے اس جدید قسم کے نظم میں بہت سی خوبیاں تھیں اس نے بنگال کی انتظامیہ کو کافی سہولتیں عطا کردیں نئے صوبہ کے حدود کو ایک دریا سے صاف طور پر متعین کیا گیا یہ دریا مغرب کی کل سرحد پر پھیلا ہوا تھا اور بنگال کے شمالی حصہ کو کل کا کل نئے صوبہ میں شامل کر دیا۔

---

58. Ronald Shay, Op. cit. Vol II, P. 325.

لیکن اس تجویز کے دو خاص فوائد تھے (۱) یہ کہ اس سے ایک ایسا صوبہ بنتا تھا جس میں مسلمانوں کی غالب اکثریت تھی کیوں کہ کل آبادی میں 18 ملین مسلمان اور 12 ملین ہندو تھے "نہ صرف یہ کہ ڈھاکہ کو صوبہ کے دوسرے حصوں کے مقابلہ میں ایک مرکزی حیثیت حاصل ہوگئی بلکہ اس کی وجہ سے اس صوبہ کو وہ خاص منصب حاصل ہوگا جہاں مسلمانوں کے مفادات کی مضبوطی کے ساتھ نمائندگی کی جا سکے گی"59/ (2) یہ کہ بنگال کے 17 ملین بنگلہ زبان بولنے والوں کے مقابلہ میں سینتیس ملین دیگر زبانوں بہاری اور اوڑیہ کے بولنے والوں کی زبردست عددی اکثریت ہوگی۔ اس طرح ایک بڑی اور ہم نوع بنگلہ زبان بولنے والی قوم کے اعضا وجوارح کاٹ ڈالے جائیں گے اور وہ بے بس ہوکر رہ جائے گی۔"

ستمبر 1904 کے آخر میں حکومت ہند اور حکومت بنگال کے درمیان بحث و گفتگو کے بعد اسکیم آخری درجہ پر مرتب کر دی گئی۔ جو انتظامات تجویز کئے گئے ان کا اشارہ یہ تک پبلک کو نہیں دیا گیا لیکن اینگلو انڈین اخبارات میں جو خبریں شائع ہوئیں ان سے قیاس کیا گیا کہ کسی ناخوشگوار چیز کا مواد تیار کیا جا رہا ہے ہندستانی اخبارات میں مضامین شائع کئے گئے جن میں پریشانیوں کا اظہار کیا گیا قانون ساز جماعت میں سوالات اطلاع حاصل کرنے کے لئے کئے گئے لیکن ان کو روک لیا گیا۔

۱۰ اپریل سے ۹ دسمبر 1904 تک کرزن ہندستان کے باہر انگلستان میں تھا واپسی پر وہ پوری سنجیدہ مستعدی سے اس مرحلے کے غور و فکر پر متوجہ ہوا۔ رسلے (Risley) وزیر ہند نے اپنا نوٹ تیار کر لیا تھا۔ اور اپنے شاطرانہ پلان کی خوبیوں کو اس میں سمجھایا تھا۔ ان میں سے چند کو ان ہی کے الفاظ میں دہرایا جاسکتا ہے۔ انھوں نے لکھا کہ۔

"متحدہ بنگال ایک طاقت ہے۔ بنگال منقسم ہوگیا تو اس کے اجزا مختلف اطراف میں ایک دوسرے سے رسہ کشی کریں گے یہ ہے وہ بات جسے کانگرس کے لیڈران محسوس کرتے ہیں۔ ان کا خوف مکمل طور پر صحیح ہے اور یہی اس اسکیم کی بڑی سے بڑی خوبیوں میں ایک خوبی ہے۔"

---

59. Home Dept. Public. A February 1905 Nos 155-167. Risley to Chief Secretary Bengal 13 Sept 1904.

اور" ہمارے خاص مقاصد کا ایک جز و یہ ہے کہ ہم تقسیم کر دیں اور اس طرح اپنی حکومت کی مخالفت میں جو ایک ٹھوس جماعت ہے اسے کمزور کر دیں۔"

کانگریس کے بارے میں ان کا نوٹ یہ تھا کہ

"اس نظام کی باگ ڈور ان کانگریسیوں کے ہاتھ میں ہے جو خفیہ طور سے ریشہ دوانیاں کر کے اور اپنا اثر ڈال کر کام لیتے ہیں ان کی مسلسل کوشش (جواب تک زیادہ تر نواب ڈھاکہ کے اثرات کی وجہ سے ناکام رہی ہے) یہ رہی ہے کہ وہ مسلمانوں کے رہنماؤں کو اپنے اثر کے تحت لے آویں .... ہر نقطہ خیال سے یہ مناسب ہے کہ رائے عامہ کے مقامی مرکز وں کے نشو و نما کی ہمت افزائی کی جائے۔ اگر بنگالی ہندوؤں کی بہت ہی زیادہ غالب اکثریت کو صوبہ کی تقسیم کرکے کم کر دیا جائے تو اس کی امید کی جا سکتی ہے کہ مسلمانوں میں اس قسم کے مراکز ڈھاکہ میں اور بہار کے باشندوں میں اور اوڑیہ بولنے والوں میں کٹک کے مقام پر ترقی پا سکیں گے۔ اور پورے بنگال کی رائے عامہ کو خوش اسلوبی سے ہموار کیا جا سکے گا۔"/60

۲/فروری 1905ء کو کرزن نے اپنی تجویزات وزیر ہند کے پاس بھیج دیں۔ موخرالذکر نے اس تجویز کے .... نامعقولیت کی جانب اشارہ کیا جس میں ایک ہم جنس قوم کے بیشتر آبادی کو ایک نئے انتظام کے ماتحت کر دیا جس کا دارالسلطنت ایک دور دراز مقام پر ہوا اور پبلک کے جذبات کی گہرائی اور طاقت کو وائسرئے۔ کے اس طرح نظر انداز کرنے کے پلان کو تعجب خیز قرار دیا۔

لیکن بہرحال وزیر ہند نے وائسرائے کے مقابلہ میں اپنے خیالات سے دستبرداری دے دی اور تمام احتجاجوں، میموریلوں اور متبادل اسکیموں کو رد کر دیا۔ کرزن نے بعد کو تمسخر آمیز انداز میں کہا "اس اسکیم کو میرے مجروح جذبات کی تسکین کے لئے اسی طرح منظور کیا گیا ہے جس طرح کہ کسی خطرناک انسان کو پرچانے کے لئے کوئی چیز دی جاتے یہ اسکیم اس لئے منظور نہیں کی گئی ہے کہ یہ سیاسی حیثیت سے مناسب اور موزوں ہے"/61

وزیر ہند نے اسکیم کی منظوری ۹/جون 1905ء کو دی لیکن دارالعلوم میں اس کا انکشاف

---

60 . Ibid, Risley's minute, 6 December 1904, and Govt of India's letter to Bengal Govt.

61 Lord Curzon, in the House of Lords, 13 June 1908. Quoted by Nevinson, H W The New Spirit in India. P. 13 Note.

جولائی میں ہوا۔ تب اس کے بارہ دن کے بعد گورنمنٹ کے ریزولیوشن سے تقسیم کی تفصیلات معلوم ہوئیں۔ یکم ستمبر کو شاہی اعلان نے شہنشاہ معظم کی منظوری کی اطلاع دی اور پبلک کو یہ اطلاع دی کہ صوبوں کی جو جدید تنظیم کی گئی ہے۔ اس پر ۱۶ اکتوبر 1905ء کو عمل درآمد ہو جائیگا۔
اگر پہلی اسکیم نے شورش پسند اور بغاوت پر اکسانے والے بنگالیوں کی پشت پر۔ جو برطانوی حکومت کے مخالفین کی ایک مستحکم جماعت کی شکل میں تھے۔ کوڑے کی ضرب لگائی تھی تو دوسری اسکیم نے بچھو کے ڈنک مارنے کا کام کیا۔ وہ ظالمانہ مقصد جو گورنمنٹ آف انڈیا نے قائم کیا تھا۔ اور جس پر وزیر ہند نے اپنی رضامندی دیدی تھی اور نہ برطانوی پارلمنٹ نے اسے منظور کر لیا تھا اس کو بہترین طریقے سے ٹینسن (Tennyson) کے حسب ذیل قطعہ سے ظاہر کیا جا سکتا ہے۔" / 62

یہ بانسری میں ایک شگاف ہے
جو رفتہ رفتہ موسیقی کو بے صوت
اور دھیرے دھیرے بڑھ کر مکمل خاموشی بپا کر دے گا۔

یہ شگاف ضرور بڑھا حتی کہ اس نے ہندستان کو دو ٹکڑوں میں بانٹ دیا اس نے نہ صرف بنگال کی یک جہتی کو ختم کر دیا جو کانگرس کا فوری مقصد تھا بلکہ ہندستان کی یک جہتی کو بھی ختم کر دیا۔

تقسیم کا اعلان

دارالعوام کا اعلان شعلہ جوالہ بن کر ہندستان میں اشاعت کے لئے آیا اور ۱۷ جولائی کو اخبارات میں طبع ہوا۔ شائع ہوتے ہی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بندوق کی لبلبی دبا دی گئی ہو اور ایک عظیم دھماکہ ہوا جذبات کا پیمانہ تو لبریز کے قریب تھا ہی اور یہ شبہہ کیا گیا کہ گورنمنٹ بنگال کی قسمت کے بارے میں خفیہ بات چیت کر رہی ہے۔ 1904ء کے یونیورسٹی ایکٹ نے

---

62 - Tenyson, Alford, Lord, Martin and vision, Idy-lls of the King Vol III. P. 197.

تعلیم یافتہ طبقہ میں وسیع پیمانہ پر غصہ کی ایک لہر دوڑا دی تھی۔ اور ۱۸ فروری 1905ء کو کرزن نے تقسیم اسناد کے موقع پر جو تقریر کی تھی اس نے بے اطمینانی کو آگ کی بھٹی میں جھونک دیا تھا اور تقسیم وہ مثالی تنکا ثابت ہوا جس نے اونٹ کی کمر توڑ دی تھی۔

اس طرح تقسیم کے موقع پر ہندستان ذلت، مایوسی، تلخی اور غصہ کے مشترک جذبات سے کانپ رہا تھا۔

ہندستان کے مزاج میں تدریج تبدیلی آرہی تھی۔ تلک، اربندو گھوش اور ٹیگور جیسے گو پرانے مدبرین جو کانگرس کی رہنمائی کر رہے تھے ان کے سیاسی لائحہ عمل سے اختلاف ظاہر کر رہے تھے۔

تمام ایشیا میں جو ہلچل پیدا ہوئی تھی اس کا اثر ہندستان پر بھی پڑا تھا۔ برطانوی شہنشاہیت سے خوف اور اس کا وقار دونوں کے اثرات معدوم ہو رہے تھے۔ آئرلینڈ کے معاملات بائیکاٹ کی شورش پارنیلیں (Parnellism) طریقہ سوراجیہ حاصل کرنے کا اور سن فین تحریک۔ ان سب نے یہ ثابت کر دیا کہ برطانوی مقبوضات کو غیر محفوظ قرار دیا تھا۔ اس سے پہلے جنوبی افریقہ کی لڑائی میں شکست نے برطانیہ کے فوجی نظام کی کمزوری کو نمایاں کر دیا تھا۔ جاپان کے ابھرنے اور برطانیہ کی اس سے مصالحت کرنے کی بے چینی اور اس کی ایک طاقتور یوروپین طاقت روس کی لڑائی میں تعجب انگیز کامیابیوں نے ہندستان کو جوش و مسرت سے بھر دیا۔ اور اس کی خود اعتمادی کا اخلاقی معیار بلند ہو گیا۔ روس، شمالی افریقہ، ایران، مشرق بعید اور چین میں جو انقلابی ہلچل مچی ہوئی تھی ان کی صدائے بازگشت ہندستان میں بھی گونجی ہندستان کے ماضی کا دقت نظر سے مطالعہ کرنے والوں نے فلسفہ، سائنس، فن اور انتظامیہ میں اس کے کارناموں کو ظاہر کیا جس سے اس کی خود اعتمادی میں اضافہ ہوا۔ تعلیم یافتہ افراد کی تعداد اب کافی زیادہ ہو گئی تھی۔ یہ لوگ زیادہ سیاسی شعور رکھتے تھے۔ زیادہ منظم تھے اور اس لئے کرزن نے ملوکیت پرستی کا جو چیلنج دیا تھا اس کے مقابلے کے لئے زیادہ تیار تھے

وہ آوازیں جو انیسویں صدی میں دھیمی اور تھوڑے تھوڑے وقفہ سے ہو رہی تھیں اب بلند بانگ اور مسلسل ہو گئیں۔ تقسیم کے اعلان کا پہلا اثر ایک غم انگیز استعجاب تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ "ترمیم شدہ اسکیم خفیہ طور پر تیار کی گئی تھی خفیہ ہی طور پر اس پر مباحثے ہوئے تھے اور خفیہ ہی طور پر وہ طے بھی کر دی گئی تھی۔ اور پبلک کو ذرا بھی اس کا اشارہ تک نہ ——

ملاحظہ ہو/63

تقسیم کی اسکیم پر اعتراضات

(۱) جدوطانیہ :- غصہ تقریباً عالمگیر تھا لہٰذا ٹائمز نے لکھا کہ "یہ ناممکن ہے کہ ان کے (یعنی بنگالیوں) لیڈران کی ان انتظامات کی نفرت سے ہمدردی نہ کی جائے جنہوں نے ان کو اس طرح دو علیٰحدہ علیحدہ حکومتوں کے ماتحت کر دیا ہے. مینچسٹر گارجین نے یہ ریمارک کیا کہ "اسکی شرح کرنا تو مشکل ہے ہی اس سے زیادہ مشکل ان کی (کرزن کی) اس اسکیم کی تائید کو معاف کرنا ہے جس نے بنگال کو کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے" اس نے حکومت ہند کی اس معاملے میں خفیہ کارروائیوں کو اور خاموشی کے خلاف تلخ شکایات کا بھی نوٹس لیا اور لکھا کہ "اب بھی تاخیر نہیں ہوئی ہے کہ اس جدت کو دور کرنے کی کوئی ترکیب نکالی جائے جس کو یکساں طور پر تمام بنگالی نقصان رساں سمجھتے ہیں خواہ ایسے بنگالی ہوں جو بنگال کے اندر رہ گئے ہیں یا وہ جن کو باہر پھینک دیا گیا ہے۔" ڈیلی نیوز نے لکھا کہ "بنگال کے جذبات میں اس سے اس قسم کی مداخلت سے عظیم ہلچل مچی ہوئی ہے اور اگر انگلستان اپنی سب سے بڑی عظیم مملکت پر توجہ کرنے پر راضی ہو تو ضرورت ہوگی کہ اس جدید اسکیم کو بہت مکمل طور پر صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی جاتے۔ اسٹنڈرڈ نے سنجیدہ احتجاج ایک ٹھوس مواد کا پتہ لگایا جس میں کسی قسم کا مبالغہ نہ تھا اور لکھا کہ :- "یوروپین لوگوں نے اصلی باشندوں کے ساتھ اس اسکیم کی مخالفت میں شرکت کی اور سب سے زیادہ وفادار اور قدامت پسند مسلمان امرا نے اس کی اسی طرح مذمت کی جیسا کہ ایک غیر ذمہ دار نا کیولر نشہ یہ کرتا ہے۔[64]

اینگلو انڈین :- اسٹیٹسمین نے اپنی ۸ جولائی کی اشاعت میں گورنمنٹ کو ان الفاظ میں موردالزام ٹھہرایا ——— "جب سے لارڈ کرزن نے مشرقی بنگال کا دورہ کیا ہے، تب سے برابر مسلسل اخفاء راز رکھنے اور دورخی پالیسی اختیار کرنے کے لیے جو کل کارروائیوں میں نمایاں رہی ہیں۔ گورنمنٹ موردالزام ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تقسیم کی اسکیم اس طرز پر پختہ کی گئی ہے جو اس "مشرقی زمانہ ساز تدبیر" کی جانب اشارہ کرتی ہے جو ایک مشہور پبلک تقریر کا مواد تھا۔ (کرزن کی تقریر

---

63 - Bounerjee S.N. Anation in Making (1965) P.172.

64 - Quoted by Muckerjee P. All About Partition Calcutta 1906.

پر جلسہ تقسیم اسنادمیں) اس سے ناقابل یقین حد تک سرکاری کارروائیوں میں بھونڈے پن کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مخالفت جس کا وجود ریزولیشن کے اندر تسلیم کیا گیا ہے، اگر ختم نہ ہوتی تو کم ضرور ہو گئی ہوتی۔ بشرطیکہ اس سے کم درازیت انگیز اور کمتر بداعتمادی پر مبنی پالیسی اختیار کی گئی ہو۔ اور صوبہ کی جدید حد بندیوں میں مستقل نسلی اور لسانی خطوط کے لحاظ سے ایک ایماندارانہ کوشش کا مظاہرہ کیا گیا ہوتا۔"

پائنیر میں بھی "اسٹیٹمنس" کی آواز کی بازگشت سنائی دی۔ کلکتہ کے اخبار "انگلش مین" نے اس پر لمبی بحث کی کہ کیا بنگالیوں کی شورش مصنوعی ہے اور یہ رائے ظاہر کی: "ہمارا خیال ہے کہ مجموعی طور پر وہ لوگ بنگالیوں کے کردار کے بارے میں کچھ بھی جانتے ہیں۔ اسی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ تقسیم کی اسکیم ان لوگوں کے لیے جو احتجاج کر رہے ہیں ذہنی اذیت کا باعث ہوئی ہے۔" اس نے اس خوف کا بھی اظہار کیا کہ یہ ممکن ہے کہ تقسیم کی وجہ سے ہائیکورٹ کے اختیارات میں بھی کمی آجائے اور اس کے اختیارات در سماعت محدود ہو جائیں۔ جس کی شدید ترین مخالفت ہر فرقہ کے غیر سرکاری طبقوں کی جانب سے ہونا لازمی ہے .... اب اس بات کو فضول قرار دے کر ٹالا نہیں جا سکتا۔ کہ گورنمنٹ کو اس وصیت سے متصف کیا جائے کہ اس کی اصل منشا ان خود مختارانہ اختیارات کو مضبوط کرنا ہے جو اس کے قبضہ میں ہوئیں۔"

آگے چل کر اس نے یہ اور اضافہ کیا کہ "گزشتہ کئی سالوں سے غیر سرکاری یوروپین طبقہ میں ایک اضطراب انگیز شک اس بات کا پرورش پا رہا ہے کہ اس حلقہ میں جس کو ہندوستان کی حکومت کے طور وطریق پر قابو رکھنے کی طاقت ہے، ایک رجعت پسندانہ روح کار فرما ہے۔"

مارلے جو دسمبر ۱۹۰۵ء میں وزیر ہند ہوا، اس نے پارلیمنٹ کے مباحثہ میں تسلیم کیا: "میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ کبھی اس سے بدتر کام نہیں ہوا جو اس معاملے میں ان لوگوں کی رائے اور ان کے جذبات کو قطعی نظر انداز کرنے کے سلسلہ میں ہوا جن کا اس معاملہ سے تعلق تھا۔" انہوں نے تسلیم کیا کہ: "آخری درجے میں جو اسکیم مرتب ہوئی جس میں ان تمام تقابلی کوششوں کو اختصار کے ساتھ جمع کر دیا گیا تھا۔ اسے بنگال کے کسی شخص کے سامنے رائے زنی کے لیے پیش نہیں کیا گیا۔ میرا خیال ہے کہ یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کی پچھلی حکومت کا کوئی بھی حامی تائید کرنے کی ہمت نہیں کرے گا۔"[65]

---

65. Morley, J. Speeches on Indian affairs pp. 110, 111. Speech in the House of Commons. 26 February 1906.

لارڈ کیننگ نے واضح اور غیر مبہم الفاظ میں تقسیم بنگال کی مذمت کی " اگرچہ وہ اس وقت کونسل کا ممبر تھا جب یہ سب برے اعمال کیے گئے " اس نے اعلان کیا کہ گورنمنٹ کو " اس وقت ذرا بھی چین نصیب نہ ہوگا اور نہ لوگ اس پر راضی ہوں گے جب تک کہ ایک متحدہ بنگال کی سمت کوئی قدم نہ اٹھایا جائے گا " 66

وزیر ہند کو عظیم استعجاب کا سامنا اس وقت ہوا جب "فلر (Fuller) جو تقسیم کی اسکیم کو عملی جامہ پہنا رہا تھا ، اس نے تسلیم کیا کہ اس نے تقسیم کی موجودہ شکل کی مخالفت کی تھی " 67

جبکہ برطانوی اخبارات کے ایک حلقے کے یہ فیصلے انگلستان میں اور برطانیہ کے حمایتی پریس کے ہندوستان میں تھے اور اسی طرح کے فیصلے گورنمنٹ کے اعلیٰ ترین افسران کے تھے تو ان لوگوں کے جذبات کی گہرائی کا اندازہ کرنا دشوار نہ ہوگا جو اس ظالمانہ تقسیم کی اسکیم کے شکار تھے۔ ایجیٹیشن کے شروع زمانے میں تو تقریباً ہندوستانیوں کے ہر طبقے نے اس میں شرکت کی لیکن بعدہ مسلمانوں کی شرکت سے اور خاص کر مشرقی بنگالی مسلمانوں نے ان مراعات کی بنا پر جو ان کے فرقے کو اس سے حاصل ہونے تھے۔ مخالفت تقسیم تحریک کی مخالفت کرنا شروع کیا۔ اور حکومت کی حمایت کا پختہ وعدہ لیا۔

ایک طبقہ تو وہ تھا جو اس جانے بوجھے راضی کرنے کے طریقے پر عمل کر رہا تھا یعنی یہ کہ گورنمنٹ کے سامنے مدلل عرضداشتیں اور میموریل سیاسی جماعتوں اور تمام پبلک کی جانب سے پیش کر کے ہندوستان اور انگلستان کی حکومتوں کی انصاف پسندی سے اپیل کی جائے۔ یہ طریقہ کار انگلستان کی روایاتی جمہوریت پسندی پر اعتقاد اور برطانیہ کی انصاف نوازی کے یقین پر مبنی تھا۔ کانگریس کے لیڈران کا پرانا گروہ اس طریقہ کو بہت کار آمد سمجھتا تھا اور خاص کر دسمبر 1905 ء کے بعد جب لیبر پارٹی انگلستان میں برسر اقتدار آئی اور انتہا پسند مفکر جان مارلے (John Morley) نے وزیر ہند کا عہدہ سنبھالا۔ احتیاط پسند معقول گروہ کے لیڈر گوکھلے اور مارلے میں ایک عجیب قسم کا تعلق پیدا ہوا۔ گوکھلے مارلے کی آزاد پسندی پر بھروسہ کر کے ان سے یہ امید کرتا تھا کہ حکومت ہند

---

66 - Morley Papers, Morley to Minto Vol IV, 5 May 1910, Kitchner's Conversation

67 - Ibid Morley to Minto Vol I, 5 October 1906.

میں ہندوستانیوں کے منصب میں خاطر خواہ ترقی ہوگی اور اس لیے بے صبری کے ہر مظاہرے اور درست اقدام مقابلے کو ناپسند کرتے تھے اور اس کی مخالفت کرتے تھے۔ مارلے ان سیاسی لیڈروں کے اثرات کو زائل کرنے کے جوش میں جو عملی تحریکات چلانے کا نقطۂ نظر رکھتے تھے، اس بات کا خواہشمند تھا کہ گوکھلے کی پارٹی کو اپنی ضمانت میں کچھ ایسے مراعات دے کر جن سے کوئی حقیقی طاقت منتقل نہیں ہوتی، صف آرا کر دے۔

دوسرا طبقہ اپیل کرنے اور عرضداشتیں دینے کے طریقے کو ذلت خیز بلکہ دراصل دریوزہ گری تصور کرتا تھا۔ وہ برطانیہ کی ضد کے قلعہ پر دو رخ سے حملہ کرنے پر یقین رکھتا تھا۔ ایک طریقۂ حملہ کا یہ تھا کہ لوگوں میں حب الوطنی، آزادی سے محبت اور بیرونی لوگوں کے اقتدار سے نفرت اور اپنے اندر استقامت بالحق، خود اعتمادی، ایثار اور قربانی کے جذبات پیدا کیے جائیں۔ ان کے ذرائع پروپیگنڈہ تھے، جلسے، جلوس، مظاہرے، ایسوسی ایشنوں کا قیام اور احکام کی خلاف ورزی، پروپیگنڈہ زبان سے، تقریروں کے ذریعے، اخبارات میں مضامین لکھ کر اور پمفلٹ نکال کر کیا جاتا تھا۔ غرض یہ تھی کہ دماغوں میں انقلاب پیدا کر کے قول سے عمل کی جانب، بیرون ہند کی بزدلانہ وفاداری سے آزاد ہیں خودارادیت کی جانب بلا خوف نتائج جو سیاسی آزادی کا پیش خیمہ ہے، قوم کو متحرک کیا جائے۔

دوسرا طریقہ اقتصادیات، انتظام اور گورنمنٹ کے میدانوں میں مخالفت اور مقابلے کی تنظیم کرنا تاکہ گورنمنٹ کے کاروبار کا جس قدر رجحان ہو، حصہ قوم کے ہاتھ میں آجائے حتیٰ کہ گورنمنٹ اپنے کل اختیارات سے تہی دست ہو جائے۔ اس پروگرام کے تختے یہ تھے۔ سودیشی، بائیکاٹ، قومی تعلیم، سوراج اور ان سب کے حصول کے لیے آخری ہتھیار سول نافرمانی۔

ایک تیسرا گروہ بھی عالم وجود میں آیا۔ ان لوگوں نے یہ بحث شروع کیا کہ برطانیہ کی ہندوستان میں حکومت، طاقت پر قائم ہے۔ کیا انگریزوں نے بار بار ہندوستانیوں کو یاد نہیں دلایا تھا کہ ہندوستان پر تلوار سے قبضہ حاصل کیا گیا ہے اور بزور شمشیر ہی یہ قبضہ قائم ہے۔ مارلے نے جب اصلاحات پر زیادہ زور دیا تو منٹو (Minto) نے ان کو لکھا: "لیکن جب آپ یہ کہتے ہیں کہ: اگر اصلاحات راج کو بچا نہ سکیں گے تو اور کوئی چیز بچا نہ سکے گی۔" میں مجبور ہوں کہ اس سے بالکلیہ اختلاف کروں۔ ہندوستان سے یہ راج اس وقت تک نہیں جائے گا جب تک کہ برطانوی نسل ویسی رہتی ہے، جو آج ہے کیونکہ اس راج کے لیے ہم ویسی ہی سخت لڑائی لڑیں گے جیسی لڑائیاں ہم کبھی بھی لڑتے رہے

ہیں اور ہم کامیاب ہوں گے جیسا کہ ہم ہمیشہ کامیاب ہوتے رہے ہیں۔ 68 اور اگر یہ تیسرا گروہ سوال کرتا تھا کہ وہ کونسا ملک ہے جس نے تشدد کے استعمال کے بغیر کسی بیرونی حکومت کا جوا اپنے کندھوں سے اتار پھینکا ہے اس لیے ہندوستان کی آزادی صرف اس صورت میں حاصل ہو سکتی ہے، جب برطانیہ کی فوجی طاقت کا مقابلہ منظم لیکن بطور امر ضروری خفیہ تشدد سے کیا جائے۔

سر ولیم مالس ورتھ (Sir William Molesworth) نے بہت سالوں قبل یہ اشارہ کیا تھا کہ "بہرحال جہاں تک ذمہ داری نہ ہوگی وہاں کے بارے میں بہت زمانوں کے تجربات نے ثابت کیا ہے کہ بداعمالیاں وجود میں آتی ہیں اور یہ بداعمالیاں برابر قائم رہتی ہیں اور ان کا کوئی مداوا نہیں ہوتا یہاں تک کہ آخر کار یہ بداعمالیاں اس حد کو پہنچ گئی ہیں جس نے قوم کو اس بات پر اکسایا کہ اب درخواستوں اور منکسرانہ عرضداشتوں پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا بلکہ وقت آگیا ہے کہ جنگ کی صدا بلند کی جائے اور جنگ کے اسلحوں سے کام لیا جائے" 69

دوسرا گروہ ٹیگور سے اتفاق کرتا تھا کہ ہندوستان کے احساسات کو ظالمانہ طریقے سے کچل دیا گیا ہے۔ انہوں نے گورنمنٹ پر یہ فرد جرم مرتب کیا کہ اس نے ہندوستان کے جذبات کو نظرانداز کیا ہے۔ کیونکہ ہمارے اس ملک میں جہاں کوئی نیشن نہیں ہے، ہر فرد ایک پورے نیشن (برطانیہ) کے پنجہ میں ہے، جس کی انتھک نگرانی ایک مشین کی نگرانی ہونے کی وجہ سے اپنے اندر چشم پوشی، کرنے اور امتیاز برتنے کی طاقت ہی نہیں رکھتی ہے۔" 70 انہوں نے یہ عقیدہ قائم کیا کہ:۔ مصیبت زدہ انسان کی غارت گر یا یوسی کی شکار دنیا جو بھوتوں کا گھر ہو اور جس پر ایک منظم کرنے والے کی ہولناک کمی کا سایہ ہو" / 71 یہ وہ حالت ہے جو ہندوستان کی ہے۔

68- Wolpert's. Morley and India P. 46. Minto to Morley - 27 May, 1908.

69. Molesworth, Sir William, House of Commons, 23 January 1838. The Canada Debate of 1838.

70- Tagore, Rabindranath, Nationalism. P. 25.

71- Ibid. P. 28.

ساتواں باب

تقسیم کے خلاف تحریک

۱- پہلا دور

1905ء کا سال ایک ناقابل تسکین المیہ کا سال تھا۔ وہ شدید حادثہ بنگال کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کا تھا ۔ 1904ء کا خاتمہ کانگرس کے اس ریزولیوشن پر ہوا تھا جس میں اس نے اپنا پر زور احتجاج گورنمنٹ آف انڈیا کی اس تجویز کے خلاف کیا تھا کہ بنگال کو تقسیم کر جائے۔ جیسے جیسے کہ سال گزرتا گیا اور اسکیم بتدریج ظاہر کی جاتی رہی ڈراما بالکل سامنے آگیا۔

اس ڈراما کا پلاٹ دو مرضیوں کے تصادم سے تیار ہوا تھا۔ ایک طرف امپیریل برطانیہ کی مرضی اور دوسری طرف ہندستان کے عامۃ الناس کی مرضی۔ ۱۰ جنوری 1905 کو کلکتہ کے ٹاؤن ہال میں ایک کثیر مجمع کے سامنے کرزن کی تجویز کی مذمت کی گئی۔ اور ایک متبادل اسکیم تجویز کی گئی جس کی رو سے بنگال کی سالمیت کو برقرار رکھتے ہوئے انتظامیہ پر بوجھ کو کم ہو جاتا تھا دوسری میٹنگ ۱۵ مارچ کو جلسہ تقسیم اسناد کے موقع پر کرزن کی تقریر اور معاملات ہند کے متعلق ان کے عام رویہ کے خلاف زبردست احتجاج کے لیے منعقد کی گئی۔ ہندستان کے دوسرے علاقوں میں بھی احتجاج کے جلسے کیے گیے۔

تحریک نے اس وقت بہت زور پکڑ لیا جب یہ ظاہر ہوا کہ وزیر ہند نے گورنمنٹ آف انڈیا کی فرستادہ تجویز کو منظور کر لیا ہے۔ اس خبر نے ایک خوفناک دھکا لگایا۔ اور تحریک میں زبردست ہیجان پیدا ہوا ۶ جولائی 1905 کو ایک میمورنڈم جس پر ہزاروں آدمیوں کے دستخط تھے وزیر ہند کو روانہ کیا گیا[1]

اس کے بعد اور بھی میموریل بھیجے گیے۔ فوراً ہی کلکتہ اور صوبہ کے دوسرے شہروں اور قصبات میں پبلک کے جلسے تجویز کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے منعقد کیے گئے۔ باگر ہاٹ کے مقام پر ایک جلسے میں "سنجیونی" کا سوجھاؤ دیا گیا اور برطانوی مال کے بائیکاٹ کی تجویز منظور کی گئی۔

گورنمنٹ کے ریزولیوشن کی اشاعت نے جس میں تشکیل جدید کی تفصیلات درج تھیں آگ میں ایندھن کا اضافہ کر دیا۔ اب مستقبل اپنی تمام ہولناکیوں کے ساتھ ملک کے سامنے تھا ایک غصہ میں بھرے ہوئے شگاف انگیز ایجیٹیشن نتیجہ کے طور پر برآمد ہوا جس میں پورے بنگال مشرق اور مغرب نے حصہ لیا۔ باشندگان ہند کے ہر طبقہ نے خواہ وہ کسی عمر کے ہوں اور خواہ کسی پیشہ یا مذہب سے تعلق رکھتے ہوں تقسیم کی مذمت کی تحریک میں شریک ہو گیے۔ جلسے جلوس اور مظاہرے تمام صوبہ میں ہوتے۔

تحریک کے روشن ترین پہلوؤں میں ایک پہلو کلکتہ کے ٹاؤن ہال میں 7 راگست کا جلسہ تھا۔ ایک عظیم الشان ہجوم اکٹھا ہوا۔ شہر کی زیادہ تر دوکانیں بند ہو گئیں اور پانچ ہزار طلباء جلوس کی شکل میں مارچ کرتے ہوئے ٹاؤن ہال پہنچے۔ مجمع اتنا کثیر تھا کہ ٹاؤن ہال کے باہر دو میٹنگیں کرنی پڑیں۔ جن میں مجمع حد سے زیادہ تھا۔ جوش انتہا کو پہنچا ہوا تھا نعرے اور "بندے ماترم" کی پکار سے فضا لرز رہی تھی۔ کتبے جن پر لکھا ہوا تھا "تقسیم نہیں ہوگی" اور جھنڈے جن پر تحریر تھا "متحدہ بنگال" اور "اتحاد میں طاقت ہے" حاضرین مجمع کے سروں پر لہرا رہے تھے۔ اشتہارات اور پمفلٹ تقسیم کیے گیے۔ کالے بلے بازؤں پر غم کی علامت کے طور پر باندھے گیے تھے۔ مہاراجہ مہندر راچندر ناندی قاسم بازار بھوپندر ناتھ باسو اور امبیکا چرن مزمدار نے تینوں میٹنگوں کی صدارت کی۔ دیگر تجاویز کے علاوہ یہ ریزولیوشن بھی منظور کیا گیا کہ "جب تک کی تقسیم کا ریزولیوشن واپس نہ لیا جائے برطانیہ کی بنی ہوئی کوئی چیز خریدی نہ جائے۔

ہندستان کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا تھا۔ جیسا کہ امبیکا چرن مزمدار نے کہا کہ "تقسیم بنگال سے ملک کی سیاسی شورش ایک نیے دور میں داخل ہو رہی ہے

---

1. Ray. P.C. The Case against The Bre... [illegible]

اس نے شک وشبہ سے بالاتر دو امور کا انکشاف کر دیا ہے۔ اول حکومت کی بالارادہ استبدادیت اور دوسرے جس قسم کے ایجیٹیشن کے ہم عادی ہو چکے ہیں ان کا قطعی بیکار ہونا۔ انھوں نے مزید کہا کہ "وقت آگیا ہے کہ ہم اپنی کارروائیوں کو خیالات کے میدان سے نکال کر عمل کے میدان میں لائیں ہم خودداری کی مشق کرنا چاہتے ہیں تاکہ ہم ان سے اپنی عزت کرانے کا مطالبہ کرا سکیں جو اب تک ہمارے ساتھ حقارت کا برتاؤ کرتے رہے ہیں"

ہندستان نے ایک نیا ورق الٹ دیا تھا۔ عمل اور جارحانہ شورش کا دور شروع ہو گیا تھا اور ہندستان کی خود اعتمادی کی روح کا پیغام عامۃ الناس تک پہنچ گیا تھا۔

ہر روز جوش اور زیادہ بلند ہوتا گیا۔ سودیشی اور بائیکاٹ کی تجویزیں بڑے جوش وخروش سے منظور کی گئیں۔ تحریک حدود بنگال کے باہر تک پھیل گئی صوبہ ممالک متحدہ، پنجاب مہاراشٹر اور ہندستان کے دوسرے علاقوں میں حرکت پیدا ہونے لگی۔ تمام ملک میں پھیلی ہوئی ہنگامہ خیز کارروائیوں کا مرکز کلکتہ تھا اور پروگرام کے مرتب کرنے اور شورش کے طریقے بتلانے میں قیادت کے فرائض انجام دیتا تھا۔

22 ستمبر کے ایک جلسہ میں جس میں ہر طبقہ اور ہر گروہ کے لوگ شریک تھے اور جہاں لال موہن گھوش، موتی لال گھوش، بھوپندر ناتھ باسو، بپن چندر پال اور سریندر ناتھ دت نے مجمع کو خطاب کیا تحریک کی حمایت میں ایک فنڈ کھولا گیا۔ اس میٹنگ کے بعد گورنمنٹ نے اپنا پہلا جابرانہ عمل شروع کیا یعنی کلکتہ کے اندر میدان میں جلسہ کرنا ممنوع قرار دے دیا۔

دوسرے دن 23 ستمبر مسلمانوں کا ایک جلسہ راجہ بازار میں ہوا جس کی صدارت عبدالرسول نے کی۔ اس جلسہ میں تقسیم کے خلاف تحریک کی تائید اور حمایت اور سودیشی کی تحریک کی صمیم قلب سے رضامندی کا اعلان کیا۔

28 ستمبر کو "مہالایا" تیوہار کے موقع پر کلکتہ کے کالی گھاٹ مندر پر ایک آداب رسوم

---

2. Mukherjee, P. All about Partition (Calcutta, 1906).

کی پابندی سے پوجا کا انتظام کیا گیا۔ آخر میں وہ تمام پوجاری جو وہاں جمع تھے انھوں نے کالی ماتا" کے سامنے حلف لیا کہ " باہر کا بنا ہوا سامان میں استعمال نہیں کروں گا" جہاں تک ممکن ہوگا میں بیرون ملک کے تاجروں کی دوکان سے وہ اشیا نہیں خریدوں گا جو ہمارے ملک کے دوکان داروں کی دوکانوں پر مل سکتی ہیں اور میں کسی بیرون ملک کے آدمی سے کوئی ایسا کام نہیں لوں گا جو ہمارے ملک کا آدمی کر سکتا ہے"/3

یہ حلف پورے بنگال کے تمام کالی کے مندروں میں دوہرایا گیا۔

16/ اکتوبر یعنی وہ دن جس دن تقسیم کا عمل در آمد ہوا اور بمپ فلائڈ فلر (BAMPFYLDE FULLER) نے نیے صوبہ کے لفٹیننٹ گورنر کے عہدے کا چارج لیا ایک انوکھے قسم کا مظاہرہ کیا گیا۔ جس میں پبلک کے جذبات کو حقارت سے ٹھکرا دینے پر سخت غصے کا اظہار کیا گیا اس دن کا پروگرام یہ تھا کہ اس دن کو سنجیدہ پروگرام اور سخت غم کا دن قرار دیا گیا اس کا آغاز گنگا میں نہانے سے ہوا۔

ننگے پاؤں چلتے ہوئے آدمیوں کے دستے پر رستے گھاٹ کی جانب بھجن اور قومی گیت گانے اور بندے ماترم کا نعرہ لگاتے جا رہے تھے انھوں نے گنگا میں ڈبکی لگائی اور بازوں پر راکھی اس اعلان سے باندھی کہ سب ایک برادرانہ رشتے میں بندھے ہوئے ہیں۔ دن میں انھوں نے برت رکھا۔ کھانا پکانے کے لیے کوئی آگ نہ جلائی۔ سہ پہر کو لوگ فیڈل ہال کا سنگ بنیاد رکھنے کے لیے جمع ہوئے۔ اتحاد بنگال کا ایک نشان۔

اس تقریب کے موقع پر بنگال کے بہت سے ممتاز لیڈران موجود تھے مثلاً گوروداس بنرجی ممتاز ماہر قانون اور ماہر تعلیم، سورندر ناتھ بنرجی بنگال کا بے تاج بادشاہ، بیل رتن سرکار ایک ممتاز طبیب، موتی لال گھوش امرت بازار پتریکا کا ہمت ور ایڈیٹر، رابندر ناتھ ٹیگور شاعر، ابوالحسن غزنوی اور ریاقت حسین۔ آنند موہن بوس نے کرسی صدارت کو زینت دی اور سنگ بنیاد رکھا۔

ایک اعلان پڑھا گیا جس میں باشندگان بنگال نے حلف لیا تھا کہ وہ ہر وہ چیز

---

3. Home Deptt. Public A. Progs June 1906, No177 and Home Deptt Political A. Progs October 1907. Nos 50-60.

جوان کے اختیار میں ہو گئی تقسیم کے مذموم اثرات کو مٹانے اور بنگال کے باشندوں
کے اتحاد کو قایم رکھنے کے لیے کریں گے۔

تب یہ عظیم الشان مجمع کلکتہ کی سڑکوں سے گزرتا ہوا باگھ بازار پہنچا جہاں اسے
سورندر ناتھ بنرجی نے خطاب کیا۔ تقریر کے بعد 5000 روپیہ قومی فنڈ کے ابتدا کے
طور پر جمع کیا گیا۔

دسمبر 1903ء سے اکتوبر 1905ء تک بنگال کے دونوں حصوں میں دو ہزار سے
زیادہ جلسے کیے گیے جن میں 5000 تک لوگ شریک ہوتے اور جن میں ہندؤں اور
مسلمانوں نے یکساں جوش اور خلوص سے احتجاج کیا/4

اس وقت تک پبلک کی جانب سے یہ تحریک تیزی کے ساتھ ترقی کرتی رہی اور پورے
بنگال میں پھیل گئی۔ ابھی تک اس کا مقابلہ گورنمنٹ کی کسی سنگین مخالفت سے نہیں ہوا
تھا۔ یہ تحریک تقسیم کے خلاف احتجاج کی شکل میں شروع ہوئی تھی۔ اکتوبر کے وسط
تک اس نے اپنی نوعیت اور اپنے حدود کو وسیع کر لیا تھا اس نے عوام میں خود اعتمادی
کا جوش پیدا کر کے ان میں یہ جذبہ پیدا کر دیا تھا کہ حاکموں کے خود مختارانہ احکام
کی تعمیل سے انکار کر دیں۔ منظم عمل کی ترقی کو اس نے فروغ دیا تھا۔ حب الوطنی کے ضمن
میں ایثار اور قربانی کے جذبہ کو اس نے عمیق کر دیا اور قومیت کے شعور کو ایک وسیع
پیمانہ پر اجاگر کیا۔

اب ایک تعمیری پروگرام ترتیب دیا گیا جو سودیشی، بائیکاٹ اور قومی تعلیم پر
مشتمل تھا اور مقصد سوراجیہ کی منزل تک پہنچنا تھا۔ تحریک کا رجحان یہ بھی تھا کہ
سیاسی خیالات کو ایک رخ پر لایا جائے۔

ایجی ٹیشن کے لیڈران

جس تعجب خیز تیز رفتاری سے یہ تحریک چلی اس کے کئی اسباب تھے۔ بنگال معلله

4- Mazumdar, A.C. Indian National Evolution (G.A. Natesan) Nove-mber 1971. 2nd Edition, P. 205.

ہیں خوش قسمت تھا کہ اس کثیر تعداد میں لائق و فائق لیڈران پیدا کیے۔ اس طوفانی زمانہ میں کلکتہ کے اندر اور اضلاع میں ایسے لوگ تھے۔ جو بلند پایہ توانائی، اخلاقی خوبیاں اور علمی و ذہنی حیثیت سے اونچا مقام رکھتے تھے جو بڑے ہی جری اور استقامت بالحق، فصیح البیان اور تنظیمی صلاحیت کے حامل تھے یہ لوگ صدق دلی اور پورے جوش وخروش سے مادر وطن کے خدمت گزار تھے فہرست لمبی ہے لیکن چند نام پیے جا سکتے ہیں۔ گمرداس بنرجی۔ سوریندر ناتھ بنرجی، رابندر ناتھ ٹیگور، ستیش چندر مکرجی موتی لال گھوش، آنند موہن بوس، رمیش چندر دت، بپن چندر پال، اشونی کمار دت امبیکا چرن مزمدار اور کے۔ کے متر۔

انجمنیں

اور پھر بہت سی سوسائٹیاں تھیں جنھوں نے چار اجزاء کے پروگرام کے لیے بہت سی کارروائیوں کو جاری کیا۔ پرانی انجمنیں جیسے کہ برٹش انڈیا ایسوسی ایشن اور لینڈ ہولڈرس ایسوسی ایشن نے میموریل دیئے جن میں تقسیم کے نامناسب ہونے پر بحث تھی متبادل پروگرام بھی دیا گیا تھا۔ اور قومی تعلیم کے لیے دلائل پیش کیے گئے تھے نئی جماعتیں ابھر پڑیں جنھوں نے تعمیری پروگرام کو جوش وخروش سے اپنا لیا۔ سودیشی اور بائیکاٹ کے مقصد کے لیے اور تعلیم گاہوں کو قایم کرنے کے لیے ذرائع و وسائل مہیا کرنے کے لیے رضا کار بنا نے ان جماعتوں میں ایک ڈان (DAWN) سوسائٹی تھی جو ستیش چندر پال مکرجی نے بنائی تھی اور اس کے علاوہ بندے ماترم سمپردائے اینٹی سرکلر سوسائٹی (ANTI CIRCULER) سودیشی سماج اور بہت سی ایسی سوسائٹیاں کلکتہ اور متصلات میں قایم ہوئیں یہ سب زور شور سے شورش بپا کر رہی تھیں ان کے ذرائع یہ تھے کہ جلسہ کرتی تھیں، جلوس نکالتی تھیں پکٹنگ (PICKETTING) کرتی تھیں اور سرمایہ جمع کرتی تھیں و النیٹروں نے جو زیادہ تر طبقہ طلبا سے بھرتی کیے لیے تھے اس تحریک میں نمایاں حصہ لیا۔ سودیشی تحریک کو سماج کے ہر طبقہ سے حمایت حاصل ہوئی۔ امیر الامراء زمینداران اور تاجران سے لے کر دھوبی اور حجام جیسے ادنیٰ درجہ کے لوگوں تک حتیٰ کہ سنیاسیوں نے بھی شرکت کی۔ سودیشی مال کو سستے

داموں بیچنے کے لیے دوکانیں کھولی گئیں۔

پریس

جو کچھ بھی افراد اور جماعتوں نے کیا ہو۔ اخبارات کی خدمات سب پر بالا تھیں انگریزی زبان کے اخبارات جن کے ایڈیٹر ہندستانی تھے اور بنگالی زبان کے اخبارات دونوں نے تحریک کو کامیاب بنانے میں حصہ لیا۔

اخبار "بنگالی" جس کے ایڈیٹر سورندر ناتھ بنرجی تھے۔ موتی لال گھوش کے امرت بازار پتریکا کا سب سے زیادہ بے خوفی سے گورنمنٹ پر نکتہ چینی کرتے تھے دوسرے بنگالی اخبارات مثلاً سنجیونی، نبتاوادی، باسمتی، اور ڈھاکہ پرکاش، اور بہت سے جو دوسرے ضلعوں میں شائع ہوتے تھے انھوں نے اور زیادہ سختی سے گورنمنٹ کی کارروائیوں کی مذمت کی۔ اخبار "سندھیا" جس کے ایڈیٹر برہمہ بندھو اپادھیا" تھے وہ ان اخبارات میں تھا جو کھل کر کھلم کھلا بات کہتے تھے۔ بنگالی اخبارات کی اشاعت اس طبقہ میں کثیر تھی جو انگریزی زبان سے ناواقف تھا اور برطانیہ کے خلاف رائے عامہ کو تیار کرنے میں ان کا اثر بہت زیادہ تھا۔

"سنجیونی" جس کے ایڈیٹر کے، کے متر اتھے۔ اس نے سب سے پہلے وزیر ہند کی تقسیم بنگال، کے فیصلے کی مذمت کی۔ 6 جولائی 1905 کو کی۔ ایک ہفتہ بعد 13 جولائی 1905 اس نے بنگالی قوم کو پکارا کہ وہ انگریز کے یہاں کی بنی ہوئی چیزوں کا استعمال ترک کر دیں۔ اور اس طرح بائیکاٹ کی تحریک کا افتتاح ہوا۔ سورندر ناتھ بنرجی کے کے اخبار "بنگالی" نے فوراً اس کے بعد اس کی تائید کرتے ہوئے گورنمنٹ کو انتباہ دیا کہ "گورنمنٹ کو اپنے دل سے یہ مغرورانہ خیال نکال دینا چاہیے کہ ان وحشیانہ کارروائیوں کو بلا زبردست اور مسلسل جدوجہد کے جس میں کسی مالی ایثار یا قربانی سے عذر کیا جائے ملک خاموشی سے برداشت کرے گا"[5]

اس نے حکومت پر یہ الزام عائد کیا کہ "برطانوی راج کے رجعت پسندانہ

5- Bengalee, 7th July 1905.

دور کا یہ سب سے بڑھ کر یادگار ہے" اور اعلان کیا کہ "ہم نے عزم بالجزم کر لیا ہے کہ ہم ایک مسلسل جنگ ان دستوری وسائل سے جو ہمیں حاصل ہیں کرتے رہیں گے"6/

امرت بازار پترِیکا نے لکھا کہ "کبھی بھی قوم کے جذبات جس کی تعداد سیکڑوں۔ ہزاروں یا لاکھوں ہی نہیں بلکہ کروڑوں کی ہے اس طرح بے دردی سے پامال نہیں کیا گیا"7/

سنجیوانی نے (22 ستمبر 1905) لکھا "لارڈ کرزن نے ایک آتشیں آزمائش میں ڈال کر ہندستانیوں میں ایک نئی زندگی پیدا کر دی ہے" 8/

اس نے مزید لکھا "ہم کو فرض کی ناہموار پر سوائے طاقت کے اور کسی چیز پر بھروسہ نہیں کرنا ہے ورنہ ہماری بربادی یقینی ہے" 9/

اسی طرح کے مضامین ہندستان کے تمام اخبارات میں شائع ہوتے اس کے علاوہ بے شمار پمفلٹ نکلے جن میں گورنمنٹ کی مذمت کی گئی تھی اور یہ پمفلٹ اضلاع کے وکالت خانوں سے بہ کثرت تقسیم کیے گیے۔ ان میں دو "ہمارا کون بادشاہ ہے اللہ رراجہ کے) اور گولڈن بنگال" (سونیہ بنگال) تھے ان دونوں نے بڑا اثر پیدا کیا۔ پہلے نے یہ سوال کیا کہ برطانیہ کو ہمارے اوپر حکومت کرنے کا کیا حق ؟ " یہ ہمارا خون ہے جسے وہ چوس رہے ہیں؛ یہ ہمارا روپیہ ہے جس سے وہ موٹے ہو رہے ہیں۔ ان ناانصاف حکمرانوں کے آگے ہم سر اطاعت کیوں خم کریں" ؟ اس دوسرے پمفلٹ میں پورے جوش سے بنگالی قوم کو پکارا گیا تھا کہ "متحد رہو اور بیرون ملک کے بلبل کا گھونسلہ نوچ کر دریائے گنگا میں پھینک دو" 10/

سودیشی اور بائیکاٹ کے اصل آلہ کار اور شورش کے پر جوش حامی بنگال کے نوجوان تھے۔

6- Ibid

7- Amrita Bazar Patrika 7th july 1905.

8- Report on the native newspapers, Bengal 1905.

9- Ibid

10- Home Deptt. Public. A. Progs june 1906 Nos 169-186, enclosures

1905 کا سال ختم ہی ہو رہا تھا کہ حکومت کی انسدادی کارروائیاں بہت بڑھ گئیں۔ اور عوام کی مصیبت میں اضافہ ہو گیا لیکن جس ہمت سے بنگال نے اس آزمائش کا مقابلہ کیا اس نے تمام ہندستان کو ہلا دیا۔ بمبئی پریسیڈنسی اور صوبہ متوسط کو محسوس ہوا کہ بال گنگا دھر تلک ایک انتہائی سنجیدہ عزم بالجزم رکھنے والا اور شجاع لیڈر رہے جس کے اندر تنظیم کی غیر معمولی صلاحیت ہے۔ انھوں نے گورنمنٹ کے حکم کو اس سے پہلے بھی ٹھکرا دیا تھا اور گورنمنٹ کی مخالفت مول لی تھی۔ انھوں نے اپنے آپ کو وائسرائے کی عجیب و غریب حرکت کے خلاف تحریک میں جھونک دیا اور اس موقع کو دونوں ہاتھوں سے اس لیے تھام لیا کہ ایک کل ہند تحریک آزادی کی جدوجہد کے لیے تعمیر کی جائے۔

انھوں نے اپنے پیغام کا بگل اخبار "کیسری" میں ایک مضمون لکھ کر بجایا جس کی سرخی تھی نازک وقت آگیا" /11

اور اس کے بعد بائیکاٹ کی موافقت میں زوردار پروپیگنڈہ جاری کیا انھوں نے اعلان کیا" وقت آگیا ہے کہ سوراجیہ یا سلف گورنمنٹ کا مطالبہ کیا جائے۔ تدریجی اصلاحات سے کچھ کام نہیں چلے گا۔ حکومت کا موجودہ نظم و نسق ملک کے لیے تباہ کن ہے اسے یا تو اپنی اصلاح کرنا ہے یا ختم ہو جانا ہے لیکن ایک غیر مسلح اور بے سہارا قوم کے لیے اور موثر ذریعہ سوائے بائیکاٹ کے اور کیا تھا۔ تلک پرتھوی پال ایڈیٹر اخبار "کل" اور ان کے احباب نے بمبئی پریسیڈنسی اور صوبہ متوسط کے گوشہ گوشہ میں جلسوں کا انتظام سودیشی کو ہر دلعزیز بنانے اور بائیکاٹ کو مضبوط کرنے کے لیے کیا ان علاقوں میں جو بنگالی رہتے تھے وہ ان کے پرجوش حمایتی تھے

پنجاب میں سودیشی کے اصول کا پرچار کرنے میں آریہ سماج نے گراں قدر حصہ لیا۔ آریہ سماج کے پرچار کرنے والے ملک میں چاروں طرف پھیل گیے اور وہ دیسی مال میں لوگوں کے دلچسپی لینے کا پرچار کرتے تھے۔

صوبہ ممالک متحدہ بھی حرکت میں آیا اور سودیشی کا پروپیگنڈا ضلع ضلع پھیلتا گیا جلسے کیے گیے اور سودیشی کی دوکانیں بہت سے قصبات اور شہروں میں کھولی گئیں۔

---

11 - Kesri : 25 August. 1905.

دکن میں تحریک سے تقریباً کل اضلاع متاثر ہوئے لیکن وہاں اتنا زور نہیں تھا جتنا کہ شمالی اور مغربی ہندستان میں تھا۔ بہر حال ہندستان کا ہر حصہ اس میں شریک تھا۔ اور برطانوی راج کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا جب پورا ہندستان ایک مشترک مقصد پر مجتمع ہوا تھا۔

تقسیم بنگال نامکمل سا ذریعہ تھا جس نے برطانیہ کے خلاف جو جذبات دھیرے دھیرے پیدا ہو رہے تھے ان کو جلدی سے آشکارا کر دیا۔ دنیا کے واقعات جیسے روس جاپان جنگ، اور خراب تر ہوتی ہوئی ہندستان کی اقتصادیات اور برطانیہ کی مغرورانہ بے حسی ایسے واقعات تھے جنھوں نے آنکھ کھول دی تھی یہ وہ جذبہ ہے جو انیسویں صدی کے آخری سالوں میں نشو ونما پا رہا تھا۔

تقسیم اور انڈین نیشنل کانگریس

گورنمنٹ اس سے واقف تھی کہ بے اطمینانی اور بے اعتمادی کی آگ سلگ رہی ہے۔ 1898ء میں وزیر ہند "جارج ہیملٹن" کو وائسرائے نے اطلاع بھیج دی تھی کہ عدم اطمینان کا زہر تیزی سے پھیل رہا ہے ...... بغاوت اب رعیت تک پہنچ گئی"/12

ہیملٹن نے جواب میں لکھا "مجھے ایک بدترین قسم کی آفت کا ڈر معلوم ہوتا ہے"/13

کرزن کا ہندستان کے جذبات کے ساتھ انتہائی حقارت کا برتاؤ اور وہ شر انگیز طریقے جو انھوں نے قومی تحریک میں شگاف ڈالنے کے لیے اختیار کیے ان سب نے میگزین میں دیا سلائی لگانے کا کام کیا جو پہلے سے بارود سے بھری ہوئی تھی۔

ان حالات میں انڈین نیشنل کانگرس جو ہندستان کی واحد سیاسی تحریک تھی وہ کیسے ہندستان کے اندر بدلے ہوئے جذبات سے غیر متاثر رہ سکتی تھی۔

گرنے والی بجلی کی کڑک نے دور سے سنائی دینا شروع کر دیا تھا۔ ہیوم نے جو پیغام کانگرس کو دیا تھا۔ (1903) اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے تلک نے لکھا

---

12 - Hamilton Papers. H.E.M. James to Hamilton enclosed in Hamilton to Elgin. 21 January 1898.

13. Ibid.

" اگر دستوری ایجیٹیشن ہماری ترقی کا صحیح راستہ ہے تو اس کا کوئی نتیجہ نکلنا چاہیے ورنہ ہم کو اس طریقہ کو خیر باد کہنا اور کوئی دوسرا مفید راستہ تلاش کرنا ہوگا" /14
کانگرس نے ایک ریزولیوشن مدراس میں منظور کیا جس میں اس نے گورنمنٹ آف انڈیا کے بنگال کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی پالیسی پر اپنی گہری تشویش کا اظہار کیا۔ 1904 کے اندر بجلی قریب آ رہی تھی۔
تقسیم بنگال کی اسکیم کا جیسے ہی علم ہوا بنگال کے اندر شورش ابلنے لگی لیکن پورے سال 1904 میں پبلک کو گورنمنٹ کے پلان کا کوئی علم نہیں ہوا اس لیے پبلک کی کارروائیوں پر سکوت طاری تھا لیکن احتجاج برابر ہو رہے تھے مثلاً 28 مارچ 1904 کلکتہ کے ٹاون ہال میں ایک جلسہ اسی غرض سے ہوا اس کی صدارت راجہ پیارے موہن مکرجی نے کی کہ بنگال کی تشکیل جدید کے خلاف [illegible] اٹھائی جاتے۔
ہنری کاٹن (S. HENRY COTTON) مارچ 1904 کی مینچسٹر گارڈین (MANCHESTER GARDIAN) اخبار کی اشاعت میں گورنمنٹ کی مذمت میں ایک مضمون لکھا۔ بنگال کی مجلس قانون ساز میں ہندستانی ممبران کو اطلاع حاصل کرنے کے لیے زور دیتے رہے اگرچہ یہ سب بے سود رہا۔ اس طرح جب کانگرس کا اجلاس دسمبر 1904 میں زیر صدارت ہنری کاٹن ہوا تو بے زاری کی آگ سلگ رہی تھی۔
کاٹن نے ہندستان کی آخری منزل کو ان الفاظ میں بیان کیا "ایک ہندستانی محب وطن کا اصل الاصول یہ ہے کہ ایک آزاد اور علیحدہ علیحدہ ریاستوں کا وفاق ممالک متحدہ ہندستان' قایم کیا جائے جس کا منصب دوسری خود مختار نو آبادیات کے ساتھ مساویانہ ہو ہر ایک کو اندرونی خود اختیاری حاصل ہو اور حکومت برطانیہ کی سرپرستی میں آپس میں مضبوطی سے بندھے ہوئے ہوں۔
باشندگان بنگال کی خواہشات اور ان کے جذبات جنھیں انھوں نے پوری بلند آواز سے ظاہر کیا تھا بنگال کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی تجویز کو اور کیا کیا جا سکتا ہے سوا اس کے کہ یہ ایک غیر ذمہ دارانہ اور خود مختارانہ تدبیر کے انتہائی آمرانہ اور

14- Tilakanche Kesaritil Lekha Vol. II. P. 485.

غیر ہمدردانہ ہونے کا ثبوت تھا۔

1905ء میں جب اسکیم پر عمل درآمد ہوا تو پورا ملک غم اور غصہ سے بھر گیا جو۔ طوفان اٹھا اس میں برطانیہ کی انصاف نوازی اور نیک ارادوں پر اعتماد بہہ گیا اس پر اب عقیدہ نہیں رہ گیا۔ آئینی طریقے شکایات کے دفعیہ کے لیے اختیار کیے جائیں اور جو نیے طریقے حکومت پر دباؤ ڈالنے کے لیے آئے ان میں لوگ زیادہ دلکشی محسوس کرنے لگے۔ سودیشی اور بائیکاٹ نئے حربوں کے طور پر استعمال کیے گئے مسکینیت کے ساتھ اطاعت قبول کرنے کا کھیل اور حکومت کی مراعات پر بھروسہ کی جگہ گورنمنٹ کے احکام کی عدم متابعت اور نیے ارادوں کی نشوونما نے لے لی۔ پورے سال میں یہ نظر آتا ہے کہ ایک جانب قوم کا اپنے حق پر اصرار ہے جس سے ایک مضبوط تصادم کی ابتدا ہو رہی ہے اور دوسری جانب اس کو دبانے کی کوشش کی جارہی ہے۔

نونسن (NEVINSON) نے ہندستان میں ایک نئی لہر کو ابھرتے دیکھ کر اپنی انگلی صحیح مقام پر رکھ دی" اینگلو انڈین لوگوں نے اس (کانگرس) کی آئینی مناسبت کو بزدلی قرار دیا۔ اس کے ریزولیوشن کا کوئی نوٹس نہیں لیا گیا۔ اس کی شکایت کا کوئی دفعیہ نہیں ہوا اور تاج برطانیہ نے اسکے وفد کو شرف باریابی بخشنے سے انکار کر دیا۔17 ان کی رائے کا فیصلہ یہ تھا اس کا کوئی اثر گورنمنٹ آف انڈیا اور نہ کوئی اثر وطن کے انگریزوں کی رائے عامہ ہے" اس طرح صاف صاف فیروزشاہ مہتا کے اس بیان کی تردید ہو گئی جس میں انھوں نے کانگریس کے کارہائے نمایاں کا ادعا کیا تھا/ 18

تقسیم نے بے اطمینانی کو تیز تر حرکت دے دی تھی۔ یہ تو لازمی طور پر ہونا ہی تھا کہ جب کانگرس کا اجلاس بنارس میں گھوکھلے کی صدارت میں ہوا تو اس

---

15 - Cotton, Sir, Henry Presidential Address Twentieth Congress Bombay. 1904. Indian National Congress (Natesan) P. 773

16 - Ibid. PP. 783-784.

17 - Nevinson. H.W. The new spirit in India. PP. 326-27.

18 - Mehta Pherozeshah Address at the Bombay Session of the Indian National Congress 1904. as Chairman of the Reception Committee.

کے سر پر کرزن کے نظم و نسق کے خلاف غصہ ایک سیاہ بادل کی طرح چھایا ہوا تھا۔ کارروائیاں طوفانی تھیں اور وہ پرانا گھسا پٹا طریقہ جو کانگرس کی بحثوں اور فیصلوں کا شعار بن چکا تھا اور جس کا انداز یہ تھا کہ شیین کی طرح ہر بات اتفاق رائے سے منظور ہو جاتی تھی اب معلوم ہو چکا تھا حتیٰ کہ شہزادہ ویلز کے خیر مقدم کی تجویز کی بھی مخالفت ہوئی لیکن اس کا اصل کارنامہ وہ دو تجاویز تھیں جو منظور کی گئیں اول میں تقسیم بنگال کے خلاف جس کا صوبہ کی رائے عامہ کو نظر انداز کر کے عمل در آمد کیا گیا تھا اپنے زوردار احتجاج کا اعلان کیا گیا اور دوسرے میں ان جابرانہ کارروائیوں کے خلاف احتجاج کیا گیا جو بنگال کے ارباب حکومت نے اختیار کر رکھی تھیں بعد اس کے کہ پبلک نے مجبور ہو کر بیرونی مال کے بائیکاٹ کا طریقہ بطور ایک آخری احتجاج کے طریقہ کو اپنایا تھا حکومت اور برطانیہ کی پبلک کی توجہ مبذول کرنے کے لیے یہی واحد طریقہ ان کے پاس باقی رہ گیا تھا" / 19

برطانوی کپڑوں کے بائیکاٹ کے لیے کانگرس کی منظوری نے یہ ثابت کر دیا کہ ملک میں ہوا کے رخ میں کتنی تبدیلی آگئی ہے۔ جو سال آگے آتے انھوں نے دیکھا کہ کس طرح ملک میں انقلابی تحریک کی ابتدا ہوئی۔

ہندستان کی معتدل رائے فیروز شاہ مہتا اور گوکھلے نے ظاہر کی۔ مقدم الذکر کے خیال کے مطابق "غلط ہو یا صحیح ہم یہ یقین کرتے ہیں کہ ان کارروائیوں کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انصاف پسندی کی جو پالیسی اب تک مسلسل چلی آرہی تھی اس کو الٹ دیا جائے اور اس میں انقلاب لایا جائے یا اگر کل اسی کی زبان استعمال کی جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ تاج برطانیہ کی انصاف پسندی کی مسلسل پالیسی جو ملک کی اچھی حکومت کے لیے اور کبھی نہ بدلنے والے اصول پر مبنی تھی اس کی کبھی اس طرح بالا علان مخالفت نہیں کی گئی تھی جیسی کہ لارڈ کرزن کے نظم و نسق کے زمانہ میں کی گئی"/20

19- Indian National Congress 1905. Resolutions Nos XII and XIII See Indian National Congress (Natesan) Part II. P.P. 118-19.

20- Mody Homi, Sir Pherozshah Mehta Vol II. P. 484.

گوکھلے نے اپنی رائے یہ ظاہر کی کہ "ان کو (لارڈ کرزن) عوام کے عروج کی تمناؤں سے کوئی ہمدردی نہیں ہے اور جب اس کو اپنی کسی رعایا کے لوگوں میں وہ اسے ابھرتا ہوا دیکھتے ہیں تو اسے اپنے ملک کی خدمت سمجھتے ہیں کہ اسے کچل دیا جائے"/ 21

جبر و تعدی من جانب حکومت

انڈیا گورنمنٹ کا پہلا ردعمل تو یہ تھا کہ وہ اس تحریک سے کھیل کرے۔ کیوں کہ وہ انگلستان میں ہراس پیدا کرنا چاہتی تھی۔ 16/ اکتوبر تک اس نے جو کارروائیاں کیں وہ دبی دبی تھیں لیکن جب تحریک پھیلی۔ سودیشی اور بائیکاٹ اثر انداز ہونے لگے اور گورنمنٹ پر حملے زیادہ خوفناک ہوتے تو پالیسی بدل گئی ایک طرف بہت مستبدانہ احکام عمل میں لاتے اور دوسری طرف ایک ٹھوس کوشش اس بات کی ہوئی کہ مسلمان اس تحریک سے علیحدہ ہو جائیں۔

گورنمنٹ کا وزنی ہاتھ اسکولوں اور کالجوں پر گرا حتیٰ کہ قبل اس کہ بمپ فلائڈ (BAMPFYLDE) واقعی طور پر چارج لیں کارلائل (CARLYLE) نے بنگال کے چیف سکریٹری کی حیثیت سے 10/ اکتوبر 1905 کو ایک خفیہ سرکلر تمام ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کو جاری کیا تھا جس میں یہ دھمکیاں درج تھیں کہ سرکاری امداد بند کر دی جائے گی کمیٹیوں کے ممبران اور ٹیچران کو بطور اسپیشل کانسٹبل بھرتی کیا جائے گا اور یونیورسٹیاں اپنا الحاق ختم کر دیں گی۔ اگر اسکولوں نے لڑکوں کو ایجیٹیشن میں حصہ لینے اور خاص طور پر بائیکاٹ کی تحریک میں کام کرنے سے نہ روکا۔/22

جس دن وہ گورنری کی مسند پر جاگزیں ہوئے فلر (FULLER) نے تمام ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کے نام ایک سرکلر جاری کیا جس میں ان ممتاز شہریوں کے نام مانگے تھے

21- Gokhle. G.K. Presidential Address 1905. See The Indian National Congress (Madras Natesan 1917) P. 792

22. Carlyle Circular dated 10 October 1905. Home Deptt, Public. A Progs. June 1906. Nos 169-186.

جو تحریک میں نمایاں حصہ لے رہے تھے دوسرا سرکلر 8 نومبر کو جاری ہوا جس میں اسکولوں کے ارباب حل کو دھمکی دی گئی تھی اور طلبا کو آگاہی دی گئی تھی کہ اگر انھوں نے اس میں حصہ لیا تو وہ گورنمنٹ کی ملازمت کے لیے نااہل قرار دیے جائیں گے دوسرا ایک اور آرڈر 8 نومبر کو جاری ہوا جس میں بندے ماترم کا نعرہ سڑکوں اور پبلک مقامات پر لگانا اور سنکیرتن (ایک مذہبی عبادت) پارٹیوں کا نکالنا بھی ممنوع قرار دیا گیا۔ ایک اور آرڈر میں کسی کو صرف ملک کی بنی ہوئی چیزوں کے استعمال پر مجبور کرنا جرم قرار دیا گیا/23

گویا کہ یہ سختیاں کافی نہیں تھیں، اور زیادہ ہولناک کارروائیاں عمل میں لائی گئیں۔ 5 نومبر کو ایک گورکھا پولیس ملٹری کمپنی باریسال مارچ کر کے پہنچی۔ بعدہٗ گورکھا دوسرے اضلاع میں بھی بھیجے گئے رنگ پور، ڈھاکہ اور نواکھالی اور دوسرے ہائی اسکولوں کے 326 لڑکے جو سولیشی کی میٹنگ میں شریک تھے ان پر یا تو جرمانہ کیا گیا یا اسکولوں سے نکال دیے گئے۔ مداری پور کے طلبا جن سے ایک یورپین ملازم سے جھڑپ ہوگئی تھی ان کو کوڑے لگانے کا حکم ہوا۔ اضلاع میمن سنگھ، سراج گنج (ڈھاکہ) اگر بھوانی پور اور بوڑا میں اسی طرح کے اخلاق سوز احکام جاری کیے گئے۔ گورکھاؤں نے جو سخت مظالم کیے ان کا نوٹس اینگلو انڈین اخبار "اسٹیٹسمین" نے لیا اس نے لکھا کہ "اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کی موجودگی (گورکھا) نے ہندو آبادی کے اندر سخت دہشت پیدا کر دی ہے"/24

امرت بازار پتریکا نے ان وحشیانہ واقعات پر جو مشرقی بنگال کے مختلف اضلاع میں پیش آرہے تھے تنقید کرتے ہوئے لکھا کہ صوبہ میں قانون اور امن کی حکومت کی جگہ پولیس کی حکومت نے لے لی ہے/25

مینچسٹر گارڈین نے رائے ظاہر کی کہ "یہ امر مشتبہ ہے کہ آیا روس بھی اس نفرت

23- Home Deptt, Public A, Progs, June 1906. Nos 169-186.

24- Statesman, 2 December 1905 Cited in Haridas Mukherjee, and Uma Mukherjee. India's Fight for Freedom P 117

25- [illegible] Patrika, 23 December [illegible]

انگریز ظلم کی کوئی مثال پیش کر سکتا ہے" /26

تقسیم بنگال کی مخالفت میں جو تحریک چل رہی تھی اس کے خلاف مسلمانوں کو ابھارنے کے لیے فلر نے صوبہ کا ایک دورہ نومبر میں کیا ہر جگہ انھوں نے ہر ایک کو جو سودیشی تحریک کی حمایت کرتا تھا ڈانٹا اور دھمکی دی کہ اگر انھوں نے اپنی حرکتوں کو بند نہ کر دیا تو تباہ کن نتائج کا ان کو سامنا کرنا پڑے گا/ 27

باریسال کے ہر دلعزیز لیڈر اشونی کمار دت سے کہا گیا کہ بیرونی مال کی خریداری کے خلاف جو اعلان انھوں نے کیا ہے وہ واپس لے لیں ورنہ ان کو ضمانت و مچلکہ کا پابند کیا جائے گا۔/ 28

نیے صوبہ کے لفٹینٹ گورنر نے اپنی کسی ملاقات میں یہ فرمایا کہ میری دو بیبیوں میں مسلمان بیوی میری محبوبہ ہے/ 29

انھوں نے وعدہ کیا کہ وہ مسلمانوں کو خاص طور پر گورنمنٹ کی ملازمتوں میں مراعات دیں گے اور اپنا مخصوص ارادہ ظاہر کیا کہ ان کو سودیشی والنیٹڑوں کی دھمکیوں اور ان کی پریشان کن حرکات سے محفوظ رکھا جائے۔

دسمبر میں ایک دوسرے شہر کے اندر لفٹینٹ گورنر نے گورنمنٹ کی طاقت اور شوکت کے مظاہرے کے لیے پولیس اور مجسٹریٹوں کو کھلی چھوٹ دے دی کہ بلا امتیاز اپنی مرضی کے مطابق عام باشندوں کو جس طرح چاہیں ماریں پیٹیں۔

---

26 - Manchester Guardian, 10 January 1906, quoted in Har Mukherjee and Uma Mukherjee op cit P. 122.

27 - Home Deptt, Public A, Progs june 1906 No 69, Telegram - Mazumder and Chaudhury to Private Secretary to Viceroy of India. 18 November 1905

28 - Ibid

29 - Nevinson, H. W. op cit P. 192 Chief Secretary Lyon's letter of 21. Feb 1906 Contains an oblique reference to the remark

اور باعزت لوگوں کو ذلیل کیا گیا/30

II دوسرا دور

نئے حکمراں دسمبر 1905 کے فوراً بعد قدامت پرست براڈرک (BRODRICK) کے بجائے جان مارلے جو لبرل تھا وزیر ہند مقرر ہوا۔ منٹو اسکاٹ لینڈ کا ایک زمیندار اسپورٹس اور گھوڑ دوڑ کا شیدائی تھا اور ایک مبہم باز سپاہی تھا اس نے ذہین اہل دماغ کرزن کی جگہ لی۔ جس نے اس بنا پر استعفیٰ دے دیا تھا کہ وزیر ہند نے کمانڈر ان چیف کچنر کا گورنر جنرل کے خلاف ساتھ دیا۔ منٹو اگرچہ اس کالر نہیں تھا لیکن وہ ایک ذہین، عملی رجحان رکھنے والا سہل پسند حاکم نظم ونسق تھا جس کے امیرانہ تعلقات لبرل وزیر ہند سے معاملہ کرنے میں مددگار بنے۔

جان مارلے وزیر ہند ایک عظیم علم داں تھا وہ امن کے اصول کا پیرو، انتہاپسند مغرور خود پرست، بلاوجہ شور مچانے والا لیکن اثر پزیر تھا بہت سے تعلیم یافتہ ہندستانی اس کی ستائش کرتے تھے بلکہ ان کو محبوب رکھتے تھے مگر یہ امر مشتبہ ہے کہ آیا نیے ستارے میں اپنی گاڑی کو خیرات کے طور پر لگاتے میں وہ حق بجانب تھے۔ ہندستان پر حکومت کرنے کا اصول مارلے کا یہ تھا کہ "ایک طرف بلا کسی ہچکچاہٹ کے استبداد کو جاری رکھنا اور دوسری طرف مضبوطی اور نیک نیتی سے اصلاح کرتے رہنا" انھوں نے بتلایا کہ برخلاف لارڈ کرزن کے جو اس مکتبہ خیال کے تھے جس کا عقیدہ یہ تھا کہ برطانوی راج کا خاص مقصد نظم ونسق میں اہلیت کا اظہار ہے۔ وہ اگرچہ اہلیت کو نظر انداز نہیں کرتا تھا لیکن وہ اس پر نگاہ رکھتا تھا جسے سیاسی مراعات کہا جاتا ہے/ 31

دوسرے الفاظ میں ان کا عقیدہ یہ تھا کہ ڈنڈے اور گاجر کا عقلمندی سے میل

---

30 - Haridas Mukherjee and Uma Mukherjee op.cit P.123.(extracts from Bengalee and Amrita Bazar Patrika.

31 - Morley's Speech in the House of Commons February 26, 1906.

رکھنا چاہیے وہ زیادہ سود مند ہوگا بہ نسبت صرف ڈنڈے کے۔

سب سے پہلا مرحلہ جو منٹو اور مارلے کے سامنے آیا وہ عام ہندستان کے اندر بے چینی کے نشو ونما کا خطرہ تھا مارلے نے تسلیم کیا کہ تقسیم "مکمل اور فیصلہ کن انداز میں عام باشندگان کی مرضی کے خلاف ہوا ہے" انھوں نے اس تھیوری سے بھی اختلاف کیا کہ جو شورش بپا ہے وہ صرف چند شورش پسندوں اور چند پیچھے سے اکسانے والوں کا کرشمہ ہے لیکن ان کا خیال یہ تھا کہ "بنگال کی تقسیم جدید تو اب ایک امر واقعہ کی شکل اختیار کر گئی ہے اور طے شدہ ہے...... اور یہ بہت ہی نا انسانی کی بات ہوگی کہ گورنمنٹ سے کہا جائے کہ از سر نو کام... شروع کرے اور علاقوں کی جدید تقسیم کرے"[32]

جہاں تک کہ منٹو کا تعلق ہے ہندستان کے حالات کے بارے میں رائے بنانے میں انھوں نے کوئی وقت ضائع نہیں کیا اور انھوں نے شروع میں کانگرس کے معتدل لیڈران سے رابطہ پیدا کیا اور سرکاری افسران سے مسئلہ پر بحث کی اور چند نتائج پر پہنچے انھوں نے خیال کیا کہ ہندستان کے اندر انگریزوں کے سیاسی ادارے کو درآمد کرنا خطرناک ہوگا لیکن انھوں نے اسے تسلیم کیا کہ "وفادار تعلیم یافتہ ہندستانیوں کا یہ حق ہے کہ گورنمنٹ کی ملازمتوں میں ان کو اور زیادہ حصہ دیا جائے" کیوں کہ اگر ہم نے ان کو نظر انداز کیا تو "ہم ان کو اپنے پاس سے بھگا کر کانگرس کے لیڈروں کی گود میں ڈال دیں گے" وہ اس بات پر غور کرنے کے لیے تیار تھے کہ ہندستانیوں کو گورنمنٹ سے اور زیادہ رابطہ قایم کرنے دیا جائے لیکن انھوں نے اس زیادتی کو جو کرزن نے کی تھی منسوخ کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔

گورنمنٹ کی انسدادی کارروائیاں (1906)

منٹو نے جبر وتشدد کے ساتھ مرعات کی پالیسی اختیار کی وزیر ہند اور گورنر جنرل اس امر پر متفق تھے کہ کانگرس کے فارورڈ بلاک کو بڑھنے نہ دیا جائے منٹو

---

32. Morley's speech in the House of Commons February 26, 1906. H.C. Debates 4th Series Vol 125. Col. 844.

کی رائے کانگرس کے بارے میں کچھ متضاد سی تھی۔ ایک طرف تو ان کا یہ خیال تھا کہ کانگرس باشندوں کے اس طبقہ کی نمائندہ ہے جو گورنمنٹ میں بلند مرتبہ حصہ لینے کا کس بل نہیں رکھتے تھے لیکن پھر بھی وہ اسے نظر انداز کرنا نہیں چاہتے تھے کیوں کہ یہ ملک کا ایک مرحلہ تھا۔

دوسرے الفاظ میں مطلب یہ ہوا کہ وہ تعلیم یافتہ طبقہ جو کانگرس کی نمائندگی کرتا تھا سلف گورنمنٹ کے لیے نا اہل تھا لیکن ایک مشاورتی جماعت کی حیثیت سے کار آمد ہے۔ منٹو گوکھلے کو سب سے زیادہ قابل قبول نمونہ کانگرس سمجھتے تھے اگرچہ ان کے خیالات اور ان کے عزائم کو وہ غیر عملی تصور کرتے تھے انھوں نے کانگرس کے لوگوں کو دو صفوں میں تقسیم کیا تھا۔ وفادار اور باغی۔ اول کو تو مراعات سے راضی کیا جائے اور دوسرے کو طاقت سے کچل دیا جائے۔

مارلے بھی کانگرس کو پسند نہیں کرتا تھا انھوں نے شاہزادہ ویلز سے منھوں نے 6-1905ء کے موسم سرما میں ہندستان کا دورہ کیا تھا یہ معلوم کیا تھا کہ یہ ایک بڑی طاقت برائیوں کو لانے کے لیے بن رہی ہے وہ منٹو کی مدد اور معتدلین کے تعاون سے اسے اچھائی کی طاقت بنانے کے خواہشمند تھے۔

اس طرح 1906ء کا سال شروع ہوا۔ کہ بے چینی سے نپٹنے کے لیے ہتھیار تھے بمپ فلائڈ فلر کی مذموم پالیسی سیاسی تحریکات کو دبانے اور اس کے کار کنوں کو ڈرانے دھمکانے کی اور مسلمانوں کو ہندوں کے خلاف اکسانے کی پوری قوت سے جاری تھی۔

بائیکاٹ کی تحریک کو باغیانہ قرار دیا گیا اسے برطانیہ اور مسلمانوں کی مخالفت قرار دے کر پولیس کے ذریعہ اس کے انسداد کی ترکیب نکالی گئی احتجاج اور پروپیگنڈا کے جلسے ممنوع قرار دے دیے گیے۔ اس حکم پر عمل درآمد ہو گیا کہ بندے ماترم کا نعرہ لگایا نہیں جا سکتا اور طالب علموں کو جلسوں اور جلوسوں میں شریک ہونے سے روکا جائے۔

جبر و تعدی اس وقت کمال کو پہنچ گئی جب باریسال کانفرنس (1906ء اپریل) کو زبردستی منتشر کر دیا گیا۔ باریسال اشونی کمار دت کا آبائی وطن تھا جسے انھوں نے

سودیشی اور بائیکاٹ کی تحریک کا گڑھ بنا رکھا تھا اس تجویز نے کہ باریسال کو کانفرنس کی جگہ قرار دی جائے جس میں کلکتہ اور دونوں بنگال کے ڈیلیگیٹ حصہ لیں گورنمنٹ کو ہراساں کر دیا چنانچہ اس نے مجنونانہ احکام جاری کرنے شروع کر دیے بندے ماترم کا نعرہ لگانا ممنوع کر دیا اور پولیس کو راستوں پر متعین کر دیا کہ ڈیلیگیٹوں کے جلوس کو بزور طاقت منتشر کیا جائے جب ڈیلیگیٹوں نے جلوس نکالا تو ان کو پیٹا گیا۔ سورندر ناتھ بنرجی کو حراست میں لے لیا گیا اور ان کو پکڑ کر مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا گیا اور مجسٹریٹ کے خلاف گستاخی کرنے کے جرم میں جرمانہ کیا گیا۔

پولیس کے مظالم کے باوجود کانفرنس ہوئی تجاویز منظور ہوئیں جن میں نوجوان ممبروں کے بہادرانہ کردار کی مدح کی گئی۔ ایک خاص تجویز یہ منظور ہوئی کہ چوں کہ باریسال اب کسی آئینی گورنمنٹ کے تحت نہیں ہے کانفرنس کو اپنی تمام تر توجہ ان مسائل پر مبذول کرنی چاہیے جن کا تعلق تقسیم سودیشی اور قومی ترقی سے ہے اور جن کی کامیابی کا انحصار عوام کی کوششوں پر ہے/33

ڈیلیگیٹوں پر لاٹھی چارج، ممتاز لیڈروں کے ساتھ بدسلوکی اور کانفرنس زبردستی منتشر کرنے کے واقعات غیر معمولی تھے جن سے پورا ملک ہل گیا اور اس کے نتائج بہت دوررس ہوئے۔

ہندستان کا ردِعمل

ملک پر غصہ اور نافرمانی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ بے شمار جلسے فلر کے ظالمانہ برتاؤ کی مذمت کرنے کے لیے کیے گیے اور جن میں یہ مطالبہ کیا گیا کہ ان کو واپس بلا لیا جائے۔ زیادہ تر ترقی پسند لیڈران مثل اسونی کمار دت، بپن چندر پال، برہم بندھب اپادھیا اور آربندو گھوش گولی کی سی تیزی سے امتیاز حاصل کر گیے اور عوام کی نظر میں محبوبیت کا جہاں تک تعلق ہے معتدلین کو ہٹا کر ان کی جگہ لے لی۔

تمام لیڈران نے فلر کی پالیسی کی مذمت کی۔ گوکھلے نے فلر پر الزام عائد کیا کہ

---

33 - Hitavadi 15 April 1906

وہ ایک اونڈسی کھوپڑسی کے آدمی ہیں۔ اور اس بلند جگہ کے لیے قطعی غیر موزوں ہیں جس پر وہ متمکن ہیں انھوں مطالبہ کیا کہ " نہ صرف یہ کہ سرکاری افسران کو سزا دی جاتے بلکہ فلر کو ان کی جگہ سے ہٹا دیا جائے "/ 34

تلک نے لکھا " بنرجی کی گرفتاری ان کے ساتھ جو سلوک کیا گیا اور ان کو جو سزا دی گئی ان سب نے یہ ثابت کر دیا کہ بنگال ایک مرتبہ پھر شائستہ خاں کی حکمرانی کے تحت آگیا ہے۔ گورنمنٹ کے احکام جن میں رائے عامہ کا مطلق لحاظ نہیں کیا گیا ہے ان میں اس اخلاقی قوت کی کمی ہے جس سے تمام قوانین وضع کیے جاتے ہیں "/ 35

امرت بازار پتریکا نے منٹو کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا کہ " مشرقی بنگال کے حکمرانوں نے ملک کے اندر بے اطمینانی کی ایک ایسی آگ جلائی ہے جو محض وحشیانہ طاقت کے استعمال سے بجھ نہ سکے گی "/ 36

انڈین میرر اخبار (The Indian Mirror) نے اس واقعہ کو قانون اور آئین کا دہشت ناک انداز میں نظر انداز کر دینے کے مرادف ہے " لکھا/ 37

لیکن دوسری جانب انتہا پسند لیڈران نے تہدید اور تشدد کی پالیسی کا اس بنا پر خیر مقدم کیا کہ اس نے قوم کی آنکھیں کھول دی ہیں اور خود داری اور مقابلے کے جذبہ کو پیدا کر دیا ہے بی. پی سی پال نے لکھا

" برطانیہ کی حکومت پر قوم کا یہ اعتماد کہ وہ ملک کی نجات دہندہ ہے تقریباً مر چکا ہے اور جس نسبت سے وہ ان بیرونی ایجنسیوں پر جو ان کے اندر کام کر رہی ہیں اعتماد کھوتے جا رہے ہیں اسی نسبت سے ان میں ایک نیا اور بہادرانہ یقین اپنے اندر پیدا ہو رہا ہے "/ 39

34- Gokhle, G. K. Speeches and writings. Vol. II Speech of 5 May 1906. P. 3566

35- Kesari, 17 April 1906.

36- Amrita Bazar Patrika April 19 - 1906

37- The Indian Mirror. April 19 - 1906

38. Bande Matram, 1st October, 1906

ٹیگور نے اپنے جذبات نظم میں ظاہر کیے :-/ 39

جتنا زیادہ وہ اپنی بیڑیوں کو مضبوط کریں گے اتنی ہی زیادہ ہماری بیڑیاں چٹ سے ٹوٹ جائیں گی۔

جتنی ہی زیادہ ان کی آنکھیں سرخ ہوں گی اتنی ہی زیادہ ہماری آنکھیں کھلیں گی"

لیکن اس سال کا سب سے بڑا واقعہ یہ تھا کہ بال گنگا دھر تلک ہندستان کے ممتاز ترین لیڈر کی حثیت سے نمودار ہوتے ان کی روحانی تاثیر سے اور ان کی موجودگی میں کلکتہ میں 8 جون 1906 کو شیواجی کا تیوہار منایا گیا۔ عظیم الشان مجمع اکٹھا ہوا اس میں ہندو مسلمان اور دوسرے فرقہ کے لوگ شریک تھے اور مرہٹہ ہیرو کی مدح میں ٹیگور کے گیت گائے گئے دوسرے اضلاع نے بھی ایسے جوش وخروش سے اس کی تقلید کی کہ مہاراشٹر سے بھی بازی لے گیے۔ بنگال نے تلک کو کل ہندستان کا لیڈر تسلیم کیا۔ 1906 کی کانگرس کی صدارت کے لیے ان کا نام پیش کیا گیا۔ لاجپت رائے جو پنجاب میں آریہ سماجیوں کے لیڈر تھے انھوں نے اور کھپارڈے نے برار سے نئی جماعت کو مزید طاقت دینے اور اس کا اثر بڑھانے کے لیے مسلسل کام کیا۔ وجے راگھواچاریہ دکن میں نیے مکتبہ خیال کا چیمپین تھا

پریس

نئے رسالے اور نئے اخبارات نکلے جن میں نیا جذبہ جھلک رہا تھا اور جو سیاسی کارروائیوں کے نئے طریقوں کی وکالت کرتے تھے ان میں بنگالی زبان کا "یوگنتر" تھا جس کے ایڈیٹر بھوپندر ناتھ دت (جو سوامی وویکانند کے بھائی تھے) اور بریندر کمار گھوش (جو آربند گھوش کے بھائی تھے) اس نے برہم بندھپ اپادھیا نے سندھیا کا جو طریقہ بیرونی تسلط کے خلاف بغاوت کا جذبہ ابھارنے کے لیے چلایا تھا اس سے تعاون کیا۔ لیکن بندے ماترم کا اجرا جس کے ایڈیٹر بپن چندر پال اور آربندو گھوش تھے قومی پریس میں سب طاقتور اضافہ تھا یہ اخبار 5 اگست سے وسط دسمبر تک جاری رہا اور بعد ازاں خفیہ طور پر آربندو گھوش کے زیر ادارت نکلتا رہا۔

---

39. Pal, B.C. Swadeshi and Swaraj. P-161.

ملک کے دوسرے حصوں میں بھی اخبارات جن کا اسی طور کا نقطۂ نظر تھا تلک کے اخبار 'کیسری' اور 'مرہٹہ' اور لالہ لاجپت رائے کا اخبار پنجابی (لاہور) تو پوری قوت سے جدید ترقی پسندانہ نظریات کی مضبوط حمایت کر رہے تھے۔

مزدور

ملک میں جو عام بے چینی پیدا ہوئی تھی اس نے مزدور تحریک کو بھی اکسایا اس صدی کے شروع سالوں سے مزدور کا مسئلہ گورنمنٹ اور عوامی لیڈروں دونوں کی توجہ کا مرکز تھا لیکن دونوں کے مفاد جدا جدا تھے۔ برطانیہ کو تو اس کی فکر تھی کہ برطانوی صنعت کی محافظت ہندستان کی ترقی کرتی ہوئی صنعت اور خاص کر سوتی کپڑوں کی صنعت کے مقابلے میں جیسے سودیشی کی تحریک سے بعد ازاں بڑی مدد ملی' کی جائے۔ ہندستان کے لیڈروں کی خواہش ایک طرف تو یہ تھی کہ ہندستان کے سرمایہ داروں کے مفاد کو محفوظ کیا جائے اور دوسرے جانب یہ تھی کہ مزدوروں کی حالت سدھاری جائے خاص کر ان مزدوروں کی جو یورپین سرمایہ داروں کے تحت کام کرتے تھے۔

اگرچہ انھوں نے ایسے قوانین کے وضع کرنے کی مخالفت کی جیسے کہ مزدوروں کے کام کے گھنٹوں کی تعداد گھٹادی جائے یا یہ کہ عورتوں سے ملوں میں کام نہ لیا جائے یا اور اسی طرح کے دوسرے قوانین جن کا مالکان مل کے منافع پر اثر پڑتا تھا۔ لیکن پیداوار کی صنعتوں چائے اور سن میں مزدوروں کی جو حالت تھی اس کے خلاف پرزور احتجاج کیا۔

لیکن بہرحال مزدور تحریک اپنا اثر محسوس کرا رہی تھی اور تیزی کے ساتھ ترقی کر رہی تھی انتہا پسندوں کے لیڈران اس میں دلچسپی لے رہے تھے بپن چندر پال نے تو 1901 ہی میں مزدوروں کی جانب یہ کہہ کر توجہ مبذول کرائی تھی کہ "ملک کے موجودہ اقتصادی مسائل کے سلسلہ میں یہ مسئلہ ایک عظیم اہمیت کا حامل ہے"[40]

سی۔ سوبرامنیا آئر نے اپنی کتاب (Some Economic aspects of British Rule in India 1903.)

40- New India. 9 September 1901.

(INDIA 1903) میں مزدور کے مسئلہ پر لکھا۔ ستیش چندر مکرجی ڈان سوسائٹی اور میگزین کے بانی اور ایجیٹیشن کے ایک فعال لیڈر نے مزدوروں کی حمایت میں زبردست دلائل پیش کیے انھوں نے لکھا "رعیت اور کاریگروں کا مستقبل میری نگاہ میں کسی شان و شوکت سے خواہ وہ قومی ہو یا بین الاقوامی اور ان کو نقصان پہنچا کر حاصل کی جائے۔ ہمیشہ مقدم رہے گا" / 41

جب تقسیم کے خلاف شورش نے طاقت پکڑی تو بنگال کے کچھ لیڈران نے مزدوروں اور کسانوں کی مصیبت ناک معیشت میں گہری دلچسپی لینا شروع کیا۔ انگلش مین نے لکھا۔ "کچھ بنگال کے وکلا اور دوسرے لوگ جنھوں نے برطانوی مال کے بائیکاٹ کے پرچار میں نمایاں حصہ لیا ہے اب اپنا خالی وقت ایک ادارے کی تعمیر میں لگا رہے ہیں جس کو وہ ٹریڈ یونین کہتے ہیں یہ ٹریڈ یونین ان کام کرنے والوں کے لیے بنائی جارہی ہے جو بڑے بڑے ایسے کارخانوں میں کام کرتے ہیں جو یورپین لوگوں کی ملکیت میں ہیں اور کلکتہ کے قریب جوٹ مل تو خاص توجہ کی جارہی ہے" / 42

ریلوے کے ملازمین میں، اور سن کی ملوں، اور سوتی کپڑے بنانے والی ملوں، اور گورنمنٹ پریس میں اسٹرائک ہوئی پھر 1905 اور 1906 میں اسی قسم کی اسٹرائک بمبئی پریسیڈنسی میں ہوئی اس خلاف میں تلک نے مزدوروں کی اس جدوجہد سے بڑی ہمدردی ظاہر کی ہے جو وہ کام کرنے کے لیے بہتر شرائط حاصل کرنے کی کر رہے تھے۔

جہاں تک کہ پیداوار کے مزدوروں کا سوال ہے بنگال لیڈران مثل بی۔ سی پال نے انڈین نیشنل کانگرس پر زور ڈالا تھا کہ وہ گورنمنٹ کے سامنے یہ پیش کرے کہ 1882 کا (Emigration Act) منسوخ کر دیا جائے کیونکہ اس قانون نے چائے کے کھیتوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی حالت نیم غلامی کی بنا رکھی ہے۔

41- Dawn Vol III, P. 233 (Bipin Chandra The Rise and growth of Economic Nationalism in India P. 790. Note 266).

42- Englishman quoted by Times of India 28 July 1906 (Reisner and Goldberg. Tilak, P. 421.).

ان تمام معاملات میں لیڈران کی غرض یہ تھی کہ تحریک کو عوامی بنایا جاتے جیسا کہ ازبندو گھوش اور تلک چاہتے تھے اگرچہ ان کو صرف معمولی کامیابی ہوئی لیکن انھوں نے بنیاد رکھ دی تھی جس پر گاندھی جی نے اپنی عوامی تحریک کو تعمیر کیا۔

کانگریس

1905ا کا کانگرس کا سشن اس وقت شروع ہوا جب کہ نیا نظام منٹو اور مارلے کا شننرکہ ابھی ابھی شروع ہوا تھا۔ اس سال کے اندر ہندستان کے لیڈروں کی رایوں میں ایک رخ پیدا ہونا شروع ہوا تھا۔ نئی اسپرٹ کے لیڈران مضبوط ارادے کے لوگ تھے بیفلا ئڈ فلر اینگلو انڈین سرکاری اور غیر سرکاری اور ان کی برادری نے ان پر جو ذلت اور اہانت لادی تھی اس سے وہ سخت گھٹن محسوس کر رہے تھے ان کا جذبہ یہ تھا کہ مضبوط جواب دیا جاتے خواہ نتیجہ کچھ ہو وہ چاہتے تھے کہ برطانوی کپڑے کے بائیکاٹ کے ساتھ برطانیہ کے ہر مال کے بائیکاٹ کا اضافہ کر دیا جاتے۔ خاص خاص احکام کی خلاف ورزی کی جاتے یہاں تک کہ مقاومت مجہول تک جایا جاتے۔ جس میں ٹیکسوں کی عدم ادائے گی بھی اگر ضرورت ہو شامل کر لی جاتے ان کی منزل سوراجیہ تھی۔

دوسرے لیڈران انتہا پسندی کے اس رجحان سے گھبرا گئے اور ان کو یہ خوف لاحق ہوا کہ اس سے بڑے خراب نتائج پیدا ہوں گے یعنی کچل دینے والی انسدادی کارروائیاں جو تمام حقیقی معنوں کی سیاسی تحریکات کو ختم کر دیں گی۔ ان لوگوں کی رائے میں عوام کی پسماندگی اور جہالت کی وجہ سے اور اس وجہ سے بھی کہ بیرونی حملہ کی صورت میں ہندستان بے کس ہے برطانیہ کی رہنمائی اب بھی ضروری ہے۔ ان کو امید تھی کہ برطانیہ کی مدد سے وہ ملک کی کمزوریوں کو دور کر سکیں گے اور اس لیے وہ چاہتے تھے کہ برطانوی راج اس وقت تک قایم رہے جب تک کہ ہندستان سلف گورنمنٹ کے قابل نہ ہو جائے اس لیے وہ اس سے بچنا چاہتے تھے جس کا نام وہ ریلیپل رکھتے تھے۔ ان کا یقین تھا کہ اگرچہ ہندستان کے دفتری حکمراں ہمدردی سے خالی ہیں لیکن اگر جمہوریت نواز باشندگان انگلستان سے اپیل کی جاتے تو نتیجہ خاطر خواہ حاصل ہوگا۔ کاٹن نے بمبئی کے اپنے ایڈریس میں کانگرس کو مشورہ دیا تھا کہ وہ انگلستان میں اپنا پروپگنڈہ کرے۔

جب دسمبر 1905ء میں کانگرس کا اجلاس بنارس میں ہوا تو وہاں ڈیلیگیٹوں میں دونوں۔ نقطہ ہائے نظر کی نمائندگی کرنے والے تھے اس سیشن میں ہندستان کی سیاست نے ایک نیا موڑ لیا گوکھلے نے اپنے ایڈریس میں ہندستان کی حالت بیان کرتے ہوئے ۔ موجودہ... دفتری نظام حکومت کے بدترین پہلوؤں کو ظاہر کیا۔ یعنی یہ رائے عامہ کو قطعی نظر انداز کرتا ہے، جو جذبات قوم کو سب سے زیادہ عزیز ہیں ان سے یہ قطعی لاپرواہ ہے اور مغرورانہ حیلہ سازی سے کام لے کر اپنی عقل کو بالاتر بتلاتا ہے اس کے انصاف کی جس سے اپیل کرنا ایک مذاق ہے اور یہ نہایت درجہ سوچ سمجھ کر محکوم کے مقابلہ میں اپنے ملازموں کے مفاد کو ترجیح دیتا ہے"۔/43

انھوں نے مضبوطی کے ساتھ کہا کہ ہندستان میں بے اطمینانی کبھی اتنی زیادہ اور اتنے وسیع پیمانہ پر نہیں تھی جیسی کہ اس وقت جب کہ سابق وائسرائے (کرزن) نے جب عنانِ حکومت اپنے ہاتھ سے چھوڑا"44

اور غم انگیز لہجہ میں پکارا "مفاد عامہ میں دفتری حکومت سے تعاون کو آخری سلام"45/

انھوں نے بنگال کا فیصلہ کرانے کے لیے بائیکاٹ کا حربہ استعمال کرنے کو جائز قرار دیا لیکن آگاہی دی کہ اس کو " انگلستان کے ساتھ جو موجودہ تعلقات ہیں ان کے کسی پہلو کے خلاف" اسے استعمال نہ ہونا چاہیے جہاں تک سودیشی کا تعلق ہے اس کی انھوں نے پرجوش حمایت کی۔ ملک کے سامنے یہ منزل مقصود رکھی کہ ایسے طرز کی سلف گورنمنٹ حاصل کرنا جیسی حکومت برطانیہ کے زیر سایہ خود مختار نوآبادیات میں ہیں اور یہاں تک پہنچنے کے لیے بڑی احتیاط اور عقلمندی سے قدم بڑھایا جائے۔

لالہ لاجپت رائے نے مقاومت مجہول (Passive resistance) کے طریقے کو اختیار کرنے کی وکالت کی۔ انھوں نے کہا کہ "جو طریقہ مکمل طور پر قانوناً جائز آئینی اور

---

43. Gokhale. G.K. Presidential Address 21st Congress Benares, 1905 The Indian National Congress (Natesan) P. 796.

44. Ibid, P. 793.

45. Ibid. P. 797.

حد درجہ مبنی برانصاف ہے وہ طریقہ ہے متاودست مجہول کا" اس طرح ظاہر ہے کہ کانگرس میں ایک ایسی پارٹی ابھر رہی تھی جو جنگ جویانہ پروگرام رکھتی تھی کانگرس کا ایک اہم ریزولیوشن یہ تھا جس میں اس نے اس عزم کا اظہار کیا کہ کانگرس کا کام پورے سال جاری رکھا جائے گا لیکن سودیشی پر جو ریزولیوشن پاس ہوا اس میں بائیکاٹ کا ذکر نہیں تھا کانگرس نے یہ بھی طے کیا کہ ایک وفد گوکھلے اور لاجپت رائے پر مشتمل ہو جو انگلستان اس غرض سے روانہ کیا جائے تاکہ ہندستان کے مسائل میں انگلستان کی دلچسپی کو ابھارے۔

دہشت پسندگان

بیرونی حکومت کے خلاف جو جدوجہد کی جائے اس کا ایک یہ نتیجہ لازمی ہوتا ہے کہ نوجوان کا ایک طبقہ تشدد کرنے کے لیے مشتعل ہو جاتا ہے ہندستان میں جس کو گورنمنٹ نے بے ہتھیار کر دیا تھا اور جہاں انقلاب پسند کھلم کھلا ہتھیار حاصل بھی نہ کر سکتے تھے خفیہ جماعتیں بنائی گئیں تاکہ وہ پلان کو کامیاب بنانے کے لیے عمل پیرا ہوں

افراد اور چھوٹی چھوٹی ٹولیوں نے 1905 کے پہلے بھی اس طریقہ کار کو اپنایا تھا مہاراشٹر برادران "چپ ہے کار" نے رانڈ (RAND) اور رایرسٹ (RYERST) کو گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا اور تلک پر اس کے ساتھ ہمدردی کرنے کا الزام لگایا گیا۔ حب الوطنی کے مقاصد کے حصول میں ایسی عظیم قربانیوں کے لیے اتنی مدح وستائش سے تلک نے کبھی انکار بھی نہیں کیا درحقیقت افضل خاں کے قتل کے معاملہ میں وہ شیواجی کی مدافعت بھی اسی بنیاد پر کرتے تھے اور وہ اس کی تعبیر اس طرح کرتے تھے کہ بھگوت گیتا نے ناانصافی اور خباثت کے خلاف جنگ کرنے کی تعلیم دی ہے

تقسیم کے خلاف شورش میں غیر معمولی جوش وخروش اور گورنمنٹ کی جابرانہ کارروائیوں کے خلاف کٹر غصہ نے زیادہ جوشیلے اور نتائج سے لاپرواہ انتہا پسندوں کو اس حد تک کھینچ لائے کہ وہ تشدد کی راہ سے ترکی بہ ترکی جواب دینے کے لیے آمادہ ہوتے وہ لوگ نہ صرف یہ کہ معتدل لیڈران کو حقارت کی نگاہ سے

سے دیکھتے تھے بلکہ زیادہ متوازن اور حقائق پسند لیڈران مثل بپن چندر پال اور تلک
کو ضرورت سے زیادہ محتاط تصور کرتے تھے۔

باریسال کے واقعہ کے بعد ایسے اعتدال پسند اخبارات جیسے کہ "ہمواد ی" اور
انڈین مرر نے یہ خطرہ ظاہر کرنا شروع کر دیا کہ "آخر کار اسلحہ کا جواب اسلحہ سے
دیا جائے گا اور سفید فام لوگوں کا خون ان بے خبر لڑکوں کے خون کا کفارہ ہوگا"[46]
سندھیا اور یوگنتر نے "خون اور آگ کا پرچار کیا"[47] طاقت کو طاقت کے ذریعہ مقابلے
برندر کمار گھوش، بھوپندر ناتھ دت، اور برہم جدھپ اپادھیا اس دہشت
پسند تحریک کے آتش روح رواں تھے جس نے بنگال میں جنم لیا۔ آربندو گھوش کا
ان تمام کارروائیوں میں کتنا حصہ تھا یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا۔ جہاں
تک اعتقاد کا سوال ہے وہ عدم تشدد پر یقین نہیں رکھتے تھے تقسیم کے پہلے بھی
وہ بنگال آتے تھے تاکہ حالات کا اندازہ کریں اور عمل کا ایک پروگرام بنائیں۔
انھوں نے ۱۹۰۲ میں بڑودہ ریاست کی فوج کے ایک آدمی کو اس غرض سے بھیجا
تھا کہ وہ بنگال کا دورہ کرے اور حالات کے امکانات کا پتہ لگائے۔ ۱۹۰۴ میں ان
کے بھائی ستین کلکتہ پہنچے اور خفیہ انجمنیں بنانے کے لیے لوگوں سے رابطہ پیدا کیا
آربندو جب کلکتہ پہنچے تو یوگنتر گروہ کے وہ مشیر بن گیے، انھوں نے بعد کو خود تسلیم
کیا کہ ان تمام سرگرمیوں کی تنظیم سے ان کا قریبی تعلق اس مقصد سے تھا کہ یہ ایک
کھلی بغاوت کے لیے تیار تھی" دراصل ایک مقاومت مجہول حصول مطلب کے لیے
ناکافی ثابت ہو"[48]

جب سورت میں کانگرس اختلاف کی وجہ سے دو پارٹیاں بن گئیں تو اس کے

---

46 - Hitvadi, 21 April 1906. (Haridas Mukherjee and Uma Mukherjee) op cit. P. 166

47- Ibid. P. 166.

48 - Ghose. A. Aurobindo on himself and on the Mother (Tripathi - Amlesh The Extremist Challenge. P. 135.

بعد ان کو بم تیار کرنے کے خفیہ منظاسہ میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی ۔

دہشت پسندوں میں سب سے اہم جماعت "انوشی لان سمیتی" تھی جس کے مرکز دونوں بنگال میں تھے کلکتہ میں دو دستے تھے ۔ بھوانی پور اور رہوڑا اور کھلنا اور جیسور، مدناپور اور گمٹی دوسرے اضلاع میں دوسرے مرکز تھے مشرقی بنگال میں ڈھاکہ خاص مرکز تھا اور اس کی شاخیں میمن سنگھ اور بہت سے دوسرے مقامات پر تھیں ۔

'انوشی لان سمیتی' بہ ظاہر تو ایک ایسی جماعت تھی جس کی غرض سماجی فلاح کا حصول اور جسمانی ورزشوں کی ترقی تھی لیکن اصل ڈکیتی اور قتل سے حکومت کے نظم و نسق کو مفلوج کر دیتا تھا/49

اس کا جال ایک وسیع رقبہ پر پھیلا ہوا تھا اور اس کے مداح اور شریک کار ۔ ہندستان کے بہت سے حصوں میں تھے دہشت پسندانہ کارروائیوں کی نشو و نما ۔ افسوس ناک تھی لیکن اس وقت کے حالات میں ناگزیر تھی ۔ ان کی حرکات سے بہت سے ہندستانی غم زدہ تھے اور تکلیف محسوس کرتے تھے ۔ لیکن نوجوان کھلم کھلا اور زیادہ پرائیویٹ طور پر دہشت پسندوں کی حب الوطنی، ہمت، اور بے باکی کی مدح سرائی کرتے تھے ان کے کارناموں نے برطانوی راج کے خلاف نفرت پھیلادی، اور آزاد ہونے کے عزم کو مضبوط کیا ۔

لیکن دہشت پسند تحریک نوجوان کے ایک چھوٹے سے طبقہ تک محدود تھی یہ ہچکچاہٹ کے ساتھ شروع ہوئی تھی لیکن اس نے تیزی سے قوت پکڑ لی جس طرح تقسیم کے خلاف تحریک زیادہ وسعت اختیار کرتی رہی اور زیادہ خطرناک ہوتی گئی گورنمنٹ کی اس کو دبانے کی کارروائیاں زیادہ شدت اختیار کرتی گئیں نتیجہ یہ ہوا کہ جو طبقہ تشدد پر اعتقاد رکھتا تھا وہ جوانوں کے نزدیک زیادہ قابل قبول

---

49. Tripathi Amlesh The Extremist Challenge in Appendix Ca lable is given of terrorist outrages in Bengal on J.C Nixon's Index on outrage Vol IX, 1917.

تھا۔ ۱۹۰۵ء میں انقلاب کا جال بنگال اور دوسرے صوبوں میں پھیل گیا۔

III تیسرا دور

ایک طرف تو پبلک جلسوں اور پریس کے ذریعہ پروپگنڈہ کا پر زور عمل جاری تھا اور عظیم الشان جلوس حب الوطنی کے جذبات کو بھڑکا رہے تھے دوسری طرف ایک تعمیری پروگرام جو زیادہ ٹھوس اور پائدار قسم کا تھا اسے جاری کیا گیا تاکہ حکمرانوں پر ایک منظم دباؤ ڈالا جا سکے مقصد دو تھے معاشی اور سیاسی اس نے برطانیہ کے لوگوں کو آگاہی دی کہ ان کے اقتصادی مفادات سخت خطرے میں مول گے مگر انھوں نے ہندستان کے اپنے حکمراں گماشتوں کو ہندستان کی رائے عامہ کو ٹھکرانے کی اجازت دی اور اگر پارلیمنٹ آزاد تجارت کی اپنی پالیسی قایم رکھنے پر مصر رہی جو ہندستان کی اقتصادیات کے لیے مضر ہے اور اگر انڈیا گورنمنٹ لنکا شائر کے کارخانوں کے مالکان کی ماتحتی کا کردار ادا کرتی رہی اس کا دوسرا مقصد دیسی صنعت کی محافظت کرنا اور اس کو طاقت پہنچانا تھا کیوں کہ گورنمنٹ ایسا کرنے میں ناکام ہو چکی تھی۔
پروگرام کے تین پہلو تھے۔ سودیشی، بائیکاٹ، اور قومی تعلیم کی نشوونما تاکہ اپنی قومی تاریخ اپنے کلچر پر فخر پیدا ہو خوداعتمادی، حب الوطنی اور آزادخیالی پیدا ہو۔

سودیشی

سودیشی اور بائیکاٹ کی تحریکات کی ایک طویل تحریک ہے جو تین دور سے گزری پہلا دور جو انیسویں صدی کے وسط میں کسی وقت سے شروع ہوتا ہے اس زمانہ میں سودیشی کا خیال ابھر رہا تھا سودیشی کے پیغام کا پرچار سب سے پہلے مہاراشٹر میں 'لوکا ہتاوادی' نے اخبار 'پربھاکر' کے کالموں میں کیا بنگال کے اندر 'ہندو میلا' نے ایک ایسا پلیٹ فارم مہیا کیا جہاں سے بنا گوپال مترا، اور راج نرائن بوس بیرون ملک کے اشیا کے بجائے دیسی بنی ہوئی اشیا کے استعمال کی وکالت کرتے تھے۔ دادابھائی نوروجی مہندالک، رانا ڈے، جی۔ وی۔ جوشی اور تلک نے مغربی ہندستان میں بھولاناتھ چندر سورندرناتھ بنرجی کے۔ کے مترا اور دوسرے لوگوں نے بنگال میں۔ مدن موہن مالویہ

مرلی دھر اور آریہ سماج کے لیڈران شل سین داس نے شمالی ہندستان میں تحریک کو اپنی حمایت کے ساتھ پیش کیا۔ 1870 سے 1896 تک سودیشی کا پروپیگنڈہ اخبارات اور عوامی جماعتوں مثلاً سارا جنگ سبھا، پونا، انڈسٹریل ایسوسی ایشن، اور صوبائی کانفرنسوں کے ذریعہ تمام ہندستان میں پھیل گیا۔ سوسائٹیاں اور جماعتیں وجود میں لائی گئیں تاکہ برطانیہ کے بنے ہوئے سوتی کپڑوں کے بائیکاٹ کو منظم کیا جائے جس میں عوامی لیڈروں کے علاوہ طلبا نے عملاً دلچسپی لی۔ اس تحریک میں زبردست حرکت 1906 میں اس وقت پیدا ہوئی جب مینچسٹر کے اشارے پر ہندستان کے سوتی مال پر تلافی محصول لگا دیا گیا۔ 1896ء میں تلک نے مہاراشٹر کے لوگوں کو پورے جوش سے پکارا کہ وہ سودیشی اور بائیکاٹ پر عمل درآمد کرتے رہیں۔ 1897 میں ٹیگور نے ایک سودیشی کی دوکان کھولی۔ 2-1901 میں جوگیش چندر چودھری جو ایک وکیل تھے انھوں نے کلکتہ میں جو انڈین نیشنل کانگرس کا اجلاس ہوا اسی کے ساتھ دیسی ایشیا کی پہلی صنعت کی نمائش کا انتظام کیا۔ بیمن سنگھ اور قاسم بازار کے مہاراجہ ستیا ناتھ رائے ایس چودھری اور دوسرے لوگوں نے کلکتہ میں ایک سودیشی اسٹور کھولا۔ 1902 میں سورندرناتھ بنرجی نے احمد آباد کے اپنے صدارتی خطبہ میں یہ تجویز کیا کہ "چونکہ گورنمنٹ نے محصول لگا کر ہندستان کی صنعت کی محافظت کرنے سے انکار کر دیا ہے ہندستانیوں کو چاہیے کہ وہ دیسی مال کے استعمال کا عزم کر لیں تاکہ ہندستان کی صنعت کو حرکت میں لایا جا سکے"۔[50]

پنجاب میں آریہ سماج نے زوردار طریقہ پر ہندستان کے کلچر کے دوبارہ زندہ کرنے کا پرچار کیا اور ہندستان کی اقتصادی اور سیاسی نئی زندگی کی حمایت کی ان کے پروپیگنڈہ کا ایک حصہ سودیشی تھا۔

1905 میں تقسیم بنگال نے تحریک کے خیالات اور اس کے عمل درآمد کے رویہ کو بہت زیادہ وسعت دے دی۔ ٹاٹا نے سودیشی کی تحریک سے اپنا ناطہ جوڑ لیا اور پیشہ ور طبقہ نے اپنا سرمایا سودیشی تحریک کی مہم میں لگایا۔ گاندھی جی نے 1908ء میں کہا تقسیم کے بعد لوگوں کو یہ نظر آیا کہ عرض داشتوں کی پشت پر طاقت کا ہونا ضروری ہے

---

50 - Report of the 18th Indian National Congress Ahmedabad 1902. P.4.

اوران میں تکلیف اٹھانے کی اہلیت ہونی چاہیے۔۔۔۔بائیکاٹ اور سودیشی کی تحریک کا آغاز ہوا51
تحریک محض اقتصادی نہ تھی بلکہ یہ بڑھ کر ایک سیاسی حربہ کی شکل اختیار کر
گئی تھی اور جو اور بھی زیادہ قابل لحاظ ہے۔بہت جلد یہ ہندوستان کی سیاسی آزادی
کی تمنا بن گئی اور اس نے اس بات کا مظاہرہ کیا کہ ہندوستان اپنی قومی وحدت
او ۔ اپنی خود اعتمادی کے حصول کا بالجزم ارادہ کرچکا ہے اس نے اس بات کو دریافت
کیا کہ ایام ماضی میں وہ کون سی چیز تھی جو مختلف کلچروں کی تنظیموں میں باہمی ربط پیدا
کرتی تھی اور مختلف جماعتوں کو ایک لڑی میں باندھنے کے لیے حال میں وہ کون سا دھاگا ہے
رابندرناتھ ٹیگور، بپن چندر پال، آربندو گھوش بنگال میں اور تلک اور لاجپت
رائے مغربی اور شمالی ہندوستان میں اس وسیع تر سودیشی تحریک کے روشن مینار سے
اور بادی تھے ٹیگور نے 22 جولائی 1904 کو ایک میٹنگ میں جو آرسی دت کی صدارت
میں ہوئی سودیشی سماج پر ایک مقالہ (ESSAY) پڑھا جو حلف اس مضمون میں درج
کی گئی تھی اس سے اس کے اغراض و مقاصد کا پتہ چلتا ہے/52

(1) ملک کی ضروریات کو کو ملک کے لوگوں کی کوششوں سے پورا کیا جائے۔

(2) قوم اپنی ذمہ داریوں کو اپنے ہی کندھوں پر اٹھائے۔

(3) ہندوستان کی تمام کارروائیاں صرف ہندوستانیوں کی ایجنسی سے انجام پائیں
اوران معاملات میں بیرونی امداد لینے سے انکار کر دیا جائے۔

(4) بیرون ملک کے بنے ہوئے کپڑوں اور دوسرے مال کے استعمال سے
پرہیز کیا جائے۔

(5) انگریزی زبان میں اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو خطوط لکھنے سے گریز
کیا جائے انگریزی مال، انگریزی فرنیچر، انگریزی موسیقی، انگریزی شراب
سے اور انگریزوں سے دوستانہ رابطہ قائم کرنے سے احتراز کیا جائے۔

(6) ہندستانی اسکول قایم کیے جائیں۔

51- Gandhi, M.K. Hind Swaraj (1958 edition) PP. 25-26.

52- Varma Devajyoti Rabindranath PP. 32-33.

(7) تنازعات کے فیصلے بلا ان عدالتوں میں گیے کیے جائیں جو برطانوی راج نے قایم کیے ہیں ۔

بائیکاٹ

سودیشی تحریک پروگرام کا شت حصہ تھی اور بائیکاٹ اس کا باغیانہ اور متحرک پہلو تھا بائیکاٹ کا استعمال گورنمنٹ کے راتے عامہ کو حقارت سے نظر انداز کرنے اور یہ کہنے کی بنا پر کہ یہ صرف ہندوؤں کی رائے ہے کیا گیا تھا جب 1905 میں تقسیم کا اعلان ہوا تو فوراً اس کا ردعمل ہوا اور باریسال کے اخبار" نباسی" اور کلکتہ کے "سنجیونی" نے بائیکاٹ کے چیلنج کا پانسہ پھینک دیا کلکتہ کی 7 اگست کی میٹنگ میں جس میں ہزاروں آدمی شریک تھے بائیکاٹ کا حلف لیا گیا تھا ۔

اس کے بعد شورش تمام بنگال میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ ہندستان کا کل پریس تقسیم کے خلاف بلند آواز سے احتجاج کر رہا تھا اور بائیکاٹ کی تائید کرتا تھا بنگال کے تمام حصوں میں جلسے کیے گیے جن میں عظیم الشان مجمع ہوتے اشتعال اس قدر زیادہ کہ کچھ لوگ سچ اور جھوٹ میں فرق کرنا بھول گیے ان لوگوں نے یہ کہہ کر بیرون ہند کے شکر کی منت کی کہ خون اور ہڈی ملی ہوئی ہے ۔ اور نمک کی مخالفت اس بنا پر کیا کہ یہ گائے کے گوشت میں لپٹ کر آتا ہے ۔ بیرون ملک کے کپڑے سگریٹ اور دوسری چیزوں کو سٹر کو سپرد آتش کیا گیا ہر طبقہ کے لوگوں نے تحریک میں شرکت کی ۔ زمینداروں نے اپنے گماشتوں کو کسانوں کے پاس اس لیے بھیجا کہ ان کو بیرون ملک کا کپڑا استعمال کرنے سے روکا جائے زمین داروں کی ایسوسی ایشن نے مارواڑی تاجروں کو اس بات پر راضی کرنے کی کوشش کی کہ وہ مینچسٹر کے کپڑوں کا روزگار بند کر دیں ۔ مذہبی اور سماجی دباؤ بائیکاٹ کی ترقی کے لیے ڈالا گیا ۔ سنتی پور اور نوادیپ کے برہمن پروہتوں کو بائیکاٹ کی حمایت پر آمادہ کر لیا گیا ان لوگوں نے ان لوگوں کے ہاں جو بیرون ملک کا کپڑا یا بیرون ملک کی چیزیں استعمال کرتے تھے مذہبی مراسم ادا کرنے سے انکار کر دیا پیشہ ور حضرات جیسے ڈاکٹر ، وکلاء ، اور ٹیچر ان ان لوگوں کا کام کرنے سے منکر ہو گیے جو تحریک میں شریک نہیں ہوتے تھے ۔ حتیٰ کے مزدوروں ، حجاموں اور دھوبیوں نے بھی ان کے یہاں کام کرنا چھوڑ دیا ۔ اس بات کی کوشش

کی گئی کہ سادھوؤں، مذہبی گداگروں اور سنیاسیوں کو ہندستان کے مال کے استعمال سے پرچار کے لیے راضی کیا جاتے کالی کے مندروں میں جلسے ہوتے تھے اور لکچر دیے جاتے تھے۔ حلف لی جاتی تھی کہ بیرون ملک کے تاجروں سے سامان نہیں خریدیں گے/53

ایس، این بنرجی نے لکھا" مذہبی پیشواؤں کی مدح سرایانہ منظوری کی مہرثبت کیے ہوتے، مقدس مندروں میں پاکیزہ ترین مذہبی مراسم سے تقدیس کا جامہ پہنے، اور جس کو ہزاروں ہندستانیوں کی سنجیدہ حلف کے ساتھ رضامندی حاصل تھی۔ سودیشی تحریک ایک پاک مقصد بن کر آگے بڑھی/54

تحریک کے سب سے زیادہ پرجوش کارکن اسکولوں اور کالجوں کے طلباء تھے۔ سوسائیٹیوں (سمیتیوں) نے والنیٹروں کی فوج پیکٹنگ کرنے اور پروپیگنڈا کرنے کے لیے تیار کیا جس میں زیادہ تر تعلیمی درس گاہوں کے نوجوان تھے۔

1905 اکے پوجا کے دنوں میں انگریزوں کے بناتے ہوتے کپڑوں کی خریداری پر اثر پڑا مارواڑی تاجروں نے مینچسٹر کے چیمبر آف کامرس سے اپیل کی کہ وہ گورنمنٹ پر اثر ڈالے کہ تقسیم کو منسوخ کر دیا جاتے لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ آٹھ اضلاع جیسور بوگرہ، ڈھاکہ، نادیا، بردوان، مالدہ، آرہ، اور ہزاری باغ میں کپڑے کی خریداری جو ستمبر 1904 میں 77،000 روپیہ تھی وہ ستمبر 1905 میں گھٹ کر 10،000 رہ گئی/55

پارٹیوں، شادیوں کے مراسم اور مورتیوں پر چڑھانے کے لیے بیرون ہند کی اشیاء حرام قرار دے دی گئیں تھیں۔ گاؤں میں چرخے تقسیم کیے گیے تاکہ کپڑا بننے کی صنعت کو دوبارہ زندہ کیا جاتے۔ مل کی صنعت پر اثر معقول تھا۔ مشرقی بنگال میں 1905۔6 میں ان الیکٹریوں کے علاوہ جو پہلے سے کام کر رہی تھی گیارہ کا اور اضافہ ہوا اور بیرونی ملکوں سے درآمد ٪ کا فیصدی گھٹ گئی اور لیورپول کے نمک

---

53. Home Dept. Public A. Progs June 1906. No 177 and also Home Dept Public A. October 1907. Nos 50-60.

54. The Bengalee 3 October, 1905.

55. The Statesman, September, 1905.

میں ۶٫۰۰۰ ٹن کی کمی ہوئی یہی حال بیرونی شراب کا ہوا/ 56

لندن کے اخبار "ٹائمز" نے مئی ۱۹۰۷ کے سوتی کپڑوں کے انگلستان سے برآمد پہ تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ "ہندستان نے ۴۴,۴۲۹,۵۰۰ گز کم لیا"/ 57

جہاں تک کہ دیسی بنے ہوئے کپڑوں کا تعلق ہے مانگ اتنی زیادہ تھی کہ ان جولاہوں کی آمدنی جو پچھر کی (شلنگ) سے کام کرتے تھے بڑھ کر ۲۰/ ہوار ہو گئی یعنی اس طبقہ کی جو کمائی اب تک تھی اس کی دوگنی ہو گئی/ 58

۱۹۰۶ کی انڈسٹریل کانفرس میں اس کے پریسیڈنٹ نے بتلایا کہ احمد آباد اور بمبئی میں ۲۲ سوت کی ملیں اور پندرہ بینک تقریباً چار کروڑ روپیہ کے سرمایہ سے اور پانچ جہاز رانی کی کمپنیاں جن کا راس المال سوا کروڑ روپیہ ہے قایم کی گئی ہیں"/ 59

لیکن تحریک نے جو محرکات مل کی صنعت کے لیے پیدا کیے وہ ان سے بہت زیادہ مختلف تھے جو اس نے کرگھا کی صنعت کے لیے کیا جیسا کہ حسب ذیل نقشہ سے ظاہر ہوگا/ 60

سال	مل (گز)	کرگھا (گز)	درآمد
1896-7 — 1898-9	295 ملین	996 ملین	191 ملین
1906-7 1908-9	،، 667	،، 1,072	،، 2,154
1916-7 1918-9	،، 1301	،، 720	،، 1,397

56- Nevinson H. W. Op. cit. P. 180.

57- Ibid. P. 181.

58- Lord Revenue Administration Report of the Lower Provinces (1906-7) Cited ibid 180.

59. Report of the Third Industrial Conference. P. 28-29.

60. Mehta, S. D. Indian Cotton Textile Industry PP. 136 and 140.

کرگھا صنعت جولاہوں کے آبائی پیشہ سے تعلق رکھتی تھی اور اس میں منافع حاصل کرنے کی صفت برائے نام تھی اس کے بنے ہوتے کپڑے یعنی موٹے سادہ خاکستری رنگ کے صرف مقامی بازاروں میں بک سکتے تھے اور دیہات کے غریب لوگوں کی ضروریات کو پورا کرتے تھے ان کی خوبی صرف یہ تھی کہ یہ سستے تھے اور مقامی طور پر دستیاب ہو جاتے تھے لیکن ملک کی بڑھتی ہوئی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے یہ مل کی صنعت کا مقابلہ کپڑے کی سپلائی میں نہیں کر سکتی تھی لیکن ہندوستان کی مل کی صنعت نے جو سیاسی ابال جو سیاسی مال کی موافقت میں آیا تھا اس سے پورا فائدہ اٹھایا اور تیزی کے ساتھ آگے بڑھنا شروع کیا تا آنکہ اس نے ہندوستان کے بازاروں سے مینچسٹر کے کل مال کو تقریباً نکال کر اس کی جگہ خود لے لیا۔

لیکن بہرحال اگرچہ سودیشی کی تحریک کو ہر چہار جانب سے حمایت حاصل ہوئی حتیٰ کہ گورنمنٹ کے کچھ افسران بھی اس کے حامی ہوئے۔ بائیکاٹ کو لوگ خطرے کی نگاہ سے دیکھتے تھے 1905ء کے کانگرس سیشن میں صدر نے ایک احتیاطی آگاہی دی اور بائیکاٹ کو ایک انتقامی جذبہ دوسروں کو نقصان پہنچانے کی غرض سے" قرار دیا۔ مدن موہن مالویہ اور دوسرے اعتدال پسند لیڈران نے لاجپت رائے اور بنگال کے کچھ لیڈران کی اس تجویز کی مخالفت کی کانگرس بائیکاٹ کا ریزولیوشن منظور کرے۔ اس ناکامی سے بڑے افسوسناک نتائج پیدا ہوئے کیونکہ اس نے اعتدال پسندوں اور انتہا پسندوں کے بیچ اختلاف کی جو خلیج تھی۔ اس کو وسیع تر کر دیا اور آخر کار اس کا انجام یہ ہوا کہ 1907ء میں کانگرس دو ٹکڑوں میں بٹ گئی۔

انڈین نیشنل کانگریس اور سودیشی بائیکاٹ تحریک

بعد کے سالوں میں سودیشی۔ بائیکاٹ کی تحریک کا جوش کم و بیش ہوتا رہا۔ 1906ء میں یہ اپنے عروج پر تھی کانگرس کے جو اجلاس 1906ء میں کلکتہ کے اندر ہوا اس نے یہ تسلیم کیا کہ یہ قوم کی مرضی کا اظہار ہے۔ لیکن وہ سیاسی لیڈران جو انگلستان کی لبرل گورنمنٹ سے ہندوستان کے مطالبات پر ہمدردانہ عمل کی امید رکھتے تھے اس بات پر ہراساں تھے کہ کہیں بائیکاٹ گورنمنٹ کے رویے کو سخت اور اصلاحات کے مخالفین

کے ہاتھوں کو مضبوط نہ کر دے ان لوگوں نے بائیکاٹ کے ریزولیوشن کے منظور ہونے کی مخالفت کی۔ اس امکان کو دور کرنے کے لیے کہ کہیں انتہاپسند طبقہ کانگرس کو اپنی مرضی کے مطابق متاثر نہ کرے اور اس طرح اس ادارہ پر غلبہ حاصل کرے اور اس لیے بھی کہ انتہاپسندوں کو یہ موقع نہ حاصل ہو جائے کہ وہ اپنے پروگرام پر کانگرس کو پابند کریں انھوں نے ہندستان کے عظیم الشان مرد پیر دادا بھائی نوروجی کو جن کو تمام پارٹیاں عزت کی نگاہ سے دیکھتی تھیں اس سیشن کی صدارت کی دعوت دی مطلب یہ تھا کہ وہ اپنے اعزاز واکرام کو استعمال کر کے انتہاپسندانہ شوروں کی روک تھام کریں۔

لیکن انتہاپسند لیڈروں نے اپنے پروگرام کے منظور کیے جانے پر اصرار کیا۔ کانگرس کی مجلس انتخاب مضامین میں گرما گرم بحث کے بعد کھلے اجلاس میں ریزولیوشن باہمی مصالحت سے منظور ہوا اس نے اعلان کیا کہ "بائیکاٹ کی تحریک جو بنگال میں تقسیم کے خلاف احتجاج کے طور پر شروع کی گئی ہے وہ جائز تھی اور جائز ہے" سودیشی کے لیے کانگرس کی تائید زیادہ واضح تھی اس نے یہ منظور کیا کہ دیسی صنعتوں کی نشوونما کو "کچھ قربانی دینے کی ضرورت پڑے تو اس کو بھی دے کر" فروغ دیا جائے

دادا بھائی نوروجی نے دونوں پارٹیوں کو خوش کرنے کی کوشش کی۔ وہ ملک کو ایک قدم اور آگے خطبہ صدارت میں یہ کہہ کر لے گئے کہ ہندستان کی جدوجہد کا مقصد سوراج ہے۔ اعتدال پسندوں نے یہ سمجھا کہ اس سے مراد اس طرز کی حکومت ہے جو زیر سایہ برطانیہ نو آبادیات میں رائج ہے اور انتہاپسندوں نے اس کا مطلب یہ سمجھا کہ سلف گورنمنٹ مملکت برطانیہ کے اندر اگر ممکن ہو تو اور اس کے باہر اگر ضروری ہو۔

کانگرس کی دونوں پارٹیوں نے سوراج، سودیشی اور بائیکاٹ کے الگ الگ ایک دوسرے سے مختلف معنی لگاتے اور 1906 اور 1907 کے واقعات نے دونوں کے درمیان خلیج کو وسیع تر کر دیا اعتدال پسند سودیشی کے اقتصادی پہلو پر زور دیتے تھے اور بائیکاٹ اور ایک عارضی طریقہ تصور کرتے تھے جسے احتیاط کے ساتھ استعمال کرتا تھا اور صرف تقسیم کو منسوخ کرانے کے لیے انتہاپسندوں کی راتے میں سودیشی اور بائیکاٹ دونوں سیاسی جنگ کے مخصوص حربے ایک ایسی قوم کے لیے تھے

جس سے اسلحہ چھین لیا گیا ہے اور جس کو ایک اسلحہ سے لیس شہنشاہی طاقت کا مقابلہ کرنا ہے ان کے نقطہ نظر کے مطابق تحریک پر فیصلہ صرف اقتصادی نتائج کی بنا پر نہ صادر کرنا چاہیئے۔ بلکہ یہ دیکھنا ہے کہ یہ قومی خودداری اور خوداعتمادی کے بیدار کرنے میں موثر ثابت ہوتی ہے۔

تحریک نے گورنمنٹ کے لیئے ایک نئی صورت حال پیدا کردی اس نے حکمرانوں کے وقار کو ٹھوکر ماری گورنمنٹ کے ایک نوٹ میں یہ فریاد درج تھی کہ " بنگالیوں کا عام رویہ مغرورانہ اور جارحانہ ہوگیا ہے "۔ 61/

گورنمنٹ کا ردعمل

گورنمنٹ کا انتقامی مقابلہ پبلک کے ابال کے خلاف کرزن ہی کے زمانہ میں شروع ہوچکا تھا اس کے خاص آلہ کار اس کے جبر واستبداد کی پالیسی کو چلانے کے لیے " بمپ فلائڈ فلر" نئے صوبہ مشرقی بنگال وآسام کے لیفٹیننٹ گورنر تھے اور فلر کا خیال تھا کہ گورنمنٹ کی کسی طرح کی مخالفت کو باغیانہ تصور کیا جائے اور طاقت کے زور پر بے رحمی سے اسے کچل دیا جائے ہندستان میں منٹو کے گورنر جنرل کا عہدہ سنبھالنے اور اس کے بعد ہی مارلے کا وزیر ہند مقرر ہونے سے اس پالیسی میں کچھ اعتدال پیدا ہوا۔

منٹو اور مارلے دونوں کو یہ یقین تھا کہ صرف جبر واستبداد ہندستان کے اندر جو بے چینی پھیلی ہوئی ہے اسے دبانے کے لئے کامیاب ثابت نہیں ہوگا ایک دورخی حملے کی ضرورت ہے پہلے یہ ضروری ہے کہ سوسائٹی کے وہ تمام عناصر جن کو اس نیشنلسٹ گروہ سے حکمت عملی سے نکالا جاسکتا ہے جو تیزی کے ساتھ سیاسی ترقی چاہتے ہیں اور خوداعتمادی کا پرچار کررہے ہیں۔ان کو مختلف قسم کی ترغیبات سے ان کی وفاداری کو یقینی بنایا جائے۔منٹو کا یہ پختہ خیال تھا کہ پبلک کا وہ حصہ جو کانگرس کی

61- Report ..... of Police Bengal 2nd December 1905

نمائندگی کرتا ہے گورنمنٹ میں کبھی بھی قائدانہ عملی حصہ لینے کا اہل نہ ہوگا۔ لیکن وہ یہ بھی سوچتے تھے کہ "یہ سب سے بڑی غلطی ہوگی کہ کانگرس کو قطعی نظر انداز کر دیا جائے۔/62

اس لیے ان کا ارادہ تھا کہ ایسے لیڈران جیسے ایس۔ این بنرجی موتی لال گھوش اور گھوکھلے جو کانگرس کے اعتدال پسند بازو کے لیڈر رکھتے ان سے رابطہ قائم رکھا جائے اس مقصد کے پیش نظر انھوں نے مراعات کا ایک پلان بنایا۔

اس کے خلاف دوسرے رخ کی پالیسی یہ تھی کہ مسلمانوں کو راضی کرکے اور برطانوی راج سے ان کی وفاداری میں جوش پیدا کرکے اور ان قوم پسندوں سے جو دستوری تبدیلیاں چاہتے ہیں اور تقسیم بنگال کو منسوخ کرانا چاہتے ہیں ان کی ہمدردی کو ہٹا کر کانگرس کو مضحکہ خیز بنا دیا جائے۔

جہاں تک تقسیم کا تعلق ہے منٹو نے 12 جولائی 1906ء کو انڈین ایسوسی ایشن کے ایڈریس کے جواب میں تقریر کرتے ہوئے اس معاملے پر اپنے پیش رو کی پالیسی کو بدلنے سے مضبوطی کے ساتھ انکار کر دیا اس اعلان کی غرض مسلمانوں کو خوش کرنا تھا کیونکہ انھوں نے یہ خوب سمجھ لیا تھا کہ دستوری اصلاحات کو آگے بڑھنے سے اگر کوئی چیز روک سکتی ہے تو وہ دونوں فرقوں کے درمیان اختلاف کو برابر قائم رکھنا ہے۔

اس پلان کی کامیابی کو یقینی بنانے کے لیے یہ ضروری تھا کہ نیشنلسٹ طاقتوں میں پھوٹ ڈال دی جائے تاکہ اعتدال پسندوں کی مخالفت کند ہو جائے۔ بلالحاظ اس پالیسی کے جو مسلمانوں کے لیے اختیار کی گئی ہے اس کے علاوہ ہندستان کے شورش پسندوں کو مبہم اصلاحات کے وعدوں کا سبز باغ دکھا کر اور اس سے ان کو بہکا کر ایک قدم ان کے خیالات پر ضرب لگانے کے لیے اٹھایا گیا۔

فلر کا استعفیٰ

بمپ فلائڈ فلر، اس دورُخی پالیسی کا جو انسداد مثبت اصلاحات سے بنائی گئی تھی اپنے کو تخریب کار ثابت کر رہا تھا اس نے مشرقی بنگال کے تشدد کو بے لگام چھوڑ دیا تھا معزز لیڈروں کی ذلت واہانت کرتا تھا، بے رحمی سے ٹیچروں اور طالب علموں کو سزائیں دیتا تھا حتیٰ کہ ان کو کوڑے تک لگواتا تھا علاوہ اس کے ان

62- Morley Papers. Minto to Morley 2th April 1906

پر جمہا نے کرتا تھا اور بہتوں کو رسٹی کیٹ کر دیا گیا۔ اس کو ہٹانے کے لیے بلند بانگ مطالبے شروع ہو گیے تھے۔ گوکھلے نے انگلستان میں احتجاجی جلسوں میں تقریریں کیں اور زور دے کر کہا کہ "اس وقت تک اس کی امید کرنا فضول ہے جب تک کہ ان کو اپنے فرائض سے سبکدوش نہ کر دیا جائے" 63/

منٹو پریشان ہو گیا اس نے مارلے کو لکھا کہ "فلر کے کارنامے جو اس تک پہنچے ہیں ان سے وہ کسی طرح خوش نہیں ہوا ہے" 64/

مارلے نے اتفاق کیا اور جواباً لکھا کہ "فلر کے بیانات میں مجھے ایک عاقلانہ پالیسی کی احمقانہ تشریح کے سوا اور کچھ نہیں ملتا ہے۔ تقسیم ایک ناگوار گولی تھی جسے فلر نے ایک سوہان روح کپڑے سے ملمع کر دیا ہے" 65/

فلر کو وارننگ دی گئی لیکن کوئی چیز ان کو ناعاقبت اندیشانہ کاموں سے روک نہیں سکتی تھی جن پر وہ عمل پیرا تھے۔ انھوں نے کلکتہ یونیورسٹی سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ سراج گنج کے دو اسکولوں کا الحاق منسوخ کر دے۔ اس نے ان کو گورنمنٹ آف انڈیا سے دوچار کیا۔ ان سے کہا گیا کہ اس مطالبہ کو واپس لے لیں مگر انھوں نے انکار کر دیا اور اپنے عہدے سے استعفیٰ دینے کی اجازت کی درخواست کی وائسرائے نے فلر کو بلا یہ موقع دیتے ہوئے کہ وہ اپنے استعفا پر نظر ثانی کریں فوراً ان کو اطلاع دے دی کہ ان کا استعفا منظور کر لیا گیا ہے۔ اس طرح کرزن کے سورما کو خاک چاٹنی پڑی منظر سے ان کے غائب ہونے (20 اگست 1906) کا منشا بہر حال یہ نہ تھا کہ عوامی مقصد کامیاب ہوا ہے۔

مسلمانوں کا ردعمل

تقسیم بنگال کے خلاف شورش نے مسلمانوں پر عام طور سے اور خصوصیات

---

63 - Gokhle G.K. op-cit Vol. II. 19 May 1906. P.366.

64 - Minto Papers. Minto to Morley. 29th March. 1906.

65 - Ibid Morley to Minto 25 April, 1906.

کے ساتھ مشرقی بنگال کے مسلمانوں پر ناموافق اثر ڈالا کیوں کہ شورش کو ایک بھاری مذہبی
رنگ دے دیا گیا تھا اس نے اپنا انحصار ہندوؤں کے مذہبی مراسم پر رکھا تھا۔ برت
باورچی خانوں سے آگ جلانے سے گریز، دوکانیں بند کرنا۔ ماتمی جلوس نکالنا۔ رنگین
دھاگا بھائی چارہ کے نشان کے طور پر باندھنا (راکھی بندھن) ننگے پیر چل کر گنگا اشنان
کرنا کالی کے مندروں میں حلف لینا وغیرہ یہ سب اسلامی اصولوں کے منافی تھے۔
ملازمتوں میں مسلمانوں کو جو مراعات دیے گیے ان سے ہندو ملازمین سرکار میں
غصہ ابھرا۔ پکٹنگ کرنے اور ہندو زمینداروں کے گاؤں کے بازاروں پر دباؤ ڈالتے
سے مسلمان پھیری پر سودا کرنے والوں کی روزی پر اثر پڑا۔

لیڈران تحریک کو یہ جاننا ضروری تھا کہ ایک فرقہ کے مذہبی جوش کو ایک سیاسی
فیصلہ کو منسوخ کرانے کے لیے استعمال کرنا ان کے مقصد کے لیے مسلمانوں کی ہمدردی
حاصل کرنے کا مناسب طریقہ نہیں تھا خاص کر جب کہ اس کے اندر یہ بات مضمر تھی کہ
ان کے فرقہ کو اس کے لیے مخصوص مفادات کی قربانی دینی پڑے گی۔

جس طرح ان کے سرپرست فلر کو عجلت کے ساتھ بلا موقع بیجے نکال دیا گیا تھا اس
سے مسلمان بہت پریشان تھے لیکن بہر حال ان کو بہت جلد مطمئن کر دیا گیا کیوں کہ گورنمنٹ
کا دوبارہ کبھی ارادہ نہ تھا کہ وہ ان کے وقار کو گراتے۔ اور ان کو اپنا سیاسی پلٹنے پر مشتمل کرے
وائسرائے کے شملہ کے اعلان مورخہ یکم اکتوبر 1906 نے بداعتمادی اور شک کے جو
بادل جمع ہو رہے ان کو اڑا دیا۔ مشرقی بنگال کے مسلمان فخر کے احساس میں ڈوب کر شاداں و
فرحاں ہو گیے اور متعصب ملاؓ ملک کے اندر گھوم گھوم کر احیاۓ اسلام کی تبلیغ کرنے
لگے اور دیہات کے رہنے والوں کے سامنے یہ اعلان کرتے تھے کہ حکومت برطانیہ مسلمانوں
کی طرف ہے۔ اور عدالتیں تین مہینے کے لیے خاص طور پر بند کر دی گئی ہیں اور ہندو۔
حکام کی نافرمانی کرنے یا ہندوؤں کی دوکانیں لوٹ لینے یا ہندو عورتوں کے اغوا کرنے پر کوئی
سزائیں دی جائے گی۔ ایک سرخ رنگ کا پمفلٹ چاروں طرف تقسیم کیا گیا جس میں اسی
طرح کی الٹی سیدھی باتیں درج تھیں۔/66۔

66- Nawinson. H.W. op.cit. P. 192.

شملہ کی خوش خبری نے متعصب ملاؤں کی جارحانہ وطن پرستی کے مقاصد کو مشتعل کر دیا۔ مارلے اور منٹو کے رویہ نے اس کی اور بھی ہمت افزائی کی۔ مارلے نے مسلم لیگ کے قیام کا اس لیے خیر مقدم کیا کہ کانگرس کی یہ "دیسی مخالفت" ہے منٹو نے ہیر (HARE) کو لکھا جو فلر کا جانشین ہوا تھا کہ "یہ واقعہ کہ مسلمان عوام پورے طور پر بیدار ہو گیے ہیں اس نے نیے صوبہ کی تاریخ میں ایک نیے عنصر کا اضافہ کیا ہے جو مفید ثابت ہوگا" 67/

"ہیر" نے منٹو کے رویہ کا فائدہ اٹھا کر ان کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ انھوں نے نواب ڈھاکہ کو قریب الوقوع دیوالیہ پن کے خطرے سے بچانے کے لیے 100,000 پونڈ کا قرض کم شرح سود پر دے دیا۔ وہ نواب کو مستحکم رکھنے کو سیاسی اہمیت کا حامل ایک معاملہ سمجھتے تھے کیوں کہ یہ صرف ان کی بدولت تھا کہ مسلمان "اب تک گورنمنٹ کے وفادار رہے ہیں" 68/

ہندو فرقہ پر جیسا کہ امید کی جا سکتی تھی اس کا الٹا اثر ہوا جو مسلمان پر ہوا تھا۔ وہ اور زیادہ تلخ غصہ میں آگیے اور زیادہ مستحکم ارادہ تقسیم کو منسوخ کرانے کا قایم کر لیا شورش اور زیادہ سنگین ہوگئی۔ اور پریس میں اور پلیٹ فارم پر گورنمنٹ پر حملے اور زیادہ غضبناک ہوگیے۔ بی۔ پی پال نے مشرقی بنگال کا ایک طوفانی دورہ کیا کلکتہ کے اخبار بندے ماترم نے پبلک سے پرجوش استدعا کی کہ وہ قربانیاں دیں۔ اور بیرونی گورنمنٹ کو مردانہ مقابلہ کی شان دکھلا دیں بہت سے ہندستانی زبان میں نکلنے والے اخباروں نے احکام حکومت کی کھلم کھلا نافرمانی کرنے کا پرچار کیا۔

پمفلٹ اور پروپیگنڈہ کی ایک جنگ بپا کر دی گئی بدنام زمانہ سرخ پمفلٹ نے ہندؤں کی دکانوں ہندؤں کی صنعتوں کے کارخانوں سے نکلے ہوتے مال کے بائیکاٹ اور مسلم اسکولوں کے کھولنے کی تبلیغ کی تھی۔ اس نے اعلان کیا تھا کہ ۔

"ہندؤں نے ہماری دولت ہماری عزت اور شوکت اسلام کو لوٹ لیا ہے انھوں نے سودیشی کا جال ہماری جانیں لینے کے لیے پھیلایا ہے اے مسلمانوں اپنی دولت ہندؤں

---

67. Minto Papers: Minto to Hare 11, November 1906.

68. Ibid. Hare to Minto 27th April 1907.

کے گھروں میں مت دو۔ وہ شخص انتہائی ذلیل ہے جو ہندوؤں کے ساتھ بند سے ماترم کا نعرہ لگاتا ہے"/69

فرقہ وارانہ بلوے

ایک ایسی فضا میں جسے پروپیگنڈہ اور جوابی پروپیگنڈہ نے انتہائی شدید بنا یا تھا یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ ٹکراؤ ہوتے۔ اپریل اور مئی 1906ء میں میمن سنگھ میں بلوے ہوتے جس نے ہندوؤں میں دہشت پیدا کر دی تھی/70

1907ء میں بڑا ضلع کے متعلقہ کوملا میں اور میمن سنگھ کے علاقہ جمال پور میں اس سے زیادہ بڑے فرقہ وارانہ بلوے ہوئے۔

کوملا میں بلوہ اس وقت ہوا جب وہاں نواب ڈھاکہ مارچ 1907ء کے پہلے ہفتہ میں اس غرض سے گیے تھے تاکہ اپنے ہم مذہبوں کی اخلاقی قوت کو مضبوط کریں۔ اشتعال اس سے پیدا ہوا کہ نواب کے جلوس پر کسی نے اینٹیں پھینک دی تھیں۔ دنگا شروع ہو گیا جس میں ایک مسلمان کو گولی لگی اور وہ ہلاک ہو گیا پولیس کی بے توجہی کا نتیجہ تھا کہ قتل، لوٹ اور آتش زنی تقریباً ایک ہفتہ تک جاری رہی/71

جمال پور کے تعلقہ میں فسادات 21 اپریل کو شروع ہوتے اور 10 مئی تک جاری رہے۔ بازاریں لوٹ لی گئیں زمینداروں اور معزز آدمیوں کے مکانات اور دفاتر جلا دیے گیے درگا کے مندروں کی بے عزتی کی گئی عورتیں اغوا کی گئیں اور بہت جانوں کا نقصان ہوا جو مقدمات چلے ان کے سلسلہ میں کلکتہ ہائی کورٹ نے اس سشن جج کو جس نے ہندو ملزمان کے مقدمات کی سماعت کی تھی سخت ریمارک دیے۔

---

69 - F.O.I. Translation of the Pamphlet, See Home Dept. Political. A. Progs July 1907. Nos 189-192.

70 - Home Dept Public. A. Progs July 1906. No 124 also. H. — Risley to Arthur Godley, Under Secretary of State 12 July 1906.

71 - Home Deptt. Public A. Progs. May 1907. Nos 159-71.

نیونس ان مظالم کا تفصیل سے تذکرہ کرتا ہے جو بلوائیوں نے کیا تھا اور یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ "اس طرح مشرقی بنگال میں ایک مذہبی جنگ قایم ہوگئی" 72/

رسلے نے فلسفیانہ انداز میں کہا "تقسیم کے خلاف ایجیٹیشن نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان عداوت کی کیفیت کا رنگ اختیار کرلیا ہے ہم جو کچھ کر سکتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ انتظار کریں دیکھیں کیا ہوتا ہے" 73/

مارلے نے اپنی (1907) بجٹ کی تقریر میں بلوؤں کے اسباب کا تجزیہ پارلیمنٹ کو دیا انھوں نے جو نچوڑ نکالا تھا وہ اتنا سرسری اور غیر اطمینان بخش تھا کہ نیونس کو جو عینی شاہد کی حیثیت رکھتا تھا مجبوراً یہ تنقید کرنی پڑی۔

یہ طاقت کے بے ڈھنگے پن کی ایک مثال ہے کہ کس طرح افسران اپنے سربراہ کو گمراہ کرتے ہیں 74 نیونس اور کیر ہارڈی (KEIR HARDIE) نے پورے طور پر الزام مسلمان غنڈوں پر رکھا جب کہ انگریز افسران صرف تماشہ بین بنے رہے" 75/

ہمپ فلائڈ فلر نے مسلمانوں کو ہندوؤں کے خلاف طاقت استعمال کرنے میں برسر حق قرار دیا اور گورنمنٹ کو کل الزام سے بری کر دیا کیوں کہ وہ اس مشکل پوزیشن میں پھنس گئی تھی کہ وفادار مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد کو سزا دینی پڑتی در اصل ایک ان کو ہندو اسکول کے لڑکوں پر سخت غصہ تھا" 76/

کانگریس شگاف

---

72 - Nevinson, op.cit, PP. 192-3.

73 - Risley's Note 1st April 1907. Home Department Public. A. Progs, May 1907. Nos 159-71.

74 - Nevinson, op.cit, P. 193.

75 - Ibid, PP. 16-17. 191-3. 202.

76 - Fuller, J.B. Vision Splendid of India youth in Nineteenth Century, july 1908. P.20.

ان حالات کے علاوہ مارلے نے نظم ونسق کی جدید تعمیر کا جو اعلان کیا تھا اس سے ایک اضطراب پیدا ہو گیا۔ سیاست داں اور رعایا امید اور خوف کے درمیان چکر لگانے لگے۔ اعتدال پسند طبقہ کا بازو چاہتا تھا کہ ہر قیمت پر انتہا پسندوں کے پروگرام کے تسلیم کیے جانے کو روکے کیوں کہ ان کا خیال یہ تھا کہ اس سے اصلاحات کے دشمنوں کے ہاتھ مضبوط ہوں گے۔ یعنی انگلستان اور ہندستان کے قدامت پرست اور دقیانوسی حکام جن کے ہاتھ میں ہندستان کے نظم ونسق کی باگ تھی۔ دوسری جانب نیشنلسٹوں کا اس گورنمنٹ کے نیک ارادوں پر کوئی بھروسہ نہ تھا جس نے ہندستان کے مختلف حصوں میں جبر واستبداد کو کھلی چھوٹ دے دی تھی اور کھلم کھلا کانگرس مخالف عناصر کا ساتھ دے رہی تھی۔

گو کھلے جو غیر معمولی لگن، اخلاص، پاکیزگی کردار اور دماغی قابلیت کا مجسمہ تھا اعتدال پسندوں کے نقطہ نظر کے مویدین میں سب سے زیادہ فعال تھا انھوں نے انگلستان میں مارلے سے ملاقات کی اور ان کے سامنے قومی مطالبہ رکھا۔ مارلے نے بلا کوئی وعدہ کیے گو کھلے کے دماغ میں امید کی ایک کرن روشن کی کہ فیاضانہ طور پر اصلاحات دیئے جائیں گے۔ آخر میں یہ امید غلط ثابت ہوئی لیکن 1907 کے وسط میں اعتدال پسند وزیر ہند کی آزادی پسندی پر عقیدہ رکھتے تھے اور انھوں نے نیشنلسٹوں کی اس کوشش کے خلاف کہ کانگرس ۔۔۔ انتہا پسند پروگرام کو قبول کرلے سعی بلیغ کی۔

رسہ کشی کی جنگ پورے سال بھر جاری رہی اعتدال پسندوں کے لیڈران۔ گو کھلے، فیروز شاہ مہتا سورندر ناتھ بنرجی، مدن موہن مالویہ اور دوسرے لوگ۔ تلک۔ آربندو گھوش، پپن چندر پال، لاجپت رائے اور دوسرے ان کے ساتھیوں کے خلاف صف آرا رہے دونوں طرف کے لوگوں نے اپنی انتہائی طاقت کو اس غرض کے لیے استعمال کیا کہ ہندستان کی اہم ترین سیاسی جماعت پر غلبہ حاصل کرلے یعنی انڈین نیشنل کانگرس پر جو نہ صرف نیشنلسٹ ہندستان کے عزت واحترام کی حامل تھی بلکہ حکومت بھی ہندستان کی سیاست میں اسے ایک ایسا اہم عنصر سمجھتی تھی جسے نظرانداز نہیں کیا سکتا تھا

1906 کے کلکتہ کے سشن کے تقریباً فوراً بعد نیشنلسٹوں نے اپنی مہم شروع کردی تھی تلک نے یہ اعلان کیا کہ ان کی پارٹی حکومت کی کریم النفسی پر کوئی عقیدہ نہیں رکھتی ہے

اور وہ بائیکاٹ کے حربہ کے ذریعہ نظم و نسق کی پوری مشینری پر اقتدار حاصل کرنا چاہتے تھے
میں اپنے مسائل کی کنجی اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتا ہوں۔ ہماری منزل سلف گورنمنٹ ہے"77

آربندو گھوش نے 1907 کے شروع میں بنگال پراونشیل کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے اعتدال پسندوں کو ملامت کیا۔ اپریل میں بندے ماترم اخبار میں مقاومت مجہول (Passive Resistance) پر متعدد مضامین شائع ہوئے جن میں اعتدال پسندوں پر غصے سے بھرے ہوئے جوشیلے الفاظ میں سخت تنقید کی گئی تھی۔

"دفتری حکومت سے کھلم کھلا تصادم کرنے کے خیال سے یہ لوگ خوف زدہ ہو کر بھاگتے ہیں اور ان پر فالج کا حملہ ہو جاتا ہے۔ ان کے اوپر برطانیہ کی غیر معمولی طاقت و قوت اور ہندستان کی حقیر کمزوری کے خیالات کا غلبہ ہے علاوہ ازیں ان کے اندر ہمت و جرأت اور قوم کے اندر اعتماد کا فقدان ہے۔ قومی کردار پر بد اعتمادی ان کے دماغوں میں جڑ پکڑ گئی ہے اور قوم میں بھی سیاسی طاقت اور خوبیوں کے پیدا ہونے کے امکانات کو دیکھنے کے لیے ان کی آنکھیں اندھی ہیں یہ تمام اسباب نجات کے کم درسے اور تنگ راستے کو دریافت کرنے میں ان کے لیے رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔"78

انھوں نے تسلیم کیا کہ "وہ کانگرس پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں اور اس کو انقلابی عمل کا آلہ کار بنانا چاہتے ہیں۔"79

دوسری جانب اعتدال پسندوں کا اصول یہ تھا۔

"کانگرس کا مقصد یہ ہے کہ ہندستان کی حکومت خود ہندستانیوں کے مفاد میں ہو اور کچھ مدت میں اس ملک کے اندر ایسی گورنمنٹ قایم ہو جائے جو برطانیہ کی خود مختار نو آبادیات کے طرز کی ہو۔"80

77- Speech at Calcutta January 2, 1906 See Bal Gangadhar - Tilak, Writings and Speeches (Ganesh & Co. Madras) PP. 37-52.

78. Aurobindo Ghose, The Doctrine of Passive Resistance, PP. 20-21.

79. Aurobindo Ghose, Sri Aurobindo on Himself and the Mother, P. 47.

80. [illegible] (1917) P. 812.

فیروزشاہ مہتا نے کانگرس کے اغراض و مقاصد کو ان الفاظ میں بیان کیا۔

"ہم ڈیلیگیٹ جو قوم کے نمائندے ہیں سال کے آخر میں ایک جگہ اس لیے جمع ہوئے ہیں کہ ملک کی رائے عامہ جو شکل اختیار کر رہی ہے اور سال بھر کے اندر جو اس کی تصویر بنی ہے اس کی ترجمانی کریں، اپنے حقوق کے لیے عرض داشت دیں، اپنی عظیم احتجاجی آواز بلند کریں اور عقل اور سچائی پر مبنی ایک مضبوط اور مستقل پالیسی کی دعا کریں"۔ 81/

اعتدال پسند اس بات پر بہت فکرمند تھے کہ وہ کانگرس کو انتہا پسندانہ راہوں پر چلنے سے بچائیں۔ گوکھلے اس بات کی سخت کوشش کر رہے تھے کہ وہ مارلے کو اس پر راضی کریں کہ جبر و استبداد ختم کیا جائے اور اصلاحات دیئے جائیں انھوں نے منٹو کو وارننگ دے دی تھی کہ "ہندستان کا نوجوان طبقہ انتہا پسندوں کی جانب جا رہا ہے"82/

وہ وڈربرن (WEDDERBURN) کے توسط سے اکتوبر 1907ء میں مارلے سے ملے اور وزیر ہند کی توجہ اس کے امکان کی جانب مبذول کی کہ انتہا پسند کانگرس پر غلبہ حاصل کر لیں گے۔ اس نے مارلے کو مجبور کیا اور انھوں نے منٹو کو ان الفاظ میں لکھا "میں یقین نہیں کرتا تھا کہ گوکھلے ایک ایسا احمقانہ کھیل کھیلے گا جیسا کہ وہ کھیل رہا ہے۔ ان کا یہ کہنا محض فضول اور ناقابل لحاظ بات ہے کہ دفتری حکومت کانگرس کو نیچا دکھا رہی ہے اور ان کو اور ان کے سلجھے ہوؤں کو الگ پھینک دیا ہے"/83

اپنے اپنا ملک کو گوکھلے نے یہ مشورہ دیا کہ "انتظار کرو مارلے اور لبرل پارٹی پر اعتماد رکھو کیونکہ کیا ان لوگوں نے وزیر ہند کی کونسل میں ہندستانیوں کو مقرر نہیں کیا ہے/84 - - -

---

81- Mehta Pherozshah Twentieth Congress, 1904. Welcome Address Ibid Part III, P. 1.

82- Minto to Morley, March 1909 (Lady Minto India Minto and Morley, P. 10.9)

83- Morley to Minto. 23 November 1907, Cited in Sastri Srinivasa Life of G.K. Gokhale, P. 74.

84- K.G. Gupta and S.A. Balgrami in july 1907.

۔۔۔ اور وائسرائے کی اکزیکیٹو کونسل میں نامزد کرنے کے لیے ایک ہندستانی کے نام کی تلاش میں ہیں۔

دسمبر 1907ء کے کانگرس سیشن کے لیے انعقاد کی جگہ ناگ پور کو تجویز کیا گیا تھا۔ لیکن جو مجلس استقبالیہ ناگ پور میں بنی تھی وہ کسی کو صدر منتخب کرنے میں ناکام رہی کیونکہ دونوں میں سے کوئی فریق تین چوتھائی کی لازمی اکثریت کو حاصل نہ کر سکا۔ اس لیے آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا اجلاس بمبئی میں مہتا کے مکان پر ہوا۔ اور جائے انعقاد کو بدل کر سورت کو تجویز کیا گیا جو فیروزشاہ مہتا کا گڑھ مانا جاتا تھا

نیشنلسٹ ناراض تھے غصہ میں قل غپارہ کیا گیا۔ سورت میں قبل اس کے کہ سیشن شروع ہو باہمی مصالحت کی کچھ کوشش کی گئی لیکن دونوں پارٹیوں نے سخت رویہ اختیار کر لیا تھا۔ اور اعتدال پسند جھکنے کے لیے تیار نہ تھے انھوں نے راش بہاری گھوش کو جو کلکتہ بار کے صف اول کے وکیل تھے اور جنھوں نے مخالف تقسیم تحریک میں نمایاں کردار ادا کیا تھا صدارت کے لیے اپنا امیدوار نامزد کیا۔

نیشنلسٹ اس تجویز کے خلاف تھے اور کھلے اجلاس میں 26 دسمبر کو تلک نے ان کے انتخاب کی مخالفت کی۔ اس سے ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا اور سیشن کو دوسرے دن کے لیے ملتوی کرنا پڑا۔ دوسرے دن تلک نے ڈائس پر جا کر ڈیلیگیٹوں کو خطاب کرنا چاہا۔ لیکن ان کو تقریر کرنے کی اجازت نہیں دی گئی کچھ ڈیلیگیٹوں نے ان کو دھکا دینے کی کوشش کی، ان پر ایک جوتا پھینکا گیا ان پر تو نشانہ چوک گیا اور جوتا جا کر سوریندر ناتھ بنرجی اور فیروزشاہ مہتا کو لگا۔ مکمل انتشار پھیل گیا فیروزشاہ مہتا کی درخواست پر پولیس نے پنڈال کو خالی کرا دیا۔ کانگرس کے دو ٹکڑے ہو گیے تھے۔

اعتدال پسندوں نے اپنا قبضہ کانگرس پر برقرار رکھا۔ وہ اس کے بعد فوراً جمع ہوتے اور کانگرس کے جدید مقاصد کا مسودہ تیار کیا۔ صرف وہ لوگ جو ان کو مقاصد تسلیم کریں وہی کانگرس کے ممبر ہونے کے اہل ہوں گے۔ اور اس لیے نیشنلسٹ نکال دیئے گیے۔ نیشنلسٹ اکیلے رہ گیے کیوں کہ اعتدال پسند حکومت کی حمایت پر کمربستہ ہوتے۔ اس وجہ سے ان کو گورنمنٹ کے مصمم اور کل بھرپور حملے کا جو اس نے جاری کیا سامنا کرنا پڑا۔

بے چینی جاری رہی

1907ء میں سودیشی اور بائیکاٹ کی تحریک نے بڑی طاقت حاصل کر لی۔ بیرونی مال کے ضائع کرنے کی بے شمار رپورٹیں آ رہی تھیں۔ والنٹیروں کے جارحانہ رویے اور ہندوؤں پر مسلمانوں کے حملے کی وجہ سے سنگین فسادات کی خبریں اضلاع سے موصول ہو رہی تھیں۔

پنجاب میں (COLONISATION ACT) قانون نو آبادیات میں ایک ترمیم کے خلاف شورش بہت سنگین صورت اختیار کر گئی۔ زرعی طبقہ جن میں سکھ بھی شامل تھے اٹھ پڑے۔ اخبارات پنجابی، لاہور اور انڈیا کے ایڈیٹران پر مقدمہ چلایا گیا اور ان کو سزا دی گئی جس کے نتیجے میں بلوے اور حملے ہوتے۔ راولپنڈی میں فسادات ہوئے۔ ۱۵ مئی کو لاجپت رائے اور 3 مئی کو اجیت سنگھ محض شبہہ کی بنا پر جلاوطن کر کے مانڈلے بھیج دیے گیے ایک حکم (Regulation of Meetings Ordinance. 1907) جاری ہوا جس کی رو سے پنجاب اور مشرقی بنگال میں اجتماعات ممنوع قرار دیے گیے۔

اس دوران میں چندر پال نے مدراس پریسیڈنسی کا دورہ کیا۔ طالب علم جوش میں آ گیے اور انھوں نے حکام کے احکام کی نافرمانی کی اور ان کو سزا دی گئی نتیجہ میں تشدد آمیز مظاہرے ہوئے چدمبرم پلے (CHIDAMBARAMPILLAY) اور ان کے ساتھیوں پر فرد جرم مرتب کی گئی اور ان کو جلاوطنی کی سزا دی گئی۔

کلکتہ میں بپن چندر پال بندے ماترم کے ایڈیٹر کے خلاف گواہی نہ دینے کے جرم میں چھ ماہ قید کی سزا دی گئی۔ ستمبر اور اکتوبر میں بلوے ہوتے اور جلسوں کو ممنوع قرار دیا گیا ایجیٹیشن کے ممتاز لوگوں سے خلاف کارروائی کی گئی۔

صوبہ ممالک متحدہ کے کئی اضلاع میں قحط کی صورت پھیلی ہوئی تھی غذائی اشیاء کے دام بڑھ رہے تھے اور وسیع پیمانہ پر مصیبت نازل تھی۔

مہاراشٹر اور دکن شورش کی آغوش میں تھے جو تقسیم بنگال کے خلاف احتجاج سے شروع ہوئی تھی اور بڑھ کر سوراج کے وسیع تر مطالبہ تک پہنچ گئی تلک نے اخبار کیسری میں متعدد مضامین لکھے جن میں مقاومت مجہول کے ذریعہ سیاسی طاقت حاصل کرنے پر زور دیا گیا۔

1908 کا سال امید اور خوف کے مابین شروع ہوا۔ منٹو نے مارلے کو لکھا "ہم کو کانگرس کے ٹکڑے ہو جانے پر مسرت معلیٰ ہوگی رہی یہ بات کہ اب کیا ہوگا تو اس کے بارے کچھ نہیں کہا جا سکتا جب تک اعتدال پسندوں یا انتہا پسندوں کی جانب سے کسی توانائی کا ثبوت نہ ملے۔ ڈاکٹر راش بہاری گھوش کل یہاں رات میں اسرکاری ڈنر پر موجود تھے اور جب سورت کی کارروائیوں کے بارے میں ان پر پھبتیاں کہی گئیں تو وہ ان سے بہت محظوظ معلوم ہوتے تھے" 85

انھوں نے مارلے کو آگاہ کیا کہ سیاسی صورت حال یقیناً پہلے سے زیادہ اطمینان بخش ہے انتہا پسند کانگرس کی حمایت اور معاونت سے محروم ہونے کے بعد گورنمنٹ کے غصہ کی ضرب برداشت کرنے کے لیے اکیلے رہ گیے۔

گورنمنٹ کے ہاتھ مضبوط ہو گیے تھے کیوں کہ وہ شمالی ہندستان کے مسلمانوں کو نیشنلسٹوں سے جدا کرنے میں اور کانگرس کے بالمقابل مسلم لیگ کو ترازو کا دوسرا پلڑا بنانے میں کامیاب ہو گئی تھی اس لیے وہ مخالفت کو کچلنے کے لیے سخت کارروائیاں کرنے لگی۔

لیکن جیسا کہ مارلے نے بتلایا سختیوں کی زیادتی امن و قانون کے قیام کا راستہ نہیں ہے اس کے برخلاف یہ وہ راستہ ہے جو بم بازی تک لے جاتا ہے جیسے جیسے کہ خفیہ جماعتوں کی کارروائیوں کے خطرات کا ثبوت ملتا گیا حکومت کا رویہ اسی طرح زیادہ سے زیادہ سخت ہوتا گیا

لاجپت رائے کے ساتھ جو برتاؤ کیا گیا اس سے مارلے کے لبرل عقیدہ کی بے حرمتی ہوئی تھی۔ اس نے منٹو سے کہا "یہ بات قطعی ہے کہ میں اب کسی کو جلاوطنی کی سزا دینے میں عجلت نہیں کروں گا اور اگر ایسا ہوتا رہا تو میں اس پر متعجب نہ ہوں گا کہ 1818 کا ریگولیشن بالکل غائب ہو جاتے" 86

ان کو اس پر غصہ تھا کہ لاجپت رائے کو اپنے وکیل سے ملاقات کی اجازت دی گئی ایک نفرت انگیز کام جو صرف روس یا آسٹریا کے اپنے اطالوی زمانہ میں کرنے کے لائق ہے" 87

---

85 - Minto Papers : Viceroy to Secretary of State january 2 .1908.

86 - Ibid Morley to Minto April 15 .1908.

87 - Ibid

جو چیز اس سے بھی زیادہ خراب تھی وہ یہ تھی کہ گورنمنٹ نے لاجپت رائے کو ان کے خاندان کے بارے میں غلط اطلاع دی تھی اس کے معنی یہ ہیں کہ "ایسے ہولناک جرم کے ارتکاب کے لیے ان کو آزاد کر دیا گیا جو بھی وہ کر سکیں۔"

گورنمنٹ آف انڈیا نے احتجاج اور وارننگ کو نظر انداز کر دیا جس کے افسوس ناک نتائج ہونے (۱۹۰۵) نے ایک خوفناک جنگ کا منظر دیکھا جس میں ایک طرف ایک طاقت ور گورنمنٹ جبر و استبداد کے قومی اسلحوں سے مسلح ہو کر ان کو انتہائی سختی سے استعمال کر رہی ہے اور دوسری جانب غصہ میں بھری ہوئی ایک مجبور و بیکس قوم جو اپنی قوت ارادی کی مضبوطی اور قربانیوں سے دوسری جانب کے حملوں کا مقابلہ کر رہی ہے خفیہ بھی اور کھلم کھلا بھی۔

بڑی بے چینی ہر حصہ ملک پھیلی ہوئی تھی۔ بنگال، شرقی بنگال اور آسام، مغربی ہندستان، دکن، پنجاب، مدراس پریسیڈنسی اور اتر پردیش۔

شرقی بنگال میں بلوے ہوتے امیمن سنگھ ایولیس اور یورپین لوگوں پر حملے ہوئے کھلم کھلا انقلابی نافرمانیاں کی گئیں اور گرفتاریاں ہوئیں، مقدمات چلے اور روحشتناک سزائیں دی گئیں۔

بمبئی پریسیڈنسی اور صوبہ متوسط میں بلوے ہوتے جن میں مل کے مزدور شامل تھے بمبئی گورنمنٹ نے بال گنگادھر تلک کو اپنا سب سے زیادہ طاقت ور مخالف قرار دے رکھا تھا۔ جولائی میں ان پر ایک مقدمہ اس الزام کے ساتھ چلایا گیا کہ انھوں نے بم کی تائید میں ایک مضمون لکھا تھا اور ان کو چھ سال قید کی سزا دی گئی۔ ان کا ہندستان میں رہنا سب سے زیادہ خطرناک سمجھا گیا اور ان کو ہندستان سے جلا وطن کر کے برما بھیج دیا گیا۔ جو وحشیانہ سزائیں دی گئی تھیں اس نے زوردار ردعمل پیدا کیا بلوے، گولی چلانے۔ مارپیٹ اور گھروں کو برباد کرنے کے واقعات اس کے نتائج تھے بنگال میں آربندو گھوش کو "علی پور بم کیس" میں پھنسایا گیا اور ان کو ایک سال سے زائد جیل میں رہنا پڑا۔ دسمبر میں نو ممتاز بنگالی لیڈروں کو جلا وطن کر دیا گیا۔ اس

---

88 - Ibid.

نے وزیر ہند کو سخت حیران کر دیا کیونکہ یہ حکم ایک فرسودہ قانون کے تحت دیا گیا تھا جسے اس سے قبل وہ مذموم قرار دے چکے تھے۔ ان کو اس قدر غصہ تھا کہ انھوں نے یہ دھمکی دی کہ جو لوگ جلا وطن کر دیے گیے ہیں اگر ان میں سے زیادہ تر کو رہا نہ کر دیا گیا تو وہ منٹو کے خلاف حکم صادر کر دیں گے۔ منٹو نے حکم کی تعمیل اس وقت کی جب اصلاحات کے ماتحت کونسلیں عالم وجود میں آئیں۔

1909ء تک تقسیم کے خلاف شورش پر دوسرے اہم واقعات کی پرچھائیاں پڑ گئیں تھیں یعنی مارلے اور منٹو کے دستوری اصلاحات کی تجویزات پر بحث، لیڈروں کے قید ہو جانے سے انتہا پسندوں کی پارٹی کا قیادت سے محروم ہو جانا اور انقلابی تحریکات کا زور پکڑ لینا۔

انقلابی کارروائیاں

تقسیم بنگال کے خلاف شورش کے زمانہ میں بنگال کے جوانوں نے عام تحریک کی کامیابی میں بڑا حصہ لیا۔ ان لوگوں نے جلسوں کو منظم کیا جلوسوں کو ترتیب دیا۔ جوش ابھارا سودیشی اور بائیکاٹ کے پروپگنڈے کے لیے والنٹیر مہیا کیے، دوکانوں پر پہرہ دیا۔ اور وہ جو کر سکتے تھے وہ سب کچھ حکمرانوں کو رائے عامہ کے سامنے جھکانے کے لیے کیا۔ قومی مقصد کے لیے وہ خوشی خوشی تکالیف برداشت کرتے تھے بہت سے لوگوں پر جبر مانے ہوئے درس گاہوں سے نکالے گیے حتی کے مارے گیے اور کوڑے بھی لگائے گیے لیکن ان کے ساتھ برتاؤ سخت ہوتا گیا اتنا ہی ان کا مزاج اور زیادہ باغیانہ ہوتا گیا۔ ان کی عوامی کارروائیوں کو روک دیے جانے کی وجہ سے انھوں نے خفیہ کارروائیوں میں اپنے جوش کو عمل پیرا کرنے اور اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے پناہ لی۔

1905ء سے بلکہ اس کے پہلے ہی سے بہت سی جماعتیں سماجی رفاہ عام کے کام کے لیے بن گئی تھیں شروع زمانہ میں تو ان کا کام جسمانی اور اخلاقی تربیت اور قومی خدمت تھا انگریز گزشتہ زمانہ بنگالیوں کو طعنہ دیا کرتے تھے کہ وہ ایک بودے، بزدل بکواسی بہت سی خوبیوں سے عاری اور احساس ذمہ داری سے محروم قوم ہیں۔ یہ سوسائٹیاں ان تحقیر کرنے والوں کی تردید کے لیے بنائی گئی تھیں۔

یہ سوسائیٹیاں جوانوں کو لاٹھی، خنجر اور تلوار جیسے ہتھیاروں کا چلانا اور جمناسٹک کی کثرت مثل باکسنگ (مکہ بازی) کشتی اور جیو جتسو سکھاتی تھیں یہ مذہبی تعلیم بھی مقدس کتابوں مثل بھگوت گیتا اور چانڈی کے مطالعہ کے ذریعہ دیتی تھیں اور کالی کی پوجا کی تلقین کرتی تھیں جو ایک غضبناک دیوی ہے اور راکشسوں کا ناش کرنے والی ہے" نوجوان انقلابیوں کے دماغوں پر یہ نقش کر دیا جاتا تھا کہ گیتا کی سب سے زیادہ عملی تعلیم یہ ہے کہ خوفناک چیزوں کا اس وقت ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے جب کہ فرض سختی اور دلداری کے لیے پکار رہا ہو اور اس وقت کسی ڈھیلے پن کا اظہار کرنا گیتا کی تعلیم نہیں ہے۔ تلک کی تحریرات کا اس موضوع پر پسندیدگی کے ساتھ حوالہ دیا جاتا تھا۔ گیتا کے اس پیغام کی چھاپ کہ روح کو موت نہیں ہے وہ مبہم غیر شخص اور ابدی یعنی ہمیشہ رہنے والی ہے۔ اگر قتل کر دیئے گئے تو سورگ میں جاؤ گے اور اگر کامیاب ہوتے تو تم زمین کے مالک ہوگے" نوجوان انقلابیوں کے دلوں پر لگا دی گئی تھی۔

ہندستان کے انقلابی لٹریچر میں راکشسوں کو مارنا ایک محاورہ ہے۔ "چانڈی" کا ایک فقرہ یہ ہے کہ" اے ماتا بھارتی" زمین پر آؤ اور بد معاش راکشسوں کے جھنڈ کو مار ڈالو آؤ اے چانڈی دیوی" چنڈ منڈ" راکشسوں کو قتل کرو۔ بد معاش خوفناک غصہ سے جسم کی دھجیاں بکھیر رہے ہیں اسے ٹکڑے ٹکڑے کر رہے ہیں۔ زمین بد حواس ہوگئی ہے" شنبھو اور نشنبھو" کی گستاخیوں پر آنسو بہہ رہے ہیں"

اور دوسری کتابیں بھی تھیں جیسے کہ" برتمان رانانتی" (جدید فنون جنگ) "مکت کون پتھو" تجارت کا راستہ کدھر ہے) "سیکم بلد ان" سکھ کی قربانی) "دلیش کتھا" اور "شیو جی" لائف آف میزینی (LIFEOF MAZZINI) ٹھیک سے اڑ جانے والے مادہ کے مکتوبات (MANUA LOF EXPLOSIVESIVE) وغیرہ جو نوجوان اور اثر پذیر دماغوں کے اندر آزادی، حب الوطنی، بیرونی غلبہ سے نفرت کے جذبات بھر دیتی تھیں اور مقابلہ کرنے کی راہیں دکھلاتی تھیں۔[89]

وہ مظاہروں کے بندوبست کرتے تھے اور مصنوعی لڑائیاں لڑتے تھے ان سب

---

89. Ker. J.C. Political Trouble in India (1917) PP. 48-62.

میں نوجوان کے لیے خدمت، مہم بازی کے جوش اور روحانی جذبات کے لیے کشش تھی۔

ان سوسائٹیوں کے بانیوں کا شروع سے یہ منشا تھا کہ ان کی نشوونما ایسی ہو کہ وہ انقلابی جماعتیں بن جائیں اور غالباً مسلح بغاوت کا مرکز بنیں۔ اس لیے یہ ضروری تھا کہ ان کی کارروائیاں گورنمنٹ کی تلاشی نگاہوں اور پبلک سے پوشیدہ رہیں۔ انھوں نے بم سازی کی تکنیک، ریوالور اور بندوق کا استعمال اور گوریلا طرز کی جنگ کو سیکھا۔ اسلحہ اور گولہ بارود حاصل کرنے اور ان کے لیے اخراجات مہیا کرنے کے لیے سماجی دباؤ۔ بائیکاٹ کی دھمکی سے سرمایہ حاصل کرتے تھے اور آخر کار استعمال بالجبر اور ڈکیتی کے طریقہ بھی استعمال کرتے تھے۔

دونوں بنگال ایسی سوسائٹیوں سے بھرے ہوئے تھے مشرقی بنگال اور آسام میں پانچ مخصوص سوسائٹیاں (سمیتیاں) تھیں لیکن ان کی بے شمار شاخیں تھیں جو صوبہ کے شہروں اور گاؤں میں پھیلی ہوئی تھیں یہ پانچ تھیں (1) انوشیلانی سمیتی" جس کا ہیڈ کوارٹر ڈھاکہ تھا۔ (2) "سودیشی بندھو سمیتی" باریسال (3) قر گنج (؟) سوہرد سمیتی" میمن سنگھ۔ (4) براتی سمیتی" فریدپور اور (5) سوربا نا سمیتی" میمن سنگھ۔

ان سب میں انوشیلا سمیتی سب سے زیادہ فعال تھی اس کا آرگنائزر پولن بہاری داس ایک جوشیلا صاحب وسائل اور زبردست قوت عمل رکھنے والا شخص تھا۔ برطانوی افسر جو اسپیشل پر تھا اس سے ملا۔ اس نے ان الفاظ میں اس کی تصویر کھینچی' ایک تارک الدنیا' ڈسپلن پر عمل کرنے والا' ذہین درج لیکن سطحی" 90/

ایک خواب وخیال کو دینے کا پُرجوش انسان' جس کا عظیم ذاتی اثر ہے' مکار اور دھوکہ باز اور جو بڑے بڑے عزائم رکھتا ہے اس سوسائٹی کی 116 شاخیں تھیں/ 91

اور شعلہ 1907 میں تقریب 8400 والنیٹر/ ممبر تھے/ 92

اس کے ممبران دو باتوں کا حلف لیتے تھے (1) اپنے لیڈر کی بے چون وچرا مکمل اطاعت (2) تمام

90- Home Deptt. Proceeding, May 1909. Nos 135-147. H. Salkeld Report dated 10th December 1908.

91. Ibid.

92. Home Deptt. Proceeding February 1909. Nos 112-136.

غلامانہ بندھنوں کو توڑدینا۔ بظاہر تو اس کا مقصد جسمانی تربیت اور سودیشی کے اصول کا پرچار تھا لیکن اس کا اصل مقصد حکومت برطانیہ کو الٹ دینا تھا جو ذرائع اختیار کیے گیے وہ اقتصادی بائیکاٹ، سماجی دباؤ۔ رضاکارانہ خدمت تہواروں وغیرہ کے موقع پر اور اسکولوں کا نظام۔

ان کی انقلابی کارروائیاں تشدد، ڈکیتی، قتل، اسلحہ کی تربیت اور بم سازی پر مشتمل تھا قانون اور ضابطہ کی خلاف ورزی اور قتل، لوٹ، ڈاکہ زنی اور بلوؤں سے سوسائٹی گورنمنٹ کو مفلوج کر دینا چاہتی تھی۔

مغربی بنگال میں بھی اسی طرح کی بہت سی سوسائٹیاں تھیں۔ ان میں سب سے اہم انوشلان سیتی کلکتہ تھی اور اسی نام کی جو جماعت ڈھاکہ میں قایم تھی اس کی مرکزی جماعت تھی دونوں میں قریبی رابطہ تھا۔ کلکتہ کی سیتی کو برندر کمار گھوش (آربندو گھوش کے بھائی) نے قایم کیا۔ دونوں کے اغراض و مقاصد ایک تھے دونوں کا نظام یکساں تھا اور اپنے مقاصد کے لیے دونوں یکساں ذرائع وسائل استعمال کرتے تھے۔

بنگال کے باہر بھی خفیہ جماعتیں تھیں جن میں سے چند بنگال کی تنظیم سے متعلق تھیں ۷ مئی ۱۹۰۵ کو ٹائمز نے رپورٹ کی کہ اگر بنگال نے تخریبی طریقے اختیار کرنے میں سب سے زیادہ نمایاں رہا ہے تو وہ عیارانہ دماغ جنھوں نے اس تحریک کا نقشہ بنایا اور ان کو پالا پوسا وہ غالباً بنگال کے باہر مغربی ہندستان کے بہت سے حصوں میں ملیں گے

مہاراشٹر میں ونائک دامودر ساورکر جو ابھی بیس سال کا بھی نہ تھا وہ تلک اور پرنجا پائی (ایڈیٹر کال) کی تحریرات کے جادو کا شکار ہوگیا۔ وہ بڑے شوق سے انقلابی لٹریچر کو پڑھتا تھا۔ اور خاص کر اطالوی لٹریچر روس اور آئرلینڈ کے اندر کی تحریکات کے سلسلے کا لٹریچر اور وہ مسلح انقلاب کا پرجوش حامی ہوگیا۔ چونکہ گورنمنٹ کے خلاف کھلم کھلا جنگ سر دست ناممکن تھی ساورکر نے خفیہ انجمنوں کو منظم کیا پہلے "متر میلا" اور بعدہٗ "ابھی نوبھارت" کو وہ ۱۹۰۶ میں انگلستان گیا۔ وہاں نوجوان ہندستانیوں کے دماغوں پر ان کے اندر انقلاب کا پیغام پھیلا کر قبضہ جمالیا۔ 1857 کی بغاوت جنگ آزادی کا نقطہ آغاز بن گئی۔ انڈیا ہاؤس کے ہفتہ واری جلسوں میں ساورکر ملوکیت پرستی کی مخالفت میں اپنی آتشیں تقریروں سے پرچار کرتا تھا اور بہت سے لوگوں کی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا جا رہا تھا ان میں سے

کچھ لوگوں نے بم بنانے اور گولی چلانے کے طریقے بھی سیکھے باوجود اس کے کہ اس کے حرکات و سکنات پر کڑی نگرانی رکھی جاتی تھی وہ بیس براوننگ (8 R A WING) پستول بھیجنے اور ناسک کے مجسٹریٹ کے قتل کرانے میں کامیاب ہوگیا۔ جو تحقیقات اس واقعہ کی ہوئی اس سلسلہ میں سوسائٹی کے حرکات و سکنات کا پتہ چلا ممبران پر اور ان کے لیڈر پر مقدمے چلے اور وہ گیارہ سال کے لیے ہندستان سے جزائر انڈمان جلا وطن کر دیئے گیے۔

انقلابیوں کے کارناموں کی ایک طویل فہرست ہے۔ مشرقی بنگال میں انھوں نے گورنمنٹ کے شبہات کو شروع ہی میں اکسا دیا تھا اور اگرچہ ان کو دبانے کے لیے سخت کارروائیاں کی گئیں لیکن ان کا بہت کم اثر ہوا۔ آخر کار صوبہ کی حکومت نے گورنمنٹ آف انڈیا سے درخواست کی کہ وہ اپنے قانونی اختیارات کا استعمال کر کے ان کو خلاف قانون قرار دے دے۔ 5 جنوری 1909 اور 26 فروری 1909 کو گورنمنٹ گزٹ میں نوٹیفیکیشن جاری کیے گیے جن میں دونوں بنگال کی سات سوسائٹیوں کو ناجائز قرار دیا گیا۔

جہاں تک انوشلان سیمتی کلکتہ کا تعلق ہے اس کے خلاف اس وقت ثبوت اکٹھا کیا گیا جب مانکٹالہ (MANIKTALA) باغ کی مئی 1908 میں تلاشی لی گئی اور اس کے ممبران گرفتار کیے گیے جن میں گھوش برادران بھی شامل تھے۔ دوسری سیتیوں کے کام بھی اسی طرح کے تھے اور ان کا انجام بھی اسی طرح کا ہوا۔

لیکن ان کارروائیوں کا آخر کیا اثر ہوا؟ اس کی کوئی شہادت نہیں ملتی ہے کہ انقلابی اعمال بند ہو گیے ہوں یا کم از کم بڑی حد تک کم ہو گئے ہوں 1908 میں بنگال کے اندر آٹھ سوسائٹیاں تھیں 1909-10 میں سترہ تھیں۔ جیسور، کھلنا اور ڈھاکہ میں تعزیری پولیس تعینات کرنی پڑی۔ بہت سی گرفتاریاں ہوئیں اور مقدمے چلائے گیے اور جن لوگوں پر مقدمے چلائے گیے ان میں "پولن بہاری داس" بھی شامل تھے۔ ہندستان کے دوسرے حصوں مثل شمالی خاندیش اور گوالیار میں سازشیں پکڑی گئیں۔ قتل اب بھی جاری تھے۔ 21 دسمبر 1909 کو ناسک کے کلکٹر جیکسن کو مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ لفٹیننٹ گورنر ان اور گورنر جنرل کی جان لینے کی کوشش کی گئی۔

وائسرائے کی گاڑی پر احمد آباد میں 13 نومبر 1909 کو بم پھینکے گیے لیکن وہ

پھٹے نہیں۔

انقلابی سازشیں شاخ در شاخ پھیل کر ہندستان کے باہر یورپ تک پہنچی۔ جولائی 1909 میں کرزن وپلی لندن میں قتل کر دیا گیا۔ 24 جنوری 1910 کو ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سی آئی ڈی۔ کو کلکتہ ہائی کورٹ کے اندر گولی مار دی گئی۔

منٹو کے جبر واستبداد کی پالیسی جس کی مارلے نے رضامندی دے دی تھی۔ نیشنلسٹ طاقتوں پر ایک دو رخ والا حملہ تھا ایک تو ان پر جو پبلک میں کھلم کھلا کام کرتے تھے اور دوسرے ان پر جو خفیہ کام کرتے تھے غرض یہ تھی کہ لیڈران کو بے اثر بنا دیا جائے اور پریس کا گلا گھونٹ دیا جائے نتیجہ یہ ہوا کہ 1910 تک انتہا پسندوں کے صف اول کے اونچے لیڈران لڑائی کے باہر تھے۔ بپن چندر پال اور لاجپت رائے نے جلاوطنی کو خود اپنے اوپر عائد کر لیا۔ اربندو چھپ کر پانڈیچری نکل گیے او تلک مانڈلے میں قیدی کی حیثیت سے تھے۔ اور بہت سے لوگوں نے گورنمنٹ کے مضبوط ہاتھ اور فوج داری کے تفتیش کے محکمے کی جانچنے والی نگاہوں کے اثرات کو محسوس کیا اور ان کو بڑی ہی احتیاط سے کام کرنا ہوتا تھا۔

اظہار رائے کے خلاف مقدمات بے شمار تھے بہت سے اخبارات دبا دیے گیے کچھ اخبارات کی ضمانتیں ضبط کر لی گئیں ان کے ڈکلریشن منسوخ کر دیے گیے۔ اور باغیانہ مضامین لکھنے کے الزام میں مقدمات دائر ہوئے۔

منٹو کی گورنمنٹ نے ایک وسیع جال ناپسندیدہ رایوں اور مخالفتوں کو پھانسنے کے لیے بچھا دیا تھا جو ایکٹ اور آرڈیننس جاری کیے گیے ان میں حسب ذیل قابل لحاظ تھے۔

(1) The Prevention of Seditious Meeting Act 1901

(قانون امتناع مجالس باغیانہ) 11 مئی 1907 کو آرڈیننس پنجاب اور بنگال میں جو شورش بپا تھی اس کے سلسلہ میں جلسوں کو کنٹرول کرنے کے لیے منظور ہوا اس کا نام ریگولیشن آف میٹنگز آرڈیننس ہوا۔ (1907) Regulation of Meetings Ordinance of 1907.

— تھا چونکہ اس آرڈیننس کی مدت 10 نومبر کو ختم ہو جاتی اس لیے گورنمنٹ نے جلسہ ہائے باغیانہ ایکٹ (110 F 1907) The Seditious Meetings Act 1907 یکم نومبر 1907 کو پاس کر دیا۔ اس قانون کی دفعات کسی علاقہ میں جہاں جلسہ کرنے کا اعلان کیا گیا ہو

وہاں کوئی سیاسی جلسہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ سات دن قبل سپرنٹنڈنٹ پولیس کو تحریری نوٹس نہ دی گئی ہو۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو مجاز کر دیا گیا تھا کہ وہ کسی جلسہ کو منعقد ہونے سے روک دے قانون کے خلاف جلسہ کرنے والا قید اور جرمانہ کی سزا کا موجب تھا جس میٹنگ کو کرنے سے منع کیا جاتے وہ مجمع ناجائز متصور ہو گا۔

(2) THE EXPLOSIVE SUBSTANCES ACT. 1908 پھٹنے والے مادوں کے متعلق قانون 1908) اس قانون کو گورنر جنرل ان کونسل نے 8 جون 1908 کو پاس کیا تھا۔ اس کی غرض یہ تھی کہ لا حکومیت حرکات کو روکا جائے اور ان لوگوں کو سزا دی جائے جو پھٹنے والے مادوں سے ترب اشیاء استعمال کریں یا جس سے جان یا مال کو خطرہ لاحق ہو اس نے پھٹنے والے مادوں سے چیزوں کے تیار کرنے اور ان کو قبضہ میں رکھنے کو بنیادی جرم قرار دیا جس کی قرار واقعی سزا مقرر کی گئی۔

(3) The Indian Criminal Amendment Act 1908 (ترمیم ضابطہ فوجداری) ہند (XIV 1908) 1908 (ایکٹ 14 1908ء) یہ ایکٹ جو پہلے صرف بنگال پر لاگو کیا گیا تھا جنوری 1910 میں دوسرے بڑے صوبوں میں بھی لاگو کر دیا گیا اس نے فوجداری کے قانون اور ضابطہ میں جلد مقدمات کو فیصل کرانے کے لیے تین جہاں ہائی کورٹ کے ایک ٹریبونل کے سامنے ملزمان کو سپرد سشن (COMMIT) کرنے کے لیے ملزمان کی ضمانتوں کو نامنظور کرنے کے لیے گواہوں کے بیانات کو داخل شہادت کرنے اور اپیلوں کو ممنوع قرار دینے کے لیے ان سب کے بارے میں شدید تبدیلیاں کی گئیں۔

ایکٹ نے گورنمنٹ کو یہ بھی اختیار دیا تھا کہ چند افراد کی کسی جماعت کو جسے وہ اپنی رائے میں ایسی سمجھے کہ وہ تشدد کے چلانے یا قانون و امن کے قیام میں خلل ڈالنے والی ہے یا امن عامہ کے لیے اس کا وجود ایک خطرہ ہے تو اس کو خلاف قانون قرار دیدے

(4) The Newspapers (Incitement and Offences) Act 1908

(اخبارات (اشتعال و جرائم) ایکٹ 1908) اس ایکٹ کا منشا اخبارات، پمفلٹ اور کتابوں میں باغیانہ مضامین کی اشاعت کو روکنا یا برطانوی راج کے خلاف سوجھاؤ دینے یا اشتعال دینے کو روکنا تھا۔

(5) The Press Act 1910 پریس ایکٹ 1910) اخبارات اشتعال و جرائم ایکٹ

1908 کے ناکام ہونے کے بعد مجلس قانون ساز کے سامنے ایک مسودۂ قانون اس غرض سے لایا گیا کہ اخبارات اور رسائل کی اشاعت پر اور پبلشروں پر قابو حاصل کیا جائے اور ہندوستان میں باہر سے باغیانہ اور قابل اعتراض مواد کو آنے سے روکا جائے اور اسی کے ساتھ جو اخبارات ناپسندیدہ یا باغیانہ تصور ہوں انھیں دبا دیا جائے۔ مالکان اخبار اور پبلشروں سے ضمانت طلب کرنے کی دفعہ بھی اس میں تھی۔ اس ایکٹ کی خلاف ورزی کرنے پر بطور سزا ضمانت ضبط کی جا سکتی تھی۔ اس قانون پر عمل درآمد 9 فروری 1910 کو شروع ہوا۔

ایکٹ اور آرڈیننس کے علاوہ حکام بالا کی طرف سے بے شمار انتظامی احکام اور سرکلر تحریک کو دبانے کے لیے جاری کیے گئے۔

آٹھواں باب

مارلے اور منٹو اصلاحات

۱۔ برطانیہ کا رویہ

جبر و استبداد نے برطانیہ کی رائے عامہ میں پھوٹ ڈال دی جس کا اظہار پارلیمنٹ میں ہوا۔ دونوں طرف کے لوگ صاف صاف نمایاں تھے۔ دارالامراء پر قدامت پرستوں کا غلبہ تھا جو ہندوستان کے معاملات پر کرزن کے مقلد اور منٹو کے حمایتی تھے۔ ان لوگوں کے نزدیک قوم پرستوں کے دباؤ سے ذرا بھی جھکنا خودکشی کے مترادف تھا۔ کرزن نے اعلان کیا کہ "جہاں تک میرا سوال ہے

میں کہہ سکتا ہوں کہ تقسیم بنگال کی منسوخی یا اس میں کسی قسم کی بھی کوئی ترمیم ....
ہندوستان میں باغیانہ شورش کے لئے ترغیب کا کام دے گی اور گورنمنٹ آف انڈیا کو تقریباً ناممکن بنا دے گی۔ اور آئندہ جو وزیر ہند ہوگا وہ پشیمانی محسوس کریگا اور اس شخص کو معاف نہیں کریگا جس کے ذریعہ یہ مراعات دی گئیں" [1]

دوسری جانب دارالعوام میں انتہاپسندوں نے وزیر ہند کو آگاہی دی کہ تقسیم کے خلاف غم و غصہ صرف اونچے طبقہ کے ہندوؤں تک محدود نہیں ہے بلکہ اس میں ہر طبقہ کے لوگ شریک ہیں۔ کیر ہارڈی Keir Hardie نے حکومت کے غلط مشوروں اور فرقہ وارانہ تخیلات پر مبنی پالیسی کو مذموم قرار دیا اور کہا کہ "اس میں شک نہیں کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایسی پست نہیں ہوگئی ہے کہ اسے یہ ضرورت لاحق ہو کہ مسلمانوں کو ایک متوجہ ایک ٹکڑے میں نام نہاد طاقت دینے کی غرض سے ہندوستان کے ہر حصہ

1- Curzon's speech, House of Lord, June 30, 1908. H.L. Debate.

کی ہندو آبادی کو ناراض کرنے پر مجبور ہو گئی ہو"۔[2] ہنری کاٹن[3] اور ریمزے میکڈانلڈ[4] نے نیشنلسٹوں کے مطالبات کی تائید کی۔ اور اس کی تائید مزید نیونسن Nevinson[5] — بریلسفورڈ Brailsford[6]، ریٹکلف Ratcliffe[7] اور ولفرڈ اسکےون بلنٹ (Wilfred Scawen Blunt)[8] جیسے ماہر صحافیوں نے بھی کی۔

لیکن لنڈن ٹائمز اور اسپیکٹیٹر (Spectator) اخبارات پارلیمنٹ کے قدامت پرست ممبران جے ڈی ریس G. D. Rees[9] اور سر جان برڈوڈ کے ساتھ تقسیم کی حمایت کرنے والوں میں سے تھے یہ سب لوگ جبر و استبداد کے بھی حامی تھے۔

ان متضاد آرا سے دوچار ہونے کی وجہ سے مارلے کے لئے آئندہ راہ عمل طے کرنا کچھ آسان کام نہ تھا۔ بہرحال انہوں نے گورنمنٹ آف انڈیا کی جبر و استبداد کی پالیسی کی پوری حمایت کا فیصلہ کر لیا تھا۔ البتہ کبھی کبھی وہ یہ آگاہی دیتے رہتے تھے کہ سختی حد سے متجاوز نہ ہو۔ دوسری جانب گورنمنٹ کے خلاف کسی قسم کی بیزاری کی پیش قدمی کے لئے انہوں نے اپنی پارٹی کے ممبران کو ہموار کرنے کی کوشش شروع کی۔ اس کے واسطے وہ افراد کے ساتھ میٹھے الفاظ میں بحث کرنے ان کو راضی کرنے کا رویہ اختیار کرتے تھے۔ اور انڈیا لابی کو مطمئن کرنے کے لئے ہوشیاری کے ساتھ پارلیمنٹ میں تقریریں کرتے تھے جن میں فنکارانہ مہارت سے بعض واقعات کو حذف اور بعض کو مدبرانہ معاملہ فہمی سے کھینچ تان

---

2. Hardie, Keir, India: Impressions and Suggestions (1909): pp. 10 & 116-17.
3. Cotton, Sir, H. House of Commons, January 26, 1905.
4. MacDonald, Ramsay, House of Commons, June 6, 1907.
5. Nevinson, H. W. The New Spirit in India (1908)
6. Brailsford, H. W. Subject India (1943)
7. Ratcliffe, S. K. Wedderburn and the Indian Reform Movement.
8. Blunt, W. S. My Diaries: being a personal narrative of events, 1881-1904.
9. Rees, J. D. The Real India (1908).

کر بڑھا دیتے تھے حالانکہ وہ اس پر تو یقین رکھتے تھے کہ ہندوستان جن عوارض میں مبتلا ہے اس کا علاج صرف جبر و استبداد نہیں ہے۔ وہ اس کا بھی شعور رکھتے تھے کہ جب وہ ہندوستان کے نیشلسٹوں کے نقطۂ نظر کے ساتھ ہمدردی کرنے کا کوئی اشارہ نہ کرے برطانوی حکومت تعلیم یافتہ طبقہ کی دلی حمایت سے محروم ہو جائے گی اور اس طرح ان کے لئے ہندوستان پر حکومت کرنے کی کوئی اخلاقی بنیاد باقی نہ رہے گی۔

معاملہ انتہائی پیچیدہ تھا۔

II مارلے کی دقتیں

بدقسمتی سے نہ تو مارلے اور نہ منٹو ہی جو ہندوستان کے اضطراب کی لہروں کے مد و جزر کو دیکھا کرتے تھے۔ ہندوستان کی ان پریشانیوں کی معقول اطلاع نہیں رکھتے تھے جو ہندوستان محسوس کر رہا تھا۔ وہ اس تمام اتھل پتھل اور بے چینی کو جو پھیلی ہوئی تھی محض عارضی ناگوار چیز سمجھتے تھے اور اسے وہ محض سطحی بکواس اور وہ جھاگ سمجھتے تھے جسے مراعات سے مایوس خود پرست شورش پسندوں نے پیدا کر دیا ہے۔

مارلے نے، وہ انتہا پسند فلسفی، جس کے نیم شعور میں جمود کے خلاف تبدیلی اور خود مختارانہ طریقوں کے خلاف جمہوریت رچی بسی ہوئی تھی بہت سی دقتوں کا شکار تھا۔ پہلی دقت تو یہ تھی کہ برطانیہ کی وہ سوسائٹی جس میں وہ اپنی زندگی گزارتا تھا عام طور پر ملوکیت پرستانہ نظریات رکھتی تھی اور اسی کے ساتھ اس سوسائٹی کے لوگوں کے سامنے ہندوستان کی جو تصویر تھی وہ بہت مسخ شدہ تھی۔ اس کے علاوہ ترقی پسند سوسلسٹ یا مزدور پارٹی کے لوگ سب کے سب ایسے کسی قانون یا ضابطہ یا عمل کے خلاف تھے جس سے یہ خیال پیدا ہو سکے کہ وہ برطانیہ کے عام باشندوں کے معیار زندگی کے لئے مضرت رساں ہوگا یا مزدوروں کے کاروبار حاصل کرنے میں اس سے کسی قسم کی رکاوٹ پیدا ہوگی۔ جو سرمایہ دار تھے ان کو صرف اس سے دلچسپی تھی کہ کچا مال سستے داموں خرید سکیں۔ ہندوستان کے بازاروں میں اپنی بنائی ہوئی اشیاء فروخت کر سکیں اور اپنا سرمایہ ہندوستان میں لگا کر وہ منافع حاصل کر سکیں جو برطانیہ کے اندر کی صنعت ان کو نہیں دے سکتی تھی۔ اس لئے وہ ہر اس پالیسی کی مخالفت کرتے تھے جو اس غلبہ کو کمزور کرے جو برطانیہ کو ہندوستان کی۔

اقتصادیات پر حاصل تھا۔ ہندوستان برطانیہ کے متوسط طبقے کے نوجوانوں کے لئے ایسی ملازمتیں فراہم کرتا تھا جن کی بڑی اونچی تنخواہیں تھیں اور قدرتاً ان لوگوں کو خوف تھا کہ کہیں یہ سہولت ان سے چھن نہ جائے

دوسری دقت یہ تھی کہ اس کو ایک ایسے دار الامراء سے معاملہ کرنا تھا جس کی زبردست اکثریت قدامت پرست تھی اور جو ہندوستانیوں کو کسی ذمہ داری کے دینے کے خیال ہی سے پیچ و تاب کھاتی تھی۔ دوسرے شاہ برطانیہ جو اگرچہ دستور کے لحاظ سے سیاست میں غیر جانبدار تھا لیکن وہ پرائیویٹ طور پر بے حد اثر ڈالتا رہتا تھا۔ اس وقت کے حکمراں بادشاہ ایڈورڈ ہفتم ہندوستان کے معاملات پر بہت سنگین خیالات رکھتے تھے اور کسی آزادی پسندانہ تبدیلی کی تجویز کے مخالف تھے۔

پھر مارلے کو گورنمنٹ آف انڈیا سے نپٹنا ہوتا تھا جس کے برطانوی نمائندے . . . . یعنی سرکاری افسران کا حلقہ زیادہ تر سرپرستانہ، مستبدانہ اور رجعت پسندانہ خیالات کا حامل تھا جو اعتراض پر مکدر ہوتا تھا اور مخالفت کو برداشت نہ کر سکتا تھا۔ غیر سرکاری یورپین طبقہ تجار کا طبقہ اور ان کا مضبوط پریس۔ شدت کے ساتھ ہندوستانیوں کے گورنمنٹ میں یا اس کے نظم و نسق میں حصہ دار بننے کا مخالف تھا۔ گورنر جنرل و وائسرائے، لارڈ منٹو، کرزن کے اصول ملوکیت پرستی کا عقیدہ رکھتا تھا۔ اگرچہ اس میں کرزن کے اعصابی قوت اور توانائی ناپید تھی اس نے مارلے کو انتباہ دیا تھا کہ "ہندوستان میں ہمارے راج کے وجود کا انحصار ہی ہماری طاقت کے مظاہرہ پر ہے" 10 اس کے پرائیویٹ سکریٹری نے اپنی ڈائری میں نوٹ کیا کہ "دنیا میں سب سے زیادہ پست جھنکار یہ ہے کہ ذرا سے استبداد سے کام لیا جائے " 11

ان تمام باتوں کے علاوہ خود مارلے کے ذہن و کردار کے کچھ پہلو تھے۔

---

10 - Minto to Morley, 23 December 1909. Cited in Das. M.N. India under Morley and Minto (London 1964) P. 142.

11- Gilbert Martin, Servant of India. being correspondence and Diaries of Sir James Dunlop Smith P. 28

جو کامیابی کی راہ میں حائل تھے اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک ممتاز اہل علم و دانشور تھا۔ وہ چمکدار الفاظ کے استعمال کا اسی طرح ماہر تھا جس طرح تلخ جملوں کا۔ وہ بڑے اصول پیش کرسکتا تھا لیکن جب اس کے خلاف ڈٹ کر مخالفت ہوتی تھی تو بڑبڑاتے ہوئے وہ جھک جاتا تھا اور اپنے عزیز خیالات کو بھی ضرورت کے بھوت پر قربان کردیتا تھا۔

مارلے کو مشرق کا کوئی ذاتی علم نہ تھا اور اس نے مشرق کے افکار اور اس کی تاریخ کا مطالعہ نہیں کیا تھا۔ اس لئے جس کام کو اس نے لیا تھا اس کے لئے وہ ایک اجنبی کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کے نزدیک ہندوستان ایک ایسا ملک تھا جو

"انتہائی وسیع تھا جتنا کہ وہ اس سے ناواقف تھا" 12/ " فاصلے اور اجنبیت دونوں عظیم ہیں" 13/

سوئز کے مشرق میں نہ اس نے جسمانی سفر کیا تھا اور نہ ذہنی اور اس لئے ان کی آزادی پسندی "ڈی لسپ" نہر کے کنارے جاکر ختم ہوجاتی تھی۔ ان کو اعتراف تھا کہ۔

"حقیقت یہ ہے کہ میں ایک مغرب کا انسان ہوں اور مشرقی نہیں ہوں! اس خطرناک راز کو فاش نہ کرنا ورنہ میں تباہ ہوجاؤں گا۔ میرا خیال یہ ہے کہ میں محمڈن ازم کو پسند کرتا ہوں لیکن مشرقی سمت میں میں آگے نہیں جاسکتا" 14/ بچان Buchan، اس پر اضافہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "درحقیقت وہ (یعنی مارلے)

کو کالی نسل کے انسانوں سے سخت قسم کی نفرت تھی اور وہ ان کے اندرونی افکار اور ان کے مزاج اور آراء سے ذرا بھی واقف نہ تھا" 15/

آسٹن چیمبرلین نے ایک لیبر پارٹی کے ایم پی سے ہندوستان پر ہندوستانی خیالات حکومت کرنے کے بارے میں بات کرتے ہوئے مارلے کے رویہ کو ان الفاظ

---

12 - Morley to Frederick Harrison, 20 March 1906 quoted in wolpert. S. Morley and India . P 28.

13 - Morley to Minto, 8 March 1906. Ibid. P 29.

14 - Buchan, J. Lord Minto. PP. 232-3. Letter to Lord Minto

15. Ibid. P. 222.

میں بیان کیا ہے "ہندوستانی خیالات؟ وہ کیا ہیں؟ ذات دیہ وہ خیالات تو نہیں ہیں
جو لیبر پارٹی کے اصول ہیں، پردہ، ستی، بچوں کی شادی لڑکیوں کا قتل، یہ ہیں
وہ ہندوستانی افکار۔ یہ کہنا کہ ہندوستان کو ہندوستان کے خیالات کے
مطابق حکومت۔ کس درجہ احمقانہ بات ہے" ۱۶/
بالفور کی رائے مارسے کے بارے میں یہ تھی "پیارے جان کے ساتھ
مصیبت یہ ہے کہ آپ اس پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔ وہ آپ سے پرائیویٹ
میں اس طرح بات کریگا اور پھر پبلک میں آپ کو نیچا دکھادیگا" ۱۷/
یہ رائیں تو ان کے مخالفین کی ہیں لیکن ایک لبرل لیڈر آکسفورڈ اسکوئیتھ کی رائے بھی
اس سے کچھ مختلف نہیں ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ "اگرچہ مارسے کو لوگ ایماندار
جان کے نام سے پکارتے ہیں مگر ان کے لئے یہ وضاحتی الفاظ دھوکے
میں ڈالنے والے ہیں۔ ان کا ذہن اور ان کی فطرت پیچیدہ اور پر اسرار
تھی ..... وہ بہت ذکی الحس، نامرد، خودسر اور ان لوگوں کے سمجھنے
میں جو ان سے مختلف تھے حاسد تھے" ۱۸/
سری نواس شاستری نے ان کے متعلق کہا کہ وہ ایک اچھے مدلل گفتگو
کرنے والے انسان تھے لیکن ان کی قوت فیصلہ کمزور تھی اور وہ بہت
جلد جھک جاتے تھے۔ ۱۹/
اس ٹیم کے دوسرے ممبر لارڈ منٹو کا مطالعہ یہ ظاہر کرے گا کہ وہ ان سے قطعی
متضاد تھے۔ کسی طرح بھی ان کا شمار فضلاء میں نہیں ہو سکتا تھا۔ اور نہ تو کوئی بڑے مفکر
تھے۔ ان میں کوئی علمی ادبی خوبی نہ تھی وہ زمین کے تھے اور زمینی تھے۔ یعنی عملی انسان،
وہ اس کا فہم وادراک رکھتے تھے کہ وہ کیا چاہتے ہیں اور اس کے حاصل کرنے میں

---

16 - Chamberlain. A. Politics from within PP. 59-60.

17 - Ibid. P. 336.

18 - Countess of Oxford and Asquith. Myself when young. P. 27.

19. Round Table Conference, Sub-Committee Part II 1931.

سخت ضدی تھے۔ لیکن وہ بھی کمزور اور کاہل تھے اور اس کے ہوشیار ماتحتین جن پر وہ اپنی بریف تیار کرنے کے لئے بھروسہ کرتے تھے اس کو اپنی راہ پر چلا لے جاتے تھے۔ وہ ان چالاکی کی ترکیبوں سے واقف تھے جن سے ایک کمزور آدمی اپنے اغراض پورے کرتا ہے وہ مارلے کے اسلحہ خانہ کے تمام ذروں کو اپنے مکمل فائدہ کے لئے اس طرح استعمال کر سکتے تھے کہ ان کے خوف کو بھڑکاتا رہتا تھا۔ اور ان کے سیاسی مخالفوں سے سازش کرتا تھا۔ ہندوستان میں اس کی اصل غرض یہ تھی کہ نیشلسٹ طاقتوں کو کچلے جو برطانوی اقتدار کو کمزور کرنے والے تھے۔ لیکن اس کے پاس اتنی عقل تھی کہ وہ خوب سمجھتا تھا کہ یہ مقصد صرف اندھا دھند تمام مخالفتوں پر بھاری ہاتھ کے ضرب سے حاصل نہیں ہو سکتا بلکہ اس طرح حاصل ہوگا کہ کمال ہوشیاری سے دشمن کی صفوں میں پھوٹ ڈال دی جائے اور پوری چالاکی سے جبر و استبداد کے ساتھ مراعات کو بھی شامل کر لیا جائے۔ اپنے افسر کے اصولوں اور ان کی ہچکچاہٹوں پر اور اپنے ماتحتوں کی پژمردگی پر قابو پانے کے لئے اس نے بڑی عیاری سے کام لیا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ دونوں کے رویے ہندوستان کے بارے میں یکساں ہی تھے۔ اگرچہ ان کے دلائل کے انداز مختلف تھے۔ مارلے اس نتیجہ پر پہونچا تھا کہ ہندوستان کے اندر کی بے چینی کی علت نمائی نسلی اور سماجی تھی نہ کہ سیاسی۔ ان کے اندازے کے مطابق کانگرس کا مطالبہ نظم و نسق سے زیادہ متعلق تھا اور سیاسی کم تھا۔ کانگرس کی خواہش اونچے درجہ کی ملازمتوں میں اور زیادہ داخلہ کی طلب گار تھی [20] ان کا خیال تھا کہ برطانیوں نے تعلیم یافتہ طبقہ کو دو طرح سے اپنا مخالف بنالیا ہے۔ اپنے کو سماج میں زیادہ عالی مرتبت ظاہر کرکے اور ہندوستان کے کلچر اور اس کی تہذیب کی حقارت آمیز مذمت کرکے۔ یہ تجزیہ جہاں تک کہ اس کی وسعت تھی صحیح تھا لیکن یہ کافی دور تک نہیں جاتا تھا۔

پھر یہ بات بھی تھی کہ ہندوستان کے سماج کی پیچیدگیوں کے بارے میں ان کا فہم و ادراک محض سطحی تھا۔ نہ صرف یہ کہ وہ انیسویں صدی نے جو خیال خام سفید لوگوں کی برتری کا قائم کیا تھا اس کے وہ بھی شکار تھے بلکہ وہ اس پر یقین رکھتے

20- Minto Papers, Morley to Minto, August 2, 1906.

تھے کہ چونکہ ہندوستان بہت سی نسلوں بہت سی زبانوں، بہت سے مذاہب اور حیران کن حد سے زیادہ ذاتوں کا ملک ہے۔ لہٰذا اس میں سلف گورنمنٹ کی سماجی بنیاد کا مکمل فقدان ہے۔

III اصلاحات کے بارے میں مارلے کی رائے

مارلے کے دماغ میں یہ وہم بسا ہوا تھا کہ ہندوستان کے دو فرقوں کے بیچ جو خلیج ہے وہ ناقابل عبور ہے۔ انڈیا کونسل کی بل کی دوسری خواندگی کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے اس نے دارالامراء کو یاد دلایا کہ "ہم کو یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ محمڈن ازم اور ہندو ازم میں اختلاف صرف مذہبی عقائد کے اصول یا احکام کے بیچ نہیں ہے۔ یہ طرز زندگی روایات، تاریخ اور ان تمام باتوں کے اندر کا اختلاف ہے جن سے ایک قوم بنتی ہے۔ علاوہ اس کے مذہبی عقائد میں بھی اختلاف ہے" 21/ مارلے نے مسلم لیگ کے قیام کا خیر مقدم کیا جو ایک محض فرقہ وارانہ تنظیم کی نوعیت سے سیاسی مقاصد کے ساتھ عالم وجود میں آئی تھی ان کے خیال میں یہ "کانگریس کی ایک دلیسی مخالف جماعت تھی"۔

ان رایوں کا لازمی منطقی نتیجہ یہ تھا کہ نمائندہ حکومت کے لئے ہندوستان کو قطعی نااہل قرار دے دیا گیا۔ اس کی نمایاں وضاحت مارلے کی اس تقریر سے ہوئی جو انھوں نے دارالعوام میں انڈیا کونسل پر کی۔

جب بالفور نے ایوان سے کہا کہ مارلے کا خیال تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ "نہ صرف یہ کہ ہندوستان نمائندہ حکومت کے لئے سر دست نااہل ہے بلکہ اگر میں ان الفاظ کی غلط تعبیر نہیں کر رہا ہوں تو ان کا کہنا یہ ہے کہ اس خیال کا قائم کرنا مشکل ہے کہ وہ کبھی بھی اہل ہو سکے گا" 22/ تو مارلے نے کہا کہ "وہ بالکل ٹھیک

21- Morley Viscount, Second Reading of Indian Councils Bill (House of Lord, 23 February 1909) Morley, Ind. in Speeches. PP. 126-27.

22- Proceeding of the House of Commons, March 1909.

کہہ رہے ہیں " 23/

مارلے جب بھی ہندوستان کا ذکر کرتے تھے تو وہ اسے قوموں کا ملک کہتے تھے۔

اس سے بہت پہلے جون ۱۹۰۶ء میں انہوں نے منٹو کو لکھا کہ " ہمارے اور آپ کے درمیان کوئی بنیادی اختلاف ؟ میرے خیال میں اس کا کوئی وجود نہیں۔ کوئی سفید فام انسان میرے خیال میں ایسا نہیں ہے جو آپ سے زیادہ اسے مناسب یا ممکن یا قابل غور سمجھتا ہو کہ انگریزی طرز کے سیاسی ادارے ان قوموں کے درمیان قائم کئے جائیں جو ہندوستان میں بستے ہیں۔ یقینی طور پر ہمارے یا آپ کے زمانے میں تو ایسا ممکن نہیں ہے" 24/

وہ لی وارنر . Lee Warner سے اس اصول موضوعہ اتفاق کرتے تھے

کہ " ہندوستان کا سماج ذاتوں، نسلوں، اور مذہبوں کے مطابق ہی زندہ رہتا سوچتا اور عمل کرتا ہے" اور مایوسانہ انداز میں یہ تسلیم کیا کہ گورنر جنرل کی کونسل میں مسلمانوں کو علیحدہ نمائندگی پانے کا حق ہے اور اسی طرح صوبہ کی قانون ساز جماعتوں میں بھی حق ہے۔ ان کو اتنی نمائندگی ملنی چاہئے جو ان کی تعداد اور ان کی سیاسی اور تاریخی اہمیت کے مطابق ہو۔" 25/

دارالعوام میں اپنی پہلی بجٹ کی تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ" ہندوستان میں میرے الفاظ کا یہ مفہوم ہرگز نہ سمجھا جائے کہ میں اس جانب اشارہ کر رہا ہوں کہ ایک لمحہ کے لئے بھی میرے خواب و خیال میں یہ بات ہے کہ آپ برطانوی اداروں کو مکمل طور پر ہندوستان میں جما سکتے ہیں۔ آپ ہمارے دستور کے تناور درخت کو اکھاڑ کر اس کی روح۔ اس کے مزاج، اس کے اصول اور برطانوی اداروں کے قواعد و ضوابط سمیت۔ اسے لے جاکر ہندوستان میں جما نہیں

---

23. Morley to Minto - Buchan's, Lord Minto P. 285.

24. Minto Papers Morley to Minto, 6 June 1906.

25. Secretary of State : despatch, 17 May 1907 cited in Wolpert op. Cit. P 191.

سکتے۔ میں اس پر اصرار نہیں کرتا کہ ہندوستان کو کناڈا کی طرح خودمختار نوآبادیات
سے برابری کا درجہ دے دیا جائے"26/

یہ تھا وہ جواب جو انڈین نیشنل کانگرس کے مطالبات کا دیا گیا۔ جہاں تک گوکھلے کا سوال
ہے جو مارلے پر زور دے رہے تھے کہ نوآبادیاتی طرز کی سلف گورنمنٹ ہندوستان
کو عطا کرنا مناسب ہے۔ مارلے نے بمبئی کے گورنر لیمنگٹن (Lamington) کو
لکھا:۔

"یہ صحیح ہے کہ انہوں نے قومی خود ارادیت، خودمختار نوآبادیات وغیرہ وغیرہ کے
الفاظ استعمال کئے ہیں مگر میں محض الفاظ اور جملے تصور کرتا ہوں تاکہ وہ وقت
کا انتظار کر سکیں۔ اور اپنا سر پانی کے اوپر رکھ سکیں۔ پارسال میری اور ان کی
کئی بار گفتگو ہوئی اور وہ جانتے ہیں کہ ہم اور آپ جانتے ہیں کہ ہندوستان کو۔
ایک خودمختار نوآبادی میں بدلنا سردست ایک فضول گفتگو ہے اور اس کی بالکل
کوشش نہیں کی جائیگی" 27/

لیکن گوکھلے کے بارے میں ان کے واقعی خیالات کیا تھے ان کا پتہ ان کی اس تحریر
سے چلتا ہے جو 1907ء میں اس وقت لکھی گئی جب گوکھلے اس پھوٹ پر پریشان تھے جو معلوم ہوتا
تھا کہ کانگرس کے سر پر منڈلا رہی ہے۔

"گزشتہ بارہ مہینوں میں میں نے اکثر سوچا ہے کہ پارٹی کے فیچر کی حیثیت سے
گوکھلے محض ایک طفل شیر خوار ہے۔ کسی پارٹی کا فیچر اور دراصل کوئی بھی سیاسی
آدمی رو رو کر یہ آواز نہیں نکالیگا مگر گوکھلے ہمیشہ رونے کی ہی آواز نکالتا
ہے۔ وہ دوم درجہ کا آئرلینڈ کے آدمیوں کی طرح ڈان اوکانل Danocennel
اور پارنل (Parnell) کا درمیانی آدمی نظر آتا ہے" 28/

1907 کی بجٹ کی تقریر میں انھوں نے پھر اس کا اعادہ کیا کہ ہندوستان اس

26- Morley J. Budget Speech of 1906.

27- Morley to Lamington 20 june 1907, Cited in wolpert opcit P.150

28- Morley Papers: Morley to minto. 31. October 1907.

بعید زمانہ تک جہاں تک میرا تخیل جا سکتا ہے ایک سرزمین بے آئین اور شخصی
حکمرانی کا مرکز رہے گا"/29

اپنے حلقہ انتخاب کے لوگوں کے سامنے ۲۱ اکتوبر ۱۹۰۷ کو تقریر کرتے ہوئے انھوں
نے اس اصول پر سختی سے حملہ کیا کہ سلف گورنمنٹ کی راہ میں جو بات کناڈا کے لئے کارآمد ہے
وہ ہندوستان کے لئے بھی کارآمد ہوگی۔ یہ ایک قطعی خطرناک غلط دلیل ہے . . . .
. . میں سمجھتا ہوں کہ سب سے زیادہ سطحی بات ہے۔ وہ کون سی سوفسطائیت ہے جو اس
سے زیادہ سنگین اور ہولناک ہوگی" /30

۱۷ دسمبر 1908 کو دارالامراء میں اصلاحات پر مباحثہ میں حصہ لیتے ہوئے انھوں نے
لارڈ صاحبان کو یقین دلایا "اگر میں ہندوستان میں ایک پارلیمانی نظام کو قائم کرنے
کی کوشش کر رہا ہوں یا یہ کہ اگر یہ بھی کہا جا سکے کہ اصلاحات کا یہ باب مختلف راہ پر
جا رہا ہے یا اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندوستان میں پارلیمانی نظام قائم ہو جاتے
تو میں زور دے کر کہتا ہوں کہ مجھے اس سے کوئی واسطہ وسروکار نہ ہوگا . . . .
پارلیمانی نظام وہ منزل نہیں ہے جس کے لئے ایک لمحہ کے لئے بھی
آرزو کروں" /31

۱۷ جون 1907 کو ریفارم کے موضوع کو چھیڑتے ہوئے انہوں نے منٹو کو لکھا:۔
"میں سوچتا ہوں کہ کیا ہم اصلاحات کی عوامی سمت کی راہ میں ایک مبارک قدم اٹھانے
کی ابتدا نہیں کر سکتے ہیں۔ اگر ہم نہیں کرتے ہیں تو یہ یقینی ہے کہ مطالبات بڑھینگے
اور بڑھ کر "قومی" دائرہ کے حد تک پہونچ جائیں گے۔ جسے کم سے کم میں بڑے
شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ آپ اسے عملی چیز اور غور کرنے کی کیوں نہیں
سمجھتے کہ آپ کی قانون ساز کونسل میں دیسی لوگوں کی تعداد میں کیوں نہ اضافہ کر
دیا جائے اور ایضاً اسی طرح اکل کونسلوں میں پوری طرح بجٹ پر بحث کرنے

---

29 - Morley viscount; 6 june 1907, Indian Speeches (Macmillan) P.12
30 - Ibid PP. 35-36 To Constitutions (Arbroath 21 October 1907.)
31 - Ibid PP. 91-92.

کی کیوں نہ اجازت دی جائے۔ بجائے اس کے کہ صرف چار پانچ پنے تلے گھنٹے ۔
نشست کے ساتھ دیئے جائیں اور ان کو ترمیمات پیش کرنے کے حقوق بھی
کیوں نہ دیئے جائیں ؟"32

اس خط میں ذمہ دار حکومت کا کوئی تذکرہ نہیں ہے اور جو امور ذکر کئے گئے ہیں وہ لبرل پارٹی کے اصول کے اظہار کے لئے ایک فرسودہ سی بات ہے۔ جو مارلے نے کچھ تو منٹو کے خطوط سے اور کچھ گوکھلے سے بات چیت کرنے میں (جنہوں نے ان سے 1906ء کے بہار کے موسم میں لندن میں ملاقات کی تھی) اور کچھ ان لوگوں سے جو وطن میں ہندوستان کے ہمدرد تھے اخذ کی تھی۔ /33

اس مراسلہ میں جو وزیر ہند نے 7 رمئی 1907ء کو گورنمنٹ آف انڈیا کو بھیجا اس میں تجویز ول کو اس طرح بیان کیا گیا ہے " اس امر کی کوشش کہ موجودہ مشنری کو ترقی دی جائے " اس نے اسکیم کے سیاسی پہلو پر زور دیا۔ کونسل کے ممبران کی تعداد میں اضافہ، صوبہ کی کونسلوں میں غیر سرکاری ممبران کی اکثریت قائم کرنا۔ اس نے اس اصول کو بھی تسلیم کیا کہ انتخاب کے نظام میں عوام کو نمائندگی کا حق دیا جائے لیکن طبقوں، نسلوں اور مفادات کی بنیاد پر "

برطانیہ کے اقتدار اعلیٰ کے مسئلہ پر یا طاقت میں ہندوستانیوں کے حصہ دار ہونے پر کسی طرح کی مصالحت کا شائبہ نہ تھا۔

27 ر نومبر 1908ء کے آخری مراسلہ میں جو دار الامراء کی میز پر رکھا گیا اصلاحات کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی تھی " 1861ء اور 1862ء میں جو اصول تسلیم کئے گئے تھے ان میں پوری احتیاط —— کے ساتھ توسیع " مندرجہ بالا مراسلہ میں مارلے نے شدت کے ساتھ اس امر کا اظہار کیا تھا کہ یہ کوئی پارلیمانی نظام نہیں ہے۔

نمائندہ حکومت کا قطعی کوئی سوال نہ تھا۔ مارلے نے "تری مورتی" (ہندوستان کا تین سر رکھنے والے دیوتا) کی طرح اپنا ایک چہرہ دار العوام کے لبرل پارٹی کی طرف رکھا، دوسرا دار الامراء کے قدامت پرست کی طرف اور تیسرا انڈین نیشنل کانگرس کی طرف جو سوراج کے لئے کوشاں

---

32 - Minto Papers; Morley to Minto. 15 June 1906.

33. Buchan. Op. cit, P. 233.

تھی۔ اپنے چہرہ کو تین رخ کا بنانے میں مارلے کا خود ہاتھ تھا۔ منٹو کو جب اس نے رپورٹ دیا تو اس میں انہوں نے پارلیمنٹ میں اپنے کو (Dreamer) جینس کے مثل کاروائی کرنے کا حوالہ دیا۔ ریٹائر ہونے کے بعد جب وہ اپنے احتساب نفس پر راغب ہوئے تو ان کو اپنے کارناموں میں وہ بات نظر نہیں آئی جو انہوں نے کی بلکہ وہ بات جو انہیں کرنی چاہئے تھی۔

مارلے کی جو عادت فلسفیانہ طور پر سوچنے کی تھی وہ بھی اس غلط فہمی کی ذمہ دار تھی وہ متوسط زمانہ کے مادی ترقی سے ترقی کر کے آزادی کی منزل تک پہونچنے کی بات کرتے تھے آزادی اور مطلق انسانی میں مصالحت سوچتے تھے اور یہ بنیادی سوال اٹھایا کہ برطانوی راج کا ہندوستان میں کیا مقصد ہے ان کا جواب تھا " یقیناً انصاف، قانون اور انسانیت کے ان خیالات کی دھیرے دھیرے عقلمندی اور ہوشیاری کے ساتھ نشوونما کرنا جو ہماری تہذیب کی بنیادیں ہیں " /34 ان کا جواب اسی نوعیت کا تھا جو مکالے نے ستر سال قبل ظاہر کیا تھا۔

اس خط کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جو جواہر لال نے اس وقت جب انگلستان میں ایک طالب علم کی حیثیت سے رہتے تھے اپنے باپ کو لکھا تھا۔

" چند ہفتے ہوئے سیٹرڈے ریویو Saturday Review نے ایک عاقلانہ رائے زنی کی تھی اس نے لکھا ہے کہ " ہندوستان سلف گورنمنٹ تو ضرور حاصل کریگا لیکن ۔ اور یہیں پر دقت واقع ہوتی ہے ۔ طبقات الارض کے چند کروٹیں بدلنے سے پہلے نہیں ۔ سب سے بڑی دقت تعلیم کی ہے اور کتنی کروڑ نسلوں کے گزر جانے کی ضرورت ہے ان کو (ہندستانیوں کو) تعلیم دینے کے لئے ہوگی تاکہ وہ نوآبادیات کے معیار تک پہونچ سکیں " /35

VI منٹو کے خیالات

ان کے دوسرے غیر شاعرانہ حصہ دار کو ان بلند عاقلانہ گفتگوؤں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ان کو یہ یقین کہ جس طرح سوراج کا تخیل گوکھلے کے دماغ میں ہے اس کے معنی مزاج کے

34- Minto Papers: Morley to Minto, 7 October 1908.

35 - Nerman, D (ed) Jawahar Lal Nehru First Sixty years Vol I, P16.

ہیں۔ وہ سوال کرتا تھا کہ "کیا عوام الناس کو بپن چندر پال جیسے آدمیوں کے گروہ کے حوالے کر دیا جائے؟ 36 وہ سمجھتے تھے کہ کانگرس میں وہ اہلیت ہی نہیں ہے کہ وہ گورنمنٹ میں کوئی حصہ لے سکے۔ مارلے کے اس بیان کی کہ اگر اصلاحات کو راج نے نہ بچایا تو کوئی اور چیز اسے بچا نہ سکے گی۔ منٹو تردید کرتا تھا اس کا کہنا تھا کہ ہم راج کے لئے اتنی سخت لڑائی لڑیں گے جیسی سخت لڑائیاں ہم لڑتے رہے ہیں اور ہم کامیاب ہوں گے جیسا کہ ہم ہمیشہ کامیاب ہوتے رہے ہیں" 37

21 مارچ 1907ء کو جو مکتوب گورنمنٹ آف انڈیا نے وزیر ہند کو بھیجا اس کے تشریحی مراسلہ میں منٹو نے اصلاحات کے بارے میں اپنا رویہ واضح الفاظ میں بیان کر دیا تھا۔

"ہندوستان نمائندہ حکومت کے قیام میں وکالت نہیں کر سکتا۔ یہ مشرق کے ذائقہ کے خلاف مغرب سے ایک درآمد شے ہو گی۔ . . . گورنمنٹ آف انڈیا کو بالضرور مطلق العنان ہونا چاہئے۔ اقتدار اعلیٰ برطانوی ہاتھوں میں مضبوطی سے قائم رہے۔ اور یہ اقتدار کسی قسم کی نمائندہ اسمبلی کو ہرگز تفویض نہیں کیا جا سکتا" 38

مارلے نے یہ تجویز کیا تھا کہ نظم و نسق میں برطانوی طرز کو نہیں بلکہ صرف اس کی روح کو داخل کیا جائے۔ اس پر منٹو کا رد عمل یہ تھا کہ "مطلق العنان اور دستوری طرز کو دستوری مطلق العنان میں ضم ہونا چاہئے" 39 مطلق العنان اس طرح قائم رکھی جائے کہ اس پارٹی کو کچل دیا جائے جو سلف گورنمنٹ مانگتی ہے اور اعتدال پسند لوگوں کو موافق کیا جائے" یہ لوگ گورنمنٹ کی طرح صف آراء ہو جائیں گے اور طاقت کے توازن کے رد و بدل اور ہندوستان میں جمہوری نظام کے قیام کی مخالفت کریں گے" 40

منٹو نے اس کی تشریح اس طرح کی: "دستوری مطلق العنانی اپنے کو قواعد و ضوابط کے مطابق

---

36 - Quoted in . M. N. Das , op. cit. P. 17

37 - Minto Papers : Minto to Morley ; 17 May 1908.

38 - Mary, Countess of Minto, India Morley and Minto . P. 110.

39 - Ibid .

40 - Minto Papers : Minto to Morley , 2 march , 1907

حکومت کرنے کے لئے پابند کرتی ہے اور نئے مشوروں میں تمام مفادات
کے نمائندوں کو جو نمائندگی کے قابل ہیں شریک کرتی ہے (لیکن) یہ اپنے اقتدار اعلیٰ
کی حیثیت اور مطلق العنان طاقت کو صرف اپنے لئے مخصوص رکھتی ہے "/41

اس لئے ان کی تجاویز یہ تھیں "(1) راجگان کی ایک کونسل بطور ایک مشاورتی جماعت کے قائم
کی جائے (2) مرکزی اور لوکل کونسل، فرقہ اور مفادات کی بنیاد پر وسیع تر کر دیا جائے اس طرح
1892ء کے کونسل ایکٹ میں انہوں نے پیشہ وروں کی نمائندگی کو سیراب کیا اور (الف) زمیندار (ب)
(ب) تاجروں اور مالکان صنعت اور (س) مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب کے ساتھ آبادی کے تناسب
سے زیادہ دے کر نمائندگی میں وسعت دی۔

دستوری اصولوں سے ان کی یہ مراد تھی کہ کونسل کے کاموں کو وسیع تر کیا جائے۔ یعنی
بجٹ کی بحثوں میں حصہ لینے کے کافی مواقع دیئے جائیں۔ تجاویز پیش کرنے، سوالات کرنے
التوا، بحث کی تجاویز دینے کے اختیارات دیئے جائیں۔ اور نمائندگی کے حق کو تسلیم کیا
جائے۔

مارلے اور منٹو دونوں کے خیال کے مطابق ریفارم کا منشا یہ تھا کہ ہندوستانیوں کو گورنمنٹ
سے اور زیادہ پیوست کیا جائے مگر مارلے کی دماغی پریشانی یہ تھی کہ "ہم سب لوگ ایک
اخلاقی میدان میں ہیں دیسی لوگوں کے مزاج کو نہیں جانتے کہ ہمارے دماغوں
میں کیا ہے تو کس طرح اس شگاف پر پل تیار کیا جائے؟ یہ ہے اصل
سوال" /42

منٹو نے اس کا حل پیش کیا۔ یعنی گورنر جنرل کی ایگزیکٹو کونسل میں ایک ہندوستانی
کی تقرری کر دی جائے مارلے اس پر اس بات کو ترجیح دیتا تھا کہ وزیر ہند کی کونسل میں ہندوستانیوں
کو شامل کیا جائے چونکہ دونوں پل کی تلاش میں سرگرداں تھے اس لئے دونوں نے متفق ہو
کر یہ طے کر دیا کہ دونوں کونسلوں میں ہندوستانیوں کو جگہ دی جائے۔

---

41. Ibid.

42. Minto Papers: Morley to Minto 16 May, 1907.

V ریفارم کی تجویز

بہت تاخیر اور طبوری بحثوں کے بعد وزیر ہند اور گورنمنٹ آف انڈیا میں ریفارم کی اسکیم پر اتفاق آرا ہوا جس میں منٹو کے "دستوری مطلق العنان" کے اصول کو بنیاد قرار دیا گیا۔ یہ شہنشاہانہ اقتدار پر ذرہ برابر بھی اثر انداز نہ تھی اور اس لئے حکومت کی مطلق العنانی کی حیثیت کو برقرار رکھتی تھی۔ لیکن اس نے اس ضرورت کو پورا کیا جس کی جانب ہیوم (HUME) نے ڈفرن کی توجہ بیس سال قبل مبذول کرائی تھی۔ اور جس کا اشارہ مارلے نے بھی کیا تھا۔ یعنی یہ کہ ہندوستان کی رائے عامہ سے گورنمنٹ کی عدم واقفیت۔ کانگرس جسے ہیوم یہ سمجھتا تھا کہ اس ضرورت کو پورا کر دیگی وہ ناکافی ثابت ہوئی کیونکہ اس کا اجلاس سال میں ایک بار ہوتا تھا۔ جبکہ اس نئے دور شور اور اتھل پتھل میں جب واقعات تیزی کے ساتھ حرکت کر رہے ہیں اور رائیں تیزی سے تبدیل ہوتی رہتی تھیں۔ یہ ضروری تھا کہ کسی ایسی مشنری کو ایجاد کیا جائے جو گورنمنٹ کو مسلسل اور روز بروز اطلاع دیتی رہے۔

کونسلوں میں وسعت دے دی گئی اور ان کے کام بھی وسیع تر کر دیئے گئے جزاً ان میں وہ ممبران بھی تھے جو حلقہ ہائے انتخاب سے چن کر آتے تھے۔ یہ حلقے چھوٹے اور تنگ تھے لیکن صوبوں کی کونسلوں میں ہندوستانی عنصر کا اضافہ ہو گیا جو ممبران منتخب ہو کر آئے وہ ایک ایک گروہ کی آرا کے نمائندے تھے کیونکہ گورنمنٹ نہ تو اس پر یقین کرتی تھی کہ ہندوستان کے لوگ ایک قوم ہیں اور نہ قومیت کو نشو و نما دینے کے لئے تیار تھی۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اصلاحات کا منشاء صرف یہ تھا کہ کانگرس جو اتحاد قومی کے لئے سرگرم عمل تھی۔ اس کے مقابلہ میں ایک ہم وزن جماعت تھی ــــ مارلے اور منٹو دونوں اس بات کے لئے بڑی تمنا رکھتے تھے کہ وفادار عناصر کو صف آرا کیا جائے۔ وہ جماعت تھی جو برطانوی راج کو ہمیشہ کے لئے قائم رکھنا چاہتی تھی اور بیرونی حکومت جو اپنا پنجہ ملک پر تغلبہ کی صورت میں جمائے رکھنا چاہتی تھی اس کی حامی تھی۔ اسی کے ساتھ اس جماعت کی یہ بھی خواہش تھی کہ اس تعلیم یافتہ طبقہ کی نہ صرف ہمت شکنی کرے بلکہ ان کی راہ میں روڑے اٹکائے۔ جو قوم کی تعمیر کے انتہائی مشکل کام میں لگے ہوئے تھے اور جن کے بارے میں برک نے حسب ذیل تقریر کی تھی:۔

"وہ لوگ تکان سے کتنا چکنا چور قدم اٹھاتے ہیں۔ جو عوام الناس کی کثیر آبادی میں سے ایک سیاسی حیثیت سے بہادر شخصیت کی تلاش میں منزل کی جانب۔

رواں ہوتے ہیں"43/

اس سے قبل اصلاحات سے متعلق جو مراسلات منٹو نے مارلے کو بھیجے ان میں اپنے ارادے کو واضح طور پر بیان کر دیا تھا۔ انھوں نے لکھا "ہم یہاں ایک چھوٹے سے برطانوی فوجی قلعہ کی شکل میں ہیں جن کو کروڑوں آدمی گھیرے ہوئے ہیں اور جن میں اتنے آتش گیر مادے ہیں جن سے مغربی دنیا ناواقف ہے اور اس لئے ہمکو مادی طور پر مضبوط ہونا چاہیئے ورنہ ہمارا شکست کھا جانا یقینی ہے 44"

اس خطرے سے نپٹنے کے لئے ضروری تھا کہ "کانگریس کے مقاصد کے مقابلہ میں ایک ہم وزن ترازو کا دوسرا پلڑا اختیار کیا جائے" 45 سب سے زیادہ کارآمد توڑ "کونسل آف پرنسز" کے علاوہ یہ تھا کہ گورنمنٹ کے لئے مسلمانوں کی حمایت حاصل کی جائے تاکہ قومیت کا جو شعور اگ رہا ہے اور "جو اس وقت تک بھی ہندو اور مسلمانوں کو ایک مشترک مقصد پر متحد ہونے کا کام رہا ہے اس میں رنگ لگا دی جائے" 46/

منٹو نے اس پالیسی کی بنیاد پہلے ہی رکھ دی تھی جس کا اظہار انھوں نے یکم اکتوبر 1906 کو مسلمانوں کو یقین دہانی کے طور پر ان الفاظ میں کیا کہ چونکہ آج تک طریقہ قانون ساز کونسلوں میں انتخاب یا نامزدگی رہا ہے وہ مسلمانوں کو معقول تحفظ دینے میں ناکامیاب ہے۔ اس لئے وہ ان کی نمائندگی کے طریقوں سے مطالبات کو تسلیم کر لینے کے حق میں ہیں۔ اور یہ کہ ان کی نمائندگی نہ صرف ان کی تعداد کے لحاظ سے ہو بلکہ ان کی سیاسی اہمیت اور ان خدمات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہو جو انھوں نے مملکت شاہی کی انجام دی ہیں۔ انھوں نے مسلمانوں کا یہ حق بھی تسلیم کر لیا کہ وہ اپنے نمائندے جداگانہ انتخاب کے ذریعہ بھیجیں۔ انھوں نے اقرار واثق کے طور پر اعلان کیا کہ "ہندوستان میں ہر وہ انتخابی نمائندگی لازمی طور پر فسادانگیز ناکامی پر منتج ہوگی جس کا مقصد شخصی رائے دہندگی کے حقوق کا ادا کرنا، ان فرقوں کے اعتقادات اور روایات کو نظرانداز کر کے ہو جو اس بر اعظم

43- Wolpert, Op. cit P. 42.

44- Minto Papers, Minto to Morley, 28 May 1906.

45- Ibid.

46- Minto's Memorandum 21, March 1907. Cited in Lady Minto op. cit.

کی کثیر آبادی کے اجزا ہیں" [47] منٹو نے جو وعدے کئے تھے مارلے نے ان کی منظوری دے دی۔

اس طرح فرقہ پرستی کے اسپ تراتے کو نیشنلزم کے اس قلعے کے اندر دوڑا دیا گیا جو کہ آہستہ آہستہ تعمیر ہو رہا تھا۔ اس نے اس قلعہ کو دو ٹکڑوں میں توڑ دینے کی کامیابی تو حاصل کی لیکن کتنے نقصان کے ساتھ۔ کیونکہ چالیس سال بھی نہیں گزرے تھے کہ ہندوستان کی ارضی سالمیت برباد ہو گئی اور اسی کے ساتھ شہنشاہیت کا وہ قلعہ بھی مسمار ہو گیا جس کی بقا کے لئے فرقہ واریت کو دھکا دے کر اوپر لایا گیا تھا۔

مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب اور آبادی سے زائد نمائندگی دینا ہندوستان کے نقطہ خیال سے اسکیم کا انتہائی قابل اعتراض جز و تھا۔ مارلے نے اسے لبرلوں ہی غیر ذمہ دارانہ موڈ میں منٹو کے اصرار پر منظور کر لیا تھا [48] لیکن جیسے ہی انھوں نے اس پر قریب سے غور کر کے دیکھا تو ان کا لبرل پارٹی کے اصول سے مرتب کیا ہوا ضمیر ان کو ستانے لگا۔ وہ اس اسکیم کو عملی شکل دینے میں دقت محسوس کرنے لگے۔ کیونکہ یہ نمائندہ حکومت کی جڑ پر ایک کاری ضرب کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس لئے انہوں نے ایک نیا فارمولا پیش کیا جس سے منقسم حلقہ انتخاب کے بُرے اثرات کم ہو جاتے تھے یعنی یہ کہ مشترکہ انتخابی حلقہ بنائے جائیں۔ ان حلقوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتنے ممبران ہی ہوں گے جتنی سیٹیں ہر فرقہ کو دی گئی ہوں گی۔ لیکن ان حلقوں کے ممبران کا انتخاب مشترکہ عام رائے دہندگان جو زمینداروں، دیہی بورڈوں، ڈسٹرکٹ بورڈوں، میونسپل کمیٹیوں وغیرہ پر مشتمل ہوں گے ان کے ذریعہ ہوگا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے جو تعداد مقرر ہو چکی ہوگی اسی کے مطابق لیجسلیٹو کونسلوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو اس طرح کے بنے ہوئے مشترکہ حلقے منتخب کریں گے۔

اسکیم نے ہر حلقہ انتخاب کے لئے ایک کالج (حلقہ) تجویز کیا تھا۔ اور اس مقام کے تمام طبقوں اور فرقوں کو اس میں نمائندگی دی گئی تھی اور اس کا منشا یہ تھا کہ ہر فرقہ کو معقول نمائندگی ملا ان کو

47- Minto reply to the Muslim Deputation, Lady Minto op. cit. PP. 46-47.

48 - Despatch of 19 May 1907, from the Secretary State to the Govt of India, Para 26.

جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب میں تقسیم کئے ہوئے حاصل ہو۔

مارلے کی تجویز گورنمنٹ آف انڈیا کے مقصد کے منافی اور منٹو نے جو پالیسی قائم کی تھی اور جو وعدے دیئے تھے ان سے متضاد تھی۔ گورنر جنرل نے قدرتاً اس اسکیم سے سخت اختلاف اور مسلمانوں کی بغاوت کا ہوا کھڑا کیا۔ انہوں نے یہ دلیل پیش کی کہ وفادار مسلمان۔ جو حکومت کا خاص سہارا ہیں کے پیروں میں لغزش آجائے گی اور نوجوان مسلمان سیاسی شورش کے گرداب میں پھینک دیئے جائیں گے۔

انہوں نے مارلے کو لکھا "مسلمان رائے دہندگان کا علیحدہ وجود ضروری ہے۔ اگر ہم اس نقطہ نظر سے ذرا بھی پیچھے ہٹتے ہیں تو ہندوؤں کی مخالفت سے جس پریشانی کا امکان ہو سکتا ہے اس سے کہیں زیادہ کا ہم کو سامنا کرنا پڑیگا" 49/

جہاد کے پرشور و فساد انگیز نعرے کے خوف نے مارلے کی ہمت توڑ دی اور حسب دستور سابق انہوں نے سپر ڈال دی اور انہوں نے منٹو کی جداگانہ انتخاب کی تجویز ہو بہو تجویز کر لی اس طرح مسلم فرقہ کے لئے نہ صرف جداگانہ انتخاب باقی رہا بلکہ عام انتخابات اور نامزدگیوں میں بھی اس کو فاضل حصہ ملا۔

اس ڈرامے کی آخری پردہ گرنے کی گھنٹی بھی اس وقت بج گئی جب 25 مئی 1909 کو دارالعوام نے مارلے کو انڈیا کونسل بل پر اپنی منظوری کی مہر ثبت کر دی اور اسے پارلیمنٹ کے منظور کردہ قوانین کے رجسٹر میں بطور ایک وضع شدہ قانون کے درج کر دیا۔

ریفارم پر ذہنی تاثرات کا اظہار

سوال یہ ہے کہ ہندوستان اور انگلستان کے باشندوں کے اس ریفارم کے بارے میں کیا ذہنی تاثرات تھے۔ مارلے نے دارالامراء میں اس کی تشریح یوں کی تھی کہ یہ ان اصولوں کی توسیع ہے جن پر 1861 اور 1892 کے ایکٹ بنے تھے۔ یہ شرح مجموعی طور پر صحیح تھی۔ انڈیا کونسل ایکٹ 1909 اپنے پہلے کے منظور شدہ قوانین کی طرح گورنمنٹ کی کوئی ذمہ داری نہیں سونپی تھی اور نہ گورنمنٹ آف انڈیا کے فیصلوں میں کسی قسم کی تبدیلی یا ترمیم یا تنسیخ ہی کا کسی قسم کا اختیار دیا تھا۔ اس نے صرف

49- Minto to Morley. 7 April 1909 Cited in Gilbert. M. Op. cit P. 173.

بحث ومباحثہ اور اطلاعات حاصل کرنے کے حقوق ادا کئے تھے اور دوسری جانب اس نے ہندو اور مسلم فرقوں کے باہمی اختلاف کو بہت وسعت دے دی تھی۔

برطانیہ کے قدامت پرست خیال کے لوگ اسے ایسا انقلابی قانون تصور کرتے تھے جو قطعی غیر ضروری اور درحقیقت مضرت رساں تھا۔ آرتھر بالفور جو پارلیمنٹ میں قدامت پرست حزب مخالف پارٹی کا لیڈر تھا۔ مارلے کے اس اعلان کا حوالہ دیتے ہوئے کہ ہندوستانی نمائندہ حکومت کے لئے نااہل ہیں۔ سوال کیا کہ "آپ کیوں ایسی اسمبلی کو بنانے کے لئے سب کچھ کرتے ہیں جو نمائندہ نہیں ہیں اور ہندوستان کو آپ کو بنانا چاہتے۔ ہماری کارروائیوں کی بدترین اور حد سے زیادہ مختلف طلب فضول نتائج میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ بات میری سمجھ میں کسی طرح نہیں آتی ہے" 50

لیکن پارلیمنٹ کے انتہا پسند ممبر مسٹر کاٹن (Cotton) اور آرتھر فورڈ Aurthurford نے اس ایکٹ کا یہ کہہ کر خیر مقدم کیا "سلف گورنمنٹ کی ایک اول قسط ہے اگرچہ یہ بہت ہلکی ہے" 51

ہندوستان میں منٹو نے امپیریل لیجسلیٹو کونسل میں بیان کیا کہ "ہم نے صاف صاف یہ طے کر رکھا ہے کہ مغربی انداز کی نمائندہ حکومت انڈین امپائر کے لئے قطعی ناقابل عمل ہے اور مشرقی اقوام کی روایات کے ناموافق ہوگی" 52

انڈین نیشنل کانگرس جو معتدلین پر مشتمل تھی اس کا اجلاس دسمبر 1908ء میں بمقام مدراس ٹھیک اس کے بعد ہوا جب مارلے نے 17 دسمبر 1908ء کو اپنا قانون پارلیمنٹ میں پیش کیا تھا اور اصلاحات کا بلا شرط مکمل خیر مقدم کیا اس نے یہ ریزولیشن منظور کیا "کانگرس اس گہرے اور عام اطمینان کا اظہار کرنا چاہتی ہے جس سے ان اصلاحات کا کام ملک میں خیر مقدم کیا گیا ہے جن کی تجویز لارڈ مارلے کے مکتوب میں کی گئی ہیں یہ اس اعلیٰ تدبر کار یکارڈ قائم کرنا چاہتی ہے جس نے گورنمنٹ کو اس قانون کے لانے

---

50 - Parliamentary Debates, House of Commons, 1st April 1909 Vol II, Col 557.

51 - Ibid

52 - Proceedings of the Legislative Council of the Governor General of India, 25 January, 1910

کی ترغیب دی اور یہ لارڈ مارلے اور لارڈ منٹو کا ان کی تجویزات کے لئے
صدقِ دل اور احسان مندانہ شکریہ ادا کرتی ہیں"/53

راس بہاری گھوش صدر نے ان الفاظ میں رجز خوانی کی ہے "ہمارے سروں کے اوپر برکتوں کے بادل ٹوٹ کر برس رہے ہیں اور خشک اور پیاسی زمین کو سیراب کر رہے ہیں۔ انگریز کا تدبر جس کے لئے مارلے نے بجا طور پر فخر کیا تھا اور دنیا میں جو کبھی ناکام نہیں ہوا ہے وہ اس نازک موقع پر اپنی مکمل عظمت پر پہنچ گیا ہے اور اس سنہرے موقع کو گرفت میں لے لیا ہے کیونکہ اسے اس بات کا علم ہے جب موقع و محل سے فائدہ اٹھایا جائے اور جبر و استبداد سے کام نہ لیا جائے بلکہ اس جدید اسپرٹ کی رہنمائی کی جائے جو انگلستان نے ہندوستان میں پیدا کیا ہے"/54

بدقسمتی سے یہ پرجوش مسرتیں قبل از وقت ثابت ہوئیں۔ مارلے نے جب مسلمانوں کے انتخاب کے سوال پر سپر ڈال دیا تو معتدلین کو سخت صدمہ ہوا۔ نوید فتح نوحہ عزاداری میں بدل گیا ہے۔ دسمبر ۱۹۰۹ء میں لاہور کے مقام پر کانگریس کی صدارت کرتے ہوئے مدن موہن مالویہ نے کہا "یہ تو اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ بدلہ لینے کے انداز میں ہے اس سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مطلب ہے کہ اقلیت اکثریت کو زیر کرکے اسے ایک کونہ میں لے جا کر گرا دے۔ ہندو اقلیتیں جو دونوں صوبوں (پنجاب اور مشرقی بنگال و آسام) میں ہیں شدید سردی میں ٹھٹھرتی ہوئی چھوڑ دی گئی ہیں"/55
انھوں نے آگاہی دی کہ "ان قوانین نے برطانوی راج کی تاریخ میں اول بار مذہب کو نمائندگی کی بنیاد قرار دیا ہے اور اس طرح ہزمجسٹی کی مسلم اور غیر مسلم رعایا کے مابین ایک دیوار کھڑی کر دی ہے"/56

---

53 Report of the Indian National Congress 1908, Resolution II, The Indian National Congress, Natson G.A, 2nd Edition Part II P.127
54 Ibid Part I P.900
55 Ibid P. 948
56 Ibid P. 955

مخصوص نیشنلسٹ لیڈران یا تو جیل کی سلاخوں کے پیچھے تھے یا جلا وطن کر دیئے گئے تھے لیکن ان کے ردعمل کا اندازہ۔ اگر ان اصلاحات کا منشا یہ تھا کہ بے چینی کو سکون سے بدل دے اور اب تحریک پر تیل ڈال دے تو وہ اس میں قطعی ناکام تھے۔ جھاگ اور ابال جبر و استبداد کی وجہ سے دب گیا ہو تو دب گیا ہو لیکن اندر جو طوفانی موجیں چل رہی تھیں وہ بدستور رواں تھیں۔ ایک مذموم چکر 'تشدد' جبر و استبداد اور مزید تشدد کا پیدا ہو گیا تھا۔ وہ اٹوٹ رہا۔ افق پر شک اور خوف کا غبار جمع ہو گیا۔ ویلنٹائن چیرول V. Chirol نے لیڈی منٹو کو لکھا۔

"اسی طرح یہ اصلاحات مرض میں تخفیف کرنے والی دوا کی طرح کچھ عرصہ کے لئے موقع پرستوں کو ممکن ہے کہ یہ جانبدار رکھ سکیں لیکن ان کا برائی سے کوئی تعلق نہیں ہے"/57

مانٹیگو چیمسفورڈ رپورٹ نے منٹو مارلے اسکیم کی ناکامی کو تسلیم کیا۔ اس میں تحریر تھا کہ "۱۹۰۹ کی اصلاحات نے ہندوستان کے سیاسی مسئلہ کا کوئی علاج تجویز نہیں کیا اور نہ ہی کوئی علاج تجویز کر ہی سکتے تھے"/58

VII مسلمانوں نے ریفارم کا خیر مقدم کیا۔

صرف ایک پارٹی جو اصلاحات سے مطمئن تھی وہ مسلم لیگ تھی کیونکہ اس کو وہ سب کچھ مل گیا تھا جو وہ مانگتی تھی لیکن ان کی پرجوش مسرت حسرت کو تاہ نظری پر مبنی تھی۔ منٹو اور ڈنلپ اسمتھ جو ان کا پرائیویٹ سکریٹری اور مشیر خاص اور سپر اور ڈفنڈ موریجی تھا"/59

57- Gilbert, M. op P 236 Letter of Valentine Chirol to Lady Minto, 4 May 1910.

58- Report on Indian Constitutional Reforms (1918) PP 68-69

59 Gilbert M. Dinlop Smith, encouraged Minto to reply in and to gader the loyalty of certain groups of Indian in particular the princes and the Muslims" He persuaded Minto to believe Indian nationalism was a passing Phenomena - P 252

اور یہ سب بہت سے مداح اور حمایتی حد سے زیادہ مطمئن تھے ان کا یہ یقین تھا کہ مسلمانوں کو راضی کرنا از حد ضروری ہے۔ خواہ اس سے ہندوؤں کی ناراضگی کیوں نہ مول لینی پڑے۔ لووات فریزر نے ڈنلپ اسمتھ کو لکھا "ہندوستان میں ہمارے لئے سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ایک دوستانہ معاہدہ نہ ہو جائے جیسی کہ ذرا کم عمر اور لائق مسلمانوں کی خواہش ہے۔ آغاخان کی طرح کے لوگ صفائی کے ساتھ یہ محسوس کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ الگ سلوک کرتے ہیں ہم لوگ اپنے معاملے سے زیادہ ان کی لڑائی لڑ رہے ہیں۔ اگر اسلام اور ہندوازم میں دوستانہ معاہدہ ہو گیا تو ہم کو مسلمانوں سے کہیں زیادہ خسارہ ہوگا" /60

مسلمان وفادار تھا۔ کیا محمد شفیع نے جو لاہور کے ممتاز وکیل اور مسلم لیگ کے بانیوں میں تھے ڈنلپ اسمتھ کو یقین دلایا تھا کہ "میں خلوص کے ساتھ اس بات پر عقیدہ رکھتا ہوں کہ مسلمان فرقے کے مفادات گورنمنٹ کے مفادات کلیتاً ہم آہنگ ہیں" /61

مسلمان نوجوانوں میں جو جذبہ کانگریس کے مقاصد سے ہمدردی کا پیدا ہو رہا تھا اس سے انگریز خوف زدہ ہو گیا۔ کیونکہ یہی وہ خطرہ ہے جس سے برطانوی اور غیر سرکاری حضرات اور رجعت پسند مسلمانوں نے مارلے اور منٹو کو یا تھا۔ اس لئے ان لوگوں نے یہ یقین کر لیا تھا کہ قومی یک جہتی اور انڈین نیشنل کانگریس کی ہر دلعزیزی مملکت برطانیہ کے لئے ایک عظیم خطرہ ہے اور اس کا واحد علاج یہ ہے کہ وفادار عناصر کو مخالفت میں صف آرا کیا جائے۔ اور خاص کر مسلمانوں کو موافق بنایا جائے۔ مسلمانوں کی بغاوت کی خیالی تصویر نے مارلے کو اس قدر ہراساں کر دیا کہ وہ تمام انتہاپسندوں سے کنارہ کش ہو گیا۔

کیا گورنمنٹ آف انڈیا کے خطرات واقعی تھے یا محض ایک لبادہ تھا جو دوسرے گہرے منصوبوں کو چھپانے کے لئے اوڑھ لیا گیا تھا۔ کیا وہ واقعی ایک مسلم بغاوت کے خطرے سے خائف تھے یا اپنے راج کو پائیدار بنانے کے لئے دونوں فرقوں کے

60- Gilbert n. op P202, Lovat Fraser to Dunlop Smith 20 July 1907

61- Ibid P 177

درمیان شگاف کرنے کے لئے مضطرب تھے؟

اس کا جواب ہندوستان کے اندر ان حالات میں مل سکتا ہے جو اس صدی کے پہلے دس سالوں میں تھے سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ۱۹۰۶ تک مسلمانوں کا کوئی ایسا نظام نہیں تھا جو انڈین نیشنل کانگریس کی طرح گورنمنٹ کے خلاف سیاسی ایجیٹیشن میں قوم کی رہنمائی اور رہبری کر سکے۔ اگرچہ دس سال کے بعد معاملہ مختلف تھا۔

مسلم لیگ جو ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ کو عالم وجود میں آئی وہ ابھی بچپن کے دور میں تھی یہ اونچے طبقہ کے کچھ مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ ان کے پیروؤں میں کچھ مالکان آراضی اور کچھ وہ مسلمان تھے جنھوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی اور جو اسی طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ علی گڑھ مسلم لیگ کا قلعہ اور اس کا مرکز تھا۔

اس طبقہ کے مسلمان۔ جن میں سے زیادہ تر کا ان خاندانوں سے تعلق تھا جنھوں نے موافق برطانیہ دور میں ممتاز کردار ادا کیا تھا۔ جب تجارت، صنعت، دولت اور تعلیم اور نمائندہ جماعتوں۔ مثل قانون ساز جماعتوں، یونیورسیٹیوں کی سینیٹ، ڈسٹرکٹ اور میونسپل بورڈ وغیرہ میں اپنی کمتر حیثیت کا مقابلہ ہندوؤں کی ان ترقی یافتہ حالات سے کرتے تھے جو انھوں نے ان میدانوں میں حاصل کر لیا تھا تو وہ بہت ہی اذیت اور کوفت محسوس کرتے تھے اگرچہ مسلمان لیڈران اور گورنمنٹ دونوں ہندوؤں کے مقابلہ میں مسلم فرقہ کی عام پسماندگی کو تسلیم کرتے تھے لیکن یہ پسماندگی ان کی خودداری پر ایسی اذیت ناک ضرب تھی اور حالات کو بہتر بنانے کی خواہش اتنی شدید تھی کہ انھوں نے اہلیت کے خیال کو غور و فکر کے قابل ہی نہیں رکھا۔

حکمرانوں نے مسلمانوں کے اضطراب اور پریشانیوں کا فائدہ اٹھایا۔ اور مسلمانوں کے دماغ میں یہ بھر دیا کہ ایک عام نمائندگی پر مبنی نظام میں ہندو اکثریت اقلیت کے مفاد کو کچلنے کا کام کرے گی۔ اس میں مسلمان لیڈروں نے کسی دوربینی کا اظہار نہیں کیا۔ ان کے نزدیک سا جھا گورنمنٹ کا تصور ایک قطعی فضول خواب تھا۔ ان لوگوں کے اندر یہ عقیدہ راسخ ہو چکا تھا کہ حکومتِ برطانیہ ابد الآباد تک رہے گی یہ لوگ اس بات کو بھول گئے تھے کہ آخر کار ان لوگوں کو ہندو اکثریت کے ساتھ ہی زندگی گذارنی تھی خواہ انگریز رہیں یا جائیں۔ اس خواہی نخواہی باہمی زندگی کے لئے صلح اور لین دین کے جذبے کی ضرورت تھی۔ یہ لوگ اس بات

62:- Gilbert. M. op. P. 57

کا اندازہ نہ کر سکے کہ ہندوستان پر ایک بیرونی حکومت کے اقتدار کے قائم رہنے کے یہ معنی تھے کہ ہندوستان کی معیشت لوٹ کھسوٹ کا شکار ہوتی رہے۔ اور عام مسلمان مفلسی اور مصیبت میں مبتلا رہیں۔ اپنے فرقہ کے چند فوری مفادات حاصل کرنے کے لئے یہ لوگ ان کا کردار ادا کرنے پر راضی ہو گئے جن کو ان کی قوم کے حقیقی فوائد اور عزت و شان کا ادنی بھی لحاظ نہ تھا۔

یہ بات کہ حکمراں طبقہ ایسے لیڈران کے بارے میں کوئی بلند و بالا رائے نہیں رکھتا تھا اس مراسلت سے بخوبی واضح ہے جن میں مارلے اور منٹو نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مثلاً منٹو نے آغاخاں کے بارے میں لکھا کہ ہندوستان کے معاملات سے زیادہ یورپ کے دوم درجہ کے ایوان سرود کی باتیں زیادہ جانتا ہے۔

مارلے کے خیال کے مطابق امیر علی ایک خود پسند کی مقرر ہے جو نائٹ کے خطاب کے لئے تدبیریں کراتا ہے لیکن پھر بھی آغاخاں نے منٹو کے پرائیویٹ سکریٹری ڈنلپ اسمتھ کو ایک مغرورانہ شان کے لہجہ میں لکھا۔

"میں نے مسلم وفد کے تمام ممبروں سے کہا ہے کہ وہ ایک مستقل کمیٹی بنالیں اور میں نے اپنے قدیم دوست محسن الملک کو جیسا کہ آپ جانتے ہیں جو ایک انتہائی وفادار اور پرجوش مسلمان ہیں طریقہ کار کے بارے میں چند ہدایات دے دی ہیں جن کے ذریعہ وہ کارروائی کر سکیں گے میں نے ان سے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ کوئی قدم اٹھانے سے پہلے پرائیویٹ طور پر اس کا ضرور اطمنان کریں کہ اس کے لئے گورنمنٹ کی پوری رضامندی ہے" /62

محسن الملک بھی اطاعت شعاری کے پرجوش اظہار میں ان سے کم نہ تھے اور انھوں نے وفد کے بعد ڈنلپ اسمتھ سے کہا کہ "منٹو کی تقریر نے ہمارے اندر ایک نئی امنگ پیدا کر دی ہے اور ہم لوگ اور ہماری آنے والی نسلیں بھی اسے ہندوستان کی گورنمنٹ کی پالیسی کے تاریخی اعلان کی حیثیت سے انتہائی جذبۂ شکرگذاری کے ساتھ اپنے دلوں میں محفوظ رکھیں گے" /63

62, Gilbert m., opcil - p. 57 / 63. India –
63. Ibid

کس طرح مسلمانوں کے منصوبوں کو فروغ دیا گیا اور علیحدگی پسندی کے جذبات کی ہمت افزائی کی گئی اسے گلبرٹ (Gilbart) نے بیان کیا ہے

اکتوبر میں مسلم وفد کی موافق پذیرائی کے بعد مسلمانوں نے نہایت تیزی کے ساتھ یہ مطالبہ پیش کر دیا کہ ہر نظام میں جو انتخاب پر مبنی ہو مسلمان قوم کو مخصوص حقوق نمائندگی دیے جائیں ''/ 64

کلکتہ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس لارنس جنکنس نے مسلمانوں کی نمائندگی کے بارے میں گورنمنٹ کے ایک اور رویہ پر سے پردہ ہٹایا ہے اور انھوں نے مارلے کو لکھا "ہندوستان میں بہت سے ایسے لوگ ہیں جو مسلمانوں کے حمایتی ہیں لیکن وہ ایسا صرف اس لئے کر رہے ہیں کہ" وہ اسے سب سے زیادہ مؤثر طریقہ آپ کی اسکیم کو ناکام بنانے کا سمجھتے ہیں ''/ 65

حتیٰ کہ منٹو بھی جو مسلم علیحدگی پسندی کا دینی باپ تھا وہ خود اس خطرناک چیز سے خائف تھا جسے خود اس نے ترغیب و تحریص کے ذریعہ بنائی تھی اس نے مارلے کو شکایتاً لکھا کہ مسلمانوں کا ایجیٹیشن وطن سے کھڑا کیا گیا ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ وہ اس تعداد کے مستحق ہیں جو ان کے لئے متعین کی گئی ہے'' / 66

مارلے بھی ہل گیا تھا۔ ان کو محسوس ہوا کہ انھوں نے جداگانہ انتخاب، اور آبادی سے زیادہ تعداد پر جو رضامندی دے دی ہے وہ مغالطہ آمیز استدلال پر مبنی اور حیلہ بازی تھی اور ان کے الفاظ اور ان کی پالیسیوں کے درمیان" ایسے تضاد موجود ہیں جن میں تطابق ممکن نہیں ہے "لیکن انھوں نے اپنے آپ کو اس سے تسکین دے لی کہ یہ جناب (منٹو) تھے جنھوں نے اپنی مشہور تقریر میں کینکو اول بار حرکت دی تھی۔''/ 67

64:- Ibid PP 172-73

65:- Ibid P199, Sir Jenkins to Morley, 15 Sep 1907 cited in wolpert op. cit P199

66:- Walpert, op. cit P198 Minto to Morley 11 Nov. 1909

67:- Morley Papers:- Morley to Minto 28 April 1909

68:- Malaviya M.M. Presidential Address, Indian National Congress 1909

بدقسمتی سے برطانوی راج سے اظہار وفاداری میں ہندو سبھا اور معتدل لیڈران مسلم لیگ کے ہم پلہ تھے تینوں حکومت سے خوشامدانہ التجا کرتے تھے کہ گورنمنٹ کی مراعات و اصلاحات میں ان کو زیادہ سے زیادہ حصہ دیا جائے۔ تینوں اپنے مطالبات کے لئے ایک ہی قسم کے دلائل پیش کرتے تھے۔ وفادار طبقوں کی ہمت افزائی ہونی چاہیئے۔ بے صبر نوجوانوں کو انتہا پسندوں کے چنگل سے چھڑایا جائے اور انتہا پسندوں کی ہردلعزیزی اور اثرات کو ان سے چھین لیا جائے۔

یہ انتہائی حقیقت آشکارا کرنے والی بات ہے کہ گورنمنٹ نے صرف مسلم لیگ کے مطالبات کو اس کی ظاہری حد تک تسلیم کیا لیکن بقیہ دو کی اسی طرح کی درخواست کو نامنظور کر دیا۔ مدن موہن مالویہ نے اپنے لاہور کے ایڈریسن میں اس پر بڑی شکایت کی ہے۔ ۱۵۱

وجہ ظاہر تھی۔ ۱۹۵۵ میں گورنمنٹ کی پالیسی یہ تھی کہ کانگریس کی مخالفت میں لیگ کی تعمیر بلا لحاظ اس کے کی جائے کہ ان کے مطالبات میں کہاں تک حقانیت ہے۔ اور یہ کہ ان کے ماننے والوں کی تعداد کتنی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ گورنمنٹ کو یہ معلوم تھا کہ مسلم عوام یا تو قطعی لاپرواہ یا ناواقف یا علماء کے زیر اثر تھے (ماہرین مذہبیات) جو مغربی تعلیم کے خلاف اور سیاست میں مخالف برطانیہ نظریات رکھتے تھے یہ بات بھی گورنمنٹ کے علم میں تھی کہ ہندوستان کی قومی تحریک شروع سے ہی سیکولر طرز کی رہی ہے اس واقفیت کے باوجود گورنمنٹ نے انڈین نیشنل کانگریس اور نیشنلسٹوں کو نظر انداز کرنے اور تلک لاجپت رائے، اربندو گھوش جیسے لیڈران کو قید خانہ میں ڈال دینے اور مسلم لیگ سے لپٹے ہوئے لوگوں کے ساتھ بہتر سلوک کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان سب باتوں سے کیا نتیجہ نکالا جا سکتا ہے۔ وجہ ظاہر ہے۔

گورنمنٹ صرف اس بات کے لیئے بہت فکرمند تھی کہ اس عوامی تحریک کے

کے خلاف محاذ قائم کیا جائے جو ابھر رہی تھی اور جس سے غیر ذمہ دارانہ حکومت خطرے میں پڑ گئی تھی اور جس کا مطالبہ تھا کہ ووٹ کھسوٹ کو ختم کیا جائے۔ مسلمانوں میں ان کو ایک ایسا توازن قائم کرنے والا مادہ ملا جو ان کی غرض کو پورا کر سکتا تھا۔

ڈنلپ اسمتھ نے ہندوستان کی قومی تحریک کے بارے میں لیڈی منٹو کو لکھا "ایشیا میں کوئی ایسا ملک مشکل سے ملیگا جہاں ایک مضبوط قومی تحریک نہ چل رہی ہو اسی نے ہندوستان میں بھی بہت سے شک و شبہات سے بالاتر طریقوں سے اپنے کو آشکارا کیا ہے، یہ کسی طرح مذہبی حیثیت نہیں رکھتی ہے ------ قومی تحریک شروع میں نامذہبی تھی لیکن لیڈران کو بہت جلد یہ معلوم ہو گیا کہ وہ نہ تو اپنی عورتوں کو نہ عوام الناس کو خالص سیکولر راہ پر اپنے لے جا سکیں گے اس لئے ابھی حال ہی میں قومی تصورات پر ہندو مذہب کی چھاپ ڈالی گئی ہے اور وہ بھی خاص کر توہماتوں کے طبقہ میں اور اس طرح مذہبی عنصر سیاست میں داخل ہو گیا ہے" /69

اس مذہبی عنصر کی سیاست میں شمولیت گورنمنٹ کے لئے خوش قسمتی کا باعث تھی اس کی وجہ سے وہ مذہبی اختلافات کو اپنے مفاد میں ناجائز طور پر استعمال کر سکتی تھی۔ اس نے اسے فرقہ وارانہ نمائندگی کے حق بہ جانب ہونے کی بہ ظاہر معقول دلیل کے لئے استعمال کیا۔ ڈنلپ اسمتھ نے منٹو کو مشورہ دیا کہ وہ جداگانہ انتخاب پر اعتراض کرنے والوں سے کہدیں کہ "ہندوستان کے مسلمان صرف ایک مذہبی جماعت نہیں ہیں بلکہ اس سے بہت کچھ زیادہ ہیں۔ وہ در حقیقت اپنی تعبیر میں ایک علیحدہ قوم ہیں۔ جن کے شادی بیاہ، غذا، اور رسم و رواج کے معاملات دوسروں سے بالکل مختلف اور علیحدہ ہیں اور ان کا یہ بھی دعوا ہے کہ ان میں کثرت سے لوگ علیحدہ نسل کے بھی ہیں" /70

69- Gilbert - M - op cit - p - 135, Letter from Dunlop smith to Lady Minto, 11, March - 1908

70 - Ibid -, P. 187 -

71 Ibid

بحث دل میں اتر گئی مسلم لیگ والوں نے اس پر یقین کرنا شروع کر دیا۔ مذہب سیاست کی کنیز بن گیا ہے۔ علیحدگی پسندی کا جو بیج اس طرح بویا گیا تھا اس کو بعض ہندو طبقوں کی خامی، فکر کی کوتاہی اور جنگجو وطن پرستی نے آبپاشی کی۔ اور اسے برطانوی ملوکیت پرستانہ مفادات نے پروان چڑھایا۔ مسلم لیگ والوں نے خوب سمجھ لیا تھا کہ وہ ایک قابل قدر چیز ہیں جس کے حصول کے لئے پرست اور گورنمنٹ دونوں مقابلہ کر رہے تھے اور اس لئے انھوں نے اپنی قیمت کا سودا کرنا شروع کیا۔

منٹو مارلے ریفارم نے آئینی حقوق تو بالکل عطا نہیں کئے تھے لیکن غالباً یہ بات اہم نہیں تھی۔ بات جو اہم تھی وہ یہ تھی کہ حکمرانوں کو آگے بڑھنے کی ضرورت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہونا پڑا تھا لیکن ان کے بارے میں جو چیز قابل مذمت تھی وہ یہ تھی کہ اصلاحات نے ہندوستان کی آئندہ سیاسی تنظیم کی بنیاد فرقوں اور جماعتوں کے مفادات کے اصول پر تیار کی تھی۔ جداگانہ اصول کے اصول میں ہندوستان کے کل باشندوں کے ایک قوم ہونے کا انکار مضمر تھا۔

ڈنلپ اسمتھ نے نیشنلسٹوں پر طنز کرتے ہوئے کہا "اگر قومیت کی نشوونما کو اس معاملہ سے جو بہر حال ایک انتخابی کارروائی سے روکا یا پیچھے ہٹایا جا سکتا ہے تو ہندوستان کی نیشنلزم وہ طاقت نہیں ہے جس کی اس کے حامی اور مبلغ وکالت کرتے ہیں" / 71

لیکن جداگانہ انتخاب ہی تنہا پریشانی کا سبب نہ تھا کیونکہ اگرچہ بہت سے قوم پرست اس کی مذمت کیا کرتے تھے لیکن کچھ ایسے بھی تھے جو اس امر پر کھلے سے اتفاق کیا کرتے تھے کہ ایک عبوری کارروائی کے طور پر اسے انگیز کر لینا چاہتے تھے۔ مذہبی جذبات سے الکشن میں جو ناجائز فائدہ ماضی میں اٹھایا گیا اس سے دور رہنا چاہیے ورنہ مسلم اقلیت کا کامیابی کے ساتھ رائے دہندگان کے ووٹ حاصل کرنے کے مواقع ظاہر ہے کہ بہت ہی کم ہو جائیں

---

71. The Speeches of G.K. Gokhale and Shamsul Huda in the Imperial Legislative Council, Calcutta Jan. 24 - 1911, on the motion of M.M. Malaviya regarding the Council Regulations.

گے۔ "72 /

اسکیم کا سب سے زیادہ غیر منصفانہ جزو یہ تھا کہ ان قطعی ناقابل قبول بنیادوں پر کہ انھوں نے گورنمنٹ کی دوسروں سے زیادہ بڑی خدمات انجام دی ہیں اور ہندوستان کی تاریخ میں وہ روایاتی حیثیت رکھتے ہیں ان کو تعداد سے زیادہ جگہیں دیدی گئی تھیں - یہ بات اوّل تو بالکل غلط تھی دوسرے ان تمام دوسری جماعتوں بالخصوص ہندوؤں کی - اندرونی کمالات کی توہین تھی جو مسلمانوں سے کہیں زیادہ تعلیم، معیشت، مذہب اور سیاسی تنظیم میں ترقی یافتہ تھے۔

اسی کے ساتھ دوسرا مذموم پہلو یہ تھا کہ امیدوار ہونے کی اہلیت کے جو شرائط قرار دیے گئے تھے ان میں مسلمان کے ساتھ دوسرے فرقوں کے مقابلہ میں امتیاز برتا گیا تھا - اور اسی طرح کے امتیاز رائے دہندگی کے لئے جو ضوابط مرتب کئے گئے تھے ان میں بھی تھا۔

یہ تین باتیں اصل مسائل نزاعی تھے اس نے فرقوں میں دونوں جانب حرص حسد، خوف اور ایک دوسرے سے نفرت کی آگ کو مشتعل کیا، تائید کرنے والے ہوں یا تردید کرنے والے دونوں نے مبالغہ آمیز اور تند زبان میں اپنے مبحث کی وکالت کی

اسی طرح مارلے منٹو ریفارم نے ایک ایسی خلیج پیدا کر دی جو کبھی پاٹی نہ جا سکی۔

بد قسمتی کی بات یہ ہے کہ بد دیانتی اور نفرت کی جن قوتوں کو شہنشاہیت نے بے لگام چھوڑ دیا تھا اس کا مقابلہ ہندوستان کی نیشنلزم نہ کر سکی۔

جہاد کا ہوّا صرف مارلے اور لبرل پارٹی کو ہراساں کرنے کے لئے کھڑا

73:- Wolpert, op. cit. P 46 Minto to Morley, 72 May 1908

74:- Wolpert, op. cit P 73 Morley's essay on British Democracy and Indian Government.

75:- Gilbert Op. cit - P 223 Minto's Letter to Dunlop Smith, 24 March 1910

کیا گیا تھا۔ اس کا قطعی کوئی امکان نہ تھا کہ صرف کونسل میں چند جگہیں حاصل کرنے کے لئے مسلم عوام کو مقدس جہاد کے لئے اکسایا جا سکتا ۔ علماء جو اس طرح کے جہاد کے لئے جھنڈا لہرا سکتے تھے وہ انگریز تعلیم یافتہ وفاداروں مثل آغا خاں، محسن الملک، اور ان کے ساتھیوں کی ترکیب بازیوں سے بالکل الگ تھے وہ لوگ جو سیاسی عزائم رکھتے تھے وہ امیر الامراء لیڈروں سے کہیں زیادہ انتہا پسندانہ تھے اور ان مقاصد کے حصول کے لئے یہ لوگ جو خطرات مول لینے کے لئے تیار تھے ان کے لئے یہ امیر الامراء لیڈر ان قطعی آمادہ نہ تھے ۔ علماء نے کبھی بھی علی گڑھ سیاسی مکتبۂ فکر کی حمایت نہیں کی اور بلا ان کی عملی امداد کے کسی تحریک کا قدم جمانا نا ممکن تھا ۔

ریفارم کے ساتھ آزادی کی جد وجہد کا پہلا دور ختم ہوا ۔ اس کا طرۂ امتیاز یہ تھا کہ ہندوستان کے معاملات میں نئی ترقیات کا آغاز ہوا ۔

VIII ریفارم کے اثرات

مارلے منٹو ریفارم سے کئی تبدیلیاں پیدا ہوئیں ایک کا اثر وزیر ہند اور گورنر جنرل کے باہمی تعلقات پر پڑا ۔ اپنے عہدے کا چارج لیتے ہی مارلے نے منٹو کو یاد دلایا کہ 1906 کے لبرل الکشن نے مرکز ثقل کو بالکل بدل دیا ہے اور وہ دفتری حکومت کی راہوں پر آنکھ پر پٹی باندھ کر چلنے کے لئے تیار نہیں ہے انھوں نے اس خیال پر زور دیا کہ گورنمنٹ آف انڈیا کے تمام ممبران "پارلیمنٹ کے ملازم اور اس کے ایجنٹ ہیں" اور ان کا عمل اسی اصول پر مبنی ہے ۔

اس خیال پر جو قانونی حیثیت سے بالکل صحیح تھا منٹو نے کوئی بحث نہیں کی لیکن انھیں وہ کمتر پوزیشن پسند نہیں تھی ۔ جس پر وزیر ہند گورنمنٹ آف انڈیا کو نافذ کرنا چاہتے تھے ۔ انھوں نے شکایت کی[4] موجودہ دار العلوم ہندوستان کی آبادی اور بہت سے عقائد اور روایات کے اثرات کو سمجھنے کی کوئی

اہمیت نہیں رکھتا ہے۔ اور میری رائے میں یہ سب سے بڑا خطرہ ہمارے اس ملک پر حکمرانی قائم رکھنے میں ہے" / 73

مارلے نے زور دے کر کہا کہ "کابینہ ایک وزیر ہند کے توسط سے، بنا قابل بحث اختیار رکھتی ہے کہ قانون کے تحت پالیسی کا حکم دے، ہدایات جاری کرے تجویزات کو مسترد کر دے، اور ہر سوال پر جو اس کی رائے میں پیدا ہو اس کا فیصلہ حرفِ آخر کی حیثیت رکھے" / 74

جہاں تک کہ منٹو کا الزام پارلیمنٹ پر تھا مارلے نے اس کا الٹ کر یہ جواب دیا کہ ہندوستان میں بے چینی پھیلی ہوئی ہے اس کی تمام تر ذمہ داری ان سرکاری افسران پر ہے جو پچاس سال سے ہندوستان پر فرسودہ خیالات اور طریقوں پر حکومت کرتے رہے ہے منٹو نے اس کے خلاف ان الفاظ میں احتجاج کیا "جہاں تک میری نظر سے انگلستان میں یہ عام طور پر یقین کیا جاتا ہے کہ ہندوستان پر وطن سے حکومت ہو رہی ہے اور وطن ہی سے حکومت ہو سکتی ہے مگر وطن سے یہ برباد ہو سکتی ہے اور ضرور برباد ہو جائیگی اگر پارلیمنٹ کے اثرات کو ترقی دینے کی اجازت دی گئی" / 75

مارلے نے مضبوطی کے ساتھ اس سے انکار کیا۔ اس بحث کو کہ کیا حق اور کیا ناحق تھا اس پر بحث کرنا ضروری ہے لیکن اس سے یہ تو پتہ چلتا ہی ہے کہ گورنمنٹ آف انڈیا کے اس وقت کے نظام میں شگاف پڑ گیا تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ جو نازک صورت ہندوستان میں پیدا ہوئی اس نے اس رتھ کو الٹ دیا تھا جسے دو گھوڑے دو مخالف سمتوں میں کھینچ رہے تھے اس کا اس

73:- Wolpert, op cit P46 Minto to Morley, 72 May 1908

74:- Wolpert:- op cit P73 Morley's essay on British Demo-cracy and Indian Government

75:- Gelbert op cit - P223 Minto's Letter to Dunlop Smith, 24 March 1910

لیئے یہ انجام ہوا۔ ملوکیت پرستانہ فلسفہ، اور خود مختارانہ نظم ونسق دونوں اس مسئلے کو حل کرنے میں ناکام ہو گئے جو ہندوستان کے اندر نئی روح نے پیدا کیا تھا۔

دوسرا اہم نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں ایک عظیم مقدار کی نفسیاتی تبدیلی پیدا ہوئی۔ ہندوستان کے دماغ پر شہنشاہیت سے خوفزدگی اور اس کے وقار کے بھاری بوجھ کو دور پھینک دیا۔ نوجوانوں نے اپنی دلاوری اور قربانیوں سے گورنمنٹ کی عذاب انگیز اہلیت کی طاقت کے بدبودار پھیکار کو ختم کر دیا یہ ان مقابلہ پر ڈٹے ہوتے بہادروں کا رویہ تھا جن کو موت، قید، یا جلاوطنی کی سزادی گئی تھی ان لوگوں نے اس ہتھیار کے کناروں کو کند کر دیا جن پر گورنمنٹ بھروسہ کرتی تھی

تحریک نے ملک کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک بیدار کر دیا۔ متحدہ مقصد اور اس کے حصول کے لیئے متحدہ کوشش کا ایک نیا جذبہ پھیل گیا۔ جو برتی قوت اس نے پیدا کی اس نے گورنمنٹ کو دفاعی شکل اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ احکام برطانیہ سے ہندوستان کو جاری ہونے شروع ہو گئے جیسے جیسے ہندوستان کی اخلاقی قدریں بلند ہوتیں ویسے ویسے حکمران طبقہ کی اخلاقی قدریں پست ہوتی گیئں۔ برطانیہ کو آج تک جو خود اعتمادی حاصل تھی اس کی جگہ شک وشبہ نے لے لی مارلے نے ایک فلسفی اور مورخ کی حیثیت سے یہ سوچا کہ "دنیا کی کوئی شہنشاہیت ہمیشہ تک نہیں رہی۔ اور مجھے شبہ ہے کہ آیا برطانوی شہنشاہیت کے لیئے بہت سے سال باقی ہیں" انھوں نے اس کا اندازہ کیا کہ "جتنا زیادہ کوئی شخص ہندوستان پر نظر ڈالے گا اتنے ہی زیادہ یہاں کے معاملات خراب اور منحوس نظر آوینگے" /76

ان کے خیال میں برطانوی اور ہندوستانی افسران میں بیگانگی بڑھ رہی تھی اور باہمی ہمدردی گھٹ رہی تھی۔

76:- Wolpert, op cit P48 Morley to Minto 3 Oct. 1907

منٹو جو ایک تنا ور سپاہی تھا۔ مغرورانہ انداز میں چاہتا تھا کہ برطانوی قوم کی مضبوط باہوں کے سہارے راج قائم رہے۔ اس نے تسلیم کیا کہ "ہم سب محسوس کرتے ہیں کہ ہم سب اس ملک میں محض مسافر کی حیثیت رکھتے ہیں اور یہ کہ ہم کیمپ ڈالتے ہیں اور پھر مارچ کرتے ہیں اور ہر شخص کی نگاہ اس پر ہے کہ آخر کار ہم وطن جا کر آرام سے رہیں جس کے ہم مستحق ہیں" /77 چرول نے یہ خیال ظاہر کیا کہ "اینگلو انڈین حکام کے نظم و نسق کے اندر ایک عظیم ہمت شکن جذبہ پیدا ہو گیا ہے جسے میں یہ سمجھنے پر مجبور ہوں کہ موجودہ حالات کا یہ المناک پہلو ہے" /78

IX عوام کا ردعمل

بیسویں صدی کی اوّل دہ سالہ مدت آزادی کی جدوجہد میں حد کا مل تھی۔ ذات اور سرباخوبی کا دور سرمائی آخر کار ختم ہو گیا تھا اور رسم و رواج اور روایات کے سنگین چھلکے کو توڑ کر زندگی نمودار ہو گئی تھی

بیداری، زندگی، طرز، اور رنگ کے دھوم دھام میں ظاہر ہوئی۔ انسان کی فطرت نے اچانک ایک چھلانگ لگائی۔ رابندر ناتھ ٹیگور نے مسرت اور شادمانی کا نغمہ سنایا جو آزادی اور غلامی سے پیغام کی خوشخبری لایا۔ بال گنگادھر تلک نے اپنی نشتر کے تیز دھار سے شہنشاہیت کے ان اوہام کے جال کو کاٹ دیا جو ہندوستان کے دماغ کو باندھے ہوئے تھا۔ آربندو گھوش نے وہ آتشیں شمع جلائی جس نے نوجوانوں کے دلوں کو گرما دیا اور ان کی رگوں میں خون کی حرکت کو تیز کر دیا۔ بپن چندر پال کی گرجدار فصیحانہ و بلیغانہ تقریریں سطح سمندر پر پرشور معلوم ہوتی تھیں اور ان موجوں کے شور کا مقابلہ کرتی تھیں جو ساحل سے ٹکرا رہی تھیں۔ دوسری

77: Minto Papers: Minto to Morley, 24 May 1907

78:- Gilbert, op cit. 237 Valentine Chirol to Lady Minto, 4 May 1910

نے بھی نغمہ و سرود گاہ میں شمولیت حاصل کی۔ لاجپت کے جوش دلانے والے الفاظ کی گونج جنگجو پنجاب کے شہروں اور دیہاتوں میں گونجی، مدن موہن مالوی وہ مقرر جن کی زبان میں مٹھاس گھلی ہوئی تھی انھوں نے اپنی شیریں تقریروں میں قدیم ہندوستان کو یاد دلایا شوکت کو یاد دلایا۔ گوکھلے ناسٹ جس کا دل پاک تھا اس نے نوجوانوں کو مادرِ وطن کی خدمت کے لئے پکارا۔ اسی دوران میں موہن داس کرم چند گاندھی دور دراز جنوبی افریقہ میں ہندوستان کی عزت و حرمت اور بیگناہی کے لئے عدیم المثال تحریک ستیہ گرہ جاری کئے ہوئے تھے۔

اس طلوع صبح میں اقبال بہادرانہ انداز میں پرشوکت ہندوستان کی مدح میں لافانی گیت "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" گاکر ہم وطنی ترانوں کے ہم آہنگ سرود میں قابل قدر حصہ لے رہے تھے۔

ان جوش دلانے والے مناظر کے درمیان ایسی نشانیاں نمودار ہوئیں جو بدبختی کی آگاہی دیتی تھیں۔ مسلم لیگ کے قیام نے یہ ظاہر کیا کہ سب کچھ ٹھیک نہیں ہے اور سیاست کے جسم میں ایسے جراثیم موجود ہیں جو پہچانے نہیں جا سکتے ہیں لیکن جن کا انجام تباہی و بربادی ہو سکتا ہے۔

ان شاندار ایام کی چمک دمک بہت جلد دھندلی ہونے لگی بہت سے عظیم ستارے جنھوں نے آسمانوں کو روشن کیا تھا بادلوں میں چھپ گئے۔ تلک مانڈلے کے جیل خانہ میں تیزی سے لے جا کر بند کر دیے گئے اربندو گوش ماوراء المحسوسات کی تلاش میں پانڈیچری کے مملکت غیر سے گھر ہوئے فرانسیسی دانہ میں تصوف کے محل کی سیر کر رہے تھے۔ بپن چندرپال نے لندن کی بھیڑ بھاڑ میں سکون و راحت تلاش کیا۔ لاجپت رائے زمانۂ جنگ تک کے لئے ترکِ وطن کر کے امریکہ چلے گئے جہاں بہت سے ملکوں سے ظلم و ستم کے باغی جمع تھے۔

آنے والی عالم گیر کے سایوں نے بھی مغربی ممالک کے افق کو سیاہ بنانا شروع کر دیا تھا۔ دنیا اور ہندوستان کے سمندر پر امن کی سانس لینے کا جو سکون نمودار ہوا تھا اس کا دیر تک قائم رہنا مقدر نہ تھا۔ جدوجہد آزادی کا دوسرا دور بہت دور نہ تھا۔

نواں باب

مسلمانوں کا مسئلہ

اٹھارہویں صدی کے آخر سے بیسویں صدی کے وسط تک مسلمانان ہند اپنی سماجی اور سیاسی نشو و نما کی راہ میں بہت سی منزلوں سے گذرے۔ راستہ ایک مجرد عالمگیریت سے شروع ہو کر ایک ٹھوس خود آگاہ قومیت پسندی پر ختم ہوا۔

پہلی منزل کے ماقبل پورا عرصہ مسلم تاریخ کا پھیلا ہوا ہے جو تیرہویں صدی سے اٹھارہویں صدی کے وسط کا زمانہ ہے اس تمام دور میں مسلم قوم میں مختلف نسلوں مختلف قبیلوں مختلف ذاتوں کے اور لسانی اور علاقائی گروہ کے لوگ شامل تھے۔ وہ طبقات میں منقسم تھے۔

(1) جنگجو اور حکمراں طبقہ جو انتظام حکومت کے کاروبار کو سنبھالے ہوئے تھا یہی لوگ تمام اونچی ملازمتوں کو حاصل کرتے تھے جو زیادہ تر فوجی ہوتی تھیں اور جنکو مختلف اصول ملکیت یا لگان داری پر آراضیات تفویض کی گئی تھیں۔ اور آگے چل کر موروثی ہو سکتی تھیں۔

(2) اعلم علم، علماء کا طبقہ۔ جو علوم اسلامیہ کا مطالعہ کرتے اور دیوانی اور فوجداری کے مقدمات فیصل کرتے تھے۔ قانونی ڈگریاں جاری اور مذہبی اوقات کا انتظام کرتے اور ملا صفتانہ فرائض انجام دیتے اور رسوم جیسے شادی طلاق مراسم تجہیز و تکفین اور نمازوں کی مذہبی ذمہ داری ان پر تھی اور ان کا یہ بھی کام تھا کہ جن عہدوں کے لیے تعلیمی اہلیت کی ضرورت ہو ان عہدوں کے واسطے اشخاص مہیا کریں۔

(3) درمیانی طبقہ۔ جن میں وسیع پیمانہ کی تجارتوں کے منیجران اور خاص گروہ جو بیرونی ملکوں سے تجارت کرتے تھے، عدالت اور فوج، تجارتی مراکز اساتذہ فنون اور کاریگری کے اڈوں اور مالکان بینک کی ضروریات کی چیزیں سپلائی کرتے تھے۔

(۴) محنت کش طبقہ۔ یعنی کسان، اہل حرفہ اور دستکار۔

مسلمانوں کا جنگجو طبقہ جو ہندوستان کے مختلف علاقوں میں رہتا تھا ان کے اندر آپس میں سیاسی یا سماجی میل جول یا مشترک مفاد کا کسی قسم کے شعور کا جذبہ تھا۔ اگر وہ کسی مضبوط مرکزی حکمراں سے وفاداری کا اظہار کرتے تھے تو اس لیے نہیں کہ مذہبی عقیدہ کے اعتبار سے وہ ایک قوم تھے بلکہ محض دباؤ کی وجہ سے مجبوراً تھی۔ لیکن وہ بہرحال ہمیشہ بادشاہ کے خلاف بغاوت کے لیے سازشیں کیا کرتے جس کا مقصد یا تو یہ ہوتا تھا کہ اپنی خودآزاد ریاست قائم کریں یا سلطان کے کسی رقیب کی حمایت کرنا ہوتا تھا۔ باغیوں کی سرکوبی کرنے کی اہلیت ہی حکمرانی کی اہلیت کا معیار تھی۔ بادشاہت اور ریاستوں کی سیاست میں مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد کسی قسم کوئی دلچسپی نہ رکھتی تھی۔ سیاست کا کھیل صرف چند آدمیوں تک محدود تھا۔ یعنی حکمراں طبقہ کے اہلِ خاندان امرا کے خاندان والے اور چند اہم علماء سماجی اور سیاسی وفاداری کی گرہ مذہب سے نہیں بلکہ خون کے رشتوں یا رشتہ داریوں سے بندھی ہوئی تھی۔ اور اطاعت شعاری حکمراں کی ذات کی بنیاد پر تھی۔ حکومت کے معاملات میں مذہب کا عمل دخل محدود تھا اور سیاسی اتحاد کے لیے مذہب کوئی خاص ناقابلِ تسخیر جذبہ بھی فراہم نہیں کرتا تھا درحقیقت مسلمانوں کی تاریخ یہ ثابت کرتی ہے کہ سیاسی افتراق اتنا ہی پرانا ہے جتنا کہ اسلام پرانا ہے انصار اور مہاجرین کی۔ ہاشمیوں اور امیوں کی سنی شیعہ اور خارجیوں کی باہمی رقابت پہلی صدی ہجری کے واقعات ہیں دوسری صدی میں امیوں کی عباسیوں سے ٹکر اور اس کے بہت بعد ہسپانیہ کے طاہریوں مصر کے فاطمیوں، طاہریوں اور صوفیوں اور خراسان کے صمدانیوں وغیرہ کے اعلان خود مختاری خود اس امر کا کافی ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ اسلام ملت کی وحدت کو قائم رکھنے میں ناکام رہا ہے اور اس وقت بھی ناکام رہا ہے جب اسلامی تہذیب عروج پر تھی۔

مذہبی مسائل کے سیاسی اصولوں کو نئے حالات سے مطابقت کرنا ضروری ہے۔ امت کی وحدت کی شرعی حیثیت اور خلیفہ کی مرکزی حکومت کے اصولوں میں ترمیم ہوگئی۔ الماوردی نے اپنی کتاب سیاست پر۔ احکام سلطانیہ۔ ایران کے فوجی امرا بود یدیوں کے زمانہ میں لکھی جنھوں نے خلافت کو سلطان کے ایک دُم چھلا کی حیثیت میں گرا دیا تھا۔ نرم الفاظ میں خلیفہ کے اختیارات کو تسلیم کرتے ہوئے اس نے صفائی کے ساتھ کہا کہ سلطان جو فوجی طاقت رکھتا ہے وہ حقیقی طور پر آزاد ہے۔ بعد کے مصنفین نے۔ خلافت امامت اور سلطانی کے فرق پر زور دیا۔

خلافت امامت اور سلطانی

ہندوستان میں یہ رجحان مغل بادشاہوں کے زمانہ میں اپنی انتہا کو پہنچ گیا جب انھوں نے عثمان کی سلاطین کو خلیفہ یا مسلمانوں کے اعلیٰ ترین مذہبی پیشوا کی حیثیت سے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اس طرح اٹھارہویں صدی میں سیاسی کثرت وجود جو خاندان قبیلوں مقامی یا فرقوں کی بنیادوں پر قائم تھا۔ اس میں کسی حد تک ایک کمزور قسم کی مذہبی عالمگیریت بھی شامل تھی۔

یہ حالات ان حالات سے مطابقت کرتے ہیں جو یورپ کے پندرہویں صدی میں تھے جب علاقائی طبقے ابھر رہے تھے جو آگے بڑھ کر ترقی کرکے خود آگاہ قومیت میں تبدیل ہو گئے۔ ان سب کا بھی ایک ہی مذہب تھا یعنی مسیحیت۔ لیکن پاپائے مقدس کے علاوہ شہنشاہیت کی کوششوں کے باوجود وہ ان کو ایک مسیحی حکومت پر متحد کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔

مسلم بادشاہت کا مرکز دلی تھا۔ اس نے بھی اسی طرح کی کوشش کی۔ لیکن ان کے جذبات کے محرکات دنیوی مقاصد مثلاً شان و شوکت دولت اور حکومت تھے نہ کہ مذہبی جوش۔

لیکن بہرحال اس کا منشا یہ نہ سمجھا جائے کہ ہندوستان میں مختلف مذاہب کا اشتراک ہو گیا تھا جیسا کہ قدیم زمانہ میں ہوا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں میں یہ شعور ہمیشہ بیدار رہا کہ وہ ایک علیحدہ مذہبی قوم ہیں جن کے عقائد اور اعمال کے مسائل دوسرے فرقوں سے مختلف ہیں اور یہ کہ ان کا پرسنل لا مخصوص ہے۔ مطابق احکام قرآن و حدیث جن کی تعلیمات ہر مسلمان پر واجب التعمیل ہیں۔ اس کا انتظام انہی کے مابہ قانون کے انتظام میں رہنا چاہیے۔ پھر فاضل علما، جو اسلام کی تعلیمات اور احکام کے شارح ہیں ان کا ایک عالمگیر طبقہ ہے جو تمام عالم اسلامی کے فاضل علماء میں ایک اخوت کا رشتہ قائم کرتا ہے۔ اور خاص کر علماء وسط اور مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ کے درمیان۔ باوجود ان مشترک معاملات کے مسلمانوں کے تمام طبقہ سوائے علما کے ہندوستان میں زندگی کے حالات سے ہوکر مختلف مدارج میں اپنے ہندوستانی ماحول کے اثر میں آگئے۔ فاتحین جو وسط ایشیا سے ایک مذہب اور ایک کلچر ایسا لے کر آئے تھے جو بہت سے طریقوں میں یہاں سے مختلف اور بعض حالات میں متضاد تھا۔ رفتہ رفتہ ارتقائی منزلیں طے کرکے اسم اور کلچر کی ایسی خصوصیات اختیار کر لیں جو دونوں میں مشترک تھیں۔

یہ ضروری نہیں ہے ۔ کہ ان سب کا یہاں تذکرہ کیا جائے ۔/1 لیکن مسلمانوں کا علاقائی زبانوں کا اختیار کرلینا عظیم اہمیت رکھتا ہے ۔ کیونکہ اگر زبان جذبات و خیالات کے اظہار کا ذریعہ ہے تو یہ ان دونوں پیمانوں پر اثر انداز بھی ہوتی ہے ۔ اس لیے یہ ذرا بھی تعجب کی بات نہیں ہے کہ جو ادب ہندو اور مسلمانوں نے پیش کیا ان میں زبردست قربت ایک دوسرے کو سمجھنے اور طور و طریق او راحساسات میں یکسانیت نمایاں طور پر نظر آتی ہے ۔

اس کے علاوہ دونوں فرقوں کے آپس میں ملنے جلنے سے مذہب اور سماجی معاملات پر نہایت زیادہ اثر پڑا ۔ اور دونوں نے ایک دوسرے سے بہت سے مراسم اور رہائش کے طور و طریقے مستعار لیے انھوں نے مذہب کے صرف ظاہری شکل کو نہیں اپنایا بلکہ بعض بنیادی مسائل عقائد اور طرز اعمال کو بھی قبول کرلیا ۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ لین دین کا یہ معاملہ مختلف سماجی سطحوں پر ہوا اور صفت اور مقدار میں یکساں نہ تھا ۔

اس وقت مسلمانان ہند مختلف گروہوں کے ایک غیر منظم بھیڑ تھے ۔ لیکن ان میں یہ طاقت تھی کہ اپنے آپ میں فرقہ وارانہ اتحاد پیدا کرلیں ۔ لیکن اس سماجی ارتقا کا ایک دوسرا اہم پہلو بھی تھا یعنی ایک عجیب رویہ کا نشوونما ۔ اتحاد اور اختلاف کا رویہ دوسرے فرقہ کے مقابلہ میں خاص کر اکثریت کے مقابلہ میں جن کا مذہب ہندوازم تھا ۔ ساتھ ہی ساتھ آزاد خیال اور قدامت پرست دونوں طرح کے علما رتھے ۔ مقدم الذکر دونوں فرقوں کے درمیان اختلافات کو کم کرنے اور موخر الذکر ان کو بڑھانے پر زور دیتے تھے ۔ سیاست کے میدان میں اکبر اور اورنگ زیب ان دونوں قسموں کے رجحانات کے نمائندے ہیں ۔

اٹھارہویں صدی کے وسط میں دوسری منزل شروع ہوئی ۔ یہ سماجی ارتقا کی ایک نئی منزل تھی جو عالم وجود میں آئی ۔ برطانیہ کی جانب سے ہندوستان کی فتح جو 757 / میں شروع ہوئی اور گورنمنٹ

---

1. On this Subject reference may be made to:
(i) Tara Chand, The Influence of Islam on Indian Culture and the Books mentioned in the Bibliography.
(2) Mohammad Umar, Dr Burhan (Urdu) 1968-1969 and 1970. (Vo. 60, 61, 62, 63 and 64.

کی سیاسی اور انتظامی پالیسیاں ان تبدیلیوں کی ذمہ دار ہیں جو اس دور میں نمودار ہوئیں۔

مسلمان امیر الامرا حکمراں طبقہ تقریباً تہس نہس کر دیا گیا کیونکہ ریاستوں پر ریاستیں جن کی حکمرانی مسلم خاندانوں کے ہاتھ میں تھی یکے بعد دیگرے یا تو ختم کر دی گئیں اور ان کو مملکت برطانیہ میں شامل کر لیا گیا یا اپنی خود اختیاری سے محروم کر دی گئیں اور ماتحت داری میں لیجائی گئیں حکمراں خاندان یا تو سرے سے کالعدم ہو گیے یا ذلیل ہو گیے۔

857 کے طوفان نے اس تباہ کاری کے کام کو مکمل کر دیا دہ خیالی تصویر جو لمبی کی مغل شہنشاہیت کی آخری نشانی کے طور پر باقی رہ گئی تھی فنا کر دی گئی اور اودھ کے نام نہاد تاجدار کو اپنی سلطنت سے کلکتہ ایک سرکاری قیدی کی حیثیت سے رہنے کیلئے جلاوطن کر دیا گیا اور بہت سی زمینداریاں توں کے مالکان کو ان کی ملکیتوں سے محروم کیا گیا اور ان کو سخت سزائیں دی گئیں کچھ دوسرے لوگوں کا منصب پست کر کے ان کو صرف زمیندار حضرات بنا دیا گیا۔

اہل علم لوگ جن میں سے کچھ لوگوں نے بغاوت میں نمایاں حصہ لیا تھا ان کو اپنے مقصد کی ناکامی پر سنگین مصائب برداشت کرنے پڑے۔ خاص کر دلی کے قریب شمالی حصے اتر پردیش اور بہار میں بنگال میں تو مسلمان راجاؤں اور زمینداروں کے تباہ و برباد ہو جانے سے بالکل قلاش ہو گیے تھے۔ ان کے وارثان برطانیہ راج کے سب سے زیادہ شدید دشمن تھے۔

درمیانی طبقہ پر مخالفانہ اثر اس وجہ سے پڑا تھا کہ تجارت ایسٹ انڈیا کمپنی اور برطانوی اور یوروپین تجار کے ہاتھوں میں چلی گئی تھی۔

کاریگر طبقہ پر دو سمت سے حملہ تھا۔ اول تو بحری ٹیکس کی اس مذموم پالیسی سے جو برطانیہ نے اپنے صنعتی انقلاب کی ابتدا میں اختیار کیا تھا اور دوسرے صنعتی انقلاب کے بعد فیکٹریوں میں تیار کی ہوئی اشیاء سے مقابلہ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کی گھریلو صنعت برباد ہو گئی۔ اور کاریگر بھوکوں مرنے لگے اور یہ زیادہ تر مسلمان تھے۔

اس طرح مسلمانوں کا ہر طبقہ یکساں مصیبت میں مبتلا تھا۔ اور اس لیے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ کہ جب ایک ہی ذریعہ سے ایسی مصیبت نازل ہوئی تھی۔ جو سب میں مشترک تھی۔ تو اپنے ہم مذہبوں کے لیے مسلمانوں میں ہمدردی کا ایک جذبہ پیدا ہوا اور تمام ہندوستان میں ایک مشترک مفاد کا نشو و نما ہوا۔

علاوہ اس کے کہ مسلمانوں پر ہندوستان میں کیا گذری انیسویں صدی میں تمام دنیا کی مسلم حکومتیں۔ یورپ، افریقہ اور ایشیا میں الٹ پلٹ گئیں۔ برطانیہ، فرانس اور روس کی باہمی رقابتیں اور ترکیبوں کی

توسیع پسندیاں مسلم ممالک کی پریشانیوں کے لیے خاص طور پر ذمہ دار تھیں۔ البتہ اس میں شک نہیں کہ ان کی اندرونی کمزوریوں اور حماقتوں نے مغربی طاقتوں کو مداخلت اور جہاں جہاں ممکن تھا ان کو اختیارات چھین لینے کے مواقع فراہم کیے۔

لیکن بہر حال یہ ایک بدبخت واقعہ ہے کہ مسلمانوں کی مصیبتوں کی اصل وجہ برطانوی شہنشاہیت کا ہندوستان میں وجود تھا۔ برطانیہ کی مشرق کے بارے میں کل خارجہ پالیسی کا محور ہندوستان تھا انگلستان، آسٹریلیا اور برطانوی ہندوستان کے درمیان رسل و رسائل کا قیام ہندوستان کے دفاع کی فوجی حکمت عملی اگر کبھی حملہ ہو اور ملوکیت پسندانہ اقتصادیات کی ضروریات۔ ان اقتصادی اور فوجی مفادات کے تحفظ کے لیے وہ ممالک جو ہندوستان کے راستے میں پڑتے تھے۔ ان پر یا تو سیاسی حکمت عملی کا یا فوجی طاقت کا دباؤ ڈال کر ان کی آزادی کو برطانوی پالیسی کے احکام کے تابع بنانے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ وہ ممالک جن کے ساحل برطانیہ کے فوجی راہ پر پڑتے تھے یا جن کے زمینی حدود اس درجہ قریب تھے کہ ان سے بے چینی پیدا ہوتی تھی یا فوجی نقطہ نظر سے اہم تھے ان پر برطانیہ کی پالیسی کے معمار خصوصی توجہ مبذول کرتے تھے۔

مسلم ممالک کو محکوم بنانے کی کارروائیوں میں ہندوستانی فوج برطانوی بحری بیڑے کی شریک کار ہو جاتی تھی اور دونوں مل کر ناقابل تسخیر ثابت ہوتے تھے۔

اس طرح بہت سے مسلم ممالک جو اٹھارہویں صدی کے اواخر تک آزاد تھے مغربی طاقتوں کی فرمانروائی کے تحت آ گئے یا تو حکمبرداری کے اصول کے تحت یا ایک غلام قوم کی حیثیت سے۔ ان ملوکیت پرستانہ مہم بازیوں میں انگلستان سب سے زیادہ کامیاب تھا۔ اس کی خارجہ پالیسی تک جب نہر سوئز کی تعمیر ہوئی ہے۔ ایسی مسلم حکومتوں کے موافق تھی جیسے کہ عثمانیہ ترکی۔ کیونکہ اس کی سالمیت برطانیہ اس لیے قائم رکھنا چاہتا تھا تاکہ روس کو مشرقی بحر متوسط سے جہاں تک ہو سکے دور رکھ سکے۔

1869ء کے بعد بحر احمر کے ذریعہ ہندوستان کے راستہ کے معاملہ کی بنا پر مصر ترکی سے زیادہ اہمیت حاصل کر گیا۔ 1853ء میں جب یورپ کے "مرد بیمار" کی موت فوراً ہوتی نظر آ رہی تھی زار روس نکولس (Nicholas) اول نے یہ تجویز پیش کی کہ مملکت عثمانیہ کو ان یورپین حکومتوں میں بانٹ دیا جائے جن کو اس سے دلچسپی تھی۔ لیکن برطانیہ نے اس کھلی ہوئی ڈکیتی کی مخالفت کی۔ 1869ء کے بعد جب ضرورت ختم ہو گئی۔ پالیسی بھی بدل گئی۔ 1876ء میں گلیڈسٹون نے سلطان کی حکومت کے خلاف ایک تیز و تند پروپیگنڈہ شروع کیا۔

جس کا اثر یہ ہوا کہ اس سے قبل جو ترکی سے موافقت کی پالیسی تھی اس میں ترمیم ہوگئی۔ اس کے بعد ترکی کے اعضا و جوارح کی قطع و برید شروع ہوئی۔ 1878ء میں قبرص کو مملکت برطانیہ میں شامل کرلیا گیا۔ مصر جو مملکت ترکیہ کا ایک صوبہ تھا اگرچہ اس پر حکمرانی ان گورنروں کی تھی جن کا عہدہ موروثی تھا۔ مالی پریشانیوں کا شکار ہوا اور برطانیہ نے ترکی کے ایک قرضہ دینے والے مہاجن کی حیثیت سے مداخلت کیا۔ عربی پاشا کی قیادت میں عوام کی بغاوت کچل دی گئی۔ اور 1882ء میں برطانیہ نے گلیڈسٹون کی حکومت کے زمانہ میں اس ملک پر اپنی حکمبرداری قائم کی۔ کیونکہ اس ملک سے نہر سوئز جو نہایت اہم تھی اپنی راہ جاتی تھی۔

فرانس الجیریا پر تو قبضہ کرہی چکا تھا اور اب ٹیونس (Tunisia) پر بھی قبضہ کرلیا۔ 1898ء میں کچنر (Kitchener) نے سوڈان کو فتح کرلیا اور اس کو انگلستان اور مصر کی مشترک نگرانی کے تحت کر دیا۔ 1895ء میں سالسبری (Salisobury) کے مملکت عثمانیہ کی تقسیم کی تجویز کا فرانس اور روس سے اعادہ کیا۔

اس طرح بحر احمر کے اندر راستہ محفوظ ہوگیا۔ لیکن جو ممالک کے نہر کے مشرقی جانب واقع تھے ان میں ایسے حالات نشو و نما پا رہے تھے جنھوں نے برطانیہ کو شدید تشویش میں مبتلا کر دیا۔ زار کی شہنشاہیت کا دائرہ تیزی کے ساتھ وسط ایشیا کی جانب بڑھ رہا تھا۔ کل رقبہ جو ایران کے شمال میں ہے یعنی بحر کیسپین (Caspian Sea) سے آکس (Oxus) تک 1864ء سے 1876ء کے اندر روس کے زیر اقتدار آچکا تھا۔ دس سال بعد مرد (Merv) جو ایران کی شمالی سرحد پر ترکمان علاقہ کا مرکز تھا۔ اور جو افغانستان سے شمال مغرب میں واقع تھا، نے روس کی اطاعت قبول کرلیا۔ اس کے علاوہ روس کا رابطہ شمالی ایران بشمولہ تہران تک بڑھ رہا تھا۔ ان واقعات نے برطانیہ کے دماغ میں ہندوستان کے لیے بے چینی میں اضافہ کر دیا۔

برطانیہ نے روس کے آگے بڑھنے کا مقابلہ کرنے کے لیے یہ کیا کہ ایک دفاعی دیوار تعمیر کرنے کا ارادہ کیا جس سے کوئی آگے بڑھنے کی حرکت ہی نہ کرسکے۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ اس وسیع علاقہ کے جو تمام ممالک تھے۔ جن میں ایران خلیج فارس، شیخ ڈوم (Shaikh Doms) اور افغانستان شامل تھے۔ ان پالیسیوں پر اپنا اقتدار قائم کیا جائے۔

اس درمیان ایک متحدہ جرمنی تیزی کے ساتھ عالم وجود میں آکر اس سے زیادہ برطانیہ کا رقیب بن گیا۔ اور قبل اس کے کہ بیسویں صدی کا پہلا دس سالہ دور ختم ہو۔ دونوں برطانیہ اور

روس اور ان کے مشترک حلیف فرانس نے فیصلہ کیا کہ اپنے اپنے حلقہ اثر کے بارے میں ایک باہمی مصالحت ہو جائے ۔ یہ کام شمالی افریقہ اور مغربی ایشیا کے مسلم ممالک کی حق تلفی کر کے کیا گیا ۔

نتیجہ یہ ہوا کہ عالم گیر مصیبت خیز جبر و تعدی سے مسلمانوں کے دل و دماغ پر مایوسی کے بادل چھا گئے لیکن یہ لوگ اپنی اس تقدیر کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے ۔ جو مغرب ان کے لیے مقدر کرنا چاہتا تھا ۔ مغرب کے خلاف ہندو بیرون ہند میں ایک رد عمل تھا ۔ ہندوستان میں انیسویں صدی کے آغاز ہی میں شاہ ولی اللہ نے مقابلے کی ٹھان لی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جہاد کی تحریک چلادی گئی ۔ یہ انیسویں اور چالیسویں میں بہت متحرک تھی ۔ اور اس کے لیڈران نے 1857ء کی بغاوت کی حمایت کی ۔ یہ تحریک حکومت کو 1873ء تک جبکہ نارمین (Norman) کلکتہ کے چیف جسٹس اور مایو (Mayo) اس کے شکار ہوئے ۔ پریشان کرتی رہی اس کے شعلے پہلی جنگ عظیم میں بجھے نہیں تھے ۔ ولی اللہ کے مستقل کارناموں میں ایک کارنامہ مدرس کا قیام تھا جس میں دیو بند کا ندوۃ العلماء جو مسلسل قومی جد وجہد کا حامی رہا سب سے زیادہ قابل لحاظ ہے ۔

دیو بند کا مکتبہ برطانیہ اور ملوکیت پرستی کا مخالف رہا تھا ۔ بہت قبل 1889ء ہی میں فاضل ترین مسلمان علماء میں سے ایک عالم ایم ۔ رشید احمد گنگوہی نے مسلمانوں کو ان الفاظ میں انتباہ دیا تھا ۔" سید احمد اسلام کے بہی خواہ ہوں یا نہ ہوں لیکن ان کے ساتھ اشتراک عمل مسلمانوں اور اسلام کے لیے آخر کار زہر ثابت ہوگا ۔ وہ زہر شبریں پیش کر رہے جو ہلاکت خیز ہے تم ہندوؤں کا ساتھ دے سکتے ہو "/2

ہندوستان کے باہر جمال الدین افغانی نے اتحاد اسلام تحریک کی بنیاد رکھی وہ بذات خود ہندوستان آئے اور ہندوستان میں اپنے بہت سے متبع بنائے یہ تحریک کلچر میں مخالف مغرب مذہب میں روایاتی اور سیاست میں زیادہ تر مخالف برطانیہ تھی ۔ جمال الدین نے کوشش کی کہ عثمان کی خلافت قدیم عظمت پھر واپس آجائے اور ان کی قیادت میں عالم گیر اسلامی اخوت کے اصول کے ماتحت اتحاد پیدا ہوا گرچہ اپنے مقصد کے حصول میں یہ تحریک ناکام رہی لیکن

---

2 - Mohammad Mian, S. Ulamai - Haq (Urdu) Vol V

یہ ہندوستان کے اخبار نویسوں مصنفوں اور مفکروں کے گروہ میں خواہ وہ پرانے مکتبہ خیال کے مسلمان ہوں یا جدید کے نہایت ہر دلعزیز تھی اور اس نے فرقہ دارانہ اتحاد میں جوش پیدا کیا جس کا شعور روز افزوں ترقی پر تھا۔

اس نتیجہ کو لانے میں اور دوسرے واقعات نے بھی حصہ لیا۔

انیسویں صدی کی ابتدا میں گورنمنٹ نے انتظامی امور میں ایسے اقدامات کیے جن کا مسلمانوں پر مخالفانہ اثر پڑا 1835ء میں گورنمنٹ نے مغربی تعلیم کی سرکاری حمایت کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور بہتر سرکاری ملازمتوں کے لیے اس کے حصول کو لازمی قرار دے کر عوام کو اس کے تسلیم کر لینے پر کسایا۔ مسلمانوں کو ان کے مذہبی رہنماؤں نے اس تعلیم سے فائدہ اٹھانے کو منع کیا اور اس طرح مسلمان گورنمنٹ کی ملازمتوں سے محروم ہو گیے

اس کے بعد 1837ء میں گورنمنٹ نے عدالت کی زبان انگریزی یا کوئی دوسری ہندستانی زبان کو فارسی کے بدل کے طور پر قرار دیا۔ اس کے دو نتیجے ہوئے۔ اول یہ کہ جو لوگ قانون اور عدل کے محکمہ سے تعلق رکھتے تھے، وہ فارسی داں مسلمان اور ہندو تھے اس لیے بہت سے لوگ ملازمت سے برطرف کر دیئے گیے۔

اس کے علاوہ جہاں تک کہ قانون کا تعلق تھا مسلمانوں کا کل قانون فوجداری ختم کر دیا گیا۔ اور مسلمانوں اور ہندوؤں کے پرسنل لا کے علاوہ تمام دیوانی کے قوانین جن کے اندر ضوابط بھی شامل تھے ان کو انگریزی کے فلسفہ قانون کے تحت مدون کر دیا گیا۔

اس کے بعد دوسرے یہ کہ ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنانے سے۔ کلاسیکی زبانوں۔ مثل سنسکرت اور عربی کو فرقوں میں مخصوص کر دیا گیا۔ سنسکرت ہندوؤں کے لیے اور عربی مسلمانوں کے لیے اس نے دونوں فرقوں کے کلچر کے درمیان جو خلیج تھی وہ اور زیادہ وسیع ہو گئی۔

اس سے زیادہ اختلاف کی وجہ اردو ہندی کا تنازعہ تھا۔ بنگال کے باہر شمالی ہندوستان کے تمام مہذب ہندو اور مسلمان شہریوں کی زبان اردو تھی۔ سترویں سال کے وسط میں یہ مطالبہ ابھرا کہ ہندی کو عدالتی زبان کی حیثیت سے تسلیم کیا جائے۔ اس زمانہ کے برطانوی افسران عام طور پر مسلمانوں کے خلاف تھے۔ جن کو وہ جہاد کا مبلغ اور 1857ء کی بغاوت کے سربراہوں میں خیال کرتے تھے۔ ان لوگوں نے مضبوطی سے ہندی کی موافقت اختیار کر لی۔ ہندی ایک علیحدہ زبان ثابت کرنے کے لیے قواعد کی کئی کتابیں لکھی گئیں۔ ہندی کی کتابوں جیسے کہ تلسی داس

کی راماتن کا ترجمہ انگریزی میں کیا گیا۔ اور ہندی انشاپردازوں کی ہمت افزائی کی گئی۔ اس کے برخلاف اردو کی مذمت یہ کہہ کر کی گئی۔ کہ یہ ایک مصنوعی زبان ہے۔ جو صرف چند لوگوں تک محدود ہے۔ اور ہندی کے لیے یہ پکار دی گئی۔ کہ یہ جنتا کی زبان ہے۔ یہ پروپیگنڈا سرسید احمد خاں کے خیالات میں تبدیلی کا نقطہ آغاز ہے۔ جو اس کے پہلے ہندو مسلم اتحاد پر عقیدہ رکھتے تھے۔ لیکن قسمت کا فیصلہ یہ ہوا کہ ہندی کا استعمال صرف بہار تک محدود رہا اور سرسید احمد خاں کی زندگی تک شمالی مغربی صوبہ (اتر پردیش) پر کچھ بھی اثر نہیں پڑا۔ اگرچہ مسلمانوں میں خوف وہراس تو پیدا ہوا تھا۔ لیکن جذبات نے وہ تلخی اختیار نہیں کی تھی۔ جو بعد کے سالوں میں پیدا ہوئی۔

ایک اس سے زیادہ قوی وجہ جس نے دونوں فرقوں کے درمیان علیحدگی کو وسیع کیا اور ان کے درمیان جو اختلافات ہیں۔ ان احساس قوی تر کیا۔ وہ تھا مذہبی اور سماجی اصلاحات کا ابھرنا۔ انگریزی سے ماقبل زمانہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک دوسرے سے کلچر کے بہت سے طور طریق مستعار لیے تھے۔ جن میں سماجی مراسم اور مذہبی تیوہار بھی شامل تھے یہ کلچروں کا ملاپ زیادہ تر غیر محسوس طور پر ہوا تھا جس پر کوئی معترض نہ تھا۔

مغربی کلچر سے جب تصادم ہوا اور یورپین مشنریوں نے جب اعتراضات شروع کئے محاسبہ نفس کا دور شروع ہوا ہندوؤں میں راجہ رام موہن رائے اور مسلمانوں میں شاہ ولی اللہ پیش رو تھے انہوں نے اس عہد کے منظر کا جائزہ لیا۔ ایک یکساں نتیجہ پر پہونچے کہ مذہب کو پاک کیا جائے اور اس کے ابتدائی اوصاف اور سادگی کو از سر نو زندہ کیا جائے۔

یہ تحریکات متوازی لیکن علیحدہ علیحدہ خطوں پر نشو ونما پانے لگیں۔ ہندو مفکرین یورپین اصول پرستوں کی تحقیقاتوں تھیاسوفیکل سوسائٹی کے یورپین بانیوں اور ہندو مصلحین سے ہمت افزا ہو کر قدیم ہندو تہذیب کے احیاء کا خواب دیکھنے لگے۔ مسلمان رہنماؤں نے اپنے عقائد میں جو غیر مسلم عنصر شامل ہو گیا تھا اس کی مذمت کی اور پیغمبر اور ان کے چاروں خلفاء کے زمانہ کی طرف لوٹنے کا پیغام دیا۔

جو لوگ زیادہ جوشیلے تھے۔ وہ صرف اصلاحات کے کام سے مطمئن نہیں ہوئے۔ بلکہ ایک دوسرے کے خلاف مناظرے کرنے لگے۔ آریہ سماج کے پرچار کرنے والوں نے اسلام عیسائیت اور دوسرے مذہبوں پر کھلے الزامات لگائے۔ اور مولویوں اور پادریوں نے بھی اکھاڑے میں اتر کر تحریر تقریر اور عام مباحثوں میں ہندو مذہب کو قابل ملامت قرار دیا۔ اگر ان میں سے

کوئی بھی یہ یقین کرتا تھا کہ وہ دوسروں کو اپنے دلائل سے مطمئن کر سکے گا۔ اور کل کے کل کو مذہب تبدیل کرلینے پر راضی کرلے گا۔ تو وہ سخت غلطی پر تھا۔ ان کوششوں سے صرف چند لوگوں نے اپنا مذہب تبدیل کیا۔ لیکن ایک بڑے پیمانہ پر بغض وعداوت کو پیدا کیا۔

عالم گیر جنگ کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر فرقہ نے اپنے کو متحد کر لیا اور فرقوں کے مابین خلیج وسیع تر ہو گئی۔

اصلاحات کی تحریک نے جدید طرز کی تعلیم کے لیے بڑا جوش پیدا کیا۔ برھمو سماج نے کلکتہ میں ہندو کالج قائم کر کے اس رجحان کے لیے مواد دیا۔ آریہ سماج نے متعدد کالج اور اسکول قائم کیے تھیا سوفیکل سوسائٹی نے بنارس ہندو کالج کی بنیاد ڈالی۔ ہندوستان کے مختلف صوبوں میں بیشمار ادارے بانی کے ذات، فرقہ یا مذہبی جوش کے اظہار کے لیے عالم وجود میں آئے۔

اسی قسم کے محرکات کی بنا پر ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ میں بنا۔ سرسید کے مقاصد حسب ذیل ہے۔

(1) اپنے طبقہ کے مسلمانوں کے لیے مغربی تعلیم کا ایک مرکز قائم کرنا تاکہ وہ اس زمین کو پھر حاصل کر سکیں جسے وہ علماء کی مغربی تعلیم سے مخالفت کی وجہ سے کھو چکے ہیں۔

(2) برطانوی حکمرانوں پر یہ واضح کرنا کہ اسلام کلچر مذہب اور سماجی تعلقات کے لحاظ سے مغرب کا مخالف نہیں ہے۔

(3) حکمرانوں سے وفاداری کی نشوونما کرنا اور ان سے مراعات کی التجا کرنا۔

(4) مسلمانوں کو یہ تعلیم دینا کہ اسلام کوئی قدامت پرست جامد مذہب نہیں ہے۔ بلکہ عقل اور قوانین فطرت کے مطابق ایک ترقی پسند اور غیر متشدد مذہب ہے۔

اپنے تین مقاصد میں ان کو عظیم کامیابی حاصل ہوئی جس کے نتیجہ میں مسلمان حکمرانوں کے مراعات میں از سر نو آباد ہو گیے ان پر سے مایوسیوں اور افسردگیوں کا دباؤ اٹھ گیا۔ اور ایک درخشاں مستقبل کے تصور نے ان میں زندگی اور ہمت کا جوش بھر دیا جیسے جیسے کہ اعلیٰ خاندانوں کے نوجوان علی گڑھ کے براہ راست یا بالواسطہ اثر میں آتے گیے۔ ویسے ویسے مسلم قوم میں فخر کا احساس بڑھتا گیا۔

سرسید کے مقاصد کا مفہوم بڑے دور رس نتائج کا حامل تھا۔ دونوں یعنی مسلمانوں کے لیے اور مجموعی طور پر کل ہندوستان کے لیے بھی۔

ہندوستانی زندگی کے اصل دھارے سے مسلمانوں کو علیحدہ کرنا۔ ان میں فرقہ وارانہ جذبات پیدا کرنا، مسلمانوں کے خصوصی مسائل پر زور دینا اور فرقہ واریت کے جذبات کو اور گہرا کرنا۔ یہ تھیں باتیں جن کی زبردست تائید ہوئی یہ امر کہ مسلمانوں کے حقوق دوسری قوموں سے بالکل الگ ہیں اس پر زیادہ زور دیا جانے لگا۔ یا تو اس طور پر کہ مسلمانوں کے جو فرائض اپنے ہمسایوں کے ساتھ تھے ان کو نظرانداز کر کے یا دوسرے فرقہ والوں کے مطالبات کی مخالفت اس صورت میں بھی کر کے جبکہ وہ مطالبات فلاح عامہ کا مقصد رکھتے تھے۔

سرسید نے جو تصور گورنمنٹ کی وفاداری کا قائم کیا تھا۔ اس کی بنیاد برطانوی نسل اور برطانوی اداروں کی برتری کا تخیل تھی۔ اس تنزل کے لیے ان کی تعلیم تقریباً بے غیرتی کی حد تک پہونچی ہوئی تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ وہ گورنمنٹ کی پالیسیوں سے کسی قسم کے اختلاف کی پرزور مخالفت کرتے تھے۔ اور اپنے ہم مذہب کو یہ مشورہ دیتے تھے۔ کہ کسی سیاسی تحریک میں شریک نہ ہوں۔ ان کا خیال تھا کہ سیاست اور نکتہ چینی اور اختلاف مترادف ہیں۔ لیکن حکومت سے وفاداری گورنمنٹ کی تائید حیات سیاست نہیں ہے۔

دوسرا بدبخت نتیجہ برطانیہ کی لامحدود مدح و ستائش کا یہ ہوا کہ انہوں نے خود اپنے خیالات اور آرار کو اپنے برطانوی آتالیق آکلینڈ کالون لیفٹیننٹ گورنر صوبہ شمالی مغربی (موجودہ اتر پردیش) اور تھیوڈر دبک ایم۔ اے۔ او کالج کے اوّل پرنسپل (1883 - 1896) کے تابع بنا دیا۔ ان لوگوں کے دماغ کی روشنی میں انہوں نے ہندوستان کے مسائل پر پہلے جو رائے قائم کی تھی اسے ترک کر دیا اور وائسرائے کی کونسل میں (1883) بک کے دلائل کی تائید کرتے ہوئے تقریر کے دوران نمائندہ اداروں کی اس بنا پر مذمت کی کہ مسلمانوں کو ان کے اندر سخت مصائب کا سامنا ہوگا۔/4

1887 میں کانگرس میں مخالفت بھی انہی اسباب کی بنا پر ہوئی۔ انہوں نے اپنا یہ مضبوط عقیدہ کر لیا جو برطانیہ کا نظریہ تھا یعنی یہ کہ سیاست کے میدان میں ہندو مسلم اتحاد ناممکن ہے۔ اور اپنے ہم مذہبوں کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ کانگرس ایک ہندوؤں کی جماعت جس سے ہر قیمت پر الگ

---

3 - Aziz. K. K. "The Making of Pakistan" P. 20.

4 - Noman. M. "Muslim India" P. 52.

رہنا چاہئے۔

یہ یہ بھی ہے۔ کہ بہت سے مسلمانوں نے اس نقطہ نظر کا تتبع کرنے سے انکار کر دیا ان میں علماء بھی شامل تھے۔ اور جن لوگوں نے ان کی بات پر کان دھرا وہ زیادہ تر مالکان زمین طبقہ کے لوگ یا ان کے شریک خاندان وہ نو عمر اراکین تھے۔ جنہوں نے انگریزی تعلیم حاصل کی تھی اور یہ سب لوگ زیادہ شمالی کے صوبوں کے تھے۔ لیکن چونکہ زمینداری (ملکیت آراضی) نظام مغربی ہندوستان اور دکن کے صوبوں میں رائج نہیں تھا ان تمام علاقوں کے اونچے طبقہ کے مسلمانوں نے سرسید کی قیادت قبول نہیں کی۔

لیکن بہر حال یہ تسلیم کرنا پڑے گا۔ کہ پورے ہندوستان کے مسلمان (خواہ وہ اونچے طبقہ کے ہوں یا متوسط طبقہ کے) ایک دوسرے سے زیادہ قریب آرہے تھے۔ اور پرانے گروہ کے علیحدہ علیحدہ مفادات مسلمانوں کے پورے فرقہ کے سامنے اپنی طاقت کھو رہے تھے۔

اس طرح صدی کے خاتمہ کے وقت تک ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے متوسط طبقے اپنے اندرونی سنگٹھن یا تنظیم اور اپنے سے باہر کے گروہوں سے اختلاف کے لیے بیدار ہو چکے تھے۔ فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی حد تک پہونچنے کے بعد سیاسی قوتوں نے انکو سماجی ارتقا کی دوسری منزل یعنی قومیت پرستی میں ڈھکیل دیا۔

لیکن پہلی جنگ عظیم کے شروع ہونے کے زمانہ تک بھی تعلیم یافتہ متوسط طبقہ باہمی اتحاد کے باوجود مسلمانوں میں بے میل عناصر اسی طرح نمایاں تھے جس طرح ہندوؤں میں۔ مانٹیگو (Montagu) ہندوستان کے نائب وزیر ہند (1910-141) نے پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے یہ بیان دیا کہ مسلمانان ہند کے بارے میں ایسی گفتگو کرنا کہ گویا وہ ایک مرلوط و متحد قوم ہیں غلط ہے۔

تحقیقات کی گئی اور گورنمنٹ آف انڈیا نے اس معاملہ پر ایک رپورٹ مرتب کی۔ اس میں لکھا تھا کہ۔

"ہندوستان کا مسلمان طبقہ مختلف نسلوں، قبیلوں، ذاتوں اور معتقدات کا جو ایک دوسرے سے جانشینی اور وراثت، نکاح اور طلاق، مذہبی رسوم و عقائد، طرز رہائش اور مراسم کے قوانین ایک دوسرے سے مختلف رکھتے ہیں۔ ایک بے ڈھنگا مجموعہ ہے۔ .... ایک فرقہ ایک

نسل جو قبیلوں میں بٹی ہوئی ہو اور یہ قبیلے مختلف خاندان کی پیداوار ہوں۔ یعنی دیسی بھی اور بیرونی مخلوط النسل بھی اور وہ بھی جو اپنا مذہب ترک کرکے مسلمان ہوئے ہیں۔ اور جن میں ذاتوں اور عقائد کا تاریخی یا روایاتی اختلاف ہو اور ہر گروہ دوسرے گروہ سے متضاد مفادات کا مطالبہ رکھتا ہو کسی طرح ایک متحد قوم نہیں کہی جاسکتی۔ تمام قبیلے اور ذاتیں ایک دوسرے سے وسیع پیمانہ پر نسلی، لسانی جغرافیائی، اخلاقی اور ذہنی اختلافات رکھتی ہیں۔/5

"فرقہ" اور "قومیت" میں نمایاں فرق یہ ہے کہ اوّل الذکر لفظ سماجی اور ثقافتی اتحاد پر زور دیتا ہے۔ اور موخر الذکر سیاسی مفادات کو اوّلیت دیتا اور دوسرے مفادات کو ضمنی حیثیت میں رکھتا ہے۔

بیسویں صدی کے شروع کے سالوں میں فرقہ پروری کے قومیت پرستی میں تبادلہ کی رفتار تیز ہوئی جو معاملات اسے عالم وجود میں لائے وہ منفی بھی تھے اور مثبت بھی۔ اوّل الذکر میں ہندو مذہب کا احیا جدید اور ہندوؤں کے بعض طبقوں کا ادعا اور ان کی جنگجویانہ وطن پرستی تھی۔

ہندو مذہب کے احیا جدید کا نظارہ مذہبی، سماجی، سیاسی اور ثقافتی تحریکات میں صاف دکھائی دیتا تھا۔ ادعا کا اظہار بنگال اور مہاراشٹر کی شورش پسند تحریکات میں ہوا اور جنگجویانہ وطن پرستی ایسے معاملات میں سامنے آئی جیسے کہ تحفظ گا: شیواجی کی تقریبات۔ مسجدوں کے سامنے باجہ شدھی (تبدیلی) سنگھٹن (تنظیم)

ہندو اہلِ علم وسطی زمانہ کی تاریخ کے ناخوشگوار حالات کو بہت طول دے کر بیان کرتے تھے۔ برطانوی مورخین مسلمان حکمران کی تصویر اس طرح پیش کرتے تھے کہ وہ بڑے ہی ظالم، متعصب ایذا رساں تھے۔ جن کا واحد ناپاک مقصد یہ تھا کہ ہندو قوم ان کے مذہب اور ان کے کلچر کو فنا کردیں۔ بہت سے ہندو مفکرین ہندوؤں کی روحانیت اور ان کی برتری کے افسانوں کی تبلیغ کرتے رہتے تھے۔ اور اس کا مقابلہ مغرب کی قابلِ نفرت مادہ پرستی سے کرتے تھے۔

ان تمام چیزوں نے چکی کے لیے جو کے دانوں کا کام کیا۔ جن کو پیس کر ہندوؤں میں ایک ایسی

5- Home Deptt 1912, Political Part B Proceedings September 1912, No 85

شراب تیار ہوئی جس نے ہندوؤں میں فخر اور خود اعتمادی بکثرت پیدا کر دی۔ لیکن اس کا جو اثر مسلمانوں پر ہوا وہ غیر متوقع نہ تھا۔ ان باتوں سے ان میں ہراس و حسد پیدا ہوا ان کی خودداری کو ٹھیس لگی اور وہ غصہ میں بھر گئے اس کا بہت سا حصہ مبنی برانصاف نہ تھا اور کل کے کل میں برطانوی اثر سے عظیم مبالغہ کیا گیا۔

برطانوی مصنفین کی تحریرات سے پتہ چلتا ہے کہ مراعات اور سرپرستوں کا کتنا انبار مسلمانوں پر لادا گیا اور اس بات کے لیے ان کی ہمت افزائی کی گئی کہ وہ ہندوؤں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھیں۔ مسلمانوں سے کہا گیا کہ" وہ ایک شاہانہ طاقت کے مالک ہیں جنھوں نے انگریزوں کی طرح ہندوؤں سے ہندوستان کو فتح کیا تھا۔۔۔ اور ان کے اندر عمل جوانمردی اور طاقت کی اعلیٰ ترین قدریں ہیں۔ اور برخلاف ہندوؤں کے تیز طبع اور وسائل سے لبریز ہیں۔/ 6 چونکہ مسلمان طاقتور ہے۔ اس لیے دشمن کی حیثیت میں بھی وہ لائق احترام ہے۔ کپلنگ (Kipling) نے اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مشرق اور مغرب مل سکتے ہیں۔ بشرطیکہ دو مضبوط آدمی (برطانوی اور مسلمان مل جائیں۔/ 7۔ اسٹیل (Steel) کے قول کے مطابق" ہندوستانی ملازموں کا سرپرست بابر (Babur) کو ہونا چاہیے"/ 8

گرین برجر (Green berger) کہتا ہے کہ" ہندو بالعموم اور مسلم بالخصوص کی تصویر کشی بڑی بے رحمانہ روشنی میں کی گئی ہے۔ وہ ان حقارت آمیز القابات کا ذکر کرتا ہے جو ہندوؤں کے لیے استعمال کیے گئے ہیں۔ اور آگے چل کر اس نے وجہ بیان کی ہے کہ کیوں ہندو متوسط طبقہ کے خلاف اتنی شدید نفرت تھی۔ توضیح یہ ہے کہ" ہندوؤں نے مسلمانوں کے اصولوں کے بارے میں مغرب کے ذہن و دماغ کی زندگی کے نظریات کے بارے میں ہتک کیا یعنی ایک تو عقل دوسرے ضابطہ اور تیسرے لائحہ عمل"/ 9

---

6. Green berger, A.J. the British Image of India P46. Croker B. M. Diana Barrington A Romanse of Central India (1888)

7. Ibid P.46 (Kipling 8 the Ballad of East and west.

8. Ibid, P46 (Steel F.A. Knight Errant)

9. Ibid, PP 47-51

ہندو پر بزدل، نامعقول، لیڈری کے نااہل، نامرد اور تقدیری ہونے کے کلنک کا ٹیکہ لگا دیا گیا۔ تعلیم یافتہ ہندوؤں کے بارے میں پیرن (PERRIN) کہتا ہے۔ کہ وہ ہندو جو زیادہ سے زیادہ یورپینوں سے قرب رکھتے ہیں وہی لوگ ہیں جو ہمارے قوانین اور ہمارے مراسم سے زیادہ سے زیادہ دشمنی رکھتے ہیں۔"/10

نہ صرف ہندو بلکہ اس کے مذہب کی شبیہہ کو بھی مضحکہ خیز قرار دیا گیا۔ اس پر یہ الزام لگایا گیا کہ یہ منفی بے عملی کا معلم، ظالمانہ بت پرستانہ تبدیلی کی تجاویز سے منہ پھیر لینے والا اور رقابت، نفرت ہے۔ ہردوار کے بارے میں فلپ میشن (Philip mason) کہتا ہے۔" تقدس کے پیرہن سے بدمعاشی لپٹی ہوئی ہے۔ کیونکہ جو کچھ بھی تقدس ہے۔ وہ توہمات میں گم ہو جاتا ہے۔ .... پروہتوں میں ڈھونگ والے ہیں یہاں بری نگاہ رکھنے والے فقیر ہیں۔ اور سیکڑوں بھکاریوں میں ہر قسم کے چھوٹے مدعیان ہیں۔ اور چونکہ یہ مقام، متبرک ہے۔ اور فطرت نے اسکو برکت دی ہے۔ اس لیے یہاں دلال بھی ہیں۔ اور کنجے بھی۔ اور ہر رنگ حشیش کی تیار کردہ نشہ آور مشروب کو چوری سے لانے والے کوکین بیچنے والوں اور مولیشیاں کے چوروں عورتوں کا اغوا کرنے والوں اور جواریوں کا بھی یہ گھر ہے"/11 مس میو (Miss Mayo) کا تعلق اسی گروہ سے تھا۔

اگر اسٹیسل، کیننگ، کرو کر، فلپ میشن اور انہی کے ہم نوا و ہم جنس لوگ حکمراں کے دماغ کی نیابت کرتے تھے۔ تو پھر اس بات کا اندازہ کرنا دشوار نہیں ہو سکتا کہ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے خلاف کیوں ہوئے اور ایسا کیوں ہوا کہ برطانوی اس باہمی نفرت سے ناجائز، فائدہ اٹھا کر اپنی حکومت کی بنیاد بڑھا سکے۔

رجب یا محرم اور دسہرہ یا ہولی ایک ہی دن پڑ جاتے تھے۔ تو ایسی حالت میں بلوے گائے کے تحفظ کے سلسلہ میں سخت مخالفانہ رویہ اور ایک دوسرے کے جذبات کا لحاظ کئے بغیر جلوس نکالنے کے حق کا مطالبہ۔ ان سب باتوں نے غصہ دلایا اور ان کے درمیان نااتفاقی کی بنیادوں کا شگاف اور زیادہ چوڑا ہو گیا۔

---

10 - P.67 (Perrin, A. Idolatry).

11 - Ibid, P.134 (Philip Mason Call the next witness).

1893 میں تلک نے گنگا پتی تہوار کا آغاز کیا اور 1895 میں شیواجی کے اصول کو ممتاز درجہ دیا۔ بذات خود ان باتوں سے مسلمانوں کے دماغی سکون میں خلل نہ آنا چاہیے تھا۔ لیکن بدقسمتی سے ان کے ساتھ یہ واقعہ بھی پیش آیا۔ کہ ہندو محرم کے جلوس میں شریک ہونے سے الگ ہو گئے۔ اور شیواجی نے افضل خاں کو جو قتل کیا تھا اسے جائز قرار دیا گیا۔ ان باتوں نے اینگلو انڈین اخبار نویسوں کو ایک سنہرا موقع اس بات کا دیا کہ وہ تلک کو ایک فرقہ پرست ہندو قرار دے کر بدنام کریں اور دونوں فرقوں کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کریں۔

1892 میں انڈین کونسل ایکٹ پاس کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ انڈین نیشنل کانگرس جو فوری مطالبات پیش کر رہی تھی۔ اس کی یہ پہلی کمزور سی جوابی ردعمل کی کاروائی تھی۔ مسلم لیڈران نے سیاسی شورش کے نتائج کو سمجھا اس ایکٹ سے ایک نئے باب کے اضافے کی نشاندہی ہوئی اور مسلم لیڈران نے مستقبل کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ ایک سخت صدمہ ان کے لیے پہلے سے سامنے آنے کے بعد موجود تھا۔ یو۔ پی کے لفٹننٹ گورنر سر میکڈانلڈ نے بہار کی مثال (1881) کو سامنے رکھتے ہوئے 1900 میں ہندی کو دفتروں اور عدالتوں میں استعمال کرنے کی منظوری دینے کی دلیل کو منظور کیا۔ حامیان اردو کو اس نے برافروختہ کر دیا۔ محسن الملک جو ایم۔ اے۔ او کالج کی ٹرسٹ کے سکریٹری تھے۔ انہوں نے اس حکم کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے لکھنو میں ایک کمیٹی بلائی۔ میکڈانلڈ نے یہ مطالبہ کیا کہ یا تو وہ کالج کے سکریٹری کے عہدے سے استعفا دیدیں یا اردو کی حمایت میں ایجیٹیشن سے الگ ہو جائیں۔

کالج کو صوبہ کی حکومت کے غیض سے نجات دلانے کے لیے محسن الملک الگ ہو گئے۔ لیکن یہ واضح ہو گیا کہ سر سید کی پرانی پالیسی۔ یعنی سیاست میں دخل اندازی سے گریز۔ اب صحیح نہیں ہے۔ وقار الملک نے کچھ اور ممتاز مسلمانوں کو ملا کر مسلمانوں کی ایک سیاسی جماعت بنانے کا فیصلہ کیا۔ ایک جماعت حسب ذیل اغراض کے لیے بنائی گئی (1) مسلمانوں کے نقطہ نظر کو گورنمنٹ کے سامنے پیش کرنا (2) برطانوی حکومت کو برقرار رکھنے کیلئے پروپیگنڈہ کرنا (3) مسلمانوں کو کانگرس کے ان مطالبات میں تعاون کرنے سے روکنا کہ نمائندہ ادارے قائم کئے جائیں اور ہندوستان اور انگلستان بیک وقت اور یکساں طور پر انڈین سول سروس کے لیے امتحانات لیے جائیں۔

مسلمانوں کا وفد

لیکن اگرچہ یہ جماعت اس بچے کی طرح تھی جو ماں کے پیٹ سے مردہ پیدا ہوا ہو پھر بھی کانگرس کے خلاف پروپیگنڈے میں بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔ ابھی تک مسلمانوں نے سرسید کے اس مشورے پر کان نہیں دھرا تھا کہ مسلمان کانگرس سے الگ رہیں۔ کیونکہ 1886ء سے 1893ء تک ہر سال ان کے ڈیلیگیٹوں کی تعداد ان کی آبادی کے تناسب سے زیادہ ہوتی تھی لیکن 1893ء کا حال فرقہ وارانہ تعلقات کے نقطہ نظر سے نازک تھا۔ اور اس کے بعد کے سالوں میں تعداد کم ہوتی گئی اور خاص کر 1902ء کے احمد آباد سیشن کے بعد جب مسلمانوں کو کانگرس میں شریک ہونے سے روکنے کے لیے بڑی زبردست کوشش کی گئیں آغا خاں کی کانگرس سے سمجھوتہ کرنے کی ایک کوشش ناکام ہوگئی۔

اب جماعت کے خیال کو زیادہ سنجیدگی سے اپنایا گیا۔ جب تقسیم بنگال (16 اکتوبر 1905ء) نے ملک میں خوفناک تہلکہ مچا دیا تو فرقے مختلف گروہوں میں تقسیم ہوگئے۔ ایک تقسیم بنگال کا موافق اور دوسرا مخالف تھا۔ بدقسمتی سے وہ لوگ جو تقسیم بنگال کے مخالف تھے یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کی کل ذمہ داری حکومت برطانیہ پر ہے۔ ایسی بے صبری اور بداحتیاطی سے کام کرنا شروع کیا کہ جس سے مسلمان عام طور پر ان کے خلاف ہوگئے۔ دوسری جانب مسلمانوں نے بھی کوتاہ نظری سے کام کیا اور بعض فوری معمولی فوائد کے لیے ایسا طرز عمل اختیار کیا کہ گویا کل ہندو قوم ان کی دشمن ہے۔

تقسیم کے نتائج یہ تھے (1) مسلمانوں نے محسوس کیا کہ اب وہ ایک ایسے علاقہ میں ہیں جہاں ان کی غالب اکثریت ہے۔ اور ان کو ایک علاقائی بنیاد مل گئی۔ جہاں وہ ایک قوم کے ابتدا کے خیال کی پرورش کر سکتے ہیں۔ اس نے مسلمانوں کے اندر ایک قوم ہونے کے تصور کو قائم کرنے میں مدد دی۔ اور (2) ہندو پوری طرح بیدار ہوگئے اور تاریخ میں ایک نئے معاملہ کا اضافہ ہوگیا تھا جو لازمی طور پر مستقبل پر اثر انداز ہونے والا تھا۔ اور صرف صوبے کے مستقبل پہ نہیں بلکہ کل ہندستان کے مستقبل پر۔/12

مسلمان اپنی موجودہ حیثیت سے بہت خوش تھے۔ لیکن بہت جلد تشویش کے اثر یدنے ان کو بے چین کرنا شروع کر دیا۔ کیونکہ 1905ء کے عام انتخابات

میں پارلیمنٹ کے اندر قدامت پرست اکثریت سے محروم ہوگئے۔ اور لبرل پارٹی برسر اقتدار آئی اور مارلے (Morley) وزیر مقرر ہوا۔ ہندوستان کے مسلمان برطانیہ کے لبرل پارٹی کے لوگوں کو اسلام کا دوست نہیں سمجھتے تھے۔ کیونکہ گلیڈسٹون اور لبرل اصولوں کے اعلیٰ منصب کے مذہبی پیشوا کی سی حیثیت رکھنے والا مانا جاتا تھا۔ اس نے مملکت عثمانیہ کے حق میں انگلستان کی موافقت کو مخالفت میں بدل دیا تھا۔ یہ لوگ مارلے کے اداروں کے بارے میں بھی مضطرب تھے۔ کیونکہ 1906ء کے اوائل میں یہ معلوم ہوگیا تھا کہ وزیر ہند گورنمنٹ آف انڈیا میں اصلاحات کرنے کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ اور جب 30 جولائی کو اسی منشا کا ایک باضابطہ اعلان کیا گیا تو اعتراضات کی بھنبھناہٹ شروع ہوگئی۔

ہندوستان میں 3 اگست 1906ء منٹو نے مارلے کے دق کرنے بمپ فلائڈ فلر (Bump Hyde Fuller) سے نجات حاصل کرلی تھی جو مسلمانوں کی حمایت کا علمبردار تھا۔ اس نے شدید مایوسی پیدا کی اور برطانیہ کی دوستی پر مسلمانوں کے اعتماد کو سخت دھکا لگا۔ کل ہندوستان کے ممتاز مسلمان مضطرب اور بدحواس ہوگئے۔ برطانوی افسران جو اندرون ہند تھے۔ اور وہ بھی جو لندن میں تھے۔ اس بات پر مجبور ہوئے کہ ایسی تدابیر کریں جن سے حالت اور زیادہ بدتر نہ ہونے پائیں اور مسلمانوں کو کانگرس کی طرف جانے سے روکا جاسکے۔

منٹو نے مارلے کو ان پریشانیوں کی اطلاع دی جس میں ایک طرف یہ تجویز کیا کہ کانگرس کو تسلیم کرلیا جائے اور دوسری جانب یہ کہا کہ کانگرس کے خلاف پلڑہ برابر کرنے کے لیے ایک جماعت کی ضرورت ہے۔ اس نے لکھا۔

"میں نے ہمیشہ مسلم آبادی سے بڑی اونچی امیدیں قائم کررکھی ہیں۔ اب چونکہ کسی حد تک اس بات کی وجہ سے جسے وہ بنگالیوں کی فتح خیال کرتے ہیں۔ وہ خطرہ محسوس کرنے لگے ہیں اس لیے ان کے مفادات کے تحفظ کی ضرورت اور بھی زیادہ واضح ہوگئی ہے۔ اور ہم لوگوں کے لیے حقیقی امداد کا باعث ہونا چاہیے" /13

مارلے نے اس سے اتفاق کیا۔ لیکن اتنا نوٹ اس پر بڑھا، کہ "وہ دن دور نہیں ہے کہ جب مسلمان تمہارے خلاف اپنی تقدیر کو کانگریس والوں سے وابستہ

13. Minto to Morley August 15, 1906, Cited in Mary Minto India Minto and Morley P.P. 28.29

کریں گے۔ ۱۴/

برتن میں ابال آچکا تھا۔ وزیر ہند اور وائسرائے نے مل کر وہ فورمولا تیار کیا جو مسلمانوں کی بھوک کو آسودہ کر سکتا تھا۔ پالیسی متعین ہو گئی۔ لیکن یہ ضروری تھا۔ کہ ایک مناسب موقع تلاش کیا جائے جب مسلم قوم کے لیے مراعات دینے کو جاری رکھنے کی یقین دہانی کا اعلان کیا جا سکے۔

اس درمیان میں مسلم لیڈران اپنے دوستوں سے مشورہ کر رہے تھے۔ جن میں مسلمان اور انگریز دونوں شامل تھے۔ بلگرامی جو نظام کی ملازمت میں تھے وہ حیدرآباد کے ریزیڈنٹ بیلے (Bayley) کے کان میں ایک ایسے وزیر ہند سے مسلمانوں کے خوف کے بارے میں بھونک رہے تھے۔ جو والٹیئر (Voltaire) اور اٹھارہویں صدی کے لٹریچر کے بارے میں اسی زمانہ کے ہندوستان کے حالات سے زیادہ علم رکھتا ہے"۔ ۱۵/

محسن الملک، نے بلگرامی سے اتفاق کیا ایک خط میں جو انہوں نے آرچ بولڈ (Archbold) کو لکھا تھا۔ اس میں یہ خیال ظاہر کیا تھا۔ کہ مسٹر مارلے ایک فلسفی ہیں۔ اور فلسفہ پر لکچر دینے سے ممکن ہے۔ وہ قطعی مطمئن ہوتے اور ہر شخص اس بات پر افسوس کرے گا۔ کہ ہندوستان کی قسمت ان کے ہاتھ میں دیدی گئی ہے۔ ۱۶/

دوسرے ممتاز مسلم لیڈروں نے محسن الملک پر دباؤ ڈالا کہ فوراً قدم اٹھائیں ورنہ ممکن ہے۔ کہ ان کا مقدمہ عدم پیروی کی بھینٹ چڑھ جائے۔ ان ممتاز لیڈروں میں کچھ تو صوبہ جات ممالک شمالی و مغربی (اترپردیش) کے تھے۔ کچھ بنگال کے بالخصوص مشرقی، بنگال کے اور کچھ ریاست حیدرآباد کے۔

انگریزوں میں انہوں نے جے۔ بی۔ لا۔ ٹاشے (J. B. Latouche) لفٹیننٹ گورنر صوبہ ممالک شمالی و مغربی سے مشورہ کیا۔ ان کے گورنر کے بیچ درمیانی آدمی ڈبلو۔ اے۔ جے،

14- Ibid. P. 30

15- Minto Papers. Letters and Telegrams 1906. Vol. 2 No 23, Cited in Tripathi, A. The Extremist Challenge, P. 154.

16- Letter from Muhsin-ul-Mulk to Archbold Bombay August 18. 1906. Cited in wasti. S.R. Minto and the Indian Nationalist Movement. P. 232.

آرچ بولڈ (W.A.J. Archbold) پرنسپل ایم اے او کالج تھے ۔ جو ان دنوں شملہ میں اپنی گرمیوں کی تعطیل گذار رہے تھے ۔ ۴ اگست ۱۹۰۶ کو محسن الملک نے آرچ بولڈ کو ایک خط لکھا جس میں ان کی توجہ مارلے کی تقریر کی جانب مبذول کرتے ہوئے یہ انتباہ دیا ۔ کہ اعلان نوجوان تعلیم یافتہ مسلمانوں کے رجحان کو اور قوی کر دے گا جو پہلے ہی سے کچھ مایوس ہو چکے ہیں ۔ اور کانگریس میں شریک ہونے کی جانب راغب ہیں ۔ انہوں نے اس امر کی جانب اشارہ کیا کہ مسلمانوں کی بے اطمینانی کی وجہ کونسل میں ان کی نمائندگی کا مسئلہ ہے ۔ اور اگر الیکشن کے اصول کو بھی وسیع کر کے اس پر عائد کر دیا گیا تو کونسل میں ایک بھی مسلمان نہ ہو سکے گا ۔/17

خط میں آرچ بولڈ سے اس تجویز کے بارے میں مشورہ طلب کیا گیا تھا کہ مسلمانوں کی جانب سے وائسرائے کی خدمت میں ایک میموریل پیش کیا جائے اور ہز ایکسلنسی سے یہ درخواست کی جائے ۔ کہ وہ مسلمانوں کے ایک وفد کو شرف باریابی بخشیں "/ 18

آرچ بولڈ نے فوراً ڈنلپ اسمتھ (Dunlop Smith) کو لکھا کہ جیسے ہی میں نے ڈھاکہ کی میٹنگ اور وہاں کی بے چینی کا حال پڑھا جو فلر کے استعفا مورخہ 3 اگست ۱۹۰۶ پر مبنی تھا (اور ان لوگوں کے نام پڑھے جو اس سے متعلق تھے تو میں اس بات پر بہت مضطرب تھا کہ ایک وفد کی تجویز پیش کر دوں تاکہ وہاں کے اختلافات کا مسئلہ حل ہو جائے اور غالباً دوسری تجویز کا بھی (مطلب علی گڑھ سے تھا ۔ انہوں نے پرائیویٹ سکریٹری کو مشورہ دیا کہ اگر مسلمانوں کو (خفیہ طور پر) یہ اطلاع دے دی جائے کہ وفد کو شرف باریابی بخشی جائے گی اور ایک بیان بھی دیا جائے گا ۔ تو وہ لوگ وائسرائے کی خدمت میں شملہ کے مقامہ کی عرضداشت پیش کریں گے ۔/ 19

آرچ بولڈ جو اپنے آپ کو مسلمانوں کے حقوق کا علمبردار سمجھتا تھا اس نے اب شملہ کے معاملات میں رہنمائی کی ۔

---

17 - Morley Papers : Enclosure from Minto to Morley Cited in Ibid. P. 62.

18 - Ibid. PP. 62-3

19 - Ibid Appendix. V. P. 228

ڈنلپ اسمتھ (Dunlop Smith) جو وائسرائے کا سکریٹری تھا: اس کو اجازت حاصل کرنے میں کسی قسم کی ترغیب کی ضرورت پیش نہیں آئی کیونکہ وہ تو خود اس پالیسی کا حامی تھا کہ مسلمانوں کو کسی طرح اپنے موافق لاکر کانگرس کے خلاف کیا جائے اور اس پالیسی پر اسکو پختہ یقین تھا۔

منٹو ڈنلپ اسمتھ کے مشوروں کی بڑی قدر کرتا تھا جو عام طور پر وہ ان کے خود رجحانات سے مطابقت رکھتے تھے۔ اس لیے اس نے بلا توقف محسن الملک کی درخواست منظور کر لی۔

8 اگست کو منٹو نے محسن الملک کے خط مورخہ 4 اگست کو مارلے کے پاس بھیج دیا۔ ،

10 اگست کو ڈنلپ اسمتھ نے آرچی بولڈ کو بتلایا کہ "ہز ایکسلنسی نے وفد کو شرف باریابی بخشنے پر منظوری دیدی ہے" 20 اس درمیان میں انہوں نے کچھ گورنمنٹ کے افسران سے مشورہ کیا۔ ڈی ابٹسن (D. Ibbetson) پنجاب کے لفٹننٹ گورنر نے اس تجویز کی تائید کرتے ہوئے کہ ایک مسلم وفد کو ملنے کی اجازت دی جانی چاہئے کہا کہ "ایک حادثہ ہوگا۔ اگر ہم ان کو بھگا کر کانگرس پارٹی کے بازوؤں میں دھکیل دیں" 21

لینسلاٹ ہیر (Lancelot Hare) جو فلر کا جانشین ہوا اور جسکو منٹو نے "ٹھنڈے دماغ والا مضبوط اور منصف مزاج انسان" کا لقب دیا تھا۔ اس نے وائسرائے کو نہ صرف وفد کو شرف باریابی بخشنے کا مشورہ دیا۔ کہ وہ اس وفد کو مسلمانوں کا صحیح نمائندہ قرار دے کر اسی حیثیت سے ان کے ساتھ برتاؤ کیا جائے۔ ان کے خیال کے مطابق "مسلمان بلا حیل و حجت کل کے کل بلا ایک مسلمان کے استثنا کے اپنے لیڈران کی اتباع کریں گے۔ اور حقیقت تو یہ ہے، کہ یہ پولیٹیکل ایجیٹیشن تعبیر کیا جاتا ہے۔" 22 ۔ منٹو نے ان رایوں سے مسلح ہو کر مارلے کو بتاریخ 10 ستمبر اپنا فیصلہ ...... بھیج دیا کہ وہ وفد سے یکم اکتوبر کو ملاقات کریگا۔ تین دن کے بعد 13 ستمبر کو وفد کے لیڈروں سے یہ کہا گیا۔ کہ وائسرائے وفد سے یکم اکتوبر کو ملاقات

---

20 - Das. M.N. opcit P.166. Minto Correspondence

21 - Gilbert, M. Servant of India P.51.

22 - Minto to Morley, September 10. 1906. enclosing Hare's letter to Dunlop smith cited in Das. M.N. opcit. P.170

کریں گے۔ منٹو نے 26 ستمبر کو اپنے جواب میں کہا کہ وہ بڑے شوق سے وائسرائے مسلمانوں کی گفتگو کا انتظار کرتا رہے گا۔

اس درمیان میں جو لوگ کہ وفد کی تحریک کو چلانے والے تھے۔ وہ ضروری انتظامات کرنے میں مشغول رہتے تھے۔ اپنے خط مورخہ 4 اگست 1906 میں محسن الملک نے آرچ بولڈ سے وائسرائے کے پاس وفد لیجانے کے مناسب ہونے پر مشورہ طلب کیا تھا۔

آرچ بولڈ نے اپنے سخت خفیہ جواب مورخہ 10 اگست 1906 میں محسن الملک کو اطلاع دی تھی کہ انہوں نے کرنل ڈنلپ اسمتھ سے ملاقات کی تھی۔ اور انکو یقین دلایا تھا۔ کہ مسلمانوں کا ہرگز کسی ایسے کام کے کرنے کا ارادہ نہیں ہے۔ جس سے گورنمنٹ کو کسی مشکل میں مبتلا ہونا پڑے بلکہ صرف ان خوف و ہراس کی تفصیل بیان کرنا ہے۔ جو معقولیت کے ساتھ ان کے دماغوں میں پیدا ہو رہے ہیں۔

اس کے بعد آگے چل کر انہوں نے ان کارروائیوں کو تجویز کیا جن پر عمل درآمد ہونا چاہیئے۔ (1) یہ کہ ایک باضابطہ درخواست جس پر چند نمائندہ مسلمانوں کے دستخط ہوں فوراً بھیج دی جائے (2) ایک اچھی تعداد ممتاز مسلمانوں کی منتخب کی جائے جو وفد کے اراکین ہوں اور میمورنڈم پر دستخط کریں (3) اور یہ کہ سپاسنامہ کا مواد کیا ہو اس کے بارے میں ان کا مشورہ یہ تھا۔ کہ حسب ذیل بات شامل ہونا چاہیئے۔

"ایک عام وفاداری کا اقرار اور یہ بیان کہ مسلمانوں کی ماضی کی تاریخ اسے مبنی برحق قرار دیتی ہے۔ کہ ان پر مستقبل میں بھروسہ کیا جائے۔

"اس بات پر شکریہ کا اظہار کہ سلف گورنمنٹ کی منزل کی جانب ایک اہم قدم اٹھایا گیا ہے۔"

"اس ہراس کا بیان تاکہ الکشن کا ایسا کوئی عام نظام اختیار نہ کیا جائے جس سے مسلمانوں کے مفاد کو جو بہت سے اضلاع کے اندر اقلیت میں ہیں نقصان نہ پہونچے۔"

"اس امید کا اظہار کہ نامزدگی کے کسی طریقہ کو اختیار کرنے یا مفادات کی نمائندگی مذہبی عقائد کی بنیاد پر کرنے میں مسلم آرار کو مناسب وزن دیا جائے گا۔"

"اس رائے کا اظہار کہ ایک ایسے ملک میں جیسی کہ ہندوستان کی حالت ہے یہ کتنا اہم ہے۔ کہ مالکان آراضی جن کا ہندوستان کی سب سے بڑی صنعت سے تعلق ہے انکو،

پوری اہمیت اور اظہار خیال کا موقع دیا جائے۔"

اس خط میں آگے چل کر لکھا تھا۔ کہ "ان تمام کارروائیوں میں میں پس پردہ رہنا چاہتا ہوں لیکن آپ تو جانتے ہی ہیں۔ کہ میرے دل کو مسلمانوں کے مفادات سے کتنا مکمل لگاؤ ہے اور جو کچھ میرے اختیارات میں ہو میں ہر طرح مدد کرنے میں خوشی محسوس کرونگا۔ میں یہ خدمت کر سکتا ہوں کہ سپاسنامہ کا مسودہ تیار کر دوں یا اگر کوئی دوسرا تیار کرے تو اس کو دقت نظر سے دیکھ لوں، آپ ہر حال میں مسودہ کو مکمل کرنے کیلئے پہلے مجھے ضرور دکھلائیے گا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ درخواست کے لیے کیسے الفاظ استعمال کئے جائیں جن سے خوشگواری بھی پیدا ہو اور اپنی غرض بھی کہہ دی جائے"۔/23

۱۴، اگست کو آرچی بولڈ نے اپنا باضابطہ درخواست کا مسوّدہ محسن الملک کو بھیج دیا۔ جنھوں نے اسے اپنے دوستوں کے پاس سوچھاؤ کے لیے بھیجا۔ محسن الملک نے اپنے جواب مورخہ 18 اگست میں چند ترمیمات کرنے کو مناسب قرار دیا۔ اور آرچی بولڈ سے دریافت کیا کہ کیا، "گورنمنٹ کے لیے یہ مناسب ہوگا۔ کہ وہ باشندگان ہند کے ایک ایسے اہم طبقہ کو جس نے ہمیشہ گورنمنٹ کی نہ صرف حمایت کی بلکہ اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے اسی پر انحصار بھی کیا تھا، مایوس کر دے اور وہ بھی ہندوؤں کی طرح ایجیٹیشن بپا کرے"۔/24

آرچی بولڈ نے یہ خط ڈنلپ اسمتھ کو دکھا دیا جس نے اس کی ایک نقل لینے لانسی لاٹ ہیر (Lancelot Hare) کو بھیج دیا۔ انہوں نے ایس۔ اتچ بلگرامی حیدرآباد اور ایس نواب علی چودھری ڈھاکہ سے اس ایڈریس اور وفد میں شریک ہونے والے ممبران کے بارے میں خط و کتابت کی۔ انہوں نے۔ اس باضابطہ درخواست کا مسوّدہ بھی تیار کیا جو مسلمانوں کو دینی تھی اور ان کے پاس دستخط کے لیے بھیج دیا۔/25

23- The letter of W.A.J. Archbold to Muhsin-ul-Mulk, Dated, Simla the 10th of August. Copy supplied to the author through the favour of Professors Syed Noorul Hasan and K.A. Nizami from the Archives of the Aligarh Muslim University.

24- Wasti, S.R. op.cit. Appendix J. Letter No.4. PP. 231-33.

25- Ram Gopal, Indian Muslims P. 97.

مسلمانوں نے ایک کمیٹی بنائی جس نے درخواست پر دستخط کرنے کے لیے بہت سے دستخطوں کو فراہم کیا۔ انہوں نے ایک مسودہ تیار کیا جس کا مواد محسن الملک۔ ایچ۔ ایس بلگرامی اور آرچی بولڈ کے باہمی مشورہ سے تیار کیا گیا تھا۔ ۱۶ ستمبر تک مسودہ کا مضمون آخری درجہ پہنچ گیا تھا۔/ 26 اور فوراً بعد اس کی ایک پیشگی نقل وائسرائے کو بھیج دی گئی۔ اور ان کو مسودہ کے خیال و خط سے پہلے ہی واقف کرا دیا گیا تھا۔ اور وہ 18 ستمبر کو ماسلے کو لکھ چکے تھے۔ کہ (اپنے جواب میں وہ کون سی راہ اختیار کریں گے مارلے نے ان کو آگے جانے کا سگنل دیدیا تھا۔

جن ممبران کو وفد میں شریک ہونا تھا ان کا انتخاب ہو گیا۔ اور آغا خاں جو مسلمانوں کے اسماعیلیہ فرقہ کے پیشوا تھے ان سے قیادت کی درخواست کی گئی۔ قیادت کے لیے آغا خاں کا انتخاب سازباز کا نتیجہ تھا۔ ان کے جد امجد جو محلات (Mahallat) اور قم (Qum) صوبوں کے ایران میں زیر حکومت شاہان قاچار گورنر تھے۔ وہ وراثت کے تنازعوں میں گھرے ہوئے تھے اور مجبور ہو کر ترک وطن کر کے سندھ آ گیے تھے۔ پہلی جنگ افغانستان میں انہوں نے انگریزوں کی مدد کی اور اسی طرح امیر سندھ کے خلاف جو مہم انگریزوں نے چلائی تھی۔ اس میں بھی مدد کی تھی۔ وفاداری کی روایت کی تقلید پوتے صاحب نے بھی کی اور گرانقدر انعامات پائے۔

ایڈریس پر نوابوں، تعلقداروں، جاگیرداروں، وکلاء، زمینداروں، تجار اور دوسرے لوگوں نے دستخط کیے جن کی مجموعی تعداد 35 تھی۔ ان لوگوں کا دعویٰ تھا کہ وہ شہنشاہ معظم کی مسلم رعایا۔ جو ہندوستان کی مختلف حصوں میں بٹی ہے۔ اور اس کی ایک بڑی جماعت کی وہ نمائندگی کرتے ہیں۔

یہ دعویٰ بہت قابل لحاظ ہے کیوں کہ یہ پہلا موقع ہے جب مسلمانان ہندستان نے اپنے کو ایک علیحدہ قوم قرار دیا۔ وائسرائے محل واقع شملہ میں یکم اکتوبر کو یہ ایڈریس مسٹو کو پیش کیا گیا۔ ان میں کئی مطالبات کیے گئے تھے۔

(۱) تمام ملازمتوں میں خواہ وہ سول ہوں یا ملٹری اور ہائیکورٹ میں بھی مسلمانوں کو معقول،

---

26 - Muhsin-ul-Mulk's letter to Archbold, August 18, 1906, refers to Archbold's draft and his own reaction (Doc. M.N. Qbir? PP.167-68)

نمائندگی دی جائے۔ اونچی جگہوں پر بامقابلہ کا امتحان لیے تقرری کی جائے۔

(2) میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں میں ایک مخصوص تعداد کی گارنٹی دی جائے اور اسی یونیورسٹیوں کے سنڈیکیٹ اور سینیٹ میں بھی۔

(3) صوبہ کی قانون ساز اسمبلیوں میں مسلمانوں کا انتخاب مسلم ووٹوں کے جداگانہ انتخاب سے ہو اور ان کی تعداد مقرر ہو آبادی کے تناسب سے نہ ہو بلکہ ان کی سیاسی اہمیت کے لحاظ سے ہو۔

(4) مرکزی لیجسلیٹو میں مسلمانوں کا انتخاب ایک جداگانہ انتخاب کے ذریعہ ہو اور کافی تعداد میں ہو تاکہ مسلمان ایک غیر موثر اقلیت بن کر نہ رہ جائیں۔

(5) ایک مسلم یونیورسٹی کے قیام میں مدد جو مسلمانوں کا مذہبی اور علمی مرکز ہو۔

اپنے جواب میں منٹو نے اراکین وفد کو "ایک فاتح اور حکمراں نسل کے وارثان" کے لقب سے طلب کیا اور وفد کی نمائندہ حیثیت کا خیر مقدم کیا جو ہندوستان کے روشن خیال مسلم طبقہ کی آرا اور ان کی تمناؤں کا اظہار کر رہا تھا۔"

انہوں نے اس بالغ نظر فہم و فراست کی مدح کی جن پر تجویزات کی بنیاد قائم کی گئی تھی۔ انھوں نے وفد کو یاد دلایا کہ ہندوستان کے برطانوی حکمراں وارن ہیسٹنگز کے زمانہ سے مسلمانوں میں تعلیم کی اشاعت کی مدد کرتے رہے ہیں۔ تاکہ وہ اس قابل ہو جائیں کہ گورنمنٹ کی ملازمتوں میں داخل ہو سکیں۔ اور علی گڑھ کالج کی اس بات کے لیے بڑی مدح و ثنا کی، اور کہا کہ مسلمانوں کو، وفاداری، ہوشمندی اور معقول فہم فراست میں تربیت دی جارہی ہے۔

جہاں تک کہ ان کے مطالبات کا تعلق ہے جن کا ذکر ایڈریس میں کیا گیا تھا انھوں نے مدبرانہ الفاظ میں ایک عام یقین دہانی کی۔ نمائندگی کے نظام کی خرابیوں کے بارے میں انہوں نے وفد سے حسب ذیل الفاظ میں کامل اتفاق کیا۔

میں اس طرح اس بات پر پختہ عقیدہ رکھتا ہوں جس طرح کہ آپ رکھتے ہیں کہ کوئی السابذریعہ انتخاب نمائندگی کا نظام جو اس برّاعظم کے بسنے والوں کے تمام فرقوں کے عقائد و روایات کا لحاظ کیے بغیر محض ذاتی بنیادوں پر بنایا جائے۔ اس کا انجام ایک مذموم ناکامی ہی ہو سکتا ہے۔"

"اس طرح فرقوں کے مخصوص نمائندگی کا اصول سرکاری طور پر تسلیم ہو گیا۔ اسی کے

ساتھ ساتھ اس امر کی بھی یقین دہانی کی گئی۔ کہ کسی جدید انتظام مملکت کے ہر شعبہ میں، مسلمانوں کے مفاد کا ایک فرقہ کی حیثیت سے تحفظ کیا جائے گا۔

شملہ کے واقعہ کے دور رس نتائج تھے۔ اگرچہ سخت تعجب ہے۔ کہ اس وقت کی سیاسی جماعتوں نے اس پر توجہ نہیں کی۔ کانگرس کے لیڈروں میں باہمی اختلاف آرار تھا جو انتہا پسند تھے۔ وہ پورے جوش کے ساتھ مخالف تقسیم بنگال شورش میں معروف تھے۔ اور اونچے طبقہ کے مسلمانوں اور وائسرائے کے ساز باز کی قطعی پروا نہ کرتے تھے۔ اور معتدل حضرات کو اصلاحات کی کارروائیوں سے زیادہ تعلق تھا۔ اور وہ اس بات پر زیادہ دھیان دیتے تھے۔ کہ نمائندہ حکومت کے قیام کی جانب قدم کتنا آگے بڑھا بجائے اس کے کہ کونسل کے سیٹوں کی تقسیم پر توجہ کرتے۔

دسمبر 1906ء میں کانگرس نے اس کا کوئی نوٹس ہی نہیں لیا۔ اور اگرچہ دادا بھائی نوروجی نے دونوں فرقوں کے اتحاد کی ایک پرجوش اپیل کی لیکن شملہ کے تماشے کا، ذکر تک نہیں کیا۔ گوپال کرشن گوکھلے۔ جنہوں نے بعد کو بالاعلان کہا اسے منظور کیا۔ رمیش چندر دت نے منٹو کی تقریر قابل اعتراض نہیں پائی اور قومیت پرست پریس بھی کچھ زیادہ مضطرب نہ تھا۔ البتہ امرت بازار پتر کا نے ایک شوخ چشم مضمون لکھا اور ان کل کارروائیوں کا مذاق اڑایا۔ لاہور کے اخبار ٹریبون نے یہ کہہ کر اسے ٹال دیا کہ یہ ایک اور کوشش ہندوؤں کی مدگوئی کرنے کی ہے۔

منٹو حد سے زیادہ خوش تھا۔ اس نے 62 ملین مسلمانوں کو باغیانہ مخالف پارٹی میں شریک ہونے سے روک کر اپنی موافقت میں جیت لیا تھا۔ مارلے نے ان کی ہوشیاری کے لیے ان کو ایک فصیح الفاظ میں سند عطا کی برطانیہ کے اخبارات ٹائمز کی قیادت اور اینگلو انڈین اخبارات مجموعی طور پر کل کے کل نے وائسرائے پر مدح و ثنا کی بارش کی۔

مسلمان اپنی کامیابی پر خوشی سے اپنے جامہ میں پھولے نہیں سماتے تھے۔ محسن الملک نے ڈنلپ اسمتھ سے کہا۔ کہ جو صاف ہمدردانہ اعلان مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے بارے میں کیا گیا ہے۔ اس سے مسلمان کس درجہ خوش اور مطمئن ہیں۔ اور جس طرح انڈیا گورنمنٹ نے اپنی پالیسی کا تاریخی اعلان کیا ہے۔ اس نے مسلمانوں میں ایک نیا

حوصلہ پیدا کر دیا ہے۔27/

ایک ڈیلیگیٹ جو لیڈی منٹو سے سر پہر کی ملاقات کے بعد ملے انہوں نے ان کو یقین دلایا کہ:

ہز اکسلنسی نے ہمارے دلوں میں محبت کا چراغ جلا دیا ہے۔ ہم ہمیشہ سے وفادار رہے ہیں۔ لیکن اب ہم محسوس کرتے ہیں۔ کہ وائسرائے ہمارا دوست ہے"/28۔ پٹیالہ کے مسلم وزیر اعظم نے اعلان کیا کہ "سو سال ہوئے کہ لارڈ منٹو آئے اور ہماری ریاست کو بچا لیا۔ ان کے خاندان کا احسان ہم کبھی نہیں بھولے۔ اب خدا نے ان کے ورثا میں سے ایک شخص کو ہندوستان۔ صرف پٹیالہ کو نہیں بلکہ پورے ہندوستان کو بچانے کیلئے بھیج دیا۔ اور ہمارے قلوب شکر گذاری کے جذبات سے بھرے ہوئے ہیں"/29

جب لارڈ منٹو 22 اپریل 1908/ کو ایم۔ اے۔ او کالج تشریف لے گئے تو مسلمان لیڈر ان نے وہاں کہا کہ "ایک ایسے موقع پر جب ہماری مسلم قوم کے مفادات سب سے نچلی تہہ میں پہونچ گئے تھے۔ اور جب کہ بقاء حیات کی جدوجہد پر چہار جانب سے انتہا کی مایوسی چھائی ہوئی تھی تو ہز اکسلنسی کے عاقلانہ تدبر اور فیاضانہ پالیسی نے جو ہمارے لیے اختیار کی گئی۔ ہم کو نا امیدی کے گہرے غار سے باہر نکالا اور ہمارے اندر ایک نئی، زندگی، نئی امید اور نئی ہمت پیدا کی جو معقول نشان اس بات کا ہے۔ کہ مسلمانان ہندوستان کے ایک درخشاں مستقبل کی صبح نمودار ہو رہی ہے۔ اس لیے یور اکسلنسی (حضور والا) کے لیے ہماری محبت اور آپ کے لیے ہمارے دل میں عظمت ایک نادر پوزیشن رکھتی ہے"/30

شملہ ڈیپوٹیشن کی علت نمائی کی تلاش کوئی اہمیت نہیں رکھتی جیسا کہ خود ایڈریس کے اندر کہا گیا تھا۔ وفد میں جو لوگ شامل تھے۔ وہ سب اونچے طبقہ کے مسلمان،

28- Mary, Countess of Minto op.cit, P.47.

29- Ibid.

30- Aligarh Institute Gazette; April 22, 1908.

تھے ۔ اس طبقہ نے سرسید کی ہدایات کے ماتحت اپنے لیے ایک معین پالیسی طے کر لی تھی ۔ یعنی حکمرانوں کی وفاداری اس امید میں کہ 1857ء کی بغاوت میں جو املاک ان سے چھین لی گئی وہاں وہ پھر آباد کر دیئے جائیں ۔ سرسید کے خیال کے مطابق برطانوی، حکومت کو دوام حاصل ہے ۔ اور اسے کوئی ہٹا نہیں سکتا اور اس لیے مسلم قوم اسی ، وقت فلاح پا سکتی ہے ۔ جبکہ وہ حکومت برطانیہ کی عنایت بے غائت حاصل کر سکے ۔ اس کا منطقی نتیجہ اس کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ مسلمان اپنے تمام مفادات کو حکمراں کی سپرد گی میں لا دیں ۔ اور ان سب لوگوں کی مخالفت کریں جو گورنمنٹ کی پالیسیوں پر ہلکے سے ہلکا بھی اعتراض کرتے ہوں ۔ اور ان سے ذرا بھی اختلاف رکھتے ہوں یا عوامی شورش میں حصہ لیتے ہوں ۔

اس لیے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے ۔ کہ مارلے کے اعلان سے جو حالات پیدا ہوئے تھے ۔ اس میں محسن الملک نے اپنے برطانوی دوستوں سے مشورہ کیا اور خاص کر جب ابھی، حال میں ان کو ایک تحقیر آمیز جھڑکی کا سامنا کرنا پڑا تھا ۔ اس لیے اس بات کی مشکل ہی سے ضرورت محسوس ہو گئی کہ اس بات کی جانچ کی جائے کہ وفد کا خیال خود ان کے دماغ میں آیا یا افسران یا ان لوگوں نے ان کے دماغ میں ڈالا جنہوں نے ایڈریس کے مواد کے سوچھا و پیش کیے ۔ اور اسی طرح یہ بات بھی اس قابل نہیں ہے ۔ کہ اسے طے کیا جائے کہ جداگانہ انتخاب اور (Weightage) (آبادی سے فاضل تناسب) کے خیالات خود ان کے دماغ میں آئے یا سرکاری افسران نے ان کے دماغ میں ڈال دیئے کیونکہ ۔ واقعہ یہ ہے ۔ کہ وفد نے دونوں کو اپنی جانب سے کہا ۔ اور مسلم مفادات کے تحفظ کے لیے ضروری قرار دے کر پیش کیا ۔

اس سلسلہ میں ریمزے میکڈانلڈ کا بیان مناسب موقع ہوگا انہوں نے لکھا :۔

مسلمان لیڈران میں کچھ اینگلو انڈین حضرات نے روح پھونکی ہے ۔ اور لندن میں کچھ افسران نے خفیہ ریشہ دوانیاں کی ہیں ۔ اور سوچی بھی بدنیتی سے کام لے کر ہندوؤں اور مسلمانوں میں پھوٹ کا بیج بو یا ہے ۔"/31

---

31. Macdonald, R. The Awakening of India, P.176.

اونچے درجہ کے افسران مثل خول، ہیر، ایبٹسن کے مشوروں اور اگزیکٹو کونسل کے ممبران سے بحث و تمحیص کے بعد منٹو نے مسلمانوں کے مسئلہ کو مسلم لیڈران مثل آغاخاں سے گفت وشنید کرتے ہوئے۔ اپنے ہاتھ میں لیا تھا۔ وہ اس بات کے بڑے آرزومند تھے۔ کہ کوئی ایسا موقع ملے جب وہ مسلم قوم کو راضی کر سکیں۔ اور نوجوان کو اپنی موافقت میں صف آرا کر دیں جو سردست تذبذب میں مبتلا تھی۔ ڈنلپ اسمتھ جو ان کے منیر کا مین تھا، اور آرچی بولڈ جو ڈنلپ اسمتھ کے دوست تھے۔ یہ دونوں اسی طرح پر سوچ رہے تھے، اور مسلمان لیڈران سے قریبی رابطہ رکھتے تھے۔

شملہ وفد کا تجزیہ

اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ کہ یہ وفد اور ایڈریس اونچے طبقہ کے مسلمانوں کے لیڈران اور برطانیہ دفتری حکام کی متفقہ کوشش کے نتائج تھے۔

اس واقعہ کے نمایاں خط وخال یہ تھے۔ (۱) بلاشرط وفد کو تمام مسلم قوم کا واحد نمائندہ تسلیم کرنا (۲) مسلمانوں کو ایک قوم تسلیم کیے جانے کی مکمل منظوری۔ یعنی ایک قوم اندرون قوم" یہ قول آغاخاں اور اس لیے وہ مخصوص برتاؤ کی مستحق ہے۔

بعد کو اس کے جو سنگین نتائج نکلے ان کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ان، مطالبات کا جو ایڈریس میں پیش کیے گئے تھے۔ اور جن دلائل پر ان کو مبنی کیا گیا تھا ان سب کا جائزہ لیا جائے۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے۔ کہ یہ مطالبہ کہ وفد تمام مسلمانان ہند کا نمائندہ ہے اس کا لچر ہونا تو صاف ظاہر ہے۔ کیونکہ وفد نے خود اپنے کو مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد ہی کا نمائندہ کہا تھا۔ لیکن منٹو نے ان کا خیر مقدم کرتے ہوئے ان کو ہندوستان کے مسلم فرقے کے روشن خیال طبقہ کے نمائندوں کی حیثیت سے خطاب کیا اور ایڈریس کے بارے میں یہ کہا کہ یہ ایک نمائندہ جماعت کی جانب سے ہے۔ منٹو کی فیاضی نے ان کو وہ منصب عطا کر دیا جس کی واقعات تردید کرتے ہیں۔

جیسا کہ ایک دوسرے باب میں ظاہر کیا گیا ہے۔ مسلمان ایک مربوط جماعت نہیں تھے، عوام اپنے مذہبی پیشواؤں کے پیچھے چلتے تھے۔ ملا۔ مولوی، اور علما۔ مذہبی پیشوا جہاں تک

کہ سیاسی مقاصد اور لائحہ عمل کا تعلق تھا۔ اونچے طبقہ کے مغرب زدہ مسلمانوں سے اختلاف رکھتے تھے۔ مغربی اور جنوبی ہندوستان کا تجار طبقہ سرسید کی پالیسیوں سے اتفاق نہیں کرتا تھا بہت سے ممتاز مسلمان جو کانگرس کے حامی تھے۔ ان کو نظرانداز کر دیا گیا۔ کچھ بڑے باصلاحیت مسلمان جو اوپر ابھر رہے تھے۔ (جنھوں نے بعد کو اپنے خیالات بدل دیئے) وہ 1906 میں پرجوش قوم پرست تھے۔ مثلاً ایم۔ اے جناح۔ جنھوں نے کلکتہ کانگرس میں شرکت کی۔ اور دادا بھائی نوروجی کے سکریٹری کی حیثیت سے کام کیا جو کانگرس سیشن کے پریسیڈنٹ تھے۔ اور اقبال جنھوں نے اپنا مشہور و معروف ترانہ سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا تصنیف کیا تھا۔

واقعہ یہ ہے۔ کہ علی گڑھ کے مکتبہ خیال کی سیاسی جماعت جو شملہ کے وفد کی پشت پر تھی۔ اور جو انڈین نیشنل کانگرس کی شدت سے مخالف تھی۔ اس کو اب تک صرف محدود کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ اور ان کے لیڈران اس بات کی بڑی آرزو رکھتے تھے کہ گورنمنٹ کی مدد سے نوجوان مسلمانوں میں جذبہ کانگرس کی جماعت میں شرکت کا پیدا ہوا ہے۔ اس کی روک تھام کی جائے۔

ان وجوہ کی بنیاد پر وفد صرف شمالی ہندوستان کے مسلمانوں کے مالکان آراضی امراء کا نمائندہ تھا۔ 35 اصحاب جو وفد کے اراکین تھے۔ ان میں سے گیارہ تو صوبہ ممالک شمالی و مغربی کے۔ آٹھ پنجاب کے اور آٹھ بنگال (بشمولہ بہار) کے تھے۔ بمبئی کے صرف چار اور تین دوسرے صوبوں کے ایک ایک اور ریاست نظام کے ایک تھے۔ یہ جز ابراہیم بھائی آدم جی پیر بھائی کے اور کوئی تجار کی بڑی اور خوش حال جماعت کا نمائندہ نہ تھا۔

پھر یہ بات بھی تھی کہ ان نمائندوں کو مسلمانوں کی کسی پبلک جماعت یا ایسوسی ایشن سے نہیں چنا تھا۔ یہ لوگ وفد کے رکن محض اپنی ذاتی حیثیت سے تھے۔ انہی لوگوں کے برابر کی حیثیت رکھنے والوں کے ایک گروہ کو بہت آسانی سے اکٹھا کیا جا سکتا تھا۔ تاکہ وہ ان مطالبات سے مختلف مطالبات پیش کریں۔

شبلی نے شملہ کے معاملہ کا جو نقشہ کھینچا ہے۔ اس سے وفد اور اس کے مطالبات کی، مصنوعی کیفیت ظاہر ہو جاتی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے۔ کہ:۔

شملہ کے وفد کا منشا صرف اس قدر تھا۔ اور اسے صفائی سے ظاہر بھی کر دیا گیا تھا،

کہ ہندو جو سیاسی حقوق حاصل کریں ان میں مسلمانوں کا بھی حصہ ہونا چاہیئے۔ دن اور رات
ان کا مستقل لیپ کا بند یہ تھا۔ کہ ہندو مسلمانوں کو ستا رہے ہیں۔ اس لیے مسلمانوں کو تحفظات
ملنے چاہئیں۔ ہم شملہ کے وفد کی اہمیت سمجھنے سے قاصر ہیں۔ فرقہ وارانہ پلیٹ فارم کے
لیے یہ سب سے بڑا تماشہ تھا۔"

شبلی نے شملہ کے معاملہ کو سیاست کا کاروبار قرار دینے سے انکار کیا۔ کیونکہ انکے
خیال کے مطابق "سیاست تو قوم کو عمل کے لیے بیدار کرتی ہے۔ اور لوگوں کو ایثار اور
بڑی سے بڑی قربانی دینے کا جوش پیدا کرتی ہے" انہوں نے سوال کیا کہ۔ ہماری سیاست
نے ایک فرد میں بھی ان صفات کو پیدا کیا ہے۔" 32

پھر منٹو نے کیوں اور بقیہ سب کو نظر انداز کر کے ان 35 آدمیوں کو مسلم قوم کا نمائندہ
قرار دیا۔ اس کا جواب صرف ایک ہو سکتا ہے۔ یعنی کہ ان لوگوں پر وائسرائے نے اپنے لطف
وکرم کی بارش کر کے دوسرے مسلمانوں پر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔ کہ وہ خبردار
ہو جائیں اور سمجھ لیں کہ گورنمنٹ کی سرپرستی صرف ان لوگوں کو حاصل ہوگی جو گورنمنٹ کی
وفادارانہ حمایت کریں گے اور انڈین نیشنل کانگرس میں شرکت سے دور رہیں گے۔ اور
انہی خیالات کو مدنظر رکھتے ہوئے منٹو نے ان کو مسلمان قوم کے تمام روشن خیال طبقہ کا
نمائندہ اعلان کیا ہے۔ اور ان کو ایک ایسا فرمان دیا جس سے مسلم لیگ نے آگے چل پورا پورا
فائدہ اٹھایا۔

ایڈریس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت مسلمان ابھی یہ فیصلہ نہیں کر سکتے تھے۔ کہ ان
کو ایک فرقہ قرار دیا جائے۔ یا ایک قوم، ایک اقلیت، ایک مساوی جماعت۔ ان کے مطالبات
ایسے الفاظ میں لکھے گئے تھے۔ جن سے اس معاملہ پر ہچکچاہٹ ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً انہوں
نے ایک طرف قومی مفادات کا تذکرہ کیا۔ اور دوسری جانب امپیریل کونسل میں غیر موثر اقلیت
ہونے پر اپنے اضطراب کو ظاہر کیا اور اسی سانس میں انہوں نے یہ کہا کہ بہت سے اہم،
معاملات میں ان کے مفادات اور ہندوں کے مفادات ایک ہی تھے۔

مسلمانوں نے معقول حقیقی اور قابل لحاظ مسلمانوں کی نمائندگی کا جو مطالبہ جداگانہ انتخاب

---

32. Shibli Numani, Muslim Gazette of Lucknow, October 9, 1907.

کے ذریعہ کیا تھا۔ اس شکایت کی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کو یہ خوف تھا۔ کہ مشترکہ انتخاب کی صورت میں مسلمان جہاں اقلیت میں تھے۔ اور زیادہ تر صوبوں میں وہ اقلیت میں تھے۔ وہاں ہندو اکثریت انہیں اپنے اندر ضم کرلے گی۔ اس سے مسلمان قوم اس کا محبوب کلچر، اس کے عقائد، اور اس کے ادارے سب کے سب تباہ و برباد ہو جائیں گے۔

یہ بلاشبہ صحیح ہے۔ کہ اکثریتوں میں یہ رجحان ہوتا ہے۔ کہ اقلیتوں کے مفادات کو نظرانداز کر دیں۔ اور ان پر ظلم کریں۔ تاریخ ہمیں بتلاتی ہے کہ ہر ملک میں اقلیتیں مصیبتوں میں مبتلا رہی ہیں لیکن اکثریت کے مقابلہ میں جدوجہد کرتی رہی ہیں۔ اور اکثر اپنے مبنی بر انصاف اور معقول حقوق حاصل کرنے میں کامیاب بھی ہوئی ہیں۔ اس لیے اقلیتوں کے خوف و ہراس خواہ ان میں کسی حد تک مبالغہ ہو۔ لیکن انکو یہ کہہ کر نہیں ٹالا جا سکتا کہ یہ سب بے اصل باتیں ہیں۔ چاہیئے کہ ان پر سنجیدگی سے غور کیا جائے اور ان کا مداوا کیا جائے۔ لیکن 1906 کے ہندوستان میں اس قسم کی حالت تو محض خیال میں تھی۔ انگریز تو اپنی طاقت کے ایک ذرہ سے بھی دستبردار ہونے کے لیے تیار نہ تھے۔ اور کونسل کے جس ریفارم پر وہ سوچ رہے تھے۔ اس کا منشا تو بس اس قدر تھا۔ کہ ممبران کی تعداد میں کچھ اضافہ کر دیا جائے اور بحث مباحثے کے مواقع میں توسیع کر دی جائے۔ بلا ووٹ کا یا گورنمنٹ کی کارروائیوں میں کسی قسم کی تبدیلی یا ترمیم کا حق دیئے ہوئے۔

لوکل سلف گورنمنٹ کی جماعتوں میں مسلمانوں کی شکایت ان کی نمائندگی کے بارے میں مبالغہ آمیز تھیں۔ اگر کچھ صوبوں میں جیسے کہ بنگال میں انکی تعداد اپنی کل آبادی کے تناسب کے لحاظ سے کم تھی تو صوبہ ممالک شمالی و مشرقی (اتر پردیش) میں ایسا نہیں تھا۔ جان ہیوٹ۔ (John Hewett) لفٹیننٹ گورنر نے گورنمنٹ جو مکتوب بھیجا اس میں یہ دکھلایا کہ نمائندگی کا جو طریقہ رائج ہے۔ اس میں کسی ترمیم کی ضرورت نہیں ہے 1901 ـــ 1900 اور 1902 ـــ 1901 اتر پردیش (صوبہ شمالی مغربی) میں میونسپل بورڈوں میں فرقوں کی تعداد حسب ذیل تھی۔

کل نمائندوں کی تعداد	1900 - 1901	1901-1902
کل	1392	1399
ہندو	741	743
مسلم	3810	38400
دیگر	270	272

فیصد 027.7

فیصد 0027.7

1909 میں مسلمانوں کی تعداد 14% فیصدی اور ہندوؤں کی 84% فیصد تھی پھر بھی مسلمان ووٹ دہندگان۔ ڈسٹرکٹ بورڈوں میں مسلمان ووٹروں کی تعداد 23% فیصدی تھی۔ 45 اضلاع میں سے 29 اضلاع میں مسلمان نمائندوں کی تعداد اس سے زیادہ تھی جو تناسب آبادی کے لحاظ سے ہونا چاہئے۔/33 ڈسٹرکٹ بورڈ کے ممبران کی مجموعی تعداد 663 تھی جس میں سے 445 ہندو اور 189 مسلمان تھے۔ یعنی 28.5% فیصد۔ سرکاری ممبران اس میں شامل نہیں ہیں۔ میونسپل بورڈوں میں 562 ہندو اور 310 مسلمان تھے یعنی 32.1% فیصد۔ بیوریٹ نے جو نتیجہ نکالا وہ یہ تھا کہ "یہ مانتے ہوئے کہ مسلمانوں کو اس سے زیادہ نشستیں ملنی چاہئیں جتنی کہ تناسب آبادی کے لحاظ سے ان کی ہوتی ہیں۔ یہ نہیں کہا جا سکتا ہے۔ کہ موجودہ نظام جو رائج ہے۔ اس کا ان کے اوپر مخالف اثر پڑا ہے۔" 34/

1911 کے وسط میں 116 ہندو اور 67 مسلمان چناؤ سے آئے اور 10 ہندو اور 2 مسلمان ممبر نامزد کیے گئے۔ اور میونسپل بورڈوں میں 207 ہندو اور 89 مسلمان منتخب ہوئے اور 36 مسلمان اور 36 ہندو نامزد ممبران بنائے گئے۔ 35/

33 - Bishan Narain Dar, Presidential Address 26th Congress Calcutta 1911, The Indian National Congress (Madras. G. A. Nelson & Co, 2nd Edition). P. 1042.

34 - Ibid

35 - Ibid

بنگال کا معاملہ عجیب تھا۔ مسلمانوں کی آبادی کا تناسب زیادہ تھا ۹۰ فیصد سے زیادہ تھے۔ لیکن جہاں تک ووٹران کی تعداد کا تعلق ہے وہ اقلیت میں تھے۔

اس لیے یہ کہنا صحیح نہیں ہے۔ کہ جہاں تک لوکل گورنمنٹوں کا تعلق ہے۔ مسلمانوں کے ساتھ تمام ہندوستان میں امتیازی سلوک کیا گیا۔ جہاں تک کہ لیجسلیٹو کونسل کا سوال ہے۔ ان کی ساخت کونسلس ایکٹ 1892ء کے مطابق ہوئی تھی۔ اس میں صوبوں کے بارے میں قانون یہ تھا۔ کہ کچھ غیر سرکاری ممبران کو گورنمنٹ نامزد کرتی تھی۔ اور بقیہ کے لیے لوکل باڈیز یا کارپوریشن۔ یعنی مذہبی جماعتیں میونسپلٹیاں، یونیورسٹیاں، چیمبر آف کامرس وغیرہ سفارشس کرتے تھے۔ لیکن کونسل کے ممبران کی اکثریت سرکاری لوگوں کی تھی۔ الکشن کے ایک ایسے نظام میں جو فرقہ وارانہ اور نسلی خیالات کی بنیاد پر قائم ہو اور جس میں ووٹ دینے والوں کی تعداد محدود ہو اس میں فرقہ دارانہ تعصب کا سوال کیسے اٹھایا جاسکتا ہے۔

جہاں تک کہ گورنمنٹ کی ملازمتوں کا سوال ہے۔ یہ ایک سخت حیرت انگیز بات ہے۔ کہ مسلمانوں نے ان میں اپنی نمائندگی کی کمی کا الزام ہندوؤں پر لگایا کیونکہ ملازمتوں کے بارے میں گورنمنٹ کی جو پالیسی تھی۔ اس کا ہر شعبہ۔ بھرتی، گریڈ، تعداد، معیار قابلیت وغیرہ سب گورنمنٹ کے زیر اقتدار تھے۔ جس کے حکم اور اختیار تمیزی میں ہندوستان کا کوئی بھی فرقہ دخل انداز نہیں ہوسکتا تھا۔ 1857ء کے غدر کے پہلے ملازمتوں میں مسلمان بہت بڑا حصہ پاتے تھے۔ اسکے، بعد ان وجوہات کی بنا پر جو معلوم ہیں۔ وہ اپنی اس مخصوص رعایتی پوزیشن سے محروم ہوگئے۔ کسی حالت میں ہندو اس کے لیے مورد الزام نہ تھے۔

مسلمانوں کی یہ شکایت کہ ملازمتوں میں ان کی نمائندگی ان کے حق سے کم ہے۔ صحیح تھی۔ جہاں تک کہ سوال محکموں کی ملازمتوں اور خاص کر بنگال پریسیڈنسی کا تعلق تھا۔ لیکن فوج میں ان کی تعداد اس سے زیادہ تھی جتنی کی ان کی آبادی کے تناسب کے لحاظ سے معقول قرار دی جاسکتی تھی۔ لارڈ کرزن کی تحقیقات سے حسب ذیل اعداد و شمار حاصل ہوئے ۱۹۰۰ میں

	ہندو	مسلمان
دیسی فوج	90.500	48,500
امپیریل سروس	11,500	5,000

	ہندو	مسلمان
ملٹری فوجی بھرتی اور ملٹری پولیس	14,550	9,750
میزان کل	1,16,550	63,500

مشرقی بنگال اور آسام میں فولر، ہیر، دونوں نے اپنی جیسی بہترین کوشش اس بارے میں کی کہ تفاوت کم ہو جائے۔ جزاً تو اس لیے کہ ایک فرقے کے ساتھ انصاف کرنے کے لیے جس کو عرصے سے نظر انداز کیا گیا تھا۔ اور جزاً اس لیے کہ آبادی کے دو فرقے کو ایک دوسرے کے خلاف آراستہ کر دیا جائے، جیسا کہ ہیر (Hare) نے خود رپورٹ میں کیا۔

یہ بات دلچسپ ہے کہ مسلم لیڈروں نے صرف ملازمتوں، کونسل کی ممبری اور یونیورسٹی کی تعلیم کے بارے میں کہا جو اونچے طبقوں کا مخصوص مفاد تھا۔ ان لوگوں نے مال گزاری کے مغموم نظام، ہندوستان کی صنعتوں کے بارے میں امتیازی سلوک، عوام کی تعلیم کو نظر انداز کرنے اور اسی طرح کی دوسری باتوں کا کوئی ذکر نہیں کیا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد کی ہلاکت خیز مصائب سے قطعی ناواقف تھے۔ جو کسان مزدور یا کاریگر تھے۔

جمہوری نظام میں اقلیتوں کے لیے جداگانہ انتخاب کا آئین میں داخلہ ضرور پیچیدگیاں پیدا کرتا ہے۔ لیکن ایک پیچ در پیچ یا الجھے ہوئے سماجی حالات میں اسے سرتاپا مذموم نہیں قرار دیا جاسکتا اور کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ کہ اس سے بچنے کی کوئی شکل ہی نہ ہو۔ بدقسمتی سے یہ ایک ایسی چیز ہے۔ جو ملک کی سالمیت اور اس کی طاقت کو برباد کر سکتی ہے۔ چونکہ ایک ملک کی بقا کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے۔ کہ سماج کے مختلف عناصر جس سے وہ مرکب ہوتا ہے۔ ان میں بنیادی طور پر اتفاق ہو اس لیے کوئی ایسا عمل جو اتفاق پر اس رضامندی کو کمزور کرے نقصان دہ ہے۔ اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے دو فرقوں کی علیحدہ،

36 - Das, M.N. op-cit. P. 151. Minto to Morley. December 19, 1906

علیحدہ فہرست فرقوں کو باہمی ایک دوسرے کے ساتھ ذمہ داریوں کو محسوس کرنے سے محروم کر دیتی ہے۔ اور اتفاق کے مواقع کم ہو جاتے ہیں۔

چونکہ یہ نظام بری نیتوں سے بروئے کار لایا گیا تھا۔ اور اسکو اس وجہ سے قائم رکھا گیا تاکہ طوکیت پرستانہ اغراض کے اثرات پیدا کیے جائیں اس لیے لازمی تھا۔ کہ اس کے نتائج بھی بڑے ہوں اس کے خطرات لاعلاج ثابت ہوئے کیونکہ دونوں فرقوں کے آپس میں مل جانے کی کوشش ایک تیسری جماعت کی موجودگی اس میں مزاحمت کرتی رہی یہ تیسری، جماعت سیاست کے جسم میں ایک مکروہ چیز تھی۔

لیکن مسلمانوں کے مطالبات کا سب سے خراب پہلو یہ تھا۔ کہ اس کی بنیاد جمہوری، حکومت کے ابتدائی اصولوں کے متعلق غلط فہمی پر مبنی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تمام۔ جمہوری ملکوں سیاسی جماعتوں کا وجود ضروری ہے۔ پارٹیوں کا کام یہ ہے۔ کہ وہ گروہوں کو ان کے مشترک ضروریات اور مفادات کے پیش نظر منظم کریں یا پروگرام اور پالیسیاں بنائیں، پروپیگنڈا کریں اور قانون ساز جماعتوں کے لیے امیدواروں کا انتخاب کریں اور اقتدار کے حصول کے لئے الکشن لڑیں۔ سیاسی جماعتوں کا فطرۃً یہی مقصد ہوتا ہے۔ کہ ان گروہوں کے دنیوی مفادات کو ترقی دیں۔ مثلاً اقتصادی مرفہ الحالی، اندرون ملک میں ترقیات کی کارروائیاں اور اقتصادی فوائد حاصل کرنے کے لیے پالیسیاں اور باہر ملکوں میں قومی مفادات کی نشوونما۔ یہ پارٹیاں اس بات کی بھی کوشش کرتی ہیں۔ کہ جن طبقات کے وہ نمائندہ ہیں۔ ان لوگوں کی سرپرستی اور امداد کے سلسلہ میں جو شکایات ہوں ان کو دور کریں۔ کسی ماڈرن (جدید طرز) ملک میں کوئی ایسی سیاسی جماعت نہیں ہے۔ اور نہ کوئی ایسی حکومت ہی ہے۔ جو اپنی حکومت کے کاروبار کو مذہبی مقدس کتابوں میں، مندرج مسائل کے مطابق چلاتی ہو بلکہ اگر یہ مذہبی مسائل۔ امن عامہ، نظم و نسق اور سوسائٹی کے تنگے کی رفتار میں کسی طرح کی رکاوٹ ڈالیں یا اگر دوسرے مذہبی گروہوں یا فرقوں کے معتقدات رواج یا رسم سے متصادم ہوں تو حکومت صرف سماج عدلیہ اور قانون کے مسائل سے اپنا تعلق رکھتی ہے۔

وہ حکومتیں جن کی ماتحت رعایا مختلف مذاہب یا فرقوں پر مشتمل ہو ہرگز زندہ ہی نہیں رہ سکتی ہیں۔ اگر ایسی پارٹی سے وہ تعلق قائم کریں جو مذہبی اختلافات پر مبنی ہو اور جس کا میلان

سماجی اور سیاسی نظام کے درہم برہم کرنے کی جانب ہو اس لیے سلامتی اسی میں ہے۔ کہ سیاست کو مذہب سے جدا کر دیا جائے۔ ایک کا تعلق دنیوی معاملات سے اور دوسرے کا روحانی معاملات سے ہو۔

جبکہ ایسا ہے۔ تو ایک مذہبی سیاسی پارٹی کے الفاظ ہی میں باہمی تضاد ہے۔ مذہبی، فرقے خواہ وہ ایک علاقہ سے تعلق رکھتے ہوں یا عالمگیر ہوں مذہبی بندھنوں میں ایک ساتھ بندھے رہ سکتے ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ وہ ایک آزاد جمہوری ملک میں سیاسی پارٹیوں یا گروہوں کی حیثیت سے کام نہیں کر سکتے یہ تاریخ کا فیصلہ اور علوم سیاست کی تعلیم ہے۔ جو حالات کہ ہندوستان اور پاکستان میں آزادی کے بعد پیش آئے وہ اس کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔

فرقہ پرست لیڈروں کے دماغ میں انتشار کی وجہ یہ تھی۔ کہ وہ لوگ مذہبی فرقہ اور، قومیت کے فرق کو سمجھ نہ سکے۔ یہ دونوں جذبات سے تعلق رکھتے ہیں۔ یا یہ کہ شعوری کیفیتیں ہیں۔ ایک کی بنیاد اتحاد ذات مطلق پر اعتقاد احکام اور اعمال ہیں۔ اور دوسرے کا ایک دوسرے سے ملانے والے کسی خاص جغرافیائی رقبہ سے محبت رکھنے والوں کے دنیوی مفادات کے جذبات ہیں۔ ایک نئی روح جو ہندوستان میں انیسویں صدی کے آخری نصف میں ترقی پذیر ہوئی وہ قومیت کا ایک جدید احساس تھی۔

اس طرح فرقوں کا مل کر قومیت میں تبدیل ہو جانے کی کارروائی تیزی سے جاری تھی۔ لیکن بیرونی حالات اور داخلی محرکات احساس کے چشمہ کو دو مختلف نالیوں میں بہا رہے تھے۔ لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ اگر فرقوں میں اپنے آپ کو قوم قرار دینے کی بیداری پیدا ہو رہی تھی۔ تو وہ لازمی طور پر اس امر میں مانع تھی۔ کہ وہ سب مل جل کر ایک واحد سیاسی جماعت نہ بنا لیں۔

لیکن یہ واقعہ پیش کیوں نہیں آیا۔ اس پر آئندہ ابواب میں بحث کی جائے گی۔ یہاں اس بات کا ذکر کر دینا ضروری ہے۔ کہ اسی قسم کی حالت یورپ میں 1870ء کے قریب پیدا ہوئی تھی۔ لیکن نتائج مختلف ہوئے۔ جرمنی کے اندر جس نے اپنا اتحاد ابھی حال ہی مکمل تھا۔ عیسائیوں کے رومن کیتھالک طبقہ نے حکومت کے خلاف اپنے ہم مذہبوں کے اتحاد ایک خطرہ کھڑا کیا جو یا تو ملک کے اندر تھے۔ یا ملک کے باہر۔ بسمارک نے ایک ایسی پارٹی کے قیام کو جو عیسائی نام سے موسوم ہو افتراق پیدا کرنے والی تصور کیا اور اسکے

خلاف ایک اہم شروع کی جس کا نام "کلچر کیمف" (ثقافتی جدوجہد) رکھا۔

فرانس میں نپولین سوم کے زوال کے بعد ایک ریپبک حکومت قائم ہوئی جس کو رومن کیتھالک کلیسا سے مقابلہ میں آنا پڑا اور خاص کر تعلیم کے مسئلہ میں جولیں فری (Jules Ferry) فرانس کے وزیر اعظم نے یہ عزم کیا کہ حکومت کے معاملات میں کلیسا کی مداخلت کو ختم کر دے اور مخالف کلیسا تدابیر اختیار کرے۔ بعد کو کیتھالک طبقہ کی اپنے کو منظم کرنے کی کوشش ناکام ہو گئی۔

اٹلی میں نئی حکومت اور دربار پاپائے مقدس کے مابین نزاع کا خاتمہ رد عمل سے پاپائے مقدس کے اختیارات کے مکمل طور پر ختم ہو جانے پر ہوا۔

انگلستان میں 1870ء کے ایجوکیشن ایکٹ اور بعد کے واقعات جو ترقی کر گئے ان سب نے مل کر فرقہ داریت کی اجارہ داری کے چیلنج کو ختم کر دیا۔

اس طرح جبکہ یورپین حکومتیں فیصلہ کن تدابیر سے سیکولرازم کی طرف بڑھ رہی تھیں، اور مذہب کی گرفت ڈھیلی پڑ رہی تھی۔ ہندوستان میں حکومت کی سرپرستی میں سیاست مذہب کی سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی راہ میں تیزی سے چلا جارہا تھا۔

بہت تعجب کی بات یہ ہے۔ کہ دونوں حالتوں میں مقصد ایک ہی تھا۔ یعنی حکومت کے اختیار و اقتدار میں توسیع و ترقی۔ یورپ میں کلیسا ریاست کا رقیب تھا۔ جبکہ ہندوستان میں مذہب کو شہنشاہیت کا مددگار تصور کیا جاتا تھا۔ اور اس کی ہمت افزائی کی جاتی تھی۔

مسلم لیگ

منٹو نے اس میں کامیابی حاصل کر لی کہ انہوں نے مسلم فرقہ کے ایک اہم طبقہ کو کانگرس کی شرکت کے خطرے سے الگ کر دیا۔ اور اس طرح قومی یک جہتی کے طاقت پکڑنے میں رکاوٹ پیدا کی۔ کیونکہ وائسرائے سے ملاقات کے فوراً بعد وفد کے لوگ ایک جگہ اس غرض سے جمع ہوئے کہ اپنی آئندہ کارروائیوں کے علیحدہ علیحدہ طریقہ پر غور وفکر کریں۔ جیسا کہ آغا خاں اپنی سوانح میں نوٹ کرتے ہیں۔ "امید کا ایک ہی راستہ تھا۔ اور وہ یہ تھا۔ کہ آزاد سیاسی حیثیت تسلیم کی جائے۔ اور اسی کے مطابق کام کیا جائے اور ضروری ہے۔ کہ ہم حکومت برطانیہ سے اپنی سیاسی حیثیت بطور" ایک قوم اندرون قوم تسلیم

کرائیں،، 37

چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا جلسہ دسمبر 1906ء میں ہوا نواب 1906
سلیم اللہ نے مسلم لیڈران کو ڈھاکہ آنے کی دعوت دی ان کا ایک جلسہ وقار الملک کی
قیادت میں ہوا جنھوں نے اپنی ایک اردو کی تقریر میں مسلمانوں کی ایک علیحدہ جماعت کے
قیام کو مبنی برحق قرار دیا۔

"جب تک کہ ہم ایک دوسرے کی امداد کے لیے آپس میں متحد نہ ہو جائیں اور حکومت
ہند سے وفاداری کے ساتھ متفقہ طور کام نہ کریں گے تو مسلم اکثریت (؟) جو بدبختیوں اور غلطیوں
کی وجہ سے اپنے ماضی کے اعلیٰ منصب سے گر گئی ہے۔ اس خطرے میں ہے۔ کہ وہ ہندوؤں
کے زبردست سیلاب میں ڈوب جائے۔" 38

سلیم اللہ نے ایک نئی جماعت کے قیام کی تجویز پیش کی اور حکیم اجمل خاں نے اس کی،
تائید کی۔ یہ تھی آل انڈیا مسلم لیگ اور اس کے مقاصد ان الفاظ میں متعین کیے گیے تھے۔

(1) حکومت برطانیہ کے ساتھ وفاداری کے جذبات کو ترقی دینا۔

(2) مسلمان ہند کے سیاسی حقوق اور مفادات کا تحفظ اور ان کو آگے بڑھانا۔

(3) دوسرے فرقوں کے خلاف مخالفت کے ابھرنے کو روکنا۔

لیگ کے قیام سے مختلف حلقوں میں مختلف ردعمل ہوا۔ اینگلو انڈین اخبارات ایک ایسی
جماعت کے ہمدرد تھے۔ جو "برطانوی راج کے ایک محفوظ اور قابل یقین "چٹان" کی بنیاد
پر قائم کی گئی تھی" 39۔ "انگلشمین" اخبار نے یہ امید ظاہر کی کہ " یہ کانگرس کا ایک پراثر جواب
فراہم کرے گی" 40

"لندن ٹائمز" نے اسے کانگرس کے خلاف ایک مخالفانہ مساوی وزن تصور کیا۔ لیکن
اس کی سیاست میں جو واقعات نمودار ہو رہے ہیں۔ ان کو کوئی اہمیت ہی نہ دی جائے

37- The Aga Khan Memora (London) 1954. P. 70

38- Wasti: S.R. op-cit. P. 78.

39- Ibid, P. 31

40- Ibid.

اور اس کو ملوکیت پرستانہ تدبیر کی ایک اور چال تصور کیا۔ لیگ کو یہ کہہ کر نظرانداز کر دیا گیا
کہ یہ سابق سرکاری افسروں پنشن خواروں اور حکومت سے مراعات کے طلب گاروں کی ایک
سوکھے کے مریض کے بیمار کا جسم ہے۔ جو بہت جلد ختم ہو جائے گا۔

علاوہ اس کے کہ اس طریقہ فکر سے سیاسی حقائق کے اندر جھانک کر دیکھنے کی اور فہم و ادراک
کی کمی ظاہر ہوتی ہے۔ یہ طریقہ فکر مسلمانوں کے اندر ایک بااثر طبقہ کے جذبات کو بھی مجروح کرنے
والا تھا۔ جن کو حکومت کی حمایت حاصل تھی۔ مسلم لیگ کی جو تحقیر کی گئی۔ اس نے اونچے طبقے کے
مسلمانوں کو جن کی لیگ نمائندہ تھی۔ قومی تحریکات کے دشمنوں کی گود میں زیادہ مضبوطی کے
ساتھ ڈال دیا۔ اور اس لئے جو مقاصد مندرجہ بالا طریقہ فکر والوں کو انتہائی عزیز تھے وہ نا
کام ہو گئے۔

ہندو نیشنلسٹ جتنے لیگ کی طاقت اور جو وجاہت اس کو گورنمنٹ سے حاصل ہوئی تھی
ان کا اندازہ کرنے میں لگے رہتے تھے آزادی پسند مخالف برطانیہ علما بھی اسی غلط اندازے کے
شکار ہو گئے۔ شبلی نعمانی جو اپنے زمانے کے فاضل ترین علماء میں سے تھے۔ اور جو اعظم گڑھ
کے ادارے اور اکادمی کے بانی تھے۔ اور جو ایک زمانہ پہلے سر سید احمد خاں کے
ساتھی رہ چکے تھے۔ وہ لیگ والوں کی بلاشرط اور بلا تذبذب اعلان وفاداری سے دھوکا کھا
گئے۔ اور لیگ کی نیتوں کے نیک ہونے کا نہ تو جائزہ لیا اور نہ اس کے مقاصد کی مذمت کی

مسلم لیگ! یہ کونسی نیم مجہولی مخلوق ہے؟ کیا یہ سیاست ہے۔ خدا مجھے معاف کرے کیا
کانگرس کی معاند ہے؟ نہیں۔ کیا یہ دارالامراء ہے؟ ہاں۔ اس کا انتخاب کچھ اسی طرح کا ہے۔
.... ضروری ہے۔ کہ یہ سمجھ لیا جائے کہ صرف آج ہی نہیں۔ بلکہ ایک ہزار برس
کے بعد بھی مسلم لیگ ایک سیاسی جماعت نہ بن سکے گی۔[41]

شبلی نے تمسخر کے انداز میں اس ذکر اس طرح کیا۔

آزادی خیال پہ تم کو ہے گر فخر — تو لیگ کو بھی شان غلامی پہ ناز ہے

مختصر اس کے فضائل کوئی پوچھے تو یہ ہیں۔ محسنِ قوم بھی ہے، خادمِ حکام بھی ہے

کہنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس وقت جو حالات تھے۔ ان میں یہ لوگ لیگ کی حیثیت اور

41- Hayat-e-Shibli (Life of Shibli Namani) in Urdu. PP. 617-18.

اسکے اثر کو کم قرار دینے میں حق بہ جانب نہ تھے۔ کیونکہ لیگ کا زیادہ تر انحصار برطانیہ کی ہمت افزائی اور حمایت پر تھا۔

اگرچہ لیگ کا قیام نیشنلزم کے جذبات کی نشوونما کی جانب ایک قدم تھا۔ لیکن کانگریسی نیشنلسٹوں اور ہندو اور مسلمان فرقہ پرستوں کے دماغوں کے انتشار میں اس نے اضافہ کر دیا۔

ایک قوم ہونے کا مطالبہ جو ایک سیاسی تصور ہندوستان کے مشرق و مغرب کے ان علاقوں میں جہاں مسلمانوں کی غالب اکثریت ہے۔ حق بجانب ہو سکتا ہے۔ لیکن ان مسلمانوں کے بارے میں جو تمام ہندوستان کے تحتی براعظم میں بکھرے ہوئے تھے۔ یہ مطالبہ قطعی نامعقول تھا۔ ان جگہوں میں وہ صرف ایک اقلیت کی حیثیت سے رہ سکتے تھے۔ مثلاً رومن کیتھالک جو مذہبی امور میں روم سے اپنی وفاداری رکھتے ہیں۔ لیکن اپنے مخصوص ممالک میں جہاں وہ بستے ہیں۔ اور جہاں پروٹسٹنٹ اکثریت میں ہیں۔ وہاں کے وہ وفادار شہری رہتے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس شعور کے نمایاں ہونے میں برطانیہ نے ایک اہم رول ادا کیا تھا۔

بدقسمتی سے ہندوستان کے سیاست دانوں کی ناتجربہ کاری اور ناپختگی وہ فرق نہ کر سکی جس کا آج ماضی کی طرف گھوم کر دیکھنے سے ہماری نظر کے سامنے آجانا ممکن ہے۔ یہ نافہمی خصوصیت سے ان ایماندارانہ کوششوں کی ناکامی کی ذمہ دار تھی۔ جو کانگرس اور لیگ دونوں نے ہندو مسلم اتحاد کے لیے کیا۔ تاکہ کل ملک کی سالمیت و وحدت برقرار رہ جائے۔ یہ کوشش اس دن تک برابر جاری رہیں۔ جس دن کہ تقسیم پر واقعی عمل درآمد ہو گیا۔ یہ کوششیں ظاہر کرتی ہیں کہ ملک کی تقسیم نہ تو ناگزیر تھی۔ اور نہ عملی سیاست کے احاطہ کے باہر تھی۔ کیونکہ ان دونوں جماعتوں میں سے کوئی بھی۔ ملک کے دو ٹکڑے ہونے کی صورت میں جو نتائج برآمد ہونگے ان کے لیے پرجوش نہ تھی۔ اگر انہوں نے تقسیم کو تسلیم کر لیا تو صرف اس لیے کہ ان لوگوں نے اپنے کو اس نامہربانی قسم کی تقدیر کے سامنے بے بس پایا جنھوں نے ان کو کھدیر کر اس کی تکمیل پر آمادہ کیا جس میں ایسے نتائج چھپے ہوئے تھے۔ جن کی پیشین گوئی کوئی نہیں کر سکتا تھا۔

سب سے زیادہ تعجب خیز اور قابل فہم پہلو ہندو اکثریت کے بارے میں مسلمانوں کے رویہ کا یہ تھا۔ کہ ایک طرف تو مسلمان یہ یقین کرتے تھے۔ کہ مذہبی معاملات، فوجی اہلیت، سماجی یکجہتی۔ جس کی بنیاد پر ذات کی عدم موجودگی میں مساوات پر ہے۔ اور ان کا ماضی جس میں شاندار

فتوحات اور شہنشاہتیں ہیں ان سب میں وہ ہندوؤں سے افضل ہیں۔ دوسری جانب وہ۔ اس بات پر سخت اظہار افسوس کرتے تھے۔ کہ وہ ہندوؤں سے تعلیم، دماغی کاموں، دولت، کاروبار، صنعت، تجارت، آزاد پیشوں، پبلک کی خدمات کے جذبات اور سیاسی تنظیمیں کم تر ہیں۔

ان کا فخر و غرور ان کے احساس ذات کی تلافی بہر حال نہ کر سکا۔ خوف و ہراس اور حسد برابر ترقی کرتے رہے۔ اور خاص کر اس لیے کہ برطانوی حکمراں برابر روز افزوں غذا اس کے لیے فراہم کرتے رہے۔ من حیث الجماعت ایک لا علاج غلط خیال کے پنجے میں پھنس گئے۔ جو دلائل اور تجربہ سے گریز کرنے والا اور اپنی معقولیت سے ڈرتا تھا۔

ہندو فرقہ پرستوں نے جواب مہذب انداز میں دیا۔ اور تسلیم کیا کہ وہ مسلمانوں سے خوف زدہ ہیں۔ ان کے لیے بھی اور مسلمانوں کے لیے بھی گویا دنیا۔ گیارہویں صدی سے خاموش غیر متحرک رہی ہے۔ جب ترکی سواروں کے رسالوں نے محمود غزنوی کی قیادت میں شمالی ہندوستان کو اپنے گھوڑوں کی ٹاپوں سے روند ڈالا تھا۔ جب ان کے بے باک نیزہ بازوں نے شہروں کو جلا ڈالا۔ محلوں اور مندروں کو لوٹ لیا۔ ہزاروں مرد عورتوں، اور بچوں کو غلام بنایا اور اپنی بیرونی حکومت ہندوستان پر زبردستی قائم کی۔

جو کچھ کہ نو صدی پیشتر ہوا تھا۔ اس کا پھر اعادہ کیا جا سکتا تھا۔ اتحاد اسلام کے شیدائیوں کی، بھیڑ کسی جگہ سے چل کر۔ ایشیائے کوچک، وسط ایشیا اور افغانستان۔ پنجاب، اتر پردیش بہار اور بنگال کو اپنے سیلاب میں بہالے جا سکتی ہے۔ مسلمانوں سے اتحاد کر کے ہندوؤں کو جو مقابلہ نہیں کریں گے دبا کر غلامی کے درجہ پر لے جا سکتی ہے۔

بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس قسم کے خواب کی طرح کے خیالات نے ہندوؤں، اور مسلمانوں دونوں کی عظیم ہستیوں پر اپنا ڈیرہ جما لیا تھا۔ اور یہ لوگ ایسی بھیانک ہولناکیوں کو ابھارنے میں اطمینان محسوس کرتے تھے۔ حالانکہ اس سے وہ بڑی مصیبت میں اپنے کو مبتلا کرتے تھے۔ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی۔

مارلے منٹو ایکٹ کے بعد

اپنی تشکیل کے بعد ہی مسلم لیگ کے سامنے یہ مسئلہ کھڑا ہوا کہ منٹو نے مسلمانوں کی نمائندگی،

کے بارے میں جو وعدے کیے تھے۔ ان پر عمل درآمد کرایا جائے۔ کیونکہ ان لوگوں کو یہ پتہ چلا کہ مارلے اور منٹو دونوں اپنے وعدے سے پھسل جانے کی کوشش میں ہیں مارلے نے ایک مشترکہ ووٹران کے اداروں کی اسکیم تیار کی تھی۔ جو جداگانہ انتخاب کے اصول کی تردید کرتی تھی۔ منٹو نے بھی یہ محسوس کیا۔ اگرچہ دیر میں کہ اصول کے حدود کتنے وسیع ہیں۔ اس نے مارلے کو لکھا۔

۔ اگر لغوی معنوں میں اس کی شرح کی جائے۔ تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جداگانہ انتخاب مختلف حلقہ ہائے انتخاب میں سے ہر ایک میں رائج کرنا ہوگا۔ مثلاً پریسیڈنسی، کارپوریشن ڈسٹرکٹ بورڈ میونسپلٹیاں، یونیورسٹیاں، زمینداری اور تجارتی طبقے، یہ ظاہر ہے۔ کہ ایسا کرنا عملاً ناممکن ہے۔ اور ایسی بات کبھی تجویز نہیں کی گئی تھی۔/ 42

لیگ کی لندن کی شاخ کے چیرمین۔ امیر علی۔ ایک سات آدمیوں کے وفد کے قائد کی حیثیت سے 27 جنوری 1909 کو وزیر ہند سے ملے جس کا مقصد یہ تھا۔ کہ ان کو، جو وعدے کیے گیے ہیں ان کے وفا کرنے کی جانب راغب کیا جائے۔ لیکن مارلے نے ان کو کوئی ٹھوس یقین دہانی دیئے بغیر ٹال دیا۔

آخر کار جب نومبر 1909 میں قواعد و ضوابط شائع کیے گیے۔ تو یہ پتہ چلا کہ اصلاحات کے دونوں تیار کرنے والے یکم اکتوبر 1906 کی پوزیشن پر واپس چلے گیے ہیں۔ رائے کی اس تبدیلی کو سمجھنا مشکل ہے۔ غالباً انتہا پسند لیڈران جیسے تلک، اربند وگھوش، بپن چندر پال کے منظر عام سے غائب ہو جانے کی وجہ سے کانگرس پارٹی میں جو مایوسی اور ان کی صفوں میں جو ابتری پیدا ہوئی تھی۔ اور سنگین جبر و تعدی کے باعث جو اخلاقی کمزوری آگئی تھی۔ ان سب نے مل کر مخالفت کے خطرے کو دور کر دیا تھا۔ اور غالباً جس ذلت خیز انداز میں معتدلیت نے 1908 کے سیشن میں اصلاحات کا خیر مقدم کیا تھا۔ اس نے مارلے کے دل سے یہ پریشانی دور کر دی تھی۔ کہ مسلمانوں کو ہم اپنی حمایت میں منتخب کرکے اپنے ہندو حصہ دار ساتھیوں،

---

42 - House of Commons August 5. 1909. Ronaldshay's Speech quo-tes the text of Minto's letter to Morley. Dt May 2, 1909. Cited in Aziz K.K. Britain and Muslim India, P: 68.

سے کنارہ کش ہونا نہیں چاہتے ہیں۔" 43/ اس لیے یہ لازم ہے کہ مسلمانوں کی نیک خواہشات کو حاصل کیا جائے۔" ہمارے لیے سب سے بڑی وفاداری کا سہارا۔" 44/ لبرل اصولوں پر غالب آیا۔

غالباً ہندوستان کے دفتری کام کی مخالفت بہت سی لوکل گورنمنٹوں نے فرقہ وارانہ نمائندگی کو تجویز کیا اور ان کے نمائندے جو وزیر ہند کی کونسل میں تھے انہوں نے ووٹران کے کالجوں کے بنانے کی اسکیم کے مقابلہ میں اسے دوسرے پلہ پر رکھ کر تولا۔ منٹو جو فرقہ وارانہ نمائندگیوں کے مذموم اثرات سے بے خبر نہیں تھا۔ اس نے صوبہ کی حکومت کو لکھا کہ وہ مارلے کے اسکیم کی تردید و مذمت کریں اور اس نے اتنا ہی نہیں کیا بلکہ عملاً قدامت پرست لیڈروں کو اپنی رائے کے موافق بنانے کے لیے ان پر ڈ ونگ بھی کی۔ مسلمانوں کے مطالبات کی تائید کے لیے شہنشاہ معظم تک سے امداد کی درخواست کی گئی۔

ان حالات میں مارلے جس تلوار کی ناچ ... رہے تھے۔ اس کا انجام صرف یہ ہوا کہ ان کا ہی انگوٹھا کٹ گیا۔ اور منٹو صحیح و سالم رہ گیا۔ 23 فروری 1909 کو دارالامراء میں اصلاحات کے بل کی دوسری خواندگی کی تحریک پیش کرتے ہوئے مارلے نے ووٹران کے کالجوں کی اسکیم کے ترک کر دینے کا اعلان کیا اور وجہ یہ ظاہر کی کہ مخلوط کارروائی دونوں فرقوں کو قریب لانے میں معاون ثابت ہوگی۔" 45/

اس طرح علیحدگی کی بنیادیں مضبوطی کے ساتھ۔ اور حقیقی معنوں میں ڈال دی گئیں۔ اسکوئتھ، وزیر اعظم یہ جانتا تھا۔ کہ یہ قابل اعتراض ہے۔ اس سے تو باشندوں کے درمیان ایک دوسرے سے تفریق کرنا ہے۔ اور ان کو مذہبی عقائد کی بنیاد پر طبقات میں بانٹ دینا ہے۔" لیکن انہوں نے اس مخصوص دلیل کی بنا پر اسے جائز قرار دیا کہ " ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اختلاف صرف مذہب کی بنیاد پر نہیں ہے۔ بلکہ اور زیادہ گہرا ہے۔ نہ صرف روایات، تاریخ اور ماضی کے لحاظ سے بلکہ بلحاظ عادات، اطوار اور

43- Morley to Minto January 28, 1909. Cited in Das op.cit. P.233.
44- Minto Papers, Minto to Morley. December, 31. 1908.
45- House of Lord, February 23, 1909. H.L. Debates 5th Series Vol. I. Col. 124.

سماجی مراسم کے بھی جو لوگوں میں رائج ہیں"46۔ بالفور تک نے اسے ایک عجیب سیاسی اصول قرار دیا۔ کہ ایک فرقہ کو محض اس بناپر آبادی سے زائد حقوق دیئے جائیں۔ کہ ہم مذہب بیرون ملک میں بھی وجود رکھتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے۔ کہ اس فیصلہ کی وجہ نہ تو یہ تھی۔ کہ برطانیہ مسلمانوں کے خوف وہراس کو، خواہ وہ مبنی برحق ہوں یا اس کے برخلاف۔ دور کرنا چاہتا تھا۔ اور نہ تو یہ وجہ تھی۔ کہ برطانیہ، ڈرتا تھا۔ کہ"گو مسلمان سردست خاموش ہے۔ لیکن یہ بڑی طاقتوں کا مالک ہے۔" بلکہ صرف یہ وجہ تھی۔ کہ برطانیہ نے خوب اندازہ کر لیا تھا۔ کہ اس انتظام سے شہنشاہیت کے مفادات کو تقویت ملے گی۔ اقلیتی قوم کو مراعات دی گئیں اور اکثریتی کو حقارت سے رد کر دیا گیا کیونکہ قومی تحریکات کے مقاصد کی راہ میں رکاوٹ ڈالتا تھا۔ تقسیم بنگال کی 1911 میں تنسیخ کسی قسم کے تصادم کے خوف اور بلا عددوں کا لحاظ کیے اور بلا مسلمانوں کے غصہ کا ہراس محسوس کیے کر دینا۔ مارلے منٹو طریقہ عمل پر ایک فصیح حاشیہ ہے۔ ہندوں اور مسلمانوں کے اختلافات کو دلیل بنانے کا سہارا لینا دراصل حقیقی عندیہ کو چھپانے کے لیے ایک پردہ تھا۔

بدقسمتی سے دونوں طرف کے بہت سے لیڈروں نے ایسا طریقہ عمل اختیار کیا جس سے صرف یہ نتیجہ نکل سکتا تھا۔ کہ وہ حکومت کے موقف کو مناسب قرار دیتے ہیں کانگرس کا 1909 میں جو اجلاس ہوا۔ اس میں اس نے فرقہ وارانہ بنیادوں پر الگ الگ ووٹران کی فہرست تیار کرنے کی سخت مذمت کی اور مسلمانوں کو جو نمائندگی میں زیادہ سے زیادہ حق دیدیا گیا تھا۔ اس پر اعتراض کیا۔ لاہور کی ہندو سبھا نے اپریل 1909 میں منٹو کو ایک ایڈریس دیا جس میں انہوں نے مسلمانوں کو جو مخصوص مراعات مذہب کی بنیاد پر دیئے گیے تھے اس کے خلاف احتجاج کیا۔ قوم پرست اخبارات میں اسی کی آواز بازگشت گونجی۔

اس کے برخلاف مسلم لیگ کے لوگ اپنی فتح کی خوشی اس مغرورانہ یقین کی بناپر

---

46 - House of Commons April 1st, 1909. H. C. Debates 5th Series, Vol 3, Col. 533.

مناسب ہے تھے۔ کہ مارلے کو ان کے نظام کی طاقت کے سامنے جھکنا پڑا۔ جب مارلے 1910ء میں رٹائر ہوا۔ تو علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ نے یہ ریمارک کیا کہ مارلے نے جو خدمات مسلمانوں کی انجام دی ہیں باوجود اس کے کہ مسلمانوں کے دماغوں کو اس خوف نے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ کہ وہ ایک سخت جان انتہاپسند تھے۔ وہ اس قابل نہیں کہ ان کو تسلیم کیا جائے۔ اور ان کی مدح کی جائے۔ 47/ انہوں نے مسلمانوں کو اہم حقوق دیئے تھے، جن سے بہ قول مالوی جی ہندو محروم رکھے گئے تھے۔

وہ مسلمان جو -/3000 کی آمدنی پر انکم ٹیکس دیتے تھے۔ ان کے نام فہرست ووٹران میں انہی ضوابط کے ماتحت درج کیے گئے۔ لیکن ہندوؤں کے لیے ووٹ دہندگی کی شرط برقرار رکھی گئی کہ وہ تین لاکھ روپیہ پر ٹیکس دیتے ہوں۔ جو مسلمان تین سال کا گریجویٹ ہو وہ، ووٹر ہو سکتا تھا۔ لیکن ہندو کے ووٹر ہونے کے لیے تیس سال کے گریجویٹ ہونے کی شرط تھی۔
علاوہ ان باتوں کے مسلمانوں کو براہ راست الکشن کا حق اور اپنی آبادی سے زیادہ تعداد بھی (Weightage) یعنی ویٹیج دیا گیا۔

لیکن ایسے بھی مسلمان تھے جنہوں نے انگریزوں کے کھیل کے اصل راز کو سمجھ لیا تھا۔ ریمزے میکڈانلڈ نے اپنی کتاب میں لکھا تھا "مسلمان قوم کے بعض دور میں لوگ ابھی سے یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ انہوں نے غلطی کی ہے۔ کئی اشخاص نے مجھ سے بات کرتے ہوئے۔ اس پر تلخی کا اظہار کیا ہے۔ کہ ان کے لیڈران ایک ایسے کھیل میں شریک ہونے کے لیے تیار ہو گئے۔ جو اینگلو انڈین افسران نے تیار کیا تھا۔" 48/

یہ سخت افسوس کی بات ہے۔ کہ مسلمانوں نے یہ محسوس نہیں کیا کہ بہت سے سیاسی امور میں ان کے مفادات وہی تھے۔ جو ہندوؤں کے تھے۔ اور جداگانہ انتخاب کی اسکیم ان نقائص کو مستر د کرتی ہے۔ جو فی الجملہ دوسری قوموں کے متعلق ان پر عائد ہوتے ہیں۔ کچھ اقلیتی حقوق کی تلاش میں انہوں نے اپنے آپکو تمام ہندوستانی فرقوں سے الگ تھلگ کر لیا گویا کہ ان کے معاملات میں نہ ان کا کوئی حصہ تھا۔ اور نہ ان کی تقدیر سے ان کا کوئی واسطہ تھا۔

47- The Aligarh Institute Gazette, November 16, 1910.

48- Mac Donald, R. op. cit. P.179.

تقسیم میں ترمیم

مسلمانوں کی مسرت کی میعاد بہت قلیل تھی جو واقعات اندرون و بیرون ہند ترقی پائے انہوں نے غیر متوقع طور پر سنگین قسم کے دھکے لگائے۔ 1915 میں مارلے نے استعفیٰ دیدیا اور قلمدان وزارت کریو (Crewe) کے ہاتھ میں آیا۔ ان کے نائب اور ترجمان دارالعوام میں مانٹیگو تھے۔

ہندوستان میں منٹو کی مدت کارگزاری اختتام کے قریب تھی اور ان کے ایک جانشین کو تلاش کرنا تھا۔ ہارڈنگ کا جو ان دنوں وزارت خارجہ کے محکمہ میں نائب راجیہ سکریٹری تھا۔ وائسرائے کے عہدے کے لیے انتخاب کیا گیا۔

نئے عہدیداران کی ٹیم نے جو پالیسی اختیار کی وہ ان کے پیش روں کے ظاہری رنگ وروپ سے تو مختلف تھی لیکن جہاں تک مغز کا سوال ہے۔ کوئی فرق نہ تھا۔

مسلم ممالک کے بارے میں لبرل پارٹی نے جو پالیسی اختیار کی اس سے ہندوستان کے مسلمانوں کا مطمئن ہونا اغلب نہیں تھا۔ کریو نے لندن مسلم لیگ کو ترکی کے سوال پر گفتگو کرنے کے لیے شرف باریابی بخشنے سے انکار کر دیا۔ ہارڈنگ بھی عثمان کی حکومت کا اسی طرح مخالف تھا۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بارے میں گورنمنٹ اور علی گڑھ یونیورسٹی کے ٹرسٹیوں میں، اختلافات رو نما ہوئے۔

ہندوستان کے باہر مسلم ممالک کو ہلاکت خیز خطرات کا سامنا تھا۔ شمالی افریقہ میں اسلام کا مغرب ترین قلعہ۔ مراکش تو پہلے ہی فرانس کی شہنشاہیت کے زیر اقتدار آچکا تھا مشرق میں مصر انگلستان کی حکمرداری میں تھا۔ انگلستان اور روس نے ایک باہمی سمجھوتہ کے ذریعہ ایران میں اپنے اپنے حلقہ اثر تقسیم کر دیے تھے۔ خلیج فارس میں برطانیہ نے پہلے ہی مخصوص حقوق قائم کر لیے تھے۔ اٹلی نے طرابلس پر 1911 میں قبضہ کر لیا جو حکومت عثمانیہ ترکیہ کا ایک صوبہ تھا۔ اس کے بعد ترکی کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کا عمل شروع کیا گیا۔ 1912 میں بلقان کے عیسائی ریاستوں کو روس کی حمایت کے تحت متحد کیا گیا تاکہ ترکی پر حملہ کیا جا سکے۔ جو ان دنوں نوجوان ترکوں کے انقلاب کے دردزہ میں مبتلا تھا اس،

کے نتیجہ میں جو جنگ ہوئی (۱۹۱۲ء) اس میں ترکی کو ہولناک شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ انجام یہ ہوا کہ سلطنت عثمانیہ کے پاس مشرقی تھریس میں (جس میں ایڈریانوپل قسطنطنیہ اور آبنائے شامل تھے) صرف قدم ٹیکنے کی جگہ کے سوا اور پورے یورپ میں کچھ باقی نہیں رہ گیا تھا۔

بلقان کی جنگیں ابھی مشکل سے ختم ہوئی تھیں۔ کہ پہلی جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ چونکہ انگلستان، فرانس اور روس۔ اتحاد ثلاثہ نے ترکی کے خلاف ریاستہائے بلقان کے حقوق کی تائید کی تھی۔ اور جرمنی نے مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا تھا۔ اس لیے یہ ایک قدرتی بات تھی۔ کہ جنگ میں ترکی اپنے ہمدرد مملکت جرمنی کی موافقت میں لڑنے۔

ان جنگوں کے بارے میں ہندوستان کے مسلمانوں کے اندر اور خاص کر علماء کے اندر بڑا جوش پیدا ہوا یہ پہلا موقع تھا۔ جب علماء جو مذہب کے ذمہ دار تھے۔ اور "جن کا تمام مسلم قوم کے قلوب پر غلبہ تھا۔ پشاور سے برہما اور کشمیر سے مدارس تک"[49] وہ متوسط طبقہ اور تعلیم یافتہ مسلمانوں کے ساتھ گورنمنٹ کی مخالفت میں شریک ہو گئے۔

تعلیم یافتہ مسلمان انڈیا گورنمنٹ کی پالیسی میں تبدیلی سے پریشان ہو گئے تھے۔ اونچے طبقہ کی وفاداری کا عہد اب خاتمہ کے قریب پہنچ رہا تھا مانٹیگو چیمسفورڈ کی رپورٹ میں یہ نوٹ تھا کہ "پریشانیوں کے تمام سالوں (۱۹۰۷ - ۱۰ء) میں کل مسلمان سوائے چند اہم استثنا کے انقلابی تحریکات سے الگ رہے۔ اور اپنی مضبوط وفاداری کے روایاتی رویے پر مضبوطی سے جمے رہے۔ .... ۱۹۱۰ء سے ان کا چپ چاپ مان لینے کا رویہ بہت کم درجہ کا ہوتا جا رہا ہے"۔[50]

وجہ یہ ہے کہ اگرچہ مارلے نے مسلمانوں کو یقین دلایا تھا۔ کہ تقسیم بنگال ایک مستقل طور پر طے شدہ مسئلہ ہے۔ لیکن درحقیقت انہوں نے کبھی اس کارروائی کو پسند نہیں کیا تھا۔ اور پھر یہ بھی کہ منٹو مارلے اصلاحات نے مسلمانوں کی موافقت میں پلہ اتنا بھاری کر دیا تھا۔ کہ جس سے اکثریت بہت ناراض ہو گئی تھی۔ اور مجبور ہو کر انہوں نے بھی اپنی ایک

---

49. Muhsin-ul-Mulk's Speech, quoted in Ram Gopal, op. cit, P. 115.

50. Report On Indian Constitutional Reforms. P. 14.

فرقہ وارانہ جماعت اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے بنائی تھی۔ یعنی ہندو مہا سبھا۔ بہت سے کانگرس اس کے اغراض و مقاصد سے ہمدردی رکھتے تھے۔ کانگرس کی ایسی عظیم شخصیتیں جیسے کہ مدن موہن مالویہ، لاجپت رائے، اور بال گنگا دھر تلک، کانگرس سے اپنی وفاداری قائم رکھتے ہوئے ہندو مہاسبھا کی حمایت کرتی تھیں۔

منٹو کی جابرانہ پالیسی نے صرف سطحی سکون پیدا کیا تھا۔ لیکن علاقائی تحریک اسی طرح مضبوط نظر آتی تھی۔ جیسی کہ وہ پہلے تھی۔ اس کا مظاہرہ منٹو کی جان لینے کی کوشش میں 21 دسمبر 1909 کو ہوا۔ اور اس مزید تصدیق ہارڈنگ پر دلی میں دسمبر 1912 بم پھینکنے سے ہوئی دہشت پسندی تقسیم کی پیداوار تھی۔

یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ کہ لو، اور ہارڈنگ نے اب ایک ایسی پالیسی اختیار کرنے کا فیصلہ کیا جو ہندوؤں کے زخم کو مندمل کر دے اور قومیت پرستوں کی نیک خواہشات کو حاصل کرسکے اس تبدیل شدہ پالیسی سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے اور بادشاہ کی ذات سے جو روایاتی وفاداری چلی آرہی تھی۔ اسکو کام میں لانے کے لیے تاجپوشی کے دربار کے ڈرامے کے کھیل دکھانے کا دلی میں بندوبست کیا گیا۔ بادشاہ کو بہ نفس نفیس دلی اس غرض سے لایا گیا تاکہ وہ اس جدید پالیسی کا اعلان کریں اور ضمناً کرزن اور مڈلے نے تقسیم بنگال کو جو ایک طے شدہ معاملہ بنا رکھا تھا۔ اس کو شاہی فرمان کے ذریعہ الٹ دیا جائے۔ اس سے یہ امید تھی کہ قدامت پرستوں کی مخالفت کے خنجر کی نوک کند ہو جائے گی۔

12 دسمبر 1911 کو دلی میں جگمگاتے ہوئے شان وشوکت کا مظاہرہ دیکھنے میں آیا۔ ہندوستان کے تمام راجگان، ریشمی لباسوں میں ملبوس جن میں سونے اور چاندی کے حاشیے تھے۔ اور چمکتے ہوئے جواہرات جڑے ہوئے تھے، حاضر تھے۔ اونچے افسران مثل وزیر ہند، وائسرائے، کمانڈران چیف، صوبہ کے گورنران، وائسرائے کی اگزیکٹو کونسل کے ممبران وغیرہ وغیرہ اپنے دل لبھانے والے یونیفارم پہنے جن سے شہنشاہیت کے قوت کی نمائندگی ہوتی تھی۔ اور جو اس شاہانہ موقع کی عظمت کی تصدیق کرتے تھے۔ موجود تھے جبکہ بگل بج رہے تھے۔ بڑے بڑے طبلوں پر چوب پڑ رہی، تھی۔ اور "یونین جیک" دسمبر کی تازگی بخش ہوا میں نیلے آسمان میں لہرا رہا تھا۔ اور جبکہ قیمتی جھول پہنے ہاتھیوں کی ایک لمبی قطار، مسلح گھوڑوں کے سوار چست و چالاک برطانوی

اور ہندوستانی فوجیں احاطہ کیے ہوئے تھیں، اور انسانوں کا ایک عظیم الشان مجمع، اضطراب قلب کے ساتھ انتظار کر رہا تھا۔ شہنشاہ معظم نے تقسیم بنگال کی تنسیخ اور دارالسلطنت کلکتہ سے دلی مستقر قرار پانے کا اعلان کیا۔ یہ خیال کیا گیا تھا۔ کہ یہ دونوں تدابیر دونوں، قوموں کے پلڑوں کو برابر کر دینے میں کامیاب رہیں گی۔ پہلا تو ہندوؤں کو خوش کر دے گا۔ اور دوسرا مسلمانوں کو تسکین دے گا۔ لیکن یہ مقاصد ناکامیاب رہے۔ اور تکمیل کو نہیں پہونچے۔

نئے انتظامات بھی کیے گیے۔ جبکہ بہار، اوڑیسہ اور چھوٹا ناگپور اور آسام میں ہندو اکثریت بحال رکھی گئی تھی۔ بنگالی صوبہ میں مسلمانوں کو ایک معمولی سی اکثریت دی گئی تھی، بنگال اس طرح تو زبان کے اعتبار سے متحد ہو گیا تھا۔ لیکن جو فرقہ پرستی ابھی حال میں پیدا کی گئی تھی۔ اس کی بنیاد پر آزردگی تھی۔

جو شورش تقسیم بنگال کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ وہ تو فرو ہو گئی، لیکن طاقت کے منتقل کرنے پر اصرار باقی تھا۔ بنگالی یقیناً خوش تھے۔ جیسا کہ امبیکا چرن مزمدار کے بیان سے ظاہر ہے۔ اور معتدل حضرات بھی سمجھتے تھے۔ کہ انصاف کیا گیا ہے۔ لیکن فضا بدل چکی تھی۔ اور بنگال کو پھر سے ایک کر دینے کا بہت کم اثر ہوا۔

مسلمانوں کا ردعمل

دوسری جانب مسلمانوں پر ردعمل بہت شدید تھا۔ وقار الملک جیسے ناقابل علاج، وفادار اس بات پر مجبور ہوئے کہ یہ تسلیم کریں کہ "اب یہ دوپہر کے سورج کی طرح روشن ہے۔ کہ جو کچھ حال میں پیش آیا ہے۔ اس کے بعد مسلمانوں سے یہ کہنا کہ وہ گورنمنٹ پر، بھروسہ کریں بالکل فضول ہے۔"/51

ان کی یہ ایک تنہا آواز تھی۔ کیونکہ چند احتجاجوں اور مایوسی کے اظہار کے علاوہ مسلمانوں میں بنگال کی جدید ساخت پر کوئی خاص جوش نہیں پیدا ہوا۔

آغا خاں نے نہایت، عقلمندی سے یہ مشورہ دیا تھا۔ کہ "ہندوستان میں اسلام کی،

51- Albirum. A.H Makers of Pakistan and Modern Muslim India. P. 10

مجموعی حالات پر غور کرنے کے بعد میں یہ شبہ کرتا ہوں کہ آیا یہ مناسب ہوگا کہ مسلمان ایک صوبہ میں اکثریت میں رہیں۔ اور بقیہ تقریباً تمام صوبوں میں اقلیت میں۔ ایسی حالت کے نقصانات بالکل ظاہر ہیں۔ تقسیم بنگال نے بنگالی زبان بولنے والی کروڑوں انسانوں پر مشتمل عظیم قوم کے جذبات کو مجروح کیا تھا۔ کوئی چیز جو ہندوستان کے کئی ملین انسانوں کو مستقل طور پر علیحدہ کر دے اور ان کے جذبات اور مفادات کو مجروح کرے وہ لوگ خواہ مسلمان ہوں یا ہندو۔ وہ چیز بذات خود ایک خراب بات ہے /52

ایڈیٹر مکامریڈ نے جو تنقید کی تھی۔ اس میں اور آغا خاں کی رائے میں کچھ زیادہ فرق نہ تھا۔ /53

منٹو اور برطانوی دفتری حکمراں جنھوں نے معتدل ہندوں کے برخلاف جارح مسلمانوں کے اندر خونی تباہی اور شیطانی شورش کے بھوتوں کے موکلوں کو بلانے کا عمل کیا تھا۔ وہ غصہ اور غم میں مبتلا تھے۔ مارلے دلائل سے مطمئن ہو گیا تھا۔ اور اس نے اس مسئلہ کو پھر اٹھانے سے انکار کر دیا۔ لیکن پھر بھی جب ہارڈنگ اور کریو نے ایک طے شدہ مسئلہ کو الٹ دیا اور اس کے لیے گھاس کے میدان کو آگ بھی نہیں لگائی تو یہ بات روز روشن کی طرح ظاہر ہے۔ کہ گورنمنٹ نے فرقہ وارانہ" ہتوے" میں مبالغہ کر کے اور اس سے کام لے کر اپنا فوری مقصد حاصل کر لیا۔

مسلمانوں کے ہم مذہبوں پر ہندوستان کے باہر جو مصائب نازل ہو رہے تھے۔ ان سے سخت صدمہ محسوس کر کے مسلمانان ہند غصہ سے پاگل ہو گئے۔ شاعر اقبال نے طرابلس کے زبردستی قبضہ پر خون کے آنسو بہائے اور خدا سے اپنی مظلوم قسمت کے خلاف شکوہ کیا انھوں نے مسلمانوں کو پکارا کہ اسلام کو پھر سے زندہ کریں اور متحد ہو جائیں اگر وہ مشکلات پر قابو حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اسلام ایک عالم گیر برادری ہے۔ جس کی موجودہ تنظیم ملک، علاقہ، نسل اور قومیت کی بنیاد پر ہے۔

ع۔ بنا ہمارے حصار ملت کی اتحاد وطن نہیں ہے۔

52- The Comrade, February 10, 1912.

53- Ibid.

(یعنی مسلم قوم کے قلعہ کی بنیاد قوموں کا اتحاد نہیں ہے۔)

ابوالکلام نے اپنے حالیہ جاری کیے ہوئے (جون 1912) ہفتہ وار الہلال میں برطانوی پالیسی کی زندگی ہی میں کمال کھینچنا شروع کی ان کے آتش بار مضامین نے مسلم قوم کے اندر غصہ اور غضب کی ایک لہر دوڑا دی۔ محمد علی نے 1911 میں اخبار "کامریڈ" انگریزی میں اور اخبار "ہمدرد" اردو میں مسلمانوں میں بیداری عمل پیدا کرنے کے لیے جاری کیا۔ ظفر علی خاں نے "زمیندار" (لاہور) میں برطانیہ کی غداری کی مذمت کرتے ہوئے تلخی اور طنز سے بھرے ہوئے مضامین لکھے۔

1912 میں ایک طبی وفد ڈاکٹر انصاری کی قیادت میں ترکی بھیجا گیا سرمایہ اکٹھا کیا گیا اور رضاکاروں کی بھرتی کی گئی۔

جب 1914 میں جنگ چھڑ گئی۔ تو حالت خوفناک ہو گئی۔ ہندوستان میں برطانیہ کی، حکومت کو اکھاڑ پھینکنے کے پلان تیار کیے جانے لگے۔ محمود الحسن دیوبند نے ڈاکٹر انصاری کی مدد سے عبیداللہ سندھی کو کابل اس لیے روانہ کیا کہ اپنے مقصد کے لیے امیر کی حمایت حاصل کی جائے۔ کابل میں ایک عارضی حکومت راجہ مہندر پرتاپ کو صدر بنا کر قائم کی گئی، بعدہٗ محمود الحسن، احمد حسین مدنی اور دوسرے لوگوں کے ساتھ مکہ اس غرض سے گیے کہ ترکوں کو ہندوستان کی بغاوت کی تائید پر آمادہ کریں۔ ریشمی رومال پر خطوط خفیہ، طریقہ سے ہندوستان اور افغانستان اشاعت کے لیے بھیجے گیے۔

لیکن قسمت ان کے خلاف تھی۔ عرب کے فیصل نے ترکی کی سلطنت کے خلاف علم، بغاوت بلند کر دیا۔ اور انگریزوں کے ساتھ مل گیا۔ محمود الحسن اور ان کے ساتھی گرفتار کر لیے گیے۔ اور مالٹا جلا وطن کر دیے گیے۔ جہاں وہ لڑائی کے خاتمہ تک بطور قیدی، رکھے گیے۔

مسلم لیگ کے کردار میں تبدیل

مسلم لیگ لیڈروں کو ایک مشکل حالت کا سامنا تھا۔ وہ اسے تو ناممکن پا رہے تھے۔ کہ پرانی ڈگر پر چلیں۔ کچھ لوگوں نے تو مسلم لیگ کو چھوڑ بھی دیا۔ جیسے آغا خان، نواب ڈھاکہ۔ خاندان امراء کے اونچے طبقہ کے دندانہ دار حضرات کو موسم بہت گرم معلوم ہوا۔ اور وہ کنارہ

کش ہو گیے۔ نیا خون داخل کیا گیا۔ جناح اور محمد علی جیسے لوگوں نے عنان قیادت اپنے ہاتھ میں لی۔ اور علماء کو شرکت پر راضی کر لیا۔ اس طرح جو لنظام صرف اوپنے طبقے کے لوگوں تک محدود تھا۔ اب متوسط طبقہ کی تحریک کا مرکز بن رہا تھا۔

یہ تبدیلی کانگرس اور لیگ کو قریب تر لائی۔ لیکن جو میل شروع ہوا۔ وہ زیادہ تر اس نوعیت کا تھا۔ کہ دو منظم اور خود آگاہ جماعتیں جو دو الگ الگ فرقوں کی نمائندگی کرتی تھیں اور جن کے الگ الگ اپنے مسائل اور نقطہ ہائے خیال تھے۔ ایک مشترک دشمن کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کرنے کا سمجھوتہ کر رہے تھے۔ نہ کہ ایک دوسرے میں گھل مل کر ایک ہو جانے کا۔

22-1911 کے زمانے کے ہندو مسلم کا امداد باہمی اور اتحاد یہ ظاہر کرتا ہے۔ کہ سب کو ایک مربوط اور ایسے متحدہ قومیت کی شکل میں سوچنا جیسے کہ دونوں ایک ہی پتھر کے تراشے ہوئے ہوں اب ممکن نہیں ہے۔ اور ایک ایسے نیشنلزم کے حصول کے لیے منفرد سماج سے متعلق سیاسی تنظیموں سے گذرنا پڑے گا۔ بد قسمتی سے یہ مقصد ناممکن الحصول ، ثابت ہوا۔

1912 میں ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ گویا سرسید ہار گیے۔ اور شبلی کامیاب 1912 میں مسلم لیگ کا جو اجلاس لکھنؤ میں ہوا۔ اس میں لیگ کی غرض و غایت میں تبدیلی کر دی گئی۔ اور بجائے۔ اس کے کہ جو اس کا مقصد اب تک تھا یعنی حکومت برطانیہ سے وفاداری کا فروغ یہ کر دیا گیا کہ تاج برطانیہ کے زیر سایہ ایک ایسی سلف گورنمنٹ کا قیام جو ہندوستان کے لیے موزوں ہو ،، دوسرے اجلاس میں جو 1915 میں ہوا ایک قدم اور آگے رکھا گیا۔ یعنی یہ قرار دیا گیا۔ کہ لیگ اور کانگرس کے باہمی تعلقات کو ترقی دی جائے۔ دونوں جلسے ایک ہی مقام پر یعنی ، بمبئی میں ہوئے اور کانگرس کے لیڈران کی ایک خاص تعداد مثل گاندھی جی مالویہ ، سروجنی نائیڈو لیگ کے اجلاس میں شریک ہوئی کانگرس کے صدر ایس۔ پی ، سنہا اور مسلم لیگ کے مظہر الحق میں تبادلہ خیال بھی ہوا۔

لیگ کے اجلاس میں جناح نے یہ تجویز پیش کی کہ ایک کمیٹی کا تقرر عمل میں لایا جائے جو ریفارم کی ایک مشترکہ اسکیم تیار کرے اور اس کے لیے اسکو مجاز کیا جائے۔ کہ وہ دوسری سیاسی جماعتوں سے بھی مشورہ کر سکے۔

۱۹۱۶ء میں لیگ اور کانگرس نے پھر ایک ہی وقت، اور ایک ہی مقام (لکھنو) میں اپنے اجلاس منعقد کیے۔ امبیکا چرن مزمدار نے کانگرس کے اور جناح نے لیگ کے اجلاس کی صدارت کی دونوں جماعتوں نے اس پر مکمل اتفاق کیا کہ وہ کون سی اصلاحات ہیں۔ جن پر وہ حکومت کے سامنے زور دینگے۔ کانگرس نے لیگ کے جداگانہ انتخاب کا مطالبہ تمام صوبوں میں (بشمول پنجاب و بنگال) تسلیم کرایا۔ لیگ نے تعداد کے معاملہ میں اپنے مطالبہ کو نرم کر دیا۔ اور بنگال میں جزاً 50 فی صد اور پنجاب میں جزو 40 فی صد پر راضی ہوگئی۔ جس کا مطلب یہ تھا۔ کہ آبادی کے تناسب کا مطالبہ ترک کر دیا گیا۔ جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ وہاں ان کی نمائندگی وہاں کے ہندؤں اور مسلمانوں کے تناسب کے رو سے کی نسبت سے تھی۔ مسلمانوں کو جو پریشانی اپنے کلچر اور مذہب کے بارے میں تھی۔ اس کا ازالہ اس طرح کر دیا گیا۔ کہ کوئی مسودہ قانون یا ریزولیوشن جو کسی فرقہ کے بارے میں ہو وہ منظور شدہ تسلیم نہ ہوگا۔ اگر اس فرقہ کی تین چوتھائی تعداد اس کی مخالف ہو۔

میثاق لکھنو اس تصوری کا بھر پور جواب تھا۔ کہ ہندوں اور مسلمانوں میں ان کے مذہبی اختلافات کی وجہ سے کسی طرح بھی اتفاق ممکن نہیں ہے۔ میثاق نے یہ ثابت کر دیا۔ کہ کوئی لائینفک، قطعی یا ناممکن دیوار حائل نہیں ہے۔ جسے باہمی تعاون، شعور اور سمجھ کی بلندی سے عبور نہ کیا جاسکے۔

میثاق لکھنو ایک ایسی دو سیاسی جماعتوں کا کارنامہ تھا۔ جن کے مقاصد کا دماغی پس منظر، اور ذہنی تخیل یکساں تھا۔ جناح، محمد علی، انصاری، راجہ محمود آباد ایک طرف اور دوسری جانب مزمدار سوریندر ناتھ بنرجی، موتی لال نہرو اور تلک ان میں سے ہر ایک ایسی زبان بولتا تھا۔ جو دوسرا سمجھتا تھا۔ ایسے الفاظ جیسے کہ ہوم رول، ذمہ دار حکومت، دستوری ترمیمات، دونوں کی زبانوں پر تھے۔ اگر لکھنو کی کانگرس میں معتدلین اور انتہا پرست دونوں شامل تھے۔ تو ادھر مسلم لیگ میں بھی تعلیم یافتہ اہل دماغ اور علماء کا روشن خیال طبقہ تھا۔

لیکن وہ طوفان جو اس کمزور میل جول کو پرزے پرزے کرکے اڑا دینے والا تھا۔ افق پر نمودار ہو رہا تھا۔ جنگ مسلمانوں کے صبر کا پیمانہ لبریز کر رہی تھی۔ ترکی کے جنگ میں کودنے سے پہلے انجمن خدام کعبہ (مکہ کی مقدس مسجد کے خدام) نے سلطان ترکی کو تار دیا تھا۔ جس میں ان پر زور دیا تھا۔ کہ یا تو جرمنی کے مقابلہ میں برطانیہ کا ساتھ دیں یا غیر جانبدار ہو جائیں۔ چار دن کے بعد ترکی میدان جنگ میں کود پڑا۔

مسلمانوں میں رایوں کا اختلاف ہو گیا۔ کچھ تو اپنا یہ فرض سمجھتے تھے۔ کہ گورنمنٹ کے وفادار رہیں۔ اور لڑائی میں اس کی مدد کریں۔ دوسرے وہ لوگ تھے۔ جو خلافت عثمانیہ کے مستقبل کے لیے بے چین تھے۔ وہ لوگ جو جنگ بلقان میں اس کی مدد کے لیے دوڑے تھے۔ اب ان لوگوں نے ترکی کی حمایت کا پلان تیار کرنا شروع کیا۔ لیڈران میں محمود الحسن (دیوبند) عبدالباری (لکھنو) اجمل خاں اور انصاری (دلی) ابوالکلام آزاد (کلکتہ) اور علی برادران اور دیگر لوگ تھے۔ ان لوگوں نے صوبہ سرحد، افغانستان اور عرب کو اپنے ایجنٹ اس غرض سے بھیجے کہ جرمنی کی مدد سے ترکی ہندوستان کی طرف بڑھے اور ہندوستان ان کی موافقت میں بغاوت کے لیے اٹھ کھڑا ہوگا۔ اور برطانیہ کا جوا اپنے کندھوں سے اتار پھینکے گا۔ مغربی محاذ پر جرمنی کی فتوحات اور برطانیہ کے جنگی بیڑے کی گیلی پولی ([illegible]) میں اور ان کی مہم کی میسوپوٹامیہ (Mesopotamia) میں ناکامی سے ان کی امیدیں بلند ہوئیں۔

ہندوستان میں ان لوگوں نے مسلم لیگ کے اغراض و مقاصد میں تبدیلی لانے کے لیے اپنے اثرات کا پرزور استعمال کیا۔ ان کی کامیابی قابل لحاظ ہے۔ کیونکہ لیگ اس راہ پر چل پڑی کہ اس نے کانگرس کے نظریے کو قبول کر لیا۔ اور میثاق لکھنو میں شامل ہو گیا۔

گورنمنٹ نے اس کے خلاف تدابیر اختیار کیں تاکہ مسلمانوں کو راضی کیا جائے۔ اور پوری مسلم قوم کی وفاداری سے محروم ہونے کی نوبت نہ آئے برطانیہ کے افسران نے مسلم علماء کو یقین دلایا کہ عرب اور میسوپوٹامیہ میں مسلمانوں کے مقدس مقامات حملہ یا اہانت سے محفوظ رکھے جائیں گے۔

اتحادی ملکوں کی گورنمنٹوں نے اس یقین کی توثیق کی۔ لائڈ جارج نے یہ وعدہ کیا کہ ترکوں کا وطنی ملک قائم رکھا جائے گا۔ ان یقین دہانیوں کی بنیاد پر مسلمان فوجوں کو ترکی کی فوجوں کے خلاف میسوپوٹامیہ اور دیگر علاقوں میں لڑایا گیا۔

امیر افغانستان کو ہندوستانی انقلابیوں کی حمایت کرنے سے گریز کرنے پر راضی کر لیا گیا۔ اور شریف مکہ نے لارنس کے اثر میں آکر سلطنت ترکیہ کے خلاف بغاوت کر دی اور میسوپوٹامیہ سے ترکوں کو مار بھگانے میں انگریز فوجوں کے ساتھ شریک ہو گیا۔

ہندوستان میں جو عناصر برطانیہ کے خلاف تھے۔ ان پر مقدمات قائم کیے گئے۔ ابوالکلام

آزاد کا اخبار "الہلال" بند کر دیا گیا۔ اور ایڈیٹر کو رانچی میں بند کر دیا گیا۔ اور یہ نظر بندی اختتام جنگ تک قائم رہی۔ محمد علی جنھوں نے ایک مضمون "ترکوں کا انتخاب" (Choice of the Turks) لکھا تھا جس میں ترکوں کے جرمنی کا ساتھ دینے کو جائز قرار دیا تھا۔ ان کو حکم دیا گیا کہ اخبار "کامریڈ" کی اشاعت بند کر دیں اور اپنے بھائی کے ساتھ لینس ڈاون (Lansdowne) میں نظر بند کر دیئے گئے۔ بعدہٗ وہ صوبہ متوسط کے قصبہ چھنڈواڑہ بھیجے گئے۔

جبر و تشدد صرف مسلمانوں تک محدود تھا۔ اس کے احاطہ میں ہوم رول کی تحریک والے بھی لے لیے گئے تھے۔ اینی بیسنٹ اور تلک جن کا خیال یہ تھا۔ کہ چونکہ ہندوستان جنگ کے مشاغل کا حصہ دار ہے۔ اس لیے اسکو حق حاصل ہو گیا ہے۔ کہ اس کی سیاسی حیثیت میں تبدیلی کی جائے۔ چنانچہ ان لوگوں نے ہوم رول کے لیے ایجی ٹیشن شروع کیا۔ 16 جنوری 1917ء کو اینی بیسنٹ اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ نظر بند کر دی گئیں۔ 1917ء کے کانگرس اور لیگ کے سال گذشتہ کے میثاق لکھنؤ کی توثیق کر دی۔

1918ء کا سال آزادی کی جدوجہد میں ایک نئے عہد کا آغاز ہے لڑائی مشرقی، یورپین طاقتوں کی پرشور شکست پر ختم ہوئی۔ ترکی نے 31 اکتوبر 1918ء کو اور جرمنی نے 11 نومبر کو ہتھیار ڈال دیئے۔ "ورسلیز" کے معاہدے کی رو سے ترکی پر جو سخت ترین شرائط عائد کیے گئے۔ اس نے ترکی کو تقریباً تباہ و برباد کر دیا۔ لیکن مصطفےٰ کمال نے البتہ اپنی بہادرانہ کوششوں سے اسکو بچا لیا۔ لیکن وہ عرب کی پوری زمینوں اور مقامات مقدسہ کے اقتدار سے محروم ہو گیا۔

برطانیہ نے ترکی کے ساتھ جو برتاؤ کیا وہ فریب دہی پر مبنی تھا۔ لائڈ جارج نے 5 جنوری 1918ء کو ٹریڈ یونینوں کے سامنے تقریر کرتے ہوئے۔ یہ اقرار صالح کیا تھا۔ کہ وہم اس لیے نہیں لڑ رہے ہیں۔ کہ ترکی کو اس کے دارالسلطنت سے محروم کر دیں یا ایشیائے کوچک یا تھریس کے زرخیز یا مشہور عالم سرزمینوں سے نکال باہر کر دیں۔ جہاں کے بسنے والوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد نسلی اعتبار سے ترک ہیں۔

پھر بھی انہی حضرات کے اکسانے سے یونانیوں نے ترکی پر حملہ کر دیا۔ انہوں نے سمرنا پر قبضہ کر لیا ایڈریانوپل میں داخل ہو گئے تاکہ بحر ایجین کے جزائر (Aegean) پر قبضہ کر لیں۔ اور اس کے سواحل پر پھیل گئے۔ لیکن بہرحال مصطفےٰ کمال نے یونانیوں کی کوششوں

کو ناکام بنا دیا۔ اور دشمن کو سمرنا سے نکال باہر کیا۔ توازن کے مقام پر کرزن نے ایک جدید۔ معاہدے کے بارے میں گفت و شنید کی جس میں معاہدہ سیورے میں ترمیم کر دیا۔ لیکن خلافت اور مقامات مقدسہ کا مستقل حل نہ ہو سکا۔

خلافت کا مسئلہ

یہ خوفناک خیال کہ یہ مقامات مسلمانوں کے کنٹرول سے باہر نکل جائیں گے ایسا ہولناک تھا۔ کہ مسلمان کو اس پر سوچنا بھی انتہائی دردناک تھا۔ اس لیے مسلمان قوم کے قلوب کی انتہائی تہوں میں تہلکہ مچا ہوا تھا۔

فضل الحق نے مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ دلی (1918ء) میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "میرے نزدیک ہندوستان میں اسلام کا مستقبل مایوسی اور اضطراب میں لپٹا ہوا ہے۔ دنیا کی مسلم طاقتوں میں سے کسی ایک کے ڈھیر ہو جانے کا لازمی طور پر خراب اثر ہندوستان میں ہمارے فرقہ کی امت پر پڑے گا۔" 54

خاص طور پر قابل غور یہ بات ہے۔ کہ اس اجلاس میں علماء شریک تھے۔ عبدالباری آزاد سبحانی ابراہیم سیالکوٹی، ثناء اللہ امرتسری، احمد سعید، کفایت اللہ، عبدالطیف، جس نے مسلم سیاسی کو ایک موڑ عطا کیا۔ اس اجلاس کا دوسرا اہم واقعہ یہ تھا۔ کہ جناح اور محمود آباد لیگ سے الگ ہو گئے۔ کیونکہ یہ دونوں اس ریزولیوشن کے خلاف تھے۔ جو پاکستان کے بارے میں منظور کیا گیا تھا۔

اس کے کچھ ہی دنوں بعد ستمبر 1919ء لکھنؤ میں ایک کانفرنس کی گئی صدارت ابراہیم ہارون جعفر نے کی جو لیجسلیٹو کونسل کے ایک ممبر تھے۔ اور مسلمانوں کے معزز طبقہ کی ایک زبردست تعداد نے شرکت کی اس کانفرنس میں ایک آل انڈیا خلافت کمیٹی بنائی گئی۔ اور بمبئی کے سیٹھ چھوٹانی اس کے صدر اور شوکت علی نظر بندی سے رہائی کے بعد، اس کے سکریٹری قرار دیئے گئے۔

54- Fazlul Haq's Presidential Address. cited in Sayeed Kha-lid. Bin Pakistan the formative Phase (1960) P. 461

خلافت کمیٹی کا پہلا اجلاس/55 دلی میں کیا گیا۔ اور 23 نومبر ۱۹۱۹ کو فضل الحق کی صدارت میں منعقد ہوا۔ گاندھی جی، موتی لال نہرو اور مالویہ شریک تھے۔ دوسرے دن، گاندھی جی اتفاق رائے سے صدر چنے گیے۔ انہوں نے حالات پر تقریر کی اور یہ تبلایا کہ مسلمانوں کے ساتھ جو ناانصافی ہوئی ہے۔ اس کا علاج ترک موالات ہے۔ نہ کی بائیکاٹ۔

دسمبر میں خلافت کمیٹی اور کانگرس دونوں کے اجلاس امرتسر میں ہوئے ان دونوں، جماعتوں میں اب بہت زیادہ برادرانہ محبت تھی۔ خلافت کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا کہ ایک وفد۔ ہندوستان میں وائسرائے اور انگلستان میں وزیر اعظم کے پاس بھیجا جائے تاکہ وہ حکومت ہند اور حکومت برطانیہ کے سامنے اپنے خیالات پیش کر سکے۔

جب کمیٹی کا اجلاس دلی میں ۲۰ جنوری 1920 کو ہوا تو گاندھی جی نے ترک موالات کا پروگرام پیش کیا۔ جو چند دن بعد میرٹھ میں جو کانفرنس ہوئی اس میں منظور کیا گیا۔ کلکتہ میں، (فروری 1920) جو کانفرنس مولانا ابوالکلام آزاد کے زیر صدارت ہوئی اس نے ایک یوم خلافت متعین کیا اور ترک موالات کی تجویز منظور کی۔ اس کے بعد کے مہینوں میں متعدد جلسے کیے گیے۔ چونکہ وفود وائسرائے کے پاس (جنوری 1920) اور وزیر اعظم کے پاس ۱۹ مارچ 1920) گئے تھے۔ وہ بالکل بیکار ثابت ہوئے تھے۔ اس لیے طے کیا گیا۔ کہ وائسرائے کو یہ نوٹس دے دی جائے کہ اگر خلافت کے مطالبات تسلیم نہ کیے گیے۔ تو یکم اگست سے ترک موالات کی تحریک شروع کر دی جائے۔

ترک موالات کی تحریک کی کامیابی کا انحصار کانگرس اور خلافت کے باہمی اشتراک عمل پر تھا۔ 30 مئی 92 کو آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے اپنے اجلاس منعقدہ الہ آباد میں اس امر پر بحث کی اور تب کانگرس کا ایک خاص اجلاس کلکتہ میں ستمبر کو کیا گیا۔ لاجپت رائے نے صدارت فرمائی ۔ ۔ ۔ نے ترک موالات کی تحریک کی منظوری دے دی لیکن سوراجیہ کے مقصد کو خلافت کے مقصد کے ساتھ منسلک کر دیا۔

اب ایک زبردست سیاسی ہل چل کے لیے میدان آراستہ تھا۔ جس نے ایک قلیل مدت میں ملک کا چہرہ ہی بدل دیا۔ خلافت کمیٹی اور کانگرس کے گاندھی جی کی تجویز کو

55- Second of the Lucknow conference is considered the first.

منتقل کرلینے کے فوری نتائج حسب ذیل ہوئے۔

(۱) انڈین نیشنل کانگرس جو 1917 میں متحد ہوگئی تھی۔ اس کے پھر ٹکڑے ہوگئے وہ لوگ جو نئے پروگرام سے متفق نہیں تھے۔ انہوں نے ایک آل انڈیا لبرل ، فیڈریشن نام سے ایک نئی جماعت بنالی۔

(2) آئندہ 25 سالوں تک کانگرس گاندھی جی کی رضا کی بجاآوری کے لیے ایک آلہ کار کی حیثیت سے کام کرتی رہی اور اس کی سیاست کا راستہ مذہبی جوش روکے رہا اگرچہ یہ فرقہ وارانہ نہ تھا۔

(3) مسلم لیگ ہر دلعزیزی سے محروم ہوگئی۔ اور مسلم سیاست مذہبی لیڈروں کے اقتدار کے اندر چلی گئی ایسے لوگ جیسے کہ جناح ، وزیر حسن ، محمود آباد ، فضل حسین ، محمد شفیع جو مسلم لیگ کے ستون رہ چکے تھے۔ وہ پچھلی صف میں پھینک دیئے گیے۔ اور خلافت کمیٹی اور جمیعتہ علماء نے مسلم سیاست کی باگ اپنے ہاتھ میں لی۔

(4) جمیعتہ علماء ہند کا قیام امرتسر میں 1919 میں محمود الحسن جو مالٹا سے واپس آگیے تھے۔ اس کے صدر مقرر ہونے اور ہندوستان کے اکابر علماء کی ایک بڑی جماعت نے اس میں شرکت کی جمیعتہ نے گاندھی جی کی تحریک ترک موالات کی وزنی حمایت کی 1924 کے بعد اس نے ایک سرگرم اور قابل لحاظ کردار آزادی کی جدوجہد میں پیش کیا۔

(5) ہندو اور مسلم عوام سیاسی جدوجہد میں کھنچ کھنچ کر زیادہ سے زیادہ تعداد میں آتے رہے مذہبی جذبات شدت سے برانگیختہ تھے۔ جس کا انجام یہ تھا کہ دونوں کے پیروں میں انفرادیت کا زیادہ سے زیادہ شعور پیدا ہوا مذہب اور سیاست میں خلط ملط ہوگیا۔

(6) راسخ العقیدہ ہندو اور سیکولر ذہنیت کا متوسط طبقہ بے چین اور افسردہ تھا لیکن سیلاب کا دھارا ان کے لیے بہت تیز تھا۔ اور وہ موجوں کی رفتار کو قابو میں لانے کے قابل نہ تھے۔ پس ساحل پر کھڑے تماشہ دیکھتے تھے۔

ترکی کے ہتھیار ڈال دینے کے بعد سے جوش اور ہراس تیزی سے ترقی کر رہا تھا۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے جذبات کے اندرونی محرکات جن کی تائید ہندوستان کے ، نیشنلسٹ بھی کرتے تھے۔ سب بیکار ثابت ہوئے۔ مایوسی اور ڈر اور جان پر کھیل جانے والے جوش نے ان کو علاج تلاش کرنے پر مجبور کیا جو انہوں نے گاندھی جی کی تجویز میں پایا جو ان

کی شدید اذیت ناک مشکلات کا واحد عملی حل نظر آتا تھا۔ مسلمانوں نے ان کی قیادت تسلیم کر لی اور ان کی ہدایات پر جس گرم جوشی سے عمل کیا وہ انتہائی شاندار ہے۔

دوسری جانب ہندو مسلم اتحاد تو گاندھی جی کا مذہبی عقیدہ تھا۔ اور اسی حیثیت سے وہ اس کے دلدادہ تھے۔ انہوں نے اپنی مقناطیسی شخصیت اور اپنی نادر شہرت اور ناموری کو کام میں لا کر کانگرس کو خلافت کے مطالبات کی حمایت پر راضی کر لیا۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ کانگرس یعنی کل کانگرس برطانوی ہتھوڑے کے ضربات کے نیچے غصہ سے پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ گورنمنٹ نے ایک کمیٹی زیر سرکردگی۔ رولٹ جو برطانیہ کے ایک جج تھے۔ مقرر کی۔ جس کا کام یہ تھا۔ کہ وہ موجودہ خطرناک حالات سے نپٹنے کے لیے کوئی قانون تیار کرے۔ فروری ۱۹۱۹ میں دو مسودات قانون امپیریل لیجسلیٹو کونسل میں رولٹ کمیٹی کی سفارشات کو عمل میں لانے کے لیے پیش کیے گئے۔ یہ ایک چیلنج تھا۔ د... کر زمین پر ٹیک دیا گیا۔ اور ستیہ گرہ شروع کر دی گئی۔ عام اسٹرائک اور ہڑتال کا نعرہ دیا گیا۔ اور جوش روز بروز بلکہ گھنٹہ گھنٹہ بڑھ رہا تھا۔ ملک میں بغاوت کے ایجیٹیشن کی آگ جل رہی تھی۔

مائیکل اوڈوائر لفٹننٹ گورنر پنجاب نے عزم کیا کہ شہنشاہیت کے وقار کو ہر حال، اونچا رکھے گا اور بے باک شورش پسندوں کو پیس دیگا۔ اس پالیسی کا انجام یہ ہوا۔ کہ جلیانوالہ باغ میں ایک بڑے پیمانہ پر قتل عام ہوا۔ جس کے بعد بربریت آمیز وحشیانہ اور ذلت خیز لائق مذمت تدابیر اختیار کی گئیں جس نے 1857 کے بعد کے خون کی پیاس کی یاد کو تازہ کر دیا۔

کانگرس کا جواب یہ تھا۔ کہ اس نے گورنمنٹ کے عوامی مقابلہ کی جدوجہد کا آغاز کر دیا تھا۔ جس کے مقاصد تین تھے۔ یعنی سوراجیہ کا حصول، پنجاب کے مظالم کی تلافی، اور خلافت کو از سر نو بحال کرنا۔ ان تینوں مقاصد کا رشتہ ایک بہت قابل غور ہے۔ کیونکہ، اس میں ایک قطعی فرقہ وارانہ مذہبی مطالبہ کو ایک قومی مطالبہ سوراجیہ سے ہم آہنگ کر دیا گیا تھا۔ باوجود اس کے کہ اس میں ایک طرف تو ایک محدود علاقائی قومیت کا تصور تھا۔ اور دوسری جانب یہ مطالبہ تھا۔ کہ ایک متحدہ با اقتدار حکومت قائم کی جائے۔ لیکن کانگرس نے مجبور ہو کر بیرون وطن ملک کے لیے ایک مقدس مذہبی غرض حاصل کرنے پر رضامندی دیدی۔

گاندھی جی کا فیصلہ زیادہ تر اخلاقی بنیادوں پر تھا۔ ان کی دلیل یہ تھی۔ کہ باشندگان ہند کے ہر

طبقہ کا یہ فرض ہے کہ وہ دوسرے طبقہ کی تکالیف و مصائب میں مددگار ہو ایک سوسائٹی کا رکن ہونا بے معنی ہوگا۔ اگر اس سوسائٹی کے ممبران سب کے غم اور مسرت دونوں میں شریک نہ ہوں۔ برطانیہ کی حکومت کے برتاؤ سے مسلمانان ہند غم اور غصہ میں ڈوب گئے اور ان کے علاج کی تلاش میں ہیں۔ ہندوؤں پر یہ اخلاقی فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں کی مدد کریں۔

ان کا یہ بھی خیال تھا کہ مسلمانوں کا معاملہ اخلاقاً مبنی برحق ہے۔ اور اس لیے انسانیت کی بنا پر بھی حمایت کا مستحق ہے۔ ترکوں کے خلاف لڑنے کے لیے مسلمان فوجوں کے ضمیر کی بے چینی پر قابو پانے کے لیے وزیراعظم لائڈ جارج نے متعین وعدے کیے تھے۔ یہ تمام وعدے نہایت آسانی کے ساتھ لڑائی ختم ہونے اور ضرورت نکل جانے پر گلدستہ طاق نسیاں بنادیئے گئے۔ انسانی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے یہ قطعی جائز ہے کہ ان وعدوں کو پورا کرانے کا یقینی بندوبست کیا جائے

گاندھی جی کے دلائل ناقابلِ تردید تھے جن اصولوں کو انھوں نے پیش کیا ان میں کسی استثنا کی گنجائش نہ تھی۔ لیکن موجودہ صورت حال میں ان کے نفاذ پر اعتراض کرنا ممکن تھا۔

بدقسمتی سے نہ تو گاندھی جی اور نہ ہندوستان کے حامیان خلافت نے اس امر کو سمجھنے کی کوشش کی کہ جو مقاصد ان کے پیش نظر تھے وہ نہ تو سیاسی حیثیت سے قابلِ عمل تھے اور نہ تو مکمل طور پر مبنی بر انصاف ہی تھے۔ مسلمانان ہند کا افریقہ، یورپ اور ایشیا کے مسلمانوں سے ہمدردی قطعی طور پر محض خیالی اور بالکل ہی ناقابلِ عمل تھی۔ دنیا کے مسلم ممالک اسلام کے رشتہ سے جڑے ہوئے نہیں تھے۔ بلکہ ان میں کوئی چیز مشترک ہی نہ تھی۔ جو اتحاد پیدا کرتی۔ ان کے باہمی تعلقات مختلف تھے۔ کہیں تو میل جول اور امداد باہمی کے اصول پر عمل پیرا تھے اور کہیں ان کے آپس میں سخت مخالفت تھی اور جنگیں ہوتی رہتی تھیں۔ لیکن ہندوستان کے مسلمان بلالحاظ اس کے کہ ان کا برتاؤ ہندوستان کے مسلمانوں یا دوسرے ملکوں کے مسلمانوں کے لیے کیا تھا۔ سب کے ساتھ دوستانہ تعلقات کے خواہشمند تھے۔

ان لوگوں نے اس کا خیال نہیں کیا کہ وہ لوگ خواہ وہ تعداد میں کسی قدر زیادہ ہوں، کسی بین الاقوامی معاملہ کو نہ طے کرسکتے ہیں اور نہ اس پر اثر انداز ہوسکتے ہیں جب تک وہ خود اقتدار اعلیٰ کے مالک یا آزاد نہ ہوں۔

خلافت کا اس کی قدیم روایاتی منصب اور طاقت کے ساتھ قایم کرنے کے لیے یہ ضروری تھا۔ کہ سلطنت عثمانیہ کو اسی درجہ پر لایا جائے۔ جس پر وہ لڑائی سے قبل فائز تھی یعنی یہ کہ، عربوں پر ترکی کا تسلط از بر دستی قائم کیا جائے۔ اور اس تسلط سے از سرے نو زندہ کیے جانے کے لیے تیار نہ تھے۔ علاوہ ازیں مسلمانان ہند کے علاوہ دوسرے ممالک کے مسلمانوں نے خواہ وہ سنی ہوں یا شیعہ اس معاملہ میں کچھ زیادہ دلچسپی ظاہر نہیں کی تھی۔ اصلیت تو یہ ہے۔ کہ عثمان کا تخت خلافت پر جلوہ افروز رہنا ہی معرض بحث میں تھا۔ ہندوستان نے، سولہویں صدی ہی سے یعنی جب سے کہ مغل حکومت قائم ہوئی۔ اس نے ترکی سلاطین کی خلافت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ صرف 1876 میں جب انگریز سلطان کے اثر اور ان کی طاقت کو روس کے خلاف ایک درمیانی دیوار بنائے رکھنا چاہتے تھے۔ تو انہوں نے چند ہندوستانی مسلمانوں کو ترکی کی خلافت تسلیم کرنے کی جانب راغب کیا۔ لیکن اس وقت بھی سر سید جو مغل روایات کے ایک وارث کی حیثیت رکھتے تھے انہوں نے خلافت کو تسلیم کرنے سے انکار کیا۔ جس سے ناراض ہو کر ملا جمال الدین افغانی نے جو اتحاد اسلامی کے مبلغ تھے۔ سر سید کی سخت مذمت کی۔ حقیقت یہ ہے۔ اس عہد سے میں خلافت کے کئی دعویدار ان تھے۔ /56۔ اس طرح چونکہ خلافت کمزور بنیادوں پر قائم تھی۔ اس لیے گاندھی جی کی مہم کے اثرات مجموعی طور پر مسرت افزانہ تھے۔

تحریک کے آغاز میں علماء نے ایک ڈگری (فتویٰ) دیا۔ جس میں یہ اعلان کیا کہ ہندوستان جنگ کی جگہ (دارالحرب) ہے۔ جس کا مطلب یہ تھا۔ کہ ہر مسلمان پر فرض ہے۔ کہ یا تو جہاد کا، اعلان کرے یا ترک وطن کر کے ہجرت کر جائے۔ ہندوستان کے مغربی خطہ سے تقریباً۔ 18,000 مسلمانوں نے دوسری تجویز پر عمل کیا۔ اور افغانستان کے مسلم ملک کی جانب چل پڑے۔ امیر کے لیے اپنے چھوٹے سے ملک میں ہندوستان کی ایک کثیر تعداد کو آباد کرنے کا خیال ہی تشویش انگیز تھا۔ یہ مذہب ہو یا مذہب نہ ہو انہوں نے ان لوگوں کے داخلے کو، انکار کر دیا۔ ایک خطرناک المیہ اس کا انجام ہوا۔ لیکن مسلمانوں نے اس سے کوئی سبق نہیں سیکھا اور وہ برابر ایک امام کی قیادت میں ملت کی وحدت کا راگ الاپتے رہے۔

---

56 - Around The Caliphate

اقبال نے اتحاد اسلام کی سالمیت پر اپنے عقیدہ کا اظہار اور نیشنلزم کی اس لحاظ سے مذمت کرتے رہے۔ کہ یہ اسلام کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ اور یہ باتیں ایسی عظیم بھرپور تاثر انگیز شاعری میں پیش کرتے تھے۔ کہ تمام مسلمانوں خواہ وہ بوڑھے ہوں یا جوان ہوش وحواس کھو دیتے تھے۔

سیاست پیچھے ہٹ گئی۔ اور اس کی جگہ مذمت نے لے لی جمیعتہ العلماء نے ایک مذہبی حکم، فتویٰ، جاری کیا جس پر تقریباً نو سو علماء کے دستخط تھے۔ اور جس میں ترک موالات کے پروگرام کی تائید کی گئی تھی۔ اور مسلمانوں کو مشورہ دیا گیا تھا۔ کہ اس پر عمل در آمد کرنے کو اپنا فرض سمجھ کر عمل کریں۔ آزاد جو مذہب اور سیاست کو مکمل طور پر ایک تسلیم کرتے تھے۔ مسلمانوں کو یاد دلایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر یہ فرض عائد کیا ہے۔ کہ جہاد کو بلا ذرا بھی نرم پڑے جاری رکھیں۔ انہوں نے ان کو ان الفاظ میں جوش دلایا۔

"مسلمانوں کو چاہیئے کہ نہ تو سیاست کو سوچیں اور نہ تعلیم کو۔ نہ تو آزادی کی تعریف کریں اور نہ غلامی کی بیڑیوں کو پہنیں ان سے ان معاملات پر سوچنے یا فیصلہ کرنے کی امید نہیں کی جاتی ہے۔ یہ صرف اللہ ہے۔ جسے ان معاملات کا فیصلہ کرنا ہے۔ اور اس نے فیصلہ کر دیا ہے۔ ان کا فرض صرف اس قدر ہے۔ کہ وہ اللہ کے حکم پر سختی سے عمل کریں۔ جو قرآن میں درج ہیں۔ ان کو انسانوں کے بنائے ہوئے تمام قوانین اور نیشنلسٹ جذبات سے خالی کر لینا چاہیئے۔ اور معلم اعلیٰ کی تعلیمات اور رہنمائی کے آگے سر تسلیم خم کر دینا چاہیئے..... مسلمان کے پاس اپنی کوئی خواہش نہیں ہے۔ نہ ان کے پاس کوئی پلان ہے۔ اور نہ کوئی پالیسی ہے۔ ان کی خواہش اور ان کی پالیسی صرف یہ ہونی چاہیئے۔ کہ اسلام کے احکام کی مکمل مطابقت میں عمل کریں۔/57"

گاندھی جی کے لیے خلافت کے مسئلہ کا مذہبی پہلو ایک پوری زندگی کا ایک موقع تھا۔ انہوں نے کہا "اگر ہندو چاہتے ہیں۔ کہ مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے اپنا دوست بنالیں تو ان کو اسلام کی عزت کا انتقام لینے کیلئے ان کے ساتھ جان تک دے دینی چاہیئے۔/58"

57- Sayeed, Khalid Bin, op. cit, P. 64.

58- Ibid, P. 62: also Gandhi. M.K. Communal Unity (Ahmedabad Navajivan. 1949). PP. 5 and 4.

جب مذہبی جذباتیت میں اس طور پر ابال آیا۔ تو لازمی تھا۔ کہ تقریروں اور عمل میں بہت زیادہ زور رہے۔ اور زیادہ خراب بات یہ ہوئی کہ اس نے مزاجوں کو سخت کر دیا اور مسائل عقلی طور پر حل کرنے میں مزاحمت کی اور مصالحت کرنے پر پابندی لگا دی۔

لیکن وقتی طور پر تحریک تیزی سے پھیلی۔ کانگرس اور خلافت کمیٹی نے خلافت کے ساتھ جو مظالم کیے گیے تھے۔ ان کے مداوا اور سوراجیہ قائم کرنے کے لیے ایک مشترکہ پروگرام بنایا تاکہ آئندہ اس قسم کی زیادتیوں کا اعادہ نہ ہو سکے۔

خلافت کانفرنس جس کا اجلاس کراچی میں 8 اکتوبر 1921 کو ہوا اس نے ترک موالات کے پروگرام پر ایک تجویز منظور کی جس کے خاص اجزا حسب ذیل تھے۔

(1) خلافت کے مطالبات کو پورے طور پر حاصل کرنے کا عزم بالجزم۔

(2) ترکی کے اقتدار اعلیٰ پر کسی قسم کی پابندی لگائے جانا نامنظور۔

(3) جزیرۃ العرب یا مقامات مقدسہ پر غیر مسلم کنٹرول تسلیم کرنے سے انکار

(4) اس بات کا اعلان کہ ایک مسلمان پر برطانیہ کی فوج میں ملازمت حرام ہے۔ اور یہ

(5) اعلان کہ قوانین توڑے جائیں جس کی ابتدا کانگرس کی منظوری کے بعد سول نافرمانی سے کی جائے۔ آزادی کامل اور ہندوستان میں ریپبلک کے قیام کا اعلان اس حالت میں کر دیا جائے۔ جب برطانیہ کی حکومت ترکوں کے خلاف فوجی کارروائیاں کرے۔

ہندو اور مسلمان قوانین کو توڑنے اور بغاوت کی تبلیغ کرنے میں ایک دوسرے پر، سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔ ہزاروں آدمی خوشی خوشی جیل گیے۔ اور۔ لاٹھیوں کی مار بلا جوابی حملہ کیے برداشت کی وکلا نے اپنی وکالت چھوڑ دی۔ ٹیچروں نے نوکریاں ترک کر دیں۔ طلبا نے اسکولوں اور کالجوں کو خیر باد کہدیا۔ علی گڑھ کے ٹرسٹیوں پر دباؤ ڈالا گیا۔ کہ وہ حکومت کی امداد لینے سے انکار کر دیں ٹرسٹیوں کے انکار پر ایک سو لڑکوں نے کالج چھوڑ دیا۔ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد رکھی۔

گاندھی جی، آزاد، محمد علی، اور دوسرے لیڈروں نے ملک گیر دورہ کر کے حکومت کی ضد کی مذمت کی سرمایہ اکٹھا کیا۔ اور رضا کاران کی جماعت بنائی۔ ہیجان زیادہ طور پر اٹھا۔ اور جذبات کی اڑان بہت اونچی ہو گئی۔

اپنی امن کی پالیسی کے ماتحت گاندھی جی مئی 1921 میں وائسرائے لارڈ ریڈنگ

سے کئی مرتبہ ملے۔ مگر کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ گورنمنٹ اپنے دماغ میں یہ طے کر چکی تھی۔ کہ تحریک کو کچل دیا جائے۔ محمد علی، اور دوسرے لیڈران کے خلاف اس ریزولیوشن کی بنیاد پر جو کراچی میں پاس ہوا تھا۔ اور جس میں یہ اعلان کیا گیا تھا۔ کہ فوج میں بھرتی مذہب کے خلاف ہے۔ مقدمہ اس سے پہلے شروع ہو چکا تھا۔

۱۴ ستمبر کو محمد علی، اور ان کے بھائی شوکت علی گرفتار کر لیے گئے۔ آزاد تو جیل میں تھے ہی۔ نومبر میں موتی لال اور جواہر لال کو چھ چھ ماہ قید کی سزا ہوئی۔ دسمبر میں سی۔ آر۔ داس کا بھی یہی انجام ہوا۔

شہزادہ ویلز کی نومبر میں ہندوستان تشریف آوری نے دیوانہ را ہوئے بس است کی مانند اشتعال انگیزی کا کام کیا۔ جہاں جہاں وہ گیے بائیکاٹ اور کالے جھنڈوں سے ان کا استقبال کیا گیا۔ دسمبر 1921 اور جنوری 1922 کے درمیانی عرصہ میں تیس ہزار آدمی گرفتار کیے گیے۔

جبر و تعدی نے آگ میں ایندھن کا کام کیا۔ ضبط کا لباس تنگ ہو گیا۔ تحریک عوام تک پہونچ گئی۔ ہزاروں کی تعداد میں عوام جمع ہوتے۔ اور مجمع عام کے غصہ میں بھرے ہوئے پرجوش مقررین کی تقریریں سنتے تھے۔ کثیر تعداد پر مشتمل ہجوم جلوس کی شکل میں گاؤں اور قصبات میں گشت کرتے تھے۔ اور بدیشی کپڑوں کی ہولی کھیلی جاتی تھی۔ پولیس مداخلت کرتی تھی۔ اور اس کے ظالمانہ رویہ کی وجہ سے بلوے ہوتے تھے۔ ایجیٹیشن جبر و تعدی اور اس کے بدلے میں مزید ایجیٹیشن کا ایک چکر قائم ہو گیا تھا۔

جذبات کی برانگیختی میں بہت سے لیڈران بھی اپنا توازن کھو بیٹھتے تھے۔ محمد علی نے اپنی، گرم جوشی کے دوران ایک ایسی بات کہہ دی جو کچھ ہندو لیڈروں کے کانوں کو کرخت آواز معلوم ہوئی۔ مسلمانوں کی تاریخ کے حوالے۔ یعنی ان کی جنگی مہموں اور فتوحات کے تذکرے۔ ہندوں کے کانوں کو اتنے شیریں نہیں معلوم ہوتے تھے۔ جتنے کہ مسلمانوں کے کانوں کو شردھا نند اور مالوی نے گاندھی جی کی توجہ قرآن کی حرب و ضرب کی آیات کی مسلسل تلاوت کی جانب دلائی۔

جاہل اور مذہبی مجنوں موپلاؤں پر۔ جو کیرالہ کے مسلم کاشتکار تھے۔ ملاؤں کے پروپگنڈا کا ایک بہت خطرناک اثر ہوا۔ دنیا کے اس حصہ میں جائداد کے جھگڑے غیر معمولی بات نہ تھے۔

اس پر اضافہ یہ ہوا۔ کہ آزادی اور حکومت برطانیہ کے زیر وزیر ہو جانے کی امید نے اس پوری آبادی کے اندر جوش کی ایک لہر دوڑادی جس نے اگست 1921 میں بغاوت کی شکل اختیار کر لی۔ یہ بغاوت زمینداروں کے خلاف تھی۔ اور گورنمنٹ کے بھی۔ جو برطانوی فوجیں ان کے خلاف بھی گئیں۔ ان سے موپلے لڑے ایک ریلوے اسٹیشن کو لوٹ لیا اور ارناد (Ernad) تعلقہ میں خلافت کی حکومت قائم کر دی لوٹ، آتش زنی، قتل اور دوسرے مظالم کو کھلی چھوٹ مل گئی۔ ہندو ان فسادات کے ہدف بنے۔ بہت سے لوگوں کو ہندو مذہب ترک کرنے اور اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا گیا۔

ان مجرمانہ واقعات کی سنگینیوں کو افواہوں میں بہت بڑھا چڑھا دیا گیا۔ ہندوں نے مسلمانوں کی پوری قوم کو کیرالا کے ان حادثات کا ذمہ دار قرار دیا۔ کچھ مسلمانوں نے موپلوں کے مذموم رویہ کو جائز قرار دیا۔ چنانچہ ہندو مسلم اتحاد کی بنیادیں ہل گئیں۔ اور ہندوں نے شدھی (تبدیل مذہب) کی تحریک شردھانند کی قیادت میں شروع کی اور ایک اور تحریک سنگھٹن (نظام) مالوی جی کی قیادت میں چلائی۔ مسلمان نے اس کا جواب تبلیغ (اشاعت اسلام) اور تنظیم (مسلمانوں کو منظم کرنے) کی تحریک چلا کر دیا۔

اس کے بعد اچانک 5 فروری 1922 گورکھپور جو یوپی کا ایک ضلع ہے۔ اس کے ایک گاؤں چوری چورا میں ایک جلوس والوں اور پولیس میں تصادم ہوگیا۔ کانسٹبلوں نے گولی چلانا شروع کیا۔ اور جب ان کا کارتوس ختم ہوگیا۔ تو وہ پولیس کے دفتر (تھانہ) کو واپس گیے۔ مجمع نے عمارت کو آگ لگادی اور بائیس کانسٹبل زندہ جل گیے۔ گاندھی جی کے لیے یہ واقعہ اس انتہائی حد تک تکلیف دہ تھا۔ کہ انہوں نے تحریک کو واپس لے لینے کا فیصلہ کر دیا۔ 11 فروری کو کانگرس کمیٹی سے مشورہ کرنے کے بعد لیکن بلا خلافت کمیٹی کی رائے لیے ہوئے عملی سول نافرمانی کا پروگرام منسوخ کر دیا گیا۔ گاندھی جی نے، پانچ دن کا فاقہ کیا اور ینگ انڈیا مورخہ 16 فروری میں دردناک الفاظ میں اپنی غلطیوں کا، اعتراف کیا۔

گاندھی جی کے اس عمل کے جواز میں یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ گاندھی جی ستیہ اور اہنسا کو اتنا عزیز رکھتے تھے۔ جتنا کسی اور چیز کو عزیز نہیں رکھتے تھے۔ حتی کہ سوراج سے بھی زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ ان کے نزدیک عدم تشدد (اہنسا) مطلق اور سب سے اعلی نیکی تھی۔

اس۔ یہ ان کے دل کی اندرونی گہرائیوں کے معتقدات کو صدمہ پہونچانے والی اور مجروح کرنے والی اس سے بڑا اور کوئی چیز ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ کہ جس تحریک کو انہوں نے شروع کیا تھا۔ وہ اتنی پست ہو جائے کہ اس میں تشدد آجائے۔ ان کے پاس کوئی متبادل اسکیم نہ تھی۔ اور اخلاقی توازن کا برقرار رہنا ضروری تھا۔ اس لیے ترک موالات کا چشمہ جو روز بروز وسیع اور گہرا ہوتا جارہا تھا۔ اس پر باندھ دی گئی۔

علاوہ اخلاقی جواز کے سول نافرمانی کے روک دینے کا ایک عملی پہلو بھی تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ کانگرس کی گرفت ڈھیلی پڑ رہی ہے۔ اور عوام نراج اور انتشار کی جانب بڑھ رہے ہیں۔ یہ ضروری تھا۔ کہ کانگرس کی قیادت کا ادعا کیا جائے۔ تاکہ آئندہ تحریک کو پھر سے زندہ کرنا ممکن رہ سکے۔ عوامی سطح پر تشدد کا انجام صرف یہ ہو سکتا تھا۔ کہ ایک وسیع پیمانہ پر خونریزی ہوا اور اس کے بعد جو اخلاقی پست ہمتی پیدا ہو گی۔ وہ اس سے بھی بدتر ہو گی جو 1857ء کے غدر کے بعد پیدا ہوئی تھی۔

ترک موالات کی تحریک کا التوا قومی نظام کی فتح تھی۔ کیونکہ اس کے حکم کی اطاعت کی گئی لیکن جو نتیجے برآمد ہوئے وہ زیادہ تر قابل اطمینان نہ تھے۔ دراصل بعض تو مثبت طور پر نقصان دہ تھے۔

شکست اپنے ساتھ غصہ، فرقہ پروری، اور لیڈروں پر اعتماد کی کمی کو لاتی ہے۔

موتی لال نہرو اور سی۔ آر۔ داس غصہ میں تھے۔ اور وہ ایک پارٹی بنانے کی اسکیم گورنمنٹ سے لڑنے کے لیے تیار کر رہے تھے۔ ان کی باہمی گفت وشنید کا نتیجہ یہ ہوا کہ سوراجیہ پارٹی قائم ہوئی جو کانگرس کے پرزے اڑا دیتی لیکن گاندھی جی کے صبر اور ان کی دانشمندی نے اسے بچا لیا۔

جواہر لال نے نوجوان طبقہ کی مایوسی اور غم کا اظہار کیا جو تحریک کی اخلاقی حیثیت کو پوری طرح نہیں محسوس کرتے تھے۔ اور یہ سمجھتے تھے۔ کہ یہ التوا ایک وحشتناک سپر اندازی ہے۔ جس نے ان تمام سیاسی فوائد کو جو حاصل ہوئے تھے کھو دیا۔ انہوں نے لکھا۔

ہم لوگ جو جیلوں میں ہیں۔ انہوں نے سخت تعجب اور اندوہ کے ساتھ سنا گاندھی جی نے ہماری جدوجہد کے جارحانہ پہلو کو روک دیا ہے۔ جب ہم لوگوں نے اپنی تحریک میں اس رکاوٹ کے بارے میں سنا جو ایک ایسے زمانہ میں کی گئی ہے۔ جب ہم اپنی پوزیشن کو،

مضبوط بنا رہے تھے۔ اور ہر کا ذیر آگے بڑھ رہے تھے۔ تو ہم لوگوں کو بڑا غصہ آیا[59]
اس نے ترک موالات کے اصولوں کے جائز ہونے کے بارے میں شک پیدا کیا انہوں
نے کہا کہ "ہمارے لیے اور نہ کل کانگرس کے لیے عدم تشدد مذہب یا ایک ناقابل حرج
اصول یا عقیدہ کی حیثیت اختیار کر سکتا ہے۔ اس کی نوعیت صرف ایک پالیسی کی ہو سکتی ہے۔ اور
یہ ایک طریقہ عمل ہے۔ جس سے بعض نتائج کی توقعات ہیں۔ اور نتائج پیدا ہوں انہی سے
اس کی حیثیت کا فیصلہ کیا جائے گا۔"[60]

اس پر زور دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ کہ نقطۂ نظر ان اصولوں کے بالکل متضاد تھے۔
جن سے مسلم خلافتی حرکت میں آتے تھے۔ ایک نظام ہے اندر جس نے تحریک جاری کی،
تھی۔ ایسے متضاد آراء کا وجود لازمی طور پر پریشانیوں کا موجب ہو سکتا تھا۔

ہندو مسلم اتحاد کا عظیم محل جو گاندھی جی نے بڑی محنت سے تیار کیا تھا۔ وہ مجروح،
ہو گیا۔ 1911 سے ہندوستان کے مسلمانوں نے علی گڑھ مکتبہ فکر کے سیاست دانوں کی،
جاری کی ہوئی پالیسی کی تردید شروع کر دی تھی۔ 1913 میں لوگوں نے ہندوستان کی منزل
سلف گورنمنٹ تسلیم کر لی تھی۔ لیگ کی لندن کی شاخ نے یہ تجویز منظور کی (14 جولائی،
1914) کہ ہندوستان کی مختلف نسلوں میں باہمی خوش خیالی اور ایک دوسرے کو سمجھنے
کی نشو ونما کا کام جس سے جدید قومی احساس پیدا ہو اس کو مضبوط کرنے کے لیے
کیا جائے۔ محمد علی نے اپنا یہ مضبوط عقیدہ ظاہر کیا کہ "مسلمانوں کی ترقی اور بھلائی اس ملک
کی ترقی اور بھلائی سے بندھی ہوئی ہے۔ جس میں ہم رہتے ہیں۔

وزیر حسن جو ایک ممتاز لیگ لیڈر تھے۔ انہوں نے 11 اکتوبر 1913 کو لنڈین
ایسوسی ایشن لندن کے سامنے ایک انشائیہ پڑھا جس میں انہوں نے یہ خیال
ظاہر کیا کہ:۔

اگرچہ مجھے ایسا نظر آتا ہے۔ کہ علیحدہ علیحدہ کمیٹیاں علیحدہ علیحدہ سیاسی جماعتوں کے لیے

59- Nehru Jawaharlal An Autobiography. P 81.

60- Nehru Jawaharlal Towards Freedom, PP 79-83.

61- The Comrade, September 8, 1913

بنانے سے نزاع نہ کرتے ہوئے بھی۔ ہم پھر بھی ہندوستان میں ایک قوم کی تعمیر کی منزل کی جانب قدم بڑھا سکتے ہیں۔ بشرطیکہ ہم رفتہ رفتہ دونوں قوموں کے اختلافات کو تخفیف اور اس کی اہمیت کو گھٹاتے رہیں۔ اور دونوں میں جو باتیں مشترک ہوں ان کو ترقی دیں"/62

ان کا جو تصور ہندوستانی قوم کا تھا۔ اسے انھوں نے ان الفاظ میں ظاہر کیا۔

"میں جب مستقبل پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے ایک متحدہ ہندوستان کی شکل نظر آتی ہے۔ مگر یہ اتحاد افراد کا اتحاد نہیں بلکہ فرقوں کا اتحاد ہوگا ایک سیاسی وحدت وفاقی طریقوں پر۔ عقائد کا ایک وفاق۔ ایسے عقائد کا وفاق جو امریکہ یا جرمنی کی ریاستوں کے وفاق سے کم مضبوط نہ ہوگا۔ قوموں کا اتحاد ہوگا۔ یہ نہیں کہ سب ایک ہی طرح کے لوگ ساتھ ہوں گے، بلکہ" ایک طرح کے لوگ ان کے ساتھ ہوں گے۔ جو ان سے مختلف ہیں۔ سب اپنی بھی عزت کریں گے اور دوسرے کی بھی عزت کریں گے"/63

مندرجہ بالا بیان یہ ظاہر کرتا ہے کہ بہت سے ممتاز اور آزاد خیال مسلمانوں کے بھی خیالات فرقہ اور قومیت کے فرق کے بارے میں کس درجہ بے ترتیب تھے۔

آغا خاں نے ایک نئے قسم کے مسلمانوں کے عالم وجود میں آنے کی جانب توجہ اپنے ایک مضمون میں مبذول کی جو انھوں نے اڈنبرگ ریویو (Edinburg Review) میں لکھا تھا۔ انھوں نے کہا کہ:

"آج کے کسی ایک متوسط اونچے طبقہ کے نمونہ کے مسلمان نوجوان کو لیجیے تو آپ یہ دیکھیں گے کہ اپنے خاندان کی روایاتی مذہبی تعلیم کے علاوہ اس کی تعلیم بالکل اسی راہ پر ہوئی ہے جس پر ایک ہندو کی ہوئی ہے۔ وہ لوگ جن کی ترتیب نئے نظام کے تحت ہوئی ہے وہ آگے آرہے ہیں اور مختلف فرقوں کے سیاسی خیالات اور جذبات کو انھوں نے متاثر کیا ہے۔ اتحاد ہندوستان میں قومیت کے نشوونما کا ایک پیمانہ ہے"/64

---

62. Ibid November 8, 1913

63. Ibid

64. Ibid February, 1914

جس طرح مسلمانوں کی آنکھیں کھلتی گئیں۔ مسلمانوں کے رویہ میں ایک ترقی پسندانہ تبدیلی آئی گئی تقسیم بنگال کی تنسیخ ایک دردناک آزمائش تھی بلقان کی لڑائیوں نے جنھوں نے ترکوں پر سخت ذلت لا دی مسلمانوں کی الجھنوں میں بڑا اضافہ ہوا۔ لیکن پہلی جنگ عظیم میں، ترکی کی شکست اور معاہدہ سیوریز نے ان کی مایوسی اور ان کے غصہ کو آخری حد تک پہونچا دیا

ان واقعات نے ہندو مسلم فرقوں کو ایک دوسرے سے قریب تر کر دیا۔ 1915 میں کانگرس اور لیگ کا اجلاس بمبئی میں ہوا اور مشترکہ طور پر باہمی مشورے ہوئے 1916 میں میثاق لکھنؤ پر دستخط ہوئے۔ 1918 سے کانگرس گاندھی جی کی رہنمائی کے تحت اور خلافت کمیٹی اسلام کے علمبرداروں۔ یعنی علماء کے تحت مل کر گورنمنٹ سے جنگ کرنے میں آپس میں ایک دوسرے کے شریک رہے۔

لیکن منزل پر پہونچنے سے پہلے یہ لڑائی روک دی گئی۔ علاوہ اور باتوں کے اس نے فرقوں کے باہمی تعلقات پر بہت بڑا اثر ڈالا۔ ہندوں کے دماغ کو خلافتیوں کے جنگجویانہ پروپیگنڈوں اور موپلاؤں کی زیادتیوں کی مبالغہ آمیز رپورٹوں نے بہت زیادہ پریشان کر دیا اور اب دونوں دو دھاروں میں بہنے لگے۔ اور ہر ایک اپنے فرقہ کے لیے ایک علیحدہ فرقہ وارانہ راہ پر چلنے لگا۔ کچھ علماء گاندھی جی کی نیک نیتی پر بھی شبہہ ظاہر کرنے لگے۔ وہ کہتے تھے۔ کہ ابھی خلافت کے سوال کا حل باقی تھا۔ کہ انہوں نے تحریک کو واپس لے لیا۔ اور ہمارا وقت پر ساتھ چھوڑ دیا۔ جواہر لال کا مذہبی نقطہ نظر اور جمہوریت کا سیکولر تصور ان لوگوں کے اس عقیدے سے متصادم تھا۔ کہ مذہب اور سیاست ایک ہیں۔ اور مقدس احکام الہیہ میں انسانوں کی قائم کی ہوئی کسی قانون ساز مجلس کو ترمیم کا اختیار نہیں ہے۔ باہمی، افتراق کی کارروائیاں ترقی کرنا شروع ہوئیں۔ ان پر بہت زیادہ اضافہ اس وقت ہوا۔ جب گاندھی جی مارچ میں گرفتار کر لیے گئے ان پر مقدمہ چلا اور چھ سال کی قید کی انکو سزا، دی گئی۔

خلافت تحریک کے پتوار سے ہوا نکل گئی۔ جب ترکوں کے لوزان میں میں 23-1922 دوران خاموشی کے ساتھ مقامات مقدسہ پر اقتدار کو ترک کر دیا اور پھر 3 مارچ 1924 کو خلافت ہی کو توڑ دیا۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں شدت سے مایوسی کے جذبات پیدا ہوئے لیکن وہ بے بس تھے۔ اس کے بعد پھر کبھی وطن کے باہر کے سوال پر اس درجہ کا جوش پیدا

نہیں ہوا جن آتشیں تجربات سے وہ گذرے تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کے دماغ پرانمٹ نشانات چھوڑے تھے۔ اس لیے خواہ وہ کانگرس کی تائید کرتے یا مخالفت تشخص پر بحث ہو یا آزادی پر سیاسی وحدت کی بات ہو یا تقسیم کی۔ ان سب میں ان کے سوچنے کا طریقہ جو پہلے تھا۔ اس سے بہت مختلف ہو گیا تھا۔ مغرب زدہ متوسط طبقہ کے رہنمایان اور روایاتی مسلم علماء کے فاضل ترین حضرات۔ ہندوستان میں مسلم مسائل کی بنیادوں کے ایک ہونے پر متفق ہو رہے تھے۔

خلافت ایجیٹیشن جس کا خاص ستون حکومت آل عثمان کو برقرار رکھنا تھا۔ ایک غیر معمولی قسم کی تحریک تھی۔ انیسویں صدی کے وسط تک مسلمانان ہند نے ترکی کے معاملات میں اپنی کوئی دلچسپی محسوس نہیں کی تھی۔ حقیقت تو یہ تھی۔ کہ وہ سلاطین ترکی کو خلیفہ ہی تسلیم نہ کرتے تھے۔ اس کے انیسویں صدی کے آخری تیسری چوتھائی میں حالات بدلنا شروع ہوئے اس وقت تک ہندوستان پر برطانیہ کی فتح مغل سلطنت کے آخری نشان کا معدوم ہو جانا" 1857 کے غدر، برطانیہ کا مسلمانوں سے انتقام اور ان سے معاندت۔ ان سب معاملات کا مجموعی اثر یہ ہوا کہ مسلمانوں میں بے بسی اور مایوسی کے جذبات بہت ترقی کر گئے۔

ان ناسازگار حالات کے مسلمانوں پر دو قسم کے اثرات ہوئے۔ قدیم روایاتی تعلیم کے فاضلان علم یعنی علماء۔ کا ردعمل یہ تھا۔ کہ انہوں نے برطانیہ کے تسلط کے خلاف کھلم کھلا پر تشدد بغاوت کا رویہ اختیار کیا۔ جہاں تک بھی حالات موافق نظر آئے۔ مثلاً ولی اللہ نے سید احمد بریلوی کو جہاد پر آمادہ کیا۔ یا ہندوستان کے عوام الناس، اور ایشیا اور افریقہ کے باشندوں میں خفیہ طریقہ پر مخالف برطانیہ پروپیگنڈا کیا۔ دوسری جانب مغربی تعلیم حاصل کیے ہوئے مسلمانوں نے گورنمنٹ کے لطف و عنایت کو حاصل کرنے کی پالیسی اختیار کی۔ تاکہ اپنی کھوئی ہوئی پوزیشن اور اثرات کو پھر سے حاصل کر سکیں اور اس غرض کے لیے اپنے آپ کو برطانیہ کی اس پالیسی کا آلہ کار بن جانے دیا جو اس نے نیشنلسٹ تحریک کی روز افزوں ہر دلعزیزی کو برباد کرنے کیلئے اختیار کر رکھی تھی۔

لیکن بہت جلد اس دوسرے طبقہ نے محسوس کیا۔ کہ یہ رویہ نہ صرف ذاتی وقار کے خلاف ہے۔ بلکہ اس کے فوائد بھی محدود ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے۔ کہ مسلمانوں کا ایک چھوٹا سا طبقہ اپنے آقا ہیں۔ وفاداری کا اعلان کر کے نفع حاصل کر لے لیکن مسلمانان ہند کا مجموعی مفاد یا انداز کرتا

ہے یا کیا ان کی مخالفت کرتا ہے۔

۱۹۰۵ء کے بعد یہ دونوں ایک دوسرے سے ملے۔ علامہ پر سید جمال الدین افغانی کی تعلیمات کا گہرا اثر ہوا تھا۔ جو اتحاد اسلام تحریک کے بانی تھے۔ اور یہ چاہتے تھے۔ کہ مسلمان عالم کو خلفاء آل عثمان کی شخصیت کے گرد جمع کر دیں۔ ہندوستان کے مسلم عوام علماء کی قیادت میں برطانیہ پر اعتماد کھو چکے تھے۔ اور ایک متبادل نظام کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ تعلیم یافتہ مسلمان جس نے ہندو اکثریت کو اپنا رقیب تصور کرتے ہوئے۔ برطانوی چھاتے کے نیچے پناہ لینے کی حکمت عملی پر عمل کیا تھا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ پناہ دینے والا چھاتا ٹپک رہا ہے۔ اس لیے اس ڈوبتے ہوئے۔ آدمی کی طرح جو تنکے کا سہارا لیتا ہے۔ دونوں نے ایک ایسے معاملہ کو اپنا لیا۔ جو ان کو اس مایوسی سے نکال کر اپنے اندر خود اعتمادی پیدا کر سکتا تھا۔

ترکی کا معاملہ اس جانب راہ دکھلانے والا نظر آ رہا تھا۔ اس لیے باوجود اس کے کہ ترکوں کے معاملات سے ہندوستانی مسلمانوں کو کسی طرح کی کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اور باوجود اس کے کہ ترکی کی خلافت کی قانونی حیثیت مشتبہ تھی۔ اور باوجود اس کے کہ عربوں نے آل عثمان کے اقتدار کو مسترد کر دیا تھا۔ اور باوجود اس کے کہ ترکی حکومت کے خلاف مصر میں بغاوت اُبھر آئی تھی۔ غصہ میں بھرے ہوئے۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں برطانیہ سے اپنی نفرت ظاہر کرنے اور ایک جذباتی اتحاد اسلام کے لیے اپنے میلان مظاہرہ کرنے کے لیے یہ داعیہ پیدا ہوا۔ کہ پورے جوش و خروش سے انہوں نے اپنے کو خلافت کے ایجیٹیشن کے ہلچل میں جھونک دیا۔

اس تحریک کا حیرت خیز پہلو یہ تھا۔ کہ یہ صرف مسلمانان ہند تک محدود تھی۔ ایشیا اور افریقہ کے کسی مسلم ملک نے سلطان ترکی کو کوئی اخلاقی یا مادی مدد نہیں دی بلکہ اس کے برخلاف امیر افغانستان جنہوں نے اس سے قبل ہندوستانی مہاجرین کا داخلہ اپنے ملک میں روک دیا تھا۔ انہوں نے 23 نومبر ۱۹۲۸ کو انڈیا گورنمنٹ سے ایک صلح نامہ پر دستخط کیے جس کے ذریعہ دونوں گورنمنٹوں کے درمیان اچھے تعلقات ہمسائگی قایم کیے گیے۔ ظاہر ہے۔ کہ مسلمانان عالم کے ایک برادری ہونے کے تخیل پر یہ ایک ضرب کاری تھی۔ جو تخیل کہ مسلمانان ہند کو انتہائی عزیز تھا۔ عربوں کا رویہ بھی اسی قدر ہمت شکن تھا۔ کیونکہ وہ تو علانیہ سلطان ترکی کے خلاف برطانیہ کی ہدایت پر بغاوت کا پرچم

لہرا دیا۔ علاوہ ان باتوں کے خود ہندوستان کے مسلمان ایک خیال کے نہ تھے۔ برطانوی فوج کے مسلمان سپاہی لڑائی کے پورے دوران میں ترکوں کے خلاف لڑتے رہے۔ اور آغاخاں اور ان کے ہم خیال لوگ برطانیہ کی وفاداری کا دم بھرتے رہے۔

خلافت کا مسئلہ کلیتہً مقصدی تھا۔ اس کا کوئی تعلق دنیوی یا سیاسی معاملات سے نہ تھا۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے خلافت کی تائید مذہبی بنیادوں پر کی۔ یہ مسلمانوں کے لیے بڑی تعریف کی بات ہے۔ کہ مذہب کے لیے وہ بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لیے تیار تھے۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بات بھی ہے۔ کہ وہ سوچتے تھے۔ کہ ایک مضبوط، اسلامی حکومت ان کی خودداری اور خود اعتمادی کے لیے ایک سہارا ثابت ہوگی، ان میں یہ شعور زندہ رکھے گی۔ کہ وہ ایک مخالف دنیا میں اکیلے اور بلا کسی دوست کے نہیں ہیں۔ یہ خیال بالکل غیر عملی تھا۔ کیونکہ گورنمنٹوں کی پالیسیاں اور مسلمان گورنمنٹوں کی بھی پالیسیاں جیسا کہ تاریخ کثرت سے شہادت فراہم کرتی ہے۔ مذہبی عقائد کی بنیاد پر نہیں چلائی جاتی ہیں۔

ہندوستان کے مسلمان اس سے بھی ناواقف تھے۔ کہ ترکی میں سیکولرازم اور مغربیت کے خیلات کس حد تک پھیل چکے ہیں۔ حتیٰ کہ اسی زمانہ میں جب ہندوستان میں خلافت کے لیڈران بدترین نتائج کی دھمکیاں دے رہے تھے۔ جہاد کے فتوے دے رہے اور فوج کی ملازمت کو حرام قرار دے رہے تھے۔ ترکی کے قوم پسند مصطفےٰ کمال کی قیادت میں ایسی کارروائیوں کے لیے قدم اٹھا رہے تھے۔ جس کا آخری انجام خلافت کا عزل ہوا۔

سلطنت عثمانیہ کی سالمیت کا مسئلہ مشکل سے قابل حل تھا۔ سلطنت عثمانیہ ایک کمزور پودا تھی۔ ایک زمانہ میں اس کے اقتدار کے اندر یورپ، شمالی افریقہ، اور ایشیا کے وسط سے اس کے منتشر ہونے کا کام شروع ہوا۔ انیسویں صدی کے وسط میں ترکی سلطنت کی جسامت بہت گھٹ گئی تھی۔ اور معظم باب عالی کو فرضی نام یہ دیدیا گیا تھا۔ کہ " وہ مرد بیمار جو موت کے کنارے پر ہے۔" اس کے عیسائی صوبے باغی اور اس کی عرب رعایا غیر مطمئن تھی۔ ترکی گندے اصطبل کو صاف نہ کر

سکے اور انجام یہ ہوا کہ وہ انتشار کی جانب بہنے پر مجبور ہوئے۔ یورپین طاقتیں اس کو ختم کرنے اور آپس میں اس کو تقسیم کر لینے کی بات چیت کر رہی تھیں۔

ترکوں کو برطانیہ اور روس کے خلاف جو غصہ تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے بہ تابع تقدیر فیصلہ کیا کہ برطانیہ اور ان کے اتحادیوں کے خلاف جنگ میں وسطی طاقتوں کے ساتھ شریک ہوگیا۔ اس فیصلے میں ایسے نتائج مضمر تھے جن کی پیش بینی پہلے سے دشوار تھی۔ ہندوستان کے مسلمان فرقہ نے نہایت بہادری کے ساتھ ترکی کے موقف کی زبردست تائید اس غرض کے پیش نظر کی کہ جو راستہ ترکوں نے سمجھ بوجھ کر اختیار کیا تھا اس کے خراب نتائج سے اس کو بچایا جا سکے۔ یہ صحیح ہے کہ برطانیہ کے مدبرین نے اس بات کے لیے اقرار صالح کے ساتھ وعدے کیے تھے کہ ترکی قوم کے وطن کو جوں کا توں رکھا جائے گا۔ لیکن بے غیرتی کے ساتھ اس سے منحرف ہو گئے۔ لیکن ان ممالک پر ترکی کے اقتدار کے لیے جو ان کے وطن کے باہر تھے کوئی ایسی دلیل نہ تھی جس کو جواز کی بنیاد بنایا جا سکے۔ یہ ایک افسوس ناک بات ہے کہ خلافت والوں نے گورنمنٹ سے ان امور پر جھگڑا دیا جن کی مناسبت مشتبہ تھی۔ یہ امور ایسے تھے جن کا اثر ہندو اور مسلمان باشندگان ہند پر اگر بالکل بے حقیقت نہیں تو کم سے کم سطحی تو ضرور ہی تھا۔ اس لیے کہ اگر ہندوستان آزاد بھی ہو گیا ہوتا تو یہ امر مشتبہ ہے کہ وہ فاتح اتحادیوں پر کوئی زیادہ اثر ڈال سکتا اور غلامی کی حالت میں تو یہ بات خارج از بحث تھی۔

لیکن بحث اور دلیل کی کوئی وقعت نہیں رہ جاتی ہے اور یہ قابل معافی بھی ہے جبکہ لوگ ایک ایسے انتہائی جوشیلے اور ناقابل اندازہ مہم میں لگے ہوئے ہوں جس کے بارے میں پیشن گوئی ناممکن ہے۔ جیسے کہ ایک بیرونی حکومت سے آزادی حاصل کرنے کی جدوجہد۔ گاندھی جی کا مسلم موقف سے کامل اتفاق اگرچہ اخلاق اور انسانیت کی بنیاد پر جائز تھا۔ لیکن عملی اور سیاسی نقطہ نظر سے اس کی قدر و قیمت مشتبہ ہے۔ خلافت ایجی ٹیشن کے ضروری مضمر نتائج کا نہ تو مسلم لیڈران نے نہ خود گاندھی جی نے صاف صاف اندازہ کیا۔

گاندھی جی کا یہ خیال کہ تحریک خلافت میں شریک کرکے وہ ہندو مسلم اتحاد کو مستقل طور پر حاصل کر لیں گے ایسا تھا کہ جس کے پورا ہونے کے امکانات نہیں کے برابر تھے فرقہ وارانہ مخالفت کے اسباب بہت گہرائی میں تھے۔ ان کی جڑیں ہندوستان کی آبادی

کی سماجی، اقتصادی اور سیاسی نظاموں کی بنیادوں تک جاتی تھیں۔ اور جب تک کہ کل نظام کو الٹ پلٹ نہ کر دیا جائے۔ ان کو دور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن اس کا یا پلٹ کو لانے میں ایک تیسری جماعت کا وجود دخل انداز تھا۔ جو سیاسی طاقت رکھتی تھی۔ اور اپنے اثرات کو اقتصادی اور سماجی ترقی اور فرقہ وارانہ اتحاد کو روکنے کے لیے استعمال کرتی تھی۔

ایک عارضی مسئلہ سے گتھ جانا۔ اور اسی کے ساتھ ایک مستقل اور عام مسئلہ کو راج یا سلف گورنمنٹ کا مطالبہ کرنا ایک عجیب بات ہے۔ خلافت شورش کے معاملہ میں۔ کامیابی یا ناکامی ایک فوری معاملہ تھا۔ اور سوراج کے حصول کے لیے خواہ کتنا ہی امید افزا حساب لگایا جائے وقت درکار تھا۔ اول الذکر کے فیصلے نے مسئلہ کو فوراً ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ سوراج کے حصول نے بہت سے لامحدود مسائل کو حل کرنے کا دروازہ کھولا۔

اس میل کا رخ اس جانب تھا۔ کہ دونوں فرقوں کی کوششوں کی مختلف شعاعوں پر ایسا اثر ڈالا جائے کہ ان کے دونوں سرے یکساں خاصیت رکھیں۔ ایک بیرون ملک کے خلافت کے سوال میں بڑی شدت سے الجھا ہوا تھا۔ اور دوسرا تمام ہندوستان کی تقدیر بلا لحاظ ذات عقیدہ پالسی بنانے میں مصروف تھا۔ خلافت والوں کے لیے خلافت کا مسئلہ اولین اہمیت رکھتا تھا۔ اور نیشنلسٹوں کے لیے آزادی کی جدوجہد کا یہ ایک معاون مسئلہ تھا۔

اول کے لیے لڑائی میں شکست ہو گئی لیکن جنگ ختم نہیں ہوئی کیونکہ باوجود اس کے ناکام ہو گئی تحریک نے اس بات کا مظاہرہ کر دیا کہ عوام کے اندر کیسی طاقتیں چھپی ہوئی ہیں جن کو سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ اس نے ان خصائص کی نشو و نما کے لیے ایک بیش بہا، تربیت مہیا کی جو آزادی حاصل کرنے اور اسے قائم رکھنے کے لیے کس درجہ ضروری ہیں یعنی نظام، تادیب اور قربانی۔

دسواں باب

جدید پالیسی کی تلاش

ا۔ نئی ٹیم

منٹو کا دور حکمرانی ۱۹۱۰ میں ختم ہو گیا۔ جانشین کی تلاش ۱۹۰۹ کی ابتدا سے شروع ہو گئی تھی اگرچہ ان کی مدت ملازمت میں دو سال باقی تھے کیونکہ مارلے بے چین ہو رہا تھا شہنشاہ معظم نے وزیر اعظم کو کچنر کا نام پیش کیا لیکن اس کو تھ اور مارلے دونوں کے خیال میں وہ وائسرائے کے عہدے کے لیے نا موزوں تھے جب تک کہ اختلافات موجود تھے کوئی فیصلہ ممکن نہ تھا لیکن شہنشاہ ایڈورڈ کی مئی ۱۹۱۰ میں موت کے بعد کچنر جو اپنی تقرری کے لیے خود ثابت قدمی کے ساتھ کوشش کر رہا تھا اس امکانی موقع سے محروم ہو گیا اور ہارڈنگ جو مستقل نائب وزیر اور دفتر وزیر خارجہ کا افسر اعلی تھا منتخب ہو گیا۔ ان کو لارڈ کا خطاب عطا کر دیا گیا اور ان کا جہاز ۲۲ نومبر ۱۹۱۰ کو سمندر کی لہروں پر ہندستان کی جانب روانہ ہوا۔

قریب قریب(؟) وقت جب ہارڈنگ روانہ ہوا وزیر ہند کے عہدے میں تبدیلی ہوئی۔ بالمورل (BALMORAL) یعنی اس کاتی ٹوپی زیب سر کرنے کے لیے درخواست نہ کیے جانے سے دلگیر ہو کر اور اس خیال کو اپنے دل میں جگہ دے کر کہ ان کی مناسب قدر و منزلت نہیں کی جا رہی ہے مارلے نے وزیر اعظم کو لکھا کہ وہ تھک چکے ہیں اور اب کام کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ ان کو اس کو تھ نے اس طرز کا جواب نہیں دیا جس کی انھیں توقع تھی اور ایک وقفہ گزرنے کے بعد جس میں وہ یہ متوقع تھے کہ ان سے درخواست کی جائے گی انھوں نے اپنی اس خواہش کا اعادہ کیا کہ وہ ریٹائر ہونا چاہتے ہیں ان کی خواہش ان ہی کے قول کے مطابق تسلیم کر لی گئی ہے۔[1]

1- Pope, Hennessy. J. Lord Crewe, P. 86

اس طرح نومبر ۱۹۱۵ء کے پہلے ہفتہ میں کریو (Crewe) نے جو لارڈ پریوی سیل (وزیر خزانہ) اور دارالامرا میں لبرل پارٹی کا لیڈر تھا اس عہدے کا چارج لیا جس پر وہ 7 نومبر ۱۹۱۵ء سے 27 مئی ۱۹۱۵ء تک فائز رہا سوائے 7 مارچ ۱۹۱۱ء سے 25 مارچ ۱۹۱۱ء تک کے ایک مختصر وقفہ کے جب وہ بیمار تھا اور مارلے نے اس کی قائم مقامی کی دارالعوام میں مانٹیگو (۱۹۱۴ء - ۱۹۱۰ء) پارلیمانی انڈر سکریٹری کے عہدے رہے۔

یہ نئی ٹیم (یعنی کریو، وزیر ہند اور ہارڈنگ، وائسرائے) اپنے پیش رو کی طباعی و ذہانت سے محروم تھی۔

ہندستان کے سیاست کی جو تصویر ان کی نگاہوں کے سامنے ان کے خیال کے مطابق تھی وہ غلامانہ وفاداری اور دہشت خیز سازش کا ایک دھوپ چھاؤں کا مجموعہ تھی۔ برطانیہ کا ردعمل توازن قائم کرنے، مراعات سے راضی کرنے اور جبر و استبداد پر عمل کرنے کا ایک معجون مرکب تھا ان کے پیشرؤں نے یہ تسلیم کر لیا تھا کہ ہندستان میں ایک نئی روح پھونکی گئی ہے لیکن اس کی پوری اہمیت و وقعت کو سمجھنے سے وہ قطعی قاصر رہے تھے جب ہندستان کو اپنی تین پہلو والی پالیسی کو پانچ تک آزمانے کے بعد وہ رٹایر ہوئے تو اس وقت حالت یہ تھی کہ خواہ ملک کی سطح بہ ظاہر پرسکون تھی لیکن کوئی چیز قابل توجہ ایسی نہیں کی گئی تھی جس سے ان اقتصادی، سماجی اور سیاسی مصائب میں کوئی کمی آئی ہو جن میں ملک مبتلا تھا۔ اس لیے بے چینی کی موجیں جو تہ کے نیچے رواں تھیں وہ برابر وقتاً فوقتاً سطح پر نمودار ہوتی رہتی تھیں۔

۱۹۰۵ سے ۱۹۰۹ تک ایجی ٹیشن کا جو طوفان ہندستان کے سماج کے سر پہ بہتا رہا تھا اس نے ایک سیاسی دور انقلاب کا آغاز کر دیا تھا۔ طاقتوں کا ایک نیا اجتماع ابھر رہا تھا تعلیم یافتہ اور پیشہ ور لوگوں نے مل کر ایک جماعت بنالی تھی۔ مالکان صنعت و تجار اپنے مفاد کے پیش نظر ان کے ساتھ شریک ہو گئے۔ یہ لوگ اس بات کے لیے مضطرب تھے کہ وہ برطانوی اجارہ داردں اور ملوکیت پرستانہ لوٹ کھسوٹ کرنے والوں کو جو بیرونی تجارت اور اندرون ملک کے بازار کے معاملات میں جوڑ توڑ کرتے تھے اکھاڑ کر ان کی جگہ لے لیں۔ یہ لوگ سیاست میں سودیشی اور بائیکاٹ کی تحریکات سے متاثر تھے۔ روایاتی ثقافتی جماعتیں جو احیا جدید کی مبلغ تھیں یعنی ہندؤں میں پنڈت اور مسلمانوں میں علما: ان لوگوں نے آزادی کی تحریک میں دلچسپی لینا شروع کیا کیونکہ اس کا مقصد قومی تعلیم کے ذریعہ سے ہندستانی کلچر کا فروغ اور ہندستان کی طرز زندگی اور سماج پر سے بیرونی غلبہ کو اکھاڑ پھینکنا تھا

آخر میں محنت کش طبقہ یعنی مزدور، کسان اور کاریگر بھی اس تحریک میں کھنچ کر آنے لگے کیونکہ اس نے یہ امید دلائی تھی کہ نوآبادیاتی اقتصادی لوٹ کھسوٹ کو یہ ختم کر دے گی۔

کریو (CREWE) اور ہارڈنگ (HORDING) کو اپنے پیشروؤں سے ایک مشکل اور پیچیدہ مسئلہ وراثت میں ملا تھا۔ کرزن نے یہ کوشش کی تھی کہ شاہانہ پالیسیوں کی کارروائیوں میں ہندستان کو ایک آلہ کے طور پر استعمال کرے اس مقصد کی تکمیل کے لیے وہ چاہتے تھے کہ قومی جماعت کی نشو و نما کا گلا گھونٹ دیں کیوں کہ اس کے مطالبات کا گورنمنٹ کی خود مختار مشنری کی قرار واقعی کارروائیوں سے تصادم تھا اسی لیے انھوں نے ایک ایسے صوبہ کو بنا کر جس پر مسلمانوں کی اکثریت کا غلبہ تھا۔ یہ کوشش کی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں باہمی رقابت خوب زور پکڑ جائے اور ان بنگالیوں کی جماعت کے جو کانگرسی ذہنیت رکھتے تھے مد مقابل ایک ہم پلہ جماعت بن جائے اور اسی لیے انھوں نے قوم پرستوں کے اصلاحات کے عزائم کو ناقابل قیاس قرار دے کر خارج از بحث قرار دے دیا۔

مارلے اور منٹو کرزن کی نسبت زیادہ غیر مکدر تھے یہ لوگ اس شاہانہ پالیسی سے تو مجموعی طور پر اتفاق کرتے تھے لیکن اس کے حصول کے ذرائع میں اختلاف رکھتے ان لوگوں نے تین منہ والا پلان مسائل کے حل کے لیے تجویز کیا لیکن پلان صرف جزوی حد تک کامیاب رہا۔ اس کی خاص کامیابی یہ تھی کہ اس نے مسلمانوں میں فرقہ وارانہ جذبات کو شدید تر کر دیا تھا اور ان میں یہ خیال بھر دیا کہ وہ ایک قوم ہیں بٹلر جو وائسرائے کی اگزیکیٹو کونسل کا ایک ممبر تھا اس نے ہارڈنگ کے بہ طور وائسرائے چارج لیتے ہی وقت 25 نومبر 1910 کو ایک خط لکھا جس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی نفرت کے وجود کی تصدیق کی۔ ان کے الفاظ یہ ہیں میرے پورے تجربہ میں کبھی بھی شمالی ہند کے اندر ہندو مسلم تفریق کے خیالات اتنے گہرے نہیں تھے جتنے کہ اب ہیں۔ وہاں کے لوگوں نے دونوں فرقوں کے لیے اب علیحدہ علیحدہ عدالتوں علیحدہ اسکولوں وغیرہ کا مطالبہ کرنا شروع کر دیا ہے کیوں کہ ہندو کہتا ہے کہ مسلمانوں کو بہت زیادہ مل گیا ہے ہم کو اس میں سے جزو واپس ملنا چاہیے[2]

وحدت قومی کا تخیل کمزور ہو گیا اور اس کی جگہ ایک ایسے سماج کے تخیل نے لے لی جس میں مختلف کلچر مختلف مراکز ہوں اسی نے آگے چل کر دو قومی نظریہ کا روپ اختیار کیا اور انجام یہ ہوا کہ دو با اقتدار حکومتیں قائم ہوئیں۔

2- Harding Papers. Vol. 81 (Nehru Memorial Museum and Library. Microfi).

لیکن جس طرح آقلیت میں فرقہ وارانہ جذبات شدید سے شدید تر ہو گیے اسی طرح اکثریت میں تلخی اور مایوسی بڑھتی گئی اور اسی نے انتہا پسندی کو جنم دیا۔جب اس کا علی الاعلان اظہار جبر یہ قوانین اور نظم ونسق کی مستبدانہ کارروائیوں سے روکا گیا تو بجائے اس کے کہ اس کا وجود ختم ہو جاتا یہ انڈر گراونڈ چلا گیا اور اپنے کو وسیع سازش اور دہشت پسندی کے رنگ میں ملک کے اندر اور انقلابی تحریکات کی مشکل میں ملک کے باہر اپنے کو ظاہر کیا۔یہ دونوں ایک مشترک دشمن کے خلاف آپس میں ملے جلے تھے۔

گورنمنٹ نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1909 بنا کر جو رعایت اپنی سمجھ میں دی تھی وہ اپنے مقصد حاصل کرنے میں ناکام رہی۔انتہا پسندوں نے تو فوراً اسے کلیتہً رد کر دیا۔اور معتدلین جو شروع میں اسے موافق تھے آخر میں انھوں نے بھی اس کو ناقابل اطمینان قرار دیا۔یہ ایکٹ بے چینی کو دور تو کیا کرتا اس نے باشندگان ملک اور حکومت کے درمیان کی خلیج کو وسیع تر کر دیا۔

جبر و استبداد کی پالیسی کے دو اثرات ہوتے۔انتہا پسندوں کو سیاست کے میدان سے ہٹانے کا یہ انجام تو ہوا کہ بہ ظاہر عارضی طور پر خاموشی چھا گئی لیکن اس نے دہشت پسندانہ کارروائیوں کو اکسا دیا۔کریو اور ہارڈنگ کو کئی ایک مشکل مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔مسلمان جن کی حمایت پر گورنمنٹ نے بھروسہ کیا تھا وہ بے اطمینانی ظاہر کرنے لگے۔برطانیہ اور اس کے حلیف فرانس اور روس کی خارجہ حکمت نے ان کو غصہ دلا دیا تھا اور برطانیہ کے رقیب جرمنی کے مسلمانوں کے موافق اعلانات سے وہ خوش ہو گیے تھے۔ترکی کے مالی اسلامک پروپیگنڈا نے ان کے جوش کو بھڑکا دیا تھا۔نتیجہ یہ تھا کہ برطانیہ کے بارے میں ہندستان کے مسلمانوں کا رویہ بدلنے لگا۔

اس کے بعد مارلے اور منٹو نے جو محل تعمیر کیا تھا اس میں شگاف نظر آنے لگے۔کریو جو اسکوتھ کا معتمد نائب تھا وہ جانتا تھا کہ مسلمانوں کے ساتھ ان کو راضی کرنے کے خیال سے مزید مراعات دینا ممکن نہیں ہے کیوں کہ برطانیہ کے تعلقات سلطان ترکی سے، جو مسلمانوں کے مقدس خلیفہ تھے بہت خراب اور جو جنگ جرمنی ملوکیت سے متوقع تھی۔اس میں ترکی کے متعلق یہ خیال تھا کہ وہ دشمن کے ساتھ مل کر لڑے گی۔لیکن اسی کے ساتھ یہ بات بھی خلاف مصلحت تھی کہ مسلمانوں کے جذبات کو بالکل مخالف بنا دیا جائے اور خاص کر اس وجہ سے کہ یہ ممکن تھا کہ ہندستان کی فوج کے مسلم سپاہیوں کو ان کے ہم مذہبوں۔یعنی ترکی۔کے خلاف لڑانے کی ضرورت پڑے۔

دوسری جانب اکثریتی فرقہ مستقل مخالفت میں مبتلا تھا جو نامناسب بات تھی۔بنگال کی تقسیم

نے ہندوؤں کو غصہ سے پاگل کر دیا۔ نیشنلسٹوں کے خلاف جو جبر و استبداد کی پالیسی اختیار کی گئی اور اسی کے ساتھ اقلیتی فرقہ کو جو رعایتیں دی گئیں ان دونوں نے آگ پر ایندھن ڈالنے کا کام دیا تھا جب تک کہ ان کی تالیف قلب کر کے ان کو ٹھنڈا نہ کیا جائے دہشت پسندوں کی تشدد آمیز کارروائیوں اور وحشیانہ جبر و استبداد کا گھن چکر ختم ہوتے نظر نہیں آتا تھا۔ لیکن تنہا تقسیم وجہ شکایت نہ تھی دراصل اس نے گورنمنٹ کی جانب سے ہندوستان کی رائے عامہ کو نظر انداز کرنے کا بنیادی مسئلہ کو منظر عام پر لاکر نمایاں کر دیا تھا۔ اصل عقدہ یہ تھا کہ آیا انڈیا گورنمنٹ ہندوستان کی رائے عامہ پر کان دھرے گی یا نہیں۔

کریو اور ہارڈنگ پر یہ ذمہ داری آن پڑی تھی کہ وہ ایسی پالیسیاں بنائیں جو ہندوؤں کے مشتعل جذبات کو ٹھنڈا کر سکیں اور اسی کے ساتھ ساتھ ان سے مسلمان بھی مخالف نہ بن جائیں اور ذمہ داری منتقل کرنے کا جو مطالبہ نیشنلسٹوں نے بطور چیلنج پیش کیا ہے اس کا صحیح حل سامنے لائیں

II تقسیم پر نظر ثانی

فساد انگیز گھن چکر تقسیم بنگال سے شروع ہوا تھا لیکن مارلے اور منٹو نے بار بار سوال کو از سر نو وا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ پھر بھی اگرچہ مارلے نے بر سر عام یہ اعلان کر دیا تھا کہ تقسیم ایک قطعی طے شدہ مسئلہ ہے لیکن اپنی یہ رائے بھی خفیہ نہیں رکھی تھی کہ کرزن نے جو قانون وضع کیا تھا اسے نہ وہ پسند کرتے ہیں۔ منٹو نے سوریندر ناتھ بنرجی سے کہا تھا کہ "اگر میرا ملک اس طرح تقسیم کر دیا جاتا جس طرح آپ کا صوبہ کیا گیا ہے تو میرے جذبات و احساسات ویسے ہی ہوتے جیسے آپ کے ہیں" 3/

کریو نے بحث کو وا کرنے کے لیے پیش قدمی کی۔ انھوں نے ہارڈنگ کو لکھا "جب میں گزشتہ دوشنبہ 22 جنوری کو ملا اور ہم لوگوں نے مختلف امور پر بحث کی جن کے بارے میں آپ کو تار سے خبر دے چکا ہوں تو ہم لوگوں نے بنگال کے سوال کو کچھ ایسی تمہید کے ساتھ اٹھایا جس سے ممکن ہے کہ میں ان کو بالکل غلطی پر سمجھوں مگر اور تمام باتوں کے ماسوا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس بات کا تہیہ کر چکے ہیں کہ کوئی ایسی بات، کسی حد تک، کریں جو اس طبقہ کی رائے کو مطمئن کر سکے جو تقسیم کو غلط

3- Banerjee Surendranath, 'A Nation in Making (1931) P.283

خیال کرتا ہے"/4

کریو نے مشرقی صوبوں کی از سر نو تقسیم کی تجویز کو پیش کیا تاکہ جس نئے بنگال کی تشکیل ہو اس کو بمبئی اور مدراس کی طرح گورنر کا صوبہ قرار دیا جائے اور اس کا دارالسلطنت بدل دیا جائے۔

ہارڈنگ نے کریو کو جواب دیتے ہوئے تقسیم کو منسوخ کرنے کی تجویز کو رد کر دیا ان کی دلیل یہ تھی کہ اب سوال میں کوئی واقعی عوامی دلچسپی یا جوش نہیں رہ گیا ہے اور معاملہ مردہ ہو چلا ہے اور مسلمانوں کے ساتھ وعدہ خلافی ہوگی جو اسے ہندوؤں کی فتح اور تمام ہندستان میں اپنے اوپر ایک کاری ضرب خیال کریں گے۔ وہ اس بات کے لیے تیار نہ تھے کہ کرزن جو اصول عمل ہیں۔ لہٰذا اس کے پہلے کی حالت پر لوٹ جائیں۔ اور وہ یہ بھی پسند نہیں کرتے تھے کہ بنگال کی حیثیت میں تبدیلی کی جائے اور آسام، بہار، اوڑیسہ اور کلکتہ کے انتظامات میں رد و بدل کیا جائے۔ انھوں نے کریو کو مشورہ دیا کہ وہ اس خیال کو ترک کر دیں اور آخر میں لکھا کہ "جن پریشانیوں کا سر دست سامنا ہے میں ان کو برداشت کرنا اس سے بہتر سمجھتا ہوں کہ نئی پریشانیوں کو دعوت دوں جن کا ہم کو علم نہیں ہے"/5

انھوں نے شہنشاہ معظم کے پرائیویٹ سکریٹری کو اس بات کی نشان دہی کی کہ موجودہ پالیسی کو الٹ دینے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندستان میں یہ تصور عام ہو جائے گا کہ شور و غل سے دب کر مراعات دی گئی ہیں۔ اور اور ہندستان کے وفادار طبقہ کو ضرب کاری لگے گی۔/6

لیکن مشکل سے چھ ماہ گزرے تھے کہ ہارڈنگ نے اپنی رائے بدل دی۔ انھوں نے لکھا کہ "مجھے اب اس بات پر یقین دلایا گیا ہے کہ اگر دونوں بنگال میں امن و امان قایم ہونا ہے تو اس کے لیے یہ سخت ضروری ہے کہ کوئی ایسا عمل کیا جائے جس سے وہ خیال رفع ہو سکے جو تمام بنگالیوں کے دماغوں میں قایم ہو چکا ہے کہ ایک کھلم کھلا ناانصافی بلا کسی وجہ معقول کے کی گئی ہے اگر کچھ نہ کیا گیا تو جن پریشانیوں سے ہم اب تک گزرے ہیں ان سے زیادہ پریشانیوں کے لیے ہم کو تیار رہنا چاہیے۔ یہ میری کونسل کے ممبر سر جان جیکسن SIR JOHN JEKSIN تھے جنھوں نے اپنے خط مورخہ 17 جون 1911 میں جو مجھے لکھا تھا کہ ایک ...

4- Hardinge Papers, Crewe to Hardinge, 27 January 1911.

5- Ibid, Hardinge to Crewe, 22 February 1911.

6- Ibid, Hardinge to Sir A. Bigge, 28 February, 1911.

بھیجا جس نے اپنی رائے کو ڈھال کر ایک واضح پالیسی پر استوار کر دیا"/7

وزیر ہند کو ایک مراسلہ میں انھوں نے دو تجاویز پر زور دے کر انھیں پیش کیا اور دونوں کو ایک دوسرے سے الگ قرار دیا تھا۔ پہلی تجویز یہ تھی کہ کلکتہ کی جغرافیائی حالت کے پیش نظر ایک صوبہ کے دارالسلطنت اور کل ہندستان کے دارالسلطنت کے ایک ہی جگہ ہونے کی نامناسبت کے پیش نظر اور ایکٹ ۱۹۰۹ء نے جو آئینی تبدیلیاں کی ہیں ان کے مطالبات کے نتائج کے طور پر یہ ضروری ہے کہ ہندستان کا دارالسلطنت کلکتہ سے ہٹا کر کسی دوسرے مرکزی مقام پر رکھا جائے جہاں لوگ آسانی سے پہنچ سکیں۔ اپنی گزشتہ تاریخی روایات کے ماتحت دِلّی دارالسلطنت ہند ہونے کے لیے سب سے زیادہ موزوں مقام معلوم ہوتا ہے۔

لیکن دارالسلطنت کی تبدیلی میں کئی دوسرے مسائل اُبھرتے تھے جو بعض فوری بھی تھے اور بعض آئندہ آنے والے تھے۔ فوری مسئلہ یہ تھا کہ جذبات کی اس تلخی کو دور کیا جائے جو تقسیم بنگال نے پیدا کی تھی کیونکہ یہ ممکن تھا کہ دارالسلطنت بدل دینے سے یہ جذبات اور بھی برانگیختہ ہو جائیں اور اگر ۱۹۰۵ء کے نظم ونسق کے آئین میں ترمیم کی جائے تو نظم ونسق کی سہولتوں اور مسلمانوں کے جذبات کا بھی خیال رکھنا ہوگا۔ ہارڈنگ کی تجاویز حسب ذیل تھیں۔

(۱) بنگالی زبان بولنے والوں کی کمشنریوں کو از سر نو متحد کر کے ایک صوبہ گورنر ان کونسل کے زیر انتظام بنایا جائے۔

(2) بہار، اڑیسہ اور چھوٹا ناگپور کو ملا کر لفٹیننٹ گورنر کی ماتحتی میں ایک الگ صوبہ قرار دیا جائے۔

(3) آسام کی چیف کمشنری کو پھر بحال کیا جائے۔

(۴) دِلّی کو آئندہ کے لیے ہندستان کا دارالسلطنت قرار دیا جائے۔

ان کو امید تھی کہ بنگال کی تشکیل جدید سے دو نتائج حاصل ہوں۔ سیاسی بےچینی دفع ہو جائے گی اور ہندو مسلم کشیدگی کا مداوا ہوگا دِلّی کو جدید دارالسلطنت بنانے سے جو سیاسی فوائد حاصل ہوں گے ان کے اندازہ کرنے میں مبالغہ ناممکن ہے۔

---

7. Lord Hardinge, My Indian Years, 1910-16, PP 36.40

8. Home Department Proceedings Delhi, A. December 1911, Nos 8-11
Governer General to secretary of state For India 25th August 1911.

کریو نے اپنے جواب میں گورنر جنرل کی تجویز کو اپنی عام رضامندی دے دی۔ چونکہ شہنشاہ معظم کی یہ عظیم خواہش تھی کہ ہندستان میں تاج سلطانی زیب سر کریں اس لیے یہ فیصلہ کیا گیا کہ دلی دربار وہ مناسب موقع ہوگا جس میں سلطان خود ان تبدیلیوں کا بہ نفس نفیس اعلان فرما دیں۔

12 دسمبر 1911 کو تاج پوشی کی رسم دلی میں منعقد کی گئی اور دارالسلطنت کی تبدیلی اور صوبوں کی جدید تقسیم کا باضابطہ اعلان کیا گیا فروری پارلیمانی قوانین 1912 میں وضع کیے گئے۔

اس اصلی حالت پر غور کرنے کا اثر عارضی رہا بس تھوڑی مدت کے لیے پبلک کے ایجیٹیشن کی گھن گرج کی آواز مدھم ہوگئی۔ مسلمانوں نے حد سے زیادہ ناراضگی کا اظہار نہیں کیا کیوں کہ بہر حال بنگال کے نئے صوبہ میں مسلمان ایک اکثریت کی حیثیت رکھتے تھے اگرچہ ان کی تعداد میں کمی ہوگئی تھی۔[10] ہارڈنگ بذات خود جنوری 1912 میں یہ اندازہ لگانے کے لیے ڈھاکہ گئے تاکہ دیکھیں کہ تقسیم بنگال کے رد کرنے پر مسلمانوں کا کیا رد عمل ہے انھوں نے بمبئی کے گورنر کو لکھا "اس میں کسی شک و شبہہ کی گنجائش ممکن نہیں ہے کہ تقسیم بنگال کی ترمیم بنگال میں نہایت مقبول عام ہوئی ہے .... میرا خیال ہے کہ وہ لوگ (یعنی مسلمان) اب پوری طرح راضی ہو چکے ہیں اور میں ان کو چھوڑ کر جب چلا ہوں تو وہ بہت خوش اور مکمل طور پر مطمئن تھے۔"[11]

لیکن سیاسی حالت میں سدھار کی جھلک محض ظاہری تھی کیوں کہ دلی دربار میں یہ بانگ دہل گھن گرج کے ساتھ جن کارروائیوں کا اعلان کیا گیا تھا وہ اس بے چینی کے گہرے اسباب کو چھوتا بھی نہیں تھا جو سطح کے نیچے برقرار تھے اور چونکہ نئے قوانین نے پریس پر اور بھی زیادہ پابندیاں عائد کر دی تھیں۔ جن سے اظہار رائے کا گلا گھونٹ دیا گیا تھا اس لیے اصلی وحقیقی شکایت کا کوئی ازالہ نہیں ہوا تھا۔

9: Ibid, Crewe to Hardinge, 1st November 1911.

10- The Census of 1921 gives the following Statistics

Bengal ——	Hindu	20.2	Muslims	25.2
Assam ——	"	4.1	"	2.2
Bihar, Orissa & Chhota Nagpur	"	28.2	"	3.7

11- Hardinge Papers, Governer General to the Governer of the Bombay, No 65, Dated 1/2 February, 1912.

اب تقسیم کا مرحلہ راستہ سے ہٹ گیا تھا لیکن دوسرے اور زیادہ بنیادی مسائل حل کرنے کے لیے باقی تھے کیونکہ یہ ایک ظاہر بات تھی کہ صرف بنگال کی وحدت کو برقرار کر دینے یا بھاری ہاتھوں سے سخت جبر و تشدد کے ضربات لگانے سے ہی تو خفیہ تشدد کی کارروائیوں پر مؤثر قابو نہیں پایا جا سکتا تھا۔ تحریک وسیع علاقوں میں پھیل گئی تھی اور اس نے دلوں میں جگہ بنالی تھی۔ یہ صرف قانون اور امن کا مسئلہ نہیں تھا اس کو سیاسی سطح پر بھی حل کرنے کی ضرورت تھی۔

III میثاق لکھنؤ

گورنمنٹ کا رویہ صرف حالات کے تجزیے سے سمجھ میں آسکتا ہے۔

جب 1909ء کے ایکٹ کا نفاذ ہوا تو مختلف سیاسی پارٹیوں نے اس پر مختلف ردعمل کیا اظہار کیا کچھ لوگوں نے یہ طے کیا کہ ریفارم جیسے بھی ہوں ان پر کام کیا جائے اور دوسرے لوگوں نے اس کو قطعی رد کر دیا۔

1907ء میں کانگرس کے اندر جو پھوٹ پڑ گئی تھی وہ اس تبدیلی کی نشان دہی کرتی تھی جو سیاست کے جسم میں رفتہ رفتہ داخل ہو رہی تھی تشدد اور غصہ جو خلاف تقسیم ایجیٹیشن کا طرۂ امتیاز رہا تھا ظاہر کرتا تھا کہ گداگری کے پرانے طریقہ میں اب کوشش باقی نہ تھی اور سیاسی تحریک کا جو جدید مکتبہ فکر وجود میں آیا اس کو ان طریقوں سے کوئی واسطہ نہ ہوگا مسلمانوں کے اندر بھی اسی طرح کے خیالات کی نشو و نما ہوئی۔

لیکن اگر حکمرانوں کا یہ خیال تھا کہ مارلے اور منٹو نے جس پالیسی کو اختیار کیا تھا وہ ان حالات کو واپس لے آئے گی جو 1905ء سے قبل تھے تو وہ افسوس ناک غلطی میں مبتلا تھے۔ مارلے کے نظم و نسق کے اصول میں جو معتدل قسم کی آزادی کی جھلک تھی جس میں حقیقی طور میں ذمہ داری کو منتقل کرنے کا کوئی وجود نہ تھا اس نے معتدلین کی آنکھوں کو صرف کچھ عرصہ کے لیے چکا چوند کر دیا مارلے کے جادو کے تحت ان لوگوں نے انتہا پسندوں کو کانگرس سے نکال دیا اور آئندہ آٹھ سال تک یہ لوگ تنہا کانگرس پر اقتدار قایم کیے رہے۔

جب 17 دسمبر 1908ء کو مارلے نے اصلاحات کا مسودۂ قانون دارالامرا میں پیش کیا تو معتدلین نے راش بہاری گھوش گو کھلے سوریندر ناتھ بنرجی فیروز شاہ وغیرہ کی قیادت میں جو اس سے قبل ہی مدراس کے کانگرس اجلاس میں جمع ہوئے تھے۔ اس بل کی مدح میں رجز خوانی کی اور اس کے مصنف کے لیے حمد و ثنا کے نعرے لگائے۔ 25 مئی 1909ء مسودۂ قانون نے زمانہ حمل کی طویل مدت کو ختم کیا اور قانون بن گیا۔

لیکن جب معتدلین نے اس کو اپنی اصلی شکل میں اور کے تحت بنے ہوئے ضوابط کو دیکھا تو ان کو اپنے خیالات پر از سر نو غور کرنا پڑا۔ مالوی نے دسمبر 1909ء میں لاہور کے کانگرس سشن کی صدارت کرتے ہوئے اس کی محض سطحی تعریف کرتے ہوئے اسے گویا ناکارہ قرار دے دیا اور نہایت تلخی کے ساتھ ان واقعات کی مذمت کی جو مسلمانوں کی نمائندگی کے بارے میں تھے اور یہ اعتراض کیا کہ ان سے ہندوؤں کے ساتھ ناانصافی بالکل ظاہر ہے۔

ان اصلاحات پر جس حد تک وہ عمل در آمد کر تے گیے اسی حد تک وہ کم سے کم قابل اطمینان ثابت ہوتے گیے۔ مارلے اور منٹو نے ہندستان کو ایک کھلونا کھیلنے کے لیے دیا تھا کوئی ایسی آواز نہیں دی تھی جو کسی عمل کے لیے استعمال کی جا سکتی۔

1909ء میں کانگرس نے اپنا یہ فرض سمجھا کہ مذہب کی بنیاد پر جو جداگانہ انتخاب ایجاد کیا گیا ہے اس کی انتہائی مذمت کو ضبط تحریر میں لائے۔ اس نے اس پر اظہار افسوس کیا کہ مسلمانوں کو تعداد میں حد سے زیادہ اور اسی کے ساتھ انتہائی مؤثر نمائندگی دی گئی ہے جو انصاف پر مبنی ہے۔ مسلمانوں اور غیر مسلموں میں خلاف عدل و انصاف، ناگوار اور ذلت خیز امتیاز انتخاب، حق رائے دہندگی اور اصول رائے دہندگی میں برتا گیا ہے۔ اور تعلیم یافتہ طبقہ پر جو بے اطمینانی ظاہر کی گئی ہے۔ اس کی مذمت کی

اس نے ان خرابیوں کی جانب بھی توجہ دلائی جو صوبائی کونسلوں کی تشکیل قانون کے سلسلہ میں کی گئی تھیں۔ دوسرے سال الہ آباد میں ان اعتراضات کا اعادہ کیا گیا۔ اگرچہ لہجہ معتدل تھا۔ کانگرس کے صدر وڈربرن (WEDDERBURN) نے کانگرس اور مسلم لیگ میں مصالحت کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔

1911ء میں کانگرس کا اجلاس کلکتہ میں ہوا جس کے صدر بشن نرائن دھر تھے۔ تقسیم بنگال کی تنسیخ کے اعلان پر کانگرس نے گورنمنٹ کا شکریہ ادا کیا۔ لیکن جداگانہ انتخاب پر جو ریزولیوشن منظور ہوا تھا اسی کا پھر اعادہ کیا گیا۔

اس کے دوسرے سال کانگرس نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1909ء پر نظر ثانی کا مطالبہ کیا۔ اور اس امر کی مذمت کی کہ جداگانہ فرقہ وارانہ انتخاب کے اصول کو اور وسیع کر کے اسے لوکل باڈیز پر بھی لاگو کر دیا گیا ہے۔

1912ء کے کانگرس کے اجلاس منعقدہ بانکی پور (پٹنہ) کا ایک خوشنما پہلو یہ تھا کہ مسلمان اس میں کثرت سے شریک ہوئے۔

1913ء میں کانگرس نے اس امر پر اپنی پرجوش مدح و ستائش کا اظہار کیا کہ مسلم لیگ نے اپنے اغراض و مقاصد میں تبدیلی کر دی تھی اور لیگ کی اس تجویز کا خیر مقدم کیا کہ قومی مفاد کے سوالات میں ایک متفقہ کارروائی کا طریق کار تلاش کیا جائے۔

دوسرے سال کانگرس کا اجلاس عالمگیر جنگ کے شروع ہونے کے بعد 4 اگست 1914ء کو ہوا۔ اس اجلاس میں کانگرس نے تخت برطانیہ سے اپنی انتہائی عقیدت، برطانیہ کے تعلقات سے ناقابل لغزش وفاداری، اور اس عزم کا اظہار کیا کہ ہر حالت میں اور ہر قیمت پر مملکت برطانیہ کے ساتھ رہیں گے کانگرس نے گورنمنٹ سے اپیل کی کہ باشندگان ہند کی جانب سے جس وفاداری کا اظہار ہو رہا ہے اس کے پیش نظر حکومت ایسے قوانین وضع کرے جو ہندستان کو ایک وفاقی امپائر کے ایک عضو کی حیثیت سے تسلیم کرنے کے لیے ضروری ہوں اور جس کی رو سے وہ ان حقوق سے جو اس ملک ہندستان کو حاصل ہیں۔ آزادی کے ساتھ اور مکمل طور پر متمتع ہو سکے۔

اس سال کے کانگرس کے صدر بھوپندر ناتھ باسو نے کہا کہ "دنیا اوپر کھینچنے والی رسیوں سے بلندی کی طرف قدم اٹھا رہی ہے .... قوموں کی یہ باہمی جنگ ازمنہ وسطی کے ان تمام غلبوں کو ختم کر دیگی جو ایک انسان کو بہت سے انسانوں پر اور ایک نسل کو دوسری نسل پر حاصل رہے ہیں —— وسیع تر زندگی کا جو چشمہ بہہ رہا ہے اس کی لہروں کو کوئی پیچھے ڈھکیل نہیں سکتا .... مشرق کے ساکن پانی میں .... ہندستان چاہتا ہے کہ اس کی گورنمنٹ اس کی ترقی یافتہ خود داری اور تعلیم یافتگی سے مطابقت کرے .... ہندستان چاہتا ہے کہ اس کی گورنمنٹ برطانوی حکومت کے زیر سایہ ایک خود مختار گورنمنٹ ہو۔/12

سب سے بڑی رکاوٹ آئینی اصلاحات کے آگے بڑھنے میں فرقہ وارانہ اختلافات تھے کراچی کے کانگرس اجلاس منعقدہ 1913ء میں اس بات کی کوشش کا آغاز کیا گیا تھا کہ ہندستان کی سیاسی منزل کے مسئلہ پر مسلم لیگ اور کانگرس متفق ہو جائیں 1915ء میں بمبئی کے مقام پر جو اجلاس ہوا وہاں اس مقصد کے حصول میں کافی ترقی ہوئی۔

ستیندر پر اسنا سنہا جنھوں نے اس سال کے اجلاس کی صدارت کی انھوں نے حاضرین جلسہ سے کہا

---

12 – Congress Presidential Addresses (2nd Edition, Second Series 1934) PP 167-71, Nelsan (1934)

"ہندستان جس قسم کی سلف گورنمنٹ چاہتا ہے وہ اس سے کم نہیں ہو سکتی جو صدر لنکن نے کہا تھا" اس قسم کی گورنمنٹ جو عوام کی گورنمنٹ ہو عوام کے مفاد کے لیے ہو اور عوام کی طرف سے ہو" انھوں نے پرجوش الفاظ میں برطانوی حکمرانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ "اس کو خوب سمجھ لینا چاہیے کہ جس طرح ماضی میں برطانیہ کا کارنامہ عظیم رہا ہے اسی طرح ان کو مستقبل میں بھی ایک پرشوکت کام یہ کرنا ہے کہ عوام کی خود مختار حکومت سیاسی کی جانب وہ ہمت افزائی اور رہنمائی کرے جس منزل پر ہندستان کو پہنچنا ہے وہ ابھی دور ہے ۔ چاہیے کہ ہندستان کو ایک سچا دوست سمجھا جائے نہ کہ ایک ماتحت دارامانت، میں برطانوی قوم سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ بلا جھجک خود مختار حکومت بزیر سایہ مملکت برطانیہ کی منزل پر اپنی منزل دیں' اس طرح کا اعلان سب سے زیادہ نمایاں طریقہ ہندستان کی خدمت اور قربانیوں کے اعزاز کے بارے میں ہوگا"/ 13

ادھر اس دوران میں مسلمان اپنی پرانی قیادت اور حکمرانوں پر بھروسہ کرنے کی پالیسی کو ترک کر رہے تھے'1913 میں وہ جناح اور محمد علی کی متحرک اور قوت آفریں اثر کے نیچے آئے اور وہ اپنے پرانے عقیدے سے دست بردار ہو گیے اور انھوں نے یہ تسلیم کر لیا کہ ہندستان کی منزل مقصود ایک ایسی سلف گورنمنٹ کا قیام ہے جو اس کے حالات کے مطابق ہو لیگ نے یہ طے کیا کہ وہ کانگرس سے ہندستان کی آئندہ گورنمنٹ کی اسکیم بنانے کے معاملہ گفت وشنید کرے۔

اس کوشش میں اور دوسری قوتیں بھی شامل ہو گئیں ۔جنگ نے ایک جدید حرکت پیدا کر دی تھی۔ جس نے مشرق اور مغرب کو ہلا ڈالا تھا مسز اینی بیسنٹ جنھوں نے اب تک اپنی توانائی مذہب کے معاملات میں صرف کی تھی۔ اب سیاست کے میدان میں داخل ہو گئیں انھوں نے پہلے ہفتہ وار اخبار کامن ویلتھ نام کا جنوری 1914 میں جاری کیا اور چند ماہ بعد روز نامہ 'نیو انڈیا' نکالا ۔ اپنے مخصوص جوش و جذبہ کے ساتھ انھوں نے خود کو آزادی کی جد وجہد کے دھارے میں ڈال دیا۔

پہلے تو انھوں نے کانگرس کے دونوں گروہوں کو ایک کرنے کی کوشش کی لیکن وہ اس میں ناکامیاب رہیں، اس کے بعد 1915 میں انھوں نے ایک کتاب لکھ کر شائع کی جس کا نام India a Nation ہندستان ایک قوم تھا اور اس کے بعد پے در پے مضامین How India wrought for Freedom اکس طرح ہندستان میں آزادی کے لیے جدوجہد ہے، کے عنوان سے لکھے۔ انھوں نے

13- Ibid. P. 200

ہوم رول لیگ کی بنیاد رکھی۔

اسی وقت تلک نے جو 1914ء میں مانڈلے جیل سے رہا ہو گئے تھے پونا میں ہوم رول لیگ کو شروع کیا۔ تلک جو ردعمل کی صلاحیت رکھنے والے تعاون کے قائل تھے اور اینی بیسنٹ جو سیاست میں ایک انتہا پسند کی حیثیت رکھتی تھیں۔ دونوں نے اپنی قوتوں کو اس لیے مجتمع کیا کہ ملک کو اس خواب غفلت سے بیدار کریں جس میں وہ گزشتہ دہ سالہ میں مبتلا ہو گیا تھا۔

1916ء میں معتدلین اور انتہا پسند اور ان کے علاوہ ہوم رول لیگ والے اور مسلم لیگی بھی سب کے سب آپس میں مل گیے اور اتفاق رائے سے اس معاہدہ کو مرتب کیا جو میثاق لکھنو کے نام سے موسوم ہے اس کی خاص تجاویز حسب ذیل تھیں۔

(1) صوبائی کونسلوں میں مسلمانوں کے لیے مخصوص یا جداگانہ فہرست رائے دہندگان حسب ذیل تناسب کے ساتھ۔

پنجاب 50% فیصدی۔ صوبہ ممالک متحدہ 30% فیصدی۔ بنگال 40% فیصدی۔ بہار 25% فیصدی۔ صوبہ متوسط 15% فیصدی۔ مدراس 15% فیصدی۔ بمبئی 33 1/3% فیصدی۔

(2) امپیریل کونسل میں 150 ممبر ہوں گے جن میں 120 کو غیر سرکاری ہونا چاہیے اور منتخب شدہ مسلم ممبران کی تعداد ایک تہائی ہونی چاہیے۔

(3) کوئی مسودۂ قانون یا کسی مسودۂ قانون کی کوئی دفعہ یا کوئی ریزولیوشن، جو کوئی غیر سرکاری ممبر کی جانب سے پیش ہو اور جس میں کسی ایک یا کسی دوسرے فرقہ پر اثر پڑتا ہو اس پر کوئی کارروائی نہ ہوگی۔ اگر اس فرقہ کی تین چوتھائی تعداد اس مسودۂ قانون، یا اس کی کسی دفعہ، یا ریزولیوشن کی مخالف ہو خواہ یہ معاملہ صوبائی کونسل کا ہو یا امپیریل کونسل کا۔

(4) دفاع، خارجہ اور سیاسی معاملات۔ خواہ جنگ، صلح اور معاہدے امپیریل کونسل کے حق اختیار سے باہر ہوں گے۔

کانگرس کی جانب سے تسلیم ہو جانے کی وجہ جداگانہ انتخاب اور فرقہ وارانہ تناسب دونوں ایسے اہم فیصلے ہو گیے تھے جنھوں نے باشندگان ملک کے معاملات اور گورنمنٹ کے پلان دونوں پر گہرا اثر ڈالا۔

میثاق لکھنو۔ سلف گورنمنٹ کے ریزولیوشن کی بنیاد تھا۔ متحدہ کانگرس نے ایک آواز ہو کر گورنمنٹ سے کہا کہ "یہ اکانگرس اپنی رائے رکھتی ہے کہ وقت آگیا ہے کہ ہز مجسٹی شہنشاہ معظم از راہ

مہربانی ایک باضابطہ اعلان جاری کردیں جس میں یہ صاف صاف اظہار کردیا جائے کہ برطانیہ کی پالیسی کا منشا یہ ہے کہ ہندستان کو ایک تدریجی تاریخ میں سلف گورنمنٹ عطا کردی جائے گی۔/14

انقلابی تحریک

پریس اور پبلک جلسوں کے خلاف سخت گیرانہ قوانین منٹو کے عہد میں پاس کیے گیے تھے اور ہارڈنگ کے زمانہ میں ان کو اور سخت کردیا گیا۔ گورنمنٹ نہایت آزادی کے ساتھ روس کی تقلید میں منتشبہ لوگوں کو ٹرکوں میں بھر کر سائبیریا روانہ کرو" امارے اکی پالیسی پر عمل کر رہی تھی۔ گورنمنٹ کو اس میں اس سے بھی مدد ملتی تھی کہ 1900 ـ 1898 اور 5 ـ 1907 کے قحط کے بعد معاشی حالت بہت خراب ہوگئی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جو جوش غضب تقسیم بنگال کے خلاف شورش نے پیدا کیا تھا۔ وہ گھٹ گیا لیکن جو سکون نسبتاً نظر آرہا تھا۔ وہ محض سطحی تھا۔

ہوا دراصل یہ تھا کہ تحریک نے اپنی نوعیت بدل دی تھی اور انڈرگراونڈ چلی گئی تھی۔ انقلابیوں نے تشدد آمیز کارروائیاں شروع کردی تھیں جیسے کہ بم پھینکنا اور ڈکیتی ڈالنا۔ ملک کے بعد انقلابی تحریک انگلستان، فرانس، ممالک متحدہ امریکہ میں منظم کی گئی اور جب جنگ شروع ہوگئی تو یہ سوئزرلینڈ جرمنی، ترکی، اور مشرق وسطی کے ممالک میں پھیل گئی۔/15

بنگال میں دہشت پسند تحریک 'مانک ٹولہ گارڈن کیس' کے خاتمہ کے بعد جس کی سماعت علی پور جیل میں ہوئی تھی ختم ہوگئی تھی۔ مقدمہ کی سماعت کے دوران میں دو نوجوان ملزموں نے جیل کے احاطہ میں سرکاری گواہ کو قتل کردیا تھا جس کے لیے ان کو پھانسی دے دی گئی تھی۔ اس گروہ کا لیڈر برندر گھوش کو دوسرے ملزموں کے ساتھ حبس دوام اور جلا وطنی کی سزا ہوئی تھی اور کئی لوگوں کو مختلف میعاد کے قید کی سزائیں دی گئی تھیں۔ عدالت نے یہ فیصلہ 6 مئی 1909 کو سنایا تھا۔

ان نوجوانوں پر مقدمات چلانے اور ان کو سزا دینے کا ذرا بھی اثر انقلابی تحریکات پر نہیں ہوا۔ قتل، ڈکیتی، اور ریلوے ٹرینوں کی توڑ پھوڑ بدستور جاری رہی جو اعداد و شمار رولٹ کمیٹی نے

14- The Indian National Congress (Nelsom) 2nd Edition 1917. Part II. P. 180.

15- Kar, J.C. Political Trouble in India. PP. 170-317.

بنگال کے بارے میں جمع کیے تھے ان کی رو سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ۱۹۰۶ء اور ۱۹۱۷ء کے درمیان ساٹھ سے زیادہ واقعات قتل اور اقدام قتل کے، ۱۱۰ سے زائد ڈکیتی اور سرقہ بالجبر کے واقعات رونما ہوئے۔

دوسرے صوبوں میں پنجاب اور مہاراشٹر (جزو بمبئی پریسیڈنسی اور صوبہ متوسط) ان کارروائیوں میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ بہار، اڑیسہ، اتر پردیش (صوبہ شمال ومغرب واودھ) راجستھان اور مدراس اس طرح سرگرم عمل نہ تھے لیکن ایک کثیر تعداد سازشوں کی تھی جن میں تشدد آمیز کارروائیاں ہوئیں اور فوج کو بغاوت پر اکسایا گیا۔ خاص کر پنجاب میں اور اس وقت جب لڑائی شروع ہوگئی اور سکھ ممالک متحدہ امریکہ اور یورپ سے نسلی امتیازات کے تلخ جذبات کے ساتھ واپس آئے۔

بنگال میں اموشیلان سمتی (Anushilan Samiti) نے اپنا کام جاری رکھا تاآنکہ اس کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا لیکن اس نے اپنی شاخیں بنگال کے باہر پھیلا دیں اور اسی کے نمونہ کی سوسائٹیاں کثرت سے عالم وجود میں آگئیں۔ ابھی نوا بھارت (Abhinava - Bharat) نے ونایک دامودر ساورکر نے قائم کیا تھا اس نے مہاراشٹر میں اہم کارنامے انجام دیئے۔

ان مہموں کے نشانہ زیادہ تر ہندستانی تھے جن کو دہشت پسند ہندستان کا دغاباز دشمن سمجھتے تھے جیسے کہ پولیس کے آدمی سرکاری وکلا، سرکاری گواہ، پولیس کے خبر رساں مخبر وغیرہ، انگریزوں کو قتل کرنے کی سازشیں شاذونادر ہی کامیاب ہوتی تھیں۔ دسمبر ۱۹۰۷ء میں دو مرتبہ اس ٹرین کو اڑا دینے کی کوشش کی گئی جس میں بنگال کے لفٹننٹ گورنر سفر کر رہے تھے لیکن دونوں مرتبہ ناکامی کا سامنا ہوا۔

30 راپریل ۱۹۰۸ء کو مسز اور مس کینڈی کی گاڑی میں مظفر پور میں بم پھینکے جانے سے ہلاک ہوگئیں۔

7 رنومبر ۱۹۰۸ء کو بنگال کے لفٹننٹ گورنر پر حملہ کیا گیا لیکن وہ سلامت بچ نکلے۔

نومبر ۱۹۰۹ء میں جب لارڈ منٹو احمدآباد تشریف لے گئے تو دو بم اس راستے پر پائے گئے جس سے وائسرائے کی گاڑی گزرنے والی تھی۔

ابھی نوا، جیکسن کے قتل کی ذمہ دار تھی جو ناسک کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تھے اور جنھوں نے 21 ردسمبر ۱۹۰۹ء کو ونایک دامودر ساورکر کے بھائی گنیش ساورکر کو مقدمہ چلانے کے لیے عدالت کے سپرد کیا تھا۔

مدراس میں آشے (Ashe) ٹینی ولی (Tinne velly) کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ پر 17 رجون ۱۹۱۱ء کو گولی چلائی گئی۔

23 ردسمبر 1912ء کو جب لارڈ ہارڈنگ دتی میں باضابطہ شاہانہ انداز میں داخل ہوئے

جو اب ہندستان کا دارالسلطنت ہو چکا تھا تو ان کی ہاتھی پر جس پر وہ جلوس کے اندر سوار تھے چاندنی چوک دہلی میں بم پھینکا گیا وائسرائے کو شدید ضربات آئے اور ایک خادم ہلاک ہو گیا۔

دہشت پسندوں کا عقیدہ تھا کہ ایک بیرونی طاقت کی حکومت ہندستان کے مذہب اخلاق اور کلچر کے لیے تباہ کن ہے اور مادر وطن کی روحانی احیا جدید کے لیے اس کا اکھاڑ پھینکنا ضروری ہے ان کا خیال تھا کہ جب تک برطانیہ کی حکمرانی باقی رہے گی ہندستان کے لوگ حکمرانوں سے مسلسل جنگ میں مبتلا رہیں گے اور اس جنگ کے لیے ہر قسم کے ذرائع کا استعال جائز ہے جن میں ریوالور اور بم کا استعال بھی دشمنان آزادی کے خلاف جو انگریز ہوں یا ہندستانی شامل ہو۔

دہشت پسندوں کا اندازہ تھا کہ افراد کو قتل کر کے وہ گورنمنٹ کے ملازمین کو پست ہمت اور نظم و نسق کو مفلوج کر دیں گے لیکن اس کے بعد کیا ہو گا اس کے بارے میں ان کے خیالات ناصاف تھے۔ کچھ لوگ یہ سوچتے تھے کہ برطانوی حکومت کے زوال کے بعد ایک با اقتدار ہیکل قایم ہو جائے گی۔ فوری طور پر جو مہم ان کے سامنے تھی اس میں وہ اس درجہ پھنسے ہوئے تھے کہ ان کے پاس مستقبل پر غور کرنے کے لیے نہ وقت تھا نہ اس جانب میلان ہی تھا۔

دہشت پسندوں اور ان کے کام کے بارے میں رایوں میں وسیع اختلافات ہیں کچھ لوگوں نے تو ان کو اس طبقہ میں شمار کیا ہے جس میں مزاج پھیلانے والوں اور مجرموں کی گنتی ہوتی ہے اور ان کو سماج اور ملک کا دشمن قرار دے کر یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ تہس نہس کر دیے جانے کے قابل تھے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں ہو سکتا کہ اپنے ذرائع کے کارآمد ہونے کے بارے میں خواہ ان کے خیالات کتنے ہی غلط کیوں نہ رہے ہوں لیکن ان کے اندر بلند مقصد کا جوش و جذبہ تھا اور اپنے ملک کی آزادی کے حصول کی کوشش میں وہ اپنی جان اور سب کچھ قربان کر دینے کے لیے تیار تھے ان میں غیر معمولی ہمت و جرات کے مرد اور عورتیں تھیں۔ چندیں حیرت انگیز تنظیم کی صلاحیتیں تھیں اور فن اور وسائل ان میں حیرت خیز طور پر جمع تھے ان کے بدترین دشمنوں نے بھی یہ تسلیم کیا ہے کہ ان کو متحرک کرنے والا جذبہ حب الوطنی اور بے غرض خدمت کا جذبہ تھا۔

اس تحریک کا جو براہ راست اثر ہوا وہ قابل لحاظ تصور نہیں کیا جا سکتا افراد کو خفیہ سازشوں کے ذریعہ قتل کرنا بذات خود ایک فضول کام ہے اور اس کا یہ مقصد کہ اس سے گورنمنٹ مفلوج ہو جائے گی غیر عملی ہے

لیکن بلند اونچے درجہ کی مہم بازیوں اور بہادری کے ساتھ حکومت کا مقابلہ کے ڈرامے کا نفسیاتی اثر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ واقعہ جو قتل، ڈکیتی، یا ٹرین کو پٹری سے اتارنے کا پیش آتا تھا وہ عوام کے قلوب میں جوش اور اشتعال کی ایک لہر دوڑا دیتا تھا بہت سے لوگ ایسے تھے جو ان کارناموں کو پسند کرتے تھے اور کرنے والوں کے ساتھ ہمدردی رکھتے تھے اور ان کی مدح کرتے تھے۔ وہ لوگ جن کو تشدد سے نفرت تھی وہ بھی اس عظیم طاقت سے جس کے خلاف ابھی تک کسی نے چوں نہیں کیا تھا بلا خوف اور نتائج سے لاپرواہ مقابلہ کرنے کو عجوبہ روزگار خیال کرتے تھے۔ اس قسم کے جذبات کا پھیلنا گورنمنٹ کے مستقبل کے لیے کوئی نشان نہ تھا۔ کیوں کے گورنمنٹ کی کل بنیاد اس کے وقار اور لوگوں کے خوف زدہ رہنے پر تھی۔

ہندستان میں دہشت پسند تحریک خفیہ سازشوں اور انفرادی اعمال تک محدود رہی لیکن ہندستان کے وہ انقلابی جو ملک کے باہر تھے وہ اگرچہ ان طریقوں کے مخالف نہ تھے لیکن انھوں نے محسوس کیا کہ اس راہ سے ہندستان کی آزادی حاصل نہیں کی جاسکتی ہے اس لیے انھوں نے ایک مسلح بغاوت کا پلان تیار کرنا شروع کیا جس میں جنگ جو سپاہی اور آتشیں اسلحے استعمال میں لائے جاسکیں۔

اول یعنی جنگجو سپاہی) کے لیے یہ طے کیا گیا کہ ہندستانی فوجوں سے ملا جائے اور ان کو آمادہ کیا جائے کہ اپنی وفاداری اپنے برطانوی مالکوں سے پھیر کر ملک کے آزادی کے مقصد کی جانب منتقل کر دیں اور جہاں تک دوسرے (یعنی آتشیں اسلحہ) کا تعلق تھا۔

سامان حرب بیچنے والوں سے خریدا جائے جو ممالک کہ برطانیہ کے مخالف تھے اور اگر ممکن ہو تو ہندستان کے اسلحہ خانوں پر حملہ کر کے بھی حاصل کیا جائے۔ اور مسلح بغاوت کے علم برداروں کو ملک کے باہر بھیجا جائے تاکہ وہ اپنے پلان کو کامیاب بنانے کے لیے تدبیر کریں۔

یہ لوگ یورپ کے انقلاب پسندوں اور آزادی کے لیے جنگ کرنے والوں کی تاریخ سے واقف تھے اور یہ جانتے تھے کہ میزنی (MAZZNI) نے اٹلی کے اندر تحریک انگلستان سے چلائی تھی۔ اسی طرح روس کے انقلابی متعدد یورپین ملک سے سرگرم عمل ہوتے تھے اور ان ملکوں میں انگلستان بھی شامل تھا۔ اشتراکیت کے بانی مارکس اور انگلس نے اپنا پروپیگنڈا لندن سے پھیلا دیا تھا۔ درحقیقت انگلستان کو ان تمام لوگوں کی پناہ گاہ سمجھا جاتا تھا جو بیرونی

یا دیسی ظالموں کے خلاف برسرجنگ تھے ہندستانی طالب علم اور تاجر جو یورپ میں مقیم تھے ان کا رابطہ ان باغیوں سے قایم ہوا جو اپنی گورنمنٹوں سے بغاوت کر رہے تھے ماقبل نسل کے ہندستانی مثل دادا بھائی (ورجی) سورندر ناتھ بنرجی، آربندو گھوش، کو ہندستان کی آزادی کے متعلق جو جوش امنگ اور حوصلہ حاصل ہوا تھا وہ بیرون ہند کے لوگوں کے رابطہ سے ہی حاصل ہوا تھا۔

لیکن سب سے پہلی منظم کوشش جو ٹریننگ پروپیگنڈا، اور سیاسی عمل کے واسطے ایک مرکز قایم کرنے کے لیے کی گئی اس کی بنیاد شیام جی کرشنا درما نے ڈالی جنھوں نے کیمبرج میں تعلیم پائی تھی اور جن کو لندن میں بیرسٹری کی سند ملی تھی۔ انگلستان سے واپسی پر وہ مختلف ریاستوں میں ملازمت کرتے رہے، دیسی ریاستوں میں جو انگریز ریزیڈنٹ تھے ان کے کام کا جو تلخ تجربہ ہوا اس نے ان کے دماغ کو پھیر دیا اور وہ ہندستان کو برطانیہ کی غلامی کے چنگل سے آزاد کرانے کا خواب دیکھنے لگے۔ وہ انگلستان 1897ء میں واپس گیے اور وہاں 1905ء میں ہوم رول سوسائٹی کو قائم کی اس کے ایک مرکز اور پروپیگنڈا کا لندن میں قایم کیا اور اس کا نام "انڈیا ہاؤس" رکھا یہاں سے بہت سے طالب علم ہندستان کی دردناک حالت اور اس کو سہارنے یا ختم کر دینے پر لکچر سننے کے لیے جمع ہوتے گیے، ایک ماہ دار رسالہ "دی انڈین سوشیالوجسٹ The Indian Sociologist" بھی نکالا گیا اور طالب علموں کو فیلوشپ، (یونیورسٹی) میں تعلیم حاصل کرنے کی اجازت کے لیے رکنیت) کے تمغے بھی دیے جاتے تھے۔

اس مرکز کی جانب بہت سے طالب علموں کی توجہ مبذول ہوئی جو مختلف یونیورسٹیوں میں تعلیم پاتے تھے ان میں دو بہت ممتاز تھے۔ صرف یال اور دنا یک دامودر ساورکر، ایک اور نوجوان جن کا تعلق مرکز سے تھا وہ مدن لال ڈھینگرا تھے۔

شیاما جی کرشنا درما کی تعلیمات پر امن مقاومت پر زور دیتی تھیں، اس کے بعض اجزا۔ وہی ہیں جو بعد کو گاندھی جی کے پروگرام میں شامل ہوئے لیکن فرق یہ ہے کہ وہ تشدد کو مسترد نہیں کرتے تھے۔

ساورکر 1906ء میں لندن پہنچے انھوں نے تلک کی پر جوش قیادت کے تحت اپنی سیاسی زندگی شروع کی تھی اور انھوں نے اور ان کے بھائی گنیش نے ایک سوسائٹی قائم کی تھی جو آگے چل کر "مترا میلا" (سوشیلان سمیتی) کے نمونہ پر "ابھینو بھارت سوسائٹی" میں تبدیل ہو گئی۔

لندن کے انڈیا ہاؤس میں ونایک ساورکر نے ایک جذبات افروز رہنما کی شکل اختیار کرلی۔ درحقیقت اس نے کرشنا ورما کے پیرس چلے جانے کے بعد اس کا چارج لے لیا ہاؤس کا دائرہ عمل یہ تھا کہ پمفلٹ شائع کرتے تھے جن میں روس کے انقلابیوں کے طریقوں کی وکالت کی جاتی تھی 1857ء کی بغاوت کی سالانہ تقریب بناتے تھے اور قتل اور بم کے استعمال کی پالیسی کی اشاعت کرتے تھے۔ ساورکر نے جو کتاب 1857ء کی جنگ آزادی ہند پر لکھی تھی اس کے باب میٹنگوں میں پڑھ کر سناتے تھے۔ مدن لال ڈھینگرا نے کرزن وِلی (Curzon Wyllie) جو انڈیا آفس کا پولیٹیکل اے، ڈی، سی تھا گولی چلائی۔ ان کو قید با مشقت کی سزا ہوئی اور وہ جزائر انڈمان میں 1921ء تک قید رکھے گئے۔ تب انھیں اس شرط پر رتناگری واپس جانے کی اجازت ملی کہ وہ سیاسی تحریکات سے الگ تھلگ رہیں یہ پابندی 1937ء میں منسوخ ہوئی۔

ہردیال جو پنجاب یونیورسٹی میں سب سے زیادہ ذہین اور طباع طالب علموں میں تھا اس نے 1905ء میں حکومت کا وظیفہ حاصل کیا اور انگلستان چلا گیا آکسفورڈ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد وہ شیام جی کرشنا ورما کے زیر اثر آگیا اگرچہ وہ غیر معمولی ذہانت اور دماغی قابلیت سے بہرہ ور تھا لیکن وہ انتہائی جذباتی، راہبانہ طرز زندگی کی جانب مائل بہت مخلص اور بے حد سخت تھا ان کے نزدیک زندگی کے کسی اصول کو ماننے کا تقاضہ تھا کہ فوراً بلا دقت اپنے عمل اور کردار میں اس کو نمایاں کیا جائے۔ چنانچہ جیسے ہی وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ ہندستان پر برطانیہ کی حکومت منافی اخلاق اور مذموم ہے اس نے گورنمنٹ سے ہر قسم کے تعلقات منقطع کر لینے کا فیصلہ کرلیا۔ انھوں نے اپنے وظیفہ سے استعفیٰ دے دیا اور 1907ء میں ہندستان واپس آگیا۔

اس دوران میں برٹش گورنمنٹ نے انڈیا ہاؤس کی کارروائیوں کی خبر پاکر اس کو کچلنے کے لیے اقدامات شروع کردیئے۔ شیام جی کرشنا ورما تو انگلستان سے جا ہی چکے تھے اور میڈم کاما اور ایس، ایس رانا کے ساتھ اپنی تحریکات کا مرکز پیرس میں قائم کردیا تھا۔ ہندستان کے دہشت پسندوں نے ان سے رابطہ قائم کیا۔ انھوں نے اپنے ممبران کو پیرس اس غرض سے بھیجا کہ وہ دھماکہ خیز آلات حرب تیار کرنے کا فن سیکھیں اور آلات حرب حاصل کریں اور چوری سے ہندستان لائیں۔

ہردیال جو اپنی کارروائیوں کی وجہ سے گورنمنٹ کی نگاہ میں خطرناک تصوّر کیے جانے

لگے تھے ان کو مشورہ دیا گیا کہ وہ ملک سے باہر چلے جائیں۔ وہ پہلے فرانس گیے اور وہاں چند ۔ مہینے رہنے کے بعد ممالک متحدہ امریکہ چلے گیے راستہ میں وہ (MARTINGUE) (مارٹنگ) پر ٹھہرے اور اس کے امریکہ کے مغربی ساحل پر اترے وہاں انھوں نے ہندستانی مہاجرین اور بالخصوص سکھوں کو بہت مضطرب پایا۔ رنگ کے اختلاف کیوجہ سے تعصبات محنت طلب کاموں میں رقابت کیوجہ سے حسد رسم و رواج اور طرز رہائش میں فرق ان ۔ سب نے مل جل کر ذلت خیز اور مخالفانہ حالات کو پیدا کر دیا تھا۔ حکومت برطانیہ جس کی وہ رعایا تھے ان کے معاملات میں کوئی دلچسپی نہیں لیتی تھی اور نہ ان کوئی مدد دیتی تھی۔ ان لوگوں نے سوسائٹیاں تو بنالی تھیں لیکن ان کی قیادت کمزور تھی۔

ان حالات میں ہر دیال ان کے درمیان پہنچا اس نے ہندو (ہندستانی) ایوسی ایشن میں نیے سرے سے جان ڈال دی اور اس کا نام غدر (بغاوت) رکھا۔ اس نے 'یوگنتر آشرم' قایم کیا سرمایہ اکٹھا کیا اور ایک زوردار ایجیٹیشن شروع کیا ایک اخبار نکالا جس کا نام بھی 'غدر' رکھا اور اس کی اشاعت نہ صرف امریکہ میں ہوتی تھی۔ بلکہ دوسرے ملکوں میں بھی جہاں جہاں ہندستانی تھے اور خود ہندستان میں بھی۔

غدر پارٹی یکم نومبر 1913 کو عالم وجود میں آئی۔ یہ شدت سے مخالف برطانیہ تھی یہ ان تمام ملکوں کی حمایت کرتی تھی جو برطانیہ کے مخالف تھے اور امریکہ کے باشندوں سے اپیل کی کہ وہ آزادی اور مساوات کے نام پر ان ہندستانیوں کی حمایت کریں جو برطانوی حکومت کا جوا اپنے کندھے سے اتار پھینکنے کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ سوسائٹی امریکہ کے کچھ باشندوں کی ہمدردی حاصل کرنے میں کامیاب رہی۔ لیکن انگریز غصہ میں آگیے تھے اور برا سماں تھے اور خاص کر اس وجہ سے کہ سوسائٹی جرمنی کے موافق خیالات ظاہر کرتی تھی حتٰی کہ دسمبر 1913 میں جرمن قنصل کو اپنے جلسہ میں بھی مدعو کیا اور ان کو ڈائس پر بٹھایا۔

برطانیہ کے نمائندہ کی شکایت پر ہردیال کو ۲۶ مارچ 1914 کو گرفتار کر لیا گیا اور اس کے خلاف قانون تارکین وطن (Undesirable Emigrants) کے ماتحت کارروائی شروع ہوئی ۔ وہ حفاظتی انتظامات کو پھاند کر امریکہ سے نکل آیا۔ اور سوئزرلینڈ ملک کے شہر جنیوا پہنچا۔

کافی تعداد میں ہندستانی وہاں اکٹھا ہو گیے۔ ان میں شیاما جی کرشنا ورما، وریندر چٹو پادھیا (مسز سروجنی نایڈو کے بھائی) تارک ناتھ داس، چمپک رمن پلے، چندر پرکاش، برکت

برکت اللہ اور دوسرے لوگ تھے۔

جب لڑائی شروع ہوگئی تو ہر دیال نے اپنی حرکات وسکنات کو جرمنی کی جانب منتقل کر دیا اور جرمنی کی گورنمنٹ سے ہندستان کی آزادی کے حصول کے سلسلہ میں مدد مانگی۔ جرمنی کی وزارت خارجہ کے دفتر نے مملکت برطانیہ کو ڈرانے کے جوش میں روپیہ اور دیگر سہولتیں دے کر جن میں آلات حرب بھی شامل تھے ان کی ہمت افزائی کی۔ ہندستان کے انقلابیوں نے برلن میں ایک آزاد ہندستان کمیٹی (Indian Independence Committee) قایم کی۔ کمیٹی نے ایک اسکیم کا پلان بنایا جس کا مقصد ممالک متحدہ امریکہ، ہندستان مشرق قریب اور دوسرے ملکوں میں پروپیگنڈہ کرنا، فوجوں کی اور ہندستانیوں کی علاحدگی کا ڑیوں کا یورپ میں بندوبست کرنا اور یہ سب اس لیے کہ برطانیہ سے جنگ کی جا سکے۔ . . . . اسی طرح یہ بھی اسکیم میں تھا کہ ہندستانی فوجوں میں بغاوت کے جذبے کو اکسایا جائے۔ دھماکہ خیز آلات کے استعمال کی کامل الفن ٹریننگ دی جائے۔ ہندستانی سپاہی جو قید کر لیے گیے تھے ان کو آمادہ کیا جائے کہ وہ برطانیہ سے وفاداری کو علی الاعلان مسترد کر دیں۔ آلات حرب کسی طرح ہندستان پہنچائے جائیں اور وہ سب کچھ کیا جائے جو برطانیہ کے زوال کے لیے مفید ہو۔

1915ء میں ہر دیال قسطنطنیہ گیا جہاں وہ انور پاشا سے ملا یہ وہ زمانہ تھا جب ہندستان کے مسلمان محمود الحسن دیوبندی کی قیادت میں جوش وخروش کے ساتھ مسلمان ملکوں کی حمایت ہندستان کو آزاد کرانے کے لیے حاصل کرنے میں ہمہ تن مشغول تھے متعدد پنجابی مسلم نوجوان چھپ کر شمال د مغرب سرحد پر اس غرض سے پہنچ گئے کہ قبائلیوں میں کام کریں عبیداللہ سندھی کابل روانہ کر دیے گیے جہاں انھوں نے امیر کابل کو حامی بنانے کی کوشش کرتے رہے محمود الحسن اور حسین احمد مدنی عرب گیے اور وہاں ترکی افسران غالب اور انور پاشا سے ملے۔ ریشمی رومال پر لکھے ہوئے خطوط ہندستان کے اندر اور ہندستان کے باہر تقسیم کیے گیے برمن سے مہندر پرتاپ اور برکت اللہ کچھ جرمن افسروں کے ساتھ کابل آئے۔ ان لوگوں نے ایک جلا وطن گورنمنٹ آف انڈیا بنائی جس کا راجہ مہندر پرتاپ کو صدر، برکت اللہ کو وزیر اعظم اور دوسرے ہندستانیوں کو اعلی عہدوں پر فائض قرار دیا۔

لیکن انقلابیوں نے کابل اور مکہ میں جو پلان تیار کیا تھا وہ ناکام ثابت ہوا۔ عبید اللہ کو کابل چھوڑنا پڑا اور محمود الحسن اور ان کے ساتھی برطانیہ کے حوالے کر دیے گیے اور برطانیہ

نے ان کو مدت جنگ تک مالٹا میں قید رکھا۔ جو تباہی جرمن افواج پر نازل ہوئی اس نے انقلابیوں کو منتشر کر دیا۔ ہر دیال نے جرمنی کو چھوڑا اور سویڈن چلا گیا۔

جرمنوں نے ممالک متحدہ امریکہ سے ہنولولو، شنگھائی، بٹیویا، سنگاپور اور جزائر انڈمان کے راستہ سے اوڑیسہ کے بندرگاہوں رائے منگل، بالاسور اور ہانیا تک کثیر مقدار میں آلات حرب ہندستان بھیجنے کی بھاری کوشش کی۔ برطانوی بحریہ کی مستعدی اور جرمنوں کی نااہلی کے باعث ان کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ جنگ کے بعد بیرون ملک کی مداخلت کے لیے حالات کلیتاً فنا ہو چکے تھے اور اگرچہ غدر پارٹی چند اور سالوں تک زندہ رہی لیکن آخر کار یہ ختم ہو گئی۔

انقلابیوں کی کارروائیوں کا ایک شاخسانہ کاماگاٹامارو (Cuma Gata Maru) کیس تھا۔ اس کے واقعات یہ تھے کہ کچھ سکھ ہندستان سے ایک جاپانی جہاز موسوم یہ کاماگاٹامارو (Cama Gata Maru) سے اس لیے جا رہے تھے کہ کناڈا کے مغربی حصہ میں برٹش کولمبیا جا کر اتریں کناڈا کے حکام نے ان کو جہاز سے اترنے کی اجازت نہیں دی اور جہاز کو واپس ہونا پڑا۔ جہاز کلکتہ کے قریب "بج بج" کے مقام پر 29 ستمبر 1914ء کو لنگر انداز ہوا۔

ان لوگوں کو ایک اسپیشل ٹرین سے روانہ کرنے کے انتظامات کیے گئے جن سے ان آدمیوں کے دل میں شبہات پیدا ہوئے۔ ان میں بہت سے لوگوں نے ٹرین میں داخل ہونے سے انکار کر دیا اور کلکتہ کی جانب چل دیئے۔ پولیس نے ان کو روکنا چاہا لیکن ان لوگوں نے انکار کر دیا۔ فوج اور مزید پولیس طلب کی گئی اور سکھوں نے سمجھا کہ ان کے خلاف طاقت استعمال کی جائے گی۔ ان کے لیڈر بابا گوردت سنگھ کے پاس یورپین پولیس کا ایک سارجنٹ ان پر دباؤ ڈالنے کے لیے ان کے پاس پہنچا۔ کل آدمی اپنے لیڈر کے پاس جمع ہو گئے اس کے بعد گولیاں چلنا شروع ہوئیں۔ رات آگئی لیکن دوسرے دن صبح تک بقیہ سکھ گرفتار کیے جا چکے تھے اور ٹرین سے پنجاب روانہ کر دیئے گئے۔ یہ ایک ایسا معاملہ تھا جو گورنمنٹ کے اس شک پر مبنی تھا کہ یہ پارٹی ایک انتہائی خطرناک انقلابی تحریک کا مرکزی حصہ ہے۔ دوسری جانب سکھوں میں اس برتاؤ سے غم و غصہ پیدا ہو گیا تھا جو ان کے ساتھ کناڈا اور ہندستان کے حکام بالا نے کیا تھا اور انھوں نے اس سے مشتعل ہو کر تشدد کا راستہ اختیار کر لیا تھا۔

ملک کے اندر اور ملک کے باہر جو انقلابی تحریکات چل رہی تھیں ان سے گورنمنٹ قدرتی طور پر پریشان ہو گئی تھی اس لیے غیر وفادارانہ اور باغیانہ کارروائیوں کی نگرانی اور ان کی رپورٹ کے لیے مخصوص انتظامات کیے گیے اور اس کے لیے بھی انتظامات کیے گیے کہ تفتیش کر کے سازشوں کا پتہ لگایا جائے اور گورنمنٹ کی مخالفت کی جانب مظاہرات کو پوری طاقت سے کچل دیا جائے شروع میں جو واقعہ پیش آیا تھا اس وقت سے جو حادثات ہوئے ان پر غور کرنے اور ان کے دور کرنے کے لیے علاج تلاش کرنے کے لیے غور وفکر کا آغاز ہوا۔

ریجینالڈ کریڈ اک (RAGINALD CRADDOCK) جو وائسرائے کی اگزیکیٹو کونسل کا ہوم ممبر تھا۔ اس نے 27 اپریل 1913 کو ایک مبسوط نوٹ لکھا جس میں اس نے اس بات کی شرح کی کہ تحریک بنگال سے کیوں چلی اور وہاں اس نے اتنی زبردست وسعت کیونکر حاصل کر لی۔ /16

انھوں نے اس جانب اشارہ کیا کہ دہشت پسند زیادہ تر بنگالیوں کی اونچی ذات بھدرلاک کے طبقہ کے تھے۔ انھوں نے سوال کیا کہ بھدرلاک کون تھے۔ اور خود ہی جواب دیا کہ بھدرلاک کل کے کل یا جزءً بھی شہر کے رہنے والے نہ تھے جیسا کہ دوسرے صوبوں میں ہیں یہ اگر بنگال کے دیہی علاقوں میں پھیلے ہوتے ہیں۔ اور بعض علاقوں میں ان کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ وہ بذات خود ایک فرقہ بن گیے ہیں۔ یہ لوگ زمینداروں اور کاشت کاروں کے درمیان بچولیے کا کام کرتے ہیں۔ یہ تعلیم یافتہ لوگ ہیں جنھوں نے ان اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم پائی ہے جو اندرون ملک قصبات اور شہروں میں پھیلے ہوئے ہیں۔

یہ بچولیے بندوبست استمراری کے انوکھے نظام کی پیداوار ہیں۔ یہ لوگ کاشت کاروں سے لگان وصول کرتے تھے اور اپنے بچولیوں یا ایجنٹوں کے ایک گروہ درجہ بدرجہ کے ذریعہ زمیندار کو بھیج دیتے تھے ہر درجہ والا اپنا حصہ وصول کرتا تھا اور سیڑھی کے ہر پایہ پر کم ہوتے ہوتے جو رقم زمیندار کو ملتی تھی وہ بہت کم ہو جاتی تھی۔ ان کے خاندان سے مختلف پیشوں کیلیے لوگ بھرتی ہوتے تھے یعنی وکلا، ٹیچران صحافی، لگان وصولی کے امین اور کلرک۔ ان کی معاشی حالت معمولی تھی بہت تو ایسے تھے جن کی گزر مشکل سے ہوتی تھی۔ اس لیے ان لوگوں کا طبقہ ایک کھلا ہوا میدان تھا جہاں سے سیاسی شورش کے لیے کارکن بھرتی

---

16 - Home Department Political A. Proceeding May 1913. Nos 72-73.

کیے جا سکتے تھے۔ کریڈاک کے الفاظ میں "یہاں، اس لیے وہ کچا مال تھا جس پر بے اطمینانی اور باغیانہ تعلیم کو پھولنے پھلنے کا پورا موقع ملا۔

کریڈاک کے تجزیہ کے مطابق اصل اسباب جو بے اطمینانی اور نا وفاداری کا باعث ہوئے وہ دو تھے (1) نظم و نسق کی نا اہلیت (2) معاشی تکالیف۔

جہاں تک پہلے کا سوال تھا۔ ان کی رائے میں گاؤں کا نظم سب سے زیادہ کمزور تھا۔ کوئی ایسا سرکاری افسر گاؤں میں نہیں تھا جس کا تعلق زمین سے ہو جیسا کہ دوسرے صوبوں میں تھا۔ اور گورنمنٹ کا صرف ایک محکمہ تھا اور وہ پولیس کا محکمہ تھا۔ بقیہ تمام محکموں کو ضلع اور تحصیل کے مرکزی مقاموں پر جمع کر دیا گیا تھا اس کے علاوہ زمینداری کے نظام نے مالکان آراضی کا ایک ایسا گروہ پیدا کر دیا تھا جن کا اور کوئی کام سوائے اس کے نہ تھا۔ کہ اپنے بچولیوں کے کثیر التعداد طبقہ سے جن کو بہت کم معاوضہ ملتا تھا لگان وصول کریں۔ ان کاہل زمینداروں پر جن کے پاس کوئی کام ہی نہ تھا۔ ان گاؤں کے اندر جن کے وہ مالک تھے امن و قانون قایم رکھنے کی نہ کوئی ذمہ داری تھی اور نہ کسی قسم کا اختیار تھا۔

جہاں تک کہ دوسرے سبب کا تعلق ہے انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ " معاشی بدحالی جو ان کے حصہ میں آئی وہی اس بغاوت اور تراح پھیلانے کے جذبہ کی ذمہ دار ہے" اس بے اطمینانی میں زمینداروں کے مظالم، وکلا، اور پولس، کے مظالم اور مہاجنوں کے مظالم نے جن کی پشت پر عدالت کے فیصلے تھے بہت زیادہ اضافہ کر دیا تھا۔ ان تمام اثرات میں سے ہر ایک حکومت کے فیاضانہ اثرات سے کہیں زیادہ طاقت ور ہو گیا تھا جس کا منفی پہلو صرف پولیس کے مظالم سے نمایاں ہوتا ہے۔

کریو کو ایک مراسلہ میں جو انقلابی کارروائیوں کے متعلق تھا ہارڈنگ نے 9 مارچ 1915ء کو لکھا " بنگال کی صورت حال بلا شبہہ خراب ہے اور روز بروز بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے اب بنگال کے حالات کا ان سے جو پنجاب کے اندر درپیش ہیں مقابلہ کرنے کے بعد مجھے اس میں کوئی شک و شبہہ نظر نہیں آتا ہے کہ ہماری دیسی افواج کی وفاداری میں مداخلت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ بہترین طریقہ یہ ہے کہ ایکٹ کے طرز پر ایک آرڈیننس مملکت کی دفاع کے لیے پاس کر دیا جائے"[17]

17- Hardinge Papers, Harding to Crewe, March 9 1915.

پنجاب کے بارے میں لاجپت رائے کی شہادت یہ ہے کہ "ماضی کے واقعات کی روشنی میں مطالعہ کرنے کے بعد یعنی یہ دیکھنے کے بعد کہ گزشتہ دس سالوں کے اندر پنجاب کے شمالی مغربی حصوں میں کیا ہوتا رہا ہے اور 1907، 1910، 1913 اور 1914 میں کیا ہوا اور ان کا پنجاب کی اس وفاداری سے مقابلہ کرنے کے بعد جو سترویں اور اسویں سالوں میں تھے کوئی بھی جو اس صوبہ سے اچھی طرح واقف ہے سوائے اس کے اور کسی نتیجہ پر پہنچ ہی نہیں سکتا کہ وہ پنجاب جو برطانیہ کی ہندستانی افواج کی بھرتی کا میدان تھا اب بے اطمینانی کے جذبہ سے کھول رہا ہے اور جو کچھ پنجاب کے لیے صحیح ہے وہ کم و بیش ہندستان کے دوسرے حصوں کے لیے بھی صحیح ہے" 18

گورنمنٹ آخرکار اس نتیجہ پر پہنچی کہ حالت ناقابل برداشت ہے اور ایک گہری سازش عالم وجود میں آگئی ہے جس کی غرض یہ ہے کہ نظم و نسق کو مفلوج کر دے / 19

گورنمنٹ آف انڈیا اور بنگال گورنمنٹ دونوں نے یہ تہیہ کیا کہ حکومت کے خلاف کارروائیوں کو کچل دیا جائے۔ قانون جو وضع کیے گیے اور زیادہ سخت تھے۔ قانون ضابطہ فوجداری میں ترمیم کر دی گئی جانچ پڑتال کے اور حفاظتی کارروائیاں وسیع پیمانہ پر جاری کر دی گئیں۔ اس سے بھی زیادہ سخت کارروائیاں سوچی جارہی تھیں اور ریگولیشن III 1818 کا آزادی سے استعمال کیا گیا۔

اس انقلابی تحریک کو دبانے کے لیے صرف بنگال میں 1818 کے ریگولیشن کے تحت سو آدمی سرکاری قید بنائے گیے اور سات سو آدمی قانون دفاع ہند کے تحت نظربند کیے گیے یہ اعداد و شمار 1917 کے شروع کے مہینوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ بنگال کے گورنر کو یہ یقین تھا کہ "اس بات کا ہر طرح یقین ہے کہ ان اعداد و شمار میں اور اضافہ ہو" 20

کریڈاک نے جو واضح تجزیہ کیا تھا اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سرکاری حکام کے اونچے

18- Joshi V.C. (Ed.) Lala Lajpat Rai, Writings and Speeches, Vol I. PP. 227-228.

19- Home Department Political Proceedings No 3. of 1914. Governor General in Council to Secretary of State, 26 March, 1914.

20- Chambalani Papers (Microfilm Copy National Archives), Ronaldshay to Chambalani, 27th June, 1917.

سے او نچے طبقہ میں ایسے لوگ موجود تھے جن کے اندر اتنی کافی دیدہ وری تھی کہ وہ تسلیم کریں کہ مسئلہ صرف امن اور قانون کا نہ تھا۔ بیماری اور زیادہ گہرائی میں تھی اور ایک سیاسی حل ہی اس کا علاج تھا۔ ان لوگوں میں اتنی ہوشیاری تھی کہ انھوں نے تہہ میں چھپے ہوئے ناسور کا پتہ لگا لیا تھا جو عوام کے اعضاء رئیسہ کو کھا رہا تھا اور ان کو اخلاقی خطرات سے سامنا کرانے والا تھا لیکن علاج دریافت کرنے میں انھوں نے اناڑی پن کا ثبوت دیا بلا اندر کی چھپی ہوئی بیماری پر حملہ کے وہ خوف مرض کی ظاہری علامتوں کا علاج کرنا چاہتے تھے۔

ہوم رول کی شورش

معتدلین کی نیت و عمل پر مبنی تدابیر اور زمین کو دہلا دینے والا انقلابیوں کا طرز عمل ان دونوں کے فوائد تھے۔ اول تو ملوکیت پسندی کی اخلاقی بنیادوں کو کاٹ رہی تھی اور دوسرا سلطنت کی طاقت کے ناقابل تسخیر ہونے کا جو واہمہ پھیلا ہوا تھا اس کو تہس نہس کر رہا تھا لیکن بہر حال ۱۹۱۶ میں قومی تحریک کا جوار بھاٹا بہت نیچے اتر گیا تھا۔ اب پبلک معتدل سیاسی رہنماؤں پر اپنا اعتماد کھو چکی تھی اور انتہا پسند لیڈران چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے۔ کچھ تو تلک کی طرح جیل میں سڑ رہے تھے اور کچھ دوسرے لوگ مثل بپن چندر پال اور لاجپت رائے خود خواستہ جلا وطنی اختیار کیے ہوئے تھے اور ایک انگلستان اور امریکہ کے اندر کے دور دراز کے مرکزوں سے لڑائی جاری رکھے ہوئے تھے انتہا پسندوں کا کام بیکار نہیں گیا تھا۔ مخالف تقسیم بنگال شورش کے زمانہ میں ہندستانی عوام اور بالخصوص نوجوانوں کے جذبات اور جوش میں بڑا تلاطم آ گیا تھا اور ان لوگوں کا نقطہ نظر بدل گیا تھا۔ اب وہ گداگری کی جگہ جنگ جوئی پر آمادہ تھے اس نسل نے اپنے لیڈروں کی بیدار کرنے والی تقریروں کو سنا تھا۔ بندے ماترم، اور کیسری، میں برطانوی راج کی مذمت کو پڑھا تھا۔ جلوسوں میں دوپہر دینے میں عملی حصہ لیا تھا اور پولیس کے بے رحمانہ حملوں اور قید و بند کی سختیوں کو خوشی خوشی برداشت کیا تھا۔ اور اس طرح یہ دکھلا دیا تھا کہ قوم کے مقصد میں وہ تکالیف اٹھانے اور قربانیاں دینے کے لیے تیار ہیں علاوہ ازیں سیاست کے پرانے مراکز جیسے بنگال، پنجاب اور مہاراشٹر اور نئے علاقے مثل یو۔پی، بہار، اوڑیسہ، مدراس گجرات۔ بلند عزائم نوجوانوں کو میدان میں جھونک رہے تھے۔ اور یہ نوجوان عمل کے پیاسے

تھے۔ وہ ایسے مضبوط دل لیڈروں کو چاہتے تھے جو ان کی میدان جنگ میں قیادت کر سکیں
مسز اینی بیسنٹ جو 1914 میں سیاست کے اندر داخل ہوئیں اور تلک جو اسی سال کے وسط
میں جیل سے رہا ہوئے تھے ان کی دعاؤں اور تمناؤں کے جواب تھے۔

مسز اینی بیسنٹ جواب سڑسٹھ (67) سال کی ہوگئی تھیں ایک غیر معمولی خاتون تھیں ان کی جو شادی 1867 میں ہوئی تھی اس کے ٹوٹ جانے کے بعد انھوں نے اپنی تمام ہولناک توانائیوں کو انتہاپسندانہ مقاصد کے لیے وقف کر دیا تھا۔ ان کا مدعا یہ تھا کہ آزادی اور سچے خیالات انسانوں میں پیدا کیے جائیں۔ اور دنیا کو اس دنیا سے جو ان کے سامنے تھی۔ زیادہ آزاد اور بہتر بنایا جائے۔ اور انھوں نے کہا کہ ان تمناؤں نے ان کے اندر ایک ایسی طاقت کو جگا دیا ہے جس سے انکار ناممکن ہے آزاد خیالی کی اشاعت میں انھوں نے بریڈلا کا ساتھ دیا اور ان کے اخبار 'نیشنل ریفارمر' میں کام کیا 1884 میں انھوں نے مختاط اشتراکیت (FABIAN) سوسائٹی میں دلچسپی لینا شروع کیا اور ایسے دیوہیکر لوگوں جیسے سڈنی دب۔ جی۔ بی۔ شا۔ اور گریہم ویلاس، کے ساتھ اشتراکی اقتصادیات کو پھیلانے میں سخت محنت کی۔ 1886 میں انھوں نے اپنے مطالعہ میں روحانیات کو بھی شامل کر لیا میڈم بلیواٹسکی Madam Blavatsky کی کتاب Secret Doctrine خفیہ اصول پڑھنے کے بعد وہ تھیاسفی (یہ عقیدہ یا اصول کہ ہر شخص بلا واسطہ خدا کی معرفت، روحانی وجد اور وجدان سے حاصل کر سکتا ہے) کی معتقد ہوگئیں اور اس سوسائٹی کی ممبر 1889 میں ہوئیں اور 1893 میں روحانی پیغام کی اشاعت کے لیے ہندستان آئیں اس وقت کے بعد وہ برابر ہندستان میں رہیں۔ اور ہندو مذہب کی تعلیم اور اس کے احیاء جدید میں لکچر دں کے ذریعہ، اسکول قائم کر کے، اور مذہبی کتابوں کا انگریزی میں ترجمہ کر کے بڑا حصہ لیا۔ جیسا کہ راج گوپال آچاریہ نے کہا ہے "انھوں نے ہندستان کی نوجوان نسل' ہندستان۔ کے کلچر اور مذہب کی عظمت پر قطعیت کے ساتھ یقین پیدا کرنے میں مدد کی "

1914 تک سز بیسنٹ نے اپنی تمام توانائی مذہبی تعلیم، اور سماجی اصلاح پر صرف کی تھی اب اسے سیاسی میدان میں منتقل کر دیا جیسا کہ انھوں نے خود اقرار کیا ہے "جبر و استبداد کی روز افزوں ترقی، آزادی کو کم کرنے کی کارروائی، طلبا کے ساتھ بدسلوکی، اور انقلاب کے خطرے نے ان کو میدان میں آنے پر مجبور کیا۔" 21

۔ایک اخبار کامن ویلتھ، 1914ء میں جاری کیا اور روز نامہ نیو انڈیا، اگست 1914ء میں نیا اجن کا مقصد "ہندستان میں جو تبدیلیاں آنے والی ہیں ان کے آگے بڑھانے پر زور دینا اور یہ مطالبہ کرنا تھا کہ رفتہ رفتہ ہندستان کا ملوکیت برطانیہ میں ایک مقام بن جائے"/ 12

اس ستان میں لکچر دے چکی تھیں جن کا موضوع "انگلستان کی ضرورت ہندستان کا مناسب موقع ہے"۔ "ہندستان کی وفاداری کی قیمت ہندستان کی آزادی ہے" وغیرہ وغیرہ تھے۔ اپنے اخبارات میں انھوں نے ہندستان کے لیے سلف گورنمنٹ کے مضمون کی بدلائل وضاحت کی اور یہ اعلان کیا کہ سوراجیہ حاصل کرنے کے لیے وہ تحریک چلائیں گی۔ انھوں نے کہا "مملکت برطانیہ کی قسمت ہندستان کی قسمت پر منحصر ہے اور اس لیے یہ ایک بدیہی عقلمندی اور ہوشیاری کی بات ہے کہ ہندستان کو ہوم رول دے کر اسے مطمئن کر دیا جائے"/ 23

چونکہ کانگرس ایک بے ہمت جماعت بن گئی تھی، انھوں نے اس میں جوش بھرنے کی کوشش کی ان کی سمجھ میں آیا کہ انتہا پسندوں کے کانگرس میں واپس آئے بغیر یہ بات ممکن نہیں ہے دسمبر 1914ء میں انھوں نے تلک سے گفت و شنید شروع کی تاکہ ان کو آمادہ کیا جائے کہ وہ پھر کانگرس واپس آجائیں تلک کانگرس میں آنے کے بہت خواہشمند تھے لیکن انھوں نے اسے واضح کر دیا تھا کہ معتدلین نے جو ویڑہ حکومت سے میل جول اور گورنمنٹ پر ہلکے پھلکے اعتراضات کا اختیار کر رکھا ہے وہ اس کے بدلہ میں حکومت کی صاف صاف اور کھلم کھلا مخالفت کا طریقہ دستوری حدود کے اندر رکھیں گے گویا دوسرے الفاظ میں رکاوٹ ڈالنے کا وہ طریقہ جو آئرلینڈ نے اختیار کیا تھا"

1915ء میں گوکھلے اور فیروز شاہ مہتہ کی موت نے تلک کے کانگرس میں داخل ہونے

21- New India, 4th April, 1917. P.2.

22- Home Department, Political Proceedings (Confidential) September 1916, Nos 652-55.

23- Annie Besant Builder of India, PP. 75-[illegible].

میں سہولت پیدا کی۔ انھوں نے نہ صرف ہوم رول کے مقصد کی حمایت کی بلکہ اس تحریک کا جھنڈا خود اپنے وطن کے صوبہ میں اپنی ذمہ داری پر بلند کیا اور مقصد کے لیے اپنے پیروؤں کو مجتمع کیا۔ کلکتہ میں کانگرس اور مسلم لیگ کے ایک مشترکہ جلسہ میں اینی بیسنٹ نے کامیابی کے ساتھ اپنا اثر استعمال کرکے دونوں جماعتوں میں فرقہ وارانہ نمایندگی پر صلح کرادی۔ یہ مشترکہ فیصلہ اس میثاق کا پیش رو تھا جس پر لکھنو میں دستخط ہوئے جو اس سلف گورنمنٹ کے اس ریزولیوشن کی بنیاد تھا جو کانگرس نے 1916ء میں پاس کیا۔ اور جس نے مانٹیگو پر اصلاحات کا دباؤ ڈالا۔

ہوم رول لیگ کا مقصد یہ تھا کہ ہندستان کو نو آبادیات کے طرز کی حکومت دی جائے اس مقصد کو اختیار کر لینے سے مسز بیسنٹ کے ہاتھ بہت مضبوط ہو گیے اور انھوں نے ایک طوفانی مہم ہوم رول لیگ کے مقصد کے جلد حاصل ہونے کے لیے شروع کر دیا وہ لیگ کی صدر، اور آرنڈیل (ARUNDALE) تنظیم کے سکریٹری سی، پی راماسوامی آیر منجلا اور لوگوں کے جنرل سکریٹری، اور بی پی واڈیا خزانچی مقرر ہوئے۔ تمام ہندستان میں اس کی دو سو شاخیں قایم ہوگئیں۔ ینگ انڈیا میں ہوم رول لیگ کا ایک صفحہ مقرر تھا۔ اسی میں وہ شاخوں کو ہدایت دیتی تھیں کہ کیا کرنا چاہیے۔ ممبران پر لازم تھا کہ درجات تعلیمی قایم کر کے سیاسی مضامین پر تقریریں کریں، لائبریریاں قایم کریں جہاں پبلک کو سیاسیات پر لٹریچر پڑھنے کو ملے، سیاسی امور متنازعہ پر پمفلٹ تیار کیے جائیں اور ان کی اشاعت کی جائے۔ لیگ کے ممبران کا یہ بھی کام تھا کہ اپنے اپنے حلقوں میں سوشل ورک کریں، میونسپلٹی کی کارروائیوں میں حصہ لیں، پبلک جلسوں کی تنظیم کریں اور لکچروں کا انتظام کریں تاکہ ہوم رول لیگ کے مقاصد برابر پبلک کی نگاہوں کے سامنے رہیں۔ تقریباً 26 پمفلٹ تو انگریزی زبان میں شایع کیے اور کچھ مقامی دیسی زبان میں۔ ان میں گورنمنٹ آف انڈیا کے نظم و نسق پر کڑی نکتہ چینی کی تھی اور سلف گورنمنٹ کا مطالبہ ہوتا تھا۔ مسز بیسنٹ نے خود تمام ملک میں طوفانی دورہ کیا اور کلکتہ، لکھنو، الہ آباد اور دوسرے چھوٹے اور بڑے شہروں میں لکچر دیا، وہ گورنمنٹ کی خارجہ پالیسی، ان مصارف ملکی کی پالیسی، ان کے ملازمتوں میں بھرتی کے طریقوں، ان کے صنعت اور تعلیم کو نظر انداز کر دینے اور ان کی مال گزاری کی پالیسی ان سب پر کڑی نکتہ چینی کرتی تھیں۔ اپنے ہفتہ وار رسالہ کامن ویلتھ، اور خاص کر

اپنے روزنامہ اخبار 'نیو انڈیا' میں وہ کالم پر کالم ہندستان کے سوراج کے مطالبہ کو مبنی برحق ثابت کرنے کے لیے لکھتی تھیں۔

سودیشی تحریک کو پھر سے زندہ کرنے اور قومی بنیادوں پر تعلیم گاہیں کھولنے کا انتظام قایم کرنے کی بھی کوشش کی گئی۔

ریجنالڈ کریڈاک نے لکھا ہے "اس وقت جو حالت ہے وہ ایک انتہائی شوار شکل کی ہے۔ معتدل لیڈران کو ان حلقوں کی کوئی حمایت حاصل نہیں ہے جو کوئی آواز اٹھا سکتے ہیں۔ اور یہ لوگ تلک اور بیسنٹ کے پیروں کے نشان پر چل رہے۔ ہوم رول پر زور دیا جا رہا ہے اور کہا جاتا ہے کہ بے شمار بے عنوانیوں اور تکالیف جن کا شکار ہندستان ان کے دفعیہ کا اور کوئی علاج سوائے ہوم رول کے اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا دستوری شورش کے پردے ہیں ان لوگوں کے دماغوں ہیں جو اخبارات پڑھتے ہیں حکومت برطانیہ کے خلاف زہر بھرا جا رہا ہے

ان کارروائیوں نے گورنمنٹ کو ہراساں کر دیا اور 16 رجون 1917 کو مسز بیسنٹ اور ان کے دو متبعین کو پنٹ لینڈ (PENTLAND) گورنر مدراس نے اپنے حکم سے نظر بند کر دیا۔ اس حکم کے خلاف غصہ میں بھرا ہوا شور و غوغا اٹھا۔ یہ غصہ عالم گیر تھا اور صوبہ کے تمام لیڈران ہر مکتبہ فکر کے مثل موتی لال نہرو تیج بہادر سپرو، سی، آر، داس، سی، پی۔ راما سوامی آئیر، ایم۔ اے جناح بھولا بھائی ڈیسائی، ایم، آر۔ جیکر اور دوسرے گورنمنٹ کو ذلیل کرنے کے لیے ہوم رول لیگ میں شریک ہو گیے۔

ہوم رول کی دکالت . . . . . نے بہت سے لوگوں کی حمایت جیت لی مہاراجہ بیکانیر نے "راجگان کی اپنے بھائی ہندستانیوں کے مقصد کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا"[25]

آغا خاں نے خفیہ طریقہ پر حکومت برطانیہ کو مشورہ دیا کہ ہندستان کو اس کی اس عظیم خدمات کا جو اس نے جنگ میں انجام دی ہیں معاوضہ دیا جائے/ 26

جناح نے مسز بیسنٹ کی نظر بندی کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ ہوم رول لیگ کی۔

24- Quoted by Kanji Dwarka Das, India's fight for freedom. P.35.

25- Panikkar. K.M.H.U. The Maharaja of Bikaner. a biography. P.174.

26- Kanji Dwarka Das, Op. cit. P.36.

شاخ بمبئی کے صدر کی حیثیت سے انھوں نے کہا کہ "یہ ہوم رول یا سلف گورنمنٹ کی اس اسکیم کو نظر بند کرنے کے مترادف ہے جو انڈین نیشنل کانگرس اور مسلم لیگ نے باہمی اتفاق سے منظور کیا ہے" 27

گاندھی جی نے پرائیویٹ طور پر جیمس فورڈ کو لکھا "میری ناچیز رائے میں یہ نظر بندیاں فاش غلطیاں ہیں" 28

ڈاکٹر سپرو نے مسز بیسنٹ کو پرجوش خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا "1915ء میں انھوں نے ہندستان کے لیے ہوم رول کا خیال اپنے دماغ میں پیدا کیا جب ملک میں عام بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ ہم لوگ اصلاحات اور کونسلوں کی توسیع کی باتیں کر رہے تھے اور سوراج کے لیے حلف اٹھاتے تھے لیکن ہمارے خیالات مبہم تھے اور ابر آلود۔ ان کی صاف دماغ سے سوچنے کے انداز نے ہمارے مبہم اور غیر متعین شکل دے دی اور نتیجہ یہ ہوا کہ ہندستان کے لیے ہوم رول ایک منظم تحریک بن گئی" 29

جب مانٹیگو نے 20 اگست 1917 کو پارلیمنٹ میں اپنا اعلان کیا تو اگر پہلے نظربندی کے کوئی معنی رہے بھی ہوں تو اس وقت وہ بالکل ختم ہو گیے۔ مسز بیسنٹ 17 ستمبر 1917 کو رہا کردی گئیں۔ ان کی ہر دلعزیزی بام عروج کے آخری منزل تک پہنچ گئی تھی۔ جو آئندہ کانگرس کا اجلاس کلکتہ میں ہونے والا تھا وہ اس کی صدر تقریباً اتفاق رائے سے چنی گئیں۔ جو خطبہ انھوں نے دیا اس میں اپنے اعتقاد کو ان الفاظ میں ظاہر کیا۔

"یہ دیکھنا کہ ہندستان آزاد ہو گیا۔ یہ دیکھنا کہ وہ دنیا کی قوموں میں اپنا سر اونچا اٹھائے ہوئے یہ دیکھنا کہ اس کے لڑکے اور لڑکیاں ہر جگہ عزت کی نگاہ سے دیکھے اور دیکھی جا رہی ہیں، یہ دیکھنا کہ وہ اپنے عظیم ماضی کا اپنے کو حقیقی وارث ثابت کر رہا ہے اور اس کام میں مشغول ہے کہ اس سے عظیم تر مستقبل کی تعمیر کرے۔ کیا یہ سب کام ایسے نہیں ہے جن کے لیے محنت کی جائے اور ان کے لیے قربانیاں دی جائیں اور کیا یہ

27- Hector Bolitho, Jenah. PP. 67-68.

28- Kanji Dwarka Das op. cit. P. 46.

29- Ibid. P. 50.

ایسے مقصد نہیں ہیں جن کے لیے جیا جائے اور مرا جائے"۔ 30

اپنی تقریر کی عدیم المثال بلند نظری، اپنی تنظیم کی حیرت خیز صلاحیتوں، اور اپنی اثر انداز شخصیت کی عجیب و غریب طاقت سے وہ اس میں کامیاب ہوگئیں کہ انھوں نے سلف گورنمنٹ کو ہندستان کی سیاست کا مرکزی اور فوری مقصد بنا دیا۔ ان کی یہ خوش قسمتی تھی کہ ان کو اپنے کام میں ایک ایسے شخص کا تعاون حاصل ہوا جو ان ہی کے برابر طاقتور اور عزم راسخ رکھنے والا تھا یعنی تلک۔

مانڈلے سے رہا ہونے کے بعد تلک نے فوراً اپنا پلان تیار کرنا شروع کر دیا کہ قومی تحریک کو پھر زندہ کرنے کے لیے کیا عمل اختیار کیا جائے۔ وہ لوگ جنھوں نے آج تک کانگرس میں کوئی دلچسپی نہیں لی تھی۔ وہ ان کی آواز پر لبیک کہتے اور ان کی قیادت کے پیچھے چلنے کے لیے تیار تھے۔

بمبئی پراونشیل کانفرنس کا جو اجلاس پونہ میں 8 مئی 1915 کو ہوا اس کے حاضرین کی تعداد اور اس کی کارروائیوں میں جوش و خروش نے اس بات کا مظاہرہ کیا کہ مہاراشٹر کے لوگوں کی محبت پر ان کا کتنا عظیم غلبہ تھا۔ کانفرنس میں انھوں نے زور شور سے ساتھ ڈیلیگیٹ صاحبان کو پکارا کہ وہ سوراج یا ہوم رول کو فوراً دیے جانے کا مطالبہ کریں۔ تلک نے یہ محسوس کیا کہ ان کی جدوجہد کی کامیابی کے لیے یہ ضروری ہے کہ کانگرس کو وہ اپنے ساتھ لے کر چلیں۔ اس قومی ادارے میں داخل ہونے کے لیے بمبئی کے 1915 کے اجلاس میں دروازہ کھولا جا چکا تھا۔ تلک نے فوراً اپنے اوپر ایک فرض سا عائد کر کے اپنے ان انتہا پسند ساتھیوں کو جو شک و شبہہ میں مبتلا تھے۔ یہ یقین دلانے کی کوشش شروع کی کہ پرانے تعصبات کو دامن سے جھاڑ دیا جائے اور کانگرس میں شرکت کی جائے

بلگام کے مقام پر 1916 میں پراونشیل کانفرنس کے اجلاس میں یہ معاملہ طے ہو گیا اور تلک کا مشورہ مان لیا۔

اس کے بعد وہ ان طاقتوں کو مجتمع کرنے میں لگ گیے جو صورت کی باہمی پھوٹ کے

---

30 - Congress Presidential Address (Second Series 1911-10) Natsan, (1934). P. 377.

بعد منتشر ہو گئی تھیں۔ بلگام کانفرنس کے بعد ہی ایک نئی سیاسی جماعت ہوم رول کے نام سے قایم کر دی گئی تلک نے ایک طوفانی دورہ اس کی اشاعت وتشہیر کے لیے کیا ان دونوں لیگوں یعنی ایک تلک کی دوسری انی بیسنٹ کی۔ نے اپنا کام یکجائی سے کرنا شروع کیا اور زور دار پروپیگنڈا چلایا۔ مسز بیسنٹ پونہ آئیں اور انھوں نے ایک جلسہ میں تقریر کی جس کی صدارت تلک نے کی۔

تلک کی کارروائیوں کو دیکھ کر حکومت کے ابرو پربل آگیے اور اس نے تلک سے چالیس ہزار روپیہ کی ضمانت نیک چلنی کی طلب کی۔ تلک نے ہائیکورٹ میں اپیل کیا۔ اور ضمانت کا حکم منسوخ ہو گیا اس کے بعد قانون دفاع ہند Defence of India Act میں احکام جاری کر کے ان کا پنجاب اور دلی صوبہ میں داخلہ ممنوع قرار دے دیا گیا۔ لیکن جتنا زیادہ گورنمنٹ اپنی ناراضگی کا اظہار کرتی گئی۔ اتنا ہی زیادہ اپنا ملک میں ان کی ہر دلعزیزی ترقی کرتی گئی اور 1916 میں وہ اپنے ملک کے دیوتا بن چکے تھے۔

انتہاپسندوں کے کانگرس میں داخل ہونے پر جو پابندی لگائی گئی تھی اسے کانگرس نے دسمبر 1915 میں اٹھا لیا تھا۔ 1916 کے سشن میں تلک نے اس سے پورا فائدہ اٹھایا۔ وہ ایک اسپیشل ٹرین سے 300 ڈیلیگیٹ کو بمبئی سے لکھنؤ کانگرس میں شریک ہونے کے لیے لے گیے۔ اس تمام سفر میں ہر اسٹیشن پر اس پارٹی کا پرجوش استقبال کیا گیا لکھنؤ کے اسٹیشن پر ہزاروں آدمی اس عظیم رہنما کی زیارت کے لیے جمع ہوئے تھے جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ ان کی کتنی مدح وستائش ان کے دلوں میں ہے۔ کانگرس نے پرجوش نعرہ ہائے تحسین سے ان کا خیر مقدم کیا۔

انھوں نے ڈیلیگیٹوں پر اپنا عظیم اثر اس لیے استعمال کیا کہ کانگرس اور مسلم لیگ میں جو معاہدہ ہوا تھا اسے وہ تسلیم کرلیں۔ جب ان پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ حد سے زیادہ مسلمانوں کے آگے جھک گیے ہیں تو ان کا جواب یہ تھا کہ "مجھے یقین ہے کہ تمام ہندستان کے ہندؤں کے جذبات کی نمائندگی کر رہا ہوں جب میں یہ کہتا ہوں کہ ہم حد سے زیادہ جھک ہی نہیں سکتے تھے اگر سلف گورنمنٹ صرف مسلمانوں کو یا ہندستان کے کسی دوسرے

31- Tahmankar, D.V. Lokamanya Tilak. P. 248.

فرقہ کو عطا کر دی جائے تو میں اس کی کچھ پرواہ نہ کروں گا۔ تب لڑائی ان لوگوں اور ہندستان کے دوسرے طبقوں کے درمیان ہوگی نہ کہ یہ مثلث لڑائی جو اس وقت لڑی جارہی ہے۔

تلک کی زور دار وکالت اور نیشنلسٹ ڈیلیگیٹ صاحبان کی ان کی مسلم قیادت کے بغیر یہ امر مشتبہ ہے کہ آیا میثاق لکھنو منظور ہو جاتا۔ یہ ایک عظیم ذاتی فتح تھی کہ انھوں نے کانگرس کو اس بات پر راضی کرا دیا کہ اس نے مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخاب اور سنٹرل اور پراونشل کونسلوں میں اور مسلمانوں کی تعداد کے تناسب کو منظور کر لیا۔

متحدہ کانگرس اور مسلم لیگ نے تجاویز اس امر کی پاس کیں کہ وقت آگیا ہے۔ کہ شہنشاہ معظم از راہ مراحم خسروانہ ایک باضابطہ اعلان جاری کریں جس میں اس کا اشتہار عام کر دیا جائے کہ برطانیہ کی پالیسی کی غرض و غایت یہ ہے کہ ہندستان کو سلف گورنمنٹ عطا کی جائے۔

VII سیاسی پیش قدمی پر سرکاری رویہ

1907ء میں سورت کے پھوٹ کے بعد کانگرس پر معتدلین چھائے ہوئے تھے۔ اور نیشنلسٹ یا بائیں بازو کے لوگ جنھیں انتہا پسند بھی کہا جاتا تھا اقلیت میں تھے۔ جس پارٹی کی قیادت کی باگ فیروزشاہ مہتہ، گوکھلے اور بنرجی کے ہاتھوں میں تھی وہ اب بھی یہ امید باندھے ہوئے تھے کہ وہ اپنے مقاصد کو اقوام برطانیہ کی فیاضی اور انصاف پسندی سے حاصل کریں گے۔ حالانکہ یہ روز بروز زیادہ نازک اور پرخطر ہوتی جارہی تھی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید اسی چیلنج کے جواب میں ہارڈنگ کا مراسلہ موءرخہ 25 اگست 1911ء دسمبر 1911ء میں شائع کیا گیا۔ اس نے ہندستان کے مستقبل کے بارے میں پرجوش بحث کو جنم دیا۔ جس عبارت نے یہ شور و غوغا پیدا کیا اس کا متن حسب ذیل تھا۔

وقت گزرنے پر ہندستانیوں کے جائز مطالبات اس بارے میں کہ ملک کی گورنمنٹ میں ان کو موجودہ سے زیادہ حصہ دیا جائے منظور کرنا ہوگا لیکن اس وقت سوال یہ ہوگا کہ طاقت کو کیسے تفویض کیا جائے۔ کہ جس سے گورنر جنرل کی کونسل کے اقتدار اعلیٰ کو ضعف نہ لگے۔ اس مشکل کا واحد حل یہ معلوم ہوتا ہے کہ آہستہ آہستہ صوبوں کو سلف گورنمنٹ کی اس سے زیادہ مقدار دی جاتی رہے تاکہ ہندستان میں متعدد نظم و نسق کے ادارے

قایم ہو جائیں جو تمام صوبائی معاملات میں خود مختار ہوں لیکن ان سب کے اوپر گورنمنٹ آف انڈیا ہو جس کے وہ ماتحت ہوں / 32

ہندستان کے معتدلین نے اس بیان کو صوبائی خودمختاری کا وعدہ قرار دیا اور اس کی تکمیل کے لیے دباؤ ڈالنے لگے۔

لیکن اور زیادہ ترقی یافتہ پارٹی یعنی انتہاپسند لوگ حکمرانوں کے نیک ارادوں پر سے اعتماد کھو چکے تھے ان کے لیڈروں پر شک و شبہہ کی نظر ڈالی جاتی تھی۔ اور استبدادی قوانین ان پر لگائے جاتے تھے لیکن انتہاپسند نہ تو خوف زدہ ہوئے اور نہ بیلانے پھیلانے کی گمراہی میں مبتلا ہوئے۔ بی۔سی پال نے سوراج کی ایک اسکیم تیار کر کے شائع کر دی تھی کہ اس سے کم پر ہندستان راضی یا مطمئن نہ ہوگا۔ لاجپت رائے نے ہندستان کے مطالبات کی ان الفاظ میں شرح کی۔

"ہم سیاسی طاقت اس لیے چاہتے ہیں تاکہ عوام کی ذہنی اور سیاسی سطح کو اونچا اٹھا سکیں ہماری منزل مقصود حقیقی آزادی، مساوات اور سب کے لیے یکساں مواقع ہیں۔ ہم اس بات کی آزادی چاہتے ہیں کہ ہم جس طرح چاہیں قانون سازی کریں اور اپنے مالیات کا خود فیصلہ کریں یہ ہے ہمارا حقیقی مقصد جس کے لیے ہم ہوم رول کا مطالبہ کرتے ہیں" / 33

اس درمیان میں مسلم لیگ میں تبدیلی پیدا ہو گئی تھی۔ 1913 میں اس نے اپنا مقصد ہندستان میں ذمہ دار حکومت قایم کرنا قرار دیا تھا اور کانگرس سے تعاون کرنے کے لیے قدم بڑھانا شروع کر دیا تھا۔

لیکن فروری 1912 میں کرزن اور لیڈی ڈاون نے خطرے کی گھنٹی کو بجایا انھوں نے

32- Home Department Proceedings Delhi: A, December 1911, Nos 8-11. From the Governor General in Council to the Secretary of State for India, 25 August, 1911.

33- Joshi, V.C. (ed) Lala Lajpat Rai, Writings & Speeches, Vol I 1888-1919, P.345.

گورنمنٹ پر الزام عائد کیا کہ وہ ہندستان میں کسی قسم کا وفاقی ہوم رول نافذ کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔/ 34

کریو نے لبرل گورنمنٹ کی پالیسی بتائی اور ایوان کو یقین دلایا کہ اس قسم کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔

لیکن ابھی مشکل سے ایک ہفتہ گزرا ہوگا کہ مانٹیگو نائب وزیر ہند' نے اپنے کیمبرج کے حلقہ انتخاب کو 28 فروری کو خطاب کرتے ہوئے کہا "وہ بیان (یعنی بارڈنگ کا) اس منزل اور اس مقصد کی نشاندھی کرتا ہے۔ جس کی جانب اور جس کے لیے ہم نے قدم اٹھانے کا ارادہ کیا ہے۔ ایسا نہیں ہوسکتا کہ بلا کسی پالیسی کا اعلان کیے ہم بس بے مقصد بہے چلے جائیں۔ ایک نئی نسل ابھری ہے اور ایک نیا مکتبہ فکر، ہماری تعلیم اور جدید یورپین علم کے اکتساب سے عالم وجود میں آیا ہے۔ اور ہم سے سوال ہو رہا ہے کہ "تم لوگ ہمارے ساتھ کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو"/36

بونرلا (BONAR LAW) نے 2 اپریل کو دار العوام کی توجہ اس جانب مبذول کی کہ کریو نے جو بیان دار الامراء میں دیا ہے اور مانٹیگو نے کیمبرج میں جو تقریر کی ہے۔ ان دونوں میں تضاد ہے۔ انچکیپ (INCHCAPE) نے ہز مجسٹی کی گورنمنٹ کی رائے کیا ہے۔ اس پر بیان کا مطالبہ کیا۔ کریو نے برطانیہ کی جو پالیسی ہندستان میں ہے اس کی شرح کی۔ جہاں تک ہندستان کا یہ مطالبہ ہے کہ ہندستان کو نو آبادیات کے نمونہ کی سلف گورنمنٹ دی جائے انھوں نے زور دے کر کہا "میں صاف صاف اور قطعیت کے ساتھ یہ اعلان کرتا ہوں جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ تاریخ کے اسباق میں جہاں تک ان کا علم ہے یا دنیا کے موجودہ حالات میں جیسا کہ وہ میرے فہم و ادراک میں ہے کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو اس طرح کے خواب زمانہ بعید میں بھی پورا ہونے کو ممکن قرار دے"/ 37

---

34 – House of Lord, Debates, 5th Series, Vol. 12, february 1912, Col – 143–46.

35 – Ibid; Cols – 155–6.

36 – Montagu, E.S. Speeches on Indian question, PP. 358–59.

37 – House of Lords Debates, 5th Series, Vol 12, 29 July 1912, Cols, 44–45

مار نے سے زیادہ دکھائی کے ساتھ ان کے لبرل جانشین نے توآبادیات طرز کی خود مختار حکومت کو ایک ایسی دنیا قرار دے کر رد کر دیا۔ جو اتنی دور ہے جتنا بحر عظیم ۔ اوقیانوس یا زمین اور تحت الثری کا درمیانی حصہ۔

ہندستان میں اس مراسلہ پر وائسرائے کے اگزیکیوٹو ممبران نے بحث کی ۔کریڈاک ہوم ممبر نے ایک طویل نوٹ لکھا جس میں انھوں نے اپنا یہ خیال مضبوطی سے ظاہر کیا کہ ہندستان ایک قوم نہیں ہے اور نہ وہ آئندہ کسی ایسے زمانہ میں جو ان کے تصور میں آسکتا ہو قوم بن سکتا ہے۔ کیوں کہ ایک قومی حکومت کے لیے یہ لازم ہے کہ اس کے لوگوں میں دو شرائط پوری کرنے کی صلاحیت ہو۔

(۱) نسلی اور مذہبی منافرت کلیتہً مٹ گئی ہو۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب مختلف نسلیں آپس میں گتھ کر ایک ہو گئی ہوں۔ ذات کا خاتمہ ہو گیا ہو۔ اور باشندگان ملک کی کثیر تعداد اپنا مذہب بدل چکی ہو تاکہ سب کا ایک مذہب ہو جائے۔

(۲) اور یا تو کسی ایک مذہب یا عظیم دیسی ریاستوں میں سے کسی ایک ریاست کا ملک کے تمام بقیہ پر زبردست تسلط ہو۔

چونکہ ان میں سے کسی بھی شرط کا صوبوں تک پورا ہونا ممکنات سے نہیں معلوم ہوتا اس لیے سلف گورنمنٹ کا کوئی سوال نہیں ہے۔/ 39

صوبوں میں سلف گورنمنٹ کا چونکہ یہ مطلب تھا کہ صوبہ کا نظم ونسق ہندستانیوں کے ہاتھ میں ہو اس لیے اسی کے برابر وہ بھی ایک خواب تھا۔ اور ایک ایسا خیال نہ تھا جس پر عمل درآمد ہو سکے۔ اس لیے کہ اگر خود مختاری دے دی گئی تو دو میں سے ایک اس کا نتیجہ ہوگا۔ یعنی یا تو سنٹرل گورنمنٹ اپنی فوقیت و برتری کو برقرار رکھنے کے لیے طاقت کا استعمال کرے یا دست بردار ہو جائے۔

---

38 - *Home Department Political (Deposit) Proceedings, September 1912. Subject: Consideration arising from the interpretation of Paragraph 3 of the Government of India Despatch dated August 25, 1911, Minute of R. Craddock, dated 6 July, 1912*

کریڈاک نے جو حل پیش کیا تھا اس میں سلف گورنمنٹ کو انھوں نے رد کر دیا تھا لیکن وہ ایک اچھی گورنمنٹ قایم کرنے کے حق میں تھے یعنی "صحت عامہ، دولت، اور زراعت میں ترقی ہو اور ہندستانیوں کی صلاحیت اور قابلیت کی قدر کی جائے" بہ سبب محب وطن کو انھوں نے مشورہ دیا کہ "برطانوی رہنماؤں کے زیر قیادت جو منظم کوچ منزل کی جانب ہو رہا ہے اسے تسلیم کریں" اور سلف گورنمنٹ کے بارے میں سب کچھ بھول جائیں۔ اگر انگلستان کے جمہوری نظام کو ارتقائی منزلوں سے گزار کر قایم کرنے میں آٹھ سو سال لگ گئے تو ہندستان کیوں عجلت کرتا ہے کہ اسی منزل کی جانب سفر وہ اس سے کم میعاد میں طے کرے۔ انھوں نے بڑے راسخ انداز میں اپنا یہ عقیدہ ظاہر کیا کہ ہندستان کے سیاسی سفر کی نہ کوئی منزل ہے اور نہ ان کے لیے کوئی موعودہ ملک ہے جہاں وہ پہنچ جائیں۔

کریڈاک کا میمورنڈم ہندستانی افسران کے ذہن و مزاج کو آشکار کرتا ہے بارڈنگ نے کریڈاک کے مراسلہ پر یہ نوٹ لکھا کہ "انھوں نے اپنے مراسلہ میں سرجان جنکنس (JENKINS) کے میمورنڈم مورخہ 24 جون 1911 سے چند حوالے گورنمنٹ آف انڈیا کی پالیسی کی وضاحت کے لیے درج کر دیے ہیں ان کے مطابق پالیسی کا منشا یہ تھا کہ۔

(۱) اصول لامرکزیت

(۲) نظم و نسق میں ہندستانی جواب تک ملازم ہیں ان کی تعداد میں اضافہ

(۳) ہندستان میں برطانوی راج کی مداومت

انھوں نے صاف صاف لکھا کہ برطانوی نوآبادیات کے طرز کی سلف گورنمنٹ کا قطعی کوئی سوال ہی نہیں ہے۔" 39

علی امام جو ان دنوں ہز اکسلنسی کی اگزیکیوٹو کونسل کے لا ممبر تھے انھوں نے بارڈنگ کے بیان کی معمولی ادھر ادھر کی باتیں کر کے تائید کی۔ انھوں نے شان و شوکت دکھانے کے انداز میں یہ خیال ظاہر کیا کہ ہندستان کا مستقبل ارتقا کا ایک مسئلہ ہے نہ کہ ایک گرم خانہ جہاں کوئی پودا باغبان کی مرضی کے مطابق زبردستی جلد پروان چڑھا دیا جاتا ہے یا گرمی کم کر کے اس کی نشو و نما دیر میں ہوتی ہے" 40

---

39. Ibid.

40. Ibid.

امرت بازار پتریکا نے غمگین لہجہ میں لکھا کہ سکریو نے خود مختاریت کے سر پر کاری ضرب لگائی ہے لیکن سوریندر ناتھ بنرجی مایوس نہیں ہوئے انھوں نے باصرار کہا کہ "لارڈ میکالے نے پہلے ہی اس کی پیشین گوئی کردی تھی لارڈ مٹکاف کی یہی آرزو تھی، الفنسٹن اور منرو نے اسی کو ہندستان میں برطانوی راج کا مقصد بتلایا تھا، معتدلین کے سینہ میں امید ہمیشہ ابھرتی رہی

VIII جنگ عظیم اور اس کے اثرات

جنگ عظیم جو اگست ۱۹۱۴ میں شروع ہوئی اس نے ہندستان کی قومی تحریک کے لیے ایک مہمیز کا کام کیا اس نے اس کی رفتار تیز تر اور اس کے مقصد کو واضح الفاظ میں متعین کردیا لڑائی یورپین طاقتوں کے درمیان اقتصادی رقابتوں اور نو آبادیات کی توسیع کے سلسلہ میں ہوئی تھی۔ جرمنی نے جس تیزی سے صنعتی ترقی کی تھی اور اس کی دبی طاقت جس طرح بڑھتی جارہی تھی ان دونوں سے انگلستان کی بحری اور سیاسی بالادستی کو خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ یہ ظاہر تھا کہ ان دو گروہوں کی باہمی رقابت کا نتیجہ عظیم آویزش ہوگا۔

برطانیہ حد سے زیادہ جرمن افواج کی شکست کا آرزو مند تھا۔ اور اس کے لیے کل مملکت برطانیہ کے وسائل و ذرائع کو دشمن کے خلاف استعمال کرنا چاہتا تھا۔ قدرتاً اس کی یہ خواہش تھی کہ ہندستان جنگ کی جدوجہد میں جہاں تک ممکن ہے زیادہ سے زیادہ حصہ لے۔ ہندستان ضرور ایسا کرسکتا تھا مگر اس کے لیے شرائط یہ تھے کہ ایک طرف باشندگان ملک پر برطانیہ کی حمایت کریں اور دوسری طرف مخالف برطانیہ کارروائیاں کرنے سے ہاتھ روکیں اور اس طرح حکومت کو پریشانیوں سے نجات دیں تاکہ وہ تمام قابل افراد اور مادی وسائل کو جنگ جاری رکھنے میں استعمال کرسکے۔

برطانوی حکمرانوں کو سخت استعجاب کے ساتھ پہلا مقصد کافی حد تک حاصل ہوا۔ تمام ہندستان پر وفاداری کی ایک لہر دوڑ گئی۔ ۱۹۱۴ میں کانگرس نے اپنے مدراس کے اجلاس میں یہ رزولیوشن منظور کیا کہ ہز مجسٹی کی گورنمنٹ اور شہنشاہ معظم اور باشندگان انگلستان کی خدمت میں کانگرس تخت برطانیہ کے ساتھ عظیم جاں نثاری، برطانیہ سے رابطہ رکھنے میں بلا لغزش وفاداری، اور مملکت برطانیہ کا تمام خطرات کا مقابلہ کرتے ہوئے اور ہر قیمت پر

ساتھ دینے کے عظم راسخ کا اظہار کرتی ہے"/ 41

تلک جو انتہا پرستوں کے ایک عظیم لیڈر تھے اور جن کو گورنمنٹ برطانوی راج کا سخت دشمن سمجھتی تھی۔ انھوں نے اعلان کیا "ایسے نازک موقع پر ہندستان کا خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، امیر ہو یا غریب، یہ فرض ہے کہ وہ حتی الامکان جہاں تک اس کی طاقت ہو ہز مجسٹی کی گورنمنٹ کی مدد کرے"/ 42

گاندھی جی فوج کے خود ساختہ بھرتی کرنے کے ایجنٹ بن گئے۔

مسلمان اس برتاؤ سے بددل تھے جو مغربی طاقتوں نے بالعموم اور انگلستان نے بالخصوص ترکی کے ساتھ برتا تھا لیکن مسلم افواج بڑے جوش و خروش سے ترکوں کے خلاف گیلی پولی اور مقدونیہ میں لڑیں اور اس بات کا مظاہرہ کر دیا کہ مذہبی رہنماؤں یعنی مولویوں اور ملاؤں کا ان کے دماغوں پر کتنا اثر تھا۔

سوسائٹی کا دوسرا طبقہ یعنی راجگان تعلقداران، تجار اور غیر سیاسی حلقے وفاداری کا رجحان کانے میں سیاسی لیڈروں سے سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے تھے یہ صحیح ہے کہ مختلف فرقوں، مختلف مفاد رکھنے والوں اور طبقوں میں اس کے متحرک کرنے والے جذبات کے اسباب مختلف تھے۔ کچھ تو حکمرانوں یا سرکاری لوگوں کے ساتھ روایاتی۔ عقیدت مندی و احترام کی وجہ سے اور کچھ فرقہ وارانہ انعامات اور کچھ قومی مفاد حاصل کرنے کے لیے اس راہ پر آئے تھے۔ یہ موافق برطانیہ وضع بہت سے۔ طریقوں سے لڑائی لڑنے میں مددگار تھی۔

اس نے گورنمنٹ میں برطانوی اور ہندستانی دونوں قسم کی فوجوں سے محروم کر دینے اور ان کو بیرون ملک محاذ پر بھیج دینے کے لیے اطمینان پیدا کر دیا۔ اس نے ہندستان سے عظیم مقدار میں آدمی، روپیہ اور مادی سامان بھیجنے کی کوشش میں مدد کی۔ اس نے

41- The Indian National Congress (2nd Edition, Natesan Co.) Part II, P. 165.

42. Tahmankar, D.V., op. cit, P. 210.

جرمنی کا جو پلان انقلابی تحریکات میں مدد دینے کا تھا اس کی ناکامی کی گارنٹی دے دی۔

ہندستان نے ایک کثیر تعداد میں فوج لڑائی کے اعلان کے فوراً بعد فرانس بھیجی تاکہ جرمنوں کے آگے بڑھنے کو اس وقت تک روکے رکھے جب تک برطانوی فوجیں اور نوآبادیات کی فوجیں تربیت پاکر اور اسلحوں سے لیس ہوکر پہنچ نہ جائیں۔ اور مقابلے کو اپنے ہاتھ میں نہ لے لیں بعد ازاں ہندستان مشرقی افریقہ، مصر، فلسطین اور مقدونیہ، سے بری و بحری سفر سے جنگ میں شمولیت کے لیے افواج مرتب کر کے روانہ کی گئیں۔ مجملہ ۰۰۰ر ۰۰ ۱۲ ہندستانیوں کو زمانہ جنگ میں فوج کے اندر بھرتی کیا گیا۔ اور تقریباً اسی تعداد میں ہندستانی افواج کو فوجی آلات سے مسلح کر کے سمندر پار بھیجا گیا ان میں دس فیصد قتل ہو گیے/43

جس طرح لڑائی آگے چلتی رہی اسی طرح اتحادی افواج منعینہ مشرق وسطی کے لیے چھوٹے چھوٹے ہتھیاروں گولہ، بارود، کپڑے اور غذائی سامان کا ہندستان مرکز بنتا گیا۔

ہندستان نے جنگ میں مدد دینے کی جو عظیم کوشش کی۔ اس نے اقوام برطانیہ اور برطانوی مدبرین کو سخت تعجب میں ڈال دیا۔ وزیر اعظم اسکوتھ نے تسلیم کیا "قومی او ملوکیت پسندانہ حب الوطنی کے جن متاثر کرنے والے جذبات کا مظاہرہ جنگ کی وجہ سے ہوا۔ ان میں سے کسی نے بھی اقوام برطانیہ کی حیات پر اتنا اثر نہیں ڈالا جتنا کہ راجگان اور باشندگان ہندستان نے ان کی ضرورت کی پکار پر جو عظیم الشان لبیک کہا تھا"/ 44

چارلس رابرٹ نائب وزیر ہند نے 26 نومبر 1914 کو دارالعوام میں تقریر کرتے ہوئے اس کو اس طرح بیان کیا "یہ نمایاں اور تاریخی واقعہ، یعنی مملکت برطانیہ کی اس عالمگیر

43- For Indian's war effort See India in 1917-18, PP-5-20, and the Presidential Speech of Pandit Madan Mohan Malviya, 1918, Congr-ess Presidential Address Natason 1934, Second Series PP. 380-81.

44- Parliamentary Debates, House of Commons, 5th Series, Vol 66 Col 955.

جنگ میں پوری قوت سے ہندستان کی شرکت "/ 45

بعد کو انھوں نے اس کا اضافہ کیا "لیکن یہ واضح ہے کہ ہندستان کا مطالبہ یہ ہے کہ وہ مملکت کا ایک تابع نہیں ہے بلکہ اس کا ایک شریک دار ہے۔ اور اس کی شرکت ہمارے ساتھ معنوی طور پر اور میدان جنگ میں ایسی ہیں کہ جن کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا کہ ہمارا نقطۂ نگاہ بدل جائے۔ جب آئندہ ہم گورنمنٹ آف انڈیا کے مسائل پر غور کریں "/ 46

انھوں نے یہ امید ظاہر کی کہ " اس زمانہ کی مشترکہ کوششوں کا یہ انجام ہوگا کہ ہندستان کو یہ محسوس ہوگا کہ وہ آزاد مملکت میں ایک مقام رکھتا ہے اور وہ مقام اس کے لیے متعدد ہو چکا ہے جو اس کی جنگجو نسلوں اور ان کے بچوں کی حب الوطنی کے لائق ہو/ 47

جس طرح ہندستان کے حوصلے بلند ہوئے انگلستان کے نیاضانہ مزاج کا دھارا گھٹ گیا اور ہندستان کے متعلق سوچنے کے پرانے انداز نے پھر اپنا اقتدار حاصل کر لیا۔

ایک خطرناک بات یہ پیدا ہوئی کہ ملوکیت (EMPIRE) کا ایک نیا تصور عالم وجود میں آیا جس کی رو سے سفید فام نو آبادیاں نہ صرف اپنے معاملات میں مکمل آزادی حاصل کیے رہیں گی بلکہ ملوکیت کے دوسرے حصوں کی حکمرانی میں بھی حصہ دار ہوں گی اس طرح ہندستان۔ نو آبادیات کے تابع ہو جائے گا۔

ہندستانی خود یہ محسوس کرنے لگے کہ ان کا ملک ملوکیت کے لیے ایک بہت بڑا سرمایہ ہے اور اس بات پر فخر محسوس کرتے تھے کہ ان کے سپاہی انگریز فوجیوں کے کندھے سے کندھا ملا کر لڑ رہے ہیں۔ برطانوی حربی طاقت کے ناقابل تسخیر ہونے اور سفید فام اقوام کی برتری کا دا ہمہ پارہ پارہ ہو گیا تھا۔ نسلوں کی برابری اور ایک آزاد ملوکیت میں برابر کی شرکت، ایسے خیالات دماغوں میں اس طرح سے پرورش پانے لگے کہ بھی عمل سوالات حل، طلب ہیں۔ ایسے راسخ معتدلین جیسے بھوپندر ناتھ باسو، اور سنہا نے بھی اس امر کی وکالت

45- Ibid, Vol. 68, Col 1357.

46- Ibid.

47- Ibid, Col 1358.

شروع کردی کہ اس بات کا اعلان کر دیا جائے کہ ہندستان کی ترقیات کی منزل سلف گورنمنٹ ہے۔ مسز بیسنٹ اور تلک نے ہوم رول کے مطالبہ سے ہندستان کو بھر دیا۔ برطانوی مدبرین اب ہندستان کے مسئلہ پر ٹال مٹول نہ کر سکتے تھے

۲۰؍اگست ۱۹۱۷ کا اعلان

آسٹن چیمبرلین (Austen Chamberlain) جو بحیثیت وزیر ہند کریو کا جانشین ہوا وہ اس ضرورت کا شعور رکھتا تھا۔ اس نے ہارڈنگ سے جو ہندستان میں 1910 سے تھے۔ درخواست کی کہ وہ اس ریفارم پر اس کے پاس میمورنڈم بھیجیں جس کا اس کی رائے میں جنگ کے بعد گورنمنٹ آف انڈیا میں نافذ کرنا ضروری تھا میمورنڈم اکتوبر 1915 میں بھیج دیا گیا۔ میمورنڈم گویا ان کی رخصتی تقریر تھی جو امپیریل کونسل میں انھوں نے 24 مارچ 1915 کو کی اس نے کہا "میں ایک لمحہ کے لیے بھی اس بات کی حمایت سے انکار نہیں کر سکتا کہ ہندستان کا قومی مقصد سلف گورنمنٹ ہے۔ یہ ایک قطعی جائز تقاضا ہے اور تمام معتدل مزاج انسانوں کی پرجوش ہمدردی کا مستحق ہے" 48

چیمبرلین نے برطانیہ کی مجلس وزارت (کابینہ) کو سمجھا دیا کہ "جو طاقتور اور روز بروز ترقی پذیر مطالبہ اس بات کا ہو رہا ہے کہ ہندستانیوں کو ملک کے نظم و نسق میں اور زیادہ حصہ دیا جائے"۔ اس کا جواب دینے کے لیے عملی قدم اٹھانا ضروری ہے لیکن" جن تبدیلیوں کا ارادہ کیا جائے ان کے متعلق یہ نہ ظاہر کیا جائے کہ ہندستان کو جنگی خدمات میں بطور انعام دیا جا رہا ہے بلکہ یہ کہ ان کو اس لیے عطا کیا جا رہا ہے کہ عام وجوہ کی بنا پر ہم لوگوں نے محسوس کیا ہے کہ مزید آگے بڑھنے کا وقت آگیا ہے" 49

چیمسفورڈ (CHELMSFORD) جس نے 4 اپریل 1916 کو ہارڈنگ سے چارج لیا

48- Budget Session of the Imperial Legislative Council, See Speeches of Lord Hardinge (Ganesh & Co) P. 551.

49- Chamberlain Papers, Minute of War, Cabinet. No 23 3/172. of June 1917. on Indian Reforms.

اپنے تین پیش رؤں کرزن، منٹو، اور ہارڈنگ سے بالکل مختلف مزاج کا تھا۔ وہ کرزن ہی کی طرح ملوکیت پرستانہ خیالات رکھتا تھا۔ لیکن اس میں کرزن جیسی قابلیت کی کمی تھی۔ اس کے اندر نہ تو منٹو جیسی ہوشیاری اور چابک دستی تھی اور نہ ہارڈنگ کی طرح خوش خلقی باوقار طرز عمل اور ہمدردی رکھتا تھا۔ مانٹیگو نے اس کے بارے میں لکھا۔ "وہ دراصل ایک اچھا آدمی ہے۔ نہایت نفیس، لیکن سرد مہر تنہائی پسند اور کم آمیز" / 50

چیمس فورڈ کی دماغی صلاحیت کے بارے میں انھوں نے بددل ہوکر کہا" اس قسم کے آدمیوں کا وائسرے بنانا بالکل غلط ہے۔ یہ لوگ اپنے مسائل پر غلط رخ سے نظر ڈالتے ہیں، یہ لوگ بس وہ کام کرتے ہیں جو ان کے سپرد کر دیا جاتے۔ وہ فائلوں کے سیلاب میں تیرتے ہیں۔ سوچنے میں یہ صرف اپنے ریگولیشنوں پر نگاہ رکھتے ہیں...... سیاسی شعور کا ان میں کلیتہً فقدان ہے" / 51

چیمس فورڈ نے گویا جواباً ایک مراسلہ چیمبرلین کو 24 نومبر 1916 کو بھیجا جس میں انھوں نے اپنی رائے ایسے امر پر ظاہر کر کے اس کی تشریح کی جسے انھوں نے موجودہ وقت کا سب سے بڑا اہم مسئلہ اسے بتایا جو اس وقت ملوکیت برطانیہ کی سب سے بڑے نازک وقت میں ہندستان نے جو عظیم حصہ لیا ہے اس سے پیدا ہوتا ہے اور یہ مسئلہ کے جو خدمات بلا کسی ہچکچاہٹ کے خلوص کے ساتھ ہندستان نے انجام دیا ہے اور مستقل مزاجی کے ساتھ جس وفاداری کا اظہار کیا ہے ان سب کا صلہ دیا جائے اور یہ اس کا جائز حق ہے جو اسے ملے" / 52

ہندستان کے حالات کی تفصیل دینے کے بعد مراسلہ میں گورنمنٹ آف انڈیا کی تجاویز درج کی گئی تھیں۔ ہندستان کے مقاصد کی منزل کو حسب ذیل الفاظ میں بیان کیا گیا تھا۔
"ملک کے نظم و نسق میں ان کو (یعنی ہندستانیوں کو) مسلسل روز افزوں درجہ

50- Waley, S.D. Edwin Montagu, a Memoir, P.144.

51- Ibid.

52. Home Department, Political A, Proceedings, December 1916. No 17, Letter dated November 24, 1916

بدرجہ اضافہ کی راہ سے ہمارے ساتھ شریک کیا جائے"

وائسرائے نے اس کی شرح اپنے ایک خط میں حسب ذیل طرز میں کی جو 20 رجولائی 1916 کو تمام گورنروں اور چیف کمشنروں کو جاری کیا گیا تھا۔/ 53

وہ منزل جو ہماری نظروں کے سامنے ہے وہ یہ ہے کہ برٹش انڈیا کو مملکت برطانیہ کے اٹوٹ حصہ کی حیثیت کی سلف گورنمنٹ عطا کردی جائے۔ لیکن اس منزل کی جانب بڑھنے کی شرح ترقی کا انحصار تعلیم میں ترقی اور وسیع پیمانہ پر اس کے رواج، نسلی اور مذہبی اختلافات کے ملایم ہو جانے اور سیاسی تجربات حاصل کرنے پر لازمی طور سے ہوگا"

اور پھر اس منزل تک پہنچنے کے لیے انھوں نے آگے بڑھنے کی حسب ذیل راہیں بتلائیں۔

(1) ایسے احکامات کا اجراء جن سے موجودہ شکایتیں دور ہوں۔

(2) شہری اور دیہاتی حلقوں میں منزل کی جانب آگے بڑھنے کے لیے قلم اٹھایا جائے۔

(3) نظم ونسق کے اعلیٰ عہدوں پر ہندستانیوں کو اور زیادہ ملازمتیں دی جائیں۔

(4) علم سیاسی نشوونما/ 54

آخری مد کے لیے تین ممکن راستے آگے بڑھنے کے لیے درج کیے گیے۔

(i) موجودہ حلقہ ہائے انتخاب کی جدید تشکیل اور رائے دہندگی کو اور زیادہ وسیع کرنا۔

(ii) منتخب شدہ ممبران کے تناسب میں اضافہ یا یہ کہ کونسل میں منتخب شدہ ممبران کی اکثریت ہو۔

(iii) کونسلوں کے دستوری اختیارات میں توسیع۔

گورنمنٹ آف انڈیا نے احتیاطاً یہ بھی واضح کردیا کہ" ہمارا کوئی ایسا ارادہ نہیں ہے کہ ہم کونسلوں کی اس طرح نشوونما کریں کہ وہ بہ ظاہر شل پارلیمنٹ کے بن جائیں۔ اور نہ تو ہم اس کے لیے تیار ہیں کہ ان کو براہ راست مالی یا انتظامی امور پر غلبہ کسی طرح بھی دے دیں"/ 55

جہاں تک کہ جداگانہ انتخاب کے متنازعہ فیہ مسئلہ کا سوال تھا۔ مراسلہ میں اختلاف

---

53. Ibid.

54. Ibid.

55. Ibid.

بات کا تذکرہ تھا۔ کچھ لوگ تو ایسے تھے جو علاقائی حلقہ ہائے انتخاب کے حق میں تھے۔ اور دوسرے کچھ لوگ ایسے تھے جو طبقات اور مفادات کی بنا پر انتخاب کو ممکن مناسب خیال کرتے تھے یا یہ کہ دونوں طریقوں کو ایک میں ملا دیا جائے۔

آسٹن چیمبرلین نے ایک "انڈیا آفس کمیٹی" اس غرض سے قائم کی کہ وہ ان تجاویز کا مطالعہ و تجزیہ کرے جو وائسرائے نے بھیجے تھے۔ کمیٹی نے اپنی رپورٹ 8 ار مارچ 1917ء کو دی۔ کمیٹی نے کونسل کے ممبران میں اضافہ کے متعلق جتنی بھی تجاویز تھیں ان میں سے بیشتر کو رد کر دیا اور منزل مقصود کے بارے میں حسب ذیل رائے ظاہر کی۔

"ہم اسے دانشمندی سے بعید سمجھتے ہیں کہ ہندستان کے سیاسی رہنماؤں کے سامنے سیاسی ترقی کا ایک ایسا فارمولا لٹکائے رہیں جو ایسے شرائط سے محدود ہے جو اس کے حقیقی معنی کو کالعدم کر دیتے ہیں، اور جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ فارمولا اپنے ابہام کی وجہ سے انڈیا گورنمنٹ میں ہمارے بعد کے آنے والے جانشینوں کے لیے پریشان دماغی کا موجب ہوں۔ ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ حالات کا تقاضا یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ ہم ترقی کے ایسے خیالی منزل کی نشاندہی کریں جو کئی نسلوں کے گزر جانے کے بعد بھی قابل عمل نہ ہو۔ یہ بہتر ہوگا کہ صاف صاف الفاظ میں واضح بیان دے دیں جو ایک ایسی معینہ مدت کے اندر جہاں تک انسانی بصیرت جا سکتی ہے ایسے ریفارم کا حامل ہو جو عمل میں آسکے۔" / 56

چیمبرلین نے ان اعتراضات اور دلائل کے بیشتر حصہ سے اتفاق کیا۔ لیکن یہ توجیہ کی کہ ان کی ذاتی مشکل یہ ہے کہ "اس سے سلف گورنمنٹ کی جانب کوئی واقعی قدم نہیں اٹھتا ہے۔" / 57 ... چیمبرلین یہ کہنے کی جانب راغب تھے کہ "ہمارا مقصد آزاد اداروں کو اس مقصد کے تحت فروغ دینا ہے کہ آخر کار مملکت برطانیہ کے اندر سلف گورنمنٹ قائم ہو۔" / 58

---

56. Chemberlain Papers, Report on Government of India Dispatch Dated November 27. 1916.

57. Chemberlain Papers, Austen Chemberlain to Chelsford. May 15, 1917

58. Ibid.

ہیں انھوں نے کہا کہ وہ پیش بندی کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں کہ اگر معقول مراعات نہ دی گئیں تو سنگین نتائج کا سامنا کرنا ہوگا۔ اور مشورہ دیا کہ ہندستان میں برطانوی پالیسی کا اعلان مخصوص وقار اور باضابطہ رسمی سنجیدگی کے ساتھ ہونا چاہیے۔

انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ "ہم سے وہ لوگ بھی جو برطانوی حکمت کے بہترین مفادات کے بدل خواہاں ہیں وہ بھی اس الزام کا جواب دینے میں مشکل محسوس کرتے ہیں کہ حکومت برطانیہ کسی قسم کے سیاسی مراعات اس وقت تک نہیں دیتی جب تک کہ شورش اپنے آخری نقطہ پر نہیں پہنچ جاتی ہے اور پبلک اپنے مطالبات پر شور وغل مچا کر حکومت کے ہاتھوں کو مجبور نہیں کر دیتی ہے۔ اور جو کچھ بھی دیا جاتا ہے اس کے لیے یہی خیال پیدا ہوتا ہے کہ طوعاً و کرہاً دیا گیا ہے نہ کہ ایک فیاضانہ اور ہمدردانہ جذبے کے تحت" 61

لیکن بہر حال قبل اس کے کہ چیمبرلین ان تجاویز پر جو بڑے ذمہ دارانہ ذرائع سے آئی تھیں کوئی مخصوص عمل کرتا اس کا عہدہ لڑائی کے معاملات کی بھینٹ چڑھ گیا برطانوی افواج کو "میسوپوٹامیہ" میں شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ دریائے فرات کی جانب جو پیش قدمی برطانوی افواج نے کی تھی، اسے ترکوں نے آگے بڑھنے سے روک دیا۔ اور برطانیہ کی فوجیں قطل الامارق میں گھر گئیں۔ اور ان کو جو کمک بھیجی گئی وہ ناکام ہوگئی یہ طے کرنے کے لیے کہ ان ناکامیوں کا کون ذمہ دار ہے۔ ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا گیا اس کی رپورٹ پارلیمنٹ کے سامنے پیش ہوئی۔ 12 جولائی کو مانٹیگو نے بڑے سخت الفاظ میں حکومت ہند کو ملامت کیا انھوں نے کہا کہ "حکومت ہند حد سے زیادہ چوبی، حد سے زیادہ آہنی، حد سے زیادہ ناقابل لچک، اور حد سے زیادہ دقیانوسی ہے۔ اس لیے وہ ان ماڈرن غراض کے لیے جو ہمارے پیش نظر ہیں قطعی کارآمد نہیں ہے" 62

مانٹیگو نے آگے چل کر کہا کہ "اس جنگ کی تاریخ یہ ظاہر کرتی ہے کہ جہاں تک لوکیت

61- Ibid, Ganga Singh, Maharaja of Bikaner, 15 May, 1917.

62- Parliamentary Debates, House of Commons 5th Series, Vol. 195, Cols. 2205.

دوسرے بھی ایسے لوگ تھے جو چیمبرلین کی رائے سے اتفاق کرتے تھے۔ شمالی مغربی صوبہ (اتر پردیش) کے لفٹیننٹ گورنر مسٹن جنھوں نے لکھنو کے مقام پر دسمبر 1916 میں انڈین نیشنل کانگرس اور مسلم لیگ کی باہمی مشاورت میں حصہ لیا تھا۔ 7 فروری 1917 کو وائسرائے کو ایک نوٹ لکھ کر بھیجا جس میں انھوں نے خیال ظاہر کیا۔

"قوم کے لیے ایک نہایت اہم موقع ہے۔ ہماری قومی حمیت کے احساس میں زبردست جوش پیدا ہوگا اور ہمارے قومی جذبات بڑی حد تک مطمئن ہو جائیں گے اگر ایک شاہی اعلان شائع کر کے یہ مشتہر کر دیا جائے کہ ہماری پالیسی کی آخری منزل مملکت برطانیہ کے اندر ہندستان کے لیے سلف گورنمنٹ کا حصول ہے" / 59

اور پھر اس کے بعد مسٹن نے دستوری اصلاحات پر 21 مارچ 1917 کو لکھا۔ "میرا خیال ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہندستان میں ہمارا مقصد ہی یہ ہے کہ آخر کار یہاں سلف گورنمنٹ قایم ہو" / 60

مسٹن ایک ایسے گروہ کا ممبر تھا جو اپنے کو گول میز کہتا تھا۔ اس نے 1916 میں ایک بیان شائع کیا جس کا عنوان تھا "ہندستان کی سیاست میں دستوری ترقی کے لیے سجھاؤ۔ اس نے یہ تجویز کیا کہ کس طرح نظم ونسق کے ایک محدود دائرے میں طاقت کو منتقل کیا جا سکتا ہے۔ بلا مرکز میں گورنمنٹ کے سانچے میں کسی قسم کا خلل ڈالے ہوئے یہ "دو عملی حکمت کا وہ مشہور پلان تھا جسے بعد کو مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات میں جگہ دی گئی۔

ایک دوسری جانب سے بھی اس کو تائید حاصل ہوئی۔ مارچ 1917 میں امپیریل وار کونسل (شہنشاہی جنگی کونسل) اور امپیریل وار کیبنٹ (شاہانہ جنگی وزارت) کے اجلاس لندن میں ہوئے۔ ان میں ہندستان کی نمائندگی وزیر ہند چیمبرلین، جیمس مسٹن، ایس۔ پی سنہا۔ اور مہاراجہ بیکانیر نے کی۔

ہندستانی ممبروں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ہندستان کے معاملہ کی وکالت برطانوی حاضرین کے سامنے کی۔ بیکانیر نے 15 مئی 1917 کو ایک نوٹ تحریر کیا جس۔

---

59 - Ibid. J. S. Meston's note for the Viceroy.
60 - Ibid.

برطانیہ سے وفاداری کا تعلق ہے۔ آپ اقوام ہند پر مکمل اعتماد کر سکتے ہیں لیکن اگر آپ اس وفاداری سے فائدہ اٹھانا چاہیں تو آپ کو اس محبت سے نفع حاصل کرنے کے لیے کوشش کرنی چاہیے جو ہندستانی اپنے وطن سے رکھتے ہیں اور جو ان کا مذہب بن چکا ہے اور اس لیے لازم ہوگا کہ آپ ان کو زیادہ بلند مواقع اپنی قسمت کے فیصلے کا اس طور پر دیں کہ خود نظم ونسق پر اقتدار کی ان کی طاقت روز بہ روز بڑھتی جائے۔"/ 63

ہندستان کا مستقبل ان کی نگاہ میں اس طور پر تھا کہ "میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ ہندستان میں بڑی بڑی خود مختار ریاستیں اور صوبہ ہندستان میں قایم ہوگیے ہیں جو اندرونی طور پر منظم ہیں اور جن کا سلسلہ ربط بڑی بڑی فرمانروائیوں سے ہیں یعنی ملک ایک ہوم رول کا ملک نہ ہو بلکہ متعدد خود مختار صوبوں اور ریاستوں کا ملک ہو جن کا مرکزی حکومت کے ماتحت ایک وفاق ہو"/ 64

چیمبرلین پر جو حملہ ہوا تھا وہ کامیاب رہا۔ چیمبرلین نے استعفا دے دیا۔ لائڈ جارج نے فوراً یہ عہدہ مانٹیگو کو پیش کیا اور انھوں نے اس پیش کش کو منظور کر لیا۔ جو خط انھوں نے وزیر اعظم کو لکھا اس میں انھوں نے اپنی پالیسی کو دہراتے ہوئے کہا تھا کہ یہ دو اصولوں پر مبنی ہوگی۔

(1) فوراً اس بات کی کھوج کی جائے کہ ہندستان پر حکومت کرنے کا کیا نظام چلن میں اور کیا ہندستان میں ہونا چاہیے تاکہ نظم ونسق میں زیادہ لچک اور زیادہ اہلیت پیدا ہو۔

(2) ایک بیان شائع کیا جائے جس میں یہ اعلان کیا جائے کہ ہندستان میں شہنشاہیت کا مقصد ایسے خود مختار صوبوں کا قیام ہے جو ایک دوسرے سے باہمی مربوط ہو کر ایک عظیم مرکزی ریاست کے زیر سایہ وفاق کی شکل میں ہوں اور اسی کے ساتھ اس پالیسی کا کچھ جزو عملی طور پر دے کر اس کا آغاز کیا جائے"/ 65

63- Ibid, Cols 2209-10.

64- Ibid.

65- Waley, S.D. Op cit. P-131.

مانٹیگو نے اپنے عہدے کا چارج ۲۷ جولائی ۱۹۱۶ کو لیا۔ ان کے سامنے فوری مسئلہ ان اہم سوالات پر فیصلہ لینے کا تھا جن پر چیمبرلین نے بحث کا آغاز کیا تھا۔ ان کے سامنے سرکاری ملازمین کے بیانات تھے۔ ہارڈنگ اور چیمس فورڈ دونوں نے وزیر ہند کو اپنی رائے بھیجی تھی۔ سرکاری ملازمین نے بھی اپنی رائیں ظاہر کی تھیں۔ کچھ کی رائے یہ تھی کہ آخر مقصد کو صاف صاف ظاہر کر دیا جائے اور وہ زینے بھی متعین کر دیئے جائیں جن پر چل کر منزل تک رسائی ہوگی اور دوسرے کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو مستقبل کے متعلق کسی پیشین گوئی کو خطرناک تصور کرتے تھے۔ "ہندستان کی رائے عامہ کا تقریباً اتفاق رائے سے یہ مطالبہ تھا کہ اچھی خاصی واقعی سیاسی طاقت یا ہوم رول منتقل کر دی جائے ہندستان جن سیاسی حالات کا منظر تھا اور جو سیاسی حالات دنیا پیش کر رہی تھی اور اسی کے ساتھ جنگ نے جن پر ہر وقت اونچ نیچ ہونے والے اور ہر دم بدلنے والے واقعات پیدا کیے تھے وہ سب واضح طور پر ان کے سامنے تھے۔

ان کے سامنے انتخاب کا دائرہ بہت سخت تھا ہندستان نے جو متبادل تجویز یہ دی تھی کہ فوراً سلف گورنمنٹ عطا کر دی جائے اسے برطانیہ کے تمام مدبروں اور عوامی رہنماؤں نے مسترد کر دیا تھا کچھ لوگ تو ان میں ایسے ضرور تھے جو اس بات کے لیے تیار تھے کہ آگے بڑھنے کا وقت آگیا ہے لیکن دوسرے لوگ ایسے تھے جو کہتے تھے کہ ہندستان ہوم رول کے قابل نہیں ہے اور نہ تو کسی زمانہ تک سلف گورنمنٹ کا اہل ہو سکتا ہے جس کا اندازہ کر کے اس کی پیشین گوئی کی جا سکے۔ لیکن دونوں طرح کے خیال کے لوگوں میں اختلاف بہت معمولی تھا۔ اختلاف صرف "کبھی نہیں" اور "روز قیامت" کا تھا۔

اس لیے سوال یہ پیدا ہوا کہ کیا یہ مناسب ہوگا کہ ثانوی اہمیت رکھنے والے چند حقیر قسم کے اختیارات منتقل کر کے اور گورنمنٹ آف انڈیا کے غلبہ و طاقت کو بدستور محفوظ رکھتے ہوئے تجربہ اور جانچ کے طور پر دے دیئے جائیں اور دس سال بعد اس کا جائزہ لیا جائے کہ آگے کیا قدم اٹھایا جائے۔

یا گورنمنٹ کی غیر ذمہ دارانہ حیثیت کو نا معلوم مدت تک بدستور قایم رکھا جائے اور پارلیمانی طرز کی حکومت کی فضول امید سامنے نہ لائی جاتے بلکہ صرف یہ کہا جاتے کہ تجربہ سے جو بعض نہایت اہم قسم کی خامیاں اور بے ضابطگیاں دریافت ہوئی ہیں ان

کو دور کر دیا جائے کونسل میں منتخبہ شدہ ممبران کی تعداد میں اضافہ کر دیا جائے اور ملازمت کی اونچی جگہوں پر زیادہ ہندستانیوں کو مقرر کیا جائے۔

مانٹیگو اپنی رائے بنا چکے تھے انھوں نے یہ سمجھ کر کہ وہ ہندستان کے قوم پرور بنیادی مطالبہ کے سامنے خواہ وہ معتدل ہوں یا انتہا پسند نہیں جھک رہے ہیں، پہلی تجویز پر عمل کرنے کا طے شدہ ارادہ کر دیا تھا ان کو ایک اعلانیہ کی اشاعت کرنا تھا اور اس کے لیے برطانوی وزارت کی باضابطہ رضامندی کی ضرورت تھی اس میں مشکل یہ تھی کہ ان کے ممدوح ہیرو 'اسکوئتھ' وزارت سے علیحدہ ہو گئے تھے اور لائڈ جارج کا رخ نامناسب تھا اور برطانوی کابینہ کے ایک ممبر کرزن' نہ تو ذاتی طور پر ان سے دوستی رکھتا تھا اور نہ ہندستان کی تمناؤں سے ہمدردی۔ لیکن چیمبرلین کی بیش قیمت تائید اور اصل الاصول چیزوں کو ترک کیے بغیر تفصیلات میں بعض معاملات کو چھوڑ دینے پر رضامندی دے کر آخر کار مانٹیگو نے اپنا مدعا حاصل کر لیا۔ ہندستان کے معاملات کا جلد فیصلہ کرنے کے لیے چیمس فورڈ کے پیہم اصرار کا اثر کرزن اور بالفور پر پڑا۔

۱۴ اگست ۱۹۱۶ کو آخر کار برطانوی وزارت نے اس مسئلہ پر غور و فکر کیا اور ان الفاظ اور جملوں کو منظور کیا جسے مانٹیگو کو استعمال کرنا تھا۔ "سلف گورنمنٹ" کے لفظ پر کچھ مباحثہ ہوا۔ کیوں کہ کرزن اس لفظ کو ناپسند کرتا تھا۔ اس کی جگہ پر "ذمہ دار حکومت" کا لفظ استعمال کیا گیا۔

20 اگست ۱۹۱۶ کو وہ اعلان ہوا جس کا بے چینی سے انتظار تھا۔

"ہز مجسٹی کی گورنمنٹ کی پالیسی، جس سے گورنمنٹ آف انڈیا پوری طرح متفق ہے یہ ہے کہ نظم و نسق کی ہر شاخ میں ہندستان کو روز افزوں حصہ لینے پر عمل کیا جائے اور رفتہ رفتہ خود مختار اداروں کے مقصد کے پیش نظر نشو و نما کی جائے آخر کار ہندستان میں اندرون مملکت برطانیہ اس کے ایک اٹوٹ جز کی حیثیت سے رفتہ رفتہ مختلف مدارج طے کرتے ہوئے ایک ذمہ دار حکومت قایم کی جائے"

X مانٹیگو چیمسفورڈ ریفارم

اصل پوائنٹ تو یہ اصل کیا جا چکا تھا اب دوسرا کام یہ تھا کہ ایک ایسا فارمولا۔

دریافت کیا جائے جس سے ایک ایسی گورنمنٹ قائم ہو جس کی باگ ڈور تو ایک بیرونی طاقت کے ہاتھ میں ہو لیکن جزءً وہ ہندستان کے عوام کے سامنے بھی ذمہ دار ہو یعنی دوسرے الفاظ میں مطلب یہ ہوا کہ ایک غیر ذمہ دار اور بے لگام انتظامیہ کو خود مختار اداروں سے جوڑ دیا۔ اس سے مانٹیگو اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ فارمولے میں ایک مد تفویض شدہ اختیارات کی بھی ہونا چاہیے۔ خواہ وہ کسی طرح محدود ہو اس غرض کے لیے وہ ہندستان آیا۔ اس کی اصل غرض یہ تھی کہ شک و شبہہ میں مبتلا اہل علم انگریزوں اور سرکاری و غیر سرکاری انگریزوں کو خوشامد درآمد کر کے اور سمجھا بجھا کر راضی کرے۔ اس کا یہ بھی منشا تھا کہ اس قسم کا عمل ہندستان کے قوم پرستوں سے بھی کرے جن کو وہ غیر ذمہ دار خیال پرست سمجھتا تھا۔

جیسا کہ ان کی ڈائری سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس کام میں دل و جان سے لگ گئے ناقابلِ بیان طویل محنت، بلا وقفہ مسلسل انٹرویو، طویل بحثیں۔ تقریباً ایک تھکا دینے والا تجربہ تھا۔ لیکن قابلِ مدح صبر و ضبط سے اس نے یہ سب برداشت خوشی خوشی کیا۔ اگرچہ کبھی کبھی آزردہ دلی بھی درمیان میں آکر مداخلت کر جاتی تھی۔ رپورٹ مانٹیگو چیمسفورڈ کے نام سے قابلِ ستائش عجلت کے ساتھ پیش ہوئی۔ لیکن یہ زیادہ تر مانٹیگو کا کارنامہ تھی جہاں تک چیمس فورڈ کا تعلق ہے مانٹیگو کا احساس یہ تھا کہ "دراصل میں اپنے اندر اس شخص سے مایوس ہو جانے کے جذبات پاتا ہوں۔ وہ اپنی زندگی کے عظیم ترین مسائل سے دوچار ہے .... میں نے اس کے پاس بار بار نئی تجویزات بھیجی ہیں اور میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ ان دس دنوں میں ان کے متعلق کسی قسم کا خیال اس کے اندر نہیں پیدا ہوا... مجھ کو تنہا ہی آگے چلنا ہے"۔/66

وہ اس نتیجہ پر پہنچا "جنگ کے ایک نازک دور میں میں نے ہندستان کو چھ ماہ تک خاموش رکھا ہے"۔/67

21ر اپریل 1918ء کو رپورٹ مکمل ہو گئی اور اس طرح ایک دوسرا کار عظیم انجام

---

66. Ibid. P. 152

67. Ibid.

کو پہنچا دوسرا بڑا اقدم یہ تھا کہ وزارت برطانیہ کو اس پر آمادہ کیا جائے کہ وہ اس رپورٹ کی ذمہ داری قبول کرے۔ یہاں پھر وہی دشواری کرزن کے سامنے تھی۔ جن سے برطانیہ سخت جان پارٹی کے لوگوں نے کرزن پر اثر ڈالا تھا۔ کہ وہ رپورٹ کے بنیادی اصول اور اس کی تفصیلات پر ہر قسم کے اعتراضات کریں۔ کرزن کا خود یہ یقین تھا کہ ہندستان کے بارے میں ان کی ذمہ داری عظیم تھی۔ کیوں کہ دارالامرا میں کوئی اسکیم اس وقت تک منظور نہیں ہو سکتی تھی جب تک اِن کی تائید اسے حاصل نہ رہے اور وہ اس سکیم کی دفعات کو اتنا انقلاب انگیز سمجھتا تھا کہ اس کی رائے میں اس سے مملکت برطانیہ کے وجود ہی کے شق ہو جانے کا خطرہ تھا۔

آخر کار مانٹیگو نے وزارت برطانیہ کی رضامندی اس رپورٹ کی اشاعت کے لیے حاصل کرلی۔ جس پر 8 جولائی 1918 کو عمل در آمد بھی ہوگیا۔ ہندستان کا ردعمل مخالفانہ تھا تلک نے اس رپورٹ پر اپنا یہ خیال ظاہر کیا کہ "یہ کل کی کل ناقابل قبول ہے" مسز بیسنٹ نے اس کی مذمت کی۔ "اس اسکیم کا پیش کرنا برطانیہ کے شایان شان نہیں ہے اور نہ اس کا قبول کرنا ہندستان کے شایان شان ہوگا"۔

کانگرس کا ایک خاص سشن بمبئی میں منعقد ہوکر 27 اگست 1918 کو شروع ہوا اس کے چیرمین حسن امام تھے۔ 3,845 ڈیلیگیٹ جو وہاں جمع ہوئے تھے وہ سب جہاں تک ریفارم کی اس اسکیم کا تعلق ہے ایک خیال نہ تھے کیوں کہ برطانیہ کی نیت پر سب لوگ عام طور پر شبہہ کرتے تھے گول میز والا گروہ جو کردار ادا کر رہا تھا اس نے ان کے شبہات میں اضافہ کر دیا تھا۔ مانٹیگو کی بالکل کھلم کھلا کوشش معتدلین مثل سورندر ناتھ بنرجی، سنیل واد، چندورکر، رحمت اللہ کی حمایت حاصل کرنے کے لیے اور یہ سوجھاؤ کہ وہ گورنمنٹ کی امداد سے ریفارم کی اسکیم کی موافقت میں پروپیگنڈہ کریں۔ اور اسی قسم کے دوسرے معاملات نے قوم پرستوں کے شکوک میں اضافہ کر دیا۔ اس لیے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ کانگرس نے رپورٹ کے چند اجزا کو یہ مانتے ہوئے کہ وہ ترقی پسندانہ ہیں بعد طے کرایا کہ اسکیم بالکلیہ "یاس انگیز اور ناقابل اطمینان ہے"۔

اسی وقت مسلم لیگ کا بھی اجلاس ہوا جس کے صدر راجہ محمود آباد تھے اور اس نے بھی ایک تجویز تقریباً اسی طرز کی منظور کی جیسی کانگرس نے منظور کی تھی۔

دسمبر ۱۹۱۸ء میں کانگرس کا جو اجلاس دلی میں ہوا اس نے خاص سشن کے منظور شدہ ریزولیوشن کی توثیق کر دی اور حسب ذیل دفعہ کا اضافہ کیا۔

"اس کانگرس کی یہ رائے ہے کہ جہاں تک صوبوں کا تعلق ہے مکمل ذمہ دارانہ حکومت کے اختیارات فوراً ان کو دے دیے جائیں۔ اور دستوری نظام کے مفادات سے برٹش انڈیا کا کوئی حصہ محروم نہ رکھا جاتے"

اس اضافہ کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ معتدلین نے اب یہ رویہ اختیار کیا تھا کہ وہ لوگ کانگرس سے الگ ہو گیے تھے اور حکومت سے گٹھ جوڑ کر لیا تھا کانگرس نے اس کا بھی مطالبہ کیا کہ ایک قریبی تاریخ میں مکمل ذمہ دار حکومت ہندستان میں قایم کر دی جاتے جس کی حیثیت نو آبادیات کے مساوی ہو۔

مسز بسنٹ اور تلک کے ہوم رول لیگ نے انگلستان وفود بھیجنے کی کوشش کی تاکہ قوم پرستوں کے نقطہ نگاہ کو سمجھایا جاتے اور اس پروپیگنڈہ کی کاٹ کی جائے جو ریفارم کے مخالفین کر رہے تھے کیوں کہ اسکیم کی تجویز پر جلد پارلیمنٹ میں مباحثہ ہونے والا تھا

معتدلین بنرجی کی قیادت میں کانگرس سے الگ ہو گیے۔ کیوں کہ وہ لوگ انتہا پسندوں سے اصولی اختلاف رکھتے تھے۔ بنرجی نے امپیریل لیجلیٹو کونسل میں ایک تجویز پیش کی جس میں انھوں نے یہ تسلیم کیا کہ اصلاحات ایک ایمان دارانہ کوشش کا نتیجہ اور ہندستان میں ذمہ دار حکومت کے قیام کی جانب بتدریج چلنے کے لیے ایک اگلا قدم ہے۔ انھوں نے ایک جلسہ بھی بمبئی میں یکم نومبر ۱۹۱۸ کو بنرجی کی صدارت میں کیا۔ اس جلسہ میں ان لوگوں نے اصلاحات کا خیر مقدم کیا۔ اور یہ رائے ظاہر کی کہ یہ حقیقی اور روزافزوں قدم ذمہ دار حکومت کے قیام کی جانب ہیں لیکن ان میں کچھ ترمیمات کی بھی سفارش کی۔

مانٹیگو کی ریفارم اسکیم کئی کمیٹیوں کی جانچ اور جائزہ سے گزری۔ ایک کمیٹی نے رائے دہندگی کے مسئلہ پر غور کیا، ایک دوسری کمیٹی نے مرکز اور صوبوں کے عمل دخل کی تقسیم پر نگاہ دوڑائی۔ اور اس پر بھی سوچ بچار کیا کہ صوبوں میں کون سے مدات محفوظ اور کون سے انتقال شدہ قرار دیے جائیں ایک تیسری کمیٹی نے انڈیا آفس کی تشکیل جدید کا جائزہ لیا۔

جب جولائی ۱۹۱۹ء میں بل پارلیمنٹ میں پیش ہوا تو ان تمام کمیٹیوں کی رپورٹیں،

گورنمنٹ آف انڈیا کی رائے اور دوسری جگہوں سے جو سوجھاؤ آئے تھے ان سب کے ساتھ پارلیمنٹ میں رکھی گئیں تو پارلیمنٹ نے بل اور رپورٹوں کو دونوں ایوانوں کی ایک مشترکہ سیلیکٹ کمیٹی (منتخب کمیٹی) کے سپرد کر دیا۔ سیلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ پر دونوں ہاؤسوں میں مباحثہ ہوا اور آخر کار 23 دسمبر 1919 کو یہ قانون کی کتاب کا ایک باب بن گئی اور اس کا عنوان گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1919 رکھا گیا۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ ایکٹ میں سلف گورنمنٹ کے الفاظ کو بڑی کوشش سے بچایا گیا تھا۔ مانٹیگو کے بل (مسودۂ قانون) پر پارلیمنٹ کی بحثوں میں مقررین نے بار بار ہندستان کی آئندہ سیاسی حیثیت کے لیے نوآبادیات کے طرز کی حکومت، کے الفاظ استعمال کیے۔ ہدایات کا جو مسودہ Instrument of Instructions بعد گورنر جنرل کے نام جاری کیا گیا اس میں تدریجی ذمہ دار حکومت کے قیام کو یوں بیان کیا تھا "یہ کہ برٹش انڈیا نوآبادیات میں اپنی وہ جگہ حاصل کرے جس کی وہ مستحق ہے"۔ 1917 میں دو ہندستانیوں بیکانیر اور سنہا۔ کی امپیریل وار کونسل اور امپیریل وار کابینہ میں شرکت کے لیے تقرری بھی اسی حیثیت کی جانب اشارہ کرتی تھی۔ ہندستان کو امپیریل کانفرنس میں دوسری خود مختار نوآبادیاتی حکومت کی مساویانہ حیثیت سے شریک کیا گیا۔

البتہ اس کے بعد کے دنوں میں ہندستان کی جو حیثیت جنگ کے دباؤ سے تسلیم کر لی گئی تھی اسے مسترد کر دیا گیا۔ لیکن خواہ انگلستان اسی طرح اس وعدے سے منحرف ہوا جس طرح ماضی میں پیمان شکنی کرتا رہا ہے۔ ہندستان اپنے اس مقصد سے سرمو ہٹنے والا نہ تھا کہ اس کا مستقبل بطور مقصد سلف گورنمنٹ میں ہے۔ اندرون مملکت برطانیہ اگر ممکن ہو یا بیرون حکومت برطانیہ اگر ضروری ہو۔

ایکٹ نے صرف چند جزوی قسم کی ترمیمیں دستور ہند کی سیڑھی کے اوپر کے ڈنڈوں میں کیں۔ یعنی ہندستان کے بارے میں پارلیمنٹ کے اختیارات اور فرائض اور کونسل میں وزیر ہند کی حیثیت۔ وزیر ہند کی تنخواہ کو ہندستان کے بجائے برطانیہ کا ذمہ دار قرار دیا گیا۔ دوسرا پہلو یہ تھا کہ جہاں تک حکومت ہند کا تعلق تھا کئی ترمیمات کی گئیں۔ مرکزی قانون ساز اسمبلی کا دستور بدل دیا بجائے ایک ایوان کے دو ایوان قایم کیے گیے۔ ایک ایوان زیریں جس کا نام لیجسلیٹو اسمبلی رکھا گیا اور ایک ایوان بالا کونسل آف اسٹیٹ

کے نام سے عالم وجود میں آیا۔

دونوں ایوانوں کے ممبران کی تعداد، اور سرکاری و غیر سرکاری کی تعداد، اور اسی طرح منتخب شدہ اور نامزد شدہ ممبران کی تعداد، ان سب کا فیصلہ ریگولیشن سے کیا گیا۔ اسمبلی میں 103 منتخب شدہ اور 42 نامزد شدہ ممبران کی تعداد تھی۔ مرکزی حکومت بدستور مستبدانہ رہی۔

اسمبلی کو یہ حق دیا گیا تھا کہ وہ تمام تجاویز پر بحث کرے جن میں مالیاتی تجاویز بھی شامل تھیں لیکن اسی کے ساتھ گورنر جنرل کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ جہاں تک مالیات کا تعلق ہے وہ اپنے فرائض کی ادائیگی میں اگر ضروری سمجھیں تو اسمبلی کے ووٹ کو نظر انداز کر سکتے تھے۔ دوسرے معاملات میں ان کو اختیار تھا کہ یا تو اپنی منظوری معرض التوا میں رکھیں یا اسمبلی کو مزید غور و فکر کے لیے واپس کر دیں۔ جہاں تک کہ ان مدات کا تعلق تھا جو صوبوں کو منتقل کر دیے گئے تھے ان کے سلسلہ میں لوکل گورنمنٹوں پر نگرانی کرتے ہدایت دینے، اور کنٹرول کرنے کا جہاں تک سوال تھا وہ گورنر جنرل ان کونسل کے حیطۂ اختیار میں دیے گئے تھے۔ لیکن یہ اختیارات صرف ان خاص اغراض کے لیے استعمال کیے جا سکتے تھے جن کا ذکر رولز میں کر دیا گیا تھا۔

سوا اس کے کہ دو ایوان عطا کر دیے گئے تھے اور کچھ اس کی جسامت بڑھا دی گئی تھی اور اس کی بناوٹ میں تبدیلی آ گئی تھی کوئی اہم سیاسی تبدیلی نہیں لائی گئی تھی۔

لیکن جہاں تک صوبوں کی حکومتوں کا سوال ہے ایک نیا اصول ایجاد کیا گیا تھا اولاً تو اصولاً ان کی گورنمنٹوں کو زیادہ اندرونی آزادی دے دی گئی تھی۔ دوسرے جو مدات کہ صوبوں کو منتقل کیے گئے تھے ان کو ان موضوعات سے صاف صاف الگ کر دیا گیا تھا جو مرکز کے تابع تھے اور صوبوں کی گورنمنٹوں کو تفویض شدہ موضوعات دو حصوں میں منقسم تھے "محفوظ" اور "منتقل شدہ"

صوبائی کونسلوں میں تین قسم کے ممبران تھے۔ گورنر کی اگزیکیٹیو کونسل کے سابق سرکاری ممبران، منتخب شدہ ممبران، اور نامزد شدہ ممبران، ان تینوں کی تعداد ریگولیشن سے طے ہوتی تھی لیکن یہ ضروری تھا کہ 20% فیصدی سے زائد سرکاری ممبران نہ ہوں اور کم سے کم ستر فیصدی ایسے ممبران ہوں جو انتخاب کے ذریعہ چن کر آویں۔ انتخاب

کنندگان کے لیے ضروری شرائط، ان ممبران کی تعداد جو فرقہ وار انتخابی حلقوں سے آویں گے اور اسی قسم کے دیگر متعلقہ امور کو بھی ضوابط کے ذریعے طے کرنا تھا۔

صوبوں کی قانون ساز اسمبلیوں کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ ان علاقوں کے لیے جو کسی صوبہ کی حد میں آتے تھے۔ قیام امن و امان، اور اچھی حکومت کے لیے قوانین وضع کریں۔

لیکن ان کی قانون سازی اور مالیات کے متعلق اختیارات محدود تھے مثلاً رقوم کے بارے میں جو مطالبات محفوظ مدات ہوں، اور بعض دوسرے جو مدات خرچ ہوں جیسے کہ ہائی کورٹ ججان کی تنخواہ یا ان ملازمینوں کی تنخواہیں جن کی تقرری وزیر ہند کے ہاتھ میں تھی۔ ان سب کے بارے میں ہوں ان کو روک رکھنے کا اختیار قانون ساز اسمبلی کو نہیں تھا۔ بقیہ تمام دوسرے معاملات میں گورنر کو یہ امتیازی حق دیا گیا تھا کہ وہ یہ تصدیق کر دے کہ ان سے صوبہ کے تحفظ یا امن و امان میں خلل پڑے گا اور اس طرح ان پر غور و بحث روک دے۔ گورنر کو یہ بھی اختیار دیا گیا تھا کہ کوئی قانون جو قانون ساز اسمبلی منظور کرے اس پر اپنی منظوری دینے سے انکار کر دے۔ یا گورنر جنرل کے غور کرنے کے لیے اپنے پاس محفوظ کر لے۔

جہاں تک محفوظ مدات کا سوال تھا۔ اگر کسی بل پر گورنر یہ تصدیق کر دے کہ وہ ضروری ہے تو وہ بل منظور شدہ متصور ہوگی خواہ قانون ساز اسمبلی اس پر غور و بحث کرے یا نہ کرے۔

صوبہ کے تنظیم و نسق کے لیے ایک اگزیکیوٹیو (انتظامی) کونسل بنائی گئی تھی یہ دو حصوں پر مشتمل تھی۔ محفوظ مدات کے ممبران اور منتقل شدہ مدات کے وزرا۔ ممبران کو گورنر نامزد کرتا تھا اور یہ لوگ اسی کے سامنے ذمہ دار تھے۔ وزرا کو گورنر ان ممبران سے منتخب کرتا تھا جو کونسل میں چن کر آتے تھے اور کونسل ہی کے سامنے ذمہ دار تھے منتقل شدہ مضامین گورنر وزرا کے مشوروں سے ہدایت حاصل کرتا تھا۔

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1919 کے واقعات کا نچوڑ یہ تھا کہ سوائے ایمرجنسی کے اوقات کے جس کا اعلان کرنے کا [illegible] گورنر تھا قانون ساز اسمبلیوں کو بہت سے صوبائی موضوعات [illegible] کنٹرول دے دیا گیا تھا اور ان قانون ساز اسمبلیوں میں عوام کے منتخب شدہ ممبران [illegible] اکثریت [illegible] کہ منتقل شدہ مدات کی فہرست میں دو قسم کے موضوعات

تھے۔ (1) سماجی بہبود (2) اقتصادی نشوونما۔ اول میں تعلیم، صفائی صحت عامہ، لوکل سلف گورنمنٹ، شامل تھے۔ دوسرے میں زراعت، صنعتی ترقی، کوآپریٹو سوسائٹیاں، جنگلات، د بائی پیداوار مثل مچھلی وغیرہ اور دیگر۔ گورنمنٹ کا اصل الاصول کام یعنی امن وامان یا پولیس، حکام فوج داری کا محکمہ، عدلیہ، مالیات، آمدنی وخرچ پر کنٹرول۔ اگر صوبہ کی بہبود اور ترقی کے لیے بنیادی اہمیت رکھتے تھے لیکن وہ وزراء کے دائرہ عمل سے باہر رکھے گیے تھے۔

اقتصادی ترقی ونشوونما کے موضوعات اگرچہ منتقل شدہ مدات میں تھے لیکن ان معاملات سے ان کو الگ تھلگ رکھا گیا تھا۔ جو ترقی یا نشوونما کے لیے پیشگی شرائط کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مثلاً سرمایے کی سپلائی، محاصل کرنا، اور رسل ورسائل وغیرہ چونکہ آمدنی محدود اور بے لچک تھی اس لیے فلاح وبہبود عامہ کے موضوعات میں آگے بڑھنے کے امکانات نہ تھے۔

واضعان دستور کا منشا یہ معلوم ہوتا تھا کہ ان لوگوں نے سیاست دانوں کے لیے ایک تربیت گاہ بنانے کا ارادہ کیا تھا۔ اور ہندستانیوں کی اہلیت آزمانا مقصود تھا کہ دیکھیں وہ لوگ ان پارلیمانی کاروبار میں اس تربیت سے کتنا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہ منشا نہیں تھا کہ عوام کی فلاح وبہبود ان کے سپرد کر دی جائے۔

سیاسی جماعتوں کا ردعمل

قدرتاً سیاسی جماعتوں کا ردعمل مایوسی اور بے اطمینانی کا تھا لیکن یہ لوگ حکمرانوں سے بگاڑ کر کے ان سے الگ ہونا نہیں چاہتے تھے۔ کانگرس نے 1918 اگست میں مرکز میں کچھ اختیارات کے منتقل کرنے اور صوبہ کو کل اختیارات سوائے لا اور آرڈر کے منتقل کرنے کا مطالبہ کیا۔ دسمبر 1918 میں یہ مطالبہ کیا گیا کہ ہندستان کو نوآبادیاتی طرز کی سلف گورنمنٹ عطا کی جائے۔ لیکن امرتسر کے اجلاس میں جو دسمبر 1919 میں منعقد ہوا اس سال کے تمام ہولناک واقعات کے باوجود کانگرس نے شہنشاہ معظم کی وفاداری اور کامیابی کے ساتھ جنگ کے ختم ہو جانے پر مبارکباد کا ایک ریزولیوشن منظور کیا۔ اگر اس کے ساتھ یہ تجویز بھی دوہرائی گئی کہ ہندستان کو مملکت برطانیہ کا ایک اٹوٹ

حصہ قرار دے کر اسے ذمہ دار حکومت مرحمت فرمائی جائے۔ یہ بھی طے ہوا کہ اصلاحات پر عمل درآمد کیا جائے۔

معتدلین جو مانٹیگو چیمس فورڈ رپورٹ کے شائع ہونے کے بعد اس غرض سے کانگرس سے الگ ہو گیے تھے تاکہ دائیں اور بائیں کے انتہاپسندوں کے مقابلہ میں مانٹیگو کے ہاتھ کو مضبوط کریں۔ انھوں نے ایک نئی پارٹی بنالی۔ انھوں نے اصلاحات کا خیر مقدم کیا۔ اصلاحات کی صدق دلی سے تائید کا اعلان کیا۔ اور ان کے متعلق یہ رائے ظاہر کی کہ یہ (اصلاحات) ذمہ دار حکومت کی منزل کی جانب "ایک حقیقی اور وزنی قدم آگے بڑھنے کے لیے ہیں"۔ لیکن ان لوگوں نے بھی ترمیمات پیش کیں اور ان میں سدھار کے سوجھاؤ تھے جو حقیقی معنوں میں کانگرس سے مختلف نہ تھے۔ اپنے کلکتہ کے اجلاس میں جو دسمبر ۱۹۱۹ میں ہوا۔ اس کے صدر سیوا سوامی ائیر نے "تدریجی حصول" اور ایک یا دو سالہ ٹرانزیشنی کرنے کو رد کر دیا۔ انھوں نے اس پر اظہار افسوس کیا کہ گورنمنٹ نے مرکز میں دوعملی حکومت کی تجویز کو منظور نہیں کیا تھا۔ "میں یقین کرتا ہوں کہ آج کے دن سے ہندستان کو "ڈومینین" (درجہ نو آبادیات کا ملک محروسہ) سے خطاب کیا جائے۔ نہ کہ مملکت برطانیہ کی ایک ڈپنڈنسی (تابع ملک)۔

بہ ظاہر کانگرس اور لبرل فیڈریشن (LIBREAL FEDERATION) کے مقاصد میں کچھ زیادہ فرق نہ تھا" لیکن دونوں جماعتوں میں ذہن و مزاج، زندگی کے متعلق نقطہ نگاہ اور پالیسی کے جو اختلافات تھے وہ روز بروز زیادہ ہوتے گئے۔[68]

مسلمان ترکی کی شکست اور اس کے پرزے پرزے ہو جانے سے اس درجہ پریشان تھے کہ وہ ان اصلاحات پر سنجیدگی سے غور کرنے کے بھی موڈ میں نہ تھے لیکن ان کا قدامت پرست طبقہ جداگانہ انتخاب کے ضوابط کے باوجود اسکیم کی عام روش سے خوف زدہ تھا اس لیے اس نے یہ تجویز پیش کی کہ کل کونسلوں میں مسلمانوں کو پچاس فیصدی جگہیں دی جائیں۔

ہندستان کے ذمہ داران نظم ونسق کی رائے ہارٹ کورٹ بٹلر لفٹیننٹ گورنر

68۔ Chintamani C.Y. Indian Politics Since the Meeting. P.94.

مالک متحدہ (اتر پردیش) نے ظاہر کیا۔ انھوں نے چیمبرلین کو اطلاع دی کہ "مانٹیگو چیمسفورڈ (۱۹۱۸ء) اسکیم کے چند ہی دوست باقی رہ گیے ہیں تقریباً تمام لوکل گورنمنٹوں نے اس کی مذمت کی ہے....... ہم لوگوں کا جو نظم و نسق کے معاملہ میں عملی تجربات رکھتے ہیں یہ خیال ہے کہ دو عملی انتظامات قطعی اور لازمی طور پر ناکام ہوں گے"۔ 69

نے جداگانہ انتخابات کو میثاق لکھنو 916 تسلیم کر لیا تھا اور اس کے مضر اثرات کا اندازہ نہیں کیا تھا۔ 919 کے ایکٹ نے ہندستان کے دستور میں ان کو جگہ دے کر مارلے اور منٹو نے جو خرابیاں شروع کی تھیں ان پر مہر تصدیق ثبت کر دی بہت جلد یہ زہر سیاسی مسائل کے جسم میں سرایت کر گیا۔ اور ہندستان میں دونوں فرقوں کے لیے اس کے دردانگیز نتائج نکلے۔ لایونل کرٹس (LIONEL CURTIS) جو گول میز کے معماروں میں تھا اور دو عملی حکومت جس کے دماغ کی تخلیق تھی اور جسے اس نے ایک تصنیف کی شکل میں وائسرائے اور وزیر ہند کے سامنے پیش کیا تھا اس کے خیالات کا ذکر کرنا ایک اندوہناک دلچسپی کا منظر رکھتا ہے۔ پہلے مارلے اور منٹو نے جو اصلاحات دیے تھے ان کی سخت مذمت اور ان پر طویل بحث کرنے اور انھیں صرف "تماشہ" قرار دینے کے بعد ان لوگوں کے دلائل پر کڑی نکتہ چینی کرتے ہوئے جو اصلاحات کو ایک نہ ایک بہانہ سے روکنا چاہتے ہیں۔ مثلاً تعلیم کی کمی تجربہ کی خامی، فرقہ وارانہ اور دیگر اختلافات کی موجودگی۔ اس نے جداگانہ انتخابات کے مسئلہ کا جائزہ لیا اور کہتا ہے۔

"فرقہ وارانہ نمائندگی کے معنی جیسا کہ میں سمجھتا ہوں یہ ہیں کہ اور ہندو اور مسلمان الگ الگ حلقہ ہائے انتخاب میں اپنا ووٹ دیں گے۔ اور اس طرح ایک مسلمان ووٹر صرف ایک مسلمان ہی امیدوار کو ووٹ دے سکتا ہے۔ اور دوسرے مذہب کے کسی آدمی کو ووٹ نہیں دے سکتا۔ اور یہی اصول دوسرے فرقوں کے لیے بھی ہے جن کو فرقہ وارانہ انتخاب کا حق دیا گیا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ مسلمان ایک مصنوعی مخالفت پر تکیہ کرنا سیکھیں گے بجائے اس کے کہ وہ اپنی کمزوری کا براہ راست مقابلہ کریں

---

69. Chamberlain Papers, Harcourt Butler to Chamberlain 2nd February, 1919.

اور نسبتاً تعلیم میں اپنی پسماندگی کو دور کرنے کی فکر کریں اس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ ایک کمزور لیکن تندرست عضو کو لوہے کے اندر بند کر دیا جائے حالانکہ اس کو طاقت دینے کے لیے ورزش کی ضرورت ہے۔

"اس رعایت کو عطا کر دینا جب کہ انتخابات کے ادارے چند سال قبل عالم وجود میں لائے گیے سب سے بڑی فاش غلطی تھی۔ جس کے برابر غلطی حکومت برطانیہ نے ہندستان میں نہیں کی۔ مجھے یقین ہے کہ اگر یہ اصول برابر جاری رہا تو ہم ہندستان پر ذات کا ایک نیا بوجھ لاد دیں گے۔ جو اس کی حیات میں ہر سال زیادہ گہرائی کے ساتھ زخم پیدا کرتا رہے گا۔ جب تک یہ قایم ہے ہندستان ہرگز ایک قوم ہونے کی منزل تک نہیں پہنچے گا۔ جتنے زیادہ دیر اس کو قایم رکھا جائے گا اتنا ہی اس کا اکھاڑ پھینکنا مشکل ہوگا۔ حتیٰ کہ یہ صرف باہمی خانہ جنگی کا ذریعہ دے کر ہی ہٹایا جا سکے گا یہ کہ ہندستان ایک قوم کی شکل اختیار کرے اس کا حاصل کرنا ہماری امانتی ذمہ داری ہے۔ اور جداگانہ انتخابات کو منظور کر کے ہم نے اس امانت اور فرض سے بے وفائی کا ارتکاب کیا ہے۔

"اس نظام نے اتنا گہرا اثر پیدا کر لیا ہے کہ اسے ایک ضرب سے اکھاڑ پھینکنا محال ہے البتہ چند سال قبل اس مطالبہ کو دینے سے انکار ممکن تھا۔ لیکن میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ ہم ایک ناقابل معافی جرم کے سزاوار ہوں گے اگر ہم بھی ایسے قانون وضع کرنے میں ناکام رہیں جن سے یہ بیڑیاں جن میں ہم نے ہندستان کو جکڑ بند کر دیا ہے ڈھیلی ہو جائیں/70

70- Curtis Lionel: Letters to the people of India Responsible Government Calcutta (1917), PP. 111-12.

گیارھواں باب

عدم تعاون اور خلافت تحریکیں

I رولٹ قوانین

جب انڈیا ایکٹ 1919 پایہمانی کاروائی کے مختلف مراحل سے گذر رہا تھا' عالمی جنگ ختم ہوچکی تھی۔ انگلینڈ اور ہندستان دونوں نئے حالات اور نئے مسائل سے دوچار تھے۔ انگلینڈ میں نئی سماجی قوتیں ظہور پذیر ہوچکی تھیں۔ اور نئے مسائل لازمی طور پر حل طلب تھے۔ سلطنت میں مقبوضہ عمل داریوں اور انگلینڈ کے باہمی رشتہ کا مسئلہ شدت اختیار کرچکا تھا۔ بیرون سلطنت جنگ فتح کرنے کی نسبت مرکزی طاقتوں سے صلح کرنا زیادہ مشکل ثابت ہو رہا تھا۔ ہندستان میں مانٹیگو رپورٹ نے نوکرشاہی (دفتری حکومت) میں خوف و ہراس پیدا کر دیا تھا۔ غیر محدود اختیار اور من مانی کرنے کا دور خطرہ میں پڑتا معلوم ہوتا تھا۔ مستقبل پر منحوس تاریکی کا غلاف پڑچکا تھا۔ غیر یقینی حالت ذہنی تناؤ کا باعث تھا وحشت میں حد سے زیادہ اضافہ کیا گیا اور وطن پرستوں کی مخالفت جن کے احتجاج نے بیرونی (دور کے) آقاؤں کو دب جانے (سر جھکانے) پر مجبور کر دیا تھا۔ تیز تر کر دی گئی۔

1916 میں لکھنؤ سمجھوتہ (پیکٹ) نے بڑی حد تک آئینی پیش قدمی کے لئے ہندستان کا مقدمہ مضبوط کر دیا تھا۔ جب 1917 میں ولسن نے دبا سنبھالے متحدہ امریکہ کو جنگ میں شامل کر دیا اور جنگ کے مقاصد کا اعلان کر دیا تو ہندستانی لیڈروں کی بہت زیادہ حوصلہ افزائی ہوئی۔ ہندستان کی جنگ میں غیر متوقع اور پرجوش تائید اور عظیم قربانیاں نتیجہ خیز ثابت ہوتی نظر آئیں۔

لیکن چیمبرلین کے فیاضانہ خیالات اور مانٹیگو کے پرخلوص اعلانات کے باوجود ہندستان

کے مطالبوں کے جواب میں کاروائی کی ضرورت کو تسلیم کرنے کے باوجود، ہندستان کی حکومت ہندستان کی خواہشات سے قطعی ہمدردی نہیں رکھتی تھی۔ جس وقت سکریٹری آف اسٹیٹ خود مختار حکومت کو تسلیم کرنے کی رپورٹ تیار کر رہے تھے، وائسرائے کی کونسل سیاسی سرگرمیوں کو کچلنے کے اقدام کا مسودہ بنا رہی تھی۔ اگرچہ حکومت اپنے کو سخت انسدادی اختیارات سے مسلح کر چکی تھی۔ دوران جنگ ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ (ہندستانی حفاظتی قانون) کے اسلحہ سے جس کا کھلم کھلا استعمال کرنے سے نہیں جھجکتی تھی لیس تھی تاہم وہ کسی ایسی چیز کی ضرورت محسوس کرتی تھی جو اس کا مقام لے جب جنگ کے بعد آئین کی عمل درآمد ختم ہو جائے گی۔

رونلڈشے (Ronaldshay) نے چیمبرلین کو ایک مراسلہ تحریر کیا جس میں مختلف ایکٹوں اور قوانین کے تحت بیان شدہ اعداد وشمار دینے کے بعد انھوں نے اپنی رائے اس طرح ظاہر کی "ان اعداد وشمار میں بتدریج اضافہ کے رجحان کا امکان ہے" اور مزید یہ کہ "اس لئے آپ دیکھیں گے کہ وہ صورت حال جس سے ہم کو جنگ کے خاتمہ پر دوچار ہونے کا امکان ہے ایسی کسی بھی حالت سے زیادہ خوفناک ہوگی جس کا گذشتہ سال تصور کیا گیا تھا"۔/1

سکریٹری آف اسٹیٹ نے دارالعوام میں ایک بیان دیتے ہوئے 22 مئی 1919 کو قبول کیا "حالات اطمینان بخش نہیں ہیں .... اندرون ملک بغاوت اور انقلاب ظاہر کر چکے ہیں" پھر انھوں نے حالات کا تجزیہ کیا۔ عناصر جنہوں نے مصیبتیں پیدا کیں متعدد تھے۔ بارش نہ ہونا غذائی رسد کی کمی، قیمتوں میں بھاری اضافہ، فوج میں بھرتی کے نتیجہ کے طور پر بہت سے خاندانوں خصوصاً پنجاب میں ان کے روزی رسانوں کا کھو دینا اور زیر کاشت رقبہ میں منتج تخفیف، انفلوانزا جس کی وجہ سے 5 سے 6 ملین جانیں تلف ہوئیں اور اوسطاً دو تہائی آبادی کی بیماری جو صنعت اور کاشتکاری دونوں پر اثر انداز ہوئی۔

مسلمانوں میں بھی انتشار و پریشانی پائی جاتی تھی اور رانڈ و برٹش ایسوسی ایشن کی لگاتار سرگرمیوں کے نتیجہ کے طور پر اصلاحات کی کاٹ چھانٹ کا خوف بھی تھا۔/2

1- Chamberlain Papers: Ronaldshay to Chamberlain 27th June 1917.

2- Montagu E.S. Speech in the House of Commons 22 May 1919. House of Commons Debates, Vol 116, Col 328 ff.

مانٹیگو کا تجزیہ اپنی حد تک درست تھا لیکن نہ تو انھوں نے اور نہ ہی حکومت نے ہندستانی انتشار اور بے اطمینانی کے نفسیاتی پہلوؤں کی اہمیت کو مناسب طور سے تسلیم کیا حقیقت یہ ہے کہ 1919 تک ہندستان کا برطانیہ پر اعتماد بہت متزلزل ہو چکا تھا اور اتنی ہی اہم حقیقت یہ تھی کہ ہندستان کی وفاداری میں انحطاط ہندستان میں برٹش اعتماد کے فقدان کا ردعمل تھا۔

دو عناصر ہندستانی ذہن کو پریشان کر رہے تھے۔ ایک بیرونی واقعات کے اثرات تھے یورپی طاقتوں کا مسلم ممالک کے خلاف جارحیت اور سفید قاموں کا سلوک عمل داریوں میں رہنے والے ہندستانیوں کے ساتھ۔ دوسرا سرکار ہند کا خود مختار حکومت کے ہندستانی مطالبہ کی طرف معاندانہ رویہ تھا۔

پہلے عنصر نے ہندستانی مسلم فرقہ کو جو فطری طور پر ہم مذہب لوگوں کے مقدر میں دلچسپی رکھتا تھا متاثر کیا۔ یہ ہمدردی مسلمانوں کے انتشار میں اہم عنصر تھی اور جس پر بحث اس باب میں مسلم مسئلہ کے تحت کی گئی ہے۔

جہاں تک عمل داریوں میں ہندستانیوں کے ساتھ سلوک کا تعلق ہے گاندھی جی کی شاندار قیادت میں جنوبی افریقہ کی حکومت کے خلاف جد و جہد نے پورے ہندستان کو ہلا دیا۔

حکومت ہند اور برطانوی غیر سرکاری طبقے کا رویہ تقسیم بنگال کے وقت ہی سے کانگریس کے نسبتاً گرم (انتہا پسند) طبقہ کے خلاف سخت ہو چکا تھا۔ سرکار نے انتہا پسندوں کو تخریب پسندوں کا مماثل سمجھ لیا تھا لیکن سخت تشدد آمیز کارروائیاں تخریب کاروں کو کچلنے کے بجائے ہندستان میں انھیں روپوش ہونے اور بیرونی مسلح مداخلت کی ہمت افزائی پر پڑا۔

انگریز اور ہندستانی افسران کے خلاف انقلابی منصوبے اور انفرادی تخریب پسند کارروائیوں کو صوبائی حکومتوں جیسے بنگال اور پنجاب نے حکومت ہند پر ایسے قوانین کو بنانے کے لئے دباؤ ڈالنے کا بہانہ بنایا جو جنگ کے ختم ہونے کے بعد بنائے گئے ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کی جگہ لیں حکومت بنگال کے سکریٹری نے حکومت ہند کو لکھا۔

"ہز اکسیلنسی ان کونسل نے اس قانون کی نوعیت پر پوری توجہ سے غور کیا ہے جو اضطراری اختیار کرنے والے اقداموں کے علاوہ ان کے یقین کے مطابق جنگ کے خاتمہ کے بعد درکار ہوگا اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اس کو ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے اصولوں اور اس کے ماتحت ضابطوں

کے مطابق ہونا چاہئے۔/3

حکومت کی تشخیص تھی کہ "دروازوں کے اندر ہمارے دشمن نسبتاً بہت کم ہیں اور یہ کہ ان کی طرف سے ہمارے خلاف کی جانے والی سرگرمیوں کی بری طرح ناکامی بحیثیت مجموعی عوام کے خلوص کی متیقن ترین دلیل ہے۔/4 اور اگرچہ وہ حکومت کو معلوم تھا جیسا کہ مانٹیگو نے اشارہ کیا ہے کہ بڑی حد تک انتشار اقتصادی بدحالی اور جنگ سے پیدا شدہ حالات کی وجہ سے تھا اور سکریٹری آف اسٹیٹ کی منظوری سے نئے قانون سازی کے بارے میں وہ لوگ اپنی تجویز کو لے کر آگے بڑھے۔

۱۰ر دسمبر 1917 کو حکومت نے ایک کمیٹی مقرر کی۔ "ہندستان میں انقلابی تحریک سے متعلق مجرمانہ سازشوں کی نوعیت اور حد، تفتیش کرنے اور اطلاع دینے کے لئے اور ایسے قانون بنانے کا مشورہ دینے کے لئے جو ان سے موثر طور پر نپٹنے کے لئے ضروری ہوں" رولٹ، انگلینڈ کی عدالت عالیہ کا ایک جج اس کا صدر مقرر کیا گیا۔ دو ہندستان کے جج ایک انگریز اور ایک ہندستانی اور دو غیر سرکاری افسران ایک انگریز اور ایک ہندستانی کمیٹی کے ممبر بنائے گئے

کمیٹی کی خفیہ بیٹھک جنوری 1918 سے ہوئی اور اپنی رپورٹ 25 اپریل کو پیش کی بیشتر خصوصاً حکومت ہند اور صوبائی حکومتوں کی طرف سے پیش کردہ شہادت پر مبنی تھی ان کا فیصلہ یہ تھا کہ "بمبئی میں انقلابی تحریک بیشتر چتپاون برہمنوں تک محدود تھی۔ بنگال میں سازشی تعلیم یافتہ متوسط طبقہ سے تعلق رکھنے والے نوجوان تھے جنہوں نے قتل اور ڈاکہ زنی کا لمبا سلسلہ جاری کیا تھا۔"/5 پنجاب میں تشدد کا سبب بڑی حد تک وہ تارک وطن تھے جو بیرون نجات سے واپس آتے تھے۔ ہندستان کے اور دوسرے صوبوں میں تحریک نے جڑ نہیں پکڑی تھی۔/6

---

3 - Government of Bengal Political Department from the Hon'ble. Mr J.H. Karr Chief Secretary to the Government of Bengal to The Secretary Government of India, 17 February, 1916.

4 - Home Department Political A. Proceedings No 358 of December 1916, Governor General to the Secretary of State for India, 24 November 1916.

5 - Sedition Committee Report (1918) P. 180.

جنوری 1906 سے دسمبر 1907 تک بنگال (مشرقی و مغربی) میں سرزد ہونے والے تشدد کے اقدام کے بارے میں اعداد و شمار سے 311 خلاف ورزیوں کا پتہ چلا 1038 اشخاص کو مجرم قرار دیا گیا لیکن صرف 84 سزایاب ہوئے /7

کمیٹی نے دیکھا کہ دہشت پسند سازشیں زمانہ جنگ کے قوانین کا شاخسانہ تھیں لیکن ان کو یقین نہیں تھا کہ وہ پھر سے ابھر سکیں گی۔ ان کے از سر نو پھوٹ پڑنے کے قیاس کی بنا پر انھوں نے دو قسم کے اقدامات تجویز کئے۔ تعزیری اور انسدادی

اس رپورٹ کی بنیاد پر حکومت ہند نے مجلس قانون ساز کے لئے دو مسودہ قانون تیار کئے مقصد عام کاروائی کے ذریعہ جرم میں ملوث اشخاص کے زیادہ سے زیادہ مقدموں کا فیصلہ کرنا اور تیزی کے ساتھ سزا دینا تھا اس مقصد کے لئے خصوصی عدالت جس کے فیصلہ کی کوئی اپیل نہیں ہوسکتی تھی۔ خفیہ مقدمہ چلانے اور ایسی گواہی کی سماعت جو قانون شہادت کی رو سے قابل سماعت نہ ہو کا اہتمام اسی مقصد کے لئے کیا گیا۔ صوبائی سرکاروں کو تلاشی لینے، گرفتار کرنے اور ضمانت طلب کرنے وغیرہ کے غیر معمولی اختیارات دیئے گئے۔ ہندستانیوں نے محسوس کیا کہ کسی حد تک ہندستان کے لئے ایک خود مختار حکومت کا حق دیئے جانے سے فوراً پیشتر اور جنگ میں شاندار تعاون کے بعد اس طرح کے انسدادی اقدام نہایت غیر ضروری تھے لیکن تقریباً ہر جانب سے احتجاج کے باوجود اسمبلی نے مسودہ قانون کو قانون بنا دیا جو 21 مارچ 1919 سے نافذ ہوا۔

اس جابرانہ اقدام کے نفاذ نے لازمی طور سے مخالفت اور مذمت کو ہوا دی وائسرائے کی مجلس انتظامیہ کے ایک رکن شنکرن نائر نے بھی قانون کے کچھ حصوں سے اتفاق نہیں کیا اپنی مخالفانہ تجویز میں انھوں نے لکھا۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ عملاً کوئی شخص اپنی خود مختاری اور حق آزادی گفتار سے محروم کیا جاسکتا ہے اور یہ کہ پریس کی آزادی انتظامیہ کی مرضی کے ماتحت ہوگی۔ مختصر یہ کہ نوکر شاہی کی منشار کو ملک کے عام قوانین کا متبادل کر دیا گیا ہے" /8۔

---

6. Ibid

7. India in 1917-18. P-158.

8. Home Department 1919. Political A. Proceedings January 1919. Nos 45-72, and App. De K.W. Minute of C. Sankaran Nair, 11 November 1918.

اسمبلی میں مباحثہ کے دوران مختلف پارٹیوں اور مفاد سے تعلق رکھنے والے منتخب ہندستانی اراکین نے اس مسودۂ قانون کی مذمت کی۔ سری نواس شاستری ایک آزاد خیال لیڈر نے کہا "حکام کے ہاتھوں میں اس سخت نوعیت کے اختیار کا ہونا محض بدکاروں کو نقصان نہیں پہونچائے گا اس سے نیک کو بھی اسی طرح چوٹ پہونچے گی جس طرح بدکو، عوام کا حوصلہ ایسا پست ہوگا اور ملک میں سیاسی معیار اتنا گر جائے گا کہ ذمہ دار حکومت کے بارے میں ساری گفتگو محض ایک دھوکا ہو گی ہوگی/9۔" انھوں نے اپنی تقریر کو ان الفاظ کے ساتھ ختم کیا "اگر ہماری استدعا کو قابل اعتنار نہیں سمجھا جاتا ہے، اگر مسودۂ قانون منظور ہو جاتا ہے تو میں نہیں یقین کرتا کہ یہاں کوئی بھی ایسا ہوگا جو اپنے فرض کو پورا کرے گا اگر اس نے تحریک میں حصہ نہیں لیا" 10/

مسلم لیگ کے چیرمین جناح نے اسمبلی میں اپنی تقریر میں حکومت کو متنبہ کیا "حکومت کو دھمکی یا تخویف کے طور میں یہ نہیں کہنا چاہتا بلکہ یہ اس لئے کہنا چاہتا ہوں کیوں کہ یہ کہنا میرا فرض ہے کہ اگر یہ قانون پاس ہو گیا تو آپ ملک کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک ایسی بے اطمینانی اور ہیجان پیدا کر دیں گے جس کی مثال آپ نے نہیں دیکھی ہے اور یقین کیجیے کہ عوام اور حکومت کے درمیان پائے جانے والے تعلقات پر یہ انتہائی تباہ کن اثر ڈالے گا" 11/

بل پر رائے شماری ہوئی۔ بائیس ہندستانی اراکین نے اس کی نامنظوری کے حق میں ووٹ دیا اور پینیس سرکاری اراکین نے اس کی منظوری کے لئے ووٹ دیا۔ وائسرائے کی مجلس انتظامیہ کے صرف ایک ہندستانی رکن شنکرن نائر اس کی موافقت میں تھے۔

منظوری کے بعد جناح، مالویہ اور مظہر الحق نے اسمبلی سے استعفیٰ دے دیا۔ وائسرائے کو اپنے استعفیٰ نامہ میں جناح نے لکھا "حکومت ہند اور یور اکسلنسی نے رجسٹر قوانین میں ایسے قانون کو درج کرنا مناسب سمجھا ہے جو امن کے دور میں بلا شبہ خطرناک اور یقیناً تشدد آمیز ہے اور اس طرح عدلیہ کی جگہ انتظامیہ لا رکھا ہے۔ علاوہ ازیں اس مسودۂ قانون کو منظور کر کے یور اکسلنسی کی سرکار نے عملاً ہر اس دعوی سے انحراف کیا ہے جو اس نے صرف ایک سال پہلے کیا تھا جب اس نے جنگ

9- Sriniwas Sashtri, Legislative Assembly debate on the Rawlatt Bill, 7 February - 1919.

10- Ibid.

11- M.A. Jinnah, Legislative Assembly debate on the Rawlatt Bill. 7 February - 1919.

کانفرنس میں ہندوستان سے امداد کی استدعا کی تھی۔ اور ان اصولوں کو بے دردی سے کچل دیا ہے جس کے لئے برطانیہ علی الاعلان جنگ لڑا تھا۔

انصاف کے بنیادی اصولوں کی بیخ کنی اور عوام کے آئینی حقوق کی ایسے وقت میں پامالی کی گئی ہے جب سلطنت کو کوئی حقیقی خطرہ لاحق نہیں ہے۔۔۔۔۔۔۔۔

میری رائے میں ایسی حکومت جو اس طرح کے قانون کو امن کے دور میں منظور کرے یا اس کی توثیق کرے ایک مہذب حکومت کہلائے جانے میں حق کو کھو دیتی ہے" 12/

اسمبلی سے باہر ہندوستانی پریس اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرنے میں ایک زبان تھا۔ امرت بازار پتریکا (کلکتہ) نے اس کو ایک فاش غلطی" بتایا" جو امن پسند و قانون کے پابند عوام کے بدترین جذبات کو ابھارے گی" 13/ نیو انڈیا (مدراس) نے اسے "وحشیانہ" بتایا 14/ پنجابی (لاہور) نے اس کو "ایک بے شرم حرکت" سمجھا" جو ایک ایسی نوکرشاہی حکومت کی طرف سے سرزد ہوئی جو آزادی میں مداخلت کرنے کی لامحدود اختیارات استعمال کرنے سے پست اخلاق ہو چکی ہے" 15/

دی ہندو (مدراس) نے لکھا" ہندوستانی عوام مجوزہ قانونی دفعات کو مذمت، غصہ اور نفرت سے پڑھیں گے" 16/ بمبئی کرانیکل (بمبئی) نے اس کو "نامعقول" "انسدادی" 17/ تصور کیا

جبکہ قانون کی مخالفت ملک گیر تھی، کئی وجہوں سے پنجاب میں حالات دھماکہ خیز تھے جنگ کے لئے سپاہیوں کی بھرتی کے لئے تیہ کیا تھا۔ 300,000 جنگی اور 60,000 غیر جنگی سپاہی اور بہت سے گاؤں مزدوری کرنے والوں اور کمانے والوں سے خالی ہو گئے تھے۔ زمینی کرپٹ بے چینی نے تشدد اور بداعمالیوں کو جنم دیا جس کو سختی سے دبا دیا گیا تھا۔ بہت سے پنجابی تارکین وطن ایسی حکومت کے خلاف تلخ احساسات کے ساتھ اپنے وطن واپس ہوئے تھے جس نے

---

12 - Montagu Papers M.A. Jinnah to Chelmsford dated 28 March 1919.
13 - Amrita Bazar Patrika, 13 January 1919.
14 - New India, 18 January 1919.
15 - Panjabee, 21 January 1919.
16 - The Hindu, 22 January 1919.
17 - Bombay Chronicale 25 January 1919.

انگریس آرڈیننس (قانون حق داخلہ) کے دفعات کا استعمال ان پر مقدمہ فوجداری چلانے کے لئے کیا تھا
پنجاب میں انقلابی سرگرمی پر بحث کرتے ہوئے لاجپت رائے نے نتیجہ اخذ کیا "لیکن سب کچھ کہنے کے بعد ہم کو یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس تہہ میں اسباب اقتصادی تھے اور حکومت کی حکمت عملی کا براہ راست نتیجہ ہے" 18/

گاندھی جی کی قیادت

1915ء کے اوائل میں گاندھی جی جنوبی افریقہ سے جہاں انھوں نے قومی وقار اور انسانی حقوق کی حمایت میں وہاں ہندستانی آبادکاروں کی ایک غیر معمولی تحریک کی قیادت کر چکے تھے ہندستان واپس آگئے تھے عدم تشدد اور اخلاقی اصولوں پر چلائی جانے والی آئینی جدوجہد کے تجربات نے ان کے فلسفہ کے خط وخال کو ڈھالا تھا۔ وہ مرکزی اصول جس نے ان کے نتائج عمل پر اثر ڈالا جیسا کہ پہلے وضاحت کی جا چکی ہے، یہ تھا کہ انسان فطرتاً مقدس ہے اور زندگی کا تمام تر مقصد انفرادی اور اجتماعی اطوار میں اپنے اس تقدس کو بروئے کار لانا ہے۔ مذہب، فلسفہ، اخلاقیات، سماجی علوم، اقتصادیات، سیاسیات، اصولی وعملی سب اس ایک عظیم ترین مقصد خودفہمی کے اصول میں ممد ہونا چاہئے۔ بقول گاندھی جی اس مقصد کی حقیقت والفاظ میں واضح ہے۔ سچائی اور عدم تشدد، سچائی شخصیت کا مغز ہے۔ انسان کی عظیم ترین اور باطنی وجود سے مماثلت ہے۔ عدم تشدد انسانی برادری کا بنیادی اصول ہے جو انسانوں کو اتحاد کے رشتہ میں منسلک کرتا ہے۔

انھوں نے ترقی کے لئے تمام کاوشوں اور دستوروں کو انھیں نظریوں کی روشنی میں جانچا ملک کی آزادی ضرورت ہے کیونکہ خود مختاری حکومت کے وسیلہ سے حاصل کی ہوئی انفرادی خودمختاری کے بغیر سچائی اور عدم تشدد کو مستحکم بنانے کے لئے ضروری حالات پیدا نہیں کئے جاسکتے۔ گاندھی جی کی اولین دلچسپی انسان کو ایک اخلاقی ہستی میں تبدیل کرنے میں تھی اور اس کے لئے انھوں نے یہ طریقہ اپنایا کہ ماورا ادراک طریقوں سے فطرت پر قابو حاصل کرایا جائے جو اس نے ارتقاء کے ذریعہ وراثتاً پایا ہے۔

---

18. Lajpat Rai, the Political future of India, P. 274.

یہ وہ دین جس کو انھوں نے جنوبی افریقہ میں عملی جامہ پہنایا اور جس کی انھوں نے ہندستان میں اشاعت کی کوشش کی، اخلاقی، سماجی، اقتصادی اور سیاسی زندگی میں ہندستانی سیاست میں ان کی آمد نے یہاں کی تواریخ میں ایک نئے باب کا آغاز کیا۔

ملک میں سوائے تھوڑے وقفہ کی اتفاقیہ آمد کے ربع صدی کی غیر حاضری کے بعد جنوری ۱۹۱۵ء میں وہ ہندستان آئے انھوں نے گوکھلے کی اس اصلاح پر عمل کیا کہ وہ ایک پرسکون سال ملک کے صحیح حالات سے اپنے کو آگاہ کرنے میں گزاریں۔ انھوں نے احمدآباد کے قریب سابرمتی ندی پر ایک ستیہ گرہ آشرم قائم کیا۔ سیاسی میدان میں ان کی پہلی مہم برٹش نوآبادیات کے مزدوروں کی بھرتی کے لیے اقرارنامہ کے طریقے کے فوری خاتمہ کے لیے مدد کرنا تھی۔ یہ طریقہ ترک کر دیا گیا۔

بعد ازاں انھوں نے اپنی توجہ بہار کے نیل کے کاشت کرنے والوں کی طرف سے شائع کیے گئے کاشت کاروں کی شکایات کی طرف مبذول کی وہ تفتیش کرنے کی غرض سے چمپارن روانہ ہوئے لیکن ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے ان کے ضلع کو فوراً چھوڑ دینے کے لیے حکم جاری کیا، گاندھی جی نے حکم ماننے سے انکار کیا۔ اور حکم عدولی کے لیے ان پر مقدمہ چلایا گیا، وہ حکم عدولی کے الزام میں ماخوذ ہوئے لیکن انھوں نے اس کو اس بنا پر حق بجانب ٹھہرایا کہ انسانی اقتدار کو لازماً ضمیر کے بالاتر اقتدار کے سامنے جھک جانا چاہیے۔ قانونی عدالت میں یہ ایک انوکھا جواز تھا، لیکن سرے سے انوکھا بھی نہیں کیونکہ تاریخ میں سقراط اور دوسرے مذہبی درویش اور شہدا اس سے پہلے اپنے عمل کو حق بجانب ٹھہرانے میں یہی راستہ اختیار کر چکے تھے۔ لیکن اس طرز کار سے بالکل بالا انگریز مجسٹریٹ کے لیے یہ جواز بدحواس کن تھا، حکومت بہار نے ان کو رہائی دلائی اور گاندھی جی کو تحقیقات جاری رکھنے کی اجازت دی گئی، آخر کار حکومت نے نیل کے کاشتکاروں پر مظالم کی سنگینی کو تسلیم کیا اور ۱۹۱۷ء کے چمپارن اگریرین بل (چمپارن مسودہ قانون) نے اس طریقۂ کار کے خاتمہ کی تجویز رکھی۔

گاندھی جی ابھی بہار ہی میں مشغول تھے کہ ان کو کھیڑا کے ان کسانوں کو مدد اور رہنمائی کرنے کی درخواست موصول ہوئی جو فصل کے خراب ہونے کی وجہ سے لگان کی ادائیگی کی مشکل سے دوچار ہو رہے تھے، دوسری استدعا احمدآباد میں مزدور جھگڑے میں مداخلت کرنا تھی انھوں نے پہلے احمدآباد کے مل مزدوروں کا مسئلہ لیا۔ انھوں نے مزدوروں کو ہڑتال کرنے کا مشورہ دیا۔ لیکن مل مالکوں اور غدار مزدوروں دونوں کے خلاف عدم تشدد کی پابندی اور ثابت قدم رکھنے

کو کہا، بدقسمتی سے دو ہفتہ بعد ان کے پاؤں ڈگمگانے لگے، اس لئے گاندھی جی نے اعلان کیا کہ جب تک ہڑتال کا تصفیہ نہ ہوگا وہ برت رکھیں گے، اس نے مزدوروں کو اپنے ارادہ میں مستحکم کردیا اور مل مالکوں کو بھی متاثر کیا، جانبین کے لئے تسلی بخش تصفیہ کے ساتھ ہڑتال ختم ہوئی۔

اس کے بعد وہ کھیدا تنازع میں گھسے جو ایک مصالحت پر تمام ہوا، گاندھی جی نے محسوس کیا کہ یہ تسلی بخش نہیں تھے لیکن یہ گجرات کے کاشتکاروں کے بیداری کے آغاز کی نشاندہی کرتی تھی۔[19]

یہ واقعات عرش بریں کی طرف اس کی پرواز کے آغاز سے پہلے پروں کی پھڑپھڑاہٹ کے مانند تھے۔ گاندھی جی کو اخبارات میں اکثر رولٹ کمیٹی کی رپورٹ پڑھنے کا اتفاق ہوتا تھا جو شائع کی جاچکی تھی انھوں نے کہا "اس کی سفارشات نے مجھے حیرت زدہ کردیا" یہ اس سلطنت کے وفادار شہری کی جس نے ابھی تک یقین کیا تھا کہ "سلطنت مجموعی طور سے ایک فلاحی قوت تھی" ایک ایسے انتہا پسند باغی میں تبدیلی کا آغاز تھا جس کا نیا عقیدہ یہ تھا کہ "اس وقت سلطنت برطانیہ شیطنت کی نمائندگی کرتی ہے اور وہ لوگ جو خدا سے لگاو رکھتے ہیں شیطان سے کوئی تعلق نہیں رکھ سکتے"

اس طرح کے عظیم روحانی شخص اور متدین محب سچائی میں یہ تغیر ہندستان میں سلطنت برطانیہ کی اخلاقی اساس کی تباہی کی آخری نوبت کی علامت تھی۔ گاندھی جی ہندستان کے ضمیر کی نمائندگی کرتے تھے اور ان کے ذہن کی برگشتگی اس بغاوت کا نقطہ آغاز تھی جو سلطنت کے خاتمہ پر ختم ہوئی۔

ان کا فوری ردعمل اس عہدنامہ کا مسودہ تیار کرنا تھا جس نے ان دستخط کنندگان کو جنہوں نے ان کی پیروی کی اور یہ باور کیا کہ بل غیر منصفانہ اور انصاف اور خود مختاری کے تمام اصولوں سے منحرف اور ایک شخص ... بتدائی حقوق کے لئے تباہ کن تھے، ان کے قانون بن جانے کی کوشش میں اور جب ... انکو واپس نہ لے لیا جائے "ان قوانین کو ماننے سے آئینی طور سے انکار کیا تھا"[20]

19 - Gandhi M.K. An Autobiography (1948) P. 538.

20 - Bombay Chronicle, 2 March 1919. Cited in Bamford P.C. Histories of the non Co-operation and Khilafat Movements. P.4.

اس اثنا میں مسودہ قانون ایکٹ بن چکا تھا۔ عہدنامہ کے بعد کل ہند پیمانہ پر ہڑتال (اقتصادی عمل کی معطلی) کی دعوت دی گئی۔ پہلے 30 مارچ 1919 کی تاریخ مقرر کی گئی لیکن بعد6 اپریل دی گئی۔ یہ دن فاقہ اور دعا کرنے کا تھا جب ہندستان نے برطانوی سامراج کی خلاف عدم تشدد کی جنگ کا آغاز کیا۔ گاندھی جی نے وائسرائے کو لکھا "ستیہ گرہ کی مہم سیاست میں انقلاب لانے کی کوشش کرنا اور اخلاقی طاقت کو اس کے اصلی مقام پر واپس لانا ہے"

اس پکار کا ردعمل حیرت انگیز تھا ملک کے ہر ایک حصہ میں شہر اور گاؤں نے ہڑتال کو کامیاب بنانے اور اس بات کا مظاہرہ کرنے میں کہ تمام ہندستانیوں کے دلوں میں ایک ہی مشترک جذبہ کار فرما ہے ایک دوسرے کا مقابلہ کیا۔

گاندھی جی نے دیکھا "ایک سرے سے دوسرے سرے تک پورے ہندستان کے قصبوں اور دیہاتوں نے مکمل ہڑتال کیا، یہ انتہائی تعجب خیز منظر تھا" 21

دہلی میں یوم ستیہ گرہ 30 مارچ کو منایا گیا بے مثال جوش کے مناظر پیش کئے گئے ہندو اور مسلمان مظاہروں میں شامل ہوئے۔ سوامی شردھانند ایک معروف آریہ سماجی رہنما کو جامع مسجد میں اکٹھا مسلمانوں کو خطاب کرنے کے لئے دعوت دی گئی۔ ایک بہت بڑے جلوس نے سڑکوں پر گشت کیا، ہندوؤں اور مسلمانوں کا بھائی چارہ اور عوام کا جوش حکام کی نظروں میں خطرہ کی علامت تھا۔ اس طرح عجیب و غریب واقعہ سے نپٹنے کا ان کی دانست میں محض ایک طریقہ تھا۔ تشدد چلانا اور اس کو جبر سے دبانا، پولیس کی مزاحمت، فساد، تشدد اور بندوق سے گولی باری ناگزیر نتائج تھے۔

بمبئی میں جہاں گاندھی جی بذات خود موجود تھے چوپال بیچ پر ایک جم غفیر مجتمع ہوا اور بلا کسی حادثہ کے شہر میں گشت کیا، گاندھی جی اور سروجنی نائیڈو نے ایک مسجد میں تقریر کی۔ گاندھی جی کی کتابیں جن پر حکومت نے پابندی لگادی تھی احکام کی نافرمانی کرتے ہوئے کھلے بندوں فروخت کی گئیں۔

بدقسمتی سے احمد آباد اور گجرات کے چند مقامات پر فسادات پھوٹ پڑے۔ لیکن بدترین حادثہ پنجاب میں ہونے والا تھا۔ دلی کے حادثہ کے بعد سے بے چینی کے اسباب کی تفتیش کے لئے

---

21 M. K. Gandhi, C. W. P. 563

گاندھی جی شہر میں آنا چاہتے تھے لیکن دہلی میں ان کی آمد کی اجازت نہ دینے کے لئے احکامات جاری کر دیئے گئے ان کو بمبئی واپس جانے اور پریسیڈنسی میں مقیم رہنے کے لئے مجبور کیا گیا یہ خبر پھیل گئی کہ ان کو قید کر لیا گیا اس سے غم و غصہ پیدا ہوا۔

III امرتسر المیہ

پنجاب جس نے جنگ کی سرگرمی میں سب سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا تمام دوسرے صوبوں کی نسبت بدترین طور پر متاثر ہوا تھا۔ مزید براں اس کی بدقسمتی یہ تھی کہ اس پر میکائل او ڈائر حکومت کرتا تھا جو مارلے کے (Tchinoonks) بدترین نمونہ تھا۔ رولٹ بل نے جیسے پنجاب کے زخموں پر نمک پاشی کی تھی۔ اس نے نہ کوئی وکیل، نہ اپیل، نہ دلیل/22 کو برداشت کیا اور ڈائر جیسے حکام کے حکم سے ہر ایک عوامی کارکن کو بدترین نتائج سے خوف زدہ کیا۔

چونکہ تناؤ اور دباؤ نسبتاً پنجاب میں زیادہ تھا اس لئے وہاں دیگر صوبوں کی نسبت شورش زیادہ وسیع اور شدید تھی، وہاں نسبتاً زیادہ جوش، سخت تر جذبات، لوگوں کا وسیع تر اژدہام ہوتا تھا اور یہ سب فساد آمیز مظاہروں، حکام کے لئے خطرے کی دہشت اور متعدد تصادم کا باعث تھے 1907 کے زمینی بے چینی کے زمانہ ہی سے پنجاب شورش پسندی کے لئے شہرت حاصل کر چکا تھا جب سے اب تک حالات مزید بگڑ چکے تھے۔ صوبہ گہری جذبہ مایوسی کو محسوس کر رہا تھا اور گاندھی جی کی للکار نے عوام پر برقی اثر ڈالا۔

پہلے ہی سے پورے صوبہ میں متعدد احتجاجی اجتماع ہو چکے تھے۔ چھٹویں اپریل کو لاہور اور دوسرے شہروں میں ہڑتالیں کی گئی تھیں۔ گورنر نے پرغیظ جوابی عمل کیا اس نے ایک تہدیدی تقریر میں صوبائی لیجسلیٹو کونسل سے کہا۔

"اس لئے میں اس موقع پر ان سبھی لوگوں کو جو صوبہ میں سیاسی تحریک سے منسک ہیں۔ متنبہ کرتا ہوں کہ وہ ان جلسوں کی جن کو وہ منعقد کریں، مناسب کاروائی، ان میں استعمال کی جانے والی زبان اور ان جلسوں کے بعد پیدا ہونے والے نتائج کے ذمہ دار ہوں گے" 23/.

22- Bamford P.C. op.cit. P.10.

23. Proceeding of the Legislative Council of the Punjab 1919 Vol X, PR 290-91

دی ٹریبون نے اس تقریر کو اشتعال انگیز نا عاقبت اندیشی کے نام سے رسوا کیا۔

۱۰ اپریل کو گاندھی جی کی گرفتاری کی خبر ملنے پر لاہور میں ایک جلوس نکالا گیا۔ پولیس طلبا اور مظاہرین پر گولی چلائی۔ ایک مجمع اور ایک اجتماع کو گولیوں کا شکار بنایا گیا۔ تین مقامی رہنماؤں کو جلاوطن کر دیا گیا۔

لیکن جو کچھ لاہور میں وقوع پذیر ہوا امرتسر میں ہونے والی وحشت زدگی کے مقابلے میں ماند پڑ جاتا ہے۔ یہاں احتجاجی جلسے فروری میں شروع ہوئے تھے۔ 23 مارچ کو ستیہ گرہ تحریک کی حمایت میں ایک جلسہ ہوا جس کے 6 دن بعد 30 مارچ کو ہڑتال کے اعلان اور وضاحت کے لئے دوسرا جلسہ ہوا۔

حکام کا فوری ردعمل رہنماؤں میں ایک ستیہ پال کو عوام کو خطاب کرنے سے روکنا تھا اس نے شہریوں کو خوف زدہ نہیں کیا اور مورخہ 30 کو ایک ہڑتال کی گئی اور جلیانوالہ باغ میں ایک جلسہ ہوا۔ ۱۰ اپریل کو ایک دوسرے رہنما سیف الدین کچلو کو بھی ستیہ پال کی طرح نوٹس دیا گیا اور متعدد دوسرے حراست میں رکھے گئے مورخہ ۶ کو مکمل ہڑتال کی گئی لیکن امن قائم رکھا گیا ڈپٹی کمشنر جھنجلا گیا اور فوراً مزید فوجی کمک طلب کی ۹ اپریل کو ایک ہندو تہوار تھا اور ہندو مسلمانوں اور سکھوں کے ایک بہت بڑے جلوس نے سڑکوں پر گشت کیا۔

گاندھی جی جو رہنماؤں کی دعوت پر پنجاب کا سفر کر رہے تھے پلوال میں روک لئے گئے اور صوبے میں داخل ہونے سے روک دیئے گئے۔

دوسرے دن صبح (۱۰ اپریل) کچلو اور ستیہ پال کو امرتسر سے شہر بدر کر دیا گیا۔ ان دو واقعات نے عوام کو مشتعل اور برافروختہ کر دیا۔ مجمع ڈپٹی کمشنر سے ملاقات کرنے اور احکامات کو منسوخ کرنے کی درخواست کرنے کے لئے اکٹھا ہوا۔ فوجی دستوں نے ان کو ڈپٹی کمشنر کی رہائش گاہ کی طرف جانے سے روکنے کی کوشش کی۔ سوار پولیس نے بھیڑ پر گولی چلائی جس سے چند اموات ہوئیں اور کئی دوسرے زخمی ہوئے۔ مزید مجمع اکٹھا ہوا اور خیر مقدم گولیوں سے کیا گیا۔ پھر برانگیختہ مجمع نے تمام حدود کو توڑ دیا جس کے بعد وحشیانہ تخریبی کارروائیاں، آتشزدگی، قتل و غارت عمل میں آئیں۔ اوڈائر نے امرتسر کو عدم تشدد کے پیرو رہنماؤں سے محروم کر کے کانٹا بو دیا تھا اور ہندوستان نے کانٹا کاٹا معصوم عوام کے قتل عام کی فصل کاٹی۔

مورخہ ۱۱ کو امرتسر فوجی حکام کے سپرد کر دیا گیا اور بریگیڈیر ڈائر نے اسی رات ذمہ داری

سنبھال لی 12 اور 13 اپریل کو اعلان جاری کیا گیا جس کے ذریعہ اگر جلسے کئے گئے، یا جلوس نکالے گئے اور تشدد سے کام لیا گیا تو ہولناک نتائج کی دھمکی دی گئی۔

عوام کا ردعمل ان دھمکیوں کے خلاف احتجاج کرنا تھا۔ 13 اپریل کے سہ پہر میں جلیانوالہ باغ میں ایک جلسہ منعقد کیا گیا۔ ڈائر نے اس کو اپنی طاقت کے خلاف تصور کیا اور ایک مثال قائم کرنے سبق دینے کے لئے بزور طاقت اس جلسہ کو منتشر کرنے کا فیصلہ کیا۔

جلیانوالہ باغ عمارتوں سے محصور ایک کھلا ہوا احاطہ تھا جس میں ایک ہی ایسا تنگ راستہ تھا جس سے ایک مسلح کار بھی نہیں گذر سکتی دوسری طرف تین یا چار شگاف تھے۔ (31) احاطہ میں مختلف اندازوں کے مطابق پندرہ سے بیس ہزار اشخاص جمع ہو گئے تھے۔ وہ لوگ امن طریقہ سے رہنماؤں کی تقاریر سن رہے تھے کہ ڈائر اور اس کے ساتھی صدر دروازہ پر آ گئے ڈائر نے فوراً اپنے فوج کی صفیں باندھ لی اور بلا کسی اطلاع کے گولی باری کر دیا۔ سیکڑوں اشخاص مارے گئے اور بے شمار لوگ بعد میں ہونے والی بھگدڑ سے کچل گئے۔ کشتوں کے پشتے لگ گئے اور زخمی دور سے کراہتے اور پانی کے لئے چلاتے رہے لیکن گولی باری ہوتی رہی (جب تک میگزین خالی نہیں ہو گئی) گولہ بارود ختم نہیں ہو گیا۔ مرے ہوئے اور زخمی لوگوں کی پرواہ کئے بغیر اپنی کارستانی پر نظر ڈالتے ہوئے پر غرور انداز میں ڈائر قتل گاہ سے چلا گیا۔

مقتول اور زخمی لوگوں کی تعداد کبھی نہیں معلوم ہو سکے گی۔ سرکاری بیان کے مطابق مرنے والے 379 تھے یا ایک ہزار تھے۔ بات خارج از بحث ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ جب انگلینڈ میں حکومت سیاسی اصلاحات کے ذریعہ ہندوستانیوں کو خود مختار حکومت کے لئے تربیت دینے کے ارادے کا اعلان کر رہی تھی۔ تو ہندوستان میں اس کے کارکن نمائندے ہندوستانیوں کو دراصل غلامی، بزدلی، ریاکاری اور چاپلوسی کی خصوصیات کی نشوونما کے لئے خوف و ہراس کا سبق دے رہے تھے۔

جلیانوالہ باغ کا قتل عام ایک اکیلا واقعہ نہ تھا۔ پنجاب میں چلائی جانے والی عوام کو دہشت زدہ کرنے کی حکمت عملی کی متعدد مثالوں میں سے یہ ایک تھی۔ قتل عام کے بعد امرتسر میں کرفیو کا حکم جاری ہوا جو دو مہینہ قائم رہا۔ اس سے بدتر یہ تھا کہ پانی اور بجلی کی سپلائی کاٹ دی گئی۔ ہنٹر بازی اور کوڑے کی سزا عام تھی اور ایک حکم صادر کیا گیا کہ اس گلی سے جس میں ایک انگریز خاتون مس شروڈ (Miss Sherwood) قتل کی گئی تھی۔ گذرنے والا کوئی بھی شخص اپنے پیٹ کے بل رینگ کر چلے گا۔ 13 اپریل کو نافذ کئے گئے مارشل لا کے تحت بے شمار لوگوں پر مقدمہ چلایا گیا۔ بہت سے

لوگوں کو موت کی کالے پانی کی اور مختلف نوعیت کی قید کی سزائیں دی گئیں۔

لاہور میں ایک جلوس پر تین مرتبہ گولی چلائی گئی ۱۰ تاریخ کو اور پھر 17 تاریخ کو۔ ۱۶ تاریخ کو لاہور کے تین سرکردہ لیڈر، رام بھج دت چودھری، ہرکشن لال اور دونی چند، ڈپٹی کمشنر کے گھر بلائے گئے، حراست میں لے لئے گئے اور جلا وطن کر دیئے گئے۔ مارشل لا نافذ کیا گیا۔ اور ہڑتال فوجی طاقت سے ختم کرائی گئی۔ 15 اپریل سے 29 مئی تک مارشل لا کا دور ظالمانہ سلوک کا خوفناک افسانہ تھا فوجی ضرورت کے لئے سواریوں کو ضبط کرنا۔ ضرورتمندوں کے لئے آزادانہ تقسیم خوراک پر پابندی سرسری عدالتوں کے ذریعہ مقدمہ چلانا، قید، کوڑے کی سزا، سرِ عام کوڑے مارنا مئی کی تپتی دھوپ میں طلباء کو دن بھر میں 16 میل پیدل چلایا جانا وغیرہ۔ کلکتہ یونیورسٹی میں اقتصادیات کے منٹو پروفیسر منوہر لال جیسے مشہور و معروف عالم کو بھی بلا وجہ بتائے جیل میں ڈال دیا گیا۔ یہ سب دانستہ طور پر لوگوں کو ہراساں اور ذلیل کرنے کے مقصد سے کیا گیا۔

قصور میں (لاہور اور امرتسر کے قریب) 13 اپریل کو امرتسر سے ملنے والی خبروں سے مشتعل ہو کر عوام کی بھیڑ نے لوٹ مار اور آتش زنی کا اقدام کیا، حکام نے مارشل لا نافذ کر دیا۔ لاہور اور امرتسر کی دہشتناکی کو دہرایا گیا۔ انچارج فوجی افسر مفروضہ سزاؤں کو عائد کرنے میں اپنی اختراع پسندی کو روبکار لایا۔

گجرانوالہ میں ایک اقامت گاہ پر بم پھینکا گیا۔ اخلاقی دباؤ ڈالنے کے لئے شہروں اور گاؤں میں مشین گنوں سے گولیاں برسائی گئیں۔ بلا امتیاز لوگ قید کئے گئے اور ان کو بے حرمتی، کوڑے کی سزا اور کئی طرح کی تذلیل کا ہدف بنایا گیا۔ کئی دوسرے مقامات پر یہی ہولناک کہانی دوہرائی گئی۔ پنجاب کو کم و بیش ایک نو مفتوح غنیم ملک سمجھا گیا۔ یہاں کے لوگوں کو قرار واجب سزا کے خوف سے حکومت کو للکارنے یا اس کی تنقید کرنے کی جرأت نہ کرنے کا سبق دیا گیا۔/24

24- The account is based Largely on:

(1) Report of the Commissioners appointed by the Punjab Sub-Committee of the Indian National Congress.

(2) Disorder Inquiry Committee Report (Hunter) in Six Volumes: and

(3) V.N. Datt Jallianwala Bagh

انگریز حکام، انتظامیہ اور فوج کے اپنے صحیح رنگ میں ظاہر ہوئے جن کی ظاہری تہذیب کا رنگ روغن یک بیک صاف دھل چکا تھا وہ لوگ خوف میں مبتلا تھے، سائے سے بھی ڈرتے تھے اور پلٹ کر مقابلہ کرنے والے خوں خوار درندوں کی طرح برتاؤ کرتے تھے۔ خود سر اور مغرور مشیر کار اوڈائر نے برٹش حکومت کے اخلاقی اساس کے دعویٰ کو ترک کر دیا اور حکومت بزور شمشیر کے عقیدہ کو قبول کیا۔ انکوائری کمیشن کے روبرو اپنے کالے کارناموں کو بیان کرنے میں کسی قسم کے

شرم یا تاسف کے جذبہ کا اظہار نہیں کیا۔

"پنجاب الگ تھلگ کر دیا گیا۔ باقی ہندستان سے کٹ کر رہ گیا ایک دبیز پردہ میں ڈھکا ہوا باہر کی دنیا کی آنکھوں سے چھپا ہوا محسوس ہوتا تھا" جواہرلال نہرو نے اعلان کیا۔25 لیکن بتدریج خبر پھیلی اور ہندستان ہل گیا۔ "جلیانوالہ باغ نے پورے ہندستان میں آگ لگا دی 26/۔ ہر طرف سے اظہار مذمت ہوا۔ رابندر ناتھ ٹیگور کا، برٹش حکومت کی طرف سے ان کو دیئے گئے سرکاری خطاب کا دریس کرنا حکمراں کے اعزاز اور امتیاز تقسیم کرنے کے اختیار کو قبول نہ کرنے کا شاندار انداز تھا۔

اوڈائر اور چیمسفورڈ کو واپس بلانے کی مانگ کی گئی۔ قیدیوں کے لئے تاوان پر زور دیا گیا اور پنجاب کے واقعات کی جانچ کے لئے انگلینڈ اور ہندستان دونوں جگہ اصرار کیا گیا۔

انگلینڈ میں سوم رول لیگ اور لبرل فیڈریشن کی طرف سے سرکردہ ہندستانیوں کا وفد جوائنٹ پارلیمنٹری کمیٹی کے روبرو ثبوت مہیا کرنے میں سرگرم عمل تھا۔ ان میں سے وٹھل بھائی پٹیل، تلک، بی پی چندر پال، مسز بیسنٹ، سریندر پال بنرجی، پنج بہار، بیرو، سری نواس شاستری اور دیگر تھے۔ رائے عامہ کو ٹھنڈا کرنے کے لئے حالیہ واقعات کی جانچ کی اہم ضرورت کا سکریٹری آف اسٹیٹ کو انھوں نے احساس دلایا۔

مانٹیگو کو علم تھا کہ ہندستان پر صرف بزور شمشیر حکومت کرنا ناممکن تھا کیونکہ آپ سنگین

25- [illegible] al Nehru. An Autobiography (1953) P 42.
26- Banerjea Surendra Nath. Op. Cit, P. 304.

سے سب کچھ کر سکتے ہیں۔ سوائے ان پر غالب آنے کے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ حکومت دیسی ہو یا ولیسی، عوام کے موثر طبقوں کے ایک حصہ کی مخلصانہ رضامندی کی برملا امداد کے بغیر کسی ملک پر عرصہ تک حکمرانی نہیں کر سکتی۔ اس کے علاوہ ہندستان کے معاملات میں اس کی ذاتی بازی لگی تھی۔ اصلاحات کو پیش کرنے میں اس نے بڑی جد و جہد کی تھی اور فطری طور پر وہ ان کی کامیابی کے لیے فکرمند تھا اس نے طے کیا اور 22 مئی کو بجٹ پر بحث کے دوران اس نے جانچ کروانے کا وعدہ کیا اس نے چیمسفورڈ کو لکھا "یہ طرز حکومت (اوڈائرزم) جلد یا بدیر اپنا صلہ دیتا ہے"/ 27

17 جولائی کو اس نے ڈائر کے بارے میں وائسرائے کو لکھا اس نے کہا "یہ اپنی نوعیت کی وحشیانہ اور غیر مناسب حماقت تھی جو مجھے غصہ دلاتی ہے۔ میں نہیں مان سکتا کہ ڈائر کی کوئی خدمت جو اس نے کہیں بھی انجام دی ہو اس قسم کے عمل کا کفارا ادا کر سکتی ہے اور میں بہت زیادہ فکرمند ہوں کہ اس کو ایک ایسے حکم کے لیے سزا سے بچ جانا چاہیے جس کے نتائج غالباً پائیدار ہوں گے"/ 28

6 اگست 1919 کو سنہا نائب وزیر ہند نے دارالامرا میں تقریر کرتے ہوئے مانٹیگو کے 22 مئی کے وعدوں کا اعادہ کیا اور کہا "یہ ہرگز ممکن نہیں کہ اس طرح کے فسادات اس طرح سے بپا ہو جائیں اور ان کے اسباب کی جانچ نہ کی جائے اور نہ یہ کہ اس قسم کے فسادات سے نبٹنے کے لیے کیا کاروائیاں کی جائیں"/ 29

لیکن مانٹیگو کی بدقسمتی تھی "کہ ہندستان میں جو طاقتیں ہیں۔ فوج مکمل طور سے ہمارے خلاف ہیں"۔ اس لیے اس نے گورنر جنرل کو سمجھانے کی کوشش کی "صحیح یا غلط ڈائرزم کی حمایت کرنے کی غلطی مت کرنا، ہندستان جیسے ترقی پذیر ملک میں انگریزی دفاتر کے لیے کوئی چیز اتنی تباہ کن نہیں ہے جتنی کہ یہ اعتقاد کہ غلطیوں کا کوئی مداوا نہیں ہوتا اور یہ کہ جو کچھ کوئی حاکم کرتا ہے اس کی حمایت کی جائے گی۔ اور نہ صرف حمایت کی جائے گی بلکہ اس کے طریقوں کو جاری رکھا.........

27- Wiley. S. D. op. cit. P. 209.

28- Ibid. P. 217.

29- Parliamentary Debates House of Lords - Earl Russell's question and Lord Sinha's reply. August. 6. 1919.

جاری ہے گا۔ /30

حکومت ہند نے چارج کی تجویز کی سختی سے مخالفت کی لیکن سکریٹری آف اسٹیٹ (وزیر ہند) ضمانت دے چکے تھے اور وائسرائے کے لئے اسے تسلیم کرنے کے علاوہ کوئی اور چارہ نہ تھا کمیٹی کا اعلان ۱۴ اکتوبر 1919 کو کیا گیا جس کے چیرمین ہنٹر تھے، چار انگریز اور تین ہندستانی سیتل ولد صاحبزادہ، سلطان احمد خاں اور جگت نرائن ممبران تھے۔

کمیٹی نے بشمول ڈائر، مارشل لا کے حکام، فوجی حکام، انتظامیہ کے حکام اور کئی لوگ فسادات میں ملوث تھے متعدد گواہوں کے بیانات لئے۔ حکومت پنجاب نے ان کے سامنے بہت سارے کاغذات پیش کئے جن میں مارشل لا عدالتوں اور کمیشنوں کے حکام شامل تھے لیکن جیل میں قید پنجاب کے سرکردہ رہنماؤں کی مناسب تحفظ کے ساتھ عارضی رہائی کی درخواست کی حکومت کی نامنظوری کی بنا پر پیدا ہونے والی حالت کے تحت کانگرس کی طرف سے کمیٹی کا بائیکاٹ کیا گیا اور سیاسی رہنماؤں نے اس کے روبرو حاضر ہونے سے انکار کر دیا۔

کمیٹی کی رپورٹ میں اتفاق رائے نہ تھا یورپین ممبران نے جو اکثریت میں تھے ایک رپورٹ پر دستخط کئے تین ہندستانی ممبران نے ایک علیحدہ رپورٹ تیار کی۔ اکثریت کی رپورٹ کے انکشافات یہ تھے:۔

(۱) ہنگامے بغاوت کی نوعیت کے تھے جو بڑھ کر انقلاب کی صورت اختیار کر جاتا۔

(2) یہ کہ شورشیں (بلوے) ایک مخصوص تنظیم کی کاروائی کا انجام نہیں اور سب باہم مربوط تھے

(3) یہ کہ حالات کے تحت مارشل لا کی پابندی پوری طور سے حق بجانب تھی اور یہ کہ گولی باری عوامی زیادتیوں کو دبانے کے لئے ضروری تھی۔

(۴) یہ کہ حکومت ہند بے قصور تھی۔

(5) یہ کہ بغیر متنبہ کئے ہوئے بڑی دیر تک اور بہت زیادہ گولی چلانے کے لئے ڈائر کا عمل قابل تنقید تھا، یہ کہ خاطر خواہ اخلاقی اثر پیدا کرنے کا ڈائر کا مقصد فرض کا غلط نظریہ تھا۔

اقلیت نے پہلے دو انکشافات سے اتفاق نہیں کیا اور مانا کہ فائرنگ حق بجانب تھی۔ لیکن سزائیں جیسے پیٹ کے بل چلنا، جائیداد کی ضبطی، کوڑے بازی، کرنا وغیرہ، ہندستانیوں

30- Waley. S.D. op. cit., P. 217.

کو دہشت زدہ اور ذلیل کرنے کے ارادے سے دی گئیں۔

ڈائر کے سلوک پر ہندستانی ممبران نے یورپین ممبران کی نسبت زیادہ شدید نکتہ چینی کی۔ انھوں نے اس کی کاروائیوں کا موازنہ 1914 میں بلجیم اور فرانس میں جرمنوں کی طرف سے ہولناکی کے کئے گئے کاموں سے کیا۔ انھوں نے لکھا "ہم محسوس کرتے ہیں کہ ملک معظم شہنشاہ کی رعیت سے نپٹنے کے لئے ایک غیر انسانی اور غیر برطانوی طریقہ کار اپنا کر ڈائر نے ہندستان میں برطانوی حکومت کے مفاد کو بہت بڑا نقصان پہونچایا ہے۔" 31/

کانگرس نے اپنی خود کی جانچ کمیٹی قائم کی تھی۔ موتی لال نہرو (جنہوں نے 1919 میں کانگرس کا صدر منتخب ہو جانے پر استعفیٰ دے دیا) فضل الحق (جو خاص کام کے سبب سے شامل نہ ہو سکے) ایم۔ آر جیاکر (M. R. Jayakar) (فضل الحق کی جگہ پر) سی۔ آر۔ داس عباس طیب جی، اور ایم۔ کے گاندھی اس کے ممبران تھے۔ انھوں نے اپنی رپورٹ پر 20 فروری 1920 کو دستخط کر دیئے۔

کمیٹی نے ایمانداری سے میکائل اور ڈائر کو موردِ الزام ٹھہرایا "جس نے ہمیشہ تعقل کی بہ نسبت جذبہ اور جہالت سے کام لیا" اور بتایا "عوام اور اپنے اعلیٰ حکام دونوں کو گمراہ کرنے کی کتنی سنگین ذمہ داری کا سزاوار ہوا۔" 32۔ انھوں نے اس پر جنگ کے لیے سپاہیوں کی بھرتی کے لئے جابرانہ طریقوں کے استعمال کرنے اور اس طرح مخالفت اور بے اطمینانی کا جذبہ جس کی انتہا 1919 کے فسادات تھے پیدا کرنے کا الزام لگایا۔ رپورٹ میں مزید یہ کہا گیا۔

"ہمیں بے اختیار کہنے کو جی چاہتا ہے کہ اس نے (او ڈائر) عوام کی طرف سے تشدد کو دعوت دی تاکہ وہ ان کو کچل سکے۔ واقعہ ظاہر کرتا ہے کہ اس نے پنجابیوں کو سخت ترین اشتعال میں مبتلا کر دیا جس کے زیر اثر انھوں نے عارضی طور سے اپنے پر ضبط کھو دیا۔" 33/

چیمسفورڈ (Chalmsford) کے بارے میں انھوں نے رائے ظاہر کی "اس نے

31- Disorders Inquiry Committee Report, the minority Report P.114.

32- Report of the Commissioners appointed by the Punjab Sub-Committee of the Indian National Congress. P.7.

33. Ibid. P.23.

اگرچہ ہم یہ نہیں سمجھتے کہ ہز ایکسلنسی بہ خوشی ان لوگوں کے مفادات کی طرف سے لاپرواہ نہیں تھے جن کو ہز مجیسٹی کی طرف سے ان کی نگرانی میں ان کو سونپا گیا تھا لیکن ہم افسوس سے کہتے ہیں کہ ہز ایکسلینسی لارڈ چیمسفورڈ نے اپنے کو اس بلند عہدے پر قائز رہنے کے لئے نااہل ثابت کیا جس پر ان کو متعین کیا گیا تھا اور ہم سب کی رائے ہے کہ ہز ایکسلنسی کو واپس بلا لینا چاہئے۔"34

پوری توجہ سے تمام واقع کی چھان بین کے بعد وہ لوگ اس نتیجہ پر پہونچے کہ

(1) پنجاب میں حکومت کو گرانے کی کوئی سازش نہیں تھی۔

(2) مارشل لا کے نفاذ کو حق بجانب ٹھہرانے کے لئے کوئی معقول سبب نہیں دکھایا گیا ہے۔

(3) جلیانوالہ باغ کا قتل عام بچوں سمیت بالکل بے قصور اور نہتے لوگوں پر ایک سوچا سمجھا وحشیانہ عمل تھا اور حالیہ برٹش حکومت کی تاریخ میں اپنی سنگ دلی میں لاثانی تھا۔35

حکومت ہند نے Hunter کمیٹی (ہنٹر کمیٹی) کی رپورٹ پر غور کیا اور اس نتیجہ پر پہونچی کہ جلیانوالہ میں ڈائر کا عمل ناقابل حمایت تھا اور یہ کہ وہ معاملہ کی معقول ضرورت سے تجاوز کر گیا اور اپنے فرض کو سمجھا۔ اس لئے اس کو اپنے عہدے پر کام کرتے رہنے کی اجازت دینا غیر دانشمندی سمجھا گیا اس وجہ سے 23 مارچ 1920 کو اُسے اپنے عہدے سے الگ کر دیا گیا۔

ڈائر کے معاملہ سے متعلق پالیمنٹ میں ایک بحث اٹھائی گئی۔ مانٹیگو نے حکومت ہند کے فیصلہ کی موافقت اس بنیاد پر کی کہ برطانیہ ہندستان پر اپنا تسلط تشدد کے ذریعہ قائم نہیں رکھ سکتا۔"36 ـــــ چرچل نے حکومت ہند کی حمایت کی اور اس نظریہ کی تردید کی کہ ڈائر نے سلطنت کو اپنی سنگ دلی کے ذریعہ بچایا تھا۔ انھوں نے جلیانوالہ باغ کے قتل عام کو "ایک انسانیت سوز واقع لکھا" وہ سب سے بڑا کلنک جو اس (تواریخ انگلیشہ) پر دور ماضی سے لے کر اب تک جب کہ ہم نے Joan of Arc (جون آف ارک) کو نذر آتش کیا تھا، لگایا گیا ہے"۔37

34- Ibid P. 157.

35- Ibid P. 158.

36 - Parliamentary Debates, House of Commons 8th July 1920. 5th Series Vol 131, Col 1715.

37- Ibid, Col 1733.

بونر لاء (Bonar Law) نے ڈائر (Dyer) کو قصوروار ٹھہرایا۔38/ پھر بھی جب رائے شماری کی گئی تو 230 کے مقابلہ میں جنہوں نے حکومت کی حمایت کی 129 کی تعداد میں ڈائر کی موافقت میں ووٹ دیئے۔39/

دارالامراء (House of Lords) میں قدامت پسندوں نے بشمول متعدد ریٹائرڈ اینگلو انڈین حکام کثرت رائے سے ڈائر کی حمایت کی تاہم حکومت ہند اپنے فیصلہ پر اٹل رہی۔ اس نے ڈائر کی مذمت کی اور اس سے کمانڈ چھین لی۔

اس کے سبب اس کی حمایت میں ردعمل ہوا۔ ایک بڑی رقم جمع کی گئی۔ 26.000 پونڈ ایک تلوار کے ساتھ اس کے مداحوں کی طرف سے بطور اظہار پسندیدگی اس کو پیش کی گئی تھی۔

اس اثنا میں پنجاب میں (امرتسر، لاہور، قصور، گوجرانوالہ وغیرہ) گجرات میں (احمدآباد، ویرامگم، نڈیاد) اور بنگال میں (کلکتہ) ہونے والے تشدد کے مظاہرے سے مجروح دل کے ساتھ گاندھی جی نے آہ وزاری کی، میں نے عوام کو سول نافرمانی شروع کرنے کی دعوت دی تھی اس سے پہلے کہ وہ اپنے کو اس کے لئے اہل بنا پاتے، اور مجھے اپنی یہ غلطی ہمالیہ جیسی بھاری محسوس ہوتی ہے۔40/ انھوں نے انفعالی مزاحمت کو معطل کرنے کے اپنے فیصلہ کا اعلان کر دیا۔

بدقسمتی سے حکومت کے رویہ میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آئی۔ مارشل لا کے دور کو اس جواز کے ساتھ طول دیا گیا کہ افغان دشمن تھے اور سرحدوں پر حملے کرنے لگے تھے۔ یہ بات شنکرن نائر کے وائسرائے کی مجلس انتظامیہ کی رکنیت سے استعفیٰ کا سبب ہوئی۔

ایک آرڈیننس بنایا گیا جس نے اختیارات کو حکومت پنجاب کے سپرد کر دیا جس کی رو سے 30 مارچ 1919 تک یا اس کے بعد سرزد ہونے والے کسی جرم کو مارشل لا ٹریبونل کو منتقل کیا جا سکتا تھا۔ گاندھی جی پہلے پنجاب سے نکال دیئے گئے تھے۔ سی۔ ایف۔ اینڈریوز C.F. Andrews جن کو پنجاب جانے اور رپورٹ دینے کے لئے مقرر کیا گیا تھا داخل ہونے سے روک دیئے گئے بعد ازاں وکیل نارٹن Eardley Norton کے ساتھ جن کو ملزم کی صفائی پیش کرنے کے لئے

38- Ibid

39- Ibid

40. Tendulkar, D.G. Mahatma, Vol I. P. 316.

بھیجا گیا تھا ایسا ہی سلوک کیا گیا۔ ہارنی مین بمبئی کرانیکل کے مدیر کو حکومت پنجاب کی نکتہ چینی کرنے کی بنا پر ہندستان سے نکال دیا گیا۔ حکومت ہند نے اوڈائر کی حکمت عملی پر اپنی تائید کا اظہار کیا اور حکام کے کالے کارناموں سے چشم پوشی کی۔ اس سے پہلے ہی کہ انکوائری کمیشن اپنا کام شروع کرے اہل حکام کی محافظت کے لئے ایک قانونی ذمہ داری سے بریت کا بل پاس کر دیا گیا۔ جن کا تعلق تشدد سے تھا اور جو قصوروار ٹھہرائے جا سکتے تھے۔ انڈین نیشنل کانگرس کی برٹش کمیٹی نے خیال ظاہر کیا "پروشیا (Prussia) کا نظریہ عمل بھی اس سے آگے نہیں جا سکتا تھا"[41]

ترک موالات کی ابتدا

ستیہ گرہ کے دنوں میں سب سے زیادہ ہمت افزا بات تھی ہندو مسلم میل جول۔ ہندوؤں نے کھانے پینے کی ممانعتوں کو بھلا دیا اور جو کچھ مسلمانوں کے ہاتھ کا ہوتا قبول کرنے مسلمانوں ہندو رہنماؤں کو اپنی مسجدوں میں تقریر کرنے کے لئے بلاتے تھے۔ سوامی شردھانند نے دہلی کی بڑی مسجد جامع مسجد میں خطبہ دیا۔ گاندھی جی اور سروجنی نائیڈو نے بمبئی کی مسجد میں تقریر کی۔ ہڑتال اور ستیہ گرہ میں مسلمان ہندو دوشانہ بدوش رہے اور لاٹھی چارج، گولی، جیل، ملکیت کی ضبطی جیسی حکام کی یورشوں کا بہادری سے مقابلہ کیا۔ ستیہ پال اور کچلو امرتسر کے جڑواں لیڈر تھے۔ گاندھی جی اور محمد علی نے مل کر قومی تحریک کی رہنمائی کی۔

لیکن مسلمانوں کو مصائب کا دوہرا بوجھ برداشت کرنا پڑا۔ ایک تو پنجاب کے مظالم اور حکومت کا جبر و تشدد اور دوسرے ترکی کا المیہ، ترکی کے سلطان، سنی مسلمانوں کے خلیفہ کی ان کی طرف سے بھرپور حمایت کی وجہ سے کئی ہندستانی مسلم رہنماؤں کو بھاری قیمت چکانی پڑی، محمد علی، شوکت علی، ابوالکلام آزاد اور محمود الحسن ان میں سے ممتاز ترین تھے اس بنا پر مسلمانوں کا دکھ سیاسی صورت حال کا اہم پہلو تھا۔

اس طرح ۱۹۱۹ کے سال میں مصائب کا پیالہ لبریز ہوگیا تھا۔ پنجاب میں مارشل لا اس کے قصاصی تاریخ، ترکی کی شکست، اور اس کے تقسیم کئے جانے کا خدشہ، مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات اور ان کی غیر تسلی بخش خاصیت، بھیانک جنگ کے فوراً بعد پیدا ہونے والی اقتصادی بدحالی،

41- Sitaramayya Pattabhi, The History of the Congress, Vol I, P. 353.

روس کا اپنے دھماکہ خیز نظریہ کے ساتھ ہولناک انقلاب، بے چینی کے اہم اسباب تھے۔

ان خوفناک حالات سے دوچار ہو کر انڈین نیشنل کانگریس کی دسمبر 1919 میں امرتسر اپریل کے المیہ کے مقام پر بیٹھک ہوئی۔ امرتسر کا اجلاس کانگریس کی تاریخ میں انتہاپسندانہ تغیر کی نشاندہی کرتا ہے۔ اجلاس کی صدارت موتی لال نے کی۔ جو سیاست میں اعتدال پسند لیکن مضبوط ارادے اور ہمت والے تھے پنجاب اور دوسرے مقام کے واقعات سے ان کا قومی جذبہ خودداری بری طرح مجروح ہوا تھا اور بھی متعدد اعتدال پسند رہنما حاضر تھے۔ سری نواس شاستری، مدن موہن مالویہ، بی این شرما مسز اینی بیسنٹ ان لوگوں میں سے تھے تلک، علی برادران، سوامی شردھانند اور سی۔ آر۔ داس جیسے کئی قوم پرست رہنما کانگریس میں شریک تھے۔ گاندھی جی کی مرکزی شخصیت تھی ستیہ گرہ کے خالق اور محرک ہونے کے علاوہ وہ کانگریس انکوائری کمیٹی کے سرگرم ترین رکن تھے ابھی چند ہفتے پہلے انھوں نے آل انڈیا خلافت کانفرنس کی صدارت کی تھی۔ یہ اس اعتماد کا ثبوت تھا جو ان کو مسلمانوں میں حاصل تھا اور انھوں نے کانفرنس کو حکومت سے تمام تر تعاون کو ترک کرنے کی صلاح دی تھی۔ اگر ترکی کے ساتھ صلح غیر اطمینان بخش ہو۔ لیکن امرتسر میں گاندھی جی نے ایک اعتدال پسندی کا رویہ اختیار کیا۔

زیر بحث آنے والے معاملات میں خاص خاص یہ تھے۔

(1) پنجاب کا مسئلہ

(2) 1919 کا گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ

(3) کانگریس کی از سر نو تنظیم چونکہ انکوائری کمیٹی کی روداد ابھی تک شائع نہیں ہوئی تھی۔ پنجاب کے معاملہ میں کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا لیکن چیمسفورڈ کی بازطلبی اور اوڈائر کے ہٹائے جانے کی مانگ کی گئی تھی۔

گاندھی جی کے اصرار پر ایک تجویز پاس ہوئی جس کے ذریعہ پنجاب اور گجرات کے ان لوگوں کی مذمت کی گئی جو تشدد میں ملوث تھے۔

جہاں تک اصلاحات کا تعلق تھا یہ اعلان کر دیا گیا کہ "وہ ناکافی اور مایوس کن ہے" پھر بھی سفارش کی گئی کہ ان اصلاحات پر عمل کیا جائے۔

اس کے بعد پاس کی ہوئی تجویز کے ذریعہ گاندھی جی کی نگرانی میں ایک کمیٹی مقرر ہوئی جس کا کام کانگریس کے تمام دستور اساسی کے بارے میں غور و خوض کرنا اور تغیر و تبدل کے لئے

مشورہ دینا تھا اور ایسا کرنا ناگزیر بھی تھا کیونکہ اس حقیقت کا انکشاف ہو چکا تھا کہ کانگریس کے طور طریقے، اس کی ساخت اور اس کی کارکردگی، اس کے مقاصد اب جدید ہندوستان کے حالات سے میل نہیں کھاتے تھے۔ پس یہ بات ضروری ہو گئی کہ کانگریس کے سیاسی قائدین اپنے سالانہ اجتماع کو جس کے ذریعہ وہ ہندوستان کی شکایات کا اظہار کیا کرتے تھے، اب غور و خوض کرنے والی باڈی میں تبدیل ہو جائیں جس کا کام پالیسی کا تعین اور اپنے نظام کار پر کنٹرول رکھنا اور اس کی کارکردگی کی رہنمائی کرنا تھی۔ ایک نئے ادارے، کانگریس ورکنگ کمیٹی کی تشکیل ہوئی اور کل ہند کانگریس کمیٹی مجموعی تعداد کو بنیاد بنا کر 350 ممبروں پر مشتمل از سر نو تنظیم کی گئی۔ لسانی بنیاد پر صوبائی کمیٹیوں کی تشکیل کی گئی۔ مختصر یہ کہ کانگریس اور اس کی کمیٹیوں کی توسیع کی گئی اور اس کے ذمہ پالیسیوں کو عمل جامہ پہنانا ہے/42 نئے دستور کی کارکردگی ہندوستانی سیاست میں گاندھیائی دور کا افتتاح تھا۔

مسئلہ خلافت

خلافت تحریک کے باعث کانگریس کی شکل و صورت کو بدلنے میں عملیت سے کام لیا گیا ہندوستانی مسلمان جنگ کے آغاز ہی سے جوش میں تھے ان کے دماغوں میں متضاد خیالات باہم متصادم تھے کیونکہ جنگ نے ایک شدید مذہبی گومگو کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ برطانیہ کی رعایا کی حیثیت سے سرکار سے وفاداری فرض کا درجہ رکھتی تھی کیونکہ اس نے اسے عبادت اور عقیدے کی آزادی دے رکھی تھی لیکن اپنی روایات کے احترام میں خلیفہ کو ماننے کے لئے مجبور تھے کیونکہ وہ مسلم کمیونٹی کا قائد تھا۔

1918ء میں اتحادی طاقتیں فتح پر فتح حاصل کرتی جا رہی تھیں۔ جرمنی نے 11 نومبر کو ہتھیار ڈال دیئے اور ترکی نے 31 اکتوبر 1918ء کو چند شرائط کے ساتھ شکست تسلیم کر لی۔ عرب برٹش کے اشتعال دلانے پر۔ اپنے اقتدار اعلیٰ اور اپنے خلیفہ کے خلاف بغاوت کر بیٹھے۔ عثمانیہ شہنشاہیت پاش پاش ہو کر رہ گئی۔ یونانیوں نے لائڈ جارج کی ہمت افزائی پر ساحلی پٹی بشمول سمرنا کی مانگ کی۔ دسمبر 1918 میں مسلم لیگ اور کانگریس کا ملا جلا اجلاس دہلی میں ہوا۔ لیگ کی مجلس استقبالیہ

---

42. Kaushik, P.D. The Congress Ideology and Programme 1920-1947 - 31.

کے چیرمین ڈاکٹر انصاری تھے انھوں نے اپنے خطبہ استقبالیہ میں شریف مکہ کی جس نے اپنے تسلیم شدہ اقتدار اعلیٰ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا مذمت کی۔ انھوں نے مطالبہ کیا کہ مسلمانوں کی حکومتوں کی آزادی اور سالمیت قائم رکھی جائے اور جزیرۃ العرب (عرب علاقہ) جن میں اسلام کے متبرک مقامات واقع تھے خلیفہ کو واپس کر دیئے جائیں۔ کانگرس کے مجلس استقبالیہ کے چیرمین حکیم اجمل خاں کا خطبہ ڈاکٹر انصاری کے جذبات کی بازگشت تھا۔ انھوں نے مسلمانوں کے مطالبات کی حمایت کے لئے مسلمانوں کی طرف سے گاندھی جی کا شکریہ ادا کیا۔

پنجاب کے اندولن کے دوران مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے خلافت تحریک کے لئے علماء کے ایک بڑی تعداد کی حمایت حاصل کرلی اور اس طرح آل انڈیا خلافت کانفرنس عالم وجود میں آئی۔

دسمبر 1919 میں گاندھی جی اور دوسرے زعمائے کانگرس نے امرتسر میں خلافت کے لیڈروں کے ساتھ مسلمانوں کی شکایات کے ازالہ کے لئے طریقہ کار کے بارے میں صلاح ومشورہ کیا ایک وفد جو کہ وائسرائے سے ۱۹ر جنوری 1920 میں ملا قابل اطمینان جواب پانے میں ناکام رہا۔ بلکہ وائسرائے نے جواباً کہا کہ "ترکی دوسری طاقتوں کی طرح جنھوں نے جرمنی کے لئے میان سے تلوار نکالی تھی مقابلتاً کچھ زیادہ کی امید نہ رکھے۔ وہ اپنی کرتوت کے نتائج بھگتنے سے بالکل نہیں بچ سکتا۔

20ر فروری 1920 کو خلافت کانفرنس کا اجلاس زیر صدارت ابوالکلام آزاد کلکتہ میں منعقد ہوئے تحریک عدم تعاون کی تجویز پاس کی۔ یہ طے کیا گیا کہ ایک وفد لندن جاکر خلافت کے معاملے کو برٹش حکومت کے سامنے پیش کرے۔ ۱۰ر مارچ کو گاندھی جی نے ایک منشور کا اجرا کیا جس میں انھوں نے عدم تعاون کی عدم تشدد کی پالیسی کی وکالت کی۔ ۱۹ر مارچ کو یوم ماتم منایا گیا۔

15ر مئی 1920 کو سیورے میں کیے گئے صلح امن کی دفعات کا اعلان ہوا۔ دفعات کی سنگدلی مسلمانوں کے لئے انتہائی اذیت ناک تھی۔ ایسی حالت میں مرکزی خلافت کمیٹی کی نشست بمبئی میں ہوئی اور 28ر مئی کو مسلمانوں کے دعوؤں کی توثیق کی اور انجمن ظلم بند کیا اور عدم تشدد کے ساتھ عدم تعاون کی تحریک میں قدم اٹھانے کے فیصلے کا اعلان کیا۔

ایک بیان ہندستان کے ہندوؤں کے خدشات کے زور کو کم کرنے کے لئے کیا گیا جس نے اس بات کی یقین دہانی کرائی کہ ہندستان کا مسلمان آخر دم تک اس مسلم سلطنت کا مقابلہ کرتا رہے گا جو ہندستان کے خلاف کوئی برا عزم رکھتی ہو۔43

آزاد نے اس کی شرعی توضیح ان الفاظ میں کی ۔

"اگر ہندستان آزاد ہو جاتا ہے اور اس پر ایک ایسی حکومت کا قیام عمل میں آتا ہے جو مسلمانوں کے لئے وہی آزادی روا رکھتی ہے جو وہ دوسرے فرقوں کو دیتی ہے تو ایسی حالت میں شرعی حکم یہ ہے کہ مسلمان حملہ آوروں سے اپنے ملک کا دفاع کریں ۔ بلا لحاظ اس بات کے کہ حملہ آور مسلم ہوں یا خلیفہ کی فوج ہی کیوں نہ ہو یہ /44

گاندھی جی کو مسلم کاز کے مبنی برانصاف ہونے کا کامل یقین تھا ۔ انھوں نے بیان دیا کہ میرے اوپر بحیثیت ہندستانی کے یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ میں اپنے ہندستانی بھائیوں کے دکھ درد کو بٹاؤں اور ان کی آزمائشوں اور ابتلاؤں میں شریک رہوں اگر میں مسلمانوں کو اپنا بھائی سمجھتا ہوں تب یہ میرا فرض ہو جاتا ہے کہ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ان کی آزمائش کے وقت مدد کروں بشرطیکہ ان کا کاز مبنی پر انصاف ولائق تحسین ہو یہ /45

۹ر جون ۱۹۲۰ کو خلافت کمیٹی کی نشست الہ آباد میں ہوئی اور عدم تعاون کے چار مدارج کا اعلان کیا ۔

(۱) اعزازی عہدوں سے مستعفی ہونا اور خطابات واپس کر دینا ۔

(2) حکومت کی سول سروس کے عہدوں سے استعفی دے دینا ۔

(3) پولیس اور فوج کی ملازمتوں سے استعفی دے دینا ۔

(4) ادائیگی ٹیکس سے انکار ۔

جولائی ۱۹۲۰ میں سندھ میں خلافت کمیٹی کی کانفرنس کا انعقاد ہوا اس میں گاندھی جی بھی شامل ہوئے انھوں نے تینتیس کروڑ ہندؤں کو پکارا کہ وہ سات کروڑ مسلمانوں کی مدد کریں اور حکومت کی امداد کرنے سے باز رہیں ۔

اب یہ منزل آگئی جب اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی کہ اب آخری فیصلہ کر ہی لیا جائے گاندھی جی نے ایک آرٹیکل جس کا عنوان "مسٹر مانٹیگو اور خلافت اندولن" تھا سپرد قلم کیا ۔

---

43 - Bamford, P.C. op.cit, P.156.

44 - Syed Tufail Ahmad Manglori; Musalmanon Ka Roshan Mustaqbil (Urdu) P.512.

45 - Young India 2nd June 1920.

"حیرت اور ناامید کی حد تک مجھے علم ہے کہ سامراج کے موجودہ کارکنان ایمان سے کورے اور غیر محتاط ہو گئے ہیں انھیں ہندستان کی خواہشات کا لحاظ نہیں رہ گیا ہے۔ وہ ہندستان کی عزت کو کوئی اہمیت نہیں دیتے ہیں اس لئے ایک ایسی حکومت کے لئے (جس کے کارکن اتنے برے ہوں) جو ایسے برے کار کنوں سے منظم ہو جیسے کہ آج کل ہیں میں محبت اور شفقت کے جذبات اپنے دل میں قائم نہیں رکھ سکتا"46/

28/ جولائی 1920ء کو گاندھی جی نے اعلان کیا کہ عدم تعاون کا افتتاح برت رکھ کر عبادت کے ساتھ یکم اگست کو کاروبار معطل کر کے کیا جائے۔ تلک نے وعدہ کیا کہ وہ عدم تعاون کے پروگرام کی حمایت کریں گے لیکن بد قسمتی یہ ہوئی کہ اگست کے طلوع آفتاب کے قبل نصف شب میں وہ انتقال کر گئے۔ گاندھی جی شوکت علی اور ڈاکٹر کچلو نے ان کے جنازے کو کاندھا دیا۔ گاندھی جی نے آہ وزاری کی کہ "میرا سب سے زیادہ پشت پناہ جاتا رہا" (یہی کہہ کہہ کر گاندھی جی روتے جاتے تھے) اخبار کے اموات کے کالم میں۔ انھوں نے لکھا "انسانوں کے درمیان کے دیوتے مٹی چاٹ لی شیر کی دھاڑ خاموش ہو گئی۔ ان کا نام بہ حیثیت جدید ہندستان کے معمار کے آنے والی نسلوں میں زندہ رہے گا وہ انھیں عزت و احترام کے ساتھ یاد کرتی رہیں گی کیوں کہ جب وہ زندہ رہے ان کے لئے رہے — اور مرے بھی تو ان کے لئے مرے۔ آیئے۔ ہم آپ اس تنہا ذات لوک مانیہ کے لئے ان کی جرأت اور ان کی سادہ روی ان کی حیرت انگیز محنت شاقہ اور حب وطن کی ایک امٹ یادگار اپنے جیون کے تانے بانے میں سمو کر قائم کریں"47/

عدم تعاون کے معرکے کا آغاز یکم اگست کو ایک دھماکہ خیز صورت حال سے ہوا۔ اس تاریخ کو گاندھی جی نے وائسرائے کو لکھا "سامراجی حکومت نے خلافت کے معاملہ میں بے باکانہ غیر اخلاقی انداز اور غیر منصفانہ رویہ اپنایا ہے اس لئے میں ایک ایسی حکومت کے لئے اپنے دل میں جذبہ محبت باقی نہیں رکھ سکتا ہوں" اور اس خط کے ساتھ ان تمام تمغہ جات کو جنہیں سرکار نے ان کے کارہائے نمایاں پر تحسین آمیز اعتراف کے طور پر عطا کئے تھے واپس کر دیئے۔

عدم تعاون کے سلسلہ میں دوسرا اقدام کانگرس کی منظوری اور اس کی توثیق کا حاصل کرنا تھا اس لئے 4/ ستمبر کو کلکتہ میں ایک اسپیشل اجلاس بلایا گیا۔ اسی عرصہ میں گاندھی جی، شوکت علی

46- Tendulkar, D. G. op-cit Vol I, P 365.

47- Ibid, PP. 370-71.

اور محمد علی اور دوسرے زعماء نے ہندوستان کے طول و عرض کا دورہ کیا جس میں دیش کے جوش کو خوب ابھارا گیا اور ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا گیا۔

لالہ لاجپت رائے کی چیئرمینی میں کانگرس کا اجلاس ہوا تقریباً 3000 نمائندوں نے شرکت کی جن میں غالب اکثریت مسلمانوں کی تھی۔

گاندھی جی نے ایک نہایت اہم فیصلہ تجویز کیا جس کی تمہید میں انھوں نے مسئلہ خلافت کی تاریخ، پنجاب کے ساتھ کی گئی ناانصافیوں کے خلاف ایک قابل اطمینان حل کے حصول کے لئے تمام مساعی ناکامیوں کا بیان تھا پیش کی۔

"مزید برآں اس کانگرس کی رائے میں ہندوستان کے عوام کے سامنے کوئی کھلا ہوا دوسرا راستہ باقی نہیں رہ جاتا ہے سوائے اس کے کہ وہ اپنی منظوری دے کر ترقی پذیر عدم تعاون کو اس وقت تک اپناتے رہیں جب تک متذکرہ غلطیوں کی اصلاح نہیں کر دی جاتی ہے۔ اور سوراج قائم نہیں ہو جاتا ہے۔

اس تجویز میں عدم تعاون کے پروگرام کی سات مدات کا بیان تھا ان مدات پر عمل پیرا ہونے کی ایک نہایت پرخلوص درخواست تھی۔ انھوں نے سوال کیا کہ اگر کانگرس نادہندہ ہاتھوں کو مروڑ کر انصاف نہیں چھین سکتی تو پھر کیسے وہ اپنے وجود اور اپنی عزت کو ثابت کر سکتی ہے۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ اگر اس پلان کے جواب میں کافی آواز اٹھتی ہے تب آپ لوگ ایک سال کے عرصہ میں سوراج حاصل کر لیں گے۔"48

ایک طویل بحث کے بعد 9 ستمبر کو کثرت رائے سے تجویز پاس ہو گئی۔ ایک قلیل تعداد نے جناح کی سرکردگی میں خلاف ووٹ دیا۔ حالانکہ بحیثیت صدر مسلم لیگ انھوں نے اس بات کو تسلیم کر لیا تھا کہ "کوئی دوسرا کھلا ہوا راستہ سوائے عدم تعاون کی پالیسی کو اپنائے ہوئے نہیں رہ جاتا ہے۔ حالانکہ یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ گاندھی جی کا پروگرام ہو۔"49 دسمبر کے ناگپور سیشن میں 1500 نمائندوں نے شرکت کی اور عدم تعاون کی تجویز کی ایک زبان ہو کر توثیق کی۔ ان لوگوں نے بھی جنہوں نے کلکتہ میں اس سے اختلاف کیا تھا۔ ناگپور میں باستثنائے جناح حمایت کی۔

48- Ibid. Vol II, PP. 12-15.

49- Ibid; P. 19.

ایک فتوی کے ذریعہ جیسے جمعیتہ العلماء نے جاری کیا تھا کانگرس کے تجویز کی حمایت کی گئی اس فتوی کے ذریعۂ مسلمانوں سے کہا گیا کہ وہ الکشن، سرکاری مدراس، کالجوں اور کچہریوں کا بائیکاٹ کریں اور خطابوں اور امتیازی عہدوں سے جو سرکار سے بطور عطیہ جات انھیں ملے ہوں دست برداری کا اعلان کریں اس فتوی پر ۹۰۰ علماء کے دستخط تھے جسے معرکۂ آزادی کو جاری رکھنے کے لئے دیا گیا تھا۔

ناگپور میں کانگرس کے دستور اساسی کو منظور کرکے اسے ایک موثر، قومی اور قابل عمل تنظیم میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔

گورنمنٹ سے عدم تعاون کا اعلان درحقیقت جنگ کی سمت میں ایک انقلاب آفریں قدم تھا فرق صرف یہ تھا کہ یہ جنگ عدم تشدد کے اصولوں پر لڑی جانے والی تھی۔ یہ ایک انوکھی جنگ تھی یہ مقابلہ کرنے والوں کے لئے نہ تو ضرر رساں اور نہ ایذا رساں تھی بلکہ اس میں ہر طرح کی چوٹ عدم تعاون کرنے والوں پر پڑتی تھی اسلحہ سے لڑی جانے والی جنگ کے مقابلہ میں یہ جنگ مطالبہ کرتی تھی زیادہ نظم و ضبط کا ''اعلیٰ جذبات جوانمردی کا۔ زیادہ تحمل کا ''اعلیٰ قربانی کا ''اعلیٰ صبر کا'' یہ کسی بھی گناہ آلود جذبہ، غصہ یا نفرت کی اجازت ہی نہیں دیتی تھی۔ اس میں ضرورت تھی آتش بداماں عقیدہ کی، یہ داعیہ حق پر ہے اور اس کا مطالبہ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اس عقیدے پر جمے رہنے کا تھا خواہ اس کا انجام کچھ ہو اچھا یا برا۔ یہ مطالبات تشدد کی جنگ کی بہ نسبت اس عہد کے بنا ہنے کے کام کو زیادہ مشکل بنا دیتے تھے اور سخت بھی۔

گاندھی جی نے بنا لیپا پوتی کئے ہوئے یہ بات صاف صاف کہہ دی کہ ''سول نافرمانی نام ہے مسلح جو یانہ بغاوت کا۔ یہ ہر صوبائی قانون کی خلاف ورزی کی انکاری صورت ہے۔ درحقیقت یہ مسلح بغاوت سے بھی زیادہ خطرناک ہے کیونکہ اس پر قابو پایا ہی نہیں جاسکتا اگر سول نافرمانی کرنے والے شدید سے شدید تر مصائب کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہیں اس کی بنیاد اس مکمل یقین پر قائم ہے کہ میرے ناکردہ گناہ کی سختیاں مکمل تاثیر کا درجہ رکھتی ہے۔'' 50

کانگرس اور خلافت کمیٹی کے درمیان عدم اشتراک کے سہ رخی مقاصد کے بارے میں سمجھوتہ ہوچکا تھا یعنی پنجاب کی شکایات کا ازالہ، خلافت کے ساتھ کی گئی ناانصافیوں کی تصحیح اور سوراج کا قیام گاندھی جی نے اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ وہ سمجھائیں کہ انھوں نے خلافت تحریک کا

---

50 - Ibid , P. 71.

کیوں ساتھ دیا اس کے اصلی وجوہ اس کے انسانی اور اخلاقی پہلو تھے۔ یہ وجوہ اپنے کم سے کم معنی میں سیاسی نہیں تھے حالانکہ بلاشبہ ان کا مدعا مستقل قومی مفاد کا حصول تھا۔

خلافت کے کیس کی بنیاد اس صداقت پر قائم تھی کہ سلطان ترکی تسلیم شدہ خلیفہ تھے یعنی مسلمانوں کے مذہبی رہنما جن کے ذمہ اسلام کے مقامات مقدسہ کے سلسلہ میں کچھ فرائض کی بجا آوری تھی جنہیں ان کی ذاتی حیثیت سے ان کے ذمہ رکھا گیا تھا۔ اس لئے اس بات کی ضرورت تھی کہ مقامات مقدسہ ان کے کنٹرول اور نگرانی میں رہیں۔ اس لئے تحریک خلافت کے مطالبات حسب ذیل تھے۔

(۱) خلیفہ کے دنیوی اور مذہبی وقار کو قائم رکھا جائے۔ سلطان ترکی جو علامت تھے۔ خلیفہ کے بلا روک ٹوک فرائض کے انجام دہی کی یعنی مقامات مقدسہ کو بشمول فلسطین میسوپوٹامیہ اور عرب صحیح اور سالم رکھنا جس کی وضاحت مسلم قاضیوں نے کی ہے۔

اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ جزیرۃ العرب کے باشندوں کی خواہشات کے خلاف ترکی حکومت ان پر لاد دی جائے اس سے مقصد صرف یہ تھا کہ خلیفہ کا مقامات مقدسہ پر کنٹرول تسلیم کرتے ہوئے انھیں حکومت خود اختیاری دے دی جائے۔

چونکہ اس مطالبہ کی بنیاد اسلام کی روایات اور شرعی قوانین پر تھی اس لئے ہر مسلمان کا یہ مذہبی فریضہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ ان شرعی قوانین پر عمل کرے۔

(۲) مسلم حکومتوں کے اقتدار اعلیٰ کی گارنٹی دینا اور فرانس اور برطانیہ کو عرب ریاستوں کے زرخیز علاقوں پر حکمراں ہونے اور فلسطین کو زیر سایہ برطانیہ یہودی وطن میں تبدیل کرنے اور قبایل کے سرداروں کے درمیان ملک عرب کا حصہ بخرہ کرنے سے باز رکھنا۔

مسلم معاملہ کی بنیاد ان مستحکم وعدوں پر تھی جنہیں برٹش وزیراعظموں اسکوئتھ اور لائڈ جارج اور برٹش وائسرائے ہارڈنگ نے مقامات مقدسہ اور ترکی سلطنت اور مسلم ممالک کو آزادی دینے کے بارے میں کئے تھے لیکن ان وعدوں کے برخلاف ان لوگوں نے جنگ کے زمانہ میں بیدردی سے نظر انداز کر دیا تھا۔

ان وعدوں کی اہمیت اس وجہ سے تھی کہ ہندستانی مسلم افواج ترکی کی مسلم فوج کے خلاف جنگ کے مختلف میدانوں میں اس یقین کے ساتھ اتری تھیں کہ یہ وعدے پورے کئے جائیں گے لیکن برٹش افواج نے جو مشرقی وسطیٰ میں برسرپیکار تھیں مقامات مقدسہ

کو بخشا نہیں تھا مزید براں سیورے کے صلح نامہ سے ترکی سلطنت کے پاش پاش ہو جانے کا خطر لاحق ہو گیا تھا۔ یونانیوں کو اکسایا گیا تھا کہ وہ ترکی وطنی علاقوں کو ہتھیالیں ۔ عرب میں ترکی مقبوضات سیریا، لبنان، اردن اور عراق عارضی طور پر برطانیہ کے زیر حکومت دے دیئے گئے فلسطین یہودیوں کے حصہ میں آیا تاکہ وہ اسے اپنا قومی وطن بنائیں۔ مصر ترکی سلطنت سے چھین کر زیر سایہ برطانیہ کر دیا گیا ۔

اس سے بڑھ کر وعدہ خلافی کی کھلی ہوئی سنگین مثال ہو ہی نہیں سکتی ۔ یہ بات اخلاقی ضمیر نیز انسانی ہمدردی کی پکار تھی کہ ہندستان مسلم مطالبات کی حمایت کرے ۔ گاندھی جی کی نگاہ میں یہ بات ایک گھٹیا درجہ کی حب الوطنی تھی اگر قوم کا ایک بازو ضرورت کے وقت دوسرے بازو کی مدد کرنے سے قاصر رہے اور خلافت کے معاملے میں یہ بات فرض کے دائرۂ عمل میں آتی تھی کیونکہ یہ معاملہ انصاف پر مبنی تھا۔

گاندھی جی کہا کرتے تھے "یہ میری بالکل ذاتی اخلاقی ذمہ داری کا احساس ہے جس نے مجھے مسئلہ خلافت کو اپنے ہاتھ میں لینے کے لئے تیار کیا ہے۔ اس معاملے میں مجھے مسلمانوں کے ساتھ کامل اتفاق ہے ۔ یہ بات بالکل سچ ہے کہ میں ہندوں اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد اور یگانگت کی ہمت افزائی کر رہا ہوں ۔" /51

بہر حال مسلمانوں نے رولٹ ایکٹ کے خلاف کیئے گئے ستیہ گرہ کے معرکہ اور شورش کی آگ میں اس جوش و خروش کے ساتھ اپنے آپ کو جھونک دیا تھا جس پر ہر محب وطن بجا طور پر فخر کر سکتا ہے لیکن جذبہ قومیت ایک نازک پودا ہے اور اس کی پرورش اور دیکھ ریکھ بہت احتیاط سے کرنی پڑتی ہے ۔ اس کی جڑ بھائی چارگی، جذبات محبت اور آپسی اعتماد پر قائم ہے اور یہ اعتماد اور محبت گھٹتے بڑھتے رہتے ہیں جیسے جیسے ان جذبات میں کمی یا بیشی ہوتی رہتی ہے۔

جہاں تک مسئلہ ترکی کے اخلاقی اور انسانی پہلو کا تعلق ہے اس معنی میں گاندھی جی ایک مضبوط چٹان پر کھڑے تھے لیکن یہ بات شبہہ سے پورا نہیں تھی کہ آیا اس کے سیاسی اور عملی خد و خال خلافت کے لیڈروں کے صاف طور پر جانے پہچانے بھی تھے ۔

عدم تعاون کی گاندھیائی تحریک ۔ قومیت، سیاست، مذہب، تصوف اور تشدد انہ

51- Young India, (1919-22). P.152

تعصب کا ایک عجیب ملغوبہ بن گئی تھی لیکن جیسا کہ جواہر لال نے تمثیلاً بتایا" جیسے ایک پس ماندہ اور پست ہمت قوم نے یک بیک اپنی پیٹھ سیدھی کی ہو اور اپنا سر اٹھایا ہو اور ایک ہمہ گیر پیمانے پر ملک کے طول و عرض میں تنظیم اور ضبط سے بھرپور مشترکہ کاروائی کی ہو ہم نے محسوس کیا کہ اس کاروائی سے عوام کو ایک ایسی قوت ملے گی جس کا مقابلہ ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لئے ہم لوگوں نے اس کاروائی کے پس پردہ غور و فکر کی ضرورت کو نظر انداز کر دیا۔ ہم لوگ اس حقیقت کو بھول گئے کہ ایک بیدار نصب العین کے بغیر عوام کا جوش اور ان کی خارجی قوت دور آتش کی طرح ختم ہو جاتے ہیں"52/

اس سے بھی خراب بات یہ ہوئی کہ کانگرس اور خلافت نے اپنے عظیم مقصد کے عملی پہلو کی طرف توجہ ہی نہ دی اور نہ اپنی بیداری کا ثبوت ان سیاسی خیالات کی موجوں کے بارے میں دیا جو اگرچہ نئی تو نہ تھیں لیکن جنگ کے زمانہ میں ترکی کے اندر بہت تیزی کے ساتھ رواں دواں تھیں۔۔۔

اس بھول چوک کے لئے ہندستان کو ایک بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑی۔

بہرحال ایک ایسی سامراجی قوت کے خلاف، جو حال ہی میں ایک جنگ میں ایک ضدی اور قوی دشمن سے لڑ کر فاتح بن کر نکلی تھی یہ ایک شاندار جرأت آمیز قدم تھے گاندھی جی اور ان کے غیر تربیت یافتہ پرستش کاروں کا ایک بہت بڑا گروہ اس کے بہت قصبوں اور بے شمار دیہاتوں بلکہ سارے ملک پر چھا گیا جو عدم اشتراک کے پیغام سے منقش علم اونچا اٹھائے ہوئے تھے۔

VI عدم تعاون

اس معرکہ کے دو مقاصد تھے تعمیری اور تخریبی۔ اول الذکر انجام دینے کے لئے فیصلہ کیا گیا کہ ایک کروڑ روپیہ کا ایک فنڈ تلک کے نام پر قائم کیا جائے تاکہ اس سے عدم تعاون کے کاموں کا خرچ چلایا جا سکے اور ایک کروڑ رضا کاروں کے دستے کو کنٹرول کیا جا سکے جو ہر طرح کے بائیکاٹ کے کام کو آگے بڑھانے میں ممد ثابت ہو۔ جیسے سماجی، تعلیمی، قانونی اور اقتصادی اور جس سے بیس لاکھ چرخوں کی تقسیم کا انتظام کیا جا سکے جو بیکاروں اور عزت کی زندگی گذارنے والے

---

52. Nehru Jawaharlal, An Autobiography. P. 76.

ملازموں کو کام مہیا کرے اور ہندستانی ہتو کرگھوں کے بنے ہوئے کپڑے غیر ملکی کپڑوں کی جگہ لے سکیں مو خرالذکر تخریبی مقصد کے پیش نظر اہم باتیں یہ تھیں۔

(۱) وکلا کا عدالتی بائیکاٹ، عوامی پنچایتوں کا قیام اور ان کے ذریعہ مقدمات کا فیصلہ کرنا۔

(2) اسکولوں، کالجوں، چاہے وہ نجی ہوں یا گورنمنٹ سے منظور کئے ہوئے ہوں یا اس سے امداد پاتے ہوں ان کے بجائے قومی اداروں کا قیام۔

(3) اسمبلی، صوبائی کونسلوں کے الکشنوں کا بائیکاٹ۔

(4) اعزازات، خطابات وغیرہ کا واپس کر دینا اور سرکاری تقریبات کا بائیکاٹ۔

(5) انگریزی مال کا بائیکاٹ۔ سودیشی مال خاص کر کھدر یا گھروں میں کاتے ہوئے دھاگوں سے بنے ہوئے کپڑے کا استعمال۔

(6) شراب نوشی سے پرہیز۔

ملک ایک زبردست ہل چل سے دوچار ہوا اور جوش و خروش کی عدیم المثال لہر ہندستان کے کروڑوں افراد میں پھیل گئی۔ ہر طرف جوش، مقصد سے لگن، قربانی کے لاثانی مناظر دیکھنے میں آئے۔ امتیازی حیثیتوں کے وکلا جیسے موتی لال۔ سی۔ آر۔ داس، راجندر پرشاد، راج گوپال آچاریہ نے اپنے اپنے منفعت بخش پیشوں کو ترک کر دیا۔ ہزاروں طلبا اپنے اپنے اسکولوں اور کالجوں سے باہر نکل آئے بہت سے قومی اداروں کی بنیاد ڈالی گئی جہاں مدرسین معمولی تن خواہوں پر کام میں لگ گئے۔ محمد علی کے حکم پر علی گڑھ یونیورسٹی کی ایک تعداد نے تعلیم چھوڑ دی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام عمل میں آیا جو بعد میں دہلی منتقل ہو گئی۔ سبھاش چندر بوس نے اپنی سول سروس کی ملازمت سے استعفی دے دیا اور نیشنل کالج کلکتہ کی پرنسپلی کا عہدہ سنبھال لیا۔ جواہر لال نہرو نے الہ آباد ہائی کورٹ کو الوداع کہا اور عدم تعاون کے بھنور میں کھنچ آئے۔ انھوں نے جذبات کے اظہار کے لئے نئے نئے الفاظ دیئے جنہوں نے عدم اشتراک کرنے والوں کو ان الفاظ میں متاثر کیا۔

"1921ء میں ہم میں سے بہتیرے جو کانگرس پروگرام چلاتے تھے ایک قسم کے نشہ سے مست ہو کر کام کیا کرتے تھے۔ ہمارے دل جوش اور خوش آئند مستقبل اور پر مسرت حوصلوں سے بھرے ہوئے تھے۔ ہمیں یہ احساس کر کے خوشی ہوئی تھی کہ ایک شخص ہمارے معاملے کو لے کر جنگ صلیبی لڑ رہا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ بات تھی کہ ہم آزادی کی نعمتوں کو سمجھتے تھے اور اس آزادی پر فخر کرتے تھے مایوسی ظلم و ستم کے پرانے احساسات بالکل ——————————

جاسکتے تھے"/53

گاندھی جی نے اپنے آپ آئی ہوئی بحالی کے لئے جو اس عظیم ہل چل کے ذریعہ پیدا ہوئی تھی جس کا تعلق اندرون قلب سے تھا راستہ صاف کر دیا۔ انھوں نے ایسی دھماکہ خیز قوت ہندستان کی روح میں پیدا کر دی جو اس قسم کے انقلاب کے لئے ضروری تھی اور جس کی تخلیق نہ تو بیرون قلب سے "ادھار لے کر یا بطور تحفہ نہ کسی کے دین سے اور نہ رعایتی انداز پر حاصل کر کے اور نہ ہی کسی باہر سے کئے گئے اعلان کے ذریعہ ہو سکتی تھی"/54

عدم تعاون کی تحریک یکم اگست 1920 سے لے کر جب تک کہ اس تحریک کا آغاز ہوا ۱۲ فروری 1922 تک جبکہ اسے بند کر دیا گیا۔ آہستہ آہستہ آگے بڑھتی رہی اور قوت پکڑتی گئی تلک فنڈ میں عوام کی ذاتی قربانیوں کی کوششوں سے نشانے سے بھی زیادہ ایک خطیر رقم چندہ میں جمع ہو گئی لاکھوں کتائی کے چرخے تقسیم کئے گئے اور ان پر کام ہونے لگا۔ بھرتی ہونے والے رضاکاروں کی تعداد آدھے نشانے تک پہنچ گئی تینوں مقاطعوں میں سے اعزازات کی واپسی کے سلسلہ میں صدائے لبیک کافی حقیر (ٹس سے مس) رہی اور یہ بات کچھ تعجب خیز بھی نہیں تھی۔ تعلیمی اداروں کا بائی کاٹ شروع میں پورے طور پر کامیاب رہا۔ کالج کے طلباء کی تعداد 1919-20 میں 52,482 سے گر کر 1921-1922 میں 45,933 اور سکنڈری اسکولوں کی تعداد 1919-20 میں 1,281,810 سے گر کر 1921-22 میں 1,239,564 ہو گئی"/55

لیکن اتنی کثیر تعداد کے لئے جو اس تحریک سے منسلک تھی انتظام کرنا ایک مشکل بات تھی حالانکہ بہت سے اسکول کالج کھول دیئے گئے تھے لیکن ایک کثیر تعداد کو جگہ ہی نہ مل سکی اور انھیں پھر اپنے اپنے اداروں میں واپس جانا پڑا۔ کچھ یہی بات قانونی پیشہ وروں کے ساتھ بھی ہوئی کیونکہ ایک نعم البدل روزگار کی قلت ان بہت سے لوگوں کے لئے جن کے اوپر اپنے اپنے خاندانوں کی پرورش کا بار تھا۔ یہ بات ناممکنات میں سے تھی کہ اپنے ذرائع معاش سے کنارہ کشی اختیار کر لیں لیکن عدم تعاون والوں

---

53 - Ibid, P. 69.

54 - Ibid, P.66 (Quotation from C.F. Andrews Independence The Immediate Need).

55 - Bamford. P.C. op-cit P. 103.

کی ایک تعداد ایسی تھی کہ اپنے مقدمات جن میں وہ ماخوذ تھے کی پیروی سے انکار کر بیٹھی اور اس نے سماعت کرنے والی عدالتوں میں جواب دعویٰ تک داخل نہیں کیا۔ جہاں تک الکشنوں کے بائیکاٹ کا معاملہ تھا معتدل اور آزاد خیال سیاست دانوں اور ایسے بچے ہوئے دوسروں نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ وہ کونسلوں کے الکشن لڑیں گے۔ کانگرس ووٹ ڈالنے سے الگ رہی پھر بھی قابل وثوق حد تک ووٹ دہندگان پر کنٹرول رکھنے کے لئے اپنے تاثرات کا مظاہرہ تو کر ہی دیا اور الیکشن جیتے ہوؤں کی غیر نمائندگی کا بھانڈا پھوڑ دیا۔

غیر ملکی کپڑے کے خلاف بائیکاٹ کا اثر پورے ہندستان میں محسوس کیا گیا۔ اس بائیکاٹ نے مدراس، بمبئی، بنگال اور یوپی میں کافی حد تک کامیابی حاصل کی ہندستان کی 22-1921 کی تجارت کے بارے میں تبصرے جو محکمہ ٹریڈ انٹلی جنس نے شائع کیا کا بیان ہے کہ دوسرا جس نے زیر سال کے تبصرے کے زمانہ میں خوردہ فروشی کی درآمدات کو بری طرح متاثر کیا۔ وہ تھا جاندار کوشش کے ذریعہ گھروں میں ہندستانی وخردہ مال کی تیاری کا جسے مزید ترقی دینے کی وجہ سے ہاتھ سے کاتے ہوئے سوت کے بنے ہوئے کپڑوں کو استعمال کا سہارا مل گیا تھا۔

شراب کے بائیکاٹ کا جہاں تک تعلق ہے۔ ایکسائز رپورٹ کا کہنا ہے کہ 22-1921 کے زمانہ میں ایکسائز کی آمدنی کافی حد تک گھٹ گئی تھی۔ پنجاب، بہار واڑلیسہ اور بمبئی میں خسارہ بالترتیب 33، 10 6 اور 6 لاکھ روپیہ تھا۔

20 مہینوں تک جاری رہنے والے اس حیرت انگیز معرکے کے تمام واقعات کا بیان کرنا ناممکن ہے جن میں ہندو اور مسلمان خلافت اور سوراج کے دوہرے مقصد کے حصول کیلئے کندھے سے کندھا ملا کر کام کرتے رہے لیکن ان میں کچھ قابل غور ہیں 1920 میں لکھنؤ کے مولانا عبدالباری نے ایک فتویٰ دیا جس پر بہت سے علماء کے دستخط تھے کہ ہندستان۔۔۔ دارالحرب ہے جس کی رو سے مسلمانوں کے سامنے دو ہی راستے رہ جاتے ہیں۔ جہاد یا ہجرت نومبر 1920 میں اس کی توثیق کی گئی اور اس کو مسلمانوں کے سامنے متفقہ فتویٰ کے نام سے پیش کیا گیا۔ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ تقریباً 18000 مسلمانوں نے جو زیادہ سندھ اور شمالی مغربی صوبوں کے باشندے تھے ہجرت کر گئے۔ افغانستان کے حکمراں نے انھیں لینے سے انکار کر دیا اس لئے ان مصیبت زدوں کو بے وطن ہو کر واپس ہونا پڑا۔

جولائی 1921 تک عدم تعاون کی تحریک سے ملک پوری طرح بیدار ہو چکا تھا لیکن اس

تحریک سے انگریز حکمراں بالکل پریشان نہ ہوئے اور خلافت کا مسئلہ حل کی حد سے اتنا ہی دور پڑا رہ گیا جتنا کہ وہ پہلے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تلخی اور مایوسی بہت بڑھ گئی۔ 8 جولائی کے کراچی اجلاس میں مسلم ہندستانی فوج کے جوانوں سے کہا گیا کہ وہ اپنی اپنی ملازمتیں چھوڑ دیں کیونکہ ان کی ملازمت مذہبی نقطۂ نگاہ سے حرام تھی۔ اس کے لیے محمد علی کو ۱۷ ر دسمبر کو قید کر لیا گیا اور ان پر فرد جرم عائد کر کے مقدمہ چلایا گیا۔ گاندھی جی نے تب ایک منشور جاری کیا کہ "بطور ہندستانی ہونے کے ہر شخص کے لیے یہ بات قومی مفاد کے خلاف ہے کہ حکومت وقت کی سول ملازمت اور اس سے بڑھ کر فوجی ملازمت اختیار کر لے"/ 56

5 ر اکتوبر کو کانگرس ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا اس نے خلافت کانفرنس کی تجویز کی توثیق کی اور لوگوں سے کہا گیا کہ عوامی جلسوں میں محمد علی کی تقریر کو دہرائیں۔ اسی جلسہ میں صوبائی کانگرس کمیٹی کو مجاز کیا گیا کہ وہ سول حکم عدولی کی تحریکوں کو شروع کریں۔

نومبر 1921ء میں شہزادہ ویلس (Prince of Wales) ہندستان آئے۔ کل ہند کانگرس کمیٹی نے ان کی آمد کے بائی کاٹ کا فیصلہ کیا۔ جہاں جہاں یہ گئے ہڑتالوں مظاہروں اور سیاسی جلوس سے ان کا استقبال کیا گیا۔ بدقسمتی سے بمبئی میں مجمع قابو سے باہر ہو گیا اور ہنگامہ پسند مجمع کی طرف سے تشدد کے مناظر اور پولیس کی جوابی کارروائی کئی جگہوں پر دیکھنے میں آئی۔

کلکتہ میں زیر قیادت سی۔ آر۔ داس سول نافرمانی شروع ہوئی چونکہ کانگریسی رضاکاروں کو غیر قانونی ہونے کا اعلان ہو گیا تھا اس لیے انھوں نے والینٹروں کی بھرتی کے لیے ایک اپیل شائع کی۔ ان کے لڑکے اور ان کی بیوی نے خود کو پیش کیا اور وہ فوراً قید کر لیے گئے۔ اس کے نتیجہ میں والینٹروں کی تعداد ہزاروں تک بڑھتی گئی اور ایک شدید جوش سارے شہر میں پھیل گیا۔ ۱۰ ر دسمبر کو داس خود بھی گرفتار کر لیے گئے۔ گرفتاری کے قبل دل ہلا دینے والا پیغام یہ تھا:

"مجھے اپنے ہاتھوں پر ہتھکڑیوں کا احساس ہے اور پیروں میں بیڑیاں بھی پڑی ہیں۔ قید و بند کی شدید تکلیف سے دوچار ہوں۔ پورا ہندستان ایک ایک قید خانے کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ کانگرس کے کام کو برابر جاری رہنا چاہیے مجھے گرفتار کر لیا جائے یا مجھے چھوڑ دیا جائے

---

56. Tendulkar D.G. op-cit II. P 82.

اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے ہاں اگر میں زندہ رہتا ہوں یا مر جاتا ہوں تب تو یقین ایک بہت بڑی بات ہوگی"[57]

VII موپلا بغاوت

اس تحریک کے سب سے زیادہ اہم واقعات میں سے ایک منحوس واقعہ کیرل میں موپلاؤں کی بغاوت تھی موپلا عربوں کی نسل میں سے تھے جو ہزاروں سال قبل اس علاقہ میں آباد ہو گئے تھے ان میں بیشتر غریب اور جاہل تھے اور زراعت یا چھوٹے موٹے کاموں میں لگے ہوئے تھے وہ بہت پسماندہ اور بڑی حد تک اپنے مولویوں اور قاضیوں کے زیر اثر تھے جو تھنگل (Thangal) کہلاتے تھے۔ فروری 1921 سے عدم تعاون کی تحریک کیرل میں پھیلنی شروع ہوئی 16 فروری کو چار لیڈر (دو مسلمان اور دو ہندو) قید کر لئے گئے۔ اس پر جوش پھیلنا شروع ہو گیا۔ جلسے ہوئے (کانفرنسیں ہوئیں) اور بہت زیادہ افراد قید خانے میں ڈال دیئے گئے۔ خلافتی جلسوں نے (جہاں اسلام کے ساتھ کی گئی ناانصافیوں کو بیان کیا گیا) ان کے مذہبی جذبات کے لئے آگ پر تیل کا کام کیا۔ حکام نے اس تحریک کو جو نظم و نسق کے لئے ایک خطرہ تھی دبانے کی انتہائی کوشش کی تب باغی موپلاؤں نے توپ و تفنگ کے مقابلے کے لئے اپنے نیزوں اپنی تلواروں کے ساتھ چھاپہ مار جنگ شروع کر دی۔ غصہ سے بپھرے ہوئے موپلاؤں نے حکومت وقت اور اپنے ہندو پڑوسیوں کے ساتھ اذیت ناک حد تک خلاف قانون کاروائیاں اور زیادتیاں کرنی شروع کر دیں۔ کچھ دنوں تک نظام حکومت ٹھپ ہو کر رہ گیا۔ گورنمنٹ نے فوج طلب کی تاکہ اس بغاوت کو فرو کرے باغیوں کے خلاف بہت سخت قدم اٹھائے گئے۔ اکتوبر کے وسط میں مارشل لا کا نفاذ ہوا اور سال کے ختم ہونے تک امن پھر سے قائم ہو گیا۔

ایک بہت بڑی بحث اس بغاوت کے اسباب کے بارے میں چھڑ گئی۔ گورنمنٹ افسران بھی اشتعال انگیزی کے بارے میں ایک دوسرے سے مختلف خیالات رکھتے تھے۔ ایک طرف امیز (Ammes) مالابار کے وقتی کلکٹر کو یقین تھا کہ معاشی حالات ان ہنگاموں کے خاص کر ذمہ دار تھے جو آئے دن مالابار میں بے چینی پیدا کرتے رہتے تھے دوسری طرف ایوانز

57- Cited in Nehru op-cit, P. 79.

(Evens) ان کے افسر اعلیٰ کو اس دعویٰ کی تردید کر کے یہ یقین تھا کہ موپلاؤں کی بے چینی سیاسی اشتعال انگیزی کا نتیجہ تھی اس کے ڈانڈ وں کا پتہ معاشی حالات میں (از قسم ملکیت زمین کا سسٹم) نہیں لگائے جا سکتے۔

حکومت مدراس نے ایوانز (Evens) سے ہم خیال ہو کر اس بات کو تسلیم کیا، کہ اس نتیجہ سے گریز ایک مشکل امر ہوگا کہ کچھ حد تک کم سے کم وہ الزکھے واقعات جو شمال میں گذشتہ صدی کے دوران وقوع پذیر ہوتے رہے، قیمتوں کا بڑھنا، تجارتی رقابت کو سرکاری سرپرستی میں بدل دینا نتیجتہً کسانوں اور زمینداروں کے درمیان چپقلش کا پیدا ہوتا اور ان کے لواحقات، مقدمہ بازی بیدخلی، زبردستی لگان کی وصولی ان سبھوں نے مل کر مالابار میں اپنا فریادی مظاہرہ کیا"/58

ان موجودہ اقتصادی حالات میں ہنگامہ پیدا کرنے کا کافی ہیجانی رجحان پایا جاتا تھا۔ جذبات جیسے ہندستان کی ہمہ گیر شورش خلافت اور کانگریس کی موافقت نے مشتعل کر رکھا تھا ـــــــــ

ـــــــــ حالات کو بد سے بد تر بنانے میں ممد ثابت ہوئے اور اس کے علاوہ پولیس کی زیادتیاں مالابار میں راج گوپال آچاریہ اور یعقوب حسن ایسی ہستیوں کا امتناع داخلہ۔ لیڈروں کی ایک وسیع پیمانہ پر قید و بند اور عدم تشدد کے ذریعہ عدم تعاون کی تحریک کو دبانے کی کوشش نے آخری تنکے کا کام کیا۔ مذہبی جذبات برانگیختہ ہوئے اور مذہبی جنون ناقابل بیان دل ہلا دینے والی خوفناک صورتوں میں ابل پڑا۔

جو اقدام بغاوت کو فرو کرنے میں کئے گئے وہ اتنے ہی وحشیانہ تھے جتنے کے موپلاؤں کے وحشیانہ اقدام۔ برما گڑھوال اور نیپال سے فوجی دستے لاکر جمع کر دیئے گئے۔ گورکھے نیپال اور کاچن (برما کی قوم) عوام کے لئے بالکل اجنبی تھے اور اس لئے باغیوں پر قابو پانے کے لئے ہر قسم کی ہمدردی سے بالکل کورے تھے۔ موپلاؤں کی دل خراش زیادتیوں اور ظالمانہ کاروائیوں کا جواب مارشل لا کے زمانہ میں بے رحمانہ سزاؤں کی صورتوں میں دیا گیا۔ سرگرم باغیوں میں سے 2226 مارے گئے 1615 زخمی ہوئے 5688 قید کر لئے گئے اور 38256 نے ہتھیار ڈال دیئے۔ سب سے زیادہ بدنما رخ

---

58 - *Home Department Political, 1922, proposed questions regarding the leniency question on Malabar.*

ان باغیانہ کی گئی حرکتوں میں سے یہ تھا کہ تقریباً ۱۰۰ موپلے ایک مال گاڑی کے ڈبے میں بھیڑ بکریوں کی طرح بھر کر جو وسط موسم گرما کی جھلسانے والی دھوپ میں آہستہ آہستہ چل رہی تھی کالی کٹ سے مدراس بھیج دیئے گئے اور جب راستہ ہی کے درمیان واقع ایک اسٹیشن پر ڈبہ کھولا گیا تب معلوم یہ ہوا کہ ۶۶ موپلے سانس گھٹنے سے دم توڑ چکے تھے اور بقیہ کی حالت خطرناک تھی۔

موپلا کے ساتھ کیے گئے مظالم کے فوری اثرات افسوس ناک تھے۔ فرقہ وارانہ جذبات کی آگ بھڑک اٹھی۔ مسلم فرقہ پرستوں نے یا تو ان اذیت ناکیوں کا صریحاً انکار کیا یا انھیں ہلکا کرکے دکھایا اور الزام دوسروں پر لگایا۔ مزید یہ کہ موپلاؤں کی اول کے مذہبی جوش اور ان کی بے جگری کی تعریف کی گئی۔ ہندو فرقہ پرست خوف سے کانپ اٹھے۔ مبالغہ آمیز کہانیوں نے جب وہ شمال میں پہنچیں غصے بھرے ہوئے جذبات کو ہوا دی۔ ہندو مذہب خطرے میں ہے کا نعرہ لگا اور شدھی اور سنگھٹن کی منصوبہ بندی ہوئی۔ الزام تراشی اور جوابی الزام تراشی کا زہر یلا حلقہ قائم ہو گیا جس نے ایک ایسی تپش پیدا کی جس میں ہندو مسلم اتحاد کا نازک پودا مرجھانے لگا۔

لیکن اس صدمہ جانکاہ کے باوجود عدم تعاون کی تحریک نے کسی قسم کے ڈھیلا پن کا مظاہرہ نہیں کیا۔ جیسا کہ پرنس آف ویلس کے مقاطعے نے ثابت کر دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ رضا کاروں کی مجوزہ تعداد کی بھرتی میں تیزی آگئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو، لاجپت رائے اور دوسرے بہت سے جیل بھیج دیئے گئے۔

چونکہ حالات خراب صورت اختیار کر رہے تھے۔ مالوی جی، جناح اور بھرگوری سمجھوتہ کرانے کی خاطر بیچ بچاؤ کے لیے درمیان میں آگئے۔ بیچ بچاؤ کرانے والوں نے کلکتہ میں لارڈ ریڈنگ سے دسمبر ۱۹۱۹ء میں ملاقات کی اور طے یہ پایا کہ ایک حل تک پہنچنے کے لیے ایک گول میز کانفرنس بلائی جائے۔ اس کانفرنس کے سلسلہ میں گاندھی جی کا بطور شرط اولین مطالبہ یہ تھا کہ تمام قیدیوں کو بشمول ان کے جو فتویٰ جاری کرنے کے جرم میں قید و بند کی مصیبتیں اٹھا رہے تھے یا جنھوں نے فوجی ملازمت کے بائیکاٹ کی ترغیب دی تھی، رہا کیا جائے۔ لیکن وائسرائے نے عام رہائی دینے کے مطالبے کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اس لیے تجویز گر گئی۔

بڑے دن کی تعطیل میں کانگرس کا اجلاس احمد آباد میں ہوا اور سی۔ آر۔ داس کی عدم موجودگی میں حکیم اجمل خاں نے صدارت کا عہدہ سنبھالا۔ اٹھارہ سال سے زائد عمر والے نوجوانوں سے اپیل کی گئی کہ وہ رضا کاروں کے دستہ میں شامل ہو جائیں۔ طے یہ کیا گیا کہ انفرادی اور اجتماعی دونوں

سول نافرمانیاں چلائی جائیں اور گاندھی جی کو وقت کے تعین، طریقہ کار اور سول نافرمانی کے ذرائع حصول کے مقاصد کے بارے میں پورے اختیار کے ساتھ ڈکٹیٹر بنادیا گیا۔ علماء نے اس میں ایک فعالی حصہ لیا۔

حالات ہر روز بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے یوں معلوم پڑتا تھا کہ ایک بحرانی کیفیت کا آغاز ہونے والا ہے۔ جنوری کے وسط میں مالوی جی اور دوسروں نے ایک ہمہ جماعتی کانفرنس بلائی اس کانفرنس میں گاندھی جی اور جناح شامل ہوئے۔ جیکر اور نت رنجن نے بحیثیت سکریٹری کے کام کیا۔ اس کانفرنس کے حکم پر سول نافرمانی کے افتتاح کی تاریخ ملتوی کر دی گئی لیکن وائسرائے قیدیوں کی رہائی پر اب بھی ٹس سے مس نہ ہوئے اور تجویز نامنظور ہوگئی۔ اس بات سے صاف ظاہر تھا کہ سلاخوں کے پیچھے کچھ ہر بوں کے قیدیوں کو یہ اصرار رکھ کر گورنمنٹ کو امید تھی کہ خلافت کانفرنس اور کانگرس میں علیحدگی ہو جائے گی۔ تاہم کانگرس اس جال میں پھنسنے کے لئے تیار نہیں تھے

سرکار کے ساتھ مصالحتی گفت وشنید کا سلسلہ ٹوٹ گیا کیونکہ سینیر گورنران منہ بھرائی کی پالیسی کے خلاف تھے۔ اس لیے برٹش کابینہ نے بھی اسے نامنظور کر دیا ہے/59 لارڈ ریڈنگ اب سخت قدم اٹھانے کے لئے تیار ہوگئے۔ پوری قوت سے ظلم وتعدی کو کھلی چھوٹ دے دی گئی۔ فروری میں گاندھی جی نے ایک خط وائسرائے کے پاس بھیجا جس میں اسے نوٹس دیا گیا کہ اگر پنجاب کے ساتھ کی گئی ناانصافیوں کا ازالہ نہ کیا گیا اور خلافت کے مسئلہ کو طے کرنے میں گورنمنٹ ناکام رہی تو وہ بارڈولی (گجرات کے ایک مقام کا نام) میں سول نافرمانی شروع کر دیں گے۔ وائسرائے کا جواب انکاری تھا کیونکہ وہ پورے طور پر تحریک کو دبانے کے لئے تیار ہو گئے تھے۔

بدقسمتی سے 5 فروری کو چوری چورا (اتر پردیش کے گورکھپور کے قریب ایک چھوٹا مقام) میں ایک المیہ واقع ہوگیا۔ پولیس والوں کی ایک تعداد سے ایک جلوس کی مڈبھیڑ ہوگئی۔ مغلوب ہو کر انھوں نے تھانے میں پناہ لی۔ بپھرے ہوئے مجمع نے تھانے کو آگ لگادی جس کی وجہ سے عمارت اور اس کے اندر کا سب کچھ جل کر خاک ہوگیا۔ ایسے ہی دوسرے واقعات دوسرے مقامات پر بھی ہوئے یعنی پرنس آف ویلس کی آمد درآمد کے موقع پر۔

59- Reading Papers, Montagu to Reading Telegram 20 Dec 1921
Refer to telegrams from Governer to Viceroy

سوال یہ تھا کہ تشدد کے واقعات کے پھیلنے کی   رت میں کیا قدم اٹھایا جائے۔ گاندھی جی عقیدتاً
لفظاً اور عملاً بالکل پرستار عدم تشدد تھے۔ عوام نے اس روح کو جوان کے فلسفہ حیات کی بنیاد
تھی قبول نہیں کیا تھا۔ اخلاق کی یہ قانون شکنی جو انہیں اپنی جان سے بھی قومی آزادی سے بھی زیادہ
عزیز تھی ان کے قلب پر ایک بوجھ بنی ہوئی تھی۔

اس بات سے یہ بھی صاف عیاں تھا کہ عوام کی تشدد کی حرکتوں سے نظم و ضبط کے فقدان اور
امن عامہ میں خلل کی حکمرانی ہو جائیگی اور نتیجہ یہ ہوگا کہ کانگرس کے ہاتھ سے قیادت چھن جائے گی
دیس میں نراج قائم ہو جائے گا۔ اور حکومت کو کافی بہانہ مل جائے گا کہ وہ بے انتہا طاقت کا استعمال
کرے جو بڑے پیمانہ پر اتلاف جان اور بربادی جائداد کو اپنے لپیٹ میں لے لے اور 1857 کے
سنگین نتائج کا پھر اعادہ ہو جائے گا جس کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

جو کچھ گاندھی جی نے بعد میں کہا۔ اس کا اطلاق چوری چورا سے پیدا شدہ حالات پر بھی ہوتا
تھا۔ ان کے الفاظ میں "فرض کر لیجئے کہ باردولی کی عدم تشدد والی سول نافرمانی کو خدا کے حکم سے
کامیابی مل جاتی ہے اور حکومت وقت فاتحین باردولی کے حق میں تخت چھوڑ دیتی ہے تب بن
مانی کارروائیاں ان عناصر پر جن سے اشتعال کی وجہ سے غیر انسانی حرکتیں ہوئیں ان پر قابو کون رکھ
سکے گا؟"[60] انھیں اپنے پر ایسا کر سکنے کا یقین نہیں تھا . . . . در یں حالات انھوں
نے سول نافرمانی کی تحریک کو ملتوی کر دیا اور باردولی پروگرام کو ترک کرنے کا فیصلہ کر دیا 12 فروری
کو کانگرس ورکنگ کمیٹی کی بیٹھک ہوئی تاکہ اس فیصلہ کی توثیق کر دے۔

یہ فیصلہ ایک قسم کے اعتراف شکست کے مترادف تھا لیکن یہ فیصلہ کانگرس کی ایک اہم تعداد
کو ناپسند تھا اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ ان کا عدم تشدد کا عقیدہ اتنا مکمل اور ناقابل تغیر نہیں تھا
جتنا کہ گاندھی جی کا تھا۔ داس اور موتی لال نہرو نے اس فیصلہ سے اختلاف کیا اور انھوں نے غصہ
سے بھرے ہوئے خطوط لکھے جن میں ورکنگ کمیٹی کے اس فیصلہ کی معقولیت پر اعتراض کیا گیا تھا
جواہر لال بھی پریشان اور متحیر تھے۔ سوال یہ تھا کہ گاندھی جی کو اپنے اس اعتراف کے دور رس نتائج کا
احساس کیوں نہیں ہوا کیونکہ اگر سول نافرمانی کے کامیاب ہو جانے پر خدشہ اس بات کا تھا کہ اس
سے بدی کی ناقابل کنٹرول طاقتوں کو کھلی چھوٹ مل جائے گی تب تو اس تحریک کو مبنی بر انصاف

---

60 - Fischer, L. Life of Mahatma Gandhi, P. 219.

ہونے کا جواز ہی باقی نہیں رہ جاتا تھا اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ انتشار ایک غیر ملکی حکومت کے قائم کئے ہوئے امن وامان سے بہتر ہے۔

تحریک پر اچانک رکاوٹ لگانے سے جوش میں جیسے تحریک نے ایک بہت بلند حد تک پہونچا دیا تھا۔ لامحالہ امر انتشار پیدا ہو گئی نتیجتاً کانگریس دو دھڑوں میں بٹ گئی۔ (۱) بائیکاٹ کے پروگرام کے حمایتی۔ جو عدم تعاون کی تحریک کو جاری رکھنے کی موافقت کرتے تھے (۲) وہ لوگ جو کونسلوں سے مقاطعہ کو ترک کرنے کا ارادہ رکھنے کے حامی تھے تاکہ ان کونسلوں کو قومی مقاصد یعنی سوراج کے لئے استعمال کیا جا سکے۔

خلافت کے دو گروہ ہو گئے۔ اس کی ایک کثیر تعداد کا گاندھی کی قیادت پر اعتماد جاتا رہا۔ اور عدم اشتراک کے عقیدے سے تائب ہو گئے اور گورنمنٹ سے امداد کی آس لگا بیٹھے۔ باقی لوگوں نے گاندھی جی کے طریقہ کار پر جس کے بارے میں انہیں یقین تھا کہ وہی اور صرف وہی طریقہ کار ہندستان کو اس کے منزل مقصود تک پہونچا سکتا ہے۔ اپنا اعتماد قائم رکھا۔

قومی طاقتوں کے اس گروہی اختلاف سے گورنمنٹ نے فائدہ اٹھایا۔ ابھی تک تو وہ گاندھی جی کے خلاف کوئی قدم اٹھانے سے ہچکچا رہی تھی لیکن اب اس نے بہت جلد فیصلہ کر کے ۱۰ مارچ کو انہیں قید کر دیا۔ ایک ہفتہ کے بعد ۱۸ مارچ کو ان کا مقدمہ پیش ہوا۔ گاندھی جی نے اپنے مقدمہ کی پیروی ہی نہیں کی۔ برخلاف اس کے انھوں نے گورنمنٹ کے خلاف بے اطمینانی پیدا کرنے کے جرم کو تسلیم کر لیا اور سخت سے سخت سزا دینے کے لئے کہا۔ بہرحال انھوں نے ایک بے لاگ اور باوقار وضاحتی بیان میں وہ حالات سمجھائے کہ کیوں وہ برٹش شہنشاہیت کے وفادار ہونے کے بعد اس کی طرف سے غیر مطمئن ہو گئے ان کا یہ بیان برٹش طرز حکومت کے خلاف ایک تحریری استغاثہ تھا اور جو عدم تعاون تحریک کا ایک مدلل فرد قرار داد تھا۔

جج نے انھیں مجرم گردانا اور چھ برس کی سزا دے دی وہ پونا کے یرودا سنٹرل جیل میں قید کر دیئے گئے

VIII کانگریس بٹ گئی

گاندھی جی کی عدم موجودگی میں کانگریس کمیٹیوں نے کافی وقت واقعات کا جائزہ لینے اور مستقبل کے طریقہ کار کے بارے میں بحث مباحثہ میں لگا دیا۔ ایک سول نافرمانی کی تحقیقاتی کمیٹی

کی تشکیل ہوئی جس کا کام حالات کا جائزہ لینا تھا اور یہ اندازہ کرنا تھا کہ عوام کا رویہ اور اس کا مزاج کیا ہے۔ اگست 1922 میں کمیٹی نے متعلقہ رپورٹ پیش کی۔ وہ اس نتیجہ پر پہونچی کہ ولیس تحریک جاری رکھنے کے لئے تیار نہیں ہے اور اس بات کی سفارش کی کہ کانگرس قانون ساز کونسلوں میں داخل ہو جائے۔

نومبر میں یہ تجویز آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے زیر بحث آئی چنانچہ دسمبر میں گیا کانگرس کی صدارت "داس" نے کی جو داخلہ کونسل کے پر جوش حامی تھے لیکن عدم اشتراک کا جوش سرد نہیں ہوا تھا اس لئے گاندھی جی کے پرستاروں اور زعمائے خلافت نے اس تجویز کی مخالفت کی نتیجتہً داس نے صدارت سے استعفیٰ دے دیا۔ یکم جنوری 1922 کو "داس" اور نہرو نے سوراج پارٹی کی تشکیل کی۔

جلد ہی ایک ایسا فیصلہ کہ "کانگرس میں تبدیلی کے حمایتیوں کی آرا کو جگہ ملنی چاہئے" ابھر کر سامنے آیا اس لئے دسمبر 1923 میں دہلی میں کانگرس کے ایک اسپیشل سشن کی نشست اس بات پر غور و خوض کرنے کے لئے ہوئی کہ سابقہ تجویز پر نظر ثانی کی جائے۔ فیصلہ یہ کیا گیا کہ سوراج پارٹی والوں کو اجازت دے دی جائے کہ کونسلوں میں کانگرس والوں کو بھیجنے کے حق رائے دہندگی کا استعمال کریں۔

نومبر 1923 میں الکشن ہوا اور سوراج پارٹی کی ایک بہت بڑی تعداد نے کامیابی کے ساتھ مقابلہ کیا۔ معتدل دل ہار گیا اور سوراج والے بہت سے صوبوں میں قابل لحاظ قوت حاصل کر کے جیت گئے صوبہ متوسط اور بنگال میں ان کی حیثیت اکثریتی پارٹی کی رہی لیجسلیٹو اسمبلی میں 48 سوراجسٹ، جس کی قیادت موتی لال کر رہے تھے اور 12 آزاد ممبران نے، جن کے قائد جناح تھے، اپوزیشن ممبران کی حیثیت سے داخل ہوئے۔ گورنمنٹ کے ہاتھ میں صرف 39 ووٹ تھے جن میں 25 سرکاری افسران اور 14 نامزد ممبران شامل تھے۔

دسمبر 1923 میں کانگرس نے جس کا اجلاس کوکناڈا میں زیر صدارت محمد علی ہوا۔ دہلی تجویز کی توثیق کی اس طرح مرکزی رشتہ جو سوراج کو مادر تنظیم سے مربوط کئے ہوئے تھا۔ منقسم نہیں ہوا 5 فروری 1924 کو گاندھی جی اپنی شدید بیماری کی وجہ سے پوری سزا بھگتنے سے پہلے ہی رہا ہو گئے۔ انھوں نے 22 مئی کو اپنی No Changer (نہ بدلنے والا) کی پوزیشن کا دفاع کرتے ہوئے ایک بیان جاری کیا "اس لئے میں ان لوگوں کا شریک کار نہ بنوں گا جو ان کے لئے (سوراجسٹ)

سدِ راہ نہیں یا مجلس قانون ساز میں داخلے کا سوراجسٹ کے خلاف پروپیگنڈا کریں"61/

سول نافرمانی کا پروگرام پہلے ہی ملتوی ہو چکا تھا اور داخلے کے مخالفین (No changers)

نو چینجرس کو ہدایت دی گئی کہ وہ اپنی تمام قوتیں تعمیری پروگرام میں لگا دیں۔ اس طرح معرکے

کا پہلا باب ختم ہوا۔

خلافت شورش نے بھی دم توڑ دیا جب اکتوبر 1923 میں ترکی نیشنلسٹوں نے زیر قیادت مصطفےٰ کمال شخصی حکومت کا خاتمہ کرکے ٹرکش ری پبلک قائم کرلی۔ عبدالمجید آفندی کو جو معزول سلطان کے بھتیجے تھے ووٹنگ کے ذریعہ خلیفہ بنا دیا گیا لیکن ان کے تمام سیاسی اختیارات سلب کر لئے گئے۔ اس لئے خلافت والوں کے دعوے کو (یعنی دینوی اختیار اور اقتدار کے معاملات میں اسے مرکزی حیثیت ملنی چاہئے) خارج کر دیا گیا دو سال بعد خلافت کا عہدہ بھی منسوخ کر دیا گیا اس لئے ہندستان میں مسلم کمیونٹی ابتری اور الجھن کے گرداب کا شکار ہو گئی نتیجہ میں یہ بات قومی تحریک کے لئے شگونِ بد ثابت ہوئی۔

IX گورنمنٹ کا جوابی حملہ

جب گاندھی جی نے اگست 1920 میں معرکہ عدم تعاون کا آغاز کیا۔ اس وقت حکومت نے اسے معمولی بات سمجھا اور کوشش اس بات کی کی گئی کہ اس کی اہمیت گھٹا دی جائے۔ اسے چیمسفورڈ جو اس وقت گورنر جنرل تھے۔ احمقوں کی ایک احمق ترین حرکت کہا کرتے تھے۔ اس پر بھی اس تحریک نے بہت جلد قوت حاصل کرلی۔ اور صوبوں کے گورنروں نے گورنمنٹ آف انڈیا پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا کہ بڑھتی ہوئی بے چینی اور بڑھتے ہوئے جوش کے خلاف سخت قدم اٹھایا جائے کیونکہ نظام حکومت میں گڑبڑی بڑھتی ہی جا رہی تھی اور سب سے زیادہ بدنما بات یہ تھی کہ یہ حکومت کے اقتدار کو کمزور کرتی جا رہی تھی۔

ونسنٹ (Vincent) نے جو گورنمنٹ آف انڈیا کے ہوم ممبر تھے۔ بنگال جاکر آسام اور بنگال کی بگڑتی ہوئی حالت کے بارے میں وائسرائے کو توجہ دلائی اور انھیں بتایا کہ گورنر، سرکاری افسران، یورپی مالکان کاشت اور تجار کے طبقے۔ موجودہ حالات کے بارے میں فکرمند تھے۔ جب آل پارٹیز کانفرنس کا بمبئی میں مالوی جی، جناح اور جیکر نے اعلان کیا تب گورنر بمبئی نے اس مضمون کا تار وائسرائے کو دیا کہ "گاندھی جی کو فوراً قید کر لیا جائے"62/

61- Tendulkar, D.G. op-cit, Vol II. P.172.

وقتاً فوقتاً دوسرے صوبہ جات سے بھی یہی مطالبہ کیا گیا یہاں تک کہ جب 2 اپریل 1921 کو ریڈنگ نے گورنر جنرل کا عہدہ سنبھالا۔ اس مسئلہ کی طرف انھیں فوری توجہ دینی پڑی ریڈنگ جو انگلینڈ کی لبرل پارٹی کے صف اول کے مدبرین میں سے تھے چیمسفورڈ ایسے معمولی درجہ کے گورنر جنرل کے جانشین ہوئے انھیں اپنا قدم اٹھانے کے لئے فیصلہ کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کے پیروں نے نقشہ پہلے ہی تیار کر دیا تھا سہ رخی پالیسی کا سختی سے پابند ہونا یعنی :۔

(1) ان مدبرین کے لئے آسانیاں بہم پہونچانا جو حکومت وقت کے شریک کی حیثیت سے اپنے آپ کو پیش کرتے تھے ان پر احسانات اور اعزازات کی بارش کرنا۔

(2) انتہا پسندوں اور عدم تعاونوں کو دبانا۔

(3) فرقہ وارانہ اختلافات کا استحصال کرنا۔

مداوں کے تحت ایس۔ پی سنہا کو نواب بنا کر نائب وزیر ہند کے عہدہ پر مقرر کر دیا گیا ان کے ذمہ ہاؤس آف لارڈز میں 1919 کے گورنمنٹ آف انڈیا بل کو پیش کرنے کا کام سپرد ہوا بعد میں وہ اڑیسہ اور بہار کے گورنر بنا دیئے گئے۔ تیج بہادر سپرو کو لبرل فیڈریشن کے خصوصی رکن تھے۔ 1920 میں وائسرائے کی اگزیکیٹیو کمیٹی کے ممبر مقرر کئے گئے۔

دوسرا قدم اس سلسلہ میں یہ اٹھایا گیا کہ پرنس آف ویلس کے ہاتھوں ایوان شہزادگان کا افتتاح ہوا۔ کانگریس اور خلافت کی طرف سے چلائی جانے والی تحریکات کی مبارزت طلبی کے جواب میں سوسائٹیاں قائم ہوئیں جیسے امن سبھا۔

یہ پالیسی اپنی ایک محدود وسعت میں کامیاب رہی شروع شروع میں 1919 کے انڈیا ایکٹ کی کارکردگی نے معتدل گروہ میں ایک جوش پیدا کر دیا اس لئے انھوں نے خوشی خوشی اصلاحات کا استقبال کیا لیکن بہت جلد اس کا مزاج بدل گیا اسمبلی میں پہونچ کر انھیں پتہ چلا کہ ووٹوں کے ذریعہ بھیجے ہوئے نمائندوں کی تجاویز کا، ملازمتوں کو ہندستانی بنانا اصلاحات کی توسیع، جبری تعلیم،

62 - Home Department Government of India Political No 89 - 1922, From Governor of Bombay to Viceroy 4 June, 1922.

کی تنسیخ کا جواب گورنمنٹ کی طرف سے ناکافی ملتا تھا۔ اس سلسلہ میں گورنمنٹ کو جبر کرنے سے باز رکھنے کی تاکہ عدم تعاون کی تحریک اپنے آپ مر جائے بند ہو جائے اور گول میز کانفرنس کر کے اختلافات دور کرا دیئے جائیں۔ تمام کوششیں رائیگاں گئیں کیونکہ گورنمنٹ کا قانونی رویہ تنگ نظری پر مبنی تھا۔ ان کے تمام شکوک جو پرنس آف ویلس کی آمد پر پیدا ہوئے تھے نظرانداز کر دیئے گئے۔

صوبہ میں وزراء کو اپنے اپنے ذمہ محکمہ جاتی کارکردگی کے سلسلہ میں ناقابل عبور مشکلات سے دوچار ہونا پڑا انھیں اپنی ہر قسم کی پابندیوں کا پتہ چلا جو ان کے اختیارات کو کم کر کے اصلاحات اور ترقی کرنے کے راستہ میں سدراہ بنی ہوئی تھیں۔ گورنروں کے ترجیحی فیصلوں کے اختیارات مجلس انتظامیہ کے ممبران کا مالیات پر کنٹرول، تنظیم وضبط قائم رکھنے والی ماتحت ملازمتوں پر انحصار ان کے وجود کے فوائد کو گھٹا کر کم سے کم کر دیتے تھے۔ وزراء سخت تنقیدوں کو جو اصلاحات کے ناکافی اور غیر اطمینان بخش ہونے کے سلسلہ میں کی جاتی تھیں تسلیم کرنے کے لئے مجبور ہو جاتے تھے۔ معتدل گروہ کے ممبروں کی تمام کوششیں کہ وزراء کے دائرہ اختیار کی توسیع کی جائے۔ ہر جانب سے بشمول وائسرائے وزیر ہند چیمسفورڈ، ریڈنگ، مانٹیگو، پیل (Peel) اور اڈیورڈ (Ordinance) کی مخالفتوں کا نشانہ بنیں۔

لائڈ جارج جو اس عرصہ میں زیادہ مدت تک وزیراعظم رہے ۲ اگست 1922 کو کی گئی اپنی مشہور تقریر میں اصلاحات کے بارے میں ہر قسم کی مجوزہ گفتگو کو ہندستان کے منہ پر دے مارا۔ دوران تقریر میں انھوں نے کہا "میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ کسی عرصہ میں بھی وہ ہندستانی برٹش سول سروس کی قلیل تعداد کی رہنمائی اور امداد کے بغیر کام چلا سکتے ہیں وہ عمارت کے فولادی ڈھانچے کا کام دیتے ہیں" اور آگے چل کر کہا "کسی صورت میں بھی برطانیہ ہندستان میں اپنی ذمہ داری سے دست بردار نہیں ہوگا"۔ 63

کھلم کھلا جبر کی پالیسی آہستہ آہستہ بڑھتی گئی ابتدائی منزل میں گورنمنٹ رجسٹر قوانین (Statute Book) میں درج شدہ قوانین کے استعمال میں پھونک پھونک کر قدم اٹھاتی رہی جیسے جرائم کا ترمیمی قانون (Criminal Act) بغاوت پر اکسانے والی سبھاؤں کا قانون جب

63- Parliamentary Debates, House of Commons 5th Series Vol 157. Col 1513.

خلافت والے فوجی خدمات کے مقاطعے کی وکالت کرنے لگے تب ان کے خلاف مقدمات قائم کردیئے گئے۔ نومبر 1921 تک عدم تعاون والوں کی ایک تعداد سلاخوں کے پیچھے ڈال دی گئی لیکن 1921 کے پرنس آف ویلس کی آمد کے بارے میں گورنمنٹ کے وقار کا سوال تھا اس لئے یہ ضروری سمجھا گیا کہ گورنمنٹ کے خلاف ہونے والے مظاہروں کو دبانے کے لئے ہر طرح کی تدبیر کی جائے۔ 1921 کے نومبر میں کانگرس اور خلافت کے ذریعہ چلائی جانے والی تنظیموں پر قانون امتناع کا نفاذ کردیا گیا مقامی حکومتوں نے جنون آمیز جوش کے ساتھ قدم اٹھائے اور جنوری 1922 تک 30,000 ہزار سول مقاومت کرنے والے جس میں بہت سے بڑے بڑے رہنما شامل تھے جیل میں بھیج دیئے گئے۔ ان سب پر طرہ یہ ہوا کہ گاندھی جی مارچ 1922 میں قید کر دیئے گئے اور مقدمہ چلا کر مجرم بنا دیئے گئے۔ جبریہ قانون پر عمل ان کی گرفتاری کے بعد بھی جاری رہا۔

پالیسی کے تیسرے عنصر کی تشکیل ہندو مسلم اختلافات کے پرانے آزمودہ ہتھکنڈوں کے استعمال پر مبنی تھی ہندستان کی بدقسمتی تھی کہ برطانیہ کی لبرل پارٹی کی خارجہ پالیسی گلیڈسٹون کے زمانہ سے ہی ترکوں کے خلاف تھی۔ جب 1905 میں لبرل برسر اقتدار آئے تو ہندستانی مسلم لرزہ براندام ہو گئے۔ مورلے کے خلاف تعصبی میلان خاطر کے بوجھ سے دب کر انھوں نے صراط مستقیم سے ہٹ کر کام کرنا شروع کر دیا بہرحال وہ منٹو کے ممنون کرم تھے جس نے مورلے کو ایسی پالیسی اختیار کرنے کی ترغیب دی تھی جو مسلمانوں کو موافقت کرے لیکن جب 1910 میں مغربی حکومتیں بشمول برطانیہ سلطنت عثمانیہ کی بندر بانٹ میں لگ گئیں تب مسلمان برطانیہ سے روٹھ گئے۔

جنگ عظیم 1914 نے برطانیہ اور ترکی کو مخالف محاذوں پر پایا۔ جنگ کے دوران ان تمام ہندستانی افواج کو دشمن سے لڑنے کے لئے استعمال کرنا پڑا جس میں قابل لحاظ تعداد مسلمانوں کی بھی تھی کیا ان مسلمانوں پر جنہیں عثمانیہ افواج کے خلاف لڑنے کے لئے بھیجا جانے والا تھا اعتماد کیا جا سکتا تھا۔ جبکہ عثمانیہ سلطان ان کا مذہبی قائد تھا۔ خاص کر ایسی حالت میں جب کہ شیخ الاسلام ترکی نے عیسائی طاقتوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ بھی دے دیا تھا۔

اس کے خلاف فتاوے زیر احسان علماء سے حاصل کئے گئے تھے جن کی رو سے برٹش حکمران کی طرف سے ہو کر جنگ کرنا شرعی حکم کی خلاف ورزی نہیں تھی برٹش سیاست دانوں نے بار بار یقین دہانی کرائی تھی کہ برطانیہ کا یہ قطعی ارادہ نہیں ہے کہ وہ خلافت کے فرائض کی انجام دہی میں خلل انداز ہو یا ترکی علاقہ جات بشمول تھریس پر زبردستی قبضہ کرلے۔

گورنمنٹ نے اطمینان کا سانس لیا کہ بہ استثناء چند کٹر علماء اور چند سخت پالیسیوں کے پرستار لیڈر، مسلم اہل دانش کا ایک بہت بڑا حصہ ان کے ساتھ تھا لیکن وہ (حکومت پھر بھی) اپنی اس خواہش کے بارے میں انگلینڈ کی حکومت پر برابر زور دیتی رہی کہ ترکی کے ساتھ رعایت سے کام لیا جائے۔ مانٹیگو خلافت والوں کے مطالبات پر غور کرنے کے لیے اپنی کابینہ میں اصرار کرتے رہے۔ ہندستان چھوڑنے سے قبل ریڈنگ نے لائڈ جارج کو لکھا "بے چینی کے خاص وجوہات میں سے صلح نامہ سیورے مسلمانان ہند کا ہدف تنقید تھا" آگے چل کر انھوں نے لکھا "مجھے معلوم ہے آپ مشکلات سے گھرے ہوئے ہیں۔ میں ان میں اضافہ نہیں کرنا چاہتا۔ بلکہ میں اس غرض سے لکھ رہا ہوں کہ یہ معاملہ میرے خیال میں کتنا اہم ہے کہ مسلمانوں کی رائے کے ساتھ رعایت برتی جائے"۔/64

28 فروری 1922ء کو مانٹیگو کو تار دیا جس میں مندرجہ ذیل الفاظ تھے۔

"ہم ہز میجسٹی کی حکومت پر زور دیتے ہیں اور جنھیں ہم لوگ ذاتی حیثیت سے ضروری سمجھتے ہیں"۔

(1) قسطنطنیہ کا تخلیہ۔

(2) مقامات مقدسہ پر سلطان کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرنا۔

(3) عثمانی تھریس جس میں مسلمانوں کا متبرک مقام ایڈریانوپل واقع ہے کی بحالی اور غیر مشروط طور پر سمرنا کی واگذاری۔

ہم لوگ خلوص دل سے اعتماد کرتے ہیں کہ ہز میجسٹی کی حکومت ہماری تمناؤں کو، تمام امکانات کو مدنظر رکھ کر وقیع سمجھے گی کیونکہ ان کا پورا کرنا ہندستان کی اہمیت کے پیش نظر نہایت ضروری ہے حکومت ہند کے لیے یہ بات اتنی اہم ہے کہ وہ خود کو کھلم کھلا ہندستان کے مسلمانوں کی صف میں لا کھڑی کرے اسی وجہ سے ہم متذکرہ بالا کی فوری اشاعت کی منظوری پر زور دیتے ہیں"۔/65

4 مارچ کو ایک دوسرا تار پہلے تار کے بعد بھیجا گیا جس میں اس بات کی اجازت دینے پر زور دیا گیا تھا کہ سابقہ ٹیلی گرام کو شائع کر دیا جائے کیونکہ گاندھی جی کی گرفتاری آنے والے چند دنوں کے بعد ہی ہونے والی تھی۔ اس ٹیلی گرام کا یہ بھی کہنا تھا کہ حالیہ اطلاعات سے جو صوبوں سے موصول ہوئی تھیں یہ بات عیاں تھی کہ تشدد آمیز ہنگامے جو پھوٹ پڑے تھے بہت بڑی تعداد تک مسلمانوں کے

---

64. Montgomery Hyde. H. Lord Reading P.P. 331-32

65. Ibid. P.P. 371-72

شورش پسند، کٹر اور متعصب عناصر کے برپا کیے ہوئے تھے۔

مانٹیگو نے اپنے رفقائے کابینہ سے صلاح و مشورہ کیے بغیر ایک بحری تار کے ذریعہ ٹیلی گرام کے شائع کرنے کی اجازت دے دی۔ لائڈ جارج اتنا طیش میں آ گئے اور کرزن اس قدر دماغی توازن کھو بیٹھے کہ انھوں نے مانٹیگو سے مستعفی ہونے کا مطالبہ کر دیا۔

ٹیلی گرام کی اشاعت نے بہرحال قابل تعریف حد تک گورنمنٹ آف انڈیا کے مقصد کی تکمیل کا کام کیا۔ مسلمانان ہند پر لازمی طور پر حکمرانوں کی ایمانداری کا گہرا اثر ہوا۔ 15/ مارچ کو عبداللہ نے محمد شفیع کو جو وائسرائے کی اگزیکیٹو کونسل کے ممبر تھے اس مضمون کا خط لکھا۔

منسلکہ خط جسے مولوی عبدالباری نے میرے پاس بھیجا ہے اور جس میں انھوں نے لارڈ ریڈنگ اور ان کی حکومت کے لیے جذبات تشکر کا اظہار کیا گیا ہے۔ اپنی کہانی اپنی زبانی سنائے گا۔ میں نے اپنے مکان پر ایک جلسہ طلب کیا جس میں مشیر حسین قدوائی، مولانا عبدالباری، حسرت موہانی اور دوسرے مقامی لیڈران نے شرکت کی۔ قریب چار گھنٹے تک ایک طویل بحث ہوتی رہی اور نتیجہ میں خط اور یہ اعلان نامہ ہے جس میں مسلمانوں کو گورنمنٹ کے خلاف اپنی معاندانہ حرکتوں سے باز آنے کا مشورہ دیا گیا ہے۔

سب سے زیادہ ضروری بات اب یہ ہے کہ مسلمانوں کے جذبات سے رفتہ رفتہ کام لیا جائے جس بات سے میں متحیر ہوا وہ تھا حسرت کا رویہ۔ وہ اس رائے کے حق میں تھے کہ عدم اشتراک کی تحریک کو بالکل ختم کر دینا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ ہمارا جھگڑا حکومت سے اس بات پر ہوا تھا کہ وہ مذہب اسلام کی دشمن تھی اور اب جبکہ وہ اسلام کی حمایت کرتی ہے تب ہمیں بھی اس کی حمایت کرنا چاہیے۔" /66

عبدالباری کے خط میں بھی جس کا حوالہ متذکرہ بالا خط میں دیا گیا ہے انھیں جذبات کو دہرایا ہے۔ انھوں نے لکھا "آپ انھیں اور ان کی حکومت کو (ریڈنگ کو) اطمینان دلا دیجیے کہ جب تک مسلمان زندہ ہیں وہ ان کے اور مانٹیگو کے ممنون رہیں گے۔" /67

بہ ظاہر مسلمانان ہند ریڈنگ کی عیارانہ چال سے پریشانی میں پڑ گئے اور وہ مجبور ہو گئے کہ گورنمنٹ کے خلاف اپنے رویہ پر نظر ثانی کریں۔ گاندھی جی کی رفتار کی وجہ سے جو اس تمام سیاسی ہنگاموں کی

---

66. Home Department Political, March 1922 Intalligance Report

67. Ibid Letter from Maulana Abdul Bari Firangi Mahal-Lucknow dated 15th Rajab 1340 A.H.

پس پشت محرک قوت تھے اور محمد علی کی قید و بند کی سزا کے باعث جو خلافت تحریک کی جان تھے وہ (مسلمان ہندو) بغیر کسی قائد کے رہ گئے تھے۔ جب ترکوں نے خلافت کا خاتمہ کر دیا اور خلافت اور اسٹیٹ کو با پائی حکومت کی طرح الگ الگ کر دیا تب مسلمان بھی سکتے میں پڑ گئے۔

فرقہ وارانہ نزاع کا احیاء

یہ قدرتی بات تھی کہ مسلمانوں کا وہ عنصر جو جذباتی اور کٹر متعصب واقع ہوا تھا گاندھی جی کو اپنی غیر متوقع ناگواری اور تکلیف دہ صورت حال کا ذمہ دار ٹھہرانے لگا اور اب وہ اپنے دماغوں میں اس فرقہ کے خلاف جس نے (ان کے خیال میں) ناکامیوں سے ہمکنار کیا تھا علیحدہ ہونے کے خیالات کی پرورش کرنے لگا۔ وہ اس تحریک میں اسی غرض کے تحت شامل ہوئے تھے کہ اسلام کے مفادات کو اپنی مذہبی کتابوں کے احکامات کی پاسداری میں حفاظت کریں گے۔ جناح کے سوانح نگار کے الفاظ میں:۔ "مسلمانوں کو خاص کر کے مسئلہ خلافت کے بارے میں تھی اور جس کے تصفیہ کے لئے وہ آمادہ بر جنگ بھی تھے۔ ان کے نزدیک سوراج سے متعلقہ مسائل دوسرے درجہ پہ تھے"[68] اس قسم کے جذبات نے شک و شبہ کے بیج کی آبیاری کی اور مسلمانوں کے دماغ میں نزاعی خلافت کی پرورش کی۔

اس بات کو بہر حال مان لینا چاہئے کہ بگاڑ کی زمین خلافت کے مزاج عدم تعاون کی تحریک سے ہموار ہوئی تھی۔ ان ڈویاتوں نے جنگ آزادی کو ایک گہرا مذہبی دیرپا رنگ دے دیا تھا۔ یہ بات بھی حقیقت پر مبنی ہے کہ زعیم ذی اقتدار کی بلند اور مخلصانہ توقعات اعلیٰ پیمانہ پر لائق صد آفرین تھیں۔ لیکن ان کے مذہبی عقیدے جو ضرورتاً روحانیت انسانیت اور اخلاقیات کے مسئلے تھے بہتوں کی سمجھ سے باہر تھے۔ ان کے پیروکاروں کی زیادہ تعداد جو ہندو مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ مذہب کا مسئلہ اس بنیادی اصول رواج کی پابندی اور اس کے متبرک قوانین کی بے چوں و چرا اطاعت سے منسلک تھا جس کی توضیح و تشریح ان کے اپنے مذہبی قائد (قاضی اور پنڈت) کریں۔ اس طرح اس تحریک نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تعصب اور اختلاف کی خلیج کی طرف مڑنے کا ایک نمایاں کردار ادا کیا۔ لامحالہ اس نے علیحدہ ہونے کا ایک سخت رجحان پیدا کر دیا جن میں ان آراء اور احساسات کی صورت گری ہوئی تھی سیاست اور

---

68 - Saiyid M.H. Mohammad Ali Jinnah (Lahore 1945) P. 280

مذہب کے جوڑ کو دھماکہ خیز ہونا ہی تھا جیسا کہ بعد کے نتائج سے ظاہر ہوتا ہے۔ لاجپت نے جو گاندھی جی کی طرف بہ نظر استحسان دیکھا کرتے تھے اور جنھوں نے 1920ء ناگپور میں عدم تعاون تحریک کی تجویز کی حمایت کی تھی 1926ء میں لکھا۔

"یہ بات خوش کن نہ ہوگی کہ گذشتہ دہائی کے دوران ہم سب ایک ایسی فضا وجود میں لائے ہیں جو قومیت اور رواداری کی خوشیوں کی جگہ رجعت پسندی اور مذہبی جنون کی بو زیادہ پیدا کرتی ہے۔

تحریک عدم تعاون خود مادی طور پر اس فضا کی تخلیق میں مددگار ہوئی ہے یہ بہت بڑی بدقسمتی ہے ہندستان میں خلافت تحریک جسے سیاسی بنیاد پر قائم ہونا چاہیے تھا مذہبی بنیاد کا سہارا لیا۔ اس کی حمایت میں سیاسی محرکات بھی تھے اور یہ بات اور بھی بدقسمتی کی تھی کہ مہاتما گاندھی اور دوسرے زعمائے خلافت نے مذہب کو ایک نمایاں آزادی دے دی۔ یہ تحریک حقیقتاً اور اصولی طور سے مذہبی ہونے کے بجائے سیاسی زیادہ تھی۔ ڈھونڈ کر مذہبی احکامات کے حوالے دوسری ہمالیائی غلطی کے مترادف تھے اس بات نے فرقہ وارانہ جذبات کو پھر سے ہوا دینے اور ان اثرات کو نئی زندگی بخشنے کا کام کیا جو متحدہ ہندستان کے عقیدے کے دشمن تھے۔"/69

ایک ناخوشگوار واقعہ جو مذہب اور سیاست کے جال میں الجھ کر نتیجتہً پیدا ہوا تھا یہ تھا کہ دانشمندوں کی ایک کثیر تعداد کی یا تو حوصلہ شکنی ہوئی تھی یا اس تحریک سے الگ ہوگئے جیسے جناح یا جنھوں نے اب اگر اس میں شرکت بھی کی تو برملا پیشگی شرائط کے اظہار کے ساتھ شرکت کی جیسا کہ جواہر لال نہرو کے معاملے میں ہوا اور یا جن میں ایک بڑی تعداد من مانی خفیہ دماغی شرائط کے ساتھ شامل ہوئی تھی 'اندولال یاجنک' لکھتے ہیں 'ہم نے گاندھی جی سے اس بات کا سودا نہیں کیا تھا کہ لوگ کسی نیم مذہبی یا مذہب اور سیاست کے گٹھ جوڑ والی تحریک میں شامل ہوں گے۔ ہم لوگ ان کے ساتھ اس خاص غرض کو مد نظر رکھ کر شامل ہوئے تھے کہ ہم لوگ بڑھتے ہوئے راست قدم کی اس وقت تک پیروی کرتے رہیں گے جو ہمیں قومی آزادی کے حصول کے پیش نظر ہم سے بالکل سیاسی جنگ کرنے کا حکم دے۔ ہم ان کے پرجوش حوصلہ مندیوں کا جو ہمیں عرب اور میسو پوٹامیہ کے بیرون مقبوضات پر ترکی اقتدار اعلیٰ کے قائم رکھنے کا مشورہ دے، ساتھ نہیں دے سکتے تھے۔"/70۔ وہ رقم طراز ہیں کہ اکثر و بیشتر ولبھ بھائی پٹیل سے ان

---

69 Joshi V.C. (ed) Lala lajpat Rai, writing & speeches Vol II P.P. 181-80

70 Yajnak. Indulal Gandhi as I Know him P.P. 129-30

کی گفت و شنید ہوتی رہتی تھی جو ہماری ہی طرح برابر روپے کے خیالات سے دماغی پریشانیوں میں مبتلا رہا کرتے تھے۔

XI کسانوں اور مزدوروں کے مصائب

عدم تعاون کی تحریک گاندھی جی کی رہنمائی میں عوام میں پھیل گئی اس تحریک نے عوام کے کئی طبقوں کو اکسایا کہ وہ اپنی شکایات کا اظہار کئی طرح پر کریں اور ان کے ازالہ کے لئے مل جل کر قدم اٹھائیں یہ شکایات جنگ کی وجہ سے بڑھ گئی تھیں اس کے معاشی نتائج زراعت پیشہ طبقے اور کارخانوں میں کام کرنے والے پر ایک بہت بڑا بوجھ بن گئے۔ کمر توڑ لگان نے کسانوں پر ایک عام بے چینی پیدا کر دی۔ اشیاء مزدوری کی چڑھتی ہوئی قیمتوں اور اسی حساب سے مزدوری میں اضافہ کے انکار نے فیکٹریوں کے مزدوروں کی زندگیوں کو ناقابل برداشت بنا دیا شہریوں اور دیہاتیوں کی گندگیوں جس سے 1918 ایسے انفلوانزا امراض پیدا ہو گئے مزید مصیبت اور بے اطمینانی کی فضا پیدا کر دی۔

تعلیم یافتہ گروہ کی بے روزگاری کا نمونہ، فوجیوں کی لام سے سبکدوشی خاص کر پنجاب میں دوسرے پریشان کن وجوہ تھے جو سیاسی بھی تھے اور معاشی بھی پنجاب ابھی تک ان زخموں کی کسک کی وجہ سے جو اسے مارشل لا زخموں کی وجہ سے پہونچی تھی تلملا رہا تھا۔

اب عوام اس ہل چل کی وجہ سے میدان میں اتر آئے۔ 1920 میں کسانوں کی ایک تعداد نے پرتاپ گڑھ (الہ آباد) کے اندرونی علاقوں سے اپنے مصیبت بھرے حالات سے ہندوستانی لیڈروں کو واقف کرنے کے لئے مارچ کیا۔ تعلقداروں کی کمر توڑ سخت گیر لگان کی وصولی، غیر انسانی حرکتوں اور اپنے ناقابل برداشت حالات کے بارے میں شکایات پیش کیں انھوں نے لیڈروں کو اپنے یہاں آنے کی دعوت دی اور ان کی حفاظتی کارروائی کے لئے درخواست کی۔

جواہر لال اپنے کچھ ساتھیوں کی ہمراہی میں ان کے یہاں گئے انھوں نے بیان دیا۔

"ہمیں سارے کا سارا وہی علاقہ جوش سے شعلہ زن ملا۔ وہ لوگ ایک انوکھے اشتعال انگیز جذبات سے بھرے ہوئے تھے"[71]

حقیقت یہ ہے کہ اپنی لگان داری کے سسٹم کے باعث اودھ کے تمام علاقے زرعی پیشہ والوں کے

71- Nehru jawaharlal, op. cit. P. 51.

مصائب سے اہل رہے تھے لیکن پرتاپ گڑھ، رائے بریلی اور فیض آباد کے اضلاع خاص طور پر متاثر تھے حالانکہ زرعی مصائب کا عدم تعاون کی تحریک سے دور کا بھی رشتہ نہیں تھا اس پر بھی دونوں کو ایک مشترک عنصر۔ معاشی ابتری سے قوت ملی۔

جنوری 1921ء میں گورنمنٹ یو پی نے مرکزی گورنمنٹ کو رپورٹ کی کہ دیہات کے مشتعل ہجوم بازارں کو لوٹتے ہوئے فصلوں کو تباہ کرتے ہوئے اور دیہاتوں کو تاراج کرتے ہوئے گھوم رہا ہے۔ پولیس سے ٹکراؤ میں دیہاتوں کی ایک تعداد جان کھو بیٹھی ہے۔ مارچ میں شدید بلوؤں کی اطلاع آئی۔

اتر پردیش کی طرح پنجاب گجرات اور مدراس میں بھی شورشیں پیدا ہوئی۔

پنجاب میں ہل چل پیدا ہوئی نہ صرف جلیانوالہ قتل عام کے مابعد اثرات کے باعث بلکہ بیرونی سے آئے ہوئے مہاجروں کی پیدا کردہ حرکتوں کے باعث اور ان فوجیوں کی لام سے واپسی کے باعث جو اب بے روزگار ہو گئے تھے۔ ایک مزید سرچشمہ فکر جو گورنمنٹ کی ناک دم کئے ہوئے تھا۔ وہ اکالی سکھوں کا وہ ایجی ٹیشن تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ ان بے ایمان پجاریوں کو ہٹایا جائے جو گوردواروں پر قابض تھے تاکہ انتظام میں سدھار پیدا کیا جا سکے۔ ان کے ساتھ شدید ترین برتاؤ ہوا لیکن انھوں نے بہادری کے ساتھ عدم تشدد کے ذریعہ پولیس کی لاٹھی چارج کو برداشت کیا۔ کانگرس کے لیڈروں نے ان کے ساتھ ہمدردی کی اور آخر کار گورنمنٹ کو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ ان کا مطالبہ درست ہے اس لئے ان کے مطالبات کو مان لیا۔

عام بے کیفی کا ظہور فیکٹریوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی بے اطمینانی کی شکل میں سامنے آیا ان کی مزدوری قلیل تھی رہنے سہنے کے حالات ناقابل بیان حد تک خراب تھے اور ان کے کام کرنے کے گھنٹے طویل ہوا کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ بے چین رہا کرتے تھے جنوبی افریقہ سے واپسی کے فوراً بعد گاندھی جی کو احمد آباد کی مل کے مزدوروں کی ہڑتال میں دخیل ہونا پڑا تھا۔ عدم تعاون کے معرکے کے دوران اندازاً 400 ہڑتالیں پورے ملک میں ہوئیں۔ 1921ء کے ابتدائی نصف حصہ میں تقریباً 200 ہڑتالیں کی گئیں اور اسی سال کے دوسرے نصف حصہ میں کاروبار ٹھپ ہو کر رہ گیا جس سردبازاری کا 10 لاکھ مزدوروں کو شکار ہونا پڑا۔

XII عدم اشتراک کے نتائج

پہلی غیر مسلح بغاوت نہ صرف ہندستان کی تاریخ میں بلکہ تواریخ عالم میں درحقیقت مارچ 1922

میں ختم ہوئی لیکن یہ 1924ء تک چلتی رہی۔ واقعی یہ اپنے اعلان کردہ مقاصد کے حصول میں ناکام ہوگئی یعنی ترکی خلافت کو دوبارہ احیاء اور سوراج کا حاصل کرنا۔ اس کا تیسرا مقصد پنجاب کے ساتھ کی گئی ناانصافیوں کی درستگی تھا۔ اور یہ تھا بھی ایک چھوٹا معاملہ۔ یکم اگست 1920ء سے لے کر مارچ 1922ء تک یہ عوام کے جوش، ان کی لگن اور ان کی ذاتی قربانیوں کے سہارے زندہ رہی۔ جب کہ ان میں تنظیم، تجربے نظم وضبط کی کمی تھی۔ ان کا مقابلہ ایک ایسی مضبوط حکومت سے تھا جو فوج، پولیس انتظامی کل پرزوں فنڈ کے بے پناہ ذرائع سے لیس تھی۔ یہ جیسا کہ گاندھی جی کہا کرتے تھے، روحانی طاقت اور مادی طاقت کے درمیان لڑی جانے والی جنگ تھی۔ یا دو مصمم ارادوں حصول آزادی کا قومی ارادہ اور حکمراں بنے رہنے کا مضبوط ارادہ۔

حصول سوراج میں اس کی ناکامی عارضی تھی۔ معرکہ ٹھکانے سے تو اب شروع ہوا تھا یہ ختم نہیں ہوا تھا لیکن اس سلسلہ میں کی گئی کوششیں رائیگاں نہیں گئیں۔ سول نافرمانی کی تحقیقاتی رپورٹ کے الفاظ میں نفع کی باتیں یہ ہوئیں۔

(1) اپنے حقوق اور فرائض کی طرف عوام کی بیداری۔

(2) گورنمنٹ کے موجودہ سسٹم کے بارے میں یقین کا قطعی فقدان۔

(3) انھیں یقین ملا کہ صرف اپنی ذاتی کوششوں کے بل بوتے پر ہندستان آزاد ہونے کی امید کر سکتا ہے۔

(4) ان کا یہ عقیدہ بنا کہ صرف کانگریس ہی ایک ایسی تنظیم تھی جو مناسب طور پر قومی کوششوں کی رہنمائی کر کے آزادی حاصل کر سکتی تھی۔

(5) عوام کو مرعوب کرنے کی مکمل طور پر جبر و تشدد کی ناکامی۔

ولنگڈن، مدراس کے گورنر نے گورنمنٹ آف انڈیا کے ہوم ممبر کو لکھتے ہوئے کہا کہ "عدم اشتراک کی تحریک اس کی دوسری کامیابیاں جو بھی رہی ہوں دور تک عوام کی کثیر تعداد میں سرایت کر گئی ہیں۔ اور ان کی پرسکون آسودہ خاطری میں برہمی پیدا ہوگئی ہے۔"72/

نفع دوگنا ہوا۔ اخلاقی اور سیاسی

(1) کیریکٹر کے امتیازی اوصاف کو استحکام ملا جو ایک آزاد معاشرہ کے لئے ضروری ہیں

---

72 - Home Department Political 418 & K.W./1922 Willingdon to Viscount - July I, 1922

(۲) اس غلط فہمی کا دور ہونا کہ انگلینڈ کے جمہوریت پسند اور آزادی کو عزیز رکھنے والوں کا ارادہ ہندوستانی پست قوم کو حکومت خود اختیاری کے راستہ پر ڈالنا ہے حالانکہ اس سلسلہ میں کی گئی کارروائی کو ضرورتاً سست رو اور تدریجی ہونا پڑا تھا۔

ہندوستانی عوام کے دماغوں پر اس تحریک کے نفسیاتی اثرات قابل غور تھے لیکن اس نے انگریز قوم کے دماغوں پر بھی کچھ کم اثر نہیں ڈالا۔ اس نے ان کی خود اعتمادی اور یقین کو کہ ان کا سامراجی مشن درست ہے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ان پر شبہات کے حملے ہونے لگے جس نے انھیں برٹش حکومت کے مبنی بر انصاف ہونے کے بارے میں غور کرنے پر مجبور کر دیا اپنی پالیسیوں کے نتائج تعلیمی، تمدنی، معاشی اور سیاسی کے بارے میں شکوک پرستی نے دماغی اطمینان کو تہہ و بالا کر دیا تعلیم یافتہ طبقے، سیاسی قائدین، گاندھی جی ناقابل اعتماد ہو گئے۔ ان کے افعال کی نیتوں کو گھٹیا درجہ کے معانی پہنائے گئے۔ مستقبل تاریک دکھائی پڑتا تھا یہ احساس کہ ہندوستان میں بحیثیت حکمراں ان کی ضرورت ختم ہو گئی تھی ان کے دماغوں میں الجھن پیدا کرنے لگا۔

سول سروس کے پرانے ممبروں نے اپنے لڑکوں کے بارے میں مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ اب وہ انہیں اس ملازمت کے لئے جو ان کے نزدیک کبھی عطیہ خداوندی کا درجہ رکھتی تھی نہیں بھیجیں گے فولادی جسم والے بہرحال اس قابل رہ ہی نہیں گئے کہ اپنے اس یقین کو زندہ رکھ سکیں کہ یہ عمارت جس کی چولیں ڈھیلی ہو چکی ہیں۔ زیادہ عرصہ تک کھڑی بھی رہ سکے گی۔ وزیر ہند پیل (Peel) نے ریڈنگ کو لکھا۔

لیکن یہ حقیقت ہے کہ یہاں یہ امر نہایت دشوار ہو گیا ہے کہ بہترین صلاحیتوں کے نوجوانوں کو ان ملازمتوں (Indian) میں شریک ہونے کی ترغیب دی جا سکے۔ اور میں یہ بات محسوس کرتا ہوں کہ ملازمتوں میں داخل ہونے کی ان کی یہ ہچکچاہٹ بڑھتی ہی جائے گی جب تک ہم ان ملازمتوں کے مستقبل کے حالات میں خاص مادی سدھار نہ کریں گے لیکن جو شہادتیں ہمارے سامنے انڈیا میں ان ملازمتوں کے بارے میں خاص کر سول سروس آتی رہی ہیں وہ نہایت سنگین ہیں 73۔

---

73 - Reading Papers: Letter from the Secretary of State for India to the Governor General of India, Vol. V October 11, 1922

سروس کے سبکدوش ممبران جیسے سٹن یو۔پی (اتر پردیش) کے سابق گورنر برٹش یونیورسٹیوں میں تقریریں کرتے رہے تاکہ وہ نوجوانوں کو ان کے سامنے روشن اور امید افزا توقعات اور ان کے اختیارات اور ذمہ داریوں کو روبہ عمل لانے کے بے روک ٹوک مواقع اور ہندوستان کی عجیب الہیئت رنگین رومانی زندگی کے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھے جانے والے مرقعات کھینچ کر ترغیب دیتے رہے تاکہ وہ (نوجوانان) ہندوستان کے لئے اپنی خدمات پیش کر سکیں لیکن غلط فہمی اب رفو چکر ہو چکی تھی اور اب یہ بات ناممکنات میں سے تھی کہ اس عہد رفتہ کو دوبارہ واپس لایا جا سکے جب ڈسٹرکٹ افسر اپنے ضلعوں کا اقتدار اعلیٰ رکھنے والا سمجھا جاتا تھا اور دیہی علاقوں کے لئے ان کی اپنی مرضی قانون کا درجہ رکھتی تھی۔ ایڈورڈ تھامپسن نے اعتراف کیا کہ "جس بات کو دنیا ہماری حکومت کی کمزوری اور ہمارے اہل قلم ذی اقتدار لوگوں اور مصنفوں اور پبلک سوسائٹی کی ضعیف العقلی پر محمول کرتی ہے وہ صرف اس کی کہن سالی ہے ہم سب غلبۂ نیند کے شکار ہیں درحقیقت بڑھاپے کی غنودگی ہے"/74 اب بیر جمائے رکھنے کا قومی ارادہ کمزور پڑ گیا تھا۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ بتا دیا جائے کہ جس تحریک کی رہنمائی گاندھی جی نے کی تھی وہ اپنے سیاسی اغراض و مقاصد میں تنگ نظر نہیں تھی۔ گاندھی جی کا یہ ضرور مقصد اولین تھا کہ سوراج حاصل کیا جائے اور خلافت قائم کی جائے لیکن ان کے نزدیک یہ بذات خود خاص مقاصد نہیں تھے۔ سوراج آدرش کے حصول کے لئے ایک ضروری حربہ تھا۔ خلافت قلب کی گہرائی میں مقیم عقیدے کی ایک خارجی علامت تھی۔ وہ آدرش تھا کیا؟ آدرش یہ تھا کہ انسان کے معاملات کی صداقت اور عدم تشدد کی بنیاد پر ترتیب دی جائے۔ صداقت اور عدم تشدد ایک ہی حقیقت کے دو رخ تھے جس کا جوہر ان کا روحانی ہونا تھا۔ اس کا روحانی پہلو عدم استدلال کی ضد تھا جس تشدد و جبر لاینفک تھا۔ عدم تشدد کا مفہوم تھا محبت، اور محبت تردید کرتی ہے تفاوت، نسل، عقیدہ، تفریق ذات کی عدم مساوات دولت کی اور تفریق جنس کی۔ ایک سماج جس کی بنیاد صداقت منشی اور عدم تشدد پر قائم ہو اپنا وجود باقی رکھ سکتا ہے جس میں

74- Thompson E.G. An End of the Hour P.25 Cited in Greenberger A.J. The British Image of India P. 86

انسان کے ذریعہ انسان کی لوٹ کھسوٹ ختم ہو چکی ہو جس میں کام کرنا فرض کا درجہ رکھے، جس میں ضروریات کی حد بندی کی گئی ہو اور لوگ چھوٹے چھوٹے گروہوں میں رہتے ہوں جو ایک دوسرے سے آپسی عزت اور شفقت کے تعلقات سے مربوط ہوں گاندھی جی کا آدرش ایک طویل زمانے والا خواب تھا لیکن وہ اسی آدرش کو پیش نگاہ رکھتے ہوئے زندگی کی راہوں پر چلتے رہے اور ان کے قدم اسی راہ کو مضبوطی سے پکڑے رہے جو انھیں اس منزل کی جانب رہنمائی کر رہا تھا۔

انڈکس

مذمت ..... ستیہ گرہ کا فلسفہ اور قوی .....
آزادی کے لیے اس کا استعمال .... ہند
سوراجیہ یا ہندستان کی سلف گورنمنٹ پنچایات
... جمہوریت کی تائید کیا .... آخری ایام میں
مایوسی کے شکار .. تحریک ستیہ گرہ کی امانت
.. .. .. بابتہ سودیشی تحریک .. ..
خلافت کانفرنس میں ترک موالات کو زوردار
طرز پر پیش کیا .. کانگرس پر کنٹرول کیا .. ..
مسئلہ خلافت کے بارے میں .. سول نافرمانی
کی تحریک .. .. حکم سزا .. .. .. خلافت کے
مسئلہ کو اپنانے میں غلطی .. .. .. مسز بیسنٹ
کی نظر بندی پر .. .. جنگ عظیم کی حمایت ...
ان کے خیالات کا نچوڑ .. .. چمپارن ستیہ گرہ ...
احمد آباد مل اسٹرائک .. .. رولٹ ایکٹ کے
خلاف ردعمل .. ... رولٹ ایکٹ کے خلاف
ستیہ گرہ ..... امرتسر کا المیہ .. ..
.. .. .. ترک موالات کو پیش کیا .. ..
تلک کی مدح ..... سوراج ایک سال میں ..
تحریک خلافت کی تائید کے وجوہ .. ..
ترک موالات کو ملتوی کیا .. .. .. سزا .. .. رہائی

گنگوہی، مولانا رشید احمد، سید احمد کی پالیسی کے
خلاف آگاہی .. ..
جارج پنجم شہنشاہ انگلستان، تقسیم کی تنسیخ .. ..
جرمنی، اس کی اقتصادی ترقی ... ہٹلر کی نمود ..

صنعتی ترقی .. اس کے نوآبادیاتی حوصلے
اس کے اقلیتی مسائل .. ..
گرشنکران، انگلز نڈر، تجارتی مہم بازیوں پر ...
سماج کے اطوار کا اثر .. ..
غدر (اخبار) .. ..
غدر پارٹی .. ..
غزنوی، ابوالحسن .. ..
گھوش، آربندو .. گاندھی کے خیالات و پروگرام کا
کا پیش گی اندازہ .. بغاوت کی تحریکات
کی کوشش ... برطانوی سوسائٹی اور
کلچر کے بارے میں ان کا رویہ ان کا
جذباتی وطن پرستی کا جوش .. متصوفانہ
رجحانات، بنکم چٹرجی سے استفادہ
... ان کے کردار کے تین پہلو .. جداگانہ
انتخاب کی مخالفت، عالم گیر جنگ II میں
برطانیہ کی حمایت ... کرپس کی پیشکش
کا خیر مقدم ..... انگلستان اور ہندستان
میں ان کے ابتدائی زندگی کے کارنامے
..... اندو پرکاش اخبار میں مضمون
..... سیاسی فلسفہ ... ہندستان
میں قومیت کے جذبہ کا ارتقا .. ہندستان
پر برطانوی حکومت کے اثرات، اسلام
اور عیسائی مذہب کو ہندستان کی زندگی کے
عناصر قرار دیا .. ہندو مسلم اتحاد کے بارے
میں .... ان کی ناکامی ... مفاہمت مجہول

کے بارے میں تحقیر آمیز خیالات ۔
مشو بر الزام کہ مسلمانوں کو زیادہ نمائندگی
دے دی گئی ہے ۔امپائر کے مستقبل
پر شک مسلمانوں کے شکوک کو آن پایا
.. ..
مسلم قوم کے حمایت کی مدح
مارلے منٹو ریفارم ۔ ..
ماونٹ بیٹن ۔ لارڈ گورنر جنرل تقسیم ۔
اور آزادی کے فیصلے ۔
محمد عبدہ شیخ ... مذہب میں عقل پر زور
محمد علی مولانا ، دیو بند اسکول سے متعلق ۔
نظر بند .... ..
گرفتار .. .. ..
محمد رشید رضا ، مسلم مفکر ۔
محمڈن ایڈریس .. .. .. مسلم عوام کی
قصر دریاں نظر انداز ۔ ...
محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج ، بانی کے مقاصد ۔
محسن الملک حکومت برطانیہ کی غلامی اور خوشامد
..گورنمنٹ کو ایڈریس دینے کے
بارے میں مشورہ طلب کیا ....
وائسرائے کے وعدوں سے خوش
مکرجی ، عتن .. ..
مکرجی ، ایم بی کس آمدنی سے متعلق ۔
مکرجی ، رادھا کومد ... ..
مکرجی ، ستیش چندر .. ..

متنی کان تھ .... ..
مسلم فرقہ (مسلم) ان کا نظریہ ....
تلک نے تعاون کے لیے مدعو کیا ۔ دنیا ۔
اسلامیت نازک صورت حال ....
ہندستان میں فرقہ کی طاقت ....
ہندو عوام سے مماثلت اور اختلاف
اسلام اور اسلامی کلچر کی پرجوش مدح
فرقہ کے اندر مغربی تعلیم کا روز افزوں اثر
...مغرب سے رد عمل کے مختلف ادوار ۔
......جمال الدین افغانی کا اثر .... ..
مسلمانوں کا قوم پرست طبقہ ۔ جدیدیت کا اثر
....مخالف تقسیم شورش سے ناراض ....
اقبال کا فلسفہ ... ہندوؤں کے ساتھ ۔
مل کر ایک قوم ۔ فرقہ کے اندر تبدیلی کے
آثار ۔ ۔ انفرادیت قایم رکھنے کی
خواہش .. .. .. فرقہ کے
متعلق گورنمنٹ کی نئی پالیسی
انتلاف اور کارنامے ... عالم گیریت
اصول کے ساتھ سیاسی رد عمل ....
اکثریت کے خلاف شک کا رویہ ....
برطانوی فتح سے تباہی ۔ مغربی طاقتوں
سے مسلم حکومتوں کی پامالی ..... نظم
و نسق کی کارروائیوں سے خوشحالی پر اثر
سماجی اصلاحات کی تحریکات کا اثر ۔
فرقہ کے اندر مختلف طبقات برطانوی حکمرانوں

تحریک آزادی ہند کی دوسری جلد کی اشاعت کے وقت ناظرین سے یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ ہندوستان کی جدوجہد آزادی کا سب سے زیادہ فعال اور محسوس پہلو جو 1905ء میں شروع ہوا اور گاندھی جی کی عوامی تحریک پر ختم ہوا اس کا بیان تیسری اور آخری جلد میں ہوگا۔ ممتاز مورخ ڈاکٹر تارا چند نے اب یہ کام ایک جلد کے بجائے دو جلدوں میں کیا ہے۔

موجودہ جلد یعنی اس سلسلہ کی تیسری جلد 1905ء سے 1924ء تک کے زمانہ کے واقعات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اس کا آغاز تقسیم بنگال کے واقعات سے ہوتا ہے اور اس کا خاتمہ پوری قوم پر پھیلی ہوئی تحریک ترک موالات پر جو کانگریس نے مہاتما گاندھی کی قیادت میں چلائی تھی اس میں صرف سیاسی واقعات کا بیان نہیں ہے بلکہ ان سماجی تبدیلیوں کی تشریح کی کوشش کی گئی ہے جن کا مغرب کے اثر انداز ہونے سے ملک تجربہ کر رہا تھا۔ اس میں اس پر بحث کی گئی ہے کہ سیاسی انقلاب کے لانے میں اقتصادی امور کی کیا اہمیت ہوتی ہے اور از وسطی کے حالات سے گریز اور ذہنی نقطہ نظر میں تبدیلی پر بھی بحث کی گئی ہے۔

ممتاز قومی لیڈران تحریک کے لیے طریقہ کار متعین کرنے ہی میں نہیں لگے ہوئے تھے بلکہ وہ ایک فلسفہ بھی ایجاد کرنا چاہتے تھے جس سے تحریک زندہ رہے۔ پچھلی دو جلدوں میں جو مستند علمی اصول پر مرتب ہوئی ہیں ان میں تلک، ٹیگور، گاندھی اور اربند گھوش کے سیاسی خیالات کی شرح کی گئی ہے۔ یہی خیالات تحریک کی اصولی بنیادیں ہیں اور انہی سے تحریک کو فروغ ملا۔

مصنف اس بات پر زور نہیں دیتا ہے کہ اس نے کوئی نئے واقعات معلوم کیے ہیں بلکہ جو واقعات معلوم ہیں ان کی شرح کو اہمیت دیتا ہے۔ اس کا طرز بیان جس طرح معروضی ہے اسی طرح ہمہ گیر بھی ہے واقعات کو جس طرح اس نے سامنے رکھا ہے وہ تابدار ہے اور اسلوب شگفتہ اور زوردار ہے۔

جلد چہارم اس سلسلہ کی آخری جلد جدوجہد آزادی کے آخری (1924ء لغایت 1947ء) سے تعلق رکھتی ہے۔